خُود نوشت

مشرق کی بیٹی

بینظیر بھٹو

مشرق کی بیٹی

مشرق کی بیٹی

بینظیر بھٹو

اردو ترجمہ

سجاد بخاری

سکوارڈن لیڈر (ر) عبدالعلی شوکت

مساوات پبلیکیشنز

زیرو پوائنٹ G-7/1 اسلام آباد

فہرست

پیش لفظ

محترمہ بے نظیر بھٹو کی تصنیف DAUGHTER OF THE EAST ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جس میں نہ صرف پاکستان کی تاریخ کے انتہائی اہم واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ بین الاقوامی سیاسیات کے اسرار و رموز' دنیا کے اہم ممالک کے خارجی معاملات' دیگر ممالک اور اقوام سے متعلق ان کے نظریات اور سیاسی و غیر سیاسی اقدامات کے بارے میں سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے..... یہ کتاب اگر چہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی خود نوشت سوانح عمری ہے اور اس میں انہوں نے اپنی نجی زندگی کے تجربات' مختلف معاملات پر اپنے ذاتی خیالات اور زندگی کے مختلف مراحل میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو بھر پور انداز میں پیش کیا ہے تاہم اگر اس کتاب کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ کتاب بلاشبہ تاریخ پر لکھی جانے والی دنیا کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے..... یہ کتاب پہلی بار 1989ء میں شائع ہوئی اور اس نے دنیا بھر میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی..... اب تک اس کتاب کے لاتعداد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس میں اس کے قاری موجود نہ ہوں.... بنیادی طور پر یہ کتاب انگریزی زبان میں تحریر کی گئی ہے تاہم اب تک دنیا کی تقریبا ہر اہم زبان میں اسے ترجمہ کر کے شائع کیا جا چکا ہے..... حال ہی میں امریکہ میں اس کتاب کا نیا ایڈیشن DAUGHTER OF DESTINY کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے مزید موضوعات پر اپنے خیالات قلمبند کئے ہیں..... دنیا کے دیگر ممالک کی طرح اگر چہ پاکستان میں بھی یہ کتاب بڑی تعداد میں پڑھی گئی ہے تاہم انگریزی زبان میں شائع ہونے کے باعث پاکستان کے عوام کی اکثریت اس کتاب کے مندرجات تک رسائی حاصل کرنے سے محروم رہی ..... پاکستان کے متعدد اخبارات و جرائد نے بھی اس کتاب کے اہم اقتباسات اردو زبان میں ترجمہ کر کے شائع کئے تاہم کتابی صورت میں اس کا مکمل ترجمہ اب تک شائع نہیں ہو سکا تھا اور گزشتہ چھ برسوں کے دوران شدت کے ساتھ یہ ضرورت محسوس کی جاتی رہی کہ اس کتاب کو مکمل

اردو زبان میں شائع کیا جائے..... یہ کام اگرچہ خاصا وقت طلب اور مشکل تھا تاہم میرا ایمان ہے کہ اگر محنت، لگن اور خلوص نیت سے کام کیا جائے تو کوئی مسئلہ لاینحل نہیں رہتا

لیجئے DAUGHTER OF DESTINY کا مکمل اردو ترجمہ کتابی صورت میں آپ کی نظروں کے سامنے ہے..... اس طویل اور انتہائی اہم دستاویز کو اردو زبان میں منتقل کرنے میں میرے ساتھی سکواڈرن لیڈر (ریٹائرڈ) جناب عبدالعلی شوکت نے حد درجہ محنت اور لگن سے کام کیا ہے جس کے لئے وہ لائق تحسین ہیں

محترمہ بے نظیر بھٹو کی تحریروں سے آشنا سب لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ ان کی تحریروں کو اردو زبان میں منتقل کرنا آسان کام نہیں تاہم ہم نے کوشش کی ہے کہ ان کی تحریر کو ممکن حد تک سلیس اردو زبان میں ترجمہ کر کے قارئین تک پہنچایا جائے..... ہم اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ صرف قارئین ہی کر سکتے ہیں

سجاد بخاری
لاہور اکتوبر 1995ء

ابتدائیہ

میں نے تاریخی دستاویزات پر ہمیشہ اعتبار کیا ہے۔ جب ۱۹۷۷ء میں میرے والد ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹا گیا، میں نے ان متعدد لوگوں کو جنہیں ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے قریب رہنے کا موقع ملا تھا بھٹو دور کے بارے میں کچھ تحریر کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن مارشل لاء کے بدترین دور میں جس کا پاکستان میں آغاز ہوچکا تھا، میرے والد کی حکومت کے اکثر رفقاء فوجی حکومت کے تیار کردہ جھوٹے مقدمات اور ظلم و جبریت کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہوگئے تھے۔ اور کئی دوسرے ملک بدر ہوچکے تھے۔ لہٰذا ان کی ذاتی دستاویزات ان کی پہنچ سے دور تھیں۔ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد میں خود میری بھرپور شمولیت اور نتیجتاً ایک خاص مدت تک بغیر کسی الزام کے زیر حراست رہنے کی وجہ سے میرے لئے اپنے والد کی حکومت پر کسی کتاب کا تحریر کرنا ناممکن ہوکر رہ گیا تھا۔

دو سال کی جلاوطنی کے بعد اپریل ۱۹۸۶ء میں پاکستان واپسی پر جب دس لاکھ سے زیادہ میرے ہم وطن میرے استقبال کے لئے آئے تو یکایک اس واقعہ نے مجھے زبردست بین الاقوامی شہرت سے ہمکنار کردیا۔ مجھے اپنے والد کی نہیں بلکہ اپنی کہانی لکھنے کے لئے متعدد پیشکشیں ہوئیں۔ میں تذبذب کا شکار تھی کہ اپنے والد جو پاکستان کے پہلے منتخب وزیراعظم

تھے اور جن کے کریڈٹ میں بے مثال دائمی نوعیت کی کامیابیاں بھی تھیں۔ کے بارے میں لکھنا ایک الگ بات تھی اور اپنے بارے میں تحریر کرنا بالکل دوسری بات کیونکہ مجھے اپنی اہم ترین سیاسی جنگیں ابھی لڑنا تھیں۔ ابھی اسے مفروضہ ہی قرار دیا جاسکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ خود نوشت سوانح عمریاں زندگی کے موسم خزاں میں نگاہ بازگشت کے ساتھ رقم کی جاتی ہیں۔

میری ایک دوست کی اس رائے نے میرا ذہن بدل دیا۔ "جسے ضابطہ تحریر میں نہیں لایا جاتا اسے بھلا دیا جاتا ہے" مجھے اس کی بات پسند آئی۔ پاکستان میں اکثر لوگوں کی طرح، مجھے بھی مارشل لاء کے تاریک دور کا تلخ تجربہ تھا لیکن بہت سے دوسروں کے برعکس مجھے ان تجربات کو ریکارڈ کرنے کا موقع میسر تھا۔ یہ ایک اہم بات تھی کہ دنیا کو اس جبروتشدد کا پتہ چلے جو جنرل ضیاء کی طرف سے بھٹو حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد ہمیں پاکستان میں برداشت کرنا پڑا۔

کتاب کو تحریر کرنا کافی مشکل تھا۔ اس کا مطلب ماضی کے کرب میں سے دوبارہ گزرنا تھا۔ لیکن اس کا مقصد غبار خاطر کو دور کرنا بھی تھا جس نے مجھے اپنی ان یادداشتوں کو کریدنے پر مجبور کیا جن سے میں اب تک فرار حاصل کرتی رہی تھی۔

یہ میری کہانی ہے۔ وہ واقعات جن کو میں نے دیکھا، محسوس کیا اور جن پر اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ یہ پاکستان کے معاشرہ کا گہرائی میں مطالعہ نہیں بلکہ یہ ایک معاشرے کے جمہوریت سے آمریت میں انتقال کے عمل پر ایک طائرانہ نگاہ ہے، اسے ہم صدائے حریت بھی کہہ سکتے ہیں۔

بے نظیر بھٹو

۲۱ر جون ۱۹۸۸ء

کراچی، پاکستان

باب ا

میرے والد کا قتل

راولپنڈی سنٹرل جیل میں ۴ر اپریل ۱۹۷۹ء کو صبح صادق سے بھی بہت پہلے راولپنڈی سنٹرل جیل میں انہوں نے میرے والد کو قتل کر دیا۔ چند میل دور سہالہ کے ایک ویران پولیس ٹریننگ کیمپ میں اپنی والدہ کے ساتھ مقید، میں نے اپنے والد کی موت کے اس لمحے کو محسوس کیا۔ ویلیم اعصاب کی مسکن گولیوں کے باوجود جو میری والدہ نے مجھے وہ کرب انگیز شب گزارنے کیلئے دی تھیں میں اپنے بستر سے گھبراہٹ کے عالم میں اٹھ بیٹھی۔ ''نہیں پاپا نہیں'' میرے رندھے ہوئے گلے میں سے چیخ نکل گئی۔ میں سرد ہوتی گئی اور موسم گرم کی حدت کے باوجود میرا جسم کپکپانے لگا، مجھے سانس لینا دوبھر ہو گیا اور میں سانس لینا بھی ''نہیں'' چاہتی تھی۔ میری والدہ اور میرے پاس ایک دوسرے کی تسلی کے لئے الفاظ بھی میسر نہیں تھے۔ تاہم وقت گزرتا گیا اور ہم بے سروسامان پولیس کوارٹروں میں سمٹی ہوئی بیٹھی رہیں۔ ہم دونوں صبح سویرے میرے والد کی میت کے ہمراہ جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔

''میں عدت میں ہوں اور غیروں سے نہیں مل سکتی۔ تم باہر جاکر اس سے بات کرو'' میری والدہ نے جیلر کی آمد پر بیزاری سے کہا۔ انہوں نے اپنی عدت کی وجہ سے چار ماہ اور

دس دن تک غیر محرموں سے الگ رہنے کے عمل کا آغاز کر دیا تھا۔

میں اٹھی اور سامنے کے ٹوٹے پھوٹے فرش والے کمرے میں چلی گئی جو ہماری بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کمرے سے کائی اور سڑاند کی بدبو آ رہی تھی۔ "ہم وزیراعظم کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہیں" میں نے سامنے کھڑے خوفزدہ چھوٹے جیلر کو بتایا۔

"وہ انہیں دفنانے کے لئے پہلے ہی لے جا چکے ہیں" اس نے کہا۔

میں نے محسوس کیا جیسے اس نے میرے سر پر لٹھ مار دی ہے۔ "ان کے گھر والوں کے بغیر؟ "میں نے تلخی سے پوچھا "فوجی حکومت کے جرائم پیشہ افراد کو بھی یہ علم ہے کہ میت کے ہمراہ جانا، اس کے لئے دعائے مغفرت کرنا، دفنانے سے پہلے چہرہ دیکھنا ہمارے خاندان کا مذہبی فریضہ ہے۔ "ہم نے جیل سپرنٹنڈنٹ سے درخواست بھی کی تھی......"

"وہ انہیں لے گئے ہیں" اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"انہیں کہاں لے گئے ہیں؟"

جیلر خاموش کھڑا رہا۔

"سب کچھ سکون سے ہوگیا" وہ بالآخر بولا، جو کچھ بچا کھچا سامان تھا میں لے آیا ہوں۔

میرے والد کی کال کوٹھڑی کا بچا کھچا سامان ایک ایک کر کے میرے حوالے کیا۔ میرے والد کی قمیص شلوار، لمبی قمیص اور ڈھیلا پاجامہ جو انہوں نے آخری دنوں میں پہنا کیونکہ بطور سیاسی قیدی انہوں نے سزا یافتہ مجرم کی وردی پہننے سے انکار کر دیا تھا۔ کھانے کا ٹفن بکس...... اگرچہ کچھ دنوں سے انہوں نے مطلقاً کچھ نہیں کھایا تھا، بستر کے کپڑے جن کی اجازت اس وقت ملی تھی جب چارپائی کے ٹوٹے ہوئے تاروں نے ان کی کمر کو چھلنی کر دیا تھا اور ان کا پانی پینے کا پیالہ۔

"ان کی انگوٹھی کہاں ہے؟" میں نے جیلر سے استفسار کیا۔

"کیا ان کے پاس کوئی انگوٹھی تھی؟"

میں نے اسے اپنے تھیلے میں ہاتھ مارتے دیکھا اور پھر اپنی جیبوں میں، آخر کار اس نے میرے والد کی انگوٹھی میرے حوالے کر دی، جو آخری دنوں میں ان کی نحیف انگلیوں میں سے پھسل پھسل جاتی تھی۔

"پُرسکون، ہر چیز بہت پُرسکون رہی" وہ بڑبڑایا۔

پھانسی پُرسکون کیسے ہو سکتی ہے؟

بشیر اور ابراہیم ہمارے دو خاندانی بیرے جو حکام کی جانب سے ہمیں کھانا مہیا کرنے سے انکار کے بعد قید خانے میں ہمارے ساتھ آ گئے تھے۔ کمرے میں داخل ہوئے میرے والد کے کپڑے دیکھ کر بشیر کا رنگ فق ہو گیا۔

"یا اللہ، یا اللہ انہوں نے صاحب کو قتل کر دیا۔ انہوں نے انہیں مار دیا ہے" وہ چلایا، اس سے قبل کہ ہم اسے روک سکتے اس نے پیٹرول کا ڈبہ اٹھایا اور اپنے کپڑوں پر انڈیل لیا تاکہ اپنے آپ کو آگ لگا لے۔

میری والدہ اسے خود سوزی سے منع کرنے کے لئے دوڑتی آئیں۔

میں حیران و ششدر کھڑی تھی اور جو کچھ انہوں نے میرے والد کے ساتھ کیا تھا اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھی اور نہ ہی یقین کرنا چاہتی تھی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو جو عوام کے ووٹوں سے براہ راست پاکستان کے وزیر اعظم منتخب ہوئے تھے اب موت کی نیند سلا دیئے گئے تھے۔ جہاں پاکستان میں ۱۹۴۷ء سے قیام مملکت کے بعد جرنیلوں کے رحم و جبر کی حکومت رہی تھی وہاں میرے والد ہی تھے جو جمہوریت کو لیکر آئے تھے۔ جہاں لوگ صدیوں سے قبائلی سرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کے رحم و کرم پر جیتے آئے تھے۔ وہاں انہوں نے پاکستان کا پہلا آئین نافذ کر کے انہیں قانونی تحفظ اور شہری حقوق کی ضمانت دی تھی۔ جہاں لوگوں کو جرنیلوں سے نجات دلانے کے لئے تشدد اور خون ریزی کرنا پڑتی تھی، وہاں انہوں نے ملک کو شہریوں کی حکومت قائم کرنے کے لئے پارلیمانی نظام کا طریقہ کار وضع کیا اور ہر پانچ سال بعد انتخابات کی ضمانت دی۔

نہیں، یہ ممکن نہیں تھا۔ "جئے بھٹو، جئے بھٹو" کے نعرے لاکھوں لوگوں کی زبانوں پر

تھے کیونکہ میرے والد پاکستان کے پہلے سیاستدان تھے جو ملک کے دور افتادہ اور فراموش کردہ دیہات میں بھی غریب عوام تک پہنچے۔ جب ان کی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی نے حکومت سنبھالی تو میرے والد نے جدید اصولوں پر مبنی اپنے پروگرام کا آغاز کیا۔

☆ چند جاگیرداروں کی نسلوں سے قبضہ کی ہوئی زمین کی غریب مزارعوں میں تقسیم۔
☆ لاکھوں افراد کو جہالت سے نکال کر زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کا انتظام
☆ ملک کی بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لینا۔
☆ کم از کم مزدوری کا تعین۔
☆ ملازمتوں کا تحفظ۔
☆ خواتین اور اقلیتوں سے امتیازی سلوک کا خاتمہ۔ ان کی حکومت کے چھ سال ملک کو اتھاہ تاریکی سے نکال کر روشن مستقبل کی طرف لائے مگر ۵ر جولائی ۱۹۷۷ء کے سیاہ دن کی نمود نے اس تمام عمل کو روک دیا۔

ضیاء الحق، میرے والد کا مبینہ طور پر اطاعت گزار چیف آف آرمی سٹاف، وہ جرنیل جس نے اپنے سپاہیوں کو میرے والد کا تختہ الٹنے اور طاقت کے ذریعے ملک پر قبضہ کرنے کے لئے نصف شب کے قریب بھیجا، ضیاء الحق وہ فوجی آمر جو اپنی بندوقوں، اشک آور گیس کے گولوں اور مارشل لاء قوانین کی بھرمار کے باوجود میرے والد کے پیرو کاروں کو کچلنے میں ناکام رہا اور جو موت کی کوٹھڑی کی تنہائی کے باوجود میرے والد کے ہمت اور حوصلہ کو نہ توڑ سکا۔ ضیاء الحق وہ مایوسی کا شکار جرنیل جس نے اگلے نو سال پاکستان پر سنگ دلی سے حکومت کی۔

میں چھوٹے جیلر کے سامنے بےبس کھڑی تھی اور میرے ہاتھوں میں اپنے والد کے بچے کھچے سامان کی ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی اور بس۔ کولون شالیمار کے عطر کی خوشبو ان کے کپڑوں سے ابھی تک آ رہی تھی۔ میں نے ان کی قمیض کو اپنے ساتھ بھینچ لیا اور اچانک کیتھلین کینیڈی یاد آ گئی جس نے ریڈ کلف میں اپنے سینیٹر والد کے قتل کے بعد اس کا لباس پہن لیا تھا۔ سیاسی اصطلاحات میں، ہمارے دونوں خاندانوں میں مماثلت پائی گئی تھی۔

اب ہم میں ایک نیا اور خوفناک رشتہ مشترک ہو گیا تھا۔ اس رات اور بعد میں بہت سی راتیں میں اپنے والد کو اپنے پاس محسوس کرنے کے لئے ان کی قمیض اپنے تکئے کے نیچے رکھ کر سوتی رہی۔

میں نے اپنے آپ کو خلاء میں محسوس کیا، میری زندگی بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ تقریباً دو برس تک میں نے فوجی حکومت کی طرف سے اپنے والد کے خلاف لگائے گئے جھوٹے اور من گھڑت الزامات کے دفاع کے سوا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر ان انتخابات کے لئے کام کرنا شروع کر دیا جن کے انعقاد کا وعدہ جنرل ضیاء نے حکومت کا تختہ الٹنے کے وقت کیا تھا اور جنہیں بعدازاں ہماری متوقع جیت کے پیش نظر جنرل ضیاء نے منسوخ کر دیا تھا۔ مجھے فوجی حکومت نے چھ مرتبہ زیر حراست رکھا اور مارشل لاء حکام نے مجھے بار بار کراچی اور لاہور کی سرزمین پر قدم رکھنے سے محروم رکھا۔ یہی حال میری والدہ کا بھی تھا۔ میرے والد کے زمانہ قید میں، انہیں پی پی پی کی قائم مقام چیئرپرسن کے طور پر آٹھ مرتبہ نظر بند رکھا گیا۔ ہم نے اپنی نظربندی کے آخری چھ ماہ سہالہ میں گزارے تھے اور اس سے چھ ماہ قبل راولپنڈی میں نظر بند رہی تھیں۔ لیکن گذشتہ کل تک مجھے مطلقاً یقین نہیں تھا کہ جنرل ضیاء حقیقتاً میرے والد کو قتل کرا دے گا۔

میرے چھوٹے بھائیوں کو یہ خبر کون دے گا؟ جو لندن میں اپنے سیاسی جلاوطنی کے دنوں سے اپنے والد کی سزائے موت کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ اور میری بہن صنم کو کون بتائے گا؟ جو ہارورڈ میں اپنی تعلیم کے آخری سال میں پڑھ رہی ہے، میں صنم کے بارے میں خصوصاً متفکر تھی۔ وہ تو سیاسی ذہن کی تھی بھی نہیں، تاہم ہمارے ساتھ اسے بھی اس المیے میں دھکیل دیا گیا تھا۔ کیا وہ اب تنہا رہ جائے گی؟ میں دعائیں کرتی کہ اللہ تعالیٰ میری بہن کو حوصلہ اور استقامت عطا کرے کہ وہ کوئی بےوقوفانہ حرکت نہ کر بیٹھے۔

مجھے اپنا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہوا محسوس ہوا میں کیسے زندہ رہ سکتی تھی۔ میں کس قدر تنہا ہو گئی تھی بالکل تنہا۔ ''آپ کے سہارے کے بغیر میں کیسے زندہ رہوں گی؟'' میں نے موت کی کوٹھڑی میں اپنے والد سے یہ سوال کیا تھا۔ مجھے ان سے سیاسی رہنمائی کی ضرورت

تھی۔ ہارورڈ اور آکسفورڈ کی ڈگریوں کے باوجود میں سیاستدان تو نہیں تھی۔ لیکن وہ بھی کیا جواب دے سکتے تھے؟ انہوں نے بے چارگی میں اپنے کندھے جھٹکے۔

میں ایک روز قبل اپنے والد کو آخری مرتبہ ملی تھی۔ اس ملاقات کا کرب ناقابل برداشت تھا۔ کسی نے ابھی تک انہیں اطلاع نہیں دی تھی کہ اگلی صبح انہیں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔

کسی نے ان متعدد عالمی رہنماؤں کو بھی اطلاع نہیں دی جنہوں نے فوجی حکومت سے سرکاری طور پر ان کی جان بخشی کی اپیل کی تھی ان میں نہ صرف جمی کارٹر، مارگریٹ تھیچر، لیونڈ بریژنیف، پوپ جان پال دوم، چیئرمین ہواکوفنگ اور اندرا گاندھی شامل تھے۔ بلکہ تمام عالم اسلام یعنی سعودی عرب، ایران، ترکی، سوڈان، قطر، مصر، کویت، لیبیا، فلسطین متحدہ عرب امارات، شام وغیرہ کے سربراہان بھی شامل تھے۔ ضیاء حکومت کے بزدل حواریوں میں سے کسی کو بھی جرات نہ ہوئی کہ علی الاعلان ملک میں میرے والد کی پھانسی کی تاریخ کا اعلان کرتے...... وہ یقیناً وزیراعظم بھٹو کی موت پر عوامی رد عمل سے خوفزدہ تھے۔ صرف مجھے اور میری والدہ کو اس بات کا علم ہوا...... وہ بھی حادثتاً اور واقعات کے تجزیہ کے بعد۔

میں ۲ر اپریل کی صبح فوج کی طرف سے فراہم کردہ چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی جب میری والدہ اچانک کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے میرے گھریلو نام سے پکارا "پنکی" یہ ایسا لہجہ تھا کہ میرا تمام جسم اکڑ گیا۔ "باہر فوجی افسران کا کہنا ہے کہ ہم دونوں آج تمہارے والد سے ملاقات کرلیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

مجھے مکمل فہم تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ اسی طرح میری والدہ بھی جانتی تھیں۔ لیکن ہم دونوں اس بات کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ یہ دن عمومی طور پر میری والدہ کے ملاقات کا دن تھا انہیں ہفتے میں ایک بار ملنے کی اجازت تھی۔ میری ملاقات ہفتے کے آخر میں متعین تھی۔ اب وہ ہم دونوں کو اکٹھے ملاقات کے لئے جانے کو کہہ رہے تھے اس کا مطلب تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ ضیاء نے میرے والد کے قتل کا فیصلہ

کر لیا تھا۔

میرا ذہن تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ میں نے سوچا ہمیں ملک سے باہر عالمی رائے عامہ اور اپنے عوام تک یہ خبر فوراً پہنچانا چاہئے۔ وقت ہاتھوں سے نکلتا جا رہا تھا کہ میں نے والدہ کو کہا کہ انہیں بتا دیں ''کہ میری طبیعت ناساز ہے۔ البتہ اگر یہ آخری ملاقات ہے تو میں جانے کے لئے تیار ہوں'' جب میری والدہ گارڈز کے ساتھ بات کرنے کے لئے گئی میں نے جلدی میں پہلے سے تحریر شدہ پیغام لفافے میں سے نکالا اور نیا تحریر کر دیا۔ میں نے جلدی جلدی اپنی دوست کے لئے ایک نیا پیغام رقم کیا ''میرا خیال ہے کہ وہ ہمیں آخری ملاقات کے لئے لے جا رہے ہیں تم فوراً غیر ملکی سفیروں تک یہ پیغام پہنچاؤ۔ اس کے ساتھ ساتھ عوام کو متحرک کرو کہ وہی ہماری آخری امید ہیں۔''

''فوراً یہ لفافہ یاسمین تک لے جاؤ'' میں نے اپنے وفادار ملازم ابراہیم کو بتایا یہ جانتے ہوئے کہ میں ایک خطرہ مول لے رہی ہوں۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کسی ایسے پہرہ دار کی ڈیوٹی کا انتظار کرتا جو طبعاً ست ہو یا ہمارا ہمدرد بھی۔ اس کی تلاشی کا امکان تھا اور اس کا تعاقب بھی کیا جا سکتا تھا۔ وہ پوری طرح احتیاطی تدابیر شاید اختیار نہ کر سکے۔ خطرہ تو تھا مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ ''ابراہیم جاؤ'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''پہرہ داروں کو بتاؤ تم میرے لئے دوائی لینے جا رہے ہو'' وہ فوراً بھاگ کھڑا ہوا، میں نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا اور دیکھا کہ مارشل لاء کے اہلکار آپس میں صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ وائرلیس سیٹ پر انہوں نے پیغام ارسال کیا کہ ''میری طبیعت ناساز ہے اور میں نہیں جا سکتی'' اب انہیں حکام کے احکامات کا انتظار تھا۔ اس افراتفری میں ابراہیم گیٹ تک پہنچ چکا تھا۔ ''مجھے بے نظیر صاحبہ کے لئے دوائی لینا ہے'' پہرہ دار جو میری ناسازی طبع کے متعلق سن چکے تھے انہوں نے ابراہیم کو نہیں روکا اور وہ معجزانہ طور پر باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد میری والدہ میرے کمرے کے اندر آ گئی۔ میرے ہاتھ مسلسل کپکپا رہے تھے مجھے یقین نہیں کہ میرا پیغام یاسمین تک پہنچ جائے گا۔

دریچے سے باہر وائرلیس سیٹ کھڑکھڑا اٹھے حکام نے میری والدہ کو بتایا کہ چونکہ ان کی

بیٹی کی طبیعت ناساز ہے اس لئے دونوں کی ملاقات اگلے روز ہوگی۔ ہمیں اب اپنے والد کی جان بچانے کے لئے مزید ۲۴ گھنٹے مل گئے تھے۔ ابراہیم کے باہر جانے کے بعد صحن کے بڑے دروازے فوراً بند کر دیئے گئے اور ہمیں کسی بری خبر کا منتظر ہونا پڑا۔

لڑنا ہے ہمیں بہر صورت والد کی زندگی بچانے کی جنگ لڑنا ہے، مگر کیسے؟ ان کی زندگی کے لمحات دھیرے دھیرے کم ہو رہے تھے۔ اس کا بھی ہمیں احساس تھا، کیا ہمارا پیغام مل چکا ہو گا؟ کیا لوگ بندوقوں اور سنگینوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے؟ جن کا اب تک وہ مقابلہ بے جگری سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کی رہنمائی کون کرے گا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے لیڈروں کی اکثریت جیلوں میں قید تھی اسی طرح عوام الناس میں ہمارے ہمدرد بھی جیلوں میں بند تھے اور ان میں پہلی دفعہ کثیر تعداد عورتوں کی بھی شامل تھی۔ لاتعداد لوگ آنسو گیس کا شکار ہوئے انہوں نے کوڑے کھائے صرف اس بات پر کہ انہوں نے میرے والد کا نام بلند آواز سے پکارا تھا۔ ان کے نیم برہنہ جسموں پر کوڑوں کے نشان اب تک ثبت ہیں۔ کیا لوگ ہماری آخری آواز پر لبیک کہیں گے؟ کیا یہ آواز ان تک پہنچ بھی سکے گی؟

سوا آٹھ بجے شب میں نے اور میری والدہ نے بی بی سی کی ایشیاء رپورٹ سننے کے لئے ریڈیو آن کیا۔ میرے جسم کا ریشہ ریشہ اکڑ چکا تھا۔ میں متوقع خبر سننے کے لئے متوجہ ہوئی جب بی بی سی نے رپورٹ دی کہ میں نے حراست سے ایک پیغام ارسال کیا ہے کہ کل مورخہ ۳ر اپریل کو والد کے ساتھ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ پیغام تو نشر ہوا لیکن عوام الناس کو احتجاج میں اٹھنے کی جو کال ہم نے دی تھی وہ بی بی سی کے اعلان نامہ میں مفقود تھی۔ اس کے برعکس بی بی سی نے رپورٹ کیا کہ اس خبر کی کوئی تصدیق جیل سپرنٹنڈنٹ سے نہیں ہوئی بلکہ میرے والد ہی کے ایک سابق وزیر کا حوالہ دیا گیا جس میں کہا گیا۔ ''وہ بلاوجہ تشویش میں مبتلا ہو گئی ہے'' میری والدہ اور مجھ میں ایک دوسرے کو دیکھنے کی بھی سکت نہ رہی۔ ہماری آخری امید گل ہو گئی۔ اگلے روز ایک تیز رفتار جیپ میں ہمیں جیل پہنچا دیا گیا۔ حفاظتی افواج کے پیچھے خوف زدہ لوگوں کا ہجوم تھا جنہیں اپنے وزیراعظم کی قسمت کے

متعلق کوئی خبر نہیں، جیل کی میٹرن نے میری والدہ اور میری تلاشی لی، ایک مرتبہ جب ہم سہالہ کے قید خانہ سے روانہ ہوئیں اور دوسری مرتبہ جب ہم راولپنڈی سنٹرل جیل پہنچیں۔

"آج تم دونوں اکٹھی یہاں کیوں آئی ہو؟" میرے والد نے اپنی کال کوٹھڑی کی دوزخ سے آواز دی

میری والدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کیا یہ آخری ملاقات ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

میری والدہ جواب دینے کا یارا نہیں رکھتیں۔

"میرا خیال ہے ایسا ہی ہے" میں نے جواب دیا۔

وہ جیل سپرنٹنڈنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو پاس ہی کھڑا ہے (یہ لوگ ہمیں پاپا کے ساتھ تنہا چھوڑنے پر کبھی تیار نہیں ہوئے۔)

"کیا یہ آخری ملاقات ہے؟" میرے والد اسے پوچھتے ہیں۔

"ہاں" جواب میں جیلر کہتا ہے جیل سپرنٹنڈنٹ حکومت کا یہ پیغام دیتے ہوئے شرمسار محسوس ہوتا ہے۔

"کیا تاریخ کا تعین ہو گیا ہے؟"۔

"کل صبح" جیل سپرنٹنڈنٹ کا جواب ہے۔

"کتنے بجے؟"۔

"جیل قواعد کے مطابق صبح پانچ بجے"۔

"یہ اطلاع تمہیں کب ملی؟"۔

"کل رات" اس نے رکتے رکتے جواب دیا۔

میرے والد اسے نظر بھر کے دیکھتے ہیں۔

"اپنے اہل و عیال سے ملاقات کا کتنا وقت دیا گیا ہے"۔

"نصف گھنٹہ"

"جیل قواعد کے مطابق ہمیں ایک گھنٹہ ملاقات کا حق ہے" وہ کہتے ہیں۔
"صرف نصف گھنٹہ" سپرنٹنڈنٹ دہراتا ہے۔ "یہ میرے احکامات ہیں۔"
"غسل اور شیو کرنے کے لئے انتظامات کرو" میرے والد اسے کہتے ہیں۔ "دنیا خوبصورت ہے اسے میں اسی حالت میں الوداع کہنا چاہتا ہوں"۔

"صرف نصف گھنٹہ" اس شخص سے ملاقات کے لئے...... صرف نصف گھنٹہ جو مجھے زندگی کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے سینے میں درد سے گھٹن محسوس ہوتی ہے مجھے رونا نہیں چاہئے مجھے اپنے ہوش بھی نہیں کھونے چاہئیں کیونکہ اس طرح میرے والد کی اذیت بڑھ جائے گی۔

وہ فرش پر پڑے گدے پر بیٹھے ہوئے ہیں ان کی کوٹھڑی میں اب صرف یہی فرنیچر باقی رہ گیا ہے جیل حکام کرسی اور میز لے جاچکے ہیں چارپائی بھی وہاں سے اٹھائی جاچکی ہے میگزین اور کتابیں جو میں پاپا کے لئے لاتی رہی تھی وہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "انہیں لے جاؤ میں نہیں چاہتا یہ لوگ میری کسی چیز کو ہاتھ لگائیں"۔

وہ چند سگار جو ان کے وکلاء وہاں چھوڑ گئے تھے میرے حوالے کرتے ہیں...... میں آج شب کے لئے صرف ایک رکھ لیتا ہوں۔ شالیمار کولون کی شیشی بھی رکھ لیتے ہیں۔ وہ اپنی انگوٹھی بھی مجھے دینا چاہتے ہیں لیکن میری والدہ انہیں کہتی ہیں "اسے پہنے رکھیں" وہ کہتے ہیں "اچھا ابھی میں رکھ لیتا ہوں لیکن بعد میں بے نظیر کے حوالے کر دی جائے"۔

"میں نے ایک پیغام باہر کی دنیا تک پہنچا دیا ہے" میں نے بہت آہستہ سے انہیں بتایا (جیل کے حکام میری آواز سننے کی کوشش کرتے ہیں)

میں تفصیلات بتاتی ہوں وہ اطمینان محسوس کرتے ہیں "یہ سیاست کے اسرار و رموز میں ماہر ہوچکی ہے" ان کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہوتا ہے۔ موت کی کوٹھڑی میں روشنی مدھم سی ہے میں انہیں صاف طور پر نہیں دیکھ سکتی۔ اس سے قبل ہر ملاقات کوٹھڑی میں ان کے پاس بیٹھ کر ہوتی رہی لیکن آج ایسا نہیں ہے۔ کوٹھڑی کے باہر دروازے کی سلاخوں کے ساتھ میں اور میری والدہ سکڑ کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ باتیں کھسر پھسر کے انداز میں

کرتے ہیں۔ ''دوسرے بچوں کو میرا پیار دینا'' وہ میری ممی سے کہتے ہیں۔ ''میر، سنی، اور شاہ کو بتانا میں نے ہمیشہ ایک اچھا باپ بننے کی کوشش کی اور میری خواہش ہے کہ کاش انہیں بھی الوداع کہہ سکتا'' میری والدہ سرہلاتی ہیں منہ سے کچھ نہیں بول سکتیں۔

''تم دونوں نے بہت تکالیف اٹھائی ہیں'' وہ کہتے ہیں ''وہ آج مجھے قتل کرنے جارہے ہیں۔ میں تمہیں تمہاری مرضی پر چھوڑتا ہوں اگر چاہو تو پاکستان سے اس وقت تک باہر چلے جاؤ جب تک آئین معطل ہے۔ اور مارشل لاء نافذ ہے اگر تمہیں ذہنی سکون چاہئے اور زندگی نئے سرے سے گزارنا چاہتی ہو تو یورپ چلی جاؤ میری طرف سے اجازت ہے''۔

(ہمارے دل ٹوٹ رہے ہیں) ''نہیں، نہیں'' ممی کہتی ہیں۔ ''ہم نہیں جاسکتے'' ہم کبھی نہیں جائیں گے جرنیلوں کو کبھی یہ تاثر نہیں دیں گے کہ وہ جیت چکے ہیں۔ ضیاء نے انتخابات کا دوبارہ پروگرام بنایا ہے اگرچہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ ایسا کرنے کی جرات بھی کرے گا یا نہیں...... ہم باہر چلی جائیں تو پارٹی کی رہنمائی کے لئے کوئی نہیں ہوگا اور یہ وہ پارٹی ہے جس کی آپ نے بنیاد رکھی اور پروان چڑھایا۔

''اور تم پنکی!'' میرے والد پوچھتے ہیں۔

''میں بھی کبھی نہیں جاسکتی'' میرا جواب ہے۔

وہ مسکراتے ہیں۔ ''میں بہت خوش ہوں...... تم نہیں جانتی مجھے تم سے کتنا پیار ہے۔''

''تم میری لعل ہو اور ہمیشہ ہی رہی ہو۔''

''وقت ختم ہوچکا'' سپرنٹنڈنٹ پکارتا ہے۔ ''وقت ختم ہوچکا''۔

میں سلاخوں کو پکڑ لیتی ہوں۔

''برائے مہربانی کوٹھڑی کا دروازہ کھول دو میں اسے کہتی ہوں میں اپنے پاپا کو الوداع کہنا چاہتی ہوں۔''

سپرنٹنڈنٹ انکار کر دیتا ہے۔

میں دوبارہ التجا کرتی ہوں "میرے والد پاکستان کے منتخب وزیراعظم ہیں۔ میں ان کی بیٹی ہوں یہ ہماری آخری ملاقات ہے مجھے ان سے مل لینے دو۔"

سپرنٹنڈنٹ انکار کر دیتا ہے۔

سلاخوں کے درمیان سے میں اپنے والد کے جسم کو چھونے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ اس قدر نحیف و ناتواں ہو چکے ہیں ملیریا، پیچش اور ناکافی خوراک کھانے کی وجوہ سے جسم بالکل نحیف اور باریک ہو چکا ہے۔ لیکن وہ سیدھا اٹھ بیٹھتے ہیں۔ اور میرے ہاتھ کو چھو لیتے ہیں۔

"آج شب علائم دنیا سے آزاد ہو جاؤں گا" چہرے پر ایک چمکتی روشنی لئے کہتے ہیں۔ "میں اپنی والدہ اور اپنے والد کے پاس چلا جاؤں گا"۔"میں لاڑکانہ میں اپنے اجداد کی زمینوں کی طرف واپس جارہا ہوں تاکہ اس سرزمین کا، اس کی خوشبو اور اس کی فضا کا حصہ بن جاؤں"۔

"خلق خدا میرے بارے میں گیت گائے گی میں اس کی کہانیوں کا جاوداں حصہ بن جاؤں گا۔"

وہ مسکراتے ہوئے کہتے ہیں "لیکن لاڑکانہ میں آج کل بہت گرمی ہے۔"

"میں وہاں ایک سائبان تعمیر کر دوں گی" میں بمشکل کہہ سکی۔ جیل حکام آگے بڑھتے ہیں۔

"الوداع پاپا!" میں والد کی طرف دیکھ کر پکار اٹھتی ہوں اور میری ممی سلاخوں میں سے ان کو چھو لیتی ہیں۔ ہم گرد آلود صحن میں سے گزرتے ہیں۔ میں مڑ کے پیچھے دیکھنا چاہتی ہوں لیکن حوصلہ نہیں پڑتا۔ مجھے معلوم ہے میں ضبط نہیں کر سکوں گی۔ "ہم جب پھر ملیں گے اس وقت تک خدا حافظ" مجھے ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔

تاہم میں چل پڑتی ہوں۔ مجھے چلنے کا مطلق احساس نہیں ہو رہا۔ میں پتھر بن چکی ہوں جیل حکام ہمیں جیل وارڈ کے اندر واپس لیجاتے ہیں۔ صحن میں فوجیوں کے متعدد ٹینٹ ایستادہ ہیں میں مدہوشی کے عالم میں چلی جارہی ہوں صرف اپنے سر کی موجودگی کا احساس

ہے۔ سربلند رہنا چاہئے وہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہیں۔

مقفل دروازوں کے اندر کار ہماری منتظر ہے تاکہ باہر ہجوم ہمیں دیکھ نہ سکے۔ میرا جسم اس قدر بوجھل ہوگیا ہے کہ کار کے اندر داخل ہونا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کار دروازوں کے بیچ میں سے تیزی سے حرکت کرتی ہے۔ اسے دیکھتے ہی ہجوم کے ایک سرے پر کھڑی اپنی دوست یاسمین پر اچانک میری نظر پڑتی ہے جس کے ہاتھ میں والد کے دینے کے لئے خوراک کا ٹفن کیریئر ہے۔ " یاسمین! وہ آج رات انہیں مار دیں گے" میں کار کے شیشوں میں سے چلائی۔ "کیا اس نے میری آواز سنی؟" ۔ "کیا میں نے کوئی آواز نکالی بھی یا نہیں...... کیا کہہ سکتی ہوں؟"

صبح کے پانچ بج گئے پھر چھ بجے...... ہر سانس جو میں لیتی مجھے اپنے والد کے آخری سانسوں کی یاد دلاتا۔ "اے خدا! کوئی معجزہ ہی رونما ہوجائے" میری ماں اور میں نے دعا مانگی۔ "کچھ نہ کچھ ہو جانا چاہئے" میری چن چن جسے میں اپنے ساتھ قید خانے میں لے آئی تھی، وہ بھی تناؤ کو محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنے بلونگڑوں کو کہیں چھپا دیا تھا وہ کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔

ہم ناقابل یقین امید کے ساتھ چپکے ہوئے تھیں۔ سپریم کورٹ نے متفقہ طور پر سفارش کی تھی کہ میرے والد کی سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا جائے مزید براں پھانسی دیئے جانے کی صورت میں پاکستانی قانون کے مطابق ایک ہفتہ قبل دن اور تاریخ کا تعین اعلانیہ کر دیا جائے۔ لیکن ایسا کوئی اعلان سرے سے کیا ہی نہیں گیا۔

پی پی پی کے راہنماؤں نے بھی ہمیں یہ پیغام ارسال کیا کہ ضیاء نے سعودی عرب، متحدہ امارات اور دوسرے ملکوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ میرے والد کی سزائے موت کو تبدیل کر دے گا۔ لیکن ضیاء کا ریکارڈ قانون سے بے اعتنائی اور جھوٹے مواعید سے بھرا پڑا تھا۔ ہمارے مستقل خدشات کی بدولت، جب بھی پھانسی کی حتمی تاریخ کا حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا۔ سعودی عرب کے وزیر خارجہ اور لیبیا کے وزیراعظم نے فوراً بذریعہ طیارہ پاکستان پہنچنے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ "کیا انہوں نے بی بی سی پر میرا پیغام سن لیا تھا؟ کیا ابھی بھی

ان کے پاس پاکستان پہنچنے کا وقت تھا؟ ''۔

چینیوں کا ایک وفد اسلام آباد میں تھا۔ میرے والد ہی نے پاکستان چین دوستی کا آغاز کیاتھا۔ کیا وہ ضیاء کو اپنے فیصلے سے منحرف کرا سکیں گے؟۔

میری والدہ اور میں سہالہ کی شدید گرمی میں بے حس و حرکت اور خاموش بیٹھی تھیں۔ ضیاء نے یہ بات بھی پھیلائی تھی کہ وہ رحم کی اپیل اس وقت ہی سنے گا اگر یہ میرے والد یا ہماری طرف سے کی گئی۔ میرے والد نے ایسا کرنے کو سختی سے منع کر دیا تھا۔

موت کی جانب گنتی کے یہ لمحات کیسے گزرتے ہیں؟ میری والدہ اور میں گم سم بیٹھی تھیں۔ بعض اوقات ہم چلاتی بھی تھیں۔ جب ہم میں بیٹھنے کی سکت باقی نہ رہی تو ہم بستر کے تکیوں پر گر گئیں۔ وہ ان کی زندگی ختم کر دیں گے، میں متواتر سوچتی رہی۔ وہ ان کی زندگی ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کے اپنے احساسات اس بھرپور تنہائی میں کیسے ہوں گے۔ جب کہ ان کے پاس اس وقت کوئی بھی نہیں؟ انہوں نے اپنے پاس کوئی کتاب بھی نہیں رکھی۔ انہوں نے اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھا صرف ایک سگار ان کے پاس تھا۔ میرا گلا گھٹن سے جڑ گیا اور میں اسے پھاڑ کر کھول دینا چاہتی تھی۔ لیکن میں ان پہرہ داروں کو جو ہماری کھڑکی کے باہر ہر وقت ہنستے اور باتیں کرتے رہتے تھے اپنی چیخوں سے استہزاء کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ ممی! میں برداشت نہیں کر سکتی بالکل نہیں کر سکتی۔ آخر میں ڈیڑھ بجے کے قریب بالکل ٹوٹ گئی وہ میرے لئے مسکن دوائی کی گولیاں لائیں۔ ''سونے کی کوشش کرو''، انہوں نے کہا۔

آدھ گھنٹے کے بعد میں اپنے بستر میں اچانک اٹھ بیٹھی..... والد کے گلے کا پھندا میں نے اپنے گلے کے ارد گرد محسوس کیا۔

آسمانوں سے اس شب برف کے آنسو برسے۔ لاڑکانہ میں ہماری خاندانی زمینوں پر اولے پڑے۔ گڑھی خدا بخش میں ہمارے آبائی قبرستان میں فوجی دستوں کی ہل چل سے لوگ جاگ اٹھے۔ جب میری والدہ اور میں اپنے قید خانے میں رات کے وقت کرب کی گھڑیاں گزار رہی تھیں میرے والد کی میت گڑھی میں دفنانے کے لئے بذریعہ طیارہ لیجائی

جاری تھی۔ مارشل لاء انتظامیہ کی ابتدائی پارٹی نے ہمارے ایک دیہاتی نذر محمد کے ذریعہ تمام انتظامات مکمل کئے تھے۔ نذر محمد اور اس کے خاندان کےافراد ہماری زمینوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اور کئی نسلوں سے ہمارے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

نذر محمد کا بیان

میں ۴/اپریل کی صبح تین بجے اپنے گھر میں سویا ہوا تھا جب میں نے گاؤں کے نواح میں پچاس سے ساٹھ فوجی گاڑیوں کی تیز روشنی دیکھی۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ شاید دو روز قبل کی طرح بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کے بعد جو عمل جاری رکھنا ہے اس کی ریہرسل کر رہے ہیں یعنی معمول کی فوجی مشقیں ہیں۔ لوگ بہت خوفزدہ تھے خاص طور پر بھٹو قبرستان میں پولیس کے داخل ہو کر ہر طرف بغور دیکھنے پر جب پولیس نے علی الصبح مجھے گھر سے باہر آنے کو کہا دیہات کے تمام لوگ بوڑھے اور جوان مرد اور عورتیں اپنے گھروں سے باہر نکل پڑے۔ تمام کو خدشہ تھا کہ بھٹو صاحب کو یا تو پھانسی دیا جاچکا ہے یا جلدی دیا جانے والا ہے۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی اور سب کے چہروں پر مایوسی۔

"ہمیں بھٹو صاحب کے دفنانے کا انتظام کرنا ہے" لاتعداد فوجی اور پولیس نوجوانوں نے اپنے عارضی ہیڈ کوارٹرز پر مجھے لاکر کہا "ہمیں وہ جگہ دکھاؤ جہاں ہم قبر کھودیں" میں رو رہا تھا۔ "ہم تمہیں بھٹو صاحب کو دفنانے کی جگہ کی نشان دہی کیوں کریں؟" "ہم ان کی آخری رسومات خود ادا کریں گے بھٹو صاحب ہمارے ہیں میں نے جواب میں کہا"۔

میں نے انہیں اپنے آدمی قبر کھودنے کے لئے لانے کی اجازت مانگی تاکہ قبر کے لئے کچی اینٹیں اور لکڑی کے تراشے ہوئے پھٹے بھی لائے جاسکیں۔ اور مذہبی رسومات بھی ادا کی جاسکیں۔ انہوں نے مجھے صرف آٹھ آدمیوں سے مدد لینے کی اجازت دی۔

جب ہم اس اذیت ناک کام میں لگے ہوئے تھے فوجی اور پولیس گاڑیوں نے پورے گاؤں کو محاصرے میں لے لیا۔ بلکہ چھوٹی سے چھوٹی گلی میں بھی رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔

نہ کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت تھی نہ ہی باہر سے گاؤں کے اندر داخل ہونے کی۔ ہم مکمل طور پر باقی دنیا سے کٹ چکے تھے۔ آٹھ بجے صبح دو ہیلی کاپٹر گاؤں سے باہر سڑک پر اترے جہاں ایمبولینس انتظار میں کھڑی تھی میں نے کفن ایمبولینس میں منتقل ہوتے دیکھا اور اس کے پیچھے پیچھے قبرستان تک پہنچا۔ ''اس گھر کو خالی کر دو'' فوجی کرنیل نے قبرستان کے جنوبی کونے میں چھوٹی سی رہائش گاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے کہا۔ یہ پیش امام کی رہائش گاہ تھی جو اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ وہاں رہائش پذیر تھا۔ میں نے پیش امام، اس کی بیوی اوراس کے بچوں پر اس ظلم اور ناروا سلوک پر احتجاج کیا مگر کرنیل اپنی بات پر مصر رہا۔ ۲۰ مسلح یونیفارم میں ملبوس جوانوں نے اس گھر کی چھت پر مورچہ سنبھال لیا اور اپنی بندوقیں قبرستان کی سمت تان لیں۔ پھر اعلان کیا گیا کہ نزدیکی رشتے دار جانے والے کا آخری دیدار کرلیں۔ بھٹو صاحب کے چچا زاد اور ماموں زاد بھائی قبرستان کے نزدیک گڑھی خدا بخش میں رہتے تھے۔ بھٹو صاحب کی پہلی بیوی بھی نزدیکی دیہات نوڈیرو میں رہتی تھیں۔ کافی پس و پیش کے بعد حکام نے مجھے ان کو لانے کی اجازت دی۔ جب وہ پہنچیں تو ہم نے کفن کو کھولا اور میت کو رسی سے بنی ہوئی چارپائی پر منتقل کیا۔ یہ چارپائی میں اپنے گھر سے لے آیا تھا تاکہ پیش امام کے گھر میں میت کو منتقل کرتے وقت کام آسکے۔ بھٹو صاحب کی بیوی پردہ کرتی تھی اور اپنے گھر والوں کو اجنبی نظروں سے محفوظ رکھنے کے لئے باہر بے پردہ نہیں آنے دیتی تھی۔ خاندان سے باہر کسی مرد کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن فوجی جوان تہذیب و تمدن کے تمام معیاروں کو کچلتے ہوئے گھر میں داخل ہوگئے۔

جب میت آدھ گھنٹے بعد گھر سے باہر لائی گئی تو میں نے کرنل سے حلفاً بتانے کے لئے کہا ''آیا میت کو مذہبی اصولوں اور روائتی رسومات کے مطابق غسل دیا گیا تھا'' کرنل نے حلفاً کہا کہ ایسا ہی کیا گیا تھا۔ میں نے مزید تسلی کے لئے کفن کا کپڑا چیک کیا تو دیکھا کہ جسم پر کفن موجود تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو پولیس کی حراست میں

ہم اس قدر پریشان اور غم زدہ تھے کہ ہمیں باقی جسم کو دیکھنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ ہمیں ایسا کرنے کی اجازت دیتے کیونکہ اس طرح ان کے اعمال شنیعہ منکشف ہوجاتے۔ تاہم ان کا چہرہ موتی کی طرح دمکتا تھا۔ وہ اتنے تازہ دم نظر آرہے تھے جیسا کہ سولہ سالہ نوجوان ہو۔ ان کی جلد کئی رنگوں میں بدلی ہوئی نہیں تھی۔ نہ ہی ان کی آنکھیں یا زبان باہر کو لٹکی ہوئی تھیں، جس طرح ان آدمیوں کی جنہیں ضیاء نے سرعام پھانسی دلوایا تھا۔ مذہبی روایات کے مطابق میں نے بھٹو صاحب کے چہرے کا رخ مغرب یعنی مکہ کی جانب کر دیا ان کی گردن ٹوٹی ہوئی نہیں تھی ان کے گلے پر عجیب طرح کے سرخ اور سیاہ نشان تھے جیسے کسی سرکاری مہر کے ہوتے ہیں۔ کرنل بہت ناراض ہوا۔ ۱۴۰۰ سے ۱۵۰۰ لوگ دیہات کی جانب سے آگے بڑھتے آرہے تھے۔ اور شہید کے چہرے پر چمک کو دیکھنے کے لئے بیتاب نظر آتے تھے۔ ان کی چیخیں دلدوز تھیں۔ کرنل نے لوگوں کو منتشر نہ ہونے کی صورت میں لاٹھی چارج کی بھی دھمکی دی۔ "دفنانے کا عمل فوراً مکمل کیا جائے" اس نے کہا۔ "ضرورت پڑی تو ڈنڈے کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کریں گے۔"

"وہ غم سے چلا رہے ہیں اور ان کے دل ٹوٹ چکے ہیں" میں نے کہا۔

بندوقوں کے جلو میں ہم نے مرحوم کو آخری دعاؤں کے ساتھ دفن کیا۔ مرحوم کی روح کو ثواب پہنچاتے ہوئے ہم نے ان کی میت کو قبر میں اتارا۔ قرآن کی تلاوت بھی جاری تھی۔ اور دیہات کے گھروں میں سے عورتوں کی آہ و زاری کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔

متعدد دنوں تک سہالہ میں اپنے والد کی موت کے بعد کھانا اور پینا بالکل چھوٹ گیا پانی کے دو گھونٹ پیتی اور تھوک دیتی میں کوئی چیز بھی نگلنے کے قابل نہیں تھی نیند بھی اڑ چکی تھی۔ ہر مرتبہ جب آنکھیں بند کرتی ایک ہی خواب دکھائی دیتا۔ "میں ڈسٹرکٹ جیل کے سامنے کھڑی ہوں۔ دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک موہوم سی شکل میری طرف بڑھتی ہے پاپا! کہتے ہوئے میں اس کی طرف دوڑتی ہوں" "آپ آگئے ہیں آپ آگئے ہیں" میں خیال کرتی تھی وہ آپ کو مار چکے ہیں لیکن آپ زندہ ہیں جونہی میں ان تک پہنچتی میری

آنکھیں کھل جاتیں اور یہ تلخ حقیقت میرے سامنے آجاتی کہ وہ تو جا چکے ہیں۔
کچھ تو کھاؤ "پنکی" تمہیں کچھ نہ کچھ کھانا چاہئے۔ میری والدہ زور دے کر کہتیں اور میرے لئے سوپ لاتیں۔ "جب ہم یہاں سے باہر جائیں گے تو انتخابات کی تیاری کے لئے تمہیں پوری توانائی کی ضرورت ہوگی" "اگر تم اپنے باپ کے اصولوں کی خاطر اپنی جدوجہد جاری رکھنا چاہتی ہو اور اسی طرح لڑنا ہے جس طرح تمہارے والد لڑے تو کھاؤ۔ کچھ ضرور کھاؤ"

تعزیت کے جو پیغامات ہمیں ملتے وہ میں پڑھنے کی پوری کوشش کرتی۔ میری ایک خاندانی دوست نے ۵ر اپریل کو لکھا "میری پیاری آنٹی اور بے نظیر! میرے پاس غم و اندوہ بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں پوری قوم اس موجودہ سانحہ کی ذمہ دار ہے ہم سب مجرم ہیں۔"

"ہر پاکستانی غم زدہ ہے مایوس ہے اور غیر محفوظ ہے ہم سب گنہگار ہیں اس گناہ میں ملوث ہیں۔"

اس دن راولپنڈی کے لیاقت باغ میں دس ہزار لوگ جمع ہوئے جہاں ڈیڑھ برس قبل میری والدہ کو سننے کے لئے ایک بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ یہ ہجوم پہلی انتخابی مہم کے موقع پر میرے مقید والد کی محبت میں جمع ہوا تھا۔ پی پی پی کے پر ہجوم جلسوں کو دیکھ کر ہی ضیاء نے انتخابات کو منسوخ کر دیا اور میرے والد کو موت کی سزا دی اب نماز جنازہ میں شریک میرے والد کے عقیدت مند ہجوم پر پولیس نے آنسو گیس پھینکی۔ لوگ بھاگے اور پولیس پر اینٹوں اور پتھروں کی بارش کر دی جس پر پولیس اپنی لاٹھیاں لے کر آگے بڑھی اور کچھ گرفتاریاں کیں۔ یاسمین، اس کی والدہ اور دو ہمشیروں نے نماز جنازہ میں شرکت کی اسی طرح میری ایک دوست آمنہ پراچہ جس نے سپریم کورٹ میں دائر میرے والد کے مقدمہ میں وکلاء کی امداد کی، اس کی دو بہنوں، بھتیجیوں اور ستر سالہ بوڑھی آیا نے بھی جنازے میں شرکت کی۔ تمام کی تمام دس خواتین کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ ان کے علاوہ سینکڑوں دوسرے افراد بھی دو ہفتوں کے لئے قید کر دیئے گئے۔

جلد ہی میرے والد کی موت کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہر طرف پھیل گئیں۔ پھانسی دینے والا جلاد پاگل ہو گیا ہے۔ میرے والد کی میت کو طیارے میں لے جانے والے پائلٹ کو جب پتہ چلا کہ میت کس کی ہے وہ اس قدر جذباتی ہو گیا کہ اس نے جہاز واپس زمین پر اتار لیا۔ اور ایک دوسرے پائلٹ کو طیارہ چلانے کے لئے بلانا پڑا۔ اخبارات میرے والد کے خاتمے کے بارے میں بہت سی دہشت ناک تفصیلات سے بھرے ہوئے تھے انہیں پھانسی سے قبل ہی اس قدر اذیت دی گئی کہ وہ تقریباً مردہ تھے جب انہیں سٹریچر پر ڈال کر تختہ دار تک لے جایا گیا۔ ایک اور بار بار دہرائی گئی تفصیل یہ تھی کہ ان کی کوٹھڑی میں تشدد کے ذریعے انہیں قتل کر دیا گیا تھا۔ فوجی افسران انہیں ایک اقبالی بیان پر دستخط کرنے پر مجبور کر رہے تھے، جس میں درج تھا کہ میرے والد نے اپنا تختہ الٹنے کی سازش کا خود ہی انتظام کیا تھا اور ضیاء کو ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کی خود ہی دعوت دی تھی۔ میرے والد نے فوجی حکومت کو قانونی جواز بخشنے کے جھوٹے کاغذات پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اسی ضمن میں ایک روایت یہ بھی تھی کہ ایک افسر نے میرے والد کو اس قدر شدید دھکا دیا تھا کہ وہ گر گئے۔ ان کا سر کوٹھڑی کی دیوار سے اس زور سے ٹکرایا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ اور دوبارہ ہوش میں نہ آسکے۔ ایک ڈاکٹر کو انہیں ہوش میں لانے کے لئے بلایا گیا جس نے دل کی مالش کی اور ہوش میں آنے کی ایک دوائی دی جس سے نذر محمد کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس نے ان کے گلے پر نشانات دیکھے تھے لیکن اب ان تمام باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔

تاہم میں اس کہانی کو حقیقت کے قریب سمجھتی ہوں کیونکہ میرے والد کے جسم پر پھانسی دیئے جانے کے نشانات واضح نہیں تھے۔ آخر انہیں پھانسی دیئے جانے کے مقررہ وقت سے تین گھنٹے پہلے رات کے دو بجے سوتے میں اچانک میری آنکھ کیوں کھل گئی تھی؟ ایک دوسرے سیاسی قیدی جنرل نصیر اللہ بابر نے مجھے بتایا کہ وہ بھی رات دو بجے ایک ٹھنڈی سی لہر محسوس کرنے کے بعد جاگ اٹھے تھے۔ اسی طرح متعدد دوسرے دوستوں اور سیاسی ہمدردوں کے ساتھ دنیا بھر میں ایسے ہی واقعات پیش آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے
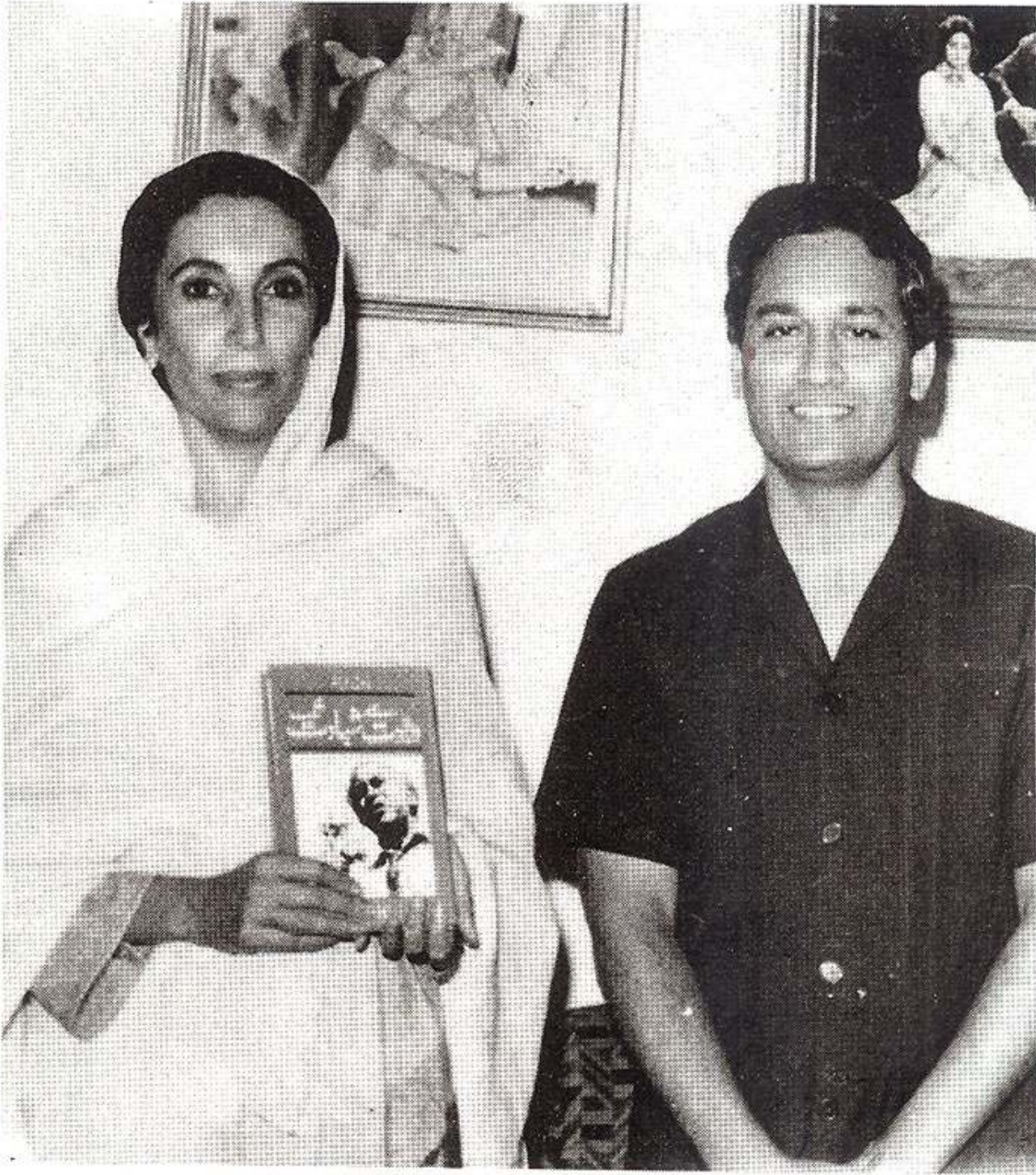
محترمہ بے نظیر بھٹو، جناب ذوالفقار علی بھٹو پر لکھی گئی کتاب "ذوالفقار علی بھٹو -- ولادت سے شہادت تک" کے مصنف سجاد بخاری کے ہمراہ

والد کی روح اپنے تمام بہی خواہوں کے پاس سے گزر کر گئی ہو گی۔ یہ افواہیں تواتر سے پھیلتی رہیں۔

میرے والد کے چچا زاد اور پیپلز پارٹی کے راہنما ممتاز علی بھٹو نے سہالہ میں تعزیت کے دوران مجھ پر زور دیا کہ میں والد کی نعش کو قبر سے نکلوا کر پوسٹ مارٹم کے لئے کہوں۔ اس سے ہمیں سیاسی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ سیاسی فائدہ؟۔ میرے والد فوت ہو چکے۔ قبر سے نعش کو باہر نکلوا کر وہ دوبارہ زندہ تو نہیں ہو سکتے۔

"انہوں نے میرے والد کو مارنے سے قبل ان کو موت کی کوٹھڑی میں کب زندہ رہنے دیا تھا" میں نے چچا ممتاز کو بتایا "اب وہ آزاد ہیں" اب انہیں امن میں رہنے دیں۔

"تم نہیں سمجھتیں کہ اس بات کی کیا تاریخی اہمیت ہے" چچا ممتاز کا اصرار تھا۔

میں نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ "تاریخ ان کی زندگی کا محاکمہ کرے گی۔ ان کی موت کی تفصیلات سے کوئی فرق نہیں پڑتا" میں نے کہا۔ "میں ان کی نعش کو نہیں نکلوانے دوں گی۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

میری والدہ کی بھانجی، فخری اور میری بچپن کی دوست سمیعہ وحید کو تعزیت کے لئے سہالہ آنے کی اجازت دیدی گئی انہیں یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ ہم شدید غم زدگی کے باوجود ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوئی تھیں۔ "ہماری شنید ہے کہ تم شدت غم سے مایوسی کے ایسے عالم میں گھری ہوئی تھیں، کہ خودکشی پر آمادہ ہو گئی تھیں" سمیعہ نے حکومت کی طرف سے پھیلائی گئی ایک افواہ کا ذکر کیا۔

فخری جو بہت جذباتی ہے میری والدہ سے لپٹ گئی اور انہیں تسلی دینے لگی۔ "نصرت جان! کاش میں مر جاتی اور مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا" وہ چلاتی ہوئی پکاری "لوگوں کا خیال ہے کہ پھانسی کا مستحق تو خود ضیاء ہے۔"

فخری میرے ساتھ بھی بغلگیر ہوئی اسی نے ہی ایک سال قبل والد کی سزائے موت کی خبر مجھے سنائی تھی۔ وہ بھی اس طرح کہ میں اپنے کراچی کے گھر میں زیر حراست تھی وہ پولیس کے پہرہ داروں سے بچتی بچاتی مجھ تک پہنچ گئی تھی۔ میں اپنے رہائشی کمرے میں بیٹھی ہوئی

تھی جب وہ اچانک سامنے کے دروازے کو زور سے کھول کر ڈیوڑھی کے ہال میں منہ کے بل گر گئی...... غم سے چلاتی ہوئی اور فرش پر اپنی پیشانی کو زور زور سے ٹکریں مارتی ہوئی۔ صرف نصف گھنٹے میں فوجی حکام فخری کی حراست کا احکام بھی تیار کر کے لے آئے جب کہ وہ اپنے تن بدن میں سیاسی نوعیت کا ایک ریشہ بھی نہیں رکھتی تھی۔ اور اپنے روز و شب برج اور ماہ جونگ کے کھیل میں گزارتی تھی۔ اسے اگلے ہفتے کے لئے میرے ساتھ ہی قید کر دیا گیا اور وہ اپنے شوہر اور بچوں کے پاس واپس نہ جا سکی۔

اب ہم دونوں مل کر روئیں۔ "سینکڑوں لوگ" اس نے ہمیں بتایا کہ فیکٹری کارکن، ٹیکسی ڈرائیور، اور عامتہ الناس موت کے تیسرے روز مذہبی رسم "سوئم" کی تیاری کے لئے کراچی میں ہمارے گھر کے باغ میں جمع ہو رہے تھے ہر شب ہفتوں تک خواتین قرآن پاک سروں پر اٹھائے میرے والد کے لئے دعائیں مانگنے کو بسوں میں بھری ہوئی آتی رہیں۔

"فوجی وردی جو ہمیشہ قومی تفاخر کا ایک ذریعہ رہی اب استہزاء کی علامت بن گئی" فخری نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ کراچی سے پی آئی اے کے طیارے میں سفر کرتے وقت اس نے اور سمیعہ نے فوجی وردی میں ملبوس کسی بھی آدمی کے قریب بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ "قاتل" وہ دونوں چیخ پڑیں۔ باقی ماندہ مسافروں نے ان کے سامنے احترام میں اپنے سر جھکائے جو اظہار افسوس کر رہے تھے کوئی دوسرا ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لایا۔ ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہم نے والد کی قبر پر سوئم کے لئے حاضری دینے کی حکام کو درخواست دی تھی۔ ۷ / اپریل کو صبح سات بجے پیغام ملا کہ پانچ منٹ میں تیار ہو جائیں۔ ہمارے پاس نوحہ خوانی کے لئے پہننے کو سیاہ کپڑے نہیں تھے۔ اور ہمیں اسی لباس میں جو ہم قید خانے میں لے کر آئی تھیں جانا پڑا۔ "جلدی کرو، جلدی کرو، ایک مارشل لاء افسر اصرار کرتا رہا کچھ دیر بعد ہم کار میں ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ وہ ہمیں ہر کام میں ہمیشہ جلد بازی کرنے پر مصر رہتے۔ اس خطرہ کے پیش نظر، مبادا لوگوں کی نظر ان پر پڑ جائے اور وہ ہاتھ ہلا ہلا کر ہمارے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کریں یا کسی طریقہ سے اپنی

ہمدردی ہمارے لئے ظاہر کریں اور نتیجتاً مارشل لاء سے انکی نفرت ظاہر ہو۔ ''

لیکن تمام فوجی احباب غیر انسانی مشینوں میں تبدیل نہیں ہوئے تھے۔ جب ہم ائیر پورٹ پر پہنچیں فوجی جہاز کے عملہ کے افراد سر نیچے کئے گارڈ آف آنر کی شکل میں ایستادہ تھے۔ جب والدہ کار سے باہر آئیں انہوں نے سیلوٹ کیا۔ یہ اس شخص کی بیوہ کے لئے توقیر کی علامت تھی جو ہندوستان کے کیمپوں سے ۹۰ ہزار سے زائد جوانوں کو آزادی دلا کر پاکستان صحیح سلامت واپس لایا تھا ہر ایک تو اس بات کو بھلا نہیں بیٹھا تھا۔ پرواز کے دوران انہوں نے چائے، کافی اور سینڈوچ پیش کئے۔ ان کے چہروں سے صدمے اور غم کا واضح اظہار ہوتا تھا۔ چند افراد کا جرم اکثریت کے ضمیر کا احساس جرم بن گیا تھا۔ طیارہ موہنجو ڈارو کے ہوائی اڈے پر نہیں اتارا گیا جو گڑھی خدا بخش سے نزدیکی فاصلے پر تھا بلکہ جیکب آباد ایئرپورٹ پر جو تقریباً ایک گھنٹے کے سفری فاصلے پر تھا اتارا گیا مقامی فوجی حکام نے ہوائی اڈے سے گاؤں کو جانے والا سیدھا راستہ جو میرے والد نے تعمیر کرایا تھا اختیار نہیں کیا بلکہ کار سڑکوں پر اچھلتی، رینگتی، بل کھاتی ہوئی کچی گلیوں میں سے گھومتی ہوئی گزری۔ ڈرائیور سیدھے راستے سے ہٹ کر جارہا تھا تاکہ مکانوں کے دبیز پردوں میں سے بھی کوئی نہ جھانک لے اور ہمیں پہچان لے۔ ہم جب خدا خدا کر کے خاندانی قبرستان کے دروازے تک پہنچیں تو گرد اور پسینے سے شرابور ہوچکی تھیں۔

میں تنگ ڈیوڑھی میں سے آگے بڑھی تو ایک فوجی افسر میرے پیچھے آیا۔ میں وہیں کھڑی ہوگئی۔

''ہمیں حکم ملا ہے کہ آپ کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں'' اس نے بتایا۔

''میں تمہیں اندر آنے کی اور اس جگہ کے تقدس کو پامال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ ''

میں نے اسے کہا '' تم نے میرے والد کو قتل کیا ہے تم ہی اس کو یہاں لائے ہو۔ اگر ہم اب اس کے لئے رواور چلا رہے ہیں تو ہمیں تنہائی میں یہ کام کرنے دو۔ ''
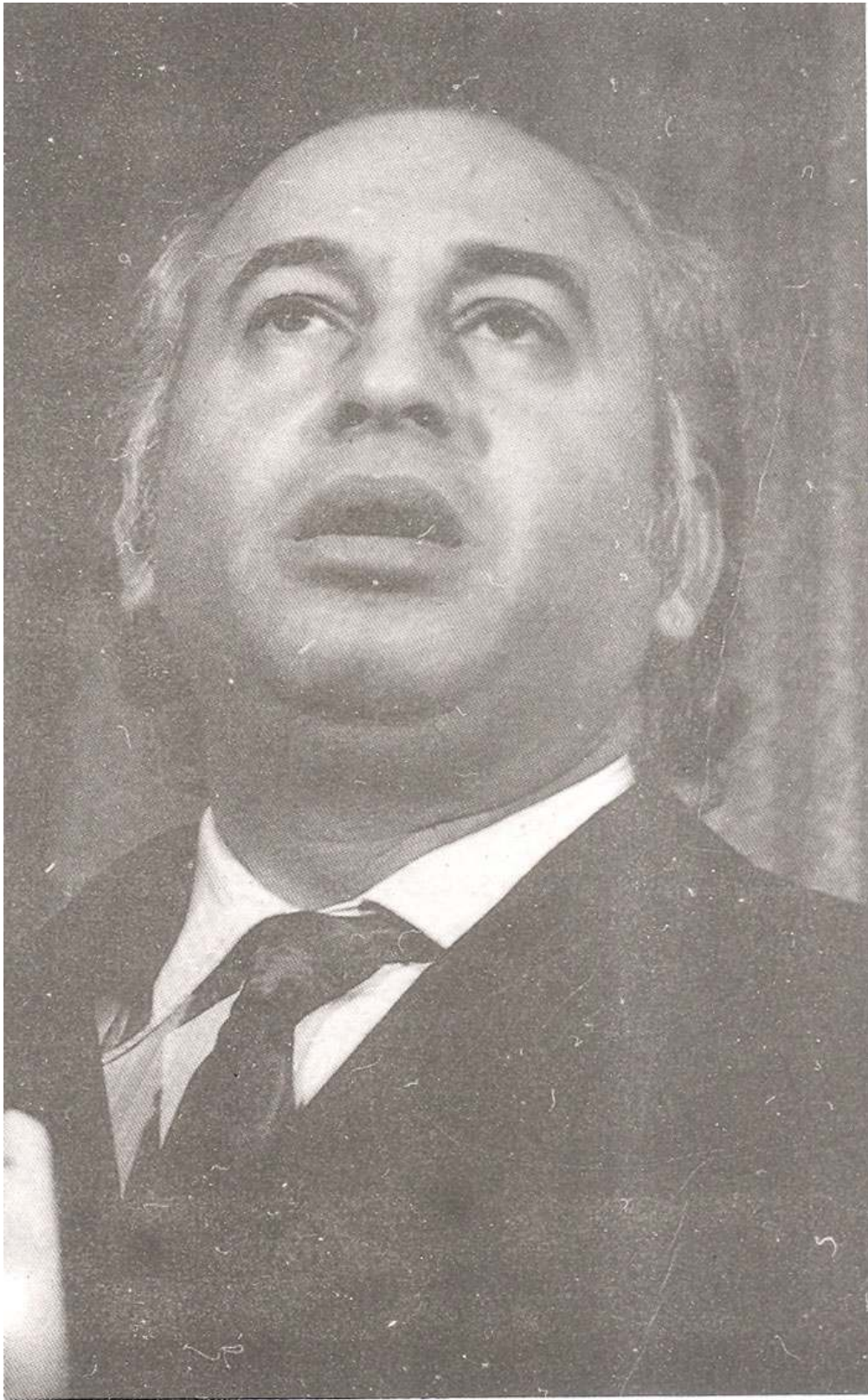
ستمگروں کے ستم کے آگے نہ سر جھکا ہے نہ جھک سکے گا
ہے کس کی گردن پر خون ناحق یہ فیصلہ اوگ ہی کریں گے

ہمیں حکم ہے کہ ہم ہر وقت آپ کے ساتھ رہیں" اس نے اصرار کیا۔

"تب ہم قبر کی زیارت نہیں کریں گی۔ ہمیں واپس لے چلو" میری والدہ نے واپس کار کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا اور ہم دیوار دار قبرستان میں داخل ہو گئیں۔ تقدس کی علامت کے طور پر ہم نے اپنے جوتے باہر ہی اتار دیئے۔ ہمیں ماحول کس قدر پرسکون محسوس ہوا اور کس قدر مانوس۔ بھٹو خاندان کے آباؤ اجداد نسل در نسل وہاں لیٹے ہوئے تھے۔ میرے دادا سر شاہنواز خاں بھٹو، ریاست جونا گڑھ کے سابق وزیر اعظم جنہیں ہندوستان کی تقسیم سے قبل بمبئی پریزیڈنسی میں خدمات کے عوض حکومت برطانیہ نے "سر" کا خطاب دیا تھا۔ ان کی بیوی خورشید بیگم، میرے چچا سکندر بھٹو اور ان کے بھائی امداد علی جن کی شخصیت ایک حکائت بن گئی تھی وہ اتنے خوبصورت تھے کہ کہا جاتا ہے کہ جب وہ ایلفنسٹن سٹریٹ میں سے اپنی بگھی پر گزرتے جو کراچی کا عظیم خرید و فروخت کا مرکز ہے تو انگریز عورتیں ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اپنی دو کانوں سے باہر آ جاتی تھیں۔ دوسرے متعدد رشتے دار بھی وہیں آسودہ خاک تھے۔ یہ وہ زمین تھی جہاں ہماری پیدائش ہوئی اور جہاں مرنے کے بعد ہماری مراجعت ہوگی۔

میرے والد اس سرزمین پر مجھے اس وقت لائے جب میں ۱۹۶۹ء میں پاکستان سے ہارورڈ یونیورسٹی میں داخل ہونے کے لئے جانے والی تھی۔ "تم دور دراز جگہ پر امریکہ میں جا رہی ہو" میرے والد نے یہ بات اس وقت کہی جب ہم اپنے آبائی قبرستان میں کھڑے تھے۔ "تم متعدد حیرت انگیز چیزیں دیکھو گی اور ایسی ایسی جگہوں تک سفر کرو گی جو تم نے پہلے کبھی سنی تک نہیں۔ لیکن یاد رکھو کہ زندگی میں جن واقعات سے بھی واسطہ پڑے آخر کار تمہیں واپس یہیں آنا ہے تمہاری جگہ یہی ہے۔ تمہاری جڑیں یہاں ہیں۔ لاڑکانہ کی مٹی، گرد اور گرمی تمہاری ہڈیوں میں موجودہ ہے۔ اور یہی جگہ ہے جہاں تمہیں دفن بھی ہونا ہے۔"

اپنے اشکوں کے درمیان میں ان کی قبر تلاش کر رہی تھی۔ مجھے مطلقاً علم نہیں تھا کہ انہوں نے انہیں کہاں دفن کیا تھا۔ میں نے جب ان کی قبر دیکھی تو وہ میری پہچان سے باہر

تھی۔ وہ فقط کیچڑ کا ایک ڈھیر تھی کچی مٹی کا کیچڑ جس پر پھولوں کی پتیاں چھڑکی ہوئی تھیں می اور میں قبر کے پاؤں کی طرف بیٹھ گئیں مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے والد یہاں مدفون ہیں۔ میں فرط غم میں وہیں گر گئی اور کیچڑ کے اس حصے کو چوما جہاں میں نے تصور میں ان کے پاؤں دیکھے۔

"مجھے معاف کر دیجئے، پاپا! اگر میری وجہ سے آپ کو کوئی دکھ پہنچا ہو" میں نے آہستہ سے پکارا۔

تنہا میں نے اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا۔ سب بچوں کی طرح میں اپنے والد کی ہمیشگی کا ایک تصور رکھتی تھی۔ اب جبکہ میں انہیں کھو چکی تھی میں نے ایک خلاء محسوس کیا جسے کبھی بھرا نہ جاسکتا تھا۔ لیکن میں روئی نہیں کیونکہ بطور مسلمان میرا یقین تھا کہ آنسو روح کو زمین کی طرف واپس لے آتے ہیں اور اس کی آزادی سلب کر لیتے ہیں۔

میرے والد نے اپنی آزادی بزور حاصل کی تھی اور اپنے سکون کے لئے بہت بڑی قیمت ادا کی تھی ان کا ابتلاء ختم ہو چکا تھا۔ "سب عزّو شان اسی ایک ذات کے لئے ہے جو تمام اشیاء پر قدرت رکھتا ہے" میں نے قرآن پاک کی سورہ یٰسین سے اس آیت کی تلاوت کی۔ "اسی کی طرف تم سب لوٹ جاؤ گے"۔

میرے والد کی روح جنت میں اللہ کے پاس تھی۔

فوجی حکام پھر ہمیں ایک مختلف اور تکلیف دہ راستے پر سے ایئرپورٹ واپس لے گئے لیکن وہی طیارے کا عملہ دوبارہ لائن میں سیدھا کھڑا تھا تاہم سہالہ جانے پر ہماری تلاشی کے دستور میں کوئی فرق نہیں پڑا اور نہ ہی ان کمروں کی غلاظت میں جہاں ہمیں جانے سے پہلے ٹھہرایا گیا تھا۔ تاہم امن اور ایک نئے یقین کا احساس مجھ پر چھا گیا تھا۔ "چیلنج کا مقابلہ کرو، مسلط کردہ ہر بگاڑ کے خلاف لڑو۔ دشمن پر غلبہ حاصل کرو" بچپن میں میرے والد جو قصے کہانیاں سناتے رہے ان میں سچائی کو برائی پر ہمیشہ فتح نصیب ہوئی۔

"آیا تم موقع کو بروقت جھپٹ لیتی ہو یا اسے ہاتھوں سے پھسل جانے دیتی ہو۔ آیا تم جلد باز ہو یا سوچ بچار کرنے والی۔ آیا تم مضبوط اعصاب کی مالک ہو یا بزدل۔ یہ انتخاب تمہارا

اپنا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ اپنی تقدیر کی تشکیل تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے"۔

اب ایک دہشت پورے پاکستان پر محیط تھی میرے والد کا مطمح نظر میرا اپنا مطمح نظر بن گیا تھا میں نے اس وقت بھی یہی محسوس کیا تھا جب میں ان کی قبر کے سرہانے کھڑی تھی۔ ان کی روح کا اعتماد اور قوت مجھ میں سرایت کر گئی تھی۔ اسی لمحے میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پاکستان میں جمہوریت آنے تک چین سے نہیں بیٹھوں گی۔ میں نے پختہ وعدہ کیا کہ امید کی جو شمع میرے والد نے جلائی ہے اسے ہمیشہ تاباں اور زندہ رکھونگی۔ میرے والد پاکستان کے وہ پہلے راہنما تھے جو تمام طبقات کی نمائندگی کرتے تھے وہ صرف فوج یا اشراف ہی کے نمائندہ نہ تھے بلکہ وہ پاکستان کے کروڑوں غریب عوام کے نجات دھندہ بھی تھے اب یہ ہم پر تھا کہ ہم ان کی جدوجہد کو جاری رکھیں۔

جب میری والدہ اور مجھے والد کے سوئم کے بعد سہالہ واپس لیجایا جارہا تھا، سپاہی ان سینکڑوں افراد پر آنسو گیس پھینک رہے تھے جو ۷۰ کلفٹن کے باغ میں میرے والد کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے جوق در جوق جمع ہو رہے تھے۔ آنسو گیس کے گولوں کی شدت اس قدر تھی کہ صحن میں لگائے گئے شامیانے کو آگ لگ گئی ہاتھوں میں قرآن کریم پکڑے ہوئے غم زدہ لوگ اپنی رندھی ہوئی آوازوں کے ساتھ وہاں سے بکھر گئے۔

باب - ۲

عہد اسیری

اپنے ہی گھر میں نظر بند

میرے والد کی شہادت کے سات ہفتے بعد، میری والدہ اور مجھے مئی ۱۹۷۹ء کے اواخر میں سہالہ سے رہا کر دیا گیا۔ ہم کراچی میں اپنے خاندانی گھر ۷۰ - کلفٹن میں واپس آ گئیں۔

ہر چیز معمول کے مطابق تھی لیکن پھر بھی کچھ بھی معمول کے مطابق نہیں تھا۔ ۷۰ - کلفٹن کے دروازے پر "ذوالفقار علی بھٹو، بار ایٹ لاء" کی کانسی سے بنی ہوئی نام کی تختی آویزاں تھی۔ اس کے اوپر ایک اور کانسی کی تختی تھی جس پر میرے دادا کا نام "سر شاہنواز بھٹو" کندہ کیا ہوا تھا۔ مگر ایک مدت گزر جانے کے باعث مدھم پڑ چکا تھا۔ میری دادی اماں نے ۱۹۵۳ء میں میری پیدائش کے جلد ہی بعد یہ وسیع و عریض دو منزلہ بنگلہ تعمیر کروایا تھا۔ میرے بھائی، بہن اور میں اسی بنگلہ میں ایک میل کے چوتھائی فاصلے کی دوری پر بحیرہ عرب کی ٹھنڈی ہواؤں کے جلو میں جوان ہوئے تھے۔ کون اس المیے اور تشدد کا تصور کر سکتا تھا جو اس پرسکون خاندان کے گھر پر ٹوٹ پڑا تھا۔

ہر روز نوحہ خوانی کرتے ہوئے سینکڑوں لوگ کراچی کے صحرا سے ہمارے گھر کے ناریلوں، آموں اور سرخ و زرد پھولوں سے لدے درختوں کے باغ میں ہمیں دلاسہ دینے کے لئے آجاتے۔ سینکڑوں مزید افراد اپنے راہنما کے خاندان سے تعزیت کرنے کے لئے دور دراز علاقوں سے آکر باہر صبح سے انتظار کرتے۔ میری والدہ ابھی عدت میں تھیں اور غیروں کا استقبال نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ مجھے ان لوگوں کے استقبال کے لئے باہر بھیج دیتیں۔

گھر میں ہونے کی انسیت ہماری دہشت میں کسی تخفیف کا باعث نہ بن سکی۔ ہمارے گھر کے عملہ نے ہمیں بتایا۔ "میرے والد کو پھانسی دیئے جانے سے دو راتیں قبل" "۷۰ کلفٹن پر دوبارہ چھاپہ مارا گیا، حکومتی اہلکار چھت اور باغ کی تلاشی لیتے رہے، میری والدہ کی الماری اور میرے والد کے ملبوسات کی الماری کی تلاشی لیتے رہے" کیا تمہارے پاس تلاشی کا وارنٹ ہے۔ گھر کے عملہ میں سے ایک نے استفسار کیا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ شہری قانون میں وارنٹ کے بغیر تلاشی ممنوع ہے۔ "میں خود تلاشی لینے والی پارٹی کے ہمراہ ہوں اس لئے کسی وارنٹ کی ضرورت نہیں" ایک فوجی افسر نے جو پولیس لے کر آیا تھا، دعویٰ کیا۔ دس گھنٹے تک انہوں نے گھر کی ہر چیز تہس نہس کر دی، جاتے ہوئے وہ میرے بیڈ روم سے میرے ذاتی خطوط اور دو سیاہ رنگ کے بریف کیس جن میں بنک کے کاغذات اور کچھ چیک تھے ساتھ لے گئے۔ اور ان میں وہ ثبوت بھی تھے جو میں نے اپنے والد کے خلاف بد عنوانی کے جعلی الزامات کے استرداد میں اکٹھے کئے تھے۔

"یہاں خفیہ الماریاں اور دیگر راستے بھی ہیں وہ ہمیں دکھاؤ" فوجی افسر نے عملے کو حکم دیا۔ پھر ان کو اس بنا پر پیٹا کہ ان کا جواب نفی میں تھا۔ جب تلاشی ختم ہو گئی تو گھر کے ملازمین کو استقبالیہ کے کمرے میں لے گئے اور وہاں انہیں مقفل کر دیا۔ جب صبح سویرے دودھ دینے والا آیا تو اسے بھی ان کے ساتھ قید کر دیا۔ یہی حادثہ اخباری ایجنٹ کے ساتھ پیش آیا۔ فوجی افسران مایوس اور جذباتی ہو رہے تھے۔ "اس کاغذ پر دستخط کرو" ایک افسر نے عملہ کے ایک ملازم کو حکم دیا۔ اس نے انکار کر دیا۔ افسر نے اسے دھمکی دی

"تمہیں علم ہے کہ تمارے صاحب کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے؟" "اگر تم دستخط نہیں کرتے تو تصور کرو تمہارے ساتھ کیا سلوک ہو گا" وہ ملازم اس قدر خوفزدہ ہوا کہ اس نے دستخط کر دیئے۔

جب تلاشی کا کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا ایک ٹرک دروازے میں سے اندر داخل ہوا۔ فوجی سپاہیوں نے ایک سرخ قالین بچھا دیا اس پر مختلف دستاویزات بکھیر دیں جو ٹرک ہی سے بر آمد ہوئیں اس کے بعد پریس کے رپورٹرز کو بلا لیا گیا تاکہ میرے والد کے خلاف "نئے ثبوت" کی تصاویر کھینچ لی جائیں۔

متعدد لوگوں کا خیال ہے کہ سپریم کورٹ کی متفقہ سفارش کی وجہ سے کہ میرے والد کی سزائے موت کو تا حیات قید میں بدل دیا جائے گا۔ حکومت کی طرف سے ان کے خلاف ایک اور مقدمہ بنانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ اس دوران اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں جب سہ پہر کے بعد چھاپہ مار پارٹی وہاں سے روانہ ہوئی تو وہ اپنا "ثبوت" بھی اپنے ساتھ لے گئی اور ہماری بہت سی ذاتی ملکیتی اشیاء بھی جن میں میرے والد کے قدیم یادگاری نقشوں کا ایک مجموعہ بھی تھا۔

۷۰ – کلفٹن میں اب میں لاڑکانہ جانے کی تیاریاں شروع کر دیتی ہوں۔ تاکہ اپنے والد کے مزار پر حاضری دے سکوں۔ حکومت کو میرے لائحہ عمل کا علم ہو جاتا ہے۔ اور ہوائی جہاز کی مقررہ پروازیں منسوخ کر دی جاتی ہیں۔ میں ٹرین کا سفر اختیار کرتی ہوں۔ ہر اسٹیشن پر لوگوں کا زبردست ہجوم میرا استقبال کرتا ہے۔ جہاں اسٹیشن موجود نہیں وہاں لوگ ریلوے لائن پر ٹرین کو رکوانے کے لئے لیٹ جاتے ہیں۔ "انتقام انتقام" لوگوں کا انبوہ پکار اٹھتا ہے۔ "ہمیں ضیاء کو انتخابات میں شکست دینے کے لئے اپنے غم کو قوت میں تبدیل کرنا ہے" لوگوں کے عظیم اجتماع سے حوصلہ پکڑتے ہوئے میں انہیں کہتی ہوں۔ لوگوں کا یہ زبردست ہجوم ہی ہمارے سیاسی مخالفوں کے پراپیگنڈہ کا بہترین جواب ہے جو اعلانیہ کہتے پھرتے تھے کہ "بھٹو کی عوامی قوت کو اور اس کے ساتھ ہی پاکستان پیپلز پارٹی کو ہم نے اس کی قبر میں دفن کر دیا ہے"۔

کراچی میں لاڑکانہ روانہ ہونے سے قبل، میں ہر دس منٹ کے وقفہ سے صبح ۹ بجے سے رات ۹ بجے تک پی پی پی کے راہنماؤں اور معاونین سے ملاقات کرتی تھی۔ ہرچند گھنٹوں بعد میں ملاقاتیوں سے اجازت لے کر باغ میں بیٹھے ہوئے تعزیت کنند گان سے بھی جا کر ملتی تھی۔ ان کی آنکھیں مجھے دیکھتے ہی چمک اٹھتی تھیں۔ اور اسی طرح میری والدہ کی عدت کے بعد انہیں اور مجھے ملتے ہی شروع شروع میں عام لوگوں کا خیال تھا کہ ہم بھٹو صاحب کی شہادت کے صدمہ کے بعد یا عہد حراست سے جانبر نہیں ہو سکیں گی۔ کیونکہ ہم نے ان کی سخت زندگی کے مقابلے میں زیادہ آرام دہ اور پر آسائش زندگی گزاری تھی۔ لیکن ہمیں بنفس نفیس اپنے درمیان دیکھ کر ان کی آنکھیں نئی امید سے روشن ہوجاتی تھیں۔ ایک گروہ باغ سے باہر جاتا تو ایک نیا گروہ داخل ہو جاتا، بوقت شب میں پارٹی کے اہم انتظامی و پالیسی امور اور سیاسی اسیران کے معاملات پر اپنی والدہ کے مطالعہ کے لئے بریف تیار کرتی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنا کام مکمل نہیں کر سکوں گی اور شاید نہ کر سکتی اگر مجھے اپنی سکول کی دوست سمیعہ اور اسی طرح آمنہ اور یاسمین کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔ نوجوان آمنہ اور یاسمین والد کی سزائے موت کے خلاف اپیل کا مقدمہ لڑتے ہوئے میری دوست اور معاون رہیں۔ مغربی پریس نے سمیعہ، آمنہ اور یاسمین کو "چارلی کے فرشتے" کا لقب دیا۔ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ اس قدر بوجھ تلے حقیقی چارلی کے فرشتے بھی دم توڑ جاتے۔

میرے والد کی موت کے پروانے پر دستخط کرنے سے پہلے جنرل ضیاء نے عوام الناس کو خاموش رکھنے کے لئے انتخابات کے وعدے کا اعلان کر دیا اور تاثر دیا کہ اس طرح ملک فوجی آمریت سے جمہوری حکومت کی سمت روانہ ہو گا۔ لیکن کیا وہ پی پی پی کے جیت جانے کا جواء کھیل سکتا تھا۔ اس نے بر ملا یہ اعلان کیا تھا کہ کسی صورت حکومت ان لوگوں کے حوالے نہیں کرے گا جن سے اس نے چھینی تھی۔ اور صرف مثبت نتائج والے انتخابات ہی اسے منظور ہوں گے۔ ضیاء اس مشکل میں پہلے بھی پھنسا تھا جب اس نے ۱۹۷۷ء میں میرے والد کا تختہ الٹنے کے بعد انتخابات کے جلد انعقاد کا اعلان کر دیا تھا۔ جب اسے پی پی پی کی جیت کا انتخابات میں یقین ہو گیا تو اس نے انتخابات منسوخ کر دیئے اور پارٹی کے
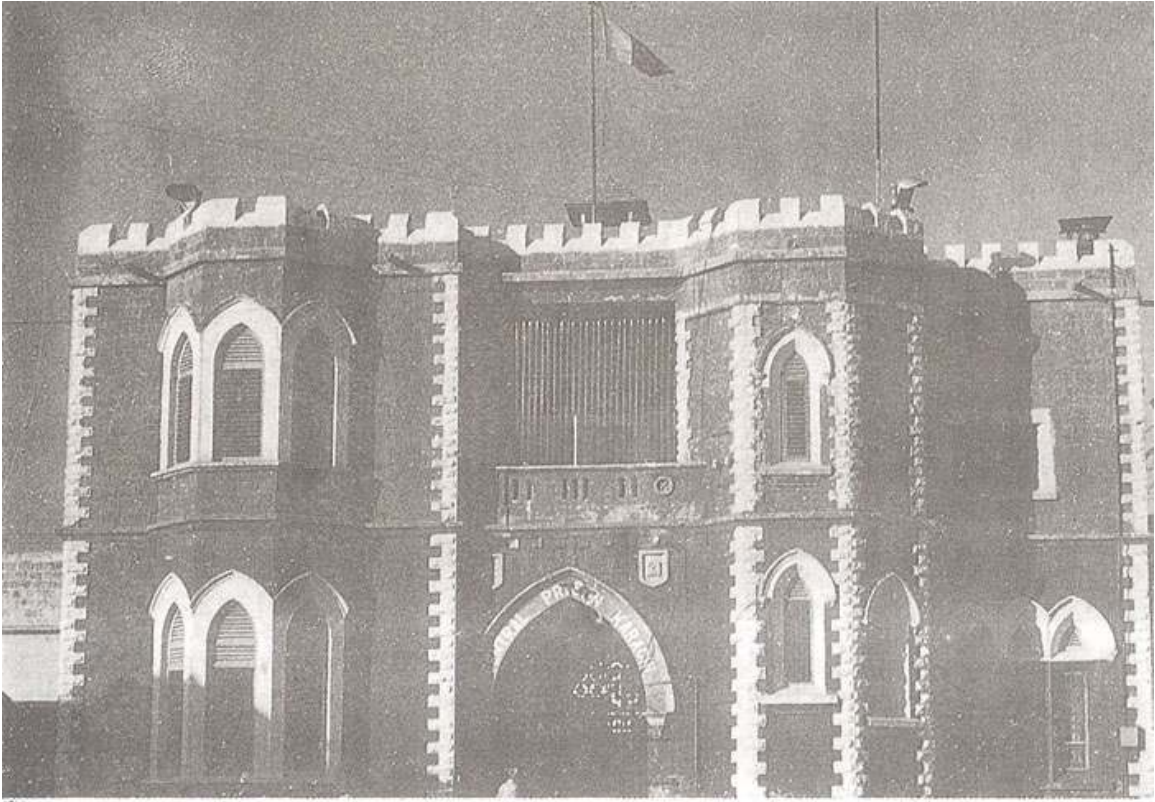
سنٹرل جیل کراچی' جہاں محترمہ بے نظیر بھٹو نے قید و بند کے بیشتر سال گزارے

راہنماؤں کو حراست میں لے لیا۔ اب اسے کیا کرنا چاہیئے ؟

بلدیاتی انتخابات پہلے آتے ہیں یعنی ستمبر کے مہینے میں پی پی پی ہر جگہ جیت جاتی ہے۔ اب قومی انتخابات کی باری ہے۔ ضیاء کو اپنی حکومت کے قانونی جواز کے لئے جیتنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ حکومت قانون کو پی پی پی کے خلاف ہر طرح استعمال کرے گی، ہماری پارٹی کے رہنما ٧٠ کلفٹن میں اس مباحثہ کے لئے جمع ہوتے ہیں کہ آیا قومی انتخابات میں حصہ لیا جائے یا ان کا بائیکاٹ کیا جائے۔ "انتخابی میدان کو خالی نہیں چھوڑنا چاہیئے" میں دلیل دیتی ہوں کیونکہ میرے والد نے مجھے ایک دفعہ یہی سمجھایا تھا۔ "خواہ زبردست مشکلات کا سامنا ہو خواہ قوانین کو مرضی کے مطابق مروڑا گیا ہو" ہمیشہ مقابلے کی تیاری کرو" قوانین کو یقیناً مرضی کے مطابق مروڑا گیا ہے۔ ہماری توقع کے عین مطابق پی پی پی کے انتخابات میں حصہ لینے کے اعلان پر ضیاء قوانین کو بدل دیتا ہے۔ "اپنی پارٹی کو سیاسی جماعت کے طور پر رجسٹر کراؤ ورنہ شرکت کی اجازت نہیں ملے گی" حکومت ہمیں اطلاع دیتی ہے۔ ہم انکار کر دیتے ہیں۔ رجسٹر کرانے کا مطلب ہے کہ ہم ضیاء کی حکومت کو قانونی مانتے ہیں۔

"ہم آزاد امیدوار کھڑا کریں گے" ہم فیصلہ کرتے ہیں۔ اگرچہ ہمیں یہ بھی فہم ہے کہ بیلٹ پیپر پر پارٹی نشان کے بغیر ہم ایک بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں، کیونکہ ہمارے معاشرے میں خواندگی کی شرح سرکاری طور پر ٢٧ فیصد ہے مگر حقیقی شرح ٨ فیصد ہے۔

حکومت شرائط لگا دیتی ہے "آزاد امیدواروں کو جیتنے کے لئے ووٹوں کا ٥١ فیصد حصول لازمی ہو گا" یہ نئے قوانین ہیں۔

"اچھا تو ایسے ہی سہی ہم حصہ لیں گے" یہ ہمارا فیصلہ ہے۔

لیکن ١٥ر اکتوبر ١٩٧٩ء کو انتخابات کی مقررہ تاریخ سے ایک ماہ قبل پی پی پی اپنے اعلیٰ کارکنوں کی درخواست پر اپنا اجلاس منعقد کرتی ہے۔ انتخابات میں شرکت کا سوال دوبارہ پیش کیا جاتا ہے۔ اور پارٹی اس سوال پر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ٧٠ کلفٹن کے حجرۂ طعام میں جہاں کانفرنس کا انعقاد جاری ہے متعدد کارکن میری والدہ پر زور دیتے ہیں کہ

بائیکاٹ کریں۔ "بائیکاٹ، بائیکاٹ" ان کا نعرہ بن جاتا ہے۔ بعض کارکن مجھے علم ہے، تنہائی میں مجھے "بیوقوف چھوٹی لڑکی" کہہ کر پکارتے ہیں۔ لیکن میں دوبارہ بولتی ہوں۔ "قوانین کو متواتر تبدیل کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضیاء اپنا اعتماد کھو چکا ہے" "ہمیں اپنا اعتماد برقرار رکھنا ہے ہم نے بلدیاتی انتخابات جیتے ہیں اور ہم عام انتخابات بھی جیت جائیں گے" کافی رات گئے پی پی پی بہت تھوڑے مارجن سے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر پاتی ہے۔ جب اگلے دن ضیاء کو ہمارے فیصلے کی اطلاع ملتی ہے اس کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔ مارشل لاء کا منتظم اعلیٰ ۱۹۷۷ء کا طریقہ واردات اپناتا ہے۔ انتخابات یکسر منسوخ کر دیئے جاتے ہیں اور فوجی سپاہیوں کو ۷۰ کلفٹن کے محاصرہ کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ گھر کے عملے کا ایک فرد نصف شب کے قریب مجھے محاصرہ کی اطلاع دیتا ہے۔ جلد ہی میں اپنے تمام سیاسی کاغذات کا پلندہ، پارٹی مسودات، رکنیت کی فہرستیں، خطوط، جیل میں نظر بند اراکین کی فہرستیں وغیرہ، غسل خانے میں پھینک کر ان کو جلا دیتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ حکومت کو آسانی سے گرفتاری کے لئے یہ فہرستیں دستیاب ہو جائیں۔ چند منٹ بعد فوجی سپاہی گھر میں داخل ہوتے ہیں میری والدہ اور مجھے بندوق کی نوک پر ہمارے دیہات کے گھر "المرتضیٰ" میں لے جاتے ہیں جہاں ہمیں آئندہ چھ ماہ کے لئے نظر بند رکھا جائے گا۔

المرتضیٰ کی زیر حراست ماحول میں، میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتی ہوں اگرچہ جنرل ضیاء کی سازش کے تحت اقتدار کے قبضہ کر لینے کے وقت سے یعنی دو سال قبل سے میری والدہ کی یہ نویں اور میری ساتویں نظر بندی ہے۔ میں اس جبری تنہائی کو برداشت نہیں کر پارہی۔ ہر اذیت پر میرے دل میں غصے کی ایک لہر کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ شاید ۲۶ سالہ ہونے کی وجہ سے یہ میری عمر کا تقاضا ہے۔ لیکن میری سوچ ہے کہ کسی بھی عمر میں المرتضیٰ میں نظر بندی پر شاید میرے خیالات مختلف نہیں ہوں گے۔

المرتضیٰ ہمارے خاندان کے دل کی حیثیت رکھتا ہے جہاں ہم چہار دانگ عالم سے ہمیشہ واپس آجاتے تھے خواہ ہمیں موسم سرما کی تعطیلات کاٹنی ہوں۔ ماہ رمضان کے خاتمہ پر عید

ہمارے متعدد رشتے داروں میں سے کسی کی مرگ پر تعزیت کرنا ہو اب حکومت نے اسی منانی ہو..... والد کی سالگرہ کا دن ہو..... خاندانی شادیاں ہوں یا زمینوں پر رہائش پذیر المرتضیٰ کو میری والدہ اور میرے لئے (قید خانے) سب جیل کا درجہ دیدیا ہے۔

مغربی پریس کو بتایا گیا ہے کہ حکومت نے ہمیں گھر پر نظر بند کر رکھا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے پاکستان میں گھر کی نظر بندی کا مطلب سرکاری نظر بندی سے مختلف ہے۔ نظر بند شخص کو دوست احباب سے ملاقات کی اجازت ہوتی ہے۔ پریس کو انٹرویو دیئے جا سکتے ہیں۔ مقامی اور طویل فاصلے کی ٹیلی فون کالوں کی اجازت ہوتی ہے کتابیں لائی جا سکتی ہیں بعض اوقات تھوڑے سے فاصلے تک گاڑی بھی چلا سکتے ہیں۔ اور گھر سے باہر میٹنگ میں بھی جا سکتے ہیں۔ المرتضیٰ کو سب جیل قرار دیئے جانے پر اسے قید خانہ قرار دیدیا گیا ہے۔ جہاں جیل کے قوانین کے ضابطہ پر عمل در آمد ہوتا ہے۔ ہمارا ٹیلی فون کاٹ دیا گیا ہے میری والدہ اور مجھے گھر کے صحن میں نظر بند کر دیا گیا ہے۔ سوائے صنم کے کسی دوست اور احباب کو ملنے کی مطلق اجازت نہیں۔ گھر کو اندر اور باہر سے شمال مغربی سرحدی صوبہ کے قبائلی پٹھانوں پر مشتمل فرنٹیر فورس کے سپاہیوں نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ میرے والد کی حکومت کے زمانہ میں المرتضیٰ پر خصوصی کمانڈو فورس اس لئے متعین تھی کہ غیر آدمی اندر نہ داخل ہو سکیں۔ فرنٹیر فورس اب صرف اس مقصد کے حصول کے لئے متعین کی گئی تھی تاکہ اس کی بیوہ اور بیٹی کو اندر سے باہر نہ جانے دیا جا سکے۔ ضیاء کی خواہش ہے کہ ملک اور باہر کی دنیا بالکل بھول جائے کہ بھٹو نام کے خاندان کا کوئی وجود بھی ہے۔

پاکستان میں اخبارات شاذونادر ہی ہمارے نام چھاپنے کی جرات کرتے ہیں۔ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۷۹ء جب ضیاء نے دوسری مرتبہ انتخابات کے انعقاد کو منسوخ کیا اور میری والدہ اور مجھے نظر بند کیا۔ مارشل قوانین کی ضخیم فہرست میں پریس پر مکمل سنسر شپ نافذ کر کے ایک اور قانون کا اضافہ کر دیا۔ مارشل لاء حکم نمبر۴۹ کے مطابق کسی جریدے کا مدیر جو پاکستان کی سلامتی، یکجہتی اور خود مختاری کے خلاف یا اخلاقیات اور امن عامہ کے خلاف کسی مواد کی اشاعت کا انتظام کرتا ہے۔ اسے دس کوڑوں اور ۲۵ سال کی قید سخت کی سزاء دی جائے

گی۔

ہمارا پارٹی ترجمان اخبار مساوات جس کی اشاعت صرف لاہور میں ایک لاکھ تک پہنچ چکی تھی بند کر دیا گیا۔ اور اس کی پریس ضبط کر لی گئی۔ دوسرے اخبارات کو بھی سنسر شپ قوانین کی خلاف ورزی کی صورت میں مکمل بندش یا اخباری کاغذ اور اشتہارات کی سپلائی میں کٹوتی کی دھمکی دی گئی۔ اگلے چھ برس تک میرے والد، والدہ اور میری تصویر کی اشاعت کبھی کبھار ہی کسی اخبار میں شائع ہوئی۔ اس طرح ہماری ہمدردی میں ہمارا نام تک بھی اخبارات کی اشاعت میں مفقود تھا۔ اگر فوجی سنسر کی نظر میں کسی خبر میں ہمارے ساتھ ہمدردانہ سلوک مترشح ہوتا تو وہ اخبارات کی فریم کردہ خبروں میں سے اسے کاٹ دیتے۔ بعض اوقات اخبار کے تمام کالم خالی ہی چھاپے جاتے تاکہ قارئین پر واضح ہو جائے کہ قابل اشاعت مواد سنسر کی قینچی کی نذر ہو گیا ہے۔ پی پی پی کی طاقت نے ضیاء کو سیاسی پابندیاں ظالمانہ حد تک نافذ کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے وقت سے سیاست میں حصہ لینے والے کسی بھی شخص کو کوڑوں اور قید کی سزاء دی جاتی۔ لیکن اکتوبر ۱۹۷۹ء سے فوجی حکومت نے اعلانیہ قانون نافذ کر دیا کہ تمام سیاسی پارٹیاں غیر قانونی ہیں یہ ایک کھلم کھلا کوشش تھی کہ میرے والد کی عوامی پالیسیوں کے لئے عوامی ہمدردی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ جنرل ضیاء کا مارشل لاء حکم نمبر ۴۸ بین طور پر کہتا ہے "پاکستان میں تمام سیاسی پارٹیوں کا وجود بمع ان کے گروہ، شاخیں اور فرقے فوری طور پر ختم کیا جاتا ہے" کسی سیاسی جماعت کا کوئی رکن یا کوئی بھی شخص جو خفیہ طور پر بھی اپنے آپ کو رکن کہتا ہے ۱۴ سال قید بامشقت، اپنی جائیداد کی ضبطی اور ۲۵ کوڑوں کی سزاء کا متوجب ہو گا" اب سے آئندہ کے لئے اخبارات میں جہاں بھی پی پی پی کا ذکر ہو گا اس کے ساتھ "سابق" کالاحقہ استعمال کرنا لازمی ہو گا۔ میری والدہ اور میں اس طرح سابق جمہوریت میں ایک پارٹی کی سابقہ رہنما بن کر رہ گئیں۔

لندن میں ۱۹۳۱ء میں انڈین راؤنڈٹیبل کانفرنس کے موقع پر میرے دادا کی تصویریں، میرے والد کی پیدائش کی سالگرہ پر کھینچی گئی تصویریں

ہماری خاندانی تاریخ میں المرتضٰی کا حوالہ انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ میرے والد اور ان کی تین ہمشیرگان یہیں پیدا ہوئیں۔ ان کی پیدائش پر دائی اماں کو لاڑکانہ کے ایک نزدیکی گاؤں سے دادا کی زیرِ نگرانی تعمیر کردہ زنانہ کوارٹروں میں اسی مقصد کے لئے لایا گیا۔ اگرچہ المرتضٰی کی جدید کاری نے پرانے گھر کی ہیئت کو تبدیل کر دیا ہے تاہم المرتضٰی ہی بھٹو خاندان کا قدیم اور اصلی گھر محسوس ہوتا ہے۔

سامنے کا دروازہ نیلی اور سفید ٹائلوں سے مزین کیا گیا ہے جو ۲۵۰۰ سال ق - م سے آغاز کردہ موہنجودارو کی نہایت ترقی یافتہ سندھی تہذیب کے زمانے کے مردوں اور عورتوں کے طرز زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔ بچپن میں میرا خیال تھا کہ اس قدیم شہر کو "موہنج جوڈیرو" اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس لفظ کا مطلب ہی سندھی زبان میں "میری جگہ" ہوتا ہے۔ میرے بھائیوں، بہن اور مجھے اس بات پر ہمیشہ فخر رہا کہ ہم موہنجو داڑو کے سائے میں پلے بڑھے ہیں۔ ہم دریائے سندھ کے کنارے پر رہائش پذیر ہیں جو اوائل زمانہ سے ہماری زمینوں کو سیراب کرتا ہے۔ کسی دوسری جگہ ماضی سے تسلسل کا ایسا رشتہ ہم نے محسوس نہیں کیا، کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد کا تعلق ۷۱۲ء میں مسلمانوں کے ہندوستان پر حملہ کرنے کے ساتھ براہ راست بنتا ہے۔ ہمارے اجداد میں سے ایک فرد کی ڈائری میں خاندان کے بارے میں پوری تفصیلات درج تھیں جو میرے پردادا کے زمانہ میں ایک بہت بڑے سیلاب کی نذر ہو گئیں۔ لیکن بچپن ہی سے ہمیں بتایا گیا کہ یا تو ہم ہندوستان کی جنگجو نسل راجپوت سے تعلق رکھتے ہیں جو مسلمانوں کے حملہ کے وقت مشرف بہ اسلام ہو

گئے تھے اور یا ان فاتح عربوں کی اولاد میں سے ہیں جو ہمارے آبائی صوبہ سندھ میں سے ہوتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے اسی لئے سندھ کو "باب الاسلام" کا نام دیا جاتا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں لاکھوں افراد بھٹو قبیلے میں شامل ہیں سندھ کا یہ سب سے بڑا قبیلہ ہے جس میں چھوٹے کسان بھی ہیں اور بڑے بڑے زمیندار بھی۔ ہمارا خاندان بھٹو قبیلے کے مشہور مورث اعلیٰ سردار ڈوڈو خان کی براہ راست اولاد میں سے ہے۔ اپر سندھ یعنی بالائی سندھ کے متعدد دیہات، میرپور بھٹو جہاں چچا ممتاز کا خاندان آباد ہےاور گڑھی خدا بخش بھٹو جہاں ہمارے خاندان کا قبرستان واقع ہے، ہمارے اجداد کے ناموں سے معروف ہیں جن کی زیادہ تر صوبے میں ارضی ملکیت تھی اور جو سیاسیات میں سینکڑوں برسوں سے حاوی چلے آرہے تھے۔ میرے بڑوں نے نوڈیرو میں گڑھی خدا بخش بھٹو کے نزدیک ایک گھر اپنی تحویل میں رکھا ہوا تھا جہاں عید کے دنوں میں میرے والد اور بھائی پکے ہوئے میٹھے چاول اور عرق گلاب سے معطر پانی روایتی تحفہ کے طور پر مہمانوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ لیکن میرے دادا کے وقتوں سے خاندان میں مرکزی حیثیت لاڑکانہ کے المرتضیٰ کو حاصل ہو گئی تھی۔

۱۹۵۸ء کی پہلی زرعی اصلاحات سے قبل، بھٹو خاندان ہی کے پاس صوبے کے ہاریوں کی سب سے بڑی تعداد ملازم تھی۔ سندھ میں ہماری زمینیں دوسرے زمینداروں کی طرح ایکڑوں میں نہیں، مربع میلوں میں ناپی جاتی تھیں۔ بچپن میں ہم ۱۸۴۳ء میں سندھ کے برطانوی فاتح چارلس نیپیئر کی حیرت کی کہانی مزے لے لے کر سنا کرتے تھے "یہ زمینیں کس کی ہیں؟" وہ وقفے وقفے سے سندھی زمینوں کے دورے کے دوران اپنے ڈرائیور سے پوچھتا تو برجستہ جواب ملتا "بھٹو کی زمینیں" اس نے ڈرائیور کو حکم دیا "جب بھٹو کی زمینیں ختم ہو جائیں، تو مجھے جگا دینا" کچھ عرصے بعد جب اس کی آنکھ خود ہی کھل گئی تو اس نے پوچھا۔ "ان زمینوں کا کون مالک ہے؟" تو ڈرائیور کا جواب سن کر حیرت زدہ رہ گیا "بھٹو ہی مالک ہے" صوبے پر فتح حاصل کرنے کے بعد برطانوی فوجی کمان کو لاطینی زبان میں

اس نے یہ پیغام بھیجا " پیکاوی، مطلب تھا کہ مجھ سے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب ہوا ہے "
بچپن میں ہم اس بات کو نیپیئر کا اعتراف گناہ سمجھتے تھے۔ میرے والد مزے لے لے کر کچھ اور کہانیاں بھی سنایا کرتے تھے۔ "تمہارے پڑدادا جب ۲۱ سال کے ایک حسین و جمیل جوان تھے" میرے والد ہماری ایک پسندیدہ کہانی شروع کرتے، سندھ کی تمام عورتیں ان کے عشق میں مبتلا تھیں خصوصاً ایک نوجوان برطانوی خاتون۔ ان دنوں یہ بات مقامی لوگوں کے لئے ممنوعہ تھی کہ ایک غیر ملکی سے شادی کریں مگر وہ اس خاتون کے محسوسات پر کسی طرح قدغن نہیں لگا سکتے تھے۔ ایک برطانوی فوجی افسر کرنل ے ہیو کو جب اس تعلق کا پتہ چلا تو اس نے تمہارے پڑدادا کو بلا بھیجا۔

برطانوی افسر کو اس بات کی مطلقاً پرواہ نہیں تھی کہ وہ بھٹو خاندان کے آبائی شہر لاڑکانہ میں متعین ہے جہاں بھٹو کی زمینیں اس قدر پھیلی ہوئی ہیں کہ نظر سے بھی پرے ہیں۔ برطانوی باشندوں کو ہماری خاندانی وجاہت کا کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ صرف ہماری بھوری رنگت دیکھتے تھے۔ " تم نے ایک برطانوی خاتون سے میل ملاپ بڑھانے کی جرات کیسے کی؟ " کرنل نے تمہارے پڑدادا غلام مرتضیٰ کو اس کے سامنے پیش ہونے پر متنبہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "میں تمہیں سبق سکھانے والا ہوں" اور کرنل نے اپنے ہاتھ میں ایک چابک سنبھال لی۔ لیکن جونہی کرنل نے غلام مرتضیٰ پر چابک مارنے کے لئے اپنا ہاتھ بلند کیا تمہارے پڑدادا غلام مرتضیٰ نے چابک پکڑ لیا اور اس افسر کی اسی چابک سے پٹائی شروع کر دی۔ مدد کے لئے چیختے ہوئے کرنل نے میز کے نیچے جا کر پناہ لی اور غلام مرتضیٰ اس کے دفتر سے باہر نکل گئے۔ "تم فرار ہو جاؤ" غلام مرتضیٰ کے خاندان کے افراد اور دوستوں نے اصرار کیا۔ "برطانوی حاکم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے" چنانچہ تمہارے پڑدادا اپنے کچھ ساتھیوں اور اس برطانوی خاتون کے ہمراہ جو انہیں اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی لاڑکانہ سے چلے گئے۔

برطانوی حکام نے سرگرمی سے تعاقب شروع کر دیا۔ "بکھر جاؤ" غلام مرتضیٰ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ "ایک ٹکڑی میرے ساتھ آؤ باقی انگریز خاتون کے ساتھ جاؤ.
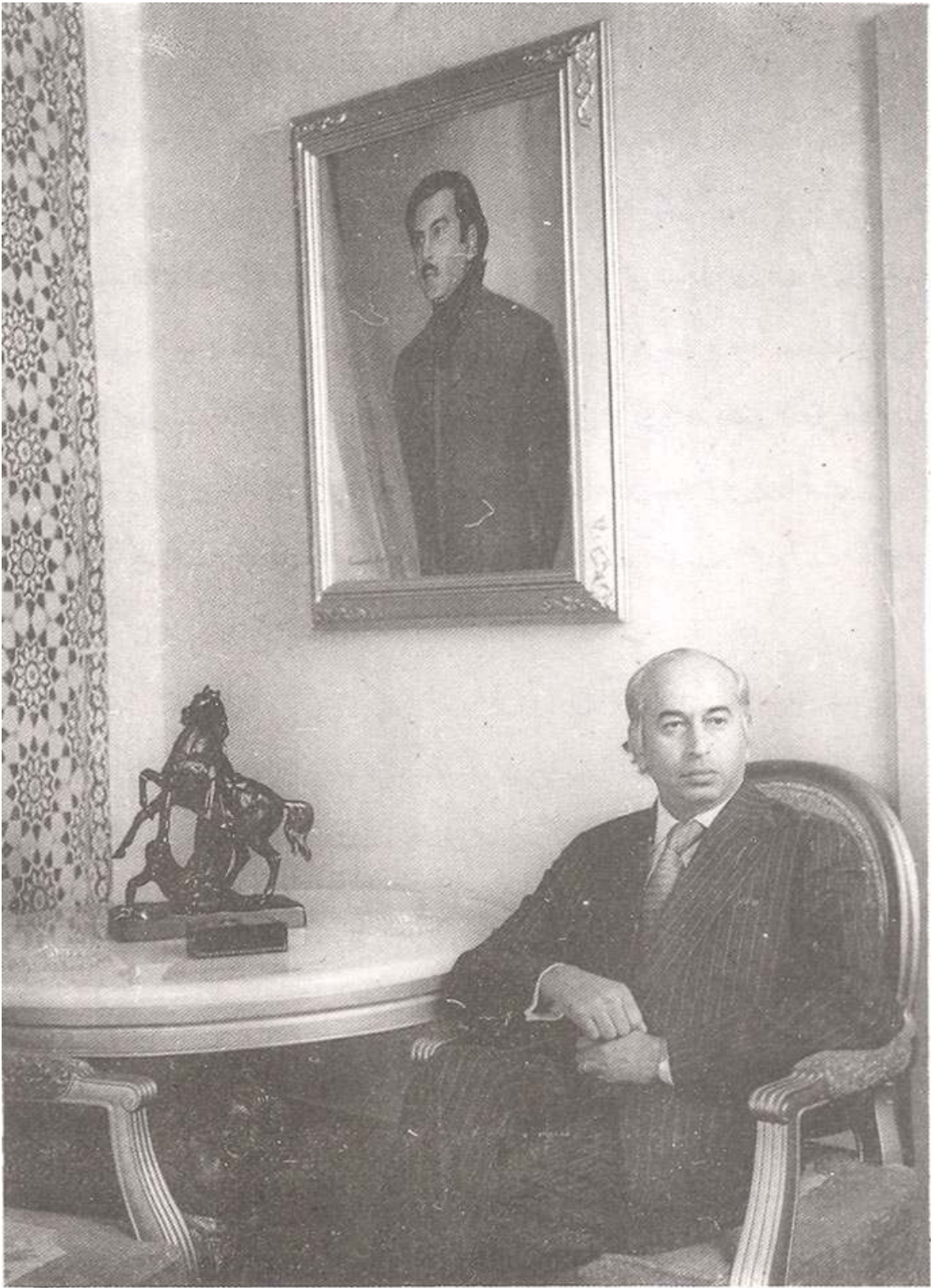
تحریک جمہوریت کے دو شہید' جناب ذوالفقار علی بھٹو اور حیات محمد خان شیر پاؤ' کی ایک یادگار تصویر

لیکن کسی قیمت پر بھی اسے برطانوی حکام کے حوالہ نہ ہونے دو، یہ ہماری عزت کا مسئلہ ہے" سبھی نے اپنے گھوڑے مختلف سمتوں کی طرف دوڑا دیئے اور تعاقب میں آنے والے برطانوی سواروں کو دھوکا دینے کے لئے دریائے سندھ کے آر پار بکھر گئے برطانوی شہ سوار خطرناک حد تک اس گروہ کے قریب پہنچ گئے، جس کے ہمراہ برطانوی خاتون تھی کیونکہ اس کی چلنے کی رفتار تمہارے پڑدادا کی تیز رفتاری سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ غلام مرتضیٰ کے جوانوں نے حکام سے چھپنے کے لئے ایک سرنگ کھودی اور اس کے دروازے کو پتوں سے ڈھانپ دیا۔ جب برطانوی سواروں نے سرنگ ڈھونڈ لی، تمہارے پڑدادا کے ساتھی بیخ پا ہوگئے۔ انہوں نے غلام مرتضیٰ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ لڑکی کو کسی صورت برطانوی حکام کے حوالے نہیں کریں گے۔ وہ لڑکی کو دشمن کے حوالے کرنے کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتے تھے چنانچہ جب برطانوی حکام لڑکی تک پہنچنے ہی والے تھے تمہارے پڑدادا کے ساتھیوں نے انہیں قتل کر دیا۔

ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں لیکن کہانی تو ابھی شروع ہوئی تھی۔ ہمارے پڑدادا بہاولپور کی آزاد ریاست کی طرف چلے گئے تھے اور نواب آف بہاولپور کے ہاں جا ٹھہرے تھے لیکن جب برطانوی حکومت نے ریاست بہاولپور پر قبضہ کرنے کی دھمکی دی تو میرے پڑدادا نواب صاحب کی خاطر و مدارت کا شکریہ ادا کرنے کے بعد دریائے سندھ کو دوبارہ عبور کر کے سلطنت افغانستان میں پناہ حاصل کرنے کے لئے چلے گئے جہاں انہیں شاہی مہمان بنا کر رکھا گیا۔ انتقاماً برطانوی حکومت نے پڑدادا کی تمام زمینوں پر قبضہ کر لیا اور ہمارے خاندانی گھر کو نیلام کر دیا۔ ہمارے ریشمی قالین بھی نیلام کر دیئے گئے۔ قدیم زمانے کے درآمد شدہ ریشم، ساٹن اور کمخواب کے بنے ہوئے صوفہ سیٹ، خالص سونے اور چاندی کی بنی ہوئی پلیٹیں، مذہبی تہواروں کے موقع پر خاندان کے ہزاروں ملازموں کے کھانے کے لئے بہت بڑے بڑے پکانے والے دیگچے اور کشیدہ کاری کئے ہوئے خیمے سب بیچ دیئے گئے۔ غلام مرتضیٰ کو عبرت ناک سزا دی جانی تھی کیونکہ برطانوی حکومت سے سرتابی ناقابل تصور تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے خداؤں کی مانند تھے۔ ہندوستان کے بعض حصوں

میں مقامی باشندے ان کی گلیوں میں چل پھر نہیں سکتے تھے۔ کسی برطانوی شخص کے سامنے بولنے کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی کجا کہ کوئی ان پر حملہ آور ہو جائے۔ آخر کار صلح جوئی کی ایک صورت بنی اور غلام مرتضٰی لاڑکانہ واپس آگئے۔ لیکن ان کی زندگی فقط چند روز اور تھی وہ بیمار پڑ گئے اور ان کا وزن کم ہونا شروع ہو گیا۔ گاؤں کے طبیب نے انہیں زہر دیئے جانے کے خدشہ کا اظہار کیا لیکن کوئی ایسا ذریعہ ثابت نہ ہو سکا۔ تمہارے پڑدادا نے ملازم رکھے ہوئے تھے۔ جو خوراک اور آب ان کو پیش کئے جانے سے پہلے خود چکھتے تھے۔ اس کے باوجود زہر سرائت کرتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ۲۷ سال کی اوائل عمری میں ہی وہ انتقال کر گئے۔ بعد ازاں انکشاف ہوا کہ ان کی زہر خورانی کا سبب کھانے کے بعد حقہ نوشی تھی یعنی تمباکو کا زہریلا دھواں۔

مجھے اپنے خاندان کی یہ کہانیاں بہت پسند تھیں اور اسی طرح میرے دونوں بھائیوں میر مرتضٰی اور شاہ نواز کو بھی ...... کیونکہ فطری طور پر وہ اپنے ہم نام کرداروں سے مماثلت کو پسند کرتے تھے۔ ان مصائب نے جو ہمارے اجداد نے جھیلے ہمارے لئے بھی ایک ضابطہ اخلاق قرار پائے اور میرے والد بھی جس کی پیروی کیا کرتے تھے۔ یعنی وفاداری، عزت اور اصول۔

غلام مرتضٰی بھٹو کے پسر اور میرے دادا سر شاہنواز نے سب سے پہلے بھٹو خاندان میں جاگیردارانہ ذہنیت ختم کرنے کی ابتداء کی کیونکہ یہ چیز معاشرے کے ایک بڑے حصے کو تباہ کر رہی تھی۔ ان کے وقتوں تک بھٹو افراد کی شادیاں بھٹو خاندان ہی میں ہوتی تھیں یعنی چچازادوں یا ماموں زادوں میں یا ان کی اولادوں میں۔ اسلام میں عورتیں بھی جائیداد کی وراثت کی حقدار ہیں اور زمین کو خاندان ہی میں رکھنے کا طریقہ یہی تھا کہ خاندان ہی میں شادی کی جائے۔ ایسی ہی ایک مطلوبہ شادی میرے والد اور ان کی فرسٹ کزن امیر بیگم میں ہوئی جب وہ ابھی بارہ سال کے تھے اور امیر بیگم ان سے آٹھ یا نو سال بڑی۔ انہوں نے اس شادی پر مزاحمت کی مگر میرے دادا نے انگلستان سے کرکٹ سیٹ منگوا کر دینے کا لالچ دے کر ان کو راضی کر لیا۔ ان کی شادی کے بعد امیر اپنے خاندان میں رہنے کے لئے واپس

چلی گئیں اور میرے والد سکول میں جس نے ان کے ذہن پر اس ناانصافی کا پختہ اثر مرتسم کیا خصوصاً عورتوں کے بارے میں ان پر خاندانی شادیوں کے جبر کا۔

امیر بیگم کی تو پھر بھی شادی کر دی گئی تھی۔ لیکن جب خاندان میں حسب خواہش کوئی کزن کا رشتہ دستیاب نہ ہو بھٹو خاندان کی لڑکیاں شادی ہی نہیں کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے پہلی شادی سے میرے دادا کی بیٹیاں ساری عمر کنواری ہی رہیں۔ باوجود خاندان کی مخالفت کے میرے دادا نے اپنی دوسری بیوی سے بیٹیوں کو بھٹو خاندان سے باہر شادی کی اجازت دیدی تھی۔ تاہم وہ محبت کی شادیاں نہیں تھیں بلکہ والدین کی طے کردہ شادیاں تھیں۔

ایک نسل بعد میری ہمشیرہ صنم نے خود فیصلہ کر کے ایسی پہلی بھٹو خاتون ہونے کی مثال قائم کی جس نے خاندان سے باہر شادی کی۔ مجھے اپنی توقعات کے خلاف مجھے روایتی راستہ ہی اختیار کرنا تھااور والدین کی طے کردہ خواہشات کا احترام کرنا تھا۔ میرے دادا بہت ترقی پسند تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کو تعلیم دلوائی۔ اپنی بیٹیوں کو بھی سکول بھیجا حالانکہ دوسرے جاگیردار اسے باعث رسوائی سمجھتے تھے۔ اکثر جاگیردار اپنے بیٹوں تک کو بھی تعلیم دلوانا پسند نہیں کرتے تھے۔ "میرے بیٹے زمین والے ہیں ان کی آمدنی طے شدہ ہے وہ نہ ہی کسی کی ملازمت کریں گے اور نہ ہی کسی کے لئے کوئی کام۔ میری بیٹیاں زمین کی وارث ہوں گی اور ان کے خاوند یا ان کے بھائی ان کی نگہداشت کریں گے۔ پس تعلیم کا تردد کیوں کیا جائے؟" یہ جاگیردارانہ ذہنیت تھی۔ میرے دادا نے بمبئی میں جہاں وہ برطانوی دور حکومت میں ملازمت کرتے تھے، تعلیم یافتہ ہندوؤں اور شہری مسلمانوں کی ترقی کا بذات خود مشاہدہ کیا تھا۔ اپنے بچوں کو تعلیم دلوا کر سرشاہ نواز نے دوسرے سندھی جاگیرداروں کے لئے ایک مثال قائم کرنے کی کوشش کی تاکہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم اور آزاد پاکستان کے قیام کے بعد ہمارا معاشرہ جامد نہ ہوجائے۔ اپنے ہم پایہ دوستوں کے بھویں چڑھانے کے باوجود انہوں نے میرے والد کو وطن سے دور تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا۔ میرے والد نے بھی اس ضمن میں انہیں مایوس نہیں کیا...... انہوں نے نہ صرف برکلے میں کیلیفورنیا یونیورسٹی سے آنرز میں گریجوایٹ کیا بلکہ آکسفورڈ میں کرائسٹ چرچ میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پاکستان میں وکالت کرنے سے قبل لنکنز ان سے

بار ایٹ لاء بھی کیا۔

میری والدہ مقابلتاً شہری صنعت کاروں کے اس طبقے سے تعلق رکھتی تھیں جو زمینداروں کے مقابلہ میں زیادہ وسیع المشرب خیالات کا مالک ہوتا ہے۔ جب کہ بھٹو خاندان کی خواتین ابھی بھی پردہ کرتی تھیں اور اپنے گھروں کی چار دیواری سے باہر شاذو نادر ہی نکلتی تھیں اور وہ بھی سیاہ برقعہ میں اپنے جسم کو مکمل طور پر چھپائے ہوئے۔ میری والدہ اور ان کی بہنیں کراچی میں بغیر نقاب کے پھرتی تھیں اور اپنی اپنی گاڑیاں خود چلاتی تھیں۔ ایک ایرانی کاروباری کی بیٹیاں، انہوں نے کالج تک تعلیم حاصل کی اور قیام پاکستان کے بعد خواتین کے ایک عسکری ذیلی ادارہ میں بطور نیشنل گارڈ کے افسروں کی خدمات بھی بجالائیں۔ بھٹو خواتین کے لئے پبلک میں نقاب کے بغیر پھرنا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ ۱۹۵۱ء میں میرے والد اور والدہ کی شادی کے بعد میری والدہ نے بھٹو خواتین کی طرح پردہ کرنا شروع کر دیا تھا اور انہیں اپنے خاندان کو ملنے جانے کے لئے ہفتہ میں صرف ایک بار گھر چھوڑنے کی اجازت تھی۔ لیکن قدیم طرز بودوباش سے ہر ایک تنگ آچکا تھا۔ جب کبھی میری دادی کو کراچی کے اپنے گھر سے باہر جانا ہوتا اور ڈرائیور دستیاب نہ ہوتا تو وہ میری والدہ کو گاڑی چلانے کے لئے کہتیں۔ جب ہمارا کنبہ المرتضیٰ کو جاتا تو میرے والد مردانہ حصے کی بجائے زنانہ حصہ ہی میں میری والدہ کے پاس رہنا زیادہ پسند کرتے۔ اور جب ۷۰ کلفٹن کی تعمیر مکمل ہو گئی وہاں خواتین کے لئے کوئی علیحدہ حصہ نہیں تھا مگر میرے دادا نے مردانہ مہمانوں سے ملاقات کے لئے بالمقابل ہی ایک اور گھر خرید لیا تھا۔ ایک نئی اور زیادہ روشن خیال نسل پاکستان میں جڑ پکڑ رہی تھی۔

ہمارے مردانہ غلبہ زدہ کلچر میں لڑکوں کو ہمیشہ ہی لڑکیوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔ اور نہ صرف انہیں اکثر تعلیم ہی سے محروم رکھا جاتا بلکہ بعض مرتبہ اتنی انتہاء بھی کی جاتی کہ لڑکوں کو کھانا بھی پہلے دیا جاتا جب کہ ماں اور بیٹیاں انتظار کرتیں۔ تاہم ہمارے خاندان میں ایسی کوئی تفریق نہیں تھی۔ علی الرغم مجھے سب سے زیادہ توجہ ملتی۔ چاروں میں سب سے بڑی، میں ۲۱ر جون ۱۹۵۳ء کو کراچی میں پیدا ہوئی...... میری جلد گلاب کی طرح سرخ ہونے کی بنا پر میری کنیت "پنکی" پڑ گئی۔ میرا بھائی میر مرتضیٰ میرے ایک سال بعد پیدا ہوا، صنم ۱۹۵۷ء

میں اور بے بی شاہ نواز ۱۹۵۸ء میں...... بڑی ہونے کے ناطے آغاز ہی سے گھر میں میری مخصوص اور الگ حیثیت تھی۔ میری عمر چار سال تھی اور والد کی ۲۸ سال جب پریذیڈنٹ اسکندر مرزا نے میرے والد کو اقوام متحدہ میں بھیجا۔ میرے والد کی بعد ازاں صدر ایوب خان کی کابینہ میں تقرری بطور وزیر تجارت ہوئی پھر وزیر توانائی بنے اور پھر وزیر خارجہ۔ وہ اکثر اقوام متحدہ میں پاکستانی وفود کے سربراہ کے بطور شریک ہوئے اس سات سالہ دور نے انہیں اور والدہ کو زیادہ عرصہ گھر سے دور رہنے پر مجبور کر دیا۔

میں نے اپنے والد کو اخبارات کے پہلے صفحات کی زینت بنتے دیکھا اور اسی طرح اقوام متحدہ میں پاکستان اور تیسری دنیا کے ممالک کی حمایت میں دلیلیں دیتے ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں سوویت یونین سے مالی اور ٹیکنیکل امداد کے معاہدے کرتے ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں ممنوعہ پیکنگ سے سرحدی معاہدہ کرتے ہوئے جس میں چین نے متنازعہ علاقہ کے ۷۵۰ مربع میل خاموشی سے پاکستان کے حوالے کر دیئے۔ میری والدہ عام طور پر ان کے ساتھ سفر کرتیں۔ بچوں کو گھر میں گھریلو عملہ کے پاس چھوڑ دیتیں اور مجھے تنبیہ کے انداز میں کہتیں "دوسرے بچوں کا خیال رکھو تم سب سے بڑی ہو" میں فقط آٹھ سال کی تھی جب مجھے گھر کی نگہداشت کا چارج سنبھالنا پڑا جب کہ میرے والدین گھر سے دور تھے۔ میری والدہ خوراک اور گھر کی دوسری ضروریات کے لئے مجھے پیسے دے جاتیں جو میں اپنے تکیئے کے نیچے چھپا دیتی۔ اگرچہ میں سکول میں ابھی جمع تفریق سیکھ رہی تھی، ہر شب والدہ کی غیر حاضری میں کچن کے ایک سٹول پر چڑھ جاتی اور ظاہر کرتی کہ میں بابو کے ساتھ حساب کتاب کر رہی ہوں۔ بابو ہمارا دیرینہ اور بزرگ ترین وفادار ملازم تھا۔ آیا حساب آپس میں مطابقت رکھتا تھا یا نہیں مجھے بالکل یاد نہیں۔ خوش قسمتی سے چھوٹی چھوٹی رقموں کا معاملہ تھا ان دنوں دس روپے یعنی دو ڈالر میں پورے گھرانے کے لئے خوراک خریدی جاتی تھی۔

ہمارے گھر میں سب سے زیادہ ترجیح تعلیم کو حاصل تھی۔ اپنے والد کی طرح میرے والد ہمیں تعلیم یافتہ اور ترقی پسند پاکستانیوں کی اگلی نسل میں ایک مثال کے طور پر شامل کرنا چاہتے تھے۔ تین سال کی عمر میں مجھے لیڈی جیننگز کے نرسری سکول میں بھیجا گیا پھر پانچ سال کی عمر میں کراچی کے اعلیٰ ترین مدرسوں میں یعنی کانونٹ آف جیزس اینڈ میری میں۔

کانونٹ میں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا اور یہی زبان ہم گھر پر بھی زیادہ تر بولتے تھے بجائے والدین کی مقامی زبانوں یعنی سندھی یا فارسی کے یا قومی زبان اردو کے۔ اگرچہ آئرش آیائیں جو وہاں پڑھاتی تھیں بڑے طلباء اور طالبات کو مختلف اقامت گاہوں میں تقسیم کر دیتی تھیں اور ان اقامت گاہوں کے متاثر کن نام رکھتی تھیں مثلاً "تنظیم" "خوش مزاجی" "کوشش" اور "خدمت" انہوں نے ہمیں عیسائیت کی تبلیغ کی کوئی ظاہری کوشش نہیں کی۔ سکول مشنریوں کے لئے آمدنی کا معقول ذریعہ تھا اور وہ مسلمان خاندانوں کی تھوڑی تعداد کو بھی ناراض کرنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے کیونکہ یہ خاندان کافی متمول تھے اور اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے میں دور اندیش بھی۔ "میرا تم سے صرف ایک ہی سوال ہے کہ تم اپنی پڑھائی میں اچھی پوزیشن حاصل کرو" میرے والد بار بار یہی پوچھا کرتے تھے۔ جیسے ہی ہم عمر میں بڑھتے گئے انہوں نے ہمارے لئے سکول کے بعد سہ پہر کے وقت حساب اور انگریزی پڑھانے کے لئے اتالیق رکھ دیئے۔ وہ خود دنیا کے کسی کونے میں بھی ہوتے تو ٹیلی فون پر ہماری سکول رپورٹوں کا پوچھتے رہتے۔ خوش قسمتی سے میں اچھی طالبہ تھی کیونکہ ان کے ذہن میں میرے لئے وطن سے باہر تعلیم حاصل کرنے والی بھٹو خاندان کی پہلی خاتون کا اعزاز حاصل کرنے کی بڑی بڑی تجاویز تھیں۔

"تم اپنے اپنے سوٹ کیس تیار رکھو اور میں تم سب کو ائرپورٹ پر الوداع کہنے کے بعد چھوڑ آؤں گا" انہوں نے ہم چاروں کو بہت پہلے سے کہنا شروع کر دیا تھا۔ "پنکی ایک چھوٹی سی بچی کی طرح جائے گی اور واپس ساڑھی میں ملبوس ایک خوبصورت نوجوان لیڈی بن کر آئے گی" شاہ نواز اپنے سوٹ کیس میں اتنے کپڑے بھر لے گا کہ اس سے بند نہیں ہو سکے گا ہمیں بابو کو بلانا پڑے گا تاکہ وہ اس کے اوپر بیٹھے۔ میرے خاندان میں ایسا کوئی سوال نہیں تھا کہ میری ہمشیرہ اور مجھے زندگی میں وہی مواقع نہیں ملیں گے جو میرے بھائیوں کو ملیں گے۔ اسلام میں بھی کوئی ایسی تفریق نہیں۔ ہمیں چھوٹی عمر ہی میں اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ یہ ہمارے مذہب میں بعض مردوں کی تاویل ہے جو عورتوں کے لئے مواقع کو محدود کر دیتی ہے۔ دراصل ہمارا مذہب اسلام اپنی ابتداء سے ہی عورتوں کے لئے بہت ترقی پسند

نظریہ رکھتا ہے ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کے عربی رسم و رواج کے مطابق چھوٹی بچیوں کے قتل کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ عورتوں کی تعلیم کا حکم دیا اور انہیں وراثت کا بھی حقدار بنایا تھا، ہزاروں سال قبل جبکہ مغرب میں یہ حقوق عورتوں کو ابھی نہیں دیئے گئے تھے۔

بی بی خدیجہؓ مسلمان بننے والی پہلی خاتون بیوہ تھیں اور تجارت کرتی تھیں۔ انہوں نے ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نوجوانی میں ہی اپنے ہاں ملازمت دی اور بعد میں ان سے شادی کر لی۔ ام عمارہ نے مردوں کے دوش بدوش کفار کے خلاف جنگوں میں حصہ لیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تلوار سے حفاظت کی۔ جنوبی ہندوستان کی ریاست احمد نگر کی چاند بی بی نے مغل شہنشاہ اکبر کو شکست دیکر صلح نامہ پر مجبور کر دیا۔ شہنشاہ جہانگیر کی بیوی نور جہاں جو دراصل خود ہی حکمران تھی حکومت کے نظم و نسق میں مہارت کے لئے مشہور تھی۔ اسلامی تاریخ میں ایسی متعدد خواتین گزری ہیں جنھوں نے اپنا عوامی کردار مردوں کی طرح مکمل کامیابی سے نبھایا۔ اسلام نے یہی راستہ اختیار کرنے کو ان کی یا میری حوصلہ شکنی نہیں کی۔ قرآن کریم کی سورہ ''النحل'' میں چیونٹی بیان کرتی ہے۔ ''میں نے ایک عورت کو ان پر حکومت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور اسے ہر شے کثرت سے عطاء کی گئی ہے اور اس کا تخت بہت طاقتور تخت ہے'' سورہ النساء میں درج ہے ''مرد جو کماتے ہیں انکا ہے اور عورتیں جو کماتی ہیں وہ ان کا ہے''۔

ہر سہ پہر اتالیق سے نصابی سبق پڑھنے کے بعد ہم نے مولوی صاحب سے جو ہمارے گھر پڑھانے آتے تھے قرآن مجید میں سے یہ اور دوسری سورتیں پڑھیں اور اسی طرح دیگر مذہبی ہدایات حاصل کیں۔ قرآن کریم کی عربی میں تلاوت اور پھر اس کے اسباق کو سمجھنا ہمارے لئے سب سے اہم موضوع تھا۔ ہم گھنٹوں مشکل عربی الفاظ پر تگ و دو کرتے، عربی کے حروف تہجی اردو سے ملتے جلتے ہیں مگر اس کی گرائمر اور مطالب انگریزی اور فرانسیسی کے مابین تفاوت کی طرح بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

ایک سہ پہر مولوی صاحب نے قرآنی احکام کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ "اپنے والدین سے مہربانی سے پیش آؤ اور ان کی اطاعت کرو" یہ بھی بتایا کہ "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے" اس بات میں حیرانی نہیں ہونی چاہئے کیونکہ ہماری والدہ اکثر یہی ہدایت دیا کرتی تھیں۔ مولوی صاحب یہ بھی پڑھایا کرتے تھے کہ دنیا میں ہمارے اعمال عقبیٰ میں ہماری قسمت سنوارنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ "تمہیں ایک وادی نار کے اوپر بال سے بھی زیادہ باریک پل صراط پر سے گزرنا ہوگا" "کیا تمہیں معلوم ہے وہ بال کتنا باریک ہوگا؟" وہ ڈرامائی انداز میں پوچھتے۔ "وہ لوگ جنہوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہوگا دوزخ میں گر پڑیں گے اور جنہوں نے دنیا میں نیکیاں کمائی ہیں وہ جنت میں جائیں گے جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں"۔

میری والدہ نے نماز کے تمام آداب مجھے سکھائے۔ وہ اپنے دین پر سختی سے پابند تھیں۔ دنیا کے جس خطے میں بھی ہوں اور جو کچھ بھی کر رہی ہوں وہ پنجگانہ نمازیں ضرور ادا کرتی تھیں۔ جب میں نو سالہ بچی تھی وہ نماز فجر کے لئے صبح سویرے بستر سے جگاتیں ہم اکھٹے ہی وضو کرتیں، خدا کے روبرو جانے کے لئے پاؤں اور منہ دھو کر صاف ہو جاتیں اور پھر مغرب کی طرف قبلہ رو ہو کر نماز پڑھتیں۔

میری والدہ اکثر ایرانیوں کی طرح شیعہ مسلک کی تھیں جبکہ ہمارا باقی خاندان سنی ہے۔ لیکن یہ ہمارے درمیان کوئی مسئلہ نہیں۔ شیعہ اور سنی ہزاروں سال سے پہلو بہ پہلو رہتے چلے آ رہے ہیں اور آپس میں شادیاں بھی کی ہیں۔ ہمارے اختلافات کم ہیں اور مشترکہ معتقدات زیادہ ہیں۔ جو چیز تمام مسلمانوں میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ فرقوں کی تفریق کے باوجود ایک کلمہ پر ایمان ہے۔ "ہمارا کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور محمدؐ اس کے آخری پیغمبر ہیں" یہی ایک مسلمان کی قرآنی تعریف ہے اور ہمارے خاندان میں اسی پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔

محرم کے دوران جب عراق میں کربلا کے مقام پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرت امام حسینؓ کو شہید کر دیا گیا ان کی یاد میں بعض اوقات میں مکمل سیاہ لباس

پہن کر اپنی والدہ کے ساتھ شیعہ مناسک ادا کرنے کے لئے مجلس میں جاتی تھی۔ "ساتھ ساتھ رہو" والدہ اصرار کرتیں کیونکہ شیعہ رسومات سنیوں کی نسبت زیادہ مفصل ہوتی ہیں۔ میں ذاکر سے اپنی آنکھیں پرے نہ کرتی جو انتہائی موثر انداز میں کربلا میں حضرت امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں پر جو المیہ گزرا تھا اسے دہراتا اور بتاتا کہ کس طرح گھات لگا کر غاصب یزید کے فوجیوں نے انہیں شہید کیا۔ کسی کو زندہ نہیں چھوڑا گیا چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھی یزید کے خنجروں کا شکار بنے۔ امام حسینؓ کا سر قلم کر دیا گیا اور ان کی ہمشیرہ زینبؓ کو یزید کے دربار میں ننگے سر لیجایا گیا۔ جہاں انہوں نے ظالم حاکم کو اپنے بھائی کے سر کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھا۔ لیکن ان کا دل نہیں ٹوٹا اس کے برعکس بی بی زینبؓ نے پختہ عزم کر لیا اور اسی طرح امام حسینؓ کے باقی مقتدیوں نے بھی ان کے پیروکار جنہیں شیعہ کے نام سے پکارا جاتا ہے وہ کربلا کے سانحہ کو کبھی نہیں بھولتے۔

"سنو کہ چھوٹی بچی پانی پانی پکار رہی ہے" ذاکرہ بھرائی ہوئی آواز میں چلاتی ہے۔ "اس ماں کے دل کی حالت محسوس کرو جو اپنی بچی کی آواز سن رہی ہے۔ اس جوان رعنا کو دیکھو جو اپنے گھوڑے پر سوار پانی لینے جارہا ہے۔ وہ دریا پر جھکتا ہے ہم اسے پانی کی خاطر دریا پر جھکتا دیکھ رہی ہیں۔ دیکھو غور سے دیکھو لوگ ان پر تلواروں سے پل پڑے ہیں" جونہی ذاکرہ نے یہ الفاظ ادا کئے کچھ عورتوں نے آہ وزاری کے ساتھ ماتم شروع کر دیا۔ پوری کہانی کی تصویر اس طرح کھینچی جاتی جو دل کو ہلا دے۔ میں خود بھی سن کر کئی مرتبہ چیخی اور چلائی۔

میرے والد کا مصمم ارادہ تھا کہ وہ اپنے ملک اور اپنے بچوں کو بیسویں صدی کے تقاضوں کے مطابق پروان چڑھائیں "کیا بچے خاندان ہی میں شادیاں کریں گے؟" میں نے ایک دن والدہ کو والد سے یہ سوال پوچھتے ہوئے سنا۔ جواب سننے کے لئے میری سانس وہیں رک گئی۔ "میں نہیں چاہتا کہ لڑکے اپنی چچا زادوں کے ساتھ شادی کریں اور باہر جاتے ہوئے ان کو گھر کی چار دیواری میں چھوڑ جایا کریں اور اس طرح میں لڑکیوں کو اپنے رشتہ داروں کی چار دیواری میں زندہ درگور ہونے کے لئے نہیں چھوڑ سکتا" مجھے یہ جواب سن کر بہت
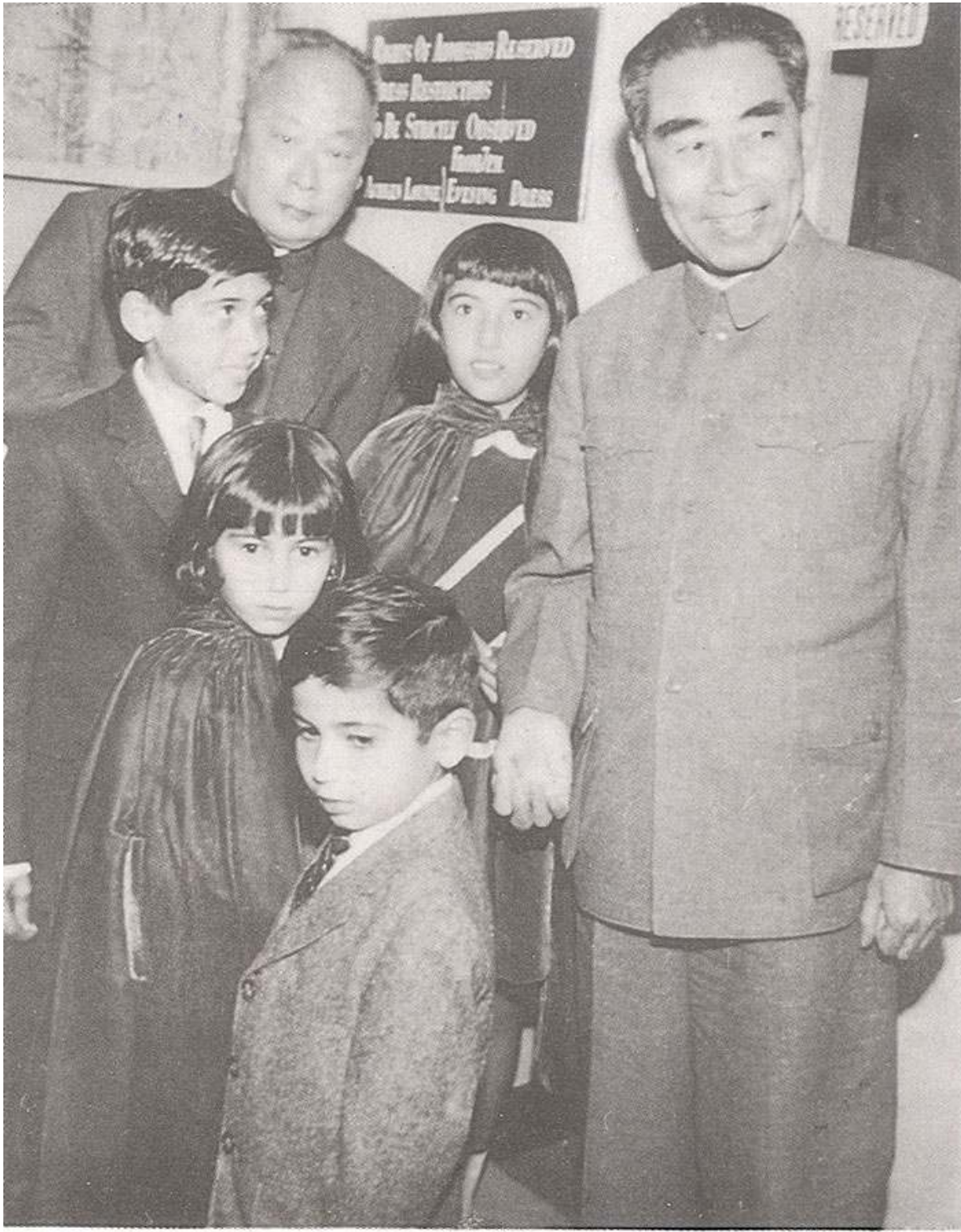
محترمہ بے نظیر بھٹو کے بچپن کی ایک یادگار تصویر، جس میں وہ چین کے عظیم لیڈر چو این لائی کے ہمراہ نظر آرہی ہیں۔

سکون ہوا۔ ”انہیں پہلے اپنی تعلیم مکمل کر لینے دو پھر وہ اپنی زندگی کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں گے“۔

میرے والد کا ردعمل میرے لئے خوشگوار تھا یہ وہی دن تھا جب میری والدہ نے مجھے پہلی مرتبہ برقع پہننے کے لئے کہا۔ ہم اس وقت کراچی سے ٹرین میں لاڑکانہ جارہے تھے جب میری والدہ نے ایک سیاہ رنگ کا کپڑا اپنے تھیلے میں سے نکالا اور مجھے اس میں لپیٹ دیا۔ ”اب تم بچی نہیں ہو“ انہوں نے تاسفانہ انداز میں کہا۔ قدامت پسند جاگیردار گھرانوں کی بیٹیوں کو اس قدیم رسم سے واسطہ پڑتا تھا۔ اور میں جب بچپن سے بلوغت کی دنیا میں داخل ہوئی تو مجھے حیرت ناک حد تک مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ آسمان، گھاس اور پھولوں کا رنگ اڑ چکا تھا وہ سب بھورے رنگ کے ہو چکے تھے۔ میری آنکھوں پر کپڑے کے پردے کی وجہ سے ہر چیز دھندلا گئی۔ جونہی میں ٹرین سے نیچے اتری، پردے کی وجہ سے جس نے مجھے سر سے پاؤں تک ڈھانپ رکھا تھا چلنا دوبھر ہو گیا۔ باہر کی ہوا بالکل بند تھی اور میں پسینے میں شرابور۔ ”پنکی نے آج پہلی مرتبہ برقع پہنا“ میری والدہ نے میرے والد کو المرتضٰی پہنچنے پر بتایا۔ ایک لمبے وقفے کے بعد میرے والد بولے ”اسے برقع پہننے کی ضرورت نہیں“ خود پیغمبر خدا کا فرمان ہے کہ بہترین پردہ آنکھوں کے پیچھے ہوتا ہے۔ ”جانچنا ہو تو اس کے کردار اور اس کے ذہن سے جانچو نہ کہ اس کے لباس سے“ اور اس طرح میں بھٹو خاندان کی پہلی خاتون بن گئی جسے مستقل دھندلکوں سے نجات مل گئی۔

میرے والد ہمیشہ مجھے اس وسیع کائنات کا حصہ بننے کے لئے کہتے اگرچہ بعض اوقات ان کی باتیں میرے شعور سے ماورا ہوتی تھیں۔ ۱۹۶۳ء کے موسم خزاں میں میں ان کے ساتھ وزیر خارجہ کے خصوصی ریل کے ڈبے میں سفر کر رہی تھی کہ انہوں نے مجھے ہلا کر جگایا۔ ”یہ سونے کا وقت نہیں ہے“ انہوں نے زور دے کر کہا ”ایک بہت بڑا سانحہ ہو گیا ہے...... ریاستہائے متحدہ امریکہ کے نوجوان صدر کو گولی مار دی گئی ہے“ اگرچہ میری عمر صرف دس سال تھی اور صدر امریکہ کے بارے میں مبہم سی شنید تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس رکھا جب تک صدر جان ایف کینیڈی کی حالت کے بارے میں تازہ ترین بلیٹن آتے

رہے۔ وہ صدر امریکہ سے وائٹ ہاؤس میں کئی مرتبہ ملاقات کر چکے تھے اور ان کے معتدل سوشل خیالات کی وجہ سے ان کے بڑے مداح تھے۔ کبھی کبھی وہ پاکستان آئے ہوئے غیر ملکی وفود سے ملنے کے لئے میرے بھائیوں، بہن اور مجھے ساتھ لے جاتے۔ جب ایک روز انہوں نے ہمیں بتایا کہ چین سے آئی ہوئی بہت اہم شخصیات سے تمہیں ملواؤں گا تو میں نے عجیب جوش اور ہیجان محسوس کیا۔ میرے والد اکثر انقلاب چین اور اس کے رہنما ماؤزے تنگ کے بارے میں تعریفاً بتاتے کہ کس طرح انہوں نے فرسودہ نظام کو ختم کرنے کے لئے اپنی فوج کو منظم کیا۔ اور کس طرح پہاڑوں اور صحراؤں میں اس کی رہنمائی کی۔ میرے والد چیئرمین ماؤ کے مداح تھے اور ان کی ٹوپی بطور ذاتی تحفہ کے میرے والد کے ڈریسنگ روم میں لٹک رہی تھی۔ مجھے اس وقت بہت افسوس ہوا جب میں نے ایک عالمی فہرست میں اہم چینی رہنماؤں میں ماؤ کا نام شامل نہ پایا۔ البتہ چینی وزیراعظم چو این لائی اور ان کے دو وزراء چن پی اور لیوشاؤ چی کے نام شامل تھے۔ آخری دونوں بعد میں ثقافتی انقلاب کے دوران جیل میں وفات پا گئے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مجھے وہ ملبوسات ناپسند نہیں ہوئے جو میرے والد نیویارک کے ففتھ ایونیو پر واقع ساکس کی مشہور دکان سے میرے لئے ہر سال لایا کرتے تھے۔ جہاں کی سیلز لیڈی کے پاس میرے لباس کی پیمائش موجود تھی۔

کراچی میں ایک روز ہمیں معلوم ہوا کہ ایک بہت اہم شخصیت شام کے کھانے پر آ رہی ہے کیونکہ گھر کا بیرونی حصہ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا جب ایک بڑی کار دروازوں میں سے اندر آئی ہم نے اوپر کی منزل کی کھڑکیوں سے جھانکا تو صدر ایوب خان اور ایک امریکن ۷۰ - کلفٹن میں داخل ہو رہے تھے۔ میں اس امریکن کو شہر میں دیکھی ہوئی فلموں کی وجہ سے فوراً پہچان گئی۔ ''کیا آپ نے باب ہوپ سے ملاقات کر کے خوشی محسوس کی؟'' میں نے اگلی صبح لاپرواہی سے اپنی والدہ سے پوچھا۔ ''کون؟'' میری والدہ نے سوال کیا۔ ''باب ہوپ'' میں نے جواب دیا۔ ''بیوقوف لڑکی'' میری والدہ نے کہا ''وہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا نائب صدر ہیوبرٹ ہمفری تھا'' بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ہیوبرٹ ہمفری ویت نام کی جنگ میں پاکستان کے تعاون کا خواہاں تھا خواہ وہ امریکی افواج کو بیڈمنٹن کے

ریکٹ کی سپلائی کی شکل میں ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن میرے والد نے اس علامتی تعاون سے بھی دستکشی اختیار کی کیونکہ ہم اخلاقی لحاظ سے ویت نام کی اندرونی جنگ میں ملوث ہونے کے خلاف تھے۔

جب میں دس سال اور صنم سات برس کی تھیں تو ہمیں شمال کی جانب مری کے سایہ دار سفیدے کے درختوں میں چھپے سابقہ برطانوی بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا گیا۔ ہماری گورنس نے مختصر سا نوٹس دیا کہ وہ انگلستان واپس جارہی ہے۔ اس کے جانے کے بعد فوری ہل بورڈنگ ہاؤس میں داخلہ تھا اور میرے والد اس کے حامی تھے تاکہ یہ تجربہ ہمیں سختی جھیلنے کا عادی بنا دے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اپنا بستر بچھانا، اپنے جوتوں کو پالش کرنا، نہانے اور دانت صاف کرنے کے لئے برآمدہ میں لگے نلکوں سے پانی ڈھونا پڑا۔ "میرے بچوں سے دوسرے بچوں سا سلوک کرو" میرے والد نے آیاؤں سے کہہ رکھا تھا۔ اور انہوں نے اس پر عمل کیا اور قواعد و ضوابط کی کسی بھی خلاف ورزی پر صنم اور مجھے قصوروار ٹھہرایا جاتا۔

مری میں میرے والد نے خط و کتابت کے ذریعہ ہماری سیاسی تعلیم جاری رکھی۔ غیر جانبدار ملکوں کی سربراہی کانفرنس منعقدہ جکارتہ سے واپسی کے فوراً بعد انہوں نے ہمیں ایک طویل خط لکھا جس میں اقوام متحدہ میں سپر پاورز کی خود غرضیوں اور تیسری دنیا کے ملکوں سے بے اعتنائی کی تفصیلات درج کیں۔ ایک آیا نے سکول کے باغ کے ایک بینچ پر صنم اور مجھے بٹھایا اور پورا خط ہمیں پڑھ کر سنایا۔ اگرچہ خط کے متن کو ہم بہت کم سمجھ سکیں۔

مری میں ہمارے دوسرے اور آخری سال میں صنم اور میں نے گہرائی سے سیاسی اسباق کا مطالعہ کیا۔ ۶ر ستمبر ۱۹۶۵ء کو ہندوستان اور پاکستان کشمیر کے مسئلہ پر آپس میں الجھ پڑے جب کہ میرے والد کشمیریوں کے حق خود اختیاری کی حمایت میں اور ہندوستانی حملے کے خلاف مباحثے میں حصہ لینے کے لئے اقوام متحدہ بذریعہ ہوائی جہاز چلے گئے۔ جیزس اور میری کانونٹ کی آیاؤں نے ہندوستانی ہوائی حملہ کے امکان کی بنا پر طلباء کو تیار کیا۔ کشمیر کی طرف سڑک مری میں سے ہو کر گزرتی تھی اور اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ ہندوستانی افواج کو

پاکستان میں گھسنے کی کھلی دعوت تھی۔

جہاں ہم کبھی شام کے کھانے کے بعد بکرے کی ہڈیوں سے "جیک جیک" کھیلا کرتے تھے اور اینڈ بلائٹن کی کتابیں پڑھتے تھے اب وہاں ہوائی حملوں سے بچاؤ اور بلیک آؤٹ کی پریکٹس ہو رہی تھی۔ آیاؤں نے بڑی لڑکیوں پر اپنی چھوٹی بہنوں کو پناہ گاہوں میں لے جانے کی ذمہ داری ڈال دی اور میں نے سنی کو اپنے جوتے پاؤں میں باندھ کر سونے کا عادی بنایا تاکہ انہیں ہمیں تلاش کرنے میں وقت ضائع نہ ہو۔ ہمارے سکول کی بہت سی لڑکیاں اعلیٰ سرکاری افسران یا فوجی افسروں کی بیٹیاں تھیں اور ہم نے جوش میں ایک دوسرے کے مصنوعی نام رکھ دیئے تھے تاکہ دشمن کے ہاتھوں میں پڑنے پر اسے دھوکا دیا جا سکے۔ ابتدائے بلوغت کی وجہ سے ہمیں یہ بالکل ڈرامائی محسوس ہوتا تھا۔ کہ ہمیں اغواء کیا جاسکتا ہے اور پہاڑوں میں چھپایا جا سکتاتھا۔ سترہ روزہ اس عرصے میں حملے کا امکان حقیقی اور خوفناک تھا۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ کی وجہ سے پاکستان میں حالات زیادہ مخدوش ہوگئے تھے۔ اس بات پر چونکتے ہوئے کہ جو ہتھیار کمیونسٹوں کے خلاف استعمال کئے جانے تھے، وہ ہندوستان کے خلاف استعمال ہوتے رہے تھے۔ جان سن کی حکومت نے پورے برصغیر پر ہندوستانی اسلحہ کی سپلائی پر پابندی عائد کر دی۔ لیکن ہندوستان سویت یونین سے بھی اسلحہ حاصل کر رہا تھا جبکہ پاکستان نہیں کر رہا تھا۔ اس رکاوٹ کے باوجود ہمارے سپاہی اقوام متحدہ کی جنگ بندی کی تاریخ ۲۳ ستمبر تک بے جگری اور کامیابی سے لڑے۔ تمام ملک نے فاتح ہونے کا شرف حاصل کیا۔ نہ صرف ہم نے ہندوستانی حملے کا منہ توڑ جواب دیا بلکہ ہم نے ان کا زیادہ علاقہ قبضے میں لے لیا نسبتاً اس علاقہ کے جو انہوں نے لیا۔ ہماری خوشی چند روزہ ثابت ہوئی۔ تاشقند کے جنوبی روسی شہر میں امن کے لئے باہمی گفت و شنید کی میز پر صدر ایوب وہ سب کچھ ہار گئے جو انہوں نے میدان جنگ میں حاصل کیا تھا۔ تاشقند معاہدہ کے مطابق، دونوں ممالک نے قبل از جنگ حالت تک اپنی افواج کی پسپائی منظور کر لی۔ میرے والد اس پر بہت برافروختہ ہوئے اور بطور وزیر خارجہ استعفیٰ دے دیا۔ جب ہندوستانی وزیراعظم

لال بہادر شاستری معاہدہ پر دستخط کے دوسرے دن دل پر حملے کی وجہ سے فوت ہو گیا میرے والد کا تبصرہ تھا کہ وہ ضرور خوشی کی تاب نہ لاتے ہوئے انتقال کر گیا۔ معاہدے کی شرائط کا لوگوں پر انکشاف ہوا تو پنجاب اور سندھ کے صوبوں میں پولیس کے ظالمانہ رویئے کے باوجود بڑے بڑے مظاہرے ہوئے۔ مظاہرے جاری رہے اور بھٹو خاندان کے افراد کی زندگیاں ہمیشہ کے لئے تبدیل ہو گئیں۔

جون ۱۹۶۶ء میں ایوب نے آخر کار میرے والد کا استعفیٰ منظور کر لیا۔ ایوب اور میرے والد کے درمیان اختلافات اب پوری طرح عیاں تھے۔ اور میرے والد کی عوامی حمایت ایک سیاسی رہنما کے طور پر بہت بلند ہو گئی تھی۔ وزیر خارجہ کے ریلوے سیلون میں لاڑکانہ کی طرف ہمارے آخری سرکاری سفر نے عوام کو پاگل کر دیا تھا۔ وہ ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑتے اور ہمارے ساتھ ڈبوں میں سوار ہونے کی کوشش کرتے۔ فخر ایشیاء زندہ باد، ہجوم میں لوگ نعرہ لگاتے اور ٹرین کی چھت پر چڑھ جاتے اور قریب کے مکانوں کی چھتوں پر بھی لوگ ہی لوگ تھے جو نعرہ زن تھے "بھٹو زندہ باد" "بھٹو زندہ باد"۔

لاہور میں جب میرے والد ٹرین سے اتر کر ظہرانے کے لئے گورنر پنجاب کے پاس گئے تو مجھے بہت خوف محسوس ہوا "بھٹو کی قمیص پر میں نے خون دیکھا ہے" کسی نے چلا کر کہا۔ میرا دل منجمد ہو گیا جب تک میں نے انہیں ہجوم میں سے واپس آتے مسکراتے اور ہاتھ ہلاتے ہوئے نہیں دیکھ لیا۔ ان کی قمیص پھٹی ہوئی تھی۔ ماتھے پر خفیف سی خراش تھی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان کی نکٹائی غائب تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ ہزاروں روپوں میں نیلام ہو گئی تھی۔ جب وہ دوبارہ وزیر خارجہ کے سیلون میں بیٹھے ہجوم نے گاڑی کو جھولے کی طرح آگے پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا یہ دورانیہ تیز تر ہوتا گیا اور مجھے خدشہ پیدا ہوا کہ ہم سب کہیں نیچے نہ گر جائیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو الیکشن ۱۹۹۳ء میں اپنا ووٹ کاسٹ کرتے ہوئے

صحیح سلامت گھر واپسی پر ہماری گفتگو میں سیاست زیادہ سے زیادہ در انداز کر گئی۔ ''کولڈ وار'' یعنی سرد جنگ اور ''آرمز ایمبارگو'' یعنی اسلحہ پر پابندی ایسی اصطلاحات جن کو پوری طرح ہم ابھی سمجھتے بھی نہیں تھے بچپن ہی سے ہماری روز مرہ گفتگو کے ذخیرہ الفاظ کا حصہ بن چکی تھیں۔ گول میز کانفرنسوں اور سربراہی ملاقاتوں کے نتائج سے ہم بالکل اسی طرح آشنا تھے جس طرح دوسرے بچے عالمی کرکٹ کپ کے سکور سے۔ لیکن ۱۹۶۶ء میں میرے والد کے ایوب خان سے کشیدہ تعلقات کے بعد ''شہری آزادیاں'' اور جمہوریت ایسے الفاظ ہماری زبان کا حصہ بن گئے جو زیادہ تر پاکستانیوں کے لئے دیومالائی یعنی افسانوی حیثیت رکھتے تھے جنھوں نے ایوب کے زیر سایہ سیاست میں محدود شراکت کا تجربہ ہی کیا تھا۔ میرے والد نے ۱۹۶۷ء میں اپنی سیاسی جماعت ''پاکستان پیپلز پارٹی'' کی بنیاد رکھ دی۔

''روٹی، کپڑا اور مکان'' یہ تینوں چیزیں پیپلز پارٹی کا ہدف اور لوگوں کے جم غفیر کا نقطہ اتصال بن گئیں یہی بنیادی ضروریات تھیں جو پاکستان کے مفلوک الحال عوام کے پاس نہیں تھیں۔ جب کہ تمام مسلمان اللہ کے حضور جھکتے تھے ہمارے ملک کے غرباء دولت مندوں کے سامنے سرنگوں ہوتے تھے۔ ''سیدھے کھڑے ہو جاؤ، دوسروں کے سامنے ذلیل مت بنو تم انسان ہو تمہارے بھی برابر کے حقوق ہیں'' میرے والد پاکستان کے دو دراز اور پسماندہ دیہاتوں میں جہاں ان سے پہلے کسی سیاستدان نے قدم نہیں رکھا تھا عوام الناس کو نیا ولولہ عطاء کرتے ہوئے کہتے ''جمہوریت کی مانگ کرو جہاں غریب ترین اور امیر ترین اشخاص کے لئے ووٹ میں برابر کا حق ہے''۔

''بھٹو کون ہے؟ بھٹو کیا ہے؟ لوگ کیوں کہتے ہیں کہ اسے سننے کے لئے ہر شخص جاتا ہے؟ جب کہ حال یہ ہے کہ صرف تانگہ، رکشہ اور ریڑھی ڈرائیور ہی اس کے جلسوں میں جاتے ہیں'' ایوب کے گورنر کا حکومت کی تسلط زدہ پریس سے استفسار تھا۔ مثالیت پسند ہونے کی بناء پر مجھے ان باتوں سے صدمہ پہنچا۔ اگرچہ ہم محفوظ زندگیاں گزار رہے تھے اور ہمیں خصوصی سکولوں میں تعلیم دی جا رہی تھی تاہم مجھے دکھ پہنچتا تھا جب لوگوں کو بغیر

جوتوں، بغیر قمیصوں اور نوجوان لڑکیوں کو گتھے ہوئے بالوں اور نحیف جسموں والے بچوں کے ساتھ دیکھتی تھی۔ کیا غریب انسان نہیں ہیں؟ ہمیں اپنی قرآنی تعلیمات سے یہی سبق ملتا ہے کہ اسلام میں اللہ کی نگاہوں میں سب برابر ہیں ہمیں والدین کی بھی یہی تعلیم تھی کہ ہر فرد کی عزت کرو اور کسی کو اپنے سامنے سرنگوں مت ہونے دو......

"خدا کا ایسا کوئی قانون نہیں کہ صرف پاکستانی ہی مفلس ہوں" میرے والد غرباء کے ہجوموں سے خطاب کرتے اور اسی طرح ان عورتوں سے بھی جو ہجوم کے اطراف میں گروہوں کی شکل میں اکھٹی ہو جاتیں۔ "ہمارا ملک امیر ہے ہمارے پاس وسائل کی کثرت ہے۔ پھر کیوں غربت، بھوک اور بیماری ہمارا مقدر ہے؟" یہ بات تھی جسے عوام الناس آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ پاکستان کی اقتصادیات کی ایوب کی موعودہ تعمیر ناکام ہو چکی تھی جب کہ اس کا خاندان اور اس کے مٹھی بھر حواری دولت مند ہو چکے تھے۔ ایوب کے گیارہ سالہ دور حکومت میں پاکستان کے ۲۲ خاندانوں کے ایک گروہ نے پاکستان میں ہر جگہ قبضہ جمالیا تھا خواہ وہ بینک تھے بیمہ کمپنیاں تھیں یا صنعتیں تھیں۔ یہ باغی نعرے سینکڑوں ہی نہیں ہزاروں لوگوں کو میرے والد کی سمت کھینچتے جو سماجی اور اقتصادی اصلاحات کی آواز اٹھاتے۔

۷۰ - کلفٹن کراچی کے ہمارے گھر کی پہلی منزل پر پی پی پی کا دفتر بن گیا۔ میری ہمشیرہ ۱۱ سال اور میں ۱۴ سال کی عمر میں چار چار آنے دے کر پارٹی کی جوشیلی رکن بن گئیں تاکہ اپنے بزرگ ترین ملازم بابو کے ساتھ لوگوں کی بھاری تعداد کی رکنیت کرنے میں امداد کے لئے شریک ہو سکیں جو ہمارے دروازے پر ہر روز لائن بنا کر پارٹی رکنیت کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ہماری معمول کی زندگی جس میں ہم فٹ بال اور کرکٹ کی جیت منایا کرتے ہم اپنے والد سے ان مراعات کی کہانی بھی سنتے جن کی ایوب حکومت انہیں پیشکش کرتی۔ "تم جوان ہو تمہارے سامنے ایک زندگی پڑی ہے ایوب اپنی باری پوری کر لے تو بعد میں تمہاری باری ہے۔ ہمارے ساتھ کام کرو بجائے اس کے کہ ہماری مخالفت کرو...... ہم تمہارے لئے سب کچھ آسان بنا دیں گے" ایوب اور اس کے رفقاء میرے والد کو پیغام

دیتے اور بالکل انہی الفاظ میں ایک اور آمر کے قاصد یہی پیغام میرے لئے لاتے۔ جب ایوب کی رشوت کی پیش کش میرے والد کو خاموش رکھنے میں ناکام رہی تو موت کی دھمکیاں آنا شروع ہو گئیں۔

میں ظلم اور زیادتی کی دنیا سے اب تک ناواقف تھی۔ ایک دنیائے سیاست تھی جس میں میرے والد مصروف تھے اور ایک دنیا بچوں کے مدرسوں اور کھیلوں کی تھی اور ساحل سمندر پر ہنسی مذاق کی۔ لیکن دونوں دنیائیں آپس میں ٹکرا گئیں۔ جب میرے والد پر مسلح حملے ہونے شروع ہو گئے۔ ایوب کے حامیوں نے ان پر رحیم یار خان ، سانگھڑ اور پی پی پی کو عوام الناس میں مقبول عام کرنے کے دوران سفر کی قیام گاہوں میں گولی چلائی۔ سانگھڑ میں میرے والد کی زندگی ان کے حامیوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر بچائی جنھوں نے گولی چلنے کے دوران خود کو ان کے اوپر گرا دیا اور خود گولیوں کے زخم کھائے۔

ہمارے گھر میں ہلچل سی مچ گئی۔ لیکن میں نے سہم کر رہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس طرح خوفزدہ ہونے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ پاکستان میں سیاسی زندگی کے یہ لوازمات تھے اور ایسی زندگی بسر کرنے پر ہم مجبور تھے۔ موت کی دھمکیاں ، ظلم و ستم جو کچھ تھا وہ تھا مگر میں نے خوف زدہ رہنے سے انکار کر دیا۔ دراصل میں نے کوشش کی کہ کسی قسم کی حساسیت کو پاس نہ آنے دوں پی پی پی کی بنیاد کے ۱۱ ماہ بعد میرے والد اور پارٹی کے اعلیٰ راہنماؤں کو قیدی بنا کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ آمروں کے یہی وطیرے تھے۔ جہاں کہیں احتجاج ہوا اسے بزور دبا دو...... جہاں غیر متفقین ہوں انہیں گرفتار کر لو۔ کس قانون کے ماتحت؟ پوچھنے پر کہا جاتا ہم خود ہی قانون ہیں۔

۱۹۶۸ء کے پرتشدد واقعات پاکستان تک ہی محدود نہیں تھے پوری دنیا انقلابی لہر کی زد میں تھی۔ طلباء تعلیمی اداروں میں ہر جگہ پیرس ، ٹوکیو ، میکسیکو شہر ، برکلے اور راولپنڈی میں ہڑتالیں کر رہے تھے۔ پاکستان میں ایوب کے خلاف احتجاج اس وقت شروع ہوا جب یہ خبر پھیلی کہ میرے والد کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور میانوالی جیل میں پھینک دیا گیا ہے جو پاکستان کے بدترین قید خانوں میں شمار ہوتی تھی۔ احتجاج جاری رہا پھر انہیں ساہیوال کی جیل

میں تبدیل کر دیا گیا جہاں ان کی کوٹھڑی میں چوہوں کی بہتات تھی۔ فسادات کو دبانے کی کوشش میں حکومت نے تمام سکول اور یونیور سٹیاں بند کر دیں۔ دریں اثناء مجھے اپنی تعلیمی زندگی کے مشکل ترین مرحلے کا سامنا تھا کیونکہ میں اپنے "او" لیول کے امتحانات کی تیاری کر رہی تھی جو میری تعلیم کے آخری تین سالوں پر محیط تھا اور میرے ریڈ کلف میں ممکنہ داخلے کے امتحان کا بھی پیش رو تھا۔ میں نے اپنے والد سے بر کلے میں جہاں وہ خود گئے تھے درخواست دینے کی گزارش کی مگر وہ نہیں مانے۔ "کیلیفورنیا کا موسم بہت عمدہ ہے" "میساچوسیٹس کی برفیلی فضاء تمہیں پڑھائی پر مجبور رکھے گی" انہوں نے مجھے کہا۔

امتحان میں نہ بیٹھنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا کیونکہ امتحانی پرچے دسمبر میں سال میں صرف ایک دفعہ انگلستان سے بھیجے جاتے تھے۔ "تم کراچی میں ٹھہرو اور اپنی پڑھائی جاری رکھو" میری والدہ نے کہا اور باقی بچوں کو وہ لاہور اپنے ساتھ لے گئیں تاکہ میرے والد کی حراست کے خلاف عدالت عالیہ میں حبس بے جا کی درخواست دے سکیں۔ میں ۷۰ کلفٹن میں تنہا رہ گئی اپنے ہی علاقے میں مقید جو تجارتی مرکز سے کافی دور تھا۔ جہاں فسادات برپا تھے۔

اپنے مقید والد کے بارے میں پریشانیوں سے اغماض کرتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو اپنے کام میں مصروف کر لیا یعنی اپنے مضامین اساتذہ کے ساتھ جو ہر روز گھر میں آیا کرتے تھے بار بار دہرانا شروع کر دیئے۔ شامیں میں نے نزدیکی سندھ کلب میں اپنی سہیلیوں فیفی، تہمینہ، فاطمہ اور سمیعہ کے ساتھ گزارنا شروع کیں۔ سندھ کلب کسی زمانہ میں برطانوی آرام گاہ تھی جہاں مقامی لوگوں اور کتوں کا داخلہ ممنوع تھا مگر اب کھاتے پیتے گھرانوں کے افراد اسے کھیلوں کی کلب کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ہم سکوائش کھیلتیں اور تیراکی کے تالاب میں تیرتیں۔ اگرچہ ہمیں معلوم تھا کہ حالات میں اس قدر بے نیازی بھی نہیں تھی جو ظاہراً ہمیں محسوس ہوتی تھی جب سے میرے والد نے ایوب کو للکارنا شروع کیا میری سہیلیوں کے کچھ رشتہ داروں اور بہی خواہوں نے انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ بھٹو کے اہل خاندان سے دوستی خطرناک ہے اور ایوب حکومت کو انتقام کی

دعوت دینے کے مترادف۔ سمیعہ اور کچھ دوسری سہیلیاں میرے ساتھ جمی رہیں مگر میں نے دوسری ہم جماعتوں کو دیکھا کہ مجھ سے فاصلہ رکھنے لگیں۔

"میں تمہارے "اولیول" امتحانات میں تمہاری کامیابی کے لئے دعاگو ہوں" میرے والد نے ۲۸ر نومبر کو ساہیوال جیل سے مجھے لکھا "مجھے حقیقتاً ایسی بیٹی پر فخر ہے جو اس قدر ذہین ہے کہ مجھ سے بھی تین سال کم یعنی پندرہ برس کی چھوٹی سی عمر میں "اولیول" کر رہی ہے۔ اگر یہی رفتار رہی تو تم کسی روز صدر بھی بن جاؤ گی"۔ اگرچہ میرے والد کو قید تنہائی میں رکھا گیا تھا مگر میرے والد نے مجھے یقین دلایا کہ ان کی سب سے بڑی پریشانی میری تعلیم ہی تھی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم بہت مطالعہ کرتی ہو لیکن تمہیں ادب اور تاریخ کا مزید مطالعہ جاری رکھنا چاہئے" انہوں نے خط میں لکھا "جن کتب کی تمہیں ضرورت ہے وہ سب تمہارے پاس ہیں...... نپولین بوناپارٹ کے متعلق پڑھو جو موجودہ تاریخ کا مرد کامل تھا...... امریکی انقلاب اور ابراہم لنکن کے بارے میں پڑھو...... بسمارک، لینن، اتاترک اور ماوزے تنگ کے متعلق پڑھو...... قدیم زمانے سے اب تک تاریخ ہندوستان پڑھو اور سب سے بڑھ کر تاریخ اسلام پڑھو" قید خانے کے فارم پر دستخط تھے "ذوالفقار علی بھٹو"۔

میری خواہش تھی کہ میں لاہور میں باقی خاندان کے ساتھ رہوں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ صنم نے مجھے ٹیلی فون پر بتایا کہ میری والدہ میرے والد کی حراست کے خلاف ہر دوسرے تیسرے دن عورتوں کا ایک احتجاجی جلوس نکال رہی ہیں اور ہر مظاہرہ کرنے والی خاتون کے پاس پلاسٹک کے تھیلے میں ایک گیلا تولیہ ضرور ہوتا ہے تاکہ ایوب کی پولیس کے آنسو گیس پھینکنے کی صورت میں استعمال کیا جا سکے۔ متعدد بار پولیس نے اپنی لاٹھیوں سے جلوسوں کو منتشر کیا مگر مظاہرین کی تعداد ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ ایوب نے افواج کو حکم دیا کہ احتجاج کرنے والوں کو گرفتار کر لیا جائے مگر سپاہیوں نے عورتوں کو گرفتار کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ان کی حمایت میں ہاتھ ہلاتے رہے۔ ایوب کے دور حکومت میں بھی خواتین کے تقدس کا لحاظ رکھا جا رہا تھا۔

جب "اولیول" امتحانات کے انعقاد کا وقت میں آگیا جیزس اور میری کانونٹ نے

ہمارے لئے ویٹیکن سفارت خانہ میں امتحان کا انتظام کیا جو کلفٹن میں ہی واقع تھا۔ اس کے تقدس اور تجارتی مرکز سے کافی فاصلے پر ہونے کی بنا پر ہمارے لئے محفوظ جگہ بن گیا تھا۔ ادھر برطانیہ میں طلباء صاف ستھرے کمروں میں کئی دنوں تک امتحان دے رہے تھے۔ ہمیں چرچ آف روم کے پاکستانی صدر مقام پر لیجایا جاتا رہا۔

دریں اثناء فسادات جاری رہے مظاہرین پر پولیس کے گولی چلنے اور متعدد لوگوں کے مرنے کے ہر واقعے کے بعد ایوب کے خلاف عوام کا غیض و غضب بڑھتا رہا۔ پورے پاکستان میں ایوب کے استعفیٰ اور میرے والد اور دوسرے سیاسی اسیروں کی رہائی احتجاجی مظاہرین کا مطالبہ بن گیا۔

میرے والد کی حراست کے تین ماہ بعد پاکستان میں بحرانی کیفیت کو دیکھ کر ایوب خاں پی پی پی کے راہنماؤں کو رہا کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ان افواہوں کے درمیان کہ میرے والد کو لاہور سے لاڑکانہ جس طیارے میں لیجایا جائے گا تخریب کاری کی سازش سے تباہ کر دیا جائے گا اور اسے حادثہ قرار دیا جائے گا۔ میری والدہ نے اس سازش کے انکشاف کے لئے پریس کانفرنس کر دی اور اس پر عمل نہ ہو سکا۔ میرے والد کو لاڑکانہ ٹرین میں لایا گیا۔ مجھے ان کی آمد پر جو خوشی ہوئی وہ کسی اور موقع پر زندگی میں کبھی نہیں ہوئی۔

اپنی رہائی کے بعد لاڑکانہ میں فتحمندی کے مارچ میں میرے والد صنم اور مجھے دیکھ کر چلاتے ہوئے پکارے "نیچے اتر جاؤ" جب ہماری کھلی کار ہجوم کے درمیان آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھی اور لوگ "جئے بھٹو" اور "گرتی دیوار کو آخری دھکا دو" کے نعرے بلند کر رہے تھے ایوب کے ایک کارندے نے میرے والد پر قریب ہی سے فائر کر دیا۔ خدا کا معجزہ تھا کہ پستول منجمد ہو گیا اور گولی نہ چلی لیکن ہجوم اس وقت معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

میں نے اپنے والد کے ہاتھ کے نیچے سے جھانکا تو ایک جوان آدمی کے جسم کے چیتھڑے اڑتے ہوئے دیکھے۔ اس کی گردن، اس کا سر، اس کے بازو اور ٹانگیں مختلف سمتوں میں کھینچے جا رہے تھے۔ اور اس کا منہ بھی جس سے خون بری طرح بہہ رہا تھا۔ "مت دیکھو"

میرے والد نے مجھے سختی سے اپنے ہاتھوں سے دباتے ہوئے پکارا میں اپنے گھٹنوں کے بل جھک گئی۔ میرے والد نے ہجوم کو سرزنش کی کہ قاتل کو زندہ چھوڑ دو۔ مجبوراً انہوں نے اسے چھوڑ دیا مگر میں یہ منظر مدتوں تک نہ بھول سکی۔

اسی طرح میں وہ نظارہ بھی نہیں بھولی کہ کس طرح میرے والد نے ایوب کی آمریت اور حراست کے غیر منصفانہ اختیارات کے خلاف اپنے نامختتم احتجاج میں بھوک ہڑتال جاری رکھی۔ قید سے اپنی رہائی کے بعد مدتوں تک وہ سرعام المرتضٰی میں شامیانہ لگا کر دوسرے پی پی پی کے راہنماؤں کے ساتھ بیٹھے رہے۔ تمام لاڑکانہ نے انہیں دیکھا کہ وہ روز بروز کمزور سے کمزور تر ہو رہے تھے اور اس بات نے لوگوں کو خوفزدہ کر دیا۔ "برائے مہربانی پاپا کی بات مان جاؤ" خاموشی سے میں ایوب کے بارے میں یہ دعا کرتی رہی اور اس بات پر حیران ہوتی رہی کہ میرے والد کے ارد گرد بیٹھے ہوئے حضرات کیسے ہٹے کٹے دکھائی دیتے ہیں۔ "جب وہ اپنے کمروں میں جاتے ہیں تو خوراک طلب کرتے ہیں ملازمین میں سے ایک نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا اپنے والد کو یہ مت بتائیں"۔

پورے پاکستان میں کھمبیوں کی طرح شہروں کی مصروف گلیوں اور بار ایسوسی ایشنوں کے سامنے بھوک ہڑتال مصر تھے گروہ پیدا ہو گئے۔ بڑے بڑے ہجوم بھوک ہڑتالیوں کے گرد انہیں اپنی اخلاقی حمایت کا یقین دلانے کے لئے ہر روز جمع ہونا شروع ہو گئے اور ایوب کے استعفیٰ کا مطالبہ کرنے لگے۔ یہ احساس کرتے ہوئے کہ اب پولیس بھی حالات کو قابو میں رکھنے سے قاصر ہے۔ ایوب نے آخر کار ۲۵ر مارچ ۱۹۶۹ء کو صدارت چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن یہ فتح عارضی ثابت ہوئی کہ اپنے ہی آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایوب نے قومی اسمبلی کے سپیکر کی بجائے فوج کے چیف آف سٹاف یحییٰ خان کو پاکستان کا نیا سربراہ نامزد کر دیا۔ ایک مرتبہ پھر پاکستان فوجی آمر کی زد میں آ گیا۔ جس نے تمام سول قانون معطل کر دیئے اور مارشل لاء نافذ کر دیا۔

"ریڈکلف سے تمہارے نام خط آیا ہے" میری والدہ نے یکم اپریل کو مجھے بتایا میں نے کچھ شکوک کے ساتھ لفافہ پکڑا۔ کیا مجھے ضرور جانا چاہئے؟ کالج نے میرے والد کو متنبہ کر
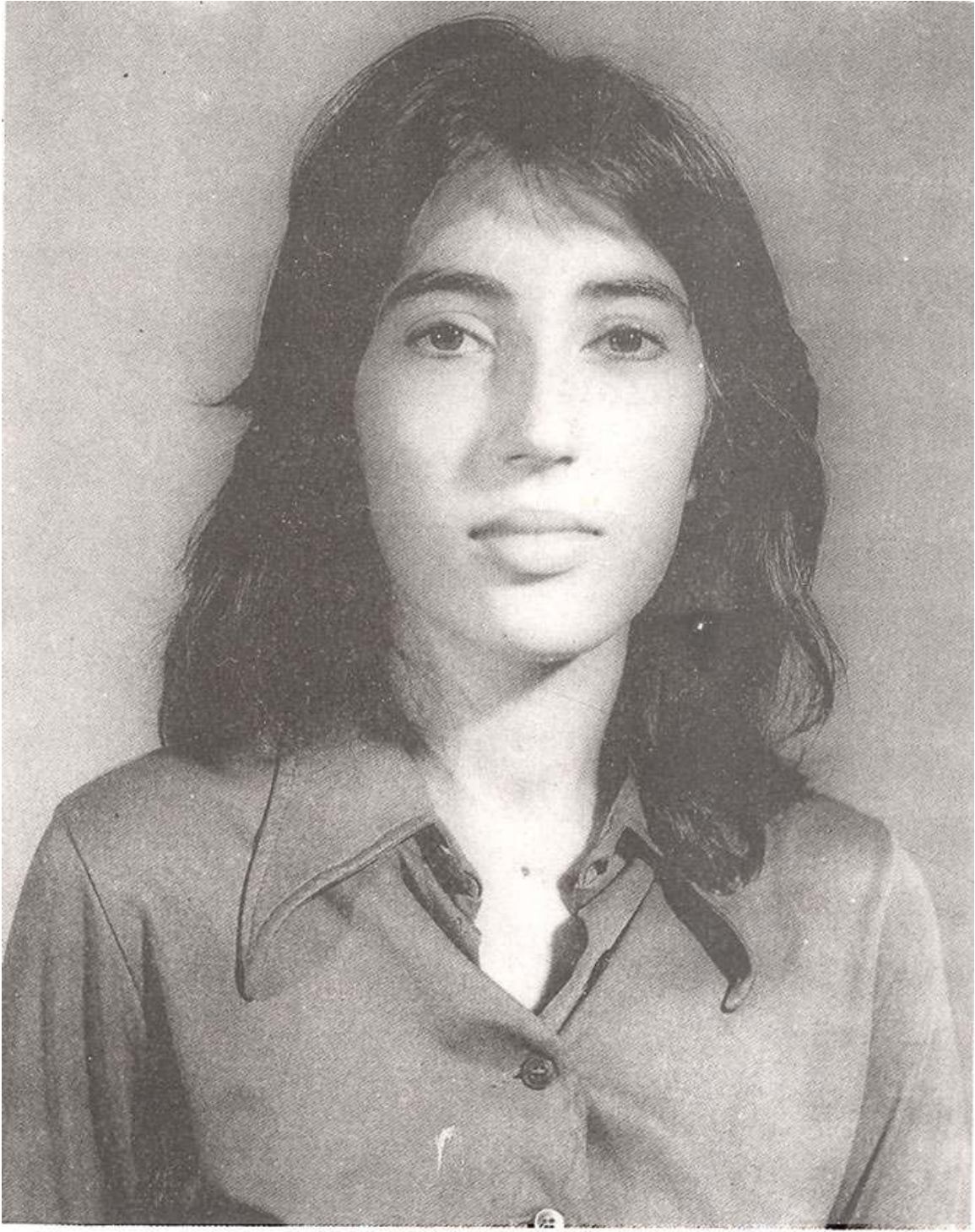
محترمہ بے نظیر بھٹو کی زمانہ طالب علمی کی ایک یادگار تصویر

دیا تھا کہ "سولہ سال کی عمر ریڈ کلف میں داخلے کے لئے کم متصور ہوتی ہے اور مشورہ دیا کہ ایک سال اور انتظار کر لوں" لیکن میرے والد نے مجھے ٹھہرنے کا مشورہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی بجائے انہوں نے اپنے دوست جان کینتھ گلبریتھ جو ہارورڈ میں اقتصادیات کے پروفیسر اور ہندوستان میں سابقہ امریکی سفیر تھے کی امداد طلب کی۔ میں نے لفافہ کھولا تو مجھے معلوم ہوا کہ ۱۹۶۹ء کے موسم سرما کے سیشن میں مجھے داخلہ دیدیا گیا تھا۔

میرے والد نے قرآن حکیم کا ایک خوبصورت نسخہ خوبصورت جلد میں مزین مجھے الوداعی تحفہ کے طور پر دیا۔ "تم امریکہ بہت سی ایسی چیزیں دیکھو گی جو تمہاری حیرت کا سبب بنیں گی اور کچھ ایسی بھی جو ذہنی صدمے کا باعث بنیں گی" لیکن مجھے امید ہے کہ تم میں حالات سے سمجھوتہ کرنے کی صلاحیت ہے۔ سب سے بڑی چیز تعلیم میں محنت ہے...... پاکستان میں بہت کم لوگوں کو تمہارے جیسا موقع میسر آتا ہے اور تمہیں اس کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے یہ مت بھولو کہ تمہارے بھیجے جانے پر جو خرچہ اٹھے گا وہ ہماری اپنی زمینوں سے آتا ہے ان لوگوں کی محنت ہے جو خون پسینہ ایک کر کے کماتے ہیں اور ان زمینوں پر کام کرتے ہیں"۔ "تمہیں ان کا قرض چکانا ہے اور یہ قرض تم چکا سکتی ہو اگر بفضل خدا اپنی تعلیم کو ان لوگوں کی زندگیاں بہتر بنانے پر صرف کرو" انہوں نے کہا۔

اگست کے آخری ہفتے میں ۷۰ کلفٹن کے لکڑی سے تراشیدہ راستے میں کھڑی تھی کہ میری والدہ نے قرآن حکیم کے نسخے کو میرے سر کے اوپر پھیرا۔ میں نے اس کا بوسہ لیا۔ ہم دونوں اس کے بعد ائرپورٹ کے لئے روانہ ہو گئیں تاکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو بذریعہ طیارہ روانہ ہو جائیں۔

باب ۳

المرتضیٰ سے چند مشاہدات

جمہوریت کا میرا پہلا تجربہ

جونہی میری والدہ اور میں المرتضیٰ میں نظربندی کے دوسرے مہینے میں داخل ہوئے تو گرمی کی شدت کے باعث باغات جھلس رہے تھے۔ میرے والد کی قید اور شہادت کے بعد ان باغات اور دیگر زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے ہمیں دس آدمیوں کی ضرورت تھی۔ لیکن چونکہ المرتضیٰ کو میری والدہ اور میرے لئے سب جیل قرار دیا جاچکا ہے۔ اس لئے ضیاء کی فوجی حکومت نے صرف تین باغبانوں کو داخلہ کی اجازت دی ہے۔ میں بھی باغات کو زندہ رکھنے کی جدوجہد میں شامل ہو گئی ہوں۔

میں پھولوں کو خصوصاً اپنے والد کے گلابوں کو مرجھا تا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ہر مرتبہ جب وہ غیر ملکی سفر پر جاتے واپسی پر اپنے باغ میں اگانے کے لئے مختلف النوع گلاب کے پودے لے آتے۔ بنفشئی گلاب، سنگتری گلاب اور ایسے گلاب جو ظاہراً گلاب نہیں لگتے مگر اس ہنرمندی سے تراشے گئے ہیں کہ گیلی مٹی سے بنائے گئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا پسندیدہ پھول نیلا گلاب تھا جسے "امن کا گلاب" بھی کہا جاتا ہے۔ اب غفلت کی وجہ سے

یہی گلاب مرجھا نا اور زرد ہونا شروع ہوگئے۔

ہر صبح تمتماتی موسم گرما کی حدت میں سات بجے تک میں باغ میں پہنچ جاتی تاکہ باغبانوں کے ساتھ بھاری کینوس پائپ اٹھانے میں مدد کروں اور ایک کیاری سے دوسری کیاری کو پانی دینے میں آسانی ہو۔ گھر کے چاروں کونوں سے فرنٹیئرفورس کے سپاہی کام کرتے ہوئے دیکھتے مکمل طور پر باغ کو پانی دینے میں باغبانیوں کے تین دن صرف ہوتے تھے۔ ہمیں آٹھ دن لگتے جب ہم گلاب کی آخری جھاڑیوں تک پہنچتے. پہلی جھاڑیاں مرجھا نا شروع کر دیتیں۔ زندہ رہنے کی ان کی جدوجہد میں میں انہیں زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ انہیں کافی پانی اور قوت دستیاب نہیں تھی بلکہ زندہ رہنے کی جدوجہد میں میری آزادی پر بھی پابندی تھی۔

میری زندگی کے خوشگوار ترین لمحات المرتضٰی میں پھلدار درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں اور گلاب کے پھولوں میں گزرے ہیں۔ دن کے دوران "دن کے راجہ" کی خوشبو ہر سمت پھیلی ہوتی، بھینی خوشبو کے سفید پھول جو میری والدہ بہت سی پاکستانی خواتین کی طرح اپنے جوڑے میں سجاتی تھیں۔ شام کے بعد "رات کی رانی" کی خوشبو پھیلتی جو بالکنی پر بیٹھے ہمارے خاندان کے افراد کی شامیں مہکادیتی۔ جتنے زیادہ کینوس کے پائپ، اتنا ہی زیادہ پانی، میں آنگن سے پتوں کو صاف کرتی، لان کو کریدتی یہاں تک کہ میرے بازو درد کرنا شروع کر دیتے۔ میری ہتھیلیوں پر چھالے پڑجاتے۔ جب دوپہر تک میں تھک ہار کر گر جاتی تو میری والدہ فکرمندی کے ساتھ پوچھتیں "تم اپنے ساتھ یہ سب کچھ کیوں کررہی ہوں؟" مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے، میں بتاتی .... اگر میں اس قدر محنت کرتے کرتے تھک جاتی ہوں تو اچھا ہے کہ تھکی حالت میں میری سوچ بھی جواب دے جاتی ہے۔ اور میں مارشل لاء کے ماتحت اپنی زندگیاں ضائع ہونے پر سوچنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ میں نے پھولوں کی ایک نئی کیاری کھودی اور گلاب کی ٹہنیاں اگادیں لیکن وہ نہ پھل سکیں۔ میری والدہ نے بھنڈی، مرچیں اور پودینہ کے پودے اگائے اور وہ اس میں کامیاب رہیں۔ میں پالتو سارس کے جوڑے کو سیٹی بجاکر بلاتی تو وہ پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے روئی کا ٹکڑا لینے

کے لئے میری طرف دوڑتے آتے۔ جانور کو بلاؤ اور وہ آجائے۔ کچھ اگاؤ اور وہ اگ جائے یہ اس بات کا کافی ثبوت تھا کہ میں بھی کائنات میں موجود ہوں۔

جب میں باغ میں کام نہیں کر رہی ہوتی تو وقت گزرنا محال ہو جاتا۔ میں پڑھتی رہتی اور اپنے دادا کی ارل سٹینلے گارڈنر کی تصانیف باربار پڑھتی کئی مرتبہ بجلی چلی جاتی اور میری والدہ کو اور مجھے تاریکی میں کئی کئی دن اور راتیں گزارنا پڑتیں۔ ٹی وی سیٹ تو موجود ہوتا لیکن بجلی کے ہوتے ہوئے بھی دیکھنے کو کچھ نہ ملتا۔ میرے والد کے وقتوں میں ڈرامے تھے، فلمیں تھیں، ٹیلی ویژن پر غنائی کھیل تھے اسی طرح مذاکرے اور خواندگی کے پروگرام تاکہ لوگ پڑھنا سیکھ جائیں۔ جب میں اب ٹی وی کو آن کرتی تو وہاں کچھ نظر نہ آتا سوائے ضیاء کے۔ ضیاء ایک اور تقریر کرتے ہوئے، ضیاء کی تقریروں پر بحثیں، سنسر شدہ خبروں کے پروگرام، جن میں بتایا جاتا کہ ضیاء کے ساتھ کن کن لوگوں نے ملاقات کی۔ سوا آٹھ بجے ہر رات میری والدہ اور میں بی بی سی ریڈیو کی اردو رپورٹ بلاناغہ سنتے، صرف بی بی سی کے ذریعہ ہی ہمیں پتہ چلا کہ نومبر میں اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کو آگ لگاکر جلادیا گیا۔ یہ کام ایک مشتعل ہجوم کا تھا جن کا خیال تھا کہ مکہ مکرمہ کے بیت الحرم پر قبضہ کرنے والوں کے پیچھے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ہاتھ ہے۔ جب پوری خبر کی تفاصیل سامنے آئیں تو میری والدہ اور میں حیرت زدہ رہ گئیں کہ اسلام آباد میں مارشل لاء کی پابندیوں اور حفاظتی حصار کے باوجود بسوں کو اکٹھا ہونے کی اجازت دی گئی۔ بنیاد پرست طلباء کو ان میں سوار ہونے دیا گیا اور امریکی سفارت خانے تک لے جایا گیا۔ جس کو انہوں نے آگ لگادی۔ سفارت خانہ کی عمارت گھنٹوں جلتی رہی تا آنکہ حکام جو پی پی پی کے مظاہرین تک آنکھ جھپکتے میں پہنچ جاتے تھے حاضر ہوئے امریکی سفارت خانہ پوری طرح جل چکا تھا اور ایک آدمی بھی مارا گیا تھا۔ پشیمان دل ضیاء نے ٹی وی پر امریکنوں سے معافی مانگی اور نقصانات ادا کرنے کی پیشکش کی لیکن اس کے دل میں سب کچھ کرنے کا کیا راز تھا۔ آج تک عیاں نہیں ہوسکا۔

ایک مہینے بعد بی بی سی کی یہ خبر بہت زیادہ اشتعال انگیز تھی۔

۲۷ر دسمبر ۱۹۷۹ء کو روسی افواج افغانستان میں داخل ہو جاتی ہیں۔ میری والدہ اور میں بی بی سی پر یہ خبر سنتے ہی ایک دوسرے کو تکتی ہیں اور جانتی ہوں کہ اب سیاسی الجھنیں لاتعداد حد تک بڑھ جائیں گی۔ دنیا کی دو سپر طاقتوں کی جنگ اب ہماری دہلیز پر لڑی جائے گی۔ اگر امریکی قیادت روسی موجودگی کا مقابلہ کرنے کی ٹھانتی ہے تو انہیں ایسے ملک کی ضرورت پڑے گی جو داخلی طور پر مضبوط ہو اور اس طرح پاکستان میں جمہوریت کی فی الفور بحالی کی طرف توجہ کی جائے گی۔ اور اگر انہوں نے افغانستان میں مزید واقعات کی پیش رفت کا جائزہ لینا مناسب سمجھا تو ضیاء کی آمریت کو اس سے کمک ملے گی۔

امریکہ .... یہ امریکہ ہی تھا جہاں پہلے پہل مجھے جمہوریت کا تجربہ حاصل ہوا۔ اور جہاں میں نے اپنی زندگی کے چار پرمسرت برس گزارے۔ میں آنکھیں بند کر کے ہارورڈ . ریڈکلف کے کیمپس کا تصور کر سکتی ہوں اور دیکھتی ہوں خزاں زدہ اشجار کے قرمزی زرد رنگ، موسم سرما میں برف کا پھیلا ہوا نرم کمبل، اور وہ ہیجانی کیفیت جو ہم سب موسم بہار میں کونپلوں کے پھوٹنے پر محسوس کرتے تاہم ریڈکلف میں بطور ایک طالبہ میں نے تیسری دنیا کے ملکوں کی بے بسی نزدیک سے دیکھی اور دونوں عالمی طاقتوں کی خود غرضیوں کا تماشا بھی کیا۔

پاکستان .... "پاکستان کہاں ہے؟" میری نئی ہم جماعتوں نے مجھے ریڈکلف پہنچنے پر سب سے پہلے پوچھا۔ اس وقت جواب دینا قدرے آسان تھا۔ "پاکستان دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے" میرا جواب تھا یعنی سفارت خانے کے ہینڈ آؤٹ جیسا۔ "پاکستان کے دو بازو ہیں جن کے درمیان ہندوستان واقع ہے"۔

"اچھا ہندوستان!" بڑا ٹھہرتا سا جواب تھا۔ "تم ہندوستان کے پڑوسی ہو" میں ہمیشہ ہی اس وقت تلملائی جب بھی ہمارے ساتھ ہندوستان کا حوالہ دیا جاتا یعنی وہ ملک جس سے ہم دو تلخ ترین جنگیں لڑ چکے تھے۔ پاکستان کو امریکہ کا زبردست اتحادی سمجھا جاتا تھا اور ایک ایسی درمیانی ریاست جو ہندوستان میں اور ہمارے دوسرے سرحدی ممالک کمیونسٹ چین . افغانستان اور ایران میں روس کے دائرہ اثر میں رکاوٹ خیال کی جاتی تھی۔ ریاستہائے متحدہ

امریکہ نے شمالی پاکستان میں "یو - ۲" طیاروں کے لئے ہمارے ہوائی اڈے استعمال کئے بشمول اس بدقسمت طیارے کے جسے ۱۹۶۰ء میں گیری پاورز نے اڑایا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں ہنری کسنجر نے اسلام آباد سے چین کی طرف کامیاب اڑان کی جس نے اگلے سال صدر نکسن کے چینی دورے کی راہ کھول دی۔ اس کے باوجود زیادہ تر امریکی میرے ملک کے وجود سے بھی بے خبر تھے۔

نتیجتاً وہ لوگ بھٹو خاندان سے بھی لاعلم تھے اور زندگی میں پہلی دفعہ گمنامی کے مزے کو پسند کیا۔ پاکستان میں بھٹو کا نام ہماری پہچان تھا۔ اور کچھ خاندانی اہمیت کا احساس بھی ساتھ ہی نمایاں ہو جاتا تھا۔ مجھے پتہ نہیں چلتا تھا کہ لوگ مجھے میری ذاتی صلاحیت کی بنا پر چاہتے ہیں یا میرے خاندان کے نام کی وجہ سے۔ ہارورڈ میں پہلی مرتبہ میں اپنی صلاحیتوں پر کھڑی تھی۔

میری والدہ پہلے چند ہفتے میرے ساتھ رہیں اور انہوں نے ایلیئٹ ہال میں میرے بسکون آباد ہونے اور مکے کی سمت تعین کرنے میں مدد دی تاکہ میں اس جانب رخ کر کے نماز ادا کر سکوں۔ جب مجھ سے بچھڑنے لگیں تو میرے لئے خصوصی طور پر تیار کردہ اونی شلوار قیمض چھوڑ گئیں جو انہوں نے کافی محنت کے ساتھ میرے لئے تیار کروائی تھی اور جس کے نیچے ایک ریشمی تہہ بھی تھی تاکہ اونی دھاگہ ادھڑ نہ سکے۔

نماز کیلئے انہوں نے جو سمت بتائی تھی وہ تو پوری طرح میری توجہ کا مرکز تھی مگر لباس کے معاملہ میں ان کی رائے بارش اور برف باری کی وجہ سے قابل عمل نہیں تھی اور میں اپنے آپ کو دوسرے طالب علموں سے الگ تھلگ بھی نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ میں نے اپنے بال لمبے اور سیدھے رکھ لئے اور ایلیئٹ ہال میں میری سہیلیاں تعریف کرتی ہوئی کہتیں کہ میں جون بیز کی طرح نظر آتی ہوں۔ میں نے سیب کا جوس گیلنوں کے حساب سے پیا، لاتعداد آئس کریم کی کونیں کھائیں۔ جن پر برگھم کی آئس کریم پارلر کی شیرینی چھڑکی ہوئی ہوتی تھی۔ اسی طرح بوسٹن کے ناچ گھر بھی دیکھے اور پروفیسر اینڈ مسز گیلبر یتھ کے گھر میں پارٹیاں بھی کھائیں۔ وہ یہاں میرے والدین کی طرح تھے۔

"عدم جارحیت" کی تحریک اپنے عروج پر تھی میں نے بھی واشنگٹن ڈی سی کی ایک عظیم ریلی اور بوسٹن میں "یوم نادہندگئی قرضہ جات" پر ہارورڈ کے ہزاروں طلباء کے ہمراہ منعقدہ ریلی میں شمولیت کی جہاں ستم ظریفی قسمت سے آنسو گیس کا پہلا ذائقہ چکھا۔ میں گھبرا گئی جب پہلی مرتبہ اپنی قمیص پر "طلباء کو گھر واپس لے آؤ" کا بیج نصب کیا۔ غیر ملکی ہونے کے ناطے کسی سیاسی ریلی میں پکڑے جانے پر مجھے ملک بدر بھی کیا جاسکتا تھا۔ لیکن میں نے ویت نام کی جنگ کی مخالفت اپنے وطن میں بھی کی تھی اور امریکہ میں "خلاف جنگ" تحریک کے بخار نے مجھے اور بھی انقلابی بنادیا تھا۔ میرے ساتھی مارچ کرنے والوں کے اور میرے محرکات ایک جیسے تھے "امریکنوں کو ایشیاء کی خانہ جنگی میں ملوث نہیں ہونا چاہئے"۔

پاکستان میں چار سکولوں کی چھ شاخوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہارورڈ میں مسلسل چار سالہ تعلیم مجھے بہت پسند آئی۔ اردگرد ماحول میں بہت کچھ ہورہا تھا۔ عورتوں کی تحریک کا تسلسل ابھرتا جارہا تھا۔ ہارورڈ کا کتب خانہ عورتوں کے متعلق کتابوں اور میگزینوں سے بھرا پڑا تھا اس میں کیمپس کی بائبل یعنی کیٹ ملٹ کی کتاب "جنسی سیاست" اور "مس" میگزین کے پہلے شمارے شامل تھے۔ ہر رات میری سہیلیاں اور میں مستقبل میں اپنی خواہشات کے بارے میں گفتگو کرتیں اور شادی کی صورت میں ہمارے ہونے والے مردوں سے تعلقات کی کیانوعیت ہوگی اس پر تبصرہ کرتیں۔ میں اس اقلیت میں شامل تھی جو شادی اور عیال کو اپنی فوری منزل تصور نہ کرتیں۔ ہارورڈ میں میں عورتوں کے سمندر کا حصہ تھی جنہوں نے جنس کی بناء پر اپنے راستے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کی۔ میرا ابتدائی اعتماد بلند ہوا اور بچپن کا شرمیلا پن ختم ہوگیا۔ پاکستان میں میری ہمشیرہ، بھائی اور میں دوستوں اور رشتے داروں کے محدود دائرے میں گھومتے تھے۔ نتیجتاً ناواقف اجنبی لوگوں کے سامنے پریشان سے دکھائی دیتے تھے۔ ہارورڈ میں میرا شناسا کوئی نہیں تھا سوائے پیٹر گیلبر یتھ کے جس سے میرا تعارف کالج میں داخلہ سے قبل اس کے والدین کے گھر پر ہوا تھا۔ میری محفوظ اور قدامت پسند نظر میں پیٹر گیلبر یتھ کا حلیہ ہولناک تھا۔ اس کے

بال لمبے تھے پرانے اور میلے کپڑوں میں ملبوس رہتااور اپنے والدین کے سامنے تمباکونوشی بھی کرتا۔ اور ایک راستہ بھولا ہوا بچہ لگتا جسے سابق سفیر ہندوستان سے اپنے گھر لے آئے تھے۔ ایک مدبر ڈپلومیٹ اور معزز پروفیسر کا بیٹانہیں لگتا تھا۔ مجھے اس وقت قطعاً علم نہیں تھا کہ یہی پیٹر جو بعد میں ایک اچھا دوست بن گیا پندرہ برس بعد پاکستان میں میری رہائی کیلئے مدد ومعاون ثابت ہوگا۔

لیکن پیٹرہارورڈ میں ہزاروں طلباء میں سے ایک تھا مجھے اجنبی طلباء سے لائبریری کا راستہ پوچھنا پڑتا لیکچرہال اور اپنی آرام گاہ کی سمتیں پوچھنا پڑتیں یعنی میں خاموش تماشائی بنی نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک عجیب اور غیر ملکی تالاب کے آخری گہرے کنارے میں مجھے پھینک دیا گیا تھا۔ مجھے ڈوبنے سے ابھرنے کے لئے اپنے ہی سہارے کی ضرورت تھی۔ میں جلد ہی نئی زندگی سے ہم آہنگ ہوگئی اپنے قیام کے پہلے ہی سال میں ایلیئٹ ہال کی سوشل سیکرٹری بن گئی اور بعد میں ہارورڈ کے اخبار میں جگہ حاصل کرنے کیلئے کوشش شروع کردی۔ اخبار "دی کرمزن" میں "کرمزن کی سوسائٹی" کیلئے کیمپس کی سیاحت کے راہنما اصول دیئے جاتے جو میں تیار کرتی۔ اس عمارت کا سرکاری نام "بین الاقوامی امور کا مرکز" تھا لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ سی آئی اے کا اصل مفہوم کیا ہے میں نئے طلباء کو ہلکے سے رازدارانہ انداز میں بتاتی۔ ہارورڈ کی متنازعہ بصری فن کی شاہکار عمارت جسے فرانسیسی ماہر عمارت سازی لاکاربینرئر نے تعمیر کیا کچھ زیادہ بہتر نہیں تھی۔ ایک معیاری لطیفہ یہ بن گیا۔ "ماہر عمارت سازی نے پلان کو دراصل الٹا دیکھا اور بنایا" تاہم کچھ ثقافتی تضادات تھے جن کو سر کرنا میرے لئے مشکل تھا۔ جب ایلیئٹ ہال میں میرے شروع کے سالوں میں مخلوط تعلیم شروع ہوگئی تو میں نے مردوں کے ساتھ قریبی کوارٹروں میں رہنا پسند نہیں کیا۔ جب کبھی کسی مرد طالب علم کو لانڈری میں پاتی تو مجھے وہاں جانا اچھا نہ لگتا۔ مسئلہ اس وقت حل ہوا جب ہم ہارورڈ کیمپس کے ایلیئٹ ہاؤس میں چلے گئے جہاں میری ہم جماعت یولنڈاکوڈرزیکی اور میں اپنے رہائشی کمروں میں منتقل ہوگئیں جہاں لانڈری روم بھی بہت بڑا تھا۔

میرا خیال تھا کہ نفسیات کا مطالعہ کروں گی۔ لیکن جب مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ اس کلاس کے نصاب میں ادویات کا علم پڑھنا پڑتا ہے۔ اور جانوروں کی چیر پھاڑ بھی شامل ہے تو میں چڑچڑی ہو گئی اور میں نے مضمون "متقابل حکومتیں" لے لیا۔ میرے والد نے اس پر بہت خوشی کا اظہار کیا۔ انہوں نے خفیہ طور پر مسز ینٹنگ، صدر ریڈ کلف کو لکھا تھا کہ کوشش کر کے مجھے سیاسی نصاب حاصل کرنے پر آمادہ کریں۔ مگر مسز ینٹنگ نے بڑے مہربانہ انداز میں مجھے اپنی زندگی کے مستقبل کے بارے میں پوچھا اور یہ اشارہ تک بھی نہیں دیا کہ میرے والد نے ان کو خط لکھا تھا۔ "متقابل حکومتیں" یقیناً بہتر انتخاب تھا۔

ہارورڈ میں حکومت کے بارے میں مطالعہ سے پاکستان کے متعلق میری معلومات میں گوناں گوں اضافہ ہوا جو مجھے وہاں رہتے ہوئے بھی حاصل نہیں تھا۔ جب پولیس کا سپاہی سڑک پر اپنا ہاتھ بلند کرتا ہے اور پکارتا ہے "ٹھہرو" تو ہر ایک ٹھہر جاتا ہے۔ لیکن جب تم یا میں اپنا ہاتھ بلند کریں تو کوئی نہیں ٹھہرتا ہے۔ کیوں؟ پروفیسر جان واکمک نے ہمارے چھوٹے سے گروہ کو "انقلاب" پر ابتدائی سیمینار میں سوال کیا۔ "کیونکہ پولیس کے سپاہی کو آئین اور حکومت نے قانون نافذ کرنے کا اختیار دیا ہے۔ اس کے پاس مینڈیٹ ہے "ٹھہرو" کہنے کا قانونی حق ہے جو تمہیں یا مجھے حاصل نہیں۔

پروفیسر واکمک کی کلاس میں مبہوت بیٹھی رہتی جہاں غالباً میں ہی ایسی طالبہ تھی جو آمریت کے سائے میں رہتی تھی ایک مثال سے پروفیسر واکمک نے پاکستان میں ایوب اور یحییٰ خان کی حکومتوں کے زیر اثر نفرت اور لاقانونیت کی حالت کی نشاندہی کر دی۔ ان آمروں کے حکومت کرنے کا حق خود ساختہ تھا اور وہ عوام کا عطا کردہ مینڈیٹ نہیں تھا مجھے پہلی بار صاف طور پر نظر آیا کہ پاکستان کے لوگ اس قسم کی حکومت کی اطاعت گزاری میں کوئی دلیل نہیں مانتے تھے۔ اور "ٹھہرو" کہنے کے حق کو بھی قانونی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ جہاں کوئی قانونی حکومت نہ ہو وہاں لاقانونیت ہوتی ہے۔ میں اپنے سالانہ کورس کا نصف مکمل کر چکی تھی جب پاکستان میں قانونی حکومت حقیقت کے قریب آ گئی۔ ۷ر دسمبر ۱۹۷۰ء کو یحییٰ خان نے آخر کار انتخابات منعقد کرا دیئے جو پچھلے تیرہ برس میں پہلے الیکشن تھے۔

کیمبرج میں دنیا کے دوسری طرف میں نے ٹیلی فون اپنے سرہانے رکھ کر ساری رات مطالعہ جاری رکھا۔ جب میری والدہ نے مجھے بتایا کہ غیر متوقع طور پر میرے والد اور پی پی پی نے مغربی پاکستان میں مخالفوں کا صفایا کر دیا ہے۔ اور قومی اسمبلی کی ۱۳۸ سیٹوں میں سے ۸۲ حاصل کر لی ہیں تو مجھے بے پناہ مسرت ہوئی۔ مشرقی پاکستان میں جہاں عوامی لیگ کے راہنما شیخ مجیب الرحمٰن بلامقابلہ جیتے تھے انہوں نے بہت بڑی اکثریت حاصل کر لی تھی۔ "مبارک باد" اگلے روز ان لوگوں نے مجھے پیغام پہنچائے جنہیں میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا اور جنہوں نے میرے والد کی فتح کے بارے میں نیویارک ٹائمز میں پڑھا تھا۔ تاہم میری خوشی لمحاتی ثابت ہوئی۔ میرے والد اور مغربی پاکستان کے منتخب نمائندوں کی رفاقت میں ایک نیا آئین تحریر کرنے کی بجائے جو پاکستان کے دونوں بازوؤں کو یکساں قبول ہو۔ مجیب نے لوگوں کو مغربی وفاق سے مکمل قطع تعلق کی خاطر مشرقی پاکستان یعنی مشرقی بنگال کی تحریک آزادی کیلئے اکسایا۔ میرے والد نے شیخ مجیب سے پاکستان کی یکجہتی قائم رکھنے کی باربار اپیل کی اور یحییٰ کی فوجی حکومت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بطور شہری کے ملکر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن اپنے رویئے میں لچک دکھانے اور سیاسی ضرورت سے متفق ہونے کی بجائے مجیب نے ضد کا رویہ اپنایا جس کی منطق مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی۔

میرے والد نے مجیب سے گفت و شنید جاری رکھنا مفید نہ سمجھا تاکہ پاکستان کی یکجہتی کو آنچ نہ آئے اور مشرقی پاکستان فوجی حکومت کے ممکنہ انتقامی رویئے سے بچ جائے۔ ۲۷ر مارچ ۱۹۷۱ء کو وہ مجیب سے دوسرے راؤنڈ کی گفت و شنید کے سلسلہ میں مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکہ ہی میں تھے جب ان کے بدترین اندیشے صحیح ثابت ہوئے۔ یحییٰ خان نے فوج کو بغاوت فرو کرنے کا حکم دیدیا۔ اپنے ہوٹل کے کمرے سے تنہا، انہوں نے ڈھاکہ کو شعلوں کی لپیٹ میں جلتے دیکھا اور جرنیلوں کی طرف سے طاقت کے ناگزیر مظاہرے کو دل سے پسند نہیں کیا۔ اور چھ ہزار میل دور کیمبرج میں میں نے بھی اس سے ایک تلخ سبق سیکھا۔ جب ہارورڈ میں پہنچی تھی تو پاکستان کے بارے میں کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔ مگر لوٹ مار، زنابالجبر، اغواء اور قتل و غارت کی داستانیں اب ہر کوئی جانتا تھا اور میرے ملک کی مذمت

عمومیت اختیار کر چکی تھی۔ پہلے پہل مجھے مغربی اخبارات میں شائع شدہ مشرقی بنگال میں اپنی افواج کے مظالم کی داستانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ (بنگالی باغی ان دنوں اسے بنگلہ دیش کے نام سے پکارتے تھے) مگر حکومت کے کنٹرول کردہ پاکستانی اخبارات کے مطابق جو میرے والدین مجھے ہر ہفتہ ارسال کرتے تھے مختصر سی بغاوت کو فرو کیا جاچکا تھا۔ یہ کس قسم کے الزامات تھے کہ ڈھاکہ کو جلاکر راکھ کردیا گیا ہے۔ اور گولی چلانے والے فوجی دستے یونیورسٹی کے مضافات میں طلباء، اساتذہ، شعراء، ناول نویس، ڈاکٹرز اور وکلاء کے قتل کیلئے بھیج دیئے گئے ہیں۔ پناہ گزین ہزاروں کی تعداد میں مفرور ہورہے ہیں۔ ان میں سے بہتوں پر پاکستانی طیاروں نے گولیاں برسائیں اور انہیں قتل کردیا۔ یہاں تک کہ مقامی لوگوں نے سڑکوں میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کیلئے مردہ جسموں کو استعمال کیا۔ مجھے ان باتوں پر یقین نہیں آتا تھا یہ داستانیں اس قدر انتہا پر تھیں کہ مجھے سن کر الجھن ہوتی تھی ہماری ابتدائی کلاس میں ہمیں زنابالجبر کے خطرات کے متعلق جو لیکچر دیئے جاتے ریڈ کلف میں سن کر وحشت ہوتی تھی۔ میں نے امریکہ آنے سے قبل زنابالجبر کے بارے میں کبھی سنا تک نہیں تھا۔ اور اب اس امکان کی وجہ سے میں اگلے چار سال کبھی رات کو اکیلی باہر نہیں نکلی۔ لیکچر سننے کے بعد ہارورڈ میں بھی زنابالجبر کا امکان حقیقی محسوس ہوتا تھا۔ مگر مشرقی بنگال میں فوج کی موجودگی میں ایسے واقعات کے رونما ہونے کا میں تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ میری رائے میں مغربی اخبارات کی رپورٹیں مبالغہ آرائی پر مبنی اور اسلامی ریاست کے خلاف صیہونیوں کی سازش تھی۔

ہارورڈ میں میرے ہم جماعتوں کو یقین دلانا مشکل تھا "تمہارے فوجی بربریت پر تلے ہوئے ہیں" یہ عام الزامات تھے۔ "تم بنگالیوں کو ذبح کررہے ہو" "ہم بنگالیوں کو قتل نہیں کررہے" میں غصے سے نیلی ہوجاتی اور ان کو جواب دیتی "کیا تم اخباروں کی خبروں میں اندھادھند یقین کرلیتے ہو" ہر شخص پاکستان کا مخالف بن گیا تھا وہ لوگ بھی جن کے ہمراہ سال کے آغاز میں میں مشرقی پاکستان میں طوفان کی تباہ کاریوں کے شکار بنگالیوں کیلئے چندہ مانگنے دربدر گئی تھی۔ الزامات میں تلخی آتی گئی۔ تم لوگ فاشسٹ ہو آمر ہو، میں اس

بات کا کوئی جواب نہ دے پاتی۔ جب اخباروں سے پتہ چلتا کہ ہندوستان ہزاروں بنگالی پناہ گزینوں کو گوریلا جنگ کیلئے تیار کر رہا ہے اور بذریعہ سرحد واپس بھیج رہا ہے۔ ''ہم ہندوستانی شہ پر کی جانے والی بغاوت کو کچل رہے ہیں'' میں ترت جواب دیتی ''ہم ملک کی یکجہتی کیلئے لڑ رہے ہیں جس طرح تم، حالانکہ بعض اوقات یہ بالکل بے بنیاد ہوتی۔ '' پاکستان نے بنگلہ دیشی لوگوں کو حق خوداختیاری دینے سے انکار کر دیا ہے'' پروفیسر والزر ایک پبلک جلسہ میں ''جنگ اور اخلاقیات'' کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے گرجے۔ میں لیکچر ہال میں ۲۰۰ دوسرے طلباء کے سامنے فوراً اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی اور زندگی کی پہلی سیاسی تقریر کر ڈالی۔ ''یہ بالکل غلط ہے پروفیسر صاحب'' میں نے تھرتھراتے لہجے میں انہیں صحیح کیا۔ ''بنگال کے لوگوں نے ۱۹۴۷ء میں اپنا حق خوداختیاری استعمال کیا تھا جب انہوں نے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ہال میں سنسناتی ہوئی خاموشی چھاگئی میرا نقطہ نظر تاریخی طور پر درست تھا۔ ایک غم ناک سچائی یہ تھی جس کا میں سامنا کرنے سے کترا رہی تھی کہ بنگالی ایک قسم کی غلط فہمی کا شکار ہوگئے ہیں جو مشرقی پاکستان کی تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے خدا سے لاتعداد مرتبہ اپنی لاعلمی کی معافی مانگی ہے مجھے اس وقت نظر نہ آیا کہ پاکستان کے جمہوری مینڈیٹ کی کس طرح شدید خلاف ورزی کی گئی تھی۔ اکثریتی صوبہ مشرقی پاکستان سے اقلیتی صوبہ مغربی پاکستان کی طرف سے نو آبادیاتی سلوک کیا جاتا تھا۔ مشرقی پاکستان کی بر آمدات سے کمائے ہوئے ۳۱ ارب روپے کے زرمبادلہ سے مغربی پاکستان کی اقلیت نے اپنے لئے سڑکیں، سکول، یونیورسٹیاں اور ہسپتال تعمیر کر لئے تھے مگر مشرقی پاکستان میں مقابلتاً کچھ بھی نہیں تھا۔ ہمارے غریب ملک میں سب سے بڑا ملازمتی ادارہ فوج تھی جس میں ۹۰ فیصد افراد مغربی پاکستان سے بھرتی کئے جاتے تھے۔ اسی طرح سرکاری ملازمتوں کے ۸۰ فیصد افراد مغربی پاکستان کے لوگوں میں سے ملازم رکھے جاتے تھے۔ مرکزی حکومت نے اردو کو قومی زبان کا درجہ دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ ایک ایسی زبان جسے مشرقی پاکستان میں بہت کم سمجھا جاتا تھا اور جس کی وجہ سے بنگالیوں کیلئے حکومت یا

تعلیم میں ملازمتوں کے حصول کیلئے ایک اور رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ بنگالی محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کو الگ تھلگ کر دیا گیا ہے اور اس طرح ان کا استحصال کیا گیا ہے۔

میں ہارورڈ میں یہ بات سمجھنے کیلئے ابھی کم عمر اور سادہ لوح تھی کہ پاکستانی فوج بھی دوسرے ممالک کی افواج کی طرح جنہیں شہریوں میں بے قابو چھوڑ دیا جائے اس قسم کے مظالم برپا کر سکتی تھی۔ یہ خطرناک ہو سکتا ہے جب امریکی افواج نے ۱۹۶۸ء میں ویت نام مائی لائی کے مقام پر قتل عام کیا تھا۔ برسوں بعد ضیاء نے میرے صوبے سندھ میں جبرواذیت کا جو طوفان برپا کیا وہ اس سے مختلف نہیں تھا۔ مسلح افواج کے سپاہی ضبط کا بندھن توڑ کر شہروں میں تباہی مچا سکتے ہیں۔ وہ ان کو دشمن کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جن کو گولی کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ جن کو لوٹا جا سکتا ہے یا جن سے زنا بالجبر کیا جا سکتا ہے۔ تاہم ۱۹۷۱ء کے دہشت ناک موسم بہار میں میں پاکستانی افواج کے بچپن کے تصور سے چمٹی رہی جنہوں نے بہادری سے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہندوستان سے نبرد آزمائی کی تھی۔ یہ وہ تصور تھا جو آہستہ آہستہ اور کرب آمیز انداز میں ختم ہوتا گیا۔

"پاکستان ایک ہولناک آزمائش سے گزر رہا ہے" میرے والد نے ایک طویل خط میں مجھے لکھا جو بعد میں کتابی شکل میں بعنوان "عظیم المیہ" شائع ہوا۔ "پاکستانیوں کا پاکستانیوں کو قتل کرنا ایک ڈراؤنا خواب ہے جو ابھی ختم نہیں ہوا۔ خون ابھی بھی بہایا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے جارحانہ انداز میں ملوث ہونے سے حالات کی گھمبیرتا بڑھ گئی ہے۔ اگر ہم اس ہلچل سے جانبر ہو گئے تو پاکستان ہمیشہ کیلئے بامقصد طور پر زندہ رہے گا وگرنہ یہ خوفناک تشنج مکمل تباہی کی طرف لے جائے گا"۔

یہ خوفناک تشنج ۳ر دسمبر ۱۹۷۱ء کی صبح محسوس کیا گیا "نہیں" ایسا نہیں ہو سکتا میں اخبار کو زمین پر پھینکتی ہوئی ایلیئٹ ہال میں زور سے چلائی۔ قانون کی عملداری قائم کرنے کا بہانہ بنا کر ہندوستانی افواج نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا تھا اور مغربی پاکستان پر بھی وار کرنے سے گریز نہیں کیا۔ اعلیٰ ترین روسی ساختہ میزائل کراچی بندرگاہ میں کھڑے ہمارے

جنگی جہازوں کو ڈبو رہے تھے۔ ہندوستانی طیارے شہر کی اہم رسد گاہوں کو نشانہ بنارہے تھے۔ ہمارے ہتھیار اس قدر پرانے ہوچکے تھے کہ ہم جوابی حملہ نہیں کرسکتے تھے۔ اب میرے ملک کا وجود بھی خطرے میں پڑچکا تھا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ یہاں نہیں ہو" سمیعہ نے کراچی سے مجھے خط لکھا۔ ہر شب دشمن کا ہوائی حملہ ہوتا ہے اور ہم نے روشنی کو باہر جانے سے روکنے کیلئے کھڑکیوں کے شیشوں پر سیاہ کاغذ چڑھادیا ہے۔ سکول اور یونیورسٹیاں بند کردی گئی ہیں۔ چنانچہ کرنے کیلئے سوائے پریشانی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ جیسا ہوتا ہے اخبارات سے معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ ہمیں تو یہ تک پتہ نہیں تھا کہ ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر حملہ کردیا ہے یہاں تک کہ کسی نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا اور چلاکر کہا "جنگ چھڑگئی ہے، جنگ چھڑگئی ہے" سات بجے صبح کی خبریں سناتی ہیں کہ "ہم جیت رہے ہیں" لیکن بی بی سی کی ایشیا کیلئے نشریات کہتی ہیں کہ ہم کچل دیئے گئے ہیں، بی بی سی مشرقی پاکستان میں فوجیوں کے خوفناک جرائم کے ارتکاب کی خبریں بھی سناتا ہے۔ کیا تمہیں بھی اس بات کا کچھ علم ہوا ہے؟۔

تمہارا بھائی شاہنواز کراچی میں تیرہ سال کی عمر میں جوش سے بھرا ہوا ہے۔ وہ شہری دفاع کے محکمہ میں شامل ہوگیا ہے۔ اور ساری رات اپنے موٹر سائیکل پر گردونواح میں گھومتا پھرتا ہے۔ اور لوگوں کو روشنیاں بند رکھنے کی ہدایت کرتا ہے۔ ہم سب خوفزدہ ہیں ایک ہوائی حملہ کے دوران میں صنم کے ساتھ تمہارے گھر میں تھی اور تمہاری والدہ ہمیں سیڑھیوں تلے کھانے کے کمرے میں لے گئیں جہاں کھڑکی بھی کوئی نہیں۔ گھر میں میں اپنی والدہ کے ساتھ سوتی ہوں اور ہم بہت خوفزدہ ہیں۔ گلی کے باہر گھر سے کچھ فاصلے پر تین بم گرے لیکن خوش قسمتی سے کوئی بھی نہیں پھٹا۔ ہمارے باغ میں شیشے کی کرچیاں بکھری ہوئی ہیں۔

ہندوستانی طیارے کھڑکیوں کے اتنے قریب سے گزرتے ہیں کہ ہوا باز نظر آتا ہے۔ لیکن ہمیں اپنا طیارہ جوابی حملہ کرتا ہوا کہیں نظر نہیں آتا۔ تین راتیں پہلے دھماکے اس قدر شدید تھے کہ مجھے محسوس ہوا ہمارے پڑوسی کے گھر پر بم گرے ہیں۔ میں چھت پر گئی تو دیکھا تمام آسمان سرخ ہے اگلی صبح پتہ چلا کہ کراچی بندر گاہ کے تیل کے ذخیروں پر میزائلوں سے حملہ کیا گیا۔ آگ ابھی تک جل رہی ہے ہمیں اس سلسلہ میں امریکی امداد کا انتظار ہے۔

امریکہ سے کوئی فوجی امداد نہیں پہنچی۔ اگرچہ پاکستان کا ریاستہائے متحدہ امریکہ سے دفاعی معاہدہ ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرف کوئی غلط فہمی ہے۔ امریکن ہمیں اپنے دشمن سوویت یونین سے بچانے کیلئے تیار ہیں مگر پاکستان کو دراصل خطرہ ہندوستان سے ہے۔ اب بھی بہت سی فوجی امداد جو روسیوں کے خلاف افغان باغیوں کو دی جاتی ہے، پاکستانی افواج کے اسلحہ خانہ میں ہندوستان کے خلاف ممکنہ استعمال کیلئے جمع ہوتی ہے۔ ۱۹۷۱ء کے بحران میں صدر نکسن نے فوجی مداخلت کی جگہ محفوظ امریکی سفارتی کارکردگی کا سہارا لیا جسے امریکہ کا پاکستان کے حق میں رجحان تصور کیا گیا۔ ۴ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو جو تیرہ روزہ جنگ کا دوسرا دن تھا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی وزارت خارجہ نے جنگی شاخسانے کا الزام ہندوستان کے کندھوں پر دھر دیا۔ ۵ر دسمبر کو امریکہ نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں جنگ بندی کی قرارداد پیش کر دی۔ ۶ر دسمبر کو نکسن انتظامیہ نے ہندوستان کو دیا جانے والا ۸۵ ملین ڈالر کا ترقیاتی قرضہ معطل کر دیا۔ لیکن یہ کارکردگی ناکافی ثابت ہوئی۔ ہندوستانی حملے کے ایک ہفتہ بعد ڈھاکہ جو ہمارا مضبوط گڑھ تھا شکست کے قریب تھا۔ ہندوستانی افواج نے مغربی پاکستان کی سرحد بھی پار کر لی تھی۔ میدان جنگ میں مکمل شکست سے دوچار ہونے کے پیش نظر اور پورے ملک کو خطرے کی وجہ سے یحییٰ خان پاکستان کے ایک منتخب راہنما کی طرف جھکا جسے پاکستان کو بچانے کا اختیار اور اعتماد تھا یعنی میرے والد کی طرف۔

"میں اقوام متحدہ میں آرہا ہوں، ۹ر دسمبر کو نیویارک کے پیئرے ہوٹل میں مجھ سے
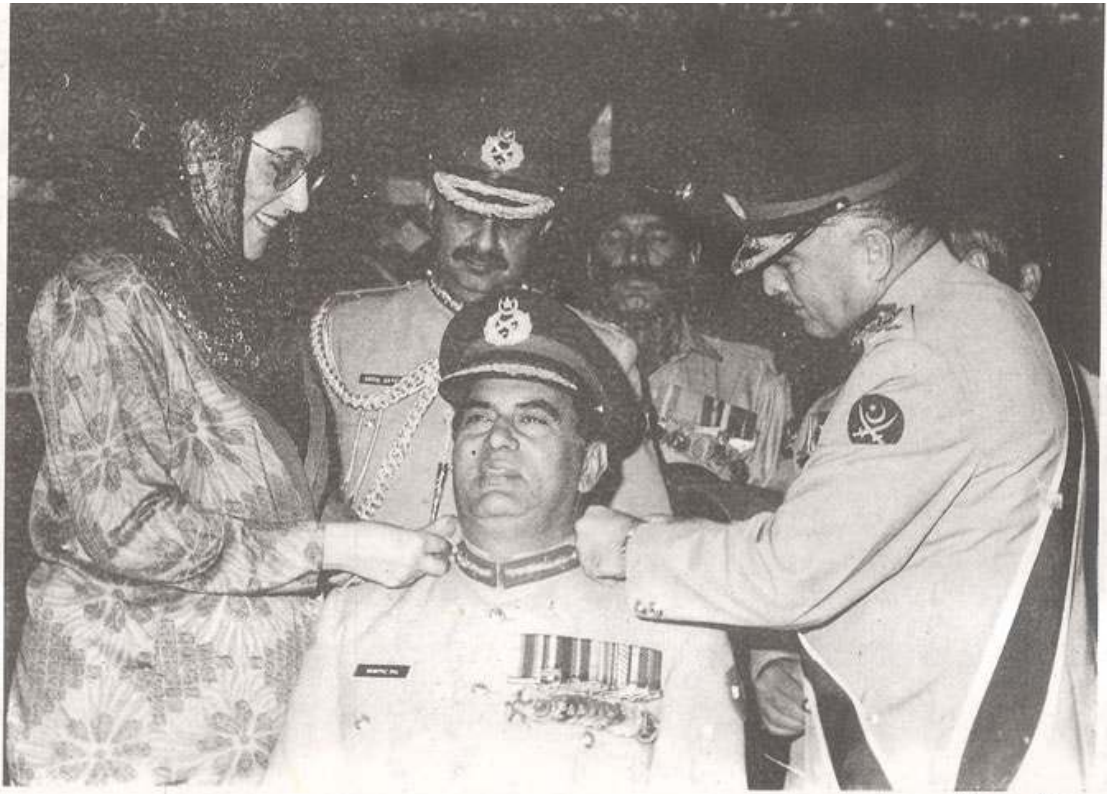
وزیر اعظم بے نظیر بھٹو اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل عبدالوحید ایک فوجی تقریب کے دوران' سینئر فوجی افسر کو بیج لگاتے ہوئے

ملو" یہ میرے والد کا پیغام تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ اقوام متحدہ میں پاکستان کو انصاف مل سکے گا" میرے والد نے نیویارک میں میری ملاقات پر پوچھا۔

"ہاں، البتہ پاپا" میں نے ۱۸ سالہ نوجوان لڑکی کی خوداعتمادی کے ساتھ کہا "کوئی ملک انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان نے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک دوسرے ملک پر حملہ اور قبضہ کیا ہے"۔

"کیا تم سمجھتی ہو کہ سلامتی کونسل ہندوستان کی مذمت کرے گی اور اپنی افواج کے واپس لیجانے پر اصرار کرے گی"۔

"وہ کیسے واپس نہیں کریں گے" میں نے بے یقینی کے ساتھ کہا "یہ امن نافذ کرنے والے ادارہ کے مینڈیٹ کو جھٹلانے کے مترادف ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور ہزاروں لوگ موت کے گھاٹ اتارے جاتے رہیں۔ اور ایک ملک بھی دولخت ہو جائے"۔

"پنکی، تم بین الاقوامی قانون کی اچھی طالبہ تو ہو سکتی ہو اور میں ہارورڈ کی انڈر گریجویٹ سے غیر متفق بھی نہیں ہو سکتا" "لیکن تمہیں طاقت کی سیاسیات کا ابھی کچھ پتہ نہیں" انہوں نے دھیمے لہجے میں مجھے کہا۔

میرے والد نے چار روز تک متحدہ پاکستان کو بچانے کیلئے دلائل دیئے مگر بے سود۔ یہ تصور ابھی تک میرے ذہن میں ویسے ہی قائم ہے۔

میں سلامتی کونسل میں ان سے دو قطاریں پیچھے بیٹھی ہوئی ہوں۔ جنرل اسمبلی میں ۱۰۴ ملکوں نے اور اسی طرح ریاستہائے متحدہ امریکہ اور چین نے ہندوستان کی مذمت کے حق میں ووٹ دیئے لیکن سوویت یونین کے حق استرداد کی دھمکی کی وجہ سے سلامتی کونسل کے پانچوں مستقل اراکین جنگ بندی پر متفقہ لائحہ عمل اختیار نہ کر پائے۔ پاک ہند تصادم پر سات اجلاسوں اور ایک درجن قراردادوں کے بعد سلامتی کونسل کسی ایک پر بھی متفق نہ ہو سکی۔ ہر چیز جو میرے والد نے اعلیٰ طاقتوں کی طرف سے تیسری دنیا کے
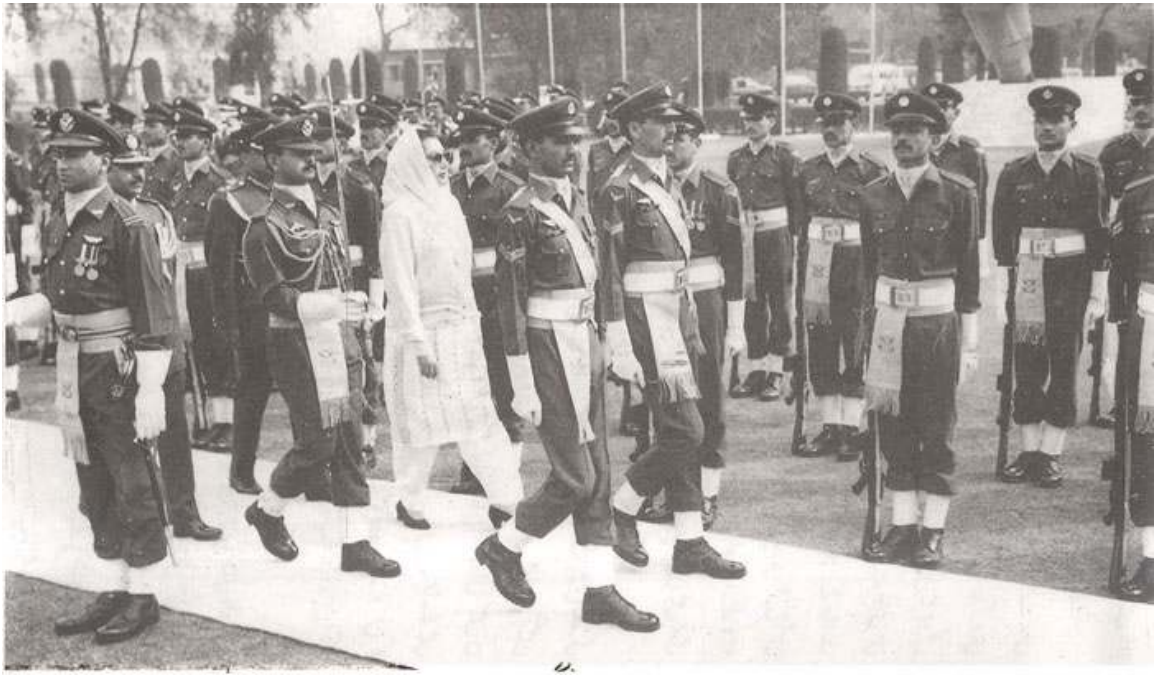
وزیر اعظم بے نظیر بھٹو چترال میں فرنٹیئر کانسٹیبلری کے ایک دستے کی طرف سے گارڈ آف آنر پیش کئے جانے کے موقعے پر

ممالک کے استحصال کے بارے میں بیان کی گئی سلامتی کونسل کے ایک کمرے میں رد کر دی گئی۔ اعلیٰ طاقتوں کے مفادات کی جنگ کے آگے پاکستان بالکل غیر محفوظ ہے۔

۱۱ر دسمبر صبح پانچ بجکر چالیس منٹ۔ ہماری فوج بہادری سے داد شجاعت دے رہی ہے۔ لیکن فضائی اور بحری کمک کے بغیر اور چھ ایک کی نسبت سے دشمن کا سامنا کر رہی ہے۔ گزشتہ کل سے اگلے ۳۶ گھنٹوں کے بعد اس میں جنگ کی سکت نہیں رہے گی۔ ہوٹل پیپرے کے کاغذات پر یہ تحریر میں نے لکھی تھی۔ دوسرے دن بھی اس سرسری سی تحریر کے مندرجات صحیح عکاسی کر رہے تھے۔ صبح ساڑھے چھ بجے سفیر شاہنواز نے حالات کو سنجیدہ قرار دیا۔ اس کا حل چینی مداخلت اور امریکنوں کا روسی پیچوں کو پوری طرح کس دینا ہے تاکہ وہ مداخلت نہ کر سکیں۔ پاپا نے اسلام آباد تار بھیجا کہ مدافعت اگلے ۳۶ گھنٹوں تک نہیں بلکہ ۷۲ گھنٹوں تک جاری رکھو۔ جنرل نیازی جو مشرقی پاکستان میں فوجی کمانڈر تھے بار بار کہہ رہے تھے کہ وہ آخری آدمی تک جنگ جاری رکھیں گے۔

۱۲ر دسمبر کو میرے والد سلامتی کونسل سے مطالبہ کرتے ہیں کہ جنگ بندی نافذ کی جائے۔ ہندوستانی افواج پاکستانی علاقے خالی کر دیں۔ اقوام متحدہ کی افواج متعین ہو جائیں اور یہ یقین دہانی کرائی جائے کہ مشرقی پاکستان میں کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ لیکن ان کی گزارشات بہرے کانوں سے گزر جاتی ہیں۔ اس کی بجائے میں غیر یقینی حالت میں سلامتی کونسل میں ایک گھنٹے تک یہ ہرزہ سرائی سنتی ہوں کہ کونسل کا اجلاس اگلی صبح ساڑھے نو بجے منعقد ہو یا زیادہ آرام دہ گھڑی گیارہ بجے۔ دریں اثناء پاکستان لمحہ لمحہ مر رہا ہے۔

''ہمیں یحییٰ پر زور دینا چاہئے کہ مغربی محاذ کھول دے'' میرے والد پاکستانی وفد سے ہمارے ہوٹل کے کمرے میں اصرار کرتے ہیں۔ مغرب میں حملہ ہندوستانی افواج کے مشرق میں اجتماع پر انداز ہو گا اور وہاں ان کے دباؤ کو کم کرے گا۔ اس دباؤ کے بغیر خطرہ ہے کہ پورا پاکستان ہی کہیں ہاتھ سے نہ چلا جائے۔ میں اپنے والد کیلئے پاکستان میں یحییٰ خان کو ٹیلی فون کال بک کراتی ہوں لیکن یحییٰ خان کا فوجی معاون جواب دیتا ہے کہ صدر

سو رہے ہیں انہیں جگایا نہیں جاسکتا۔ میرے والد فون کو پکڑ لیتے ہیں۔ ”ایک طرف جنگ جاری ہے صدر کو فوراً جگاؤ“ میرے والد چلاتے ہیں۔ ان کو مغربی محاذ فوراً کھول دینا چاہئے۔ ہمیں مشرق میں دباؤ کم کرنے کیلئے فوری اقدامات کرنے ہیں۔

ایک مغربی صحافی رپورٹ کرتا ہے کہ جنرل نیازی نے مشرقی پاکستان میں ہندوستانیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ میرے والد یحییٰ سے غصے میں آگ بگولہ ہوجاتے ہیں۔ افواہوں کو ختم کرو، میرے والد فون پر یحییٰ کے ملٹری سیکرٹری پر برس پڑتے ہیں۔ کیونکہ یحییٰ سے ملاقات نہیں ہوپارہی۔ میں اپنی حمایت میں فیصلہ کیلئے کیا گفت و شنید کر سکتا ہوں میرے پاس سودا چکانے کیلئے کچھ بھی نہیں؟۔

پیئرے ہوٹل میں ٹیلی فون لگاتار بجتے ہیں۔ ایک سہ پہر مجھے امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر کا ٹیلی فون آتا ہے اور دوسری لائن پر چینی جمہوریہ کے وفد کے چیئرمین ہوانگ ہوا کا۔ ہنری کسنجر کو اس بات کی بہت پریشانی ہے کہ چینی پاکستان کی حمایت میں فوجی مداخلت کریں گے۔ میرے والد کو پریشانی ہے کہ چینی مداخلت نہیں کریں گے۔ ایک طرف پاپا یحییٰ پر زور دینے والے ہیں کہ وہ آخری حربے کے طور پر پیکنگ پرواز کر جائیں۔ دوسری طرف میں نے اخبار میں پڑھا کہ ہنری کسنجر نیویارک کے سی آئی اے کے محفوظ ٹھکانوں میں چینیوں سے ملاقاتیں کر رہے ہیں۔

سوویت وفد میرے والد کی قیام گاہ میں آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اسی طرح چینی آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا وفد جارج بش کی سربراہی میں آتا ہے اور چلاجاتا ہے۔ ”میرا بیٹا بھی ہارورڈ ہی میں ہے اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس کے ذریعے مجھے بلاسکتی ہو“ سفیر بش نے اپنا کارڈ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ اپنے سونے کے کمرے میں ٹیلی فون پاس رکھے میں بیٹھی رہتی ہوں حقیقی پیغامات کو لکھتی ہوں اور جھوٹوں کو نظرانداز کرتی ہوں۔

”ملاقاتیوں میں ابہام پیدا کرو“ میرے والد مجھے کہتے ہیں اگر روسی موجود ہوں تو کہو چینی مجھے بلا رہے ہیں۔ اگر امریکن یہاں ہوں تو مجھے آکر اطلاع دو کہ روسی یا ہندوستانی

فون پر بلا رہے ہیں" اور کسی پر ظاہر نہ ہونے دو کہ اس وقت دراصل کون سے ملاقاتی یہاں ہیں۔ فنی سفارت کاری کا بنیادی سبق ہے کہ شکوک پیدا کرو اور اپنے تمام پتے میز پر مت پھینکو۔ میں ان کی ہدایات سمجھتی ہوں لیکن سبق نہیں سیکھتی ہوں۔ چنانچہ اپنے تمام کارڈ ہمیشہ ہی میز پر بکھیر دیتی ہوں۔

تاہم نیویارک میں سفارت کاری کا یہ کھیل اچانک ہی ختم ہوجاتا ہے جب یحیٰی مغربی محاذ نہیں کھولتا۔ فوجی حکومت نے نفسیاتی طور پر مشرقی پاکستان کے کھو جانے کو تسلیم کرلیا ہے۔ اور حوصلہ ہار بیٹھی ہے۔ چینی اپنی فوجی امداد کے بیانات کے باوصف مداخلت نہیں کرتے۔ وقت سے پہلے ہمارے ہتھیار ڈالنے کی افواہ ناقابل تلافی نقصان پہنچاتی ہے۔ اگرچہ بعد میں اس کی تردید بھی کردی جاتی ہے۔ ہندوستانیوں کو علم ہوچکا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ہمارے فوجی کمانڈر جنگ ختم کردینا چاہتے ہیں۔ اسی طرح سلامتی کونسل کے مستقل اراکین بھی جانتے ہیں کہ ڈھاکہ شکست کھانے کے قریب ہے۔

۱۵ر دسمبر کو میں سلامتی کونسل میں اپنے والد کے پیچھے قطار میں اپنی روزانہ والی سیٹ پر بیٹھ جاتی ہوں جب کہ اراکین اسمبلی کے کچھ نہ کرنے کی پالیسی ان کے پیمانہ صبر کو لبریز کردیتی ہے۔ "غیر جانبدارانہ ایوان کا کہیں وجود نہیں ہے تم واضح طور پر اپنی پوزیشن بیان کرو" وہ ان پر الزام لگاتے ہیں خاص طور پر برطانیہ اور فرانس پر کیونکہ یہ ممالک برصغیر میں اپنے مفادات کی خاطر ووٹنگ میں کسی جانب حصہ نہیں لیتے۔ اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں "تمہیں یا تو انصاف کی جانب رہنا ہے یا اس کی مخالف سمت" تمہیں یا تو حملہ آور کا ساتھ دینا ہے یا جس پر حملہ کیا گیا اس کا ساتھ، غیر جانبداری کوئی شئے نہیں ہے"۔ جیسے ہی ان کے جذباتی الفاظ کمرے میں گونجتے ہیں میں رضامندی بمقابلہ سرکشی کا ایک سبق سیکھتی ہوں۔ جب اعلیٰ طاقتیں مکمل طور پر پاکستان کے خلاف مجتمع ہوں تو دانشمندی کا تقاضا رضامندی ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن اعلیٰ طاقتوں کے آگے شکست تسلیم کرلینا ان کے ساتھ شامل ہونے کے مترادف بھی تو قرار دیا جاسکتا ہے۔ "کوئی بھی فیصلہ ہم پر تھوپ دو۔ معاہدہ ورسیلز سے بھی بدتر معاہدہ کرلو، حملے کو قانونی جواز بخشو،

قبضے کو قانونی حیثیت دو، ۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء تک ہر وہ چیز جو غیر قانونی تھی اسے قانونی قرار دو میں کسی بات کا حصے دار نہیں بنوں گا" میرے والد گرجدار آواز میں کہہ رہے ہیں۔

"اپنی سلامتی کونسل کو اپنے پاس رکھو، میں جارہا ہوں" اور اسی کے ساتھ وہ اپنے پاؤں پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں۔ جلدی سے میں کاغذات اکٹھے کرتی ہوں اور حیرت زدہ خاموشی میں ان کے پیچھے جاتی ہوں پاکستانی وفد کے ارکان بھی باہر آجاتے ہیں۔

واشنگٹن پوسٹ سلامتی کونسل میں میرے والد کی طرزادائیگی کو زندہ ناٹک کا نام دیتا ہے لیکن ہمارے لئے ایک حقیقی پیچیدہ مسئلہ تھا جو ہمارے ملک کے مستقبل پر اثرانداز ہورہا تھا کہ آئندہ پاکستان ایک ملک کے طور پر قائم رہے گا؟۔ "ڈھاکہ میں اگر ہم فوجی شکست تسلیم کرتے ہیں تو کیا یہ سیاسی شکست تسلیم کرنے کے مترادف ہے؟ انہوں نے بعد میں نیویارک کی گلیوں میں چلتے چلتے مجھے کہا "سلامتی کونسل سے واک آؤٹ کا میرا مطلب اس بات کو اجاگر کرنا تھا کہ اگرچہ ہمیں جسمانی طور پر ختم کیا جاسکتا ہے ہمارے قومی عزم اور وقار کو تباہ نہیں کیا جاسکتا"۔

میرے والد بہت پریشان تھے ہم اسی حالت میں پاکستان کیلئے تباہ کن نتائج کا خدشہ محسوس کرتے ہوئے چلتے گئے اور چلتے ہی گئے۔ "اگر گفت و شنید کے بعد سیاسی معاہدہ طے پاجاتا، اقوام متحدہ کی نگرانی میں سیاسی ریفرنڈم ہوجاتا تو شائد مشرقی پاکستان کے عوام پاکستان کے ساتھ رہنے یا بنگلہ دیش کی صورت میں ایک الگ ملک قائم کرنے کیلئے ووٹ دے سکتے ہیں۔ مگر پاکستان کو ہندوستان کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی خفت اٹھانا پڑیگی اور یہ خوفناک قیمت ہوگی جو ہمیں ادا کرنا ہوگی۔ "

اگلی صبح میرے والد واپس پاکستان روانہ ہوگئے۔ میں کیمبرج واپس چلی گئی اور ڈھاکہ زیرنگیں ہوگیا۔ متعدد سطحوں پر بنگلہ دیش کا نقصان پاکستان کیلئے ایک بھاری چپت تھی۔ ہمارے اتحاد کی مشترکہ اساس مذہب اسلام جس کی قوت کا ہمیں ہمیشہ احساس تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ہندوستانی علاقے کے ایک ہزار میل کے فاصلے کو مٹادے

گا، ہمیں آپس میں اکٹھا رکھنے میں ناکام رہا۔ ہمارا ایمان بطور ایک ملک کے باقی رہنے میں متزلزل ہوگیا۔ اور مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کے تعلقات منقطع ہونے کی حد تک کشیدہ ہوگئے۔ ہندوستان کے آگے پاکستان کی مکمل شکست کی وجہ سے عوام کا حوصلہ بہت پست ہوچکا تھا۔

جیسے ہی ٹیلی ویژن کیمرے آن ہوئے جنرل نیازی اپنے ہم مرتبہ ہندوستانی جرنیل اروڑہ کی طرف ڈھاکہ ریس کورس میں بڑھا۔ ان دونوں جرنیلوں نے سینڈہرسٹ میں اکٹھے تربیت حاصل کی تھی۔ میری آنکھوں کو یقین نہیں آرہا تھا جب میں نے جنرل نیازی کو ڈھاکہ کے فاتح کے ساتھ تلواروں کا تبادلہ کرتے دیکھا اور نیازی کو اس سے بغلگیر ہوتے بھی۔ انڈین جنرل سے بغلگیر ہونا .... نازیوں نے بھی اس قدر ذلت آمیز انداز میں ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ ایک شکست خوردہ فوج کے کمانڈر کے طور پر نیازی اگر اپنے آپ کو گولی مار کر ختم کرلیتا تو اس کیلئے زیادہ عزت کا باعث ہوتا۔

جب میرے والد اسلام آباد پہنچے تو شہر شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔

بپھرے ہوئے ہجوم ان شراب کی دو کانوں کو آگ لگا رہے تھے جن سے ان کے خیال میں یحییٰ خان اور اس کی حکومت کے اراکین کو شراب سپلائی ہوتی تھی حکومت کے دعوؤں کے برعکس کہ پاکستان ہر محاذ پر جیت رہا ہے۔ ہفتوں بعد ٹیلی ویژن پر ہندوستان کے سامنے پاکستانی افواج کے ہتھیار ڈالنے کے منظر کو دیکھنے پر کراچی میں بہت بڑے ہجوم نے ٹیلی ویژن سٹیشن پر دھاوا بول دیا اور اسے آگ لگانے کی کوشش کی۔ ہندوستانی اخبارات نے اپنے جنگجویانہ اداریوں کے ذریعے پاکستان کی مزید تباہی کی دھمکیاں دیں اور یہ دعویٰ کیا کہ "پاکستانی ایک مصنوعی قوم ہے جس کی تخلیق ہی نہیں ہونی چاہئے تھی۔"

۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ کی ہزیمت کے چار روز بعد لوگوں کے طیش نے یحییٰ خان کو اقتدار چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اور میرے والد جو پاکستان میں اکثریتی پارلیمانی پارٹی کے راہنما تھے نئے صدر بنادیئے گئے۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ چونکہ ملک میں کوئی آئین نہیں تھا انہیں تاریخ عالم میں مارشل لائی انتظامیہ کا پہلا سویلین سربراہ بننا پڑا۔ ہارورڈ میں مجھے

اب پاکستان سے پنکی کی بجائے پنکی بھٹو کہا جانے لگا۔ جو صدر پاکستان کی بیٹی تھی لیکن پاپا کی کامیابیوں پر فخر ہماری ہزیمت اور جو قیمت پاکستان کو ادا کرنا پڑی کے مقابلہ میں میرا سر بلند نہ کر سکا۔ جنگ کے دو ہفتوں کے دوران ہماری فضائیہ کا چوتھائی حصہ ناکارہ بنا دیا گیا تھا۔ بحریہ کا تقریباً نصف حصہ سمندر میں غرقاب ہوچکا تھا۔ ہمارا خزانہ خالی تھا۔ ناصرف مشرقی پاکستان کو ہم گنوا چکے تھے بلکہ مغربی پاکستان میں ۵۰۰۰ مربع میل علاقے پر ہندوستانی افواج قابض ہوچکی تھیں اور ہمارے ۹۳۰۰۰ فوجی جوان جنگی قیدی بن چکے تھے بہت سوں کی پیش گوئی تھی کہ اب پاکستان قائم نہیں رہ سکے گا۔ بنگلہ دیش کے قیام کے ساتھ ہی وہ متحدہ پاکستان جس کی بنیاد قائداعظم محمد علی جناحؒ نے رکھی تھی ختم ہوگیا۔

شملہ :۔ ۲۸ جون ۱۹۷۲ء .... میرے والد صدر پاکستان اور اندرا گاندھی وزیراعظم ہندوستان کے درمیان سربراہی ملاقات ہوئی۔ پورے برصغیر کا مستقبل اس کے نتائج پر منحصر تھا اور اس دفعہ میرے والد مجھے بھی وہاں دیکھنا چاہتے تھے۔ ”جو بھی نتیجہ ہو یہ ملاقات پاکستان کی تاریخ میں اہم موثر ثابت ہوگی“ انہوں نے مجھے ہارورڈ میں موسم گرما کی تعطیلات میں واپسی پر بتایا۔

”میں چاہتا ہوں تم اسے بنفس نفیس دیکھو۔

”اگر چھ ماہ پہلے اقوام متحدہ میں فضا کشیدہ تھی تو شملہ میں کھنچاؤ کی وجہ سے نقطہ انقطاع پر تھی۔ میرے والد کے پاس اندرا گاندھی سے گفت و شنید کی میز پر دینے کیلئے کچھ بھی نہیں تھا۔ ہندوستان کے پاس سوداکاری کے تمام کارڈ تھے۔ ہمارے جنگی قیدی، جنگی مقدمات کی دھمکی، اور ہمارے ملک کی پانچ ہزار مربع میل سرزمین کا قبضہ .... پنجاب کے ہندوستانی صوبے میں صدارتی طیارے کی چندی گڑھ روانگی کے دوران پاکستانی وفد کے چہرے سنجیدہ تھے .... کیا شملہ میں دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی کم ہوجائے گی؟ کیا ہم ہندوستان سے امن کا سمجھوتہ کرلیں گے۔ اور کیا ہمارا ملک مزید تباہی سے بچ سکے گا؟ ”ہر شخص کی آنکھیں متلاشی ہونگی کہ پتہ چلے ملاقات کس نہج پر چل رہی ہے؟ اس لئے مزید محتاط رہنے کی ضرورت ہے“ میرے والد نے طیارے ہی میں مجھے نصیحت کی

تھی کہ تم نے مسکرانا تک نہیں اور یہ تاثر نہیں دینا کہ تم تفریح پر نکلی ہو جب کہ ہمارے جوان ابھی تک ہندوستانی جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں اسیر ہیں۔ تم اس قدر اداس بھی نظر نہ آؤ کہ لوگ اسے مایوسی کی علامت تصور کریں۔ کوئی شخص یہ کہنے نہ پائے "اس کا چہرہ دیکھو یقیناً ملاقات ناکام ہورہی ہے پاکستانی گھبرائے ہوئے ہیں اور انہیں کسی کامیابی کی امید نہیں چنانچہ مزید مراعات دینے پر تیار ہیں" "پس مجھے کیا نظر آنا چاہئے؟" میں نے ان سے استفسار کیا۔

"میں نے پہلے ہی تمہیں بتادیا ہے غمگین نظر آؤ نہ خوش" میرے والد نے کہا۔

"بہت مشکل امر ہے"

"نہیں یہ کوئی مشکل نہیں"

ایک مرتبہ تو وہ مجھے غلطی پر محسوس ہوئے۔ چہرے پر غیر جانبدارانہ تاثرات کو برقرار رکھنا بہت مشکل تھا جب ہم چندی گڑھ میں پہاڑی ہوائی اڈے شملہ جانے کے لئے ہیلی کاپٹر میں سوار ہورہے تھے۔ شملہ وادی ہمالیہ میں برطانوی سلطنت کا موسم گرما کا پائے تخت تھا۔ مجھے اور بھی وہ مرحلہ مشکل نظر آیا جب ہم فٹ بال گراؤنڈ میں اترے اور ٹیلی ویژن کیمروں کے جلو میں مسز اندرا گاندھی نے خود ہمارا استقبال کیا۔ اس کا قد کتنا چھوٹا تھا ان لاتعداد تصاویر کے برعکس جو میں نے ماضی میں دیکھی تھیں۔ کس قدر پر حشمت نظر آرہی تھیں .... گرجتے آسمانوں کے نیچے ساڑھی پر اوور کوٹ پہنے ہوئے۔ "اسلام علیکم" میں نے انہیں مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ سلامتی کا اسلامی طریقہ، انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا "نمستے" خوش آمدید!" میں بھی انہیں دیکھ کر نیم دلی سے مسکرائی۔

اگلے پانچ روز میرے والد اور پاکستانی وفد کے دیگر ارکان جذبات کے ریلے پر سوار رہے "بات چیت ٹھیک نہج پر جارہی ہے" پہلے اجلاس کے نصف میں ایک رکن وفد نے مجھے بتایا۔ اسی شام دوسرے رکن کا خیال تھا "یہ صحیح رخ پر نہیں جارہی" اگلے دن وحشت بڑھ گئی کہ پرامیدی کی جگہ مایوسی نے لے لی۔ طاقت کی پوزیشن سے بات کرتے ہوئے، مسز اندرا گاندھی ایک کلی معاہدے پر مصر تھیں جس میں کشمیر کی متنازعہ وادی پر ہندوستانی دعویٰ

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دورہ ہندوستان کے دوران ایک تقریب میں لی گئی تصویر، بے نظیر بھٹو نمایاں ہیں

کو مان لیا گیا ہو۔ پاکستان کی طرف سے کشمیر کی ایسی فروخت جو دباؤ کے تحت کی گئی ہو پاکستانیوں کیلئے ناقابل قبول ہوگی اور نئی جنگ کے مواقع کو مہمیز دے گی۔ لیکن جب تبادلہ خیالات بند گلی کے دہانے تک پہنچ گیا، گلیوں میں ایک عجیب نوعیت کی فضا پیدا ہو رہی تھی ہر مرتبہ جب میں ہماچل بھون (پنجاب کے برطانوی گورنروں کی سابقہ رہائش گاہ جہاں ہم قیام پذیر تھے) سے باہر نکلتی، لوگ مجھے گھورنے کے لئے گلیوں میں قطار بند کھڑے ہو جاتے خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے ہجوم ہر جگہ میرا پیچھا کرتے .... پرانی جھگیوں اور مضافات کے باغات جنہیں سالہاسال قبل بیزار قسم کے برطانوی باشندوں نے اگایا تھا کے پاس سے گزر کر جاتی، میرے لئے ترتیب دیئے گئے پروگرام کے مطابق میں گڑیا محل، مرکز دستکاری، ٹین بند پھلوں کے کارخانے اور ایک کانونٹ سکول میں رقص دیکھنے کیلئے گئی تو وہاں مجھے مری سکول کانونٹ کی بے شمار استانیاں ملیں جب میں مال پر سیر کیلئے نکلی جہاں برطانوی سامراج کے حکام اپنی بیگمات کے ساتھ سیر کیا کرتے تھے، اتنا بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا کہ ٹریفک کو روکنا پڑ گیا اس ہنگامے سے میں بہت بے چین ہو گئی سمجھ نہیں آتا تھا کہ میں لوگوں کی توجہ کا مرکز کیسے بن گئی۔

خطوط اور تاریں آنا شروع ہو گئیں جن میں مجھے ہندوستان آمد پر خوش آمدید کہا گیا تھا۔ ایک خط میں مشورہ دیا گیا کہ میرے والد مجھے ہندوستان میں پاکستانی سفیر کے طور پر مقرر کر دیں۔ صحافی اور فیچر لکھنے والے انٹرویو کیلئے آنا شروع ہو گئے اور مجھے آل انڈیا ریڈیو پر تبصرہ کی دعوت دی گئی۔ میری جھنجھلاہٹ اس بات پر بڑھی کہ میرا لباس قومی فیشن کا واقعہ بن گیا، میرے لئے گھبراہٹ کا باعث یہ امر تھا کہ نہ صرف میں نے اپنے ملبوسات سمیعہ کی ہمشیرہ سے ادھار لئے تھے، میرے اپنے ملبوسات زیادہ تر غیرفیشنی قیمضوں، جینز اور سویٹر ٹائپ شرٹس پر مشتمل تھے، اس لئے کہ میں نے ملبوسات کو ہمیشہ توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔ میں اپنے آپ کو ہارورڈ کی دانشور سمجھتی تھی جس کا ذہن جنگ و امن کے سنجیدہ مسائل میں الجھا رہتا تھا مگر یہاں صحافی مصر تھے کہ وہ ملبوسات کے بارے میں سوالوں پر سوال کریں۔ تنگ آ کر میں نے ایک انٹرویو کرنے والے صحافی کو کہا کہ فیشن

بورژوا لوگوں کا مشغلہ ہے لیکن اخباری خبر یہ تھی کہ میں نے فیشن کا ایک نیا راستہ جلوہ گر کیا ہے۔

میرے والد اور پاکستانی وفد کے دیگر ارکان کی فہم سے یہ بات بالا تھی کہ مجھے اس قدر توجہ کا مرکز کیوں بنادیا گیا ہے "تم یہاں مسائل کی سنجیدگی سے اجتناب کا ایک بہانہ ہو" میرے والد نے ایک صبح فیصلہ کن انداز میں کہا، جب انہوں نے اخبار کے صفحہ اول پر میری تصویر عوام کو ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھی۔ "بہتر ہے ذرا محتاط رہو" انہوں نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا "تم مسولینی کی طرح نظر آرہی ہو" ان کی عوامی توجہ ہٹانے کی تھیوری شاید صحیح تھی۔ گفت و شنید مکمل رازداری میں سرانجام دی جارہی تھی اور بین الاقوامی پریس کے ٹولے کو شملہ میں سوائے میرے اور کچھ قابل توجہ معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میرا فقید المثال استقبال کسی اور چیز کی طرف بھی اشارہ کناں تھا۔ میں نئی نسل کی نمائندہ تھی میں ہندوستانی تو کبھی بھی نہیں تھی میں آزاد پاکستان میں پیدا ہوئی تھی میں ان الجھنوں اور تعصّبات کا شکار نہیں تھی جنہوں نے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کو تقسیم کے وقت ایک خونی سانحہ میں الگ الگ کر دیا تھا۔ شائد لوگ امید کررہے تھے کہ ایک نئی نسل اپنے آباؤاجداد کے تلخ ماضی سے جس نے ہمیں تین جنگوں میں جھونک دیا تھا کنارہ کشی اختیار کر سکتی ہے اور دوستوں کی طرح باہم اکٹھا کر سکتی ہے۔ اور میں نے یقیناً محسوس کیا کہ یہ ممکن تھا جب میں شملے کی گلیوں میں ہجوم کی گرم جوشی اور طرز استقبال دیکھتی۔ کیا نفرت کی دیواریں ہمیں ہمیشہ منقسم رکھیں گی یا ہم بھی یورپ کے جنگجو ممالک کی طرح آپس میں ایک دوسرے کے قریب آسکیں گے۔

اس سوال کا جواب برطانوی سلطنت کے زمانے کی عمارتوں کے کمروں میں جاری کانفرنس کے اندر ہی مل سکتا تھا جہاں طویل اور تھکا دینے والی گھنٹوں پر محیط گفت و شنید بغیر کسی انجام کے جاری تھی۔ میرے والد نے اپنے قیام کو طول دیدیا اس امید پر کہ شائد کوئی حل نکل آئے لیکن وہ پرامید نہیں تھے۔ ہندوستانیوں نے کشمیر پر پاکستانی پوزیشن کو ماننے سے یکسر انکار کر دیا جو کشمیریوں کو اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے کیلئے استصواب رائے کی

اجازت دینا تھی کہ وہ کس ملک کے ساتھ شامل ہونا چاہتے تھے۔ انہیں مسز گاندھی سے گفت و شنید میں مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ اگرچہ وہ ان کے والد وزیراعظم جواہرلال نہرو کے بڑے مداح تھے، مسز گاندھی، میرے والد کا خیال تھا، اس قدر بابصیرت اور مثالیت پسند نہیں تھیں جتنا ان کے والد جنہوں نے ہندوستان کو بین الاقوامی توقیر و عزت دلائی تھی۔

مجھے خود مسز گاندھی کے بارے میں کوئی یقین نہیں تھا ایک مختصر سے ڈنر پر جو ۳۰ رجون کو ہمارے وفد کے اعزاز میں انہوں نے دیا، مجھے متواتر گھورتی رہیں جس نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں نے ان کی سیاسی زندگی کا مطالعہ قریب سے کیا تھا اور ان کے استقلال کی ہمیشہ تعریف کی۔ ۱۹۶۶ء میں ان کو وزیراعظم منتخب کرنے کے بعد، انڈین کانگرس کے جھگڑالو اراکین نے خیال کیا کہ انہوں نے ایک نرم مزاج اور فقط علامتی قسم کے ایک راہنما کا انتخاب کیا تھا اور وہ اس کی پیٹھ پیچھے اسے گونگی گڑیا کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن اس ریشمی اور آہنی خاتون نے ان سب کو پچھاڑ دیا۔ اپنے اعصاب پر قابو پانے کیلئے میں نے ان سے گفتگو کی کوشش کی مگر وہ بالکل خاموش رہیں وہ ایک قسم کی سرد تنہائی اور کشیدگی کا شکار تھیں جس سے چھٹکارا پانے کیلئے وہ مسکراتی تھیں۔

میرے اعصاب اس وجہ سے بھی کشیدہ تھے کہ میں اپنی والدہ کی ریشمی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اگرچہ انہوں نے اس طویل و عریض کپڑے کو اپنے گرد محفوظ طریقے سے لپیٹنے کا گر سکھایا تھا مگر اس کے اچانک کھل جانے کا خوف مجھ پر سوار رہتا تھا مجھے ابھی تک اپنی آنٹی ممتاز کی ساڑھی کا سانحہ جو جرمنی کی سپر مارکیٹ میں پیش آیا تھا یاد آتا ہے کہ کس طرح ان کی ساڑھی کا کنارہ برقی سیڑھی میں پھنس گیا تھا اور ان کی ساڑھی کھلتی جا رہی تھی یہاں تک کہ کسی نے آخر کار سیڑھی کی بجلی کو بند کیا۔ اس یاد کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا اور مسز گاندھی مجھے گھورتی رہیں۔

شائد انہیں وہ سفارتی وفود یاد آ رہے تھے جن کے ہمراہ وہ اپنے والد کی معیت میں گئیں میں نے اپنے دل میں سوچا کیا وہ اپنے آپ کو مجھ میں ایک اور سیاستدان کی بیٹی کی طرح دیکھ رہی ہیں؟ کیا وہ ایک بیٹی کی باپ کیلئے اور باپ کی بیٹی کیلئے محبت کو یاد کر رہی ہیں؟ وہ اس قدر

محترمہ بے نظیر بھٹو اپنے والد وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ہمراہ دورہ ہندوستان کے موقع پر بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے ساتھ

کوتاہ قد اور کمزور تھیں۔ ان کی درشت مزاجی کا منبع کہاں ہے؟ انہوں نے ایک پارسی سیاستدان سے شادی کر کے اپنے والد کے حکم سے بھی سرتابی کی تھی جنہیں یہ رشتہ منظور نہیں تھا۔ ان کی شادی خوش انجامی پر منتج نہ ہوئی اور دونوں نے علیحدگی اختیار کر لی اب دونوں ان کے والد اور خاوند انتقال کر چکے ہیں کیا وہ اکیلا پن محسوس کرتی ہیں؟

میں اس بات پر بھی حیران تھی کہ کیا شملہ میں پاکستانی وفد کی موجودگی نے تاریخی یادداشتوں کو مزید تازہ کر دیا تھا؟ یہی وہ شہر ہے جہاں ان کے والد نے محمد علی جناحؒ اور لیاقت علی خان کے ساتھ مل کر ہندوانڈیا سے مسلم پاکستان کی نئی مملکت کی سرحدوں کا نقشہ کشید کیا تھا۔ اب بطور وزیراعظم خود ہی علیحدہ مسلم مملکت کی بقاء کی یقین دہانی کرا سکتی تھیں یا اسے برباد کرنے کا تردد کر سکتی تھیں۔ وہ کونسا راستہ اختیار کریں گی؟ اس کا جواب چار روز بعد پتہ چلا۔

"سامان باندھ لو" میرے والد نے ۲ جولائی کو مجھے کہا "ہم کل گھر واپس جا رہے ہیں"

"بغیر کسی فیصلے کے؟" میں نے پوچھا۔

"بغیر فیصلے کے" انہوں نے کہا "میں ہندوستان کی طرف سے عائد کردہ کسی فیصلے کی بجائے بغیر کسی فیصلے کے پاکستان واپس جانا پسند کرونگا ہندوستانیوں کا خیال ہے کہ میں گھر واپس بغیر کسی معاہدہ کے جانے کی ہمت نہیں رکھتا اور اس لئے ان کے مطالبات کے آگے سر تسلیم خم کر دونگا۔ لیکن میں ان کی گیدڑ بھبکی کو سمجھتا ہوں۔ میں پاکستان میں غلط فہمی کا ازالہ کرنے کو ترجیح دونگا بجائے ایسا معاہدہ کرنے کے جس سے ملک ہی فروخت ہوتا ہو"۔

ہماچل بھون میں مقیم تھکے ماندہ پاکستانی وفد میں مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی صرف کاغذات کو اکٹھا کرنے کی آواز ہی خاموشی کو توڑ رہی تھی۔ اب بقایا پروگرام کی مد میں دو واقعات ہی باقی بچے تھے میرے والد کی طرف سے مسز گاندھی سے الوداعی ملاقات اور ہمارے وفد کی طرف سے دیا گیا ہندوستانیوں کے اعزاز میں عشائیہ .... اس کے بعد ہم اسلام آباد روانہ ہو جائیں گے۔ میں اپنے بیڈروم کے فرش پر بیٹھی تھی جب میرے والد دروازے میں اچانک نمودار ہوئے "کسی سے ذکر مت کرنا" انہوں نے آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا

کرتے ہوئے کہا ''مسز گاندھی کے ساتھ اس آخری سفارتی ملاقات میں ایک اور کوشش کروں گا۔ یہ میری ایک سوچ ہے لیکن اگر یہ ملاقات بھی بے نتیجہ رہی تو مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں'' اور وہ یہ کہہ کر چلے گئے۔

میں کھڑکی تک ان کے انتظار میں کئی مرتبہ گئی۔ باہر پہاڑیوں پر چیڑ کے درخت، پیچ دار پہاڑی سڑکیں، لکڑی کی رہائش گاہیں دھند میں لپٹی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ شملہ مری سے ملتا جلتا تھا لیکن وہ لوگ جو سرحد کے دونوں اطراف میں رہائش پذیر تھے ایک دوسرے کو ملنے سے قاصر تھے اچانک ہی میرے والد واپس بھی آگئے۔

''امید دوبارہ پیدا ہوگئی ہے'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا ''معاہدہ طے پاجائے گا انشاء اللہ''

''یہ کیسے ممکن ہوا، پاپا!؟'' میں نے ہال کی متین خاموشی کو توڑا اور وفد کے ایک رکن نے دوسرے کو بھنبھناتے ہوئے شور میں یہ خبر دینی شروع کی۔

''میں نے محسوس کیا کہ مسز گاندھی ہماری ملاقات کے دوران بہت کشیدہ حالت میں تھی'' میرے والد نے مجھے بتایا ''حتمی طور پر گفت و شنید میں ناکامی، ہماری ہی شکست نہیں تھی، ان کی بھی شکست تھی، ہم دونوں کے سیاسی مخالفین اس امر کو ہمارے خلاف استعمال کریں گے وہ اپنے ہینڈ بیگ سے انگلیوں کے ساتھ کھیلتی رہیں اور انہوں نے یہ تاثر دیا کہ وہ اس وقت گرم چائے کے ذائقہ سے بھی لطف حاصل نہیں کر رہیں پس میں نے ایک گہری سانس لی پھر آدھ گھنٹے تک متواتر بولتا رہا''۔

ہم دونوں عوام کے منتخب کردہ جمہوری راہنما ہیں جنہوں نے ہمیں ایک مینڈیٹ دیا ہے'' ہم خطے کو امن دے سکتے ہیں جو تقسیم سے لیکر اب تک ہمیں فریب دیتا رہا ہے یا ہم ناکام ہو کر پہلے سے موجودہ زخموں کو مزید گہرا کر سکتے ہیں............ عسکری فتوحات تاریخ کا حصہ ہیں، لیکن یہ مدبرانہ سوچ ہے جو اپنے لئے دائمی مقام بناتی ہے۔ اس مدبرانہ سوچ کا تقاضا ہے کہ ہم مستقبل پر نظر رکھیں اور اس لمحے جو رعایات دیں گے اس کے انعامات مستقبل میں حاصل کریں گے فاتح کے طور پر، یہ ہندوستان کی باری ہے نہ کہ پاکستان کی کہ

امن کے حصول کیلئے مناسب رعایات اختیار کرے" میرے والد نے مجھے بتایا۔

"کیا انہوں نے اس بات سے اتفاق کیا؟" میں نے جوشیلے انداز میں اپنے والد سے پوچھا۔

"وہ غیر متفق بھی نہیں تھیں" انہوں نے سگار سلگاتے ہوئے کہا

"اس نے کہا کہ وہ اپنے ذاتی مشیروں سے مشورہ کریں گی اور آج کے عشائیہ پر مزید بات چیت ہوگی"۔

دعوت کے دوران ٹوسٹ، تقریریں اور خوش گپیاں مگر میں ان سے ذہنی طور پر لاتعلق سی رہی اس مرتبہ میں مسز گاندھی کو گھورتی رہی، لیکن ان کے چہرے سے کچھ مترشح نہ ہوا .... عشائیہ کے بعد میرے والد اور مسز گاندھی ایک چھوٹے سے ملحقہ کمرے میں چلے گئے اور وفد کے باقی اراکین بلیئرڈ روم میں براجمان ہوگئے کیونکہ یہ کمرہ سب سے بڑا تھا جہاں سب سما سکتے تھے۔ بلیئرڈ کی میز بھی جائے نشست کے طور پر استعمال ہوئی۔ جب بھی وہ کسی ایک نکتے پر متفق یا غیر متفق ہوئے وفد کا ایک رکن جھٹ سے کاغذات کے ساتھ دونوں راہنماؤں سے "ہاں" یا "نا" کا جواب حاصل کرنے کیلئے ان کے کمرے میں چلا جاتا۔

مسودات کا باربار تحریر کرنا، ترمیمیں اور تبدیلیاں، اس میں کئی گھنٹے صرف ہوگئے۔ دونوں ملکوں کے نمائندوں، ٹیلیویژن کیمرہ مینوں اور صحافیوں سے ہال زیادہ سے زیادہ بھرتا چلا گیا............ میں نیچے صحافیوں اور سیڑھیوں سے اوپر اپنے بیڈ روم میں آتی جاتی رہی "کیا کوئی حتمی چیز قرار پا گئی؟" میں سیڑھیوں کے اوپر سے کئی دفعہ پوچھتی۔ "چونکہ کوئی اعلان متوقع نہیں تھا جب تک اس کی سرکاری حیثیت متعین نہیں ہوجاتی، پاکستانی وفد نے اپنے لئے ایک کوڈ (اشارہ) وضع کرلیا تاکہ پتہ چلے گفتگو کس نہج پر چل رہی ہے اگر معاہدہ طے پا گیا تو ہم کہیں گے بیٹا پیدا ہوا ہے اور اگر معاہدہ طے نہ پایا تو ہم کہیں گے "لڑکی پیدا ہوئی ہے"۔

"یہ کیسی مردانہ شاونزم ہے" میں نے پکارا مگر کسی نے میری آواز نہ سنی۔ "یاد رکھو
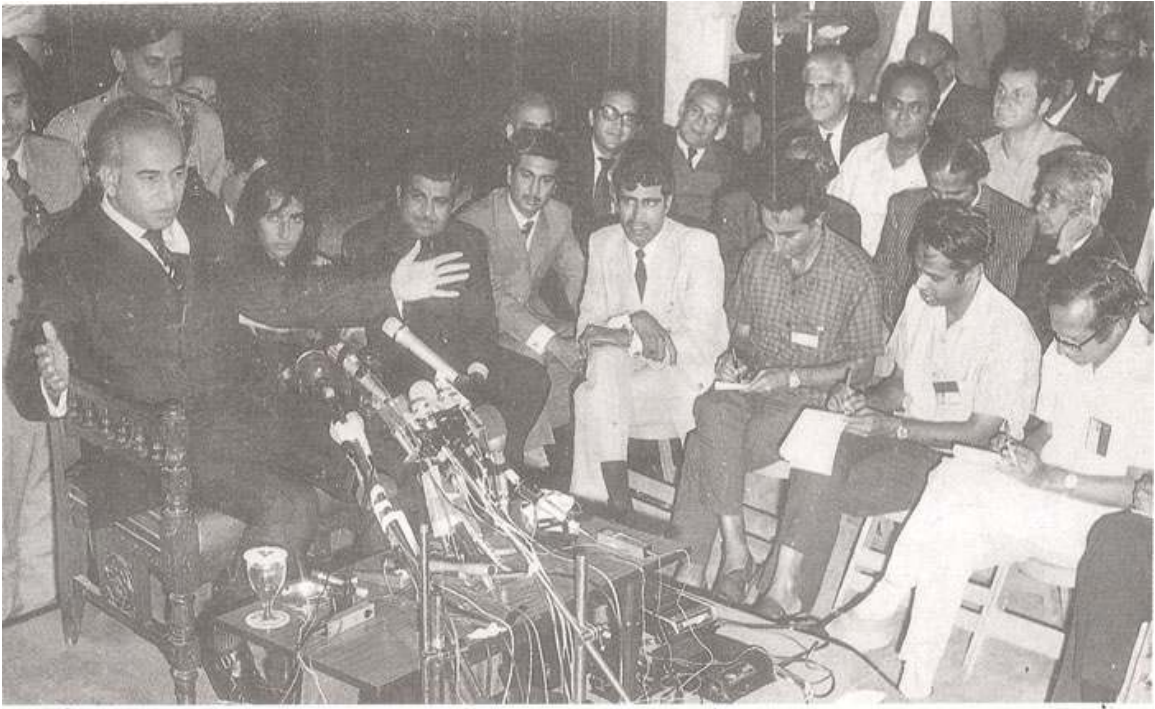
دورہ ہندوستان کے دوران وزیر اعظم بھٹو، شملہ میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے ہیں بے نظیر بھٹو ہمراہ ہیں

تمہیں نچلی منزل میں ہونا چاہئے اگر اور جب معاہدہ پر دستخط ثبت کئے جاتے ہیں" میرے والد نے آرام والے کمرے میں جانے سے پہلے مجھے کہا "یہ ایک تاریخی لمحہ ہو گا" لیکن ہوا اس کے برعکس .... میں اپنے بیڈروم میں اوپر کی منزل میں تھی جب پوری قیام گاہ آدھی رات کو ۴۰ - ۱۲ بجے "لڑکا ہے" لڑکا ہے "کے نعروں سے گونج اٹھی۔ میں دوڑتی ہوئی نچلی منزل میں آئی لیکن صحافیوں اور ٹیلی ویژن کیمرہ مینوں کے ہجوم میں گرتی پڑتی کمرے تک اس وقت نہ پہنچ سکی جب اپنے والد اور مسز گاندھی کو اس معاہدہ پر دستخط کرتے ہوئے دیکھ سکتی جسے بعد میں "شملہ معاہدہ" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ خیر اس کی کچھ پرواہ نہیں۔ برصغیر پر طویل اور دائمی امن کیلئے بنیاد رکھ دی گئی تھی۔

شملہ معاہدہ کے مطابق پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ ہندوستان سے واگزار کرایا گیا .... اس نے ہمارے دونوں ملکوں کے درمیان مواصلات اور تجارت بڑھانے کی بنیاد رکھ دی اور جموں کشمیر کے تنازعہ پر پاکستان اور ہندوستان کے نقطہ نظر میں قطعاً کوئی فرق نہ پڑا۔ اس معاہدہ سے ہمارے فوجیوں پر بنگلہ دیش میں، شیخ مجیب کی طرف سے بنائے جانے والے جنگی جرائم کے مقدمات کی دھمکیوں سے نجات کا راستہ کھل گیا، تاہم یہ معاہدہ قیدیوں کی فوری واپسی مہیا نہیں کرتا تھا۔

مسز گاندھی جنگی قیدیوں یا مقبوضہ علاقوں میں سے کسی ایک کی واپسی پر متفق ہوئی ہیں میرے والد نے اوپر کی منزل میں آمد پر مجھے بتایا "تمہارا کیا خیال ہے میں نے علاقے کی واپسی کو کیوں چنا؟"

"مجھے کچھ علم نہیں پاپا" میں نے صدمہ محسوس کرتے ہوئے کہا "پاکستان میں لوگوں کو زیادہ خوشی ہوتی اگر قیدیوں کو رہا کر دیا جاتا"

"انہیں رہا کیا جائے گا" انہوں نے مجھے یقین دلایا "قیدی انسانی مسئلہ ہیں اس مسئلے کی شدت میں اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے کیونکہ ان کی تعداد ۹۳ ہزار ہے یہ ہندوستان کا غیر انسانی فعل ہو گا اگر وہ انہیں طویل عرصے تک رکھنے میں مصر ہو۔ ان کی خوراک اور ان کی رہائش بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہو گا علاقہ اس کے برعکس انسانی مسئلہ نہیں۔ علاقے کو مدغم کیا جاسکتا

ہے قیدیوں کو نہیں .... عرب ۱۹۶۷ء کی جنگ میں کھوئے ہوئے علاقے کی واپسی میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوئے۔ علاقے پر قبضہ کی چیخ و پکار بین الاقوامی توجہ کا مرکز نہیں بنتی جب کہ قیدیوں کے سلسلہ میں بنے گی"۔

قیدیوں کی رہائی کے بارے میں کسی معاہدہ کے بغیر واپسی میرے والد کیلئے مشکل فیصلہ تھا اور توقع کے مطابق مخالف پاکستانی سیاستدانوں اور قیدیوں کے اہل خاندان نے بہت زیادہ احتجاج کیا شائد ہندوستانی حکومت اس لازمی ہنگامے پر انحصار کر رہی تھی جو میرے والد کو پسپائی پر مجبور کر دے گا۔ لیکن انہوں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اور ۱۹۷۴ء میں بنگلہ دیش اور پاکستانی حکومت کی منظوری کے بعد ۹۳ ہزار قیدی رہا کر دیئے گئے۔

جب ہم ۳ر جولائی کو راولپنڈی واپسی اڑان کیلئے طیارہ میں سوار ہوئے تو سب کی طبیعت بشاش تھی حالانکہ جب ہم ہندوستان کی سرزمین پر پہنچے تھے تو ایک قسم کی غم زدہ حالت کے جلو میں تھے جب ہم نے طیارہ سے باہر سرخ غالیچے پر قدم رکھا تو ہوائی اڈے پر ہزاروں لوگ میرے والد کے استقبال کیلئے جمع تھے۔ "آج کا دن عظیم دن ہے" میرے والد نے ہجوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ہمیں ایک بہت بڑی فتح نصیب ہوئی ہے یہ میری فتح نہیں ہے اور نہ ہی مسز گاندھی کی فتح ہے یہ پاکستان اور ہندوستان کے عوام کی فتح ہے جن کو تین جنگوں کے بعد امن نصیب ہوا ہے"۔

۴ر جولائی ۱۹۷۲ء کو قومی اسمبلی نے شملہ معاہدہ کی متفقہ منظوری دی۔ حزب مخالف نے بھی خراج تحسین پیش کیا .... شملہ معاہدہ کی آج بھی وہی اہمیت ہے۔

مگر بدقسمتی سے ۱۹۷۳ء کے آئین کی وہ اہمیت نہیں رہی جو پاکستان کا پہلا جمہوری آئین تھا اور جسے لوگوں کے حقیقی منتخب نمائندوں نے تشکیل دیا تھا ایک سال بعد ۱۴ر اگست ۱۹۷۳ء کو جب ہمارے سب اہل خاندان وزیراعظم کے بکس میں بیٹھے دیکھ رہے تھے قومی اسمبلی نے متفقہ طور پر اسلامی چارٹر کو منظور کیا جس پر ناقابل یقین حد تک علاقائی اور مذہبی راہنماؤں اور میرے والد کے مخالفوں سمیت پوری قوم کا اتفاق رائے تھا۔ اس آئین کی رو سے قومی اسمبلی میں اکثریت کے راہنما کے طور پر میرے والد وزیراعظم پاکستان بن گئے۔

چار سال بعد جنرل ضیاء کے ہاتھوں میرے والد کا تختہ الٹنے اور آئین کی معطلی تک پاکستان کے عوام تاریخ پاکستان کے اس پہلے آئین سے مستفید ہوتے رہے جس نے بنیادی انسانی حقوق دیئے اور ان حقوق کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کی رو سے نسل، جنس اور مذہب کی بنیاد پر تفریق کلیتاً ممنوع قرار دی گئی............ اس نے عدلیہ کی آزادی اور انتظامیہ سے علیحدگی کی ضمانت دی............ پاکستان کی پہلی نمائندہ حکومت کو آخر کار وہ قانونی ڈھانچہ میسر آگیا جس کے دائرہ کار میں تمام امور مملکت کی انجام دہی تھی یہ وہ منظور شدہ مقتدرہ تھی جسے پروفیسر والک نے میرے ذہن میں صاف طور پر بٹھادیا تھا۔

۱۹۷۳ء کے موسم بہار میں جب میں ہارورڈ کو چھوڑنے کی تیاری کر رہی تھی، میں نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے آئین کی قوت کا بنفس نفیس مظاہرہ ہوتے ہوئے دیکھا راحت بخش موسم اور ہارورڈ کے میدان میں فرزبی کھیلوں کے باوجود ہم میں سے اکثر ٹیلی ویژن پر واٹر گیٹ مقدمہ کی کارروائی سننے میں مصروف ہوتے۔ "میرے خدایا! یہ سب کیا ہے؟ امریکی عوام جمہوری آئینی ذرائع کے تحت اپنے صدر کو معزول کر رہے ہیں رچرڈ نکسن ایسا طاقتور صدر جس نے ویت نام جنگ کا خاتمہ کیا اور چین سے تعلقات استوار کئے اپنے ملک کے قانون کی زد میں تھا............ میں لاک، روسو اور جان سٹوارٹ مل کے فلسفہ "معاشرہ اور ریاست اور "لوگوں کے حقوق کی ضمانت کیا ہے" کا مطالعہ کر چکی تھی لیکن مفروضہ یا تھیوری الگ بات ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا حقیقی مظاہرہ دوسری بات۔ واٹر گیٹ مقدمہ کی کارروائی نے مجھ پر افراد کے نافذ کردہ جانبدارانہ اور ذاتی پسند کے قوانین کے مقابلہ میں قومی اتفاق رائے سے منظور کردہ قوانین کی اہمیت کو اچھی طرح واضح کر دیا............ ایک سال بعد ۱۹۷۴ء میں جب صدر نکسن نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دیا، انتقال اقتدار صاف شفاف اور پرامن طریقے سے ہوا۔ امریکہ ایسی جمہوریت میں سربراہ آتے اور جاتے رہتے ہیں لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا آئین قائم رہتا ہے۔ جیسے جیسے ہارورڈ میں میری تعلیم کی تکمیل کے دن قریب آتے گئے، کیمبرج اور امریکہ کے چھوڑنے کے خیال سے میری یاسیت بڑھتی چلی گئی میرے دیگر دوستوں کی طرح جن میں پیٹر گیلبریتھ شامل تھے

۱۹۸۸ء میں پاکستان میں منعقدہ سارک کانفرنس کے موقع پر بھارتی وزیر اعظیم راجیو گاندھی اور وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو۔

مجھے بھی آکسفورڈ میں داخلہ مل چکا تھا لیکن میرا جی وہاں جانے کو نہیں چاہتا تھا کیمبرج اور بوسٹن کے ماحول سے میں مانوس تھی اور زیر زمین راستوں پر ٹرانسپورٹ وغیرہ پر بھی حاوی تھی میں وہاں کے لوگوں کو اچھی طرح جانتی اور پہچانتی تھی میں نے اپنے والد سے درخواست کی پاکستان واپسی سے قبل مجھے قانون کے فلیچر سکول اور ٹفٹس کے سفارت کاری مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے دیں مگر وہ نہ مانے اور بضد تھے کہ میں آکسفورڈ جاؤں۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ ایک ہی مقام پر چار برس کا عرصہ بہت کافی ہے۔ اگر تم امریکہ میں طویل عرصے تک ٹھہری رہیں تو تمہاری جڑیں وہاں پختہ ہو جائیں گی .... اب وقت ہے کہ وہاں سے حرکت کر جاؤ۔ مجھے پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ میرے والد مجھے جبراً وہاں بھیج رہے تھے۔ لیکن میں مجبور تھی کیونکہ آخر کار وہی میرے تعلیمی اور دیگر معاملات کے ذمہ دار تھے میرے پاس متبادل کچھ نہیں تھا اور میں عملیت پسند فرد تھی۔

میری والدہ میرے گریجویٹ ہونے پر وہاں آئیں انہوں نے اور میرے بھائی میر نے جس نے ہارورڈ میں اپنا پہلا تعلیمی سال مکمل کیا تھا مجھے سامان کے اکٹھا کرنے میں مدد دی۔ میری "روم میٹ" یولنڈا کارزکی اور میں نے کمرے کا فرنیچر اٹھوادیا اور دیواروں پر سے پوسٹر بھی اتار لئے۔ ہمارے کمرے خالی نظر آنے لگے اور اسی طرح ہارورڈ کے میدان اور مشترکہ کتاب گھر۔ شائد جانے کا وقت آن پہنچا تھا۔

جب طیارہ لوگان ایئرپورٹ سے اڑا، میں نے بوسٹن کے افق پر ایک آخری نظر دوڑانے کی کوشش کی۔ فیلین کے زیرزمین دکان سے خریداری، ڈرگن پارک میں بچھی میزوں پر خوراک کھانا کاسابلانکا جانا اور پھر ہاکی میں اپنی شکست کے بعد بوسٹن یونیورسٹی میں واپس آنا، انسان چاند پر پہنچ چکا اور میں ٹیلی ویژن پر خاک قمر دیکھنے کیلئے رہ گئی۔ پیٹر، پال اور میری کے گیتوں کے گن گاتی، میں جیٹ طیارے میں جارہی ہوں .... پتہ نہیں پھر کب یہاں واپس آؤنگی اپنے تصورات میں کھوئی میں اپنے گھر پاکستان کی طرف اڑتی چلی گئی۔

باب ۴

المرتضٰی سے تاثرات

آکسفورڈ کے خوابناک کلس

جنوری ۱۹۸۰ء...... المرتضٰی میں حراست کے تیسرے مہینے میرے کان میں پھر تکلیف شروع ہو گئی۔ کلک، کلک کرتی ہوئی شوریدہ آوازیں ۱۹۷۸ء میں حراست کے دنوں کی طرح کانوں کو تکلیف دینے لگیں۔ تب مارشل لاء حکام کی طرف سے کراچی میں بلائے گئے ڈاکٹر نے میری ناک کی ہڈی میں خرابی کی تشخیص کی جو میرے ہر دو ہفتے کے بعد جیل میں اپنے والد کو ملنے کے لئے بذریعہ طیارہ جانے کی وجہ سے اڑان کے باعث بدتر ہو گئی تھی۔ اس نے کان کے اندر کی ٹیوب کو کھولنے کے لئے بڑھتی ہوئی ہڈی کو جلا دیا تھا۔ لیکن اب میں اپنے کان میں بھنبھناتے ہوئے شور کی آوازیں سن رہی تھی اور اس کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ مقامی ڈاکٹر کو دکھایا لیکن کانوں کے شور میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ میں نے قید خانے کے حکام کو اسی ڈاکٹر کو بلانے کا کہا جس نے کراچی میں ناک کا علاج کیا تھا۔ لیکن سخت حیرت ہوئی جب وہ کسی غیر معروف ڈاکٹر کو بلا لائے۔

وہ ڈاکٹر بظاہر شریف آدمی تھا اس نے میرے کان کے معائنہ کے دوران نرم لہجے میں

مجھے کہا ''اپنے اعصاب ڈھیلے رکھو۔ آپ بہت زیادہ دباؤ میں رہی ہیں۔ ''

''اوچھ '' میں چلا اٹھتی ہوں ، ''تم تو مجھے زخمی کر رہے ہو''۔

'' آپ ویسے ہی یہ خیال کر رہی ہیں'' وہ جواب دیتا ہے ''میں تو فقط کان کے اندر کا معائنہ کر رہا ہوں''۔

جب میں اگلی صبح جاگتی ہوں تو اپنے تکیئے پر خون کے تین قطرے دیکھتی ہوں۔

'' آپ نے اپنے کان کے پردہ میں سوراخ کر لیا ہے۔ آپ نے ضرور بالوں کی پن سے ایسا کیا ہے'' ڈاکٹر دوسرے دن مجھے بتلاتا ہے۔ بالوں کی پن! میں بالوں کی پن اپنے کان میں کس لئے ڈالوں گی؟ وہ دو دوائیوں کا ایک نسخہ لکھ دیتا ہے اور مجھے دن میں تین مرتبہ استعمال کے لئے کہتا ہے۔ لیکن ان گولیوں کے نتیجہ میں مجھے نیند آجاتی ہے۔ اور میں جب جاگتی ہوں تو اداس اداس محسوس کرتی ہوں۔ میری والدہ کو اس وقت صدمہ پہنچتا ہے جب وہ دیکھتی ہیں کہ تیسرے روز بھی میں باغ میں جانے کے لئے صبح سویرے نہیں اٹھتی اور نہ ہی کھانے کی طرف راغب ہوتی ہوں۔ بلکہ دانتوں کو برش تک بھی نہیں کرتی۔ وہ اس قدر پریشان ہو جاتی ہیں کہ وہ باقی گولیوں کو پھینک دیتی ہیں۔

بہت دنوں بعد تک ، درد آتا ہے اور جاتا ہے اور شور کی آوازیں بڑھ جاتی ہیں۔ کلک ، کلک ، کلک ، میں سو نہیں سکتی اور سکون بالکل نہیں ملتا۔ کیا حکومت کے ڈاکٹر نے جان بوجھ کر میرے کان کے پردے میں سوراخ کر دیا ہے یا اس سے ایسا غلطی سے ہو گیا ہے۔ کلک ، کلک ، کلک ، میرا کان بھرا بھرا محسوس ہوتا ہے۔ اور پوری طرح سنائی بھی نہیں دیتا۔ میں اپنے مرض سے توجہ ہٹانے کے لئے باغ میں دن بھر زیادہ محنت سے کام کرتی ہوں۔ میرے کان کے پردہ میں سوراخ سے پسینہ بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ نہاتے وقت میرے کان میں پانی بھی ڈھلک جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے کوئی ایسا مشورہ بھی نہیں دیا کہ کان کو خشک رکھوں کیونکہ کان میں پانی جانے سے زخم میں زہر پیدا ہو سکتا ہے۔ کلک کلک۔

رات کو نیند نہ آنے کے باعث میں المرتضیٰ کے اندر گھومتی پھرتی ہوں ۷۰ کلفٹن کی

طرح المرتضٰی پر بھی اتنی مرتبہ چھاپہ مارا گیا ہے کہ چیزیں اپنی جگہ سے ہلا دی گئی ہیں یا غائب کر دی گئی ہیں۔ میرے والد کا قدیم بندوقوں کا ذخیرہ جو میرے پڑدادا سے وراثتاً ملا تھا ضبط کر لیا گیا ہے۔ اور باغ کے ایک سٹور روم میں سر بمہر کر دیا گیا ہے۔ مارشل لاء حکام ہر ہفتہ جانچ پڑتال کے لئے آتے ہیں کہ کہیں میری والدہ اور میں نے سٹور روم کی مہریں توڑ کر بندوقوں سمیت گھر سے راہ فرار تو اختیار نہیں کر لی۔

میں اب بندوقوں سے خالی شدہ کمرے سے ہو کر گزرتی ہوں جسے ہم کھانے کے کمرے کے طور پر استعمال کرتے تھے اور لکڑی سے آراستہ دیواروں کے بلیئرڈ روم میں جاتی ہوں جہاں میرے بھائی آکسفورڈ سے آئے ہوئے دوستوں سے مقابلہ کیا کرتے تھے۔ متعدد بچوں سے گھِرا ہوا ایک چینی کا مجسمہ بلیئرڈ روم کی ایک میز پر سجا بیٹھا ہے اگرچہ اس کی اصلی جگہ ڈرائنگ روم ہے۔ میں اس کو وہیں واپس رکھنے کے لئے اٹھاتی ہوں۔ میرے والد کو یہ مجسمہ بہت پسند تھا وہ اکثر مذاق میں کہتے کہ وہ کافی بچوں کی خواہش رکھتے ہیں تاکہ ایک کرکٹ ٹیم بن سکے لیکن جدید دنیا میں ۱۱ بچوں کی تعلیم بہت مہنگی پڑے گی چنانچہ انہوں نے چار بچوں پر ہی اکتفا کیا تھا۔ آکسفورڈ، آکسفورڈ، آکسفورڈ انہوں نے ہم سب کے کانوں میں یہ لفظ ٹھونس دیا تھا۔ آکسفورڈ دنیا کی بہترین اور باوقار یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔ آکسفورڈ میں پوری انگریزی تاریخ سرائت کر چکی ہے۔ انگریزی ادب، گرجا، شہنشاہیت، پارلیمان سب کا کوئی نہ کوئی تعلق آکسفورڈ کے ساتھ ہے۔ امریکی طریقہ تعلیم اچھا تھا وہ مانتے تھے لیکن ان کا طریق کار زیادہ ڈھیلا تھا۔ آکسفورڈ ہم سب پر نئے افق کھولے گا اور نظم و ضبط کا احساس بخشے گا۔ ہم سب کی پیدائش پر انہوں نے ہر ایک کا نام وہاں رجسٹر کرا دیا تھا۔ سب سے بڑی ہونے کی بنا پر صرف میں ہی آکسفورڈ میں اپنی تعلیم مکمل ہونے کی عیاشی حاصل کر سکی کیونکہ بعد میں تختہ الٹ جانے کی بنا پر سب کی زندگیاں اتھل پتھل ہو گئیں میر کو تعلیم کے دوسرے سال ہی اپنی تعلیم منقطع کرنا پڑی تاکہ انگلستان میں اپنے والد کی زندگی بچانے کی تگ و دو کر سکے۔ جبکہ صنم وہاں پہنچنے ہی نہ پائی۔ میرے وہ سال جو میرے والد کی مادر علمی میں گزرے میرے والد کی نظر میں ان کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔

"مجھے یہ سوچ کر ایک عجیب قسم کا احساس ہوتا ہے کہ تم میرے انہی نقوش قدم پر چل رہی ہو جو آکسفورڈ میں ۲۲ سال قبل میں نے چھوڑے تھے"۔ میرے والد نے ۱۹۷۳ء کے موسم خزاں میں میری آکسفورڈ آمد کے فوراً بعد وزیراعظم ہاؤس راولپنڈی سے مجھے ایک خط میں لکھا۔ "میں ریڈ کلف میں تمہاری موجودگی پر خوش تھا لیکن چونکہ میں ہارورڈ میں نہیں تھا...... میں اپنی آنکھوں کے کیمرے سے اس کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں تمہاری موجودگی کو اپنے ہی گوشت پوست کی طرح آکسفورڈ کی گلیوں کے گول پتھروں پر یخ بستہ پتھریلی سیڑھیوں کے ہر قدم پر اور علمی درسگاہ کی ہر ڈیوڑھی میں دیکھتا ہوں۔ تمہارا آکسفورڈ میں موجود ہونا میرے خوابوں کی تعبیر ہے ہماری دعا اور امید ہے کہ ہمارا یہ خواب حقیقت کا روپ دھار کر پاکستانی عوام کی خدمت میں ایک شاندار کردار بن کر ابھرے۔"

وہ آکسفورڈ میں رہتے ہوئے میری نسبت زیادہ خوش و خرم تھے۔ یہاں ہارورڈ کی طرح نہیں جہاں میری ہم جماعت اور مجھے الگ الگ رہائشی کمرے ملے ہوئے تھے بلکہ لیڈی مارگرٹ ہال میں میرا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اور غسل خانہ پورا راستہ کاٹنے کے بعد سب کے لئے مشترکہ تھا۔ میرے پاس کوئی الگ ٹیلی فون نہیں تھا اور پیغام رسانی کے لئے آکسفورڈ کے پرانے طریق کار پر عمل کرنا پڑتا تھا۔ جس میں دو دن کا عرصہ لگ جاتا تھا۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ انگریز زیادہ سنجیدہ تھے نسبتاً ہارورڈ کے دوستوں کے جو بہت جلد گھل مل جاتے تھے۔ ہفتوں تک میں امریکی ہم جماعتوں کی دوستی کی متلاشی رہی جو آکسفورڈ میں داخلہ لے چکے تھے۔ میرے والد نے قدیم روم کا ایک نقشہ جو ۱۹۵۰ء میں کرائسٹ چرچ میں ان کے کمرے میں لٹکتا تھا میرے لئے بھجوایا۔

"آکسفورڈ میں داخلہ سے پہلے اس نقشہ کے کوئی معانی تمہیں سمجھ نہیں آسکتے تھے" انہوں نے المرتضٰی سے مجھے خط تحریر کیا "اب میں تمہیں یہ نقشہ بھجوا رہا ہوں تاکہ اپنے کمرے میں رکھو" میں نے اسے دیوار پر لٹکایا تھا۔ تاکہ اس تسلسل کے احساس کو یاد رکھوں جواب پاکستان کی گرد سے آکسفورڈ کی گلیوں تک پھیلا ہوا تھا۔ میرے والد نے مجھے متنبہ کر

دیا تھا کہ ہارورڈ کی نسبت آکسفورڈ میں جبراً کام کرنے کا عادی بنایا جائے گا۔ جب مجھے ہر ہفتے سیاسیات، فلسفہ اور اقتصادیات کے مضامین پر ٹیوٹوریل گروپ کے لئے دو مضمون لکھنے پڑے تو محسوس ہوا کہ وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ وہ مجھے آکسفورڈ یونین میں شمولیت پر ٹھیک ہی اصرار کرتے تھے۔ آکسفورڈ کی مختلف سوسائٹیوں میں سے جو تعداد میں کافی تھیں یعنی قدامت پرست سوشلسٹوں سے لے کر لبرل سیاسی کلبوں تک، سب سے زیادہ مشہور آکسفورڈ یونین کی ڈیبیٹنگ سوسائٹی تھی۔ جس کا قیام ۱۸۲۳ء میں عمل میں آیا تھا اور جو دارالعلوم کی طرز پر تشکیل دی گئی تھی۔ اور یہی یونین مستقبل کے سیاستدانوں کی تربیت گاہ تھی۔ سیاست میں زندگی پر قریب سے دباؤ اور تناؤ دیکھنے کے بعد میرا ارادہ سیاستدان بننے کا مطلق نہیں تھا۔ میں پاکستان کی وزارت امور خارجہ میں ملازمت کا سوچ رہی تھی۔ تاہم اپنے والد کو خوش کرنے کے لئے میں آکسفورڈ یونین میں شامل ہوگئی۔ اپنے والد کی خواہشات کا بھرم رکھنے کے علاوہ مجھے فن مباحثہ سے بھی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ایشیا کے برصغیر میں فن خطابت ہمیشہ ہی ایک قوت بن کر ابھرا جہاں ناخواندہ عوام کی اکثریت تھی۔ لاکھوں لوگ مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، محمد علی جناح اور میرے والد کی تقریروں سے متاثر ہوئے۔ افسانہ گوئی، خطابت اور شاعری ہماری روایات کا حصہ رہے ہیں۔ مجھے شائبہ تک نہیں تھا کہ آکسفورڈ یونین کی شائستہ اور سجی ہوئی دیواروں میں حاصل شدہ میرا تجربہ پاکستان کے میدانوں میں لاکھوں کے مجمعوں سے خطاب کرتے ہوئے کام آئے گا۔ تین سال پی پی ای کی تعلیم میں گزارنے کے بعد جب میں بین الاقوامی قانون اور سفارت کاری میں پوسٹ گریجوائٹ کورس کے لئے واپس آئی تو آکسفورڈ یونین میری زندگی کا اہم ترین اور خوشگوار ترین نقطہ ارتکاز بن چکی تھی۔ آکسفوڈ کے مرکز میں باغات اور عمارت بمع زیر زمین ریستوران، دو لائبریریاں اور ایک بلیئرڈ روم سے میں اتنا ہی مانوس تھی جتنا المرتضٰی کے کمروں سے۔ اس کے مباحثہ کے ہال میں تحریک نسواں کی علمبردار مشہور مصنفہ جرمین گرئیر سے لے کر مزدور لیڈر آرتھر سکارگل ایسے مقرروں کو سنا۔ آکسفورڈ یونین میں میرے وقتوں میں دو سابق وزرائے اعظم لارڈ سٹاکٹن اور ایڈورڈ ہیتھ بھی آئے۔ طالب علم مقرر

اپنے مخصوص لباسوں میں گلنار پھولوں کو اڑستے ہوئے آئے اور مجھے بھی جینز اتار کر اپنا بلینڈا کا ریشمی لباس پہننے پر مجبور کیا۔ شمعوں کی روشنی میں عشائیہ کے طعام کے بعد ہم نے لفظوں کی لڑائی چھیڑ دی۔

زندگی ہمارے ساتھ کیا کیا فریب کرتی ہے؟ پہلی تقریر جو سابق برطانوی مدبرین گلیڈ سٹون اور میکملن کے مجسموں کے جلو میں بڑے مباحثوں کے ہال میں مجھے کرنے کے لئے کہا گیا۔ اس کا تعلق ایک منتخب سربراہ مملکت کی مسلح نہیں بلکہ آئینی معزولی سے تھا۔ یونین کے صدر نے مجھے یہ تحریک پیش کرنے کی دعوت دی جس میں ہاؤس کی طرف سے نکسن کی مذمت کی گئی تھی۔ "یہ کتنا بڑا تضاد ہے کہ جو شخص نظم و ضبط قائم کرنے کے مسئلہ پر صدارت کا انتخاب لڑتا ہے خود ہی قانون کو توڑنے کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور اپنے ملک کے طول و عرض میں بدامنی پھیلاتا ہے" میں نے اپنی پہلی دلیل دی۔ "لیکن امریکی تاریخ ایسے تضادات سے بھری پڑی ہے۔ مجھے جارج واشنگٹن اور ان کے والد کا قصہ بیان کرنے دیجئے جب نوجوان جارج کے والد نے چیری کے درخت کو کٹا ہوا پایا تو وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا اور استفسار کیا کہ یہ کس کی شرارت تھی؟۔ بہادر نوجوان جارج نے قدم آگے بڑھایا اور کہا "والد صاحب، میں جھوٹ نہیں بولوں گا یہ کام میں نے کیا ہے" خیر. امریکی تاریخ کی ایک ایسے صدر سے ابتداء ہوئی جو جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اور اب ایک ایسا صدر ہے جو سچ نہیں بول سکتا"۔ ایک بیس سالہ فرد کی حیثیت میں اپنے یقین کامل کے ساتھ میں نے صدر امریکہ کے خلاف قابل مذمت الزامات کی فہرست بیان کرنا شروع کی یہ الزامات حسب ذیل تھے۔

ا۔ ویت نام میں اور کمبوڈیا کی خفیہ بمباری میں کانگرس کے جنگ شروع کرنے کے اختیارات کی خلاف ورزی۔

ب۔ نائب صدر امریکہ کے طور پر ٹیکس میں رعائت کے کاغذات میں تاریخوں کی دانستہ تبدیلی۔

ج۔ واٹر گیٹ سکینڈل میں اپنی شمولیت کے ثبوت کی پردہ پوشی۔

دورہ چین کے دوران وزیر اعظم بے نظیر بھٹو اپنی مداحوں کو آٹو گراف دیتے ہوئے

د۔ اپنی سیکرٹری کے ٹیپوں میں قطع و برید۔

تقریر ختم کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "میرے دوستو، اب کوئی غلطی نہیں ہونا چاہئے۔ یہ الزامات گھمبیر ہیں نکسن نے متواتر اپنے آپ کو قانون سے ماورا سمجھا ہے۔ اور جیسے چاہا ویسے کیا۔ آخری انگریز حکمران جس نے اپنی مرضی کی اس نے اپنا سر بھی کھویا۔ ہم اس سے کم شدید مگر اتنی ہی پر اثر جراحی کی تجویز پیش کر رہے ہیں...... کہا جاتا ہے کہ نکسن ایک مرتبہ ماہر نفسیات کے پاس گیا۔ "جناب صدر! آپ مالخولیا کے مریض نہیں ہیں۔ آپ سے ہر کوئی نفرت کرتا ہے" آج نکسن مطعون ہی نہیں بلکہ اپنا اعتماد بھی کھو چکا ہے۔ اپنے لوگوں کا اعتماد، نکسن امریکی قوم کی رہنمائی کا اخلاقی جواز کھو چکا ہے۔ یہ نکسن اور امریکہ کا عظیم المیہ ہے"۔

قوانین کی حرمت، اعتماد، اخلاقی جواز، یہ تمام جمہوری اصول جن کی مغرب میں میں نے تربیت حاصل کی تھی پاکستان میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ صدر نکسن کی مذمت کی قرار داد دو کے مقابلے میں ۳۴۵ ووٹوں سے پاس ہو گئی صد حیف کہ پاکستان میں ووٹوں نے نہیں بلکہ بندوقوں نے میرے والد کا تختہ الٹا۔

جب میں آکسفورڈ میں تھی تو پاکستان بہت فاصلے پر قائم دکھائی دیتا تھا۔ جیسے میرے والد نے پیش گوئی کی تھی یہی ہلکے پھلکے اور خوشگوار برس جو یہاں گزارے میری زندگی کے بہترین برس بن گئے۔ دوست مجھے دریائے چرول پر گھڑ دوڑ میں لیجاتے اور اسی طرح ووڈ سٹاک کے نزدیک بلینھم محل کے سایہ دار سبزہ زار میں پکنک منانے کے لئے بھی اصرار کرتے۔ دیگر ہفتہ وار تعطیلات میں ہم اپنی پیلی گاڑی میں سوار ہو کر جاتے جو مجھے ریڈ کلف میں گریجوایٹ ہونے پر میرے والد نے تحفتاً دی تھی۔ تاکہ ہم سٹریٹ فورڈ آن ایوان میں شکسپئیر کا ڈرامہ دیکھ سکیں۔ یا پھر لندن میں باسکن، روبنز کی نئی شاخ پر پیپر منٹ آمیز آئس کریم کھانے کا لطف اٹھا سکیں۔ آٹھویں ہفتہ میں جب ہر کالج کے کشتی ران مقابلہ کے لئے اکھٹے ہوئے ہم سب کشتی رانوں کی ساحلی قیام گاہوں میں پارٹیاں کھانے کے لئے اکھٹے ہو گئے۔ مردوں نے ملاحوں کا لباس اور کھیلوں کے بلیزر پہنے ہوئے تھے اور

خواتین نے لمبے پھولدار ملبوسات اور ہیٹ، ہم نے امتحانوں کے بہانے روائتی سفید قمیصیں، سیاہ سکرٹ اور بے آستین سیاہ گاؤن پہنے جنہیں دیکھ کر آکسفورڈ میں غیر طالب علم اشخاص بھی ہمارا "خوش قسمت" کے نعروں سے استقبال کرتے۔ ہارورڈ کے برعکس جہاں غیر ملکی طلباء کی تعداد بہت کم تھی صرف ریڈ کلف میں ہماری کلاس میں انگریز خاتون سمیت صرف چار طلباء تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لیکن آکسفورڈ میں کافی تعداد تھی۔ مشہور کرکٹر عمران خان وہاں تھا اسی طرح بہرام دہقانی تفتی جس کے والد ایرانی تھے بہرام جسے انقلاب کے فوری بعد ۱۹۸۰ء میں قتل کر دیا گیا، پیانو پر ہمیں تفریح مہیا کرتا تھا۔ اس کی تنوع مزاجی میں گلبرٹ، سیلیون اور سکاٹ جاپلس سے لے کر فورے تک شامل تھے۔ لیکن ایشیائی آکسفورڈ میں بطور اجنبی قابل قبول تھے اور کسی خاص زمرے یا جماعت میں گنے نہیں جاتے تھے۔ مگر سب برطانوی باشندے ایسا محسوس نہیں کرتے تھے۔ فروری ۱۹۷۴ء میں میں لاہور میں مجوزہ اسلامی سربراہی کانفرنس کا خاندان کے ہمراہ مشاہدہ کرنے کے لئے بذریعہ طیارہ پاکستان پہنچ گئی۔ تقریباً مسلم ممالک کے تمام شہنشاہ، صدر، وزیراعظم اور وزیر خارجہ حاضر تھے اور وہ ۳۸ اقوام، ممالک، امارات، اور سلطنتوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ سربراہی کانفرنس کے اراکین کو میرے والد کی بنگلہ دیش کو قبول کرنے کی دعوت پر مجیب الرحمٰن بھی صدر حواری بومدین کے ذاتی طیارہ میں تشریف لے آئے۔ میرے والد اور پاکستان کے لئے کانفرنس کی کامیابی ایک بہت بڑا اعزاز تھی۔ مجیب کے ساتھ صلح کرنے میں میرے والد کا ایک مقصد پاکستانی جنگی قیدیوں کی پرامن واپسی کا راستہ کھولنا تھا جن کو بنگالی راہنما نے جنگی مقدمات کی دھمکی دی تھی۔

میں اپنی ایشیائی شناخت کے جوشیلے ولولے سے بھری ہوئی انگلستان واپس آئی تو امیگریشن آفسر نے میرا پاسپورٹ دیکھ کر سوال کیا۔

"انگلستان میں تم کہاں قیام کرو گی؟"۔

آکسفورڈ، میں نے ملائمت سے جواب دیا "میں وہاں کی طالبہ ہوں"۔

"آکسفورڈ، اس نے اپنے ابرو بھینچتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

چڑ چڑا کر میں نے اپنا تعلیمی شناختی کارڈ دکھایا۔

بھٹو، مس بے نظیر بھٹو، کراچی، پاکستان اس نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ "تمہارا پولیس کارڈ کہاں ہے؟"۔

"یہ ہے" میں نے جواب دیا اپنا مکمل پولیس کارڈ جو انگلستان میں ہر غیر ملکی کو رکھنا پڑتا ہے دکھایا۔

"اور آکسفورڈ میں اپنے بل کیسے ادا کروگی؟" اس نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کے سوالوں کے جواب میں اپنی برہمی پر قابو پاتے ہوئے کہا "میرے والدین میرے بینک اکاؤنٹ میں رقم بھیجتے ہیں" میں نے اپنی بینک کی کتاب اسے دکھائی۔

پھر بھی اس کم ظرف ملازم نے مجھے کھڑے رکھا میرے کاغذات کو بار بار دیکھتا رہا میرا نام پڑھتا رہا جو شاید وہ اپنی بڑی موٹی کتاب میں پہچان نہیں سکا تھا۔

"ایک پاکی" (پاکستانی کے لئے تحقیر آمیز لفظ) کے پاس آکسفورڈ میں تعلیم کے لئے اسقدر دولت کہاں سے میسر ہو سکتی ہے" مجھے میرے کاغذات واپس کرتے ہوئے اس نے کہا۔

میں غصے میں بھری ہوئی تھی جب میں اپنے پاؤں پر واپس لوٹی اور ایئرپورٹ سے باہر آگئی...... اگر امیگریشن حکام کا وزیراعظم کی بیٹی کے ساتھ یہ رویہ ہے تو باقی پاکستانیوں سے وہ کیا سلوک کرتے ہوں گے جو میری طرح روانی سے نہ تو انگریزی بول سکتے ہیں اور نہ ہی جارحانہ انداز اختیار کر سکتے ہیں؟۔

آکسفورڈ میں جانے سے بہت عرصہ پیشتر میرے والد نے مجھے اس تعصب کے خلاف متنبہ کیا تھا جو مغرب میں پھیلا ہوا ہے۔ بطور طالب علم انہیں بھی اس کا تجربہ ہو چکا تھا جب سان ڈیگو، کیلی فورنیا میں ایک ہوٹل کلرک نے انہیں ایک کمرہ دینے سے انکار کر دیا تھا اس لئے نہیں کہ وہ پاکستانی تھے بلکہ اس لئے کہ انکا سانولا رنگ ایک میکسیکو کے باشندے کی مانند نظر آتا تھا۔ انہوں نے مجھے نسلی تعصب کے خطرات سے آگاہ کیا جب آکسفورڈ سے میرے خطوط اور گھر میں میرے حوالہ جات اتنے ہی مغربی محسوس ہوتے تھے جتنے مشرقی تھے۔ انہیں

خدشہ تھا کہ میں کہیں مغرب ہی کی ہو کر نہ رہ جاؤں اور پاکستان واپس آنا پسند نہ کروں۔
"وہ اپنے قلب کی گہرائیوں سے جانتے ہیں کہ بطور طالبہ تم نے ان کے ملک میں ہمیشہ کے لئے رہائش اختیار نہیں کرنی" انہوں نے مجھے خط لکھا "وہ تمہیں اس لئے قبول کرتے ہیں کہ وہ تمہیں تارک وطن متصور نہیں کرتے۔ ان کا رویہ اس وقت تبدیل ہو جاتا ہے جب انہیں پتہ چلتا ہے کہ تم ایک اور ایسے پاکستانی یا ایشین ہو جو ان کے عظیم ملک میں پناہ لینے کے لئے آئے ہو۔ وہ پھر تمہیں حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھیں گے۔ وہ اس بات کو غیر مناسب سمجھتے ہیں کہ تم ان سے کسی بھی میدان میں مسابقت کی کوشش کرو"۔

ان کے تمام خدشات غیر ضروری تھے کیونکہ میں نے پاکستان واپس نہ جانے کے متعلق کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میرا دل تو وہیں تھا۔ میرا ورثہ اور کلچر وہیں تھا۔ اسی طرح میرا مستقبل بھی محکمہ سفارت کاری میں، میں سفارت کاری میں اپنے والد کی بیٹی ہونے کے ناطے پہلے ہی کافی تجربہ حاصل کر چکی تھی۔ ۱۹۷۳ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دورے میں جہاں میرے والد نے پاکستان کے خلاف اسلحہ کی پابندی کو اٹھانے کی تحریک پر زور دیا میں وائٹ ہاؤس کے سرکاری عشائیہ میں ہنری کسنجر کے ساتھ بیٹھی تھی۔ سوپ پیتے ہوئے میری سوچ کا محور سگار کے کش لگاتے ہوئے وزیر خارجہ کے پانڈہ کی کھال کی چٹائی پر پڑی ہوئی بدنما ہارورڈ کی میز تھی جو ایک بہت قیمتی شے محسوس ہوئی اور میں نے فوراً خرید کر ایک اپنی ہمشیرہ اور دوسری سمیعہ کو بھجوا دی۔ جب مچھلی پیش ہوئی تو میں نے اپنی توجہ دوسری طرف مرکوز کرنے کے لئے ہارورڈ کی ممتاز حیثیت اور دیگر غیر متنازعہ مسائل پر بات چھیڑ دی۔ میں اگلی شب اسی وجہ سے کافی پریشان ہوئی جب کسنجر نے میرے والد کو ایک دوسرے عشائیہ پر یہ کہہ کر چھیڑنے کی کوشش کی "مسٹر وزیراعظم! تمہاری بیٹی تم سے زیادہ بزدل ہے" میرے والد نے یہ بات ہنسی میں اڑا دی یہ سمجھتے ہوئے کہ کسنجر کی طرف سے یہ تعریفی کلمات تھے۔ لیکن مجھے ابھی تک اس پر یقین نہیں۔

۱۹۷۴ء میں جب میرے والد نے فرانس میں جارج پمپیڈو کی رسومات جنازہ میں شرکت کی تو نیوکلیائی طاقت ہی زیر بحث تھی انہوں نے ایک سال قبل پمپیڈو سے نیوکلیائی تعاون کا غیر سرکاری معاہدہ طے کر لیا تھا۔ جس کے مطابق فرانس نے پاکستان کو ایٹمی قوت

کے لئے یورنیم کو دوبارہ افزودہ کرنے کا پلانٹ مہیا کرنا تھا۔ جو بات ان کے علم میں نہیں تھی وہ یہ تھی کہ آیا پمپیڈو کا جانشین اس گفتگو کا سلسلہ جاری رکھ سکے گا...... میکسم ہوٹل میں عشائیہ کے موقع پر میرے والد نے اپنے دوستوں کے ہمراہ مجھے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے کہ اگلا صدر فرانس کون ہوگا؟" "ژسکار دیستان" میرا جواب تھا جو فرانسیسی سیاست کے راست راستے پر چلنے کی وجہ سے آسانی سے متوقع تھا۔ اور اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں ان دنوں کرائسٹ چرچ میں اپنے اتالیق پیٹر پلسر سے فرانسیسی سیاست کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ خوش قسمتی سے میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا کیونکہ ژسکار دیستان نے اس معاہدہ پر عمل سے اتفاق کیا حالانکہ ہنری کسنجر اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کا دباؤ ان پر شدید تھا۔

تین برس قبل چین میں جہاں میرے والد نے میرے بھائیوں، بہن اور مجھے ایک کمیونسٹ ملک کے مشاہدہ کے لئے بھیجا تھا وہاں میرے صدر کے متعلق تبصرے اتنے زیرک نہیں تھے۔ چواین لائی کے ساتھ ایک غیر سرکاری ملاقات میں، چینی وزیراعظم نے مجھے پوچھا کہ میرے خیال میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کا اگلا صدر کون ہو گا تو میں نے پختہ یقین کے ساتھ "جارج میک گورن" کا نام لیا۔ اس کے باوجود کہ چواین لائی نے جب بتایا کہ ان کے ذرائع کے مطابق رچرڈ نکسن کے مواقع زیادہ ہیں میں نے اپنی بات ہی کو دہرایا۔ ہارورڈ میں ایک مخالف جنگ کارکن اور اعتدال پسند شمال مشرقی امریکی شہری کے طور پر میرے ذہن میں میک گورن کے علاوہ کسی اور کا نام آ ہی نہیں سکتا تھا۔ "جب امریکہ واپس جاؤ تو اپنے تاثرات مجھے لکھنا" چواین لائی نے مجھے کہا۔ "میری رائے میں میک گورن ہی ہے" میں نے بااصرار کہا۔ بطور طالبہ میری سیاسی بصیرت اتنی ہی تھی۔

جب میں ایک سال کے پوسٹ گریجوایٹ کورس کے لئے انگلستان واپس آئی تو ۱۹۷۶ء کے موسم خزاں میں میرے اپنے صدارتی انتخابات، نے مجھے کافی مصروف رکھا۔ اگرچہ میں عالم تعلیم سے عالم سفارت کاری میں جانے کے لئے بہت بے چین تھی تاہم میرے والد کو شدید احساس تھا کہ ان کے بچے ایک وزیراعظم کے بچے ہونے کی وجہ سے کسی بھی سرکاری آسامی پر آنے کے لئے دوسرے بچوں سے تعلیمی قابلیت اور استعداد میں دگنی صلاحیت کے مالک ہونا چاہیئں تاکہ کوئی ان پر ناجائز اقرباء نوازی کا الزام نہ دھر سکے۔

میرے بھائی میر نے آکسفورڈ میں ابھی پہلے تعلیمی سال کا آغاز کیا تھا اور میں اس کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا سوچ رہی تھی۔ لیکن آکسفورڈ میں ایک اور سال رہنے کا حقیقی فائدہ یہ تھا کہ آکسفورڈ یونین کی صدارت کے لئے کھڑی ہونے کا موقع تھا۔ برسابرس میں یونین کی مجلس قائمہ کی رکن رہی تھی اور خزانچی بھی، لیکن صدارت کی پہلی کوشش میں مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس مرتبہ میں جیت گئی۔ دسمبر ۱۹۷۶ء میں میری فتح نے ''بوڑھے لڑکوں کی کلب'' میں انقلاب پیدا کر دیا۔ جہاں دس سال قبل خواتین کا اوپر کی منزل کی گیلری میں داخلہ ممنوع تھا اور جہاں مردوں اور عورتوں میں رکنیت کی نسبت سات اور ایک تھی۔ میری کامیابی نے سب کو حیرت زدہ کر دیا میرے والد کو بھی۔

امریکہ میں ۱۹۷۶ء کے صدارتی انتخاب سے قبل انہوں نے مجھے لکھا ''انتخاب میں ایک پارٹی اگر جیتتی ہے تو دوسری ہارتی ہے'' اس طرح مجھے ڈٹا رہنے کا سبق دینا چاہتے تھے جس طرح جیرلڈ فورڈ جمی کارٹر کے ہاتھوں شکست کھا گیا تھا۔ ''تمہیں اپنی مقدور بھر کوشش کرنا چاہئے لیکن نتیجہ جو بھی ہو شرافت سے برداشت کرنا چاہئے'' ایک ماہ بعد میرے والد کا پیغام مختلف تھا ''آکسفورڈ یونین کے صدارتی انتخاب میں تمہاری کامیابی پر از حد خوش ہوں'' ان کے ٹیلیگرام میں لکھا تھا۔ ''تم نے شاندار کارنامہ سرانجام دیا ہے تمہاری عظیم کامیابی پر دلی مبارک باد، پاپا''۔

میری تین ماہانہ ٹرم بطور صدر یونین جنوری ۱۹۷۷ء سے شروع ہونا تھی۔ جب میر اور میں پاکستان میں گھر واپسی کے لئے روانہ ہوئے تو مائیکل ماس کی تعطیلات کا وقفہ تھا میرے افق پر کوئی بادل اندھیرا کئے ہوئے نہیں تھا۔

چند روز بعد المرتضیٰ کے میدان میں میرے والد کی سالگرہ پارٹی پر میرے والد کے ایک معاون نے مجھے کہا ''آؤ، اور ضیاء الحق سے ملو'' پہلی اور تنہا ملاقات میں میں اس شخص کے سامنے تھی جس نے چھ ماہ بعد میرے والد کا تختہ الٹا اور بعد میں موت کے منہ میں دھکیلا۔

آرمی چیف آف سٹاف کی تقرری میں مشکلات کا سننے کے بعد میں اس نامزد کردہ شخص

کو ملنے کی جستجو رکھتی تھی۔ اس اعلیٰ ترین فوجی آسامی پر تقرری میں چھ دیگر جرنیلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے جنرل ضیاء کا انتخاب کیا گیا تھا۔ وہ سب کسی نہ کسی اخلاقی گراوٹ کا شکار تھے یعنی شراب نوشی، زنا کاری یا مشکوک وفاداری جنرل ضیاء بھی اگرچہ عیوب سے یکسر پاک نہیں تھا تاہم جنرل ضیاء "فوجی انٹیلی جنس" کے مطابق جماعت اسلامی سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ ایک بنیاد پرست مذہبی جماعت تھی جو پی پی پی کی مخالف تھی اور چاہتی تھی کہ ملک پر سیکولر قوتوں کے برعکس مذہبی راہنماؤں کی حکومت ہو۔ میرے والد کے بعض سفیروں کے مطابق وہ ایک کمینہ سارق بھی تھا۔ لیکن ضیاء میں معتدبہ خوبیاں بھی تھیں ہمارے متعدد فوجی افسران کے برخلاف ضیاء پر مشرقی پاکستان میں ظلم و تباہی کا دھبہ نہیں تھا کیونکہ وہ خانہ جنگی کے دوران ملک سے باہر تھا۔ فوج میں رپورٹوں کے مطابق وہ قابل عزت سمجھا جاتا تھا۔ اس طویل انتخابی طریق کار میں میرے والد کو اور کوئی معیار پسند نہ آیا۔ جب مختلف فوجی ایجنسیوں نے ضیاء کی حمایت میں رپورٹیں تحریر کیں تو میرے والد نے اس کا انتخاب کر لیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ "سول حکومت فوج پر اپنی مرضی عائد کرتے ہوئے ظاہر ہو۔ ضیاء چند سینئر ترین افسروں میں شامل نہیں تھا مگر فوج میں جوان اس کو قابل تکریم سمجھتے تھے" میرے والد نے مطمئن ہو کر کہا اور اب ۵ر جنوری ۱۹۷۷ء کو میں اس شخص کے روبرو تھی جس نے ہماری زندگیوں کو چند ماہ بعد پوری طرح مفلوج کر دیا تھا۔

میں چند لمحوں کے لئے پریشان ہوئی جب میں نے اسے دیکھا۔ میرے بچپن کے تصور کے برعکس جو میرے ذہن میں ایک سپاہی کے متعلق تھا کہ وہ قد آور، تند خو اور جیمز بانڈ کی طرح آہنی اعصاب کا مالک ہوتا ہے میرے سامنے ایستادہ جنرل کوتاہ قد، خوف زدہ اور بے اثر سا آدمی نظر آیا جس نے تیل سے چپڑے ہوئے بالوں کی مانگ درمیان سے نکالی ہوئی تھی۔ اور وہ بری طرح سر سے چپکے ہوئے تھے۔ وہ ایک پرتاثیر فوجی راہنما کی بجائے ایک انگریزی غنڈہ کارٹون نظر آتا تھا۔ وہ اس قدر اطاعت گزار ظاہر ہوتا تھا کہ بار بار یہ جملہ دہراتا تھا کہ وہ ایک نابغہ لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی سے ملاقات کو اپنی بہت بڑی عزت افزائی سمجھتا ہے۔ "یقیناً میرے والد کو ایک زیادہ بارعب چیف آف آرمی سٹاف مل سکتا
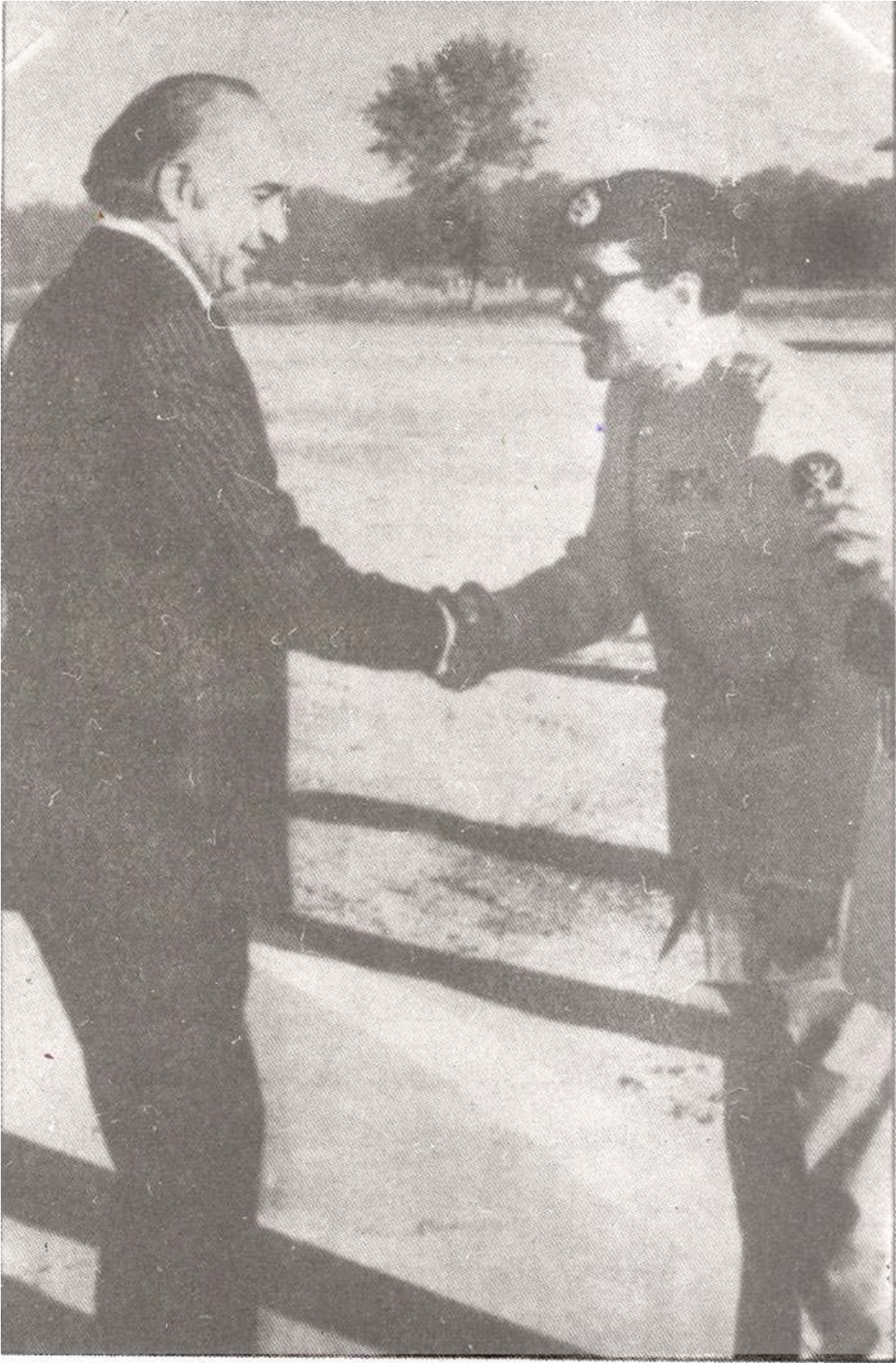
جناب ذوالفقار علی بھٹو کے سامنے ضیاء ہمیشہ جھکے رہے

تھا" میں نے دل ہی میں خیال کیا۔ لیکن اس ضمن میں میں نے والد سے کچھ نہیں کہا۔

"میں مزید زرعی اصلاحات کا اعلان کرنا چاہتا ہوں" المرتضٰی کے باغ میں چلتے ہوئے میرے والد نے اپنی سالگرہ کے دن سہ پہر کو مجھے بتایا۔ "میرا خیال ہے کہ مارچ میں انتخابات کا اعلان بھی کر دوں۔ آئین کے مطابق ماہ اگست تک انتخابات کی ضرورت نہیں لیکن میں مزید انتظار نہیں کرنا چاہتا۔ تمام جمہوری ادارے جو آئین کے ماتحت قائم کئے گئے ہیں اپنی جگہ پر قائم ہیں پارلیمان اور صوبائی حکومتیں نظم و نسق بخوبی چلا رہی ہیں۔ عوام سے اب نیا منڈیٹ لے لیں تو ہم آسانی سے اپنے پروگرام کے دوسرے مرحلے پر عمل در آمد کر سکتے ہیں یعنی ملک کی صنعتی بنیاد میں توسیع کرنے، نئے ٹیوب ویل لگا کر زراعت کو جدید کرنے، بیجوں کی تقسیم بہتر کرنے اور کھاد کی پیداوار میں اضافہ کرنے کا پروگرام" ان کے دماغ سے نئے خیالات اُمڈ رہے تھے۔ اور ایک جدید اور دوسرے ملکوں سے مسابقت کے بعد آگے بڑھنے والے پاکستان کا خواب نزدیک تر ہو رہا تھا۔

ان کی بہت سی اصلاحات کا آغاز ہو چکا تھا۔ پی پی پی نے اپنی مہم کے دوران غریبوں سے جو وعدے کئے تھے ان کے مطابق جاگیرداروں کی زرعی زمین کی دوبارہ تقسیم شروع ہو گئی تھی۔ میرے والد نے پاکستان کے ۲۲ خاندانوں کی اجارہ داری میں چلتی صنعتوں کو قومیا کر اپنی سوشلسٹ اقتصادی پالیسیاں شروع کر دی تھیں تاکہ ان صنعتوں کا منافع اپنے ملک میں واپس لایا جا سکے۔ ان کی حکومت نے مزدوروں کے لئے کم از کم اجرت کا تعین کر دیا تھا جن کو قبائلی سردار اور صنعتی مالکان محنت کے عوض کچھ بھی دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے مزدوروں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنی یونین کی تشکیل کر سکیں۔ صنعتی انتظامیہ میں آواز اٹھا سکیں اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اپنے مستقبل کی شرائط طے کر سکیں۔ بجلی دیہاتی علاقوں میں متعدد دیہات کو پہنچا دی گئی تھی۔ مردوں اور عورتوں کے لئے خواندگی کے پروگرام وضع کئے گئے اور غرباء کے لئے نئے مدرسے تعمیر کئے گئے تھے۔ شہروں میں گرد آلود کھلی جگہوں میں پارک اور باغات اگائے گئے، اور صوبوں میں جہاں پہلے صرف کچے راستے بنے ہوئے تھے نئی پکی رابطہ سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ چینیوں سے ایک

معاہدہ کیا گیا جس کے مطابق ایک بڑی شاہراہ کوہ ہندوکش کے پہاڑوں میں سے نکالی گئی تھی جو چین کی سرحد تک جاتی تھی۔ میرے والد کا پختہ عزم تھا کہ پاکستان کے عوام الناس تک جدید خوشحالی پہنچائی جائے۔

"میرا گدھا نئی سڑک پر اکثر پھسل جاتا ہے" بلوچستان میں ایک کسان نے میرے والد سے شکایت کی۔ "میں تمہیں اس سے بہتر قسم کا گدھا مہیا کروں گا جو تگنی رفتار سے تمہاری سبزیاں منڈی تک پہنچائے گا" میرے والد نے اس کسان کو یقین دلایا۔ اگلے ہفتہ انہوں نے اسے ایک جیپ بھجوا دی۔ بیشک میرے والد کے خلاف بھی ایک گروہ تھا۔ صنعت کار ان کے حامی نہیں تھے کیونکہ ان کی نجی اجارہ داریاں قومی تحویل میں دیدی گئی تھیں۔ جاگیردار بھی ان کے حامی نہیں تھے کیونکہ ان کی جاگیروں میں سے مزارعین کو حصہ دیا گیا تھا جو گیارہ نسلوں سے کھیتوں پر کام کر رہے تھے مگر انہیں ان فصلوں کا جو انہوں نے کاشت کی تھیں صرف نصف حصہ ہی ملتا تھا۔ جماعت اسلامی کے اراکین جن میں اکثر چھوٹے دکاندار تھے نے میرے والد کی معاشرتی اصلاحات کے خلاف آواز اٹھائی خاص طور پر حکومت کی خواتین کے حق میں کھلم کھلا پالیسی کے خلاف کیونکہ وہ گھروں سے باہر ملازمتیں کرتی تھیں اور نئے ملکی قوانین جنس کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کرتے تھے۔ میرے والد کی جمع بندی کی پالیسی نے ان لوگوں کو دشمن بنا دیا جن کے مخصوص مفاد علیحدگی میں تھے۔ بلوچستان اور صوبہ سرحد میں علیحدگی پسند مکمل آزادی چاہتے تھے اور قبائلی سردار اپنی لاکھوں افراد کی رعایا پر مرکزی حکومت کی بجائے اپنی حکومت نافذ کرنا چاہتے تھے۔

دراصل وہ تمام گروہ جو ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی تشکیل کے وقت موجود تھے ۱۹۷۷ء میں بھی اسی طرح موجود تھے۔ علاقائیت پسند مرکزی حکومت کے خلاف. سرمایہ دار سوشلسٹوں کے خلاف، جاگیردار اور سردار تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگوں کے خلاف، غریب صوبوں کے باشندے پنجاب کی امیر اعلیٰ ترین اشرافیہ کے خلاف اور اسی طرح بنیاد پرست ان اشخاص کے خلاف تھے جو ملک کو جدید ترین تقاضوں کے مطابق دیکھنا چاہتے تھے۔ اور ان سب پر فوج کا طاقتور سایہ دامن گیر تھا جو گروہوں میں بٹے ہوئے پاکستان میں

واحد منظم ترین اور باقاعدگی سے چلنے والا ادارہ تھا۔

بعض مغربی سیاسی تجزیہ نگار اور پاکستانی فوجی افسران کی دلیل تھی کہ ایسے متفرق اور منتشر لوگوں کے لئے جن کی خواندگی کی شرح اور سالانہ آمدنی اس قدر قلیل ہو جمہوریت ناممکنات میں سے ہے۔ پاکستان میں اکثر لوگ ایک، دوسرے سے مافی الضمیر کا اظہار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہر علاقے کی اپنی زبان اور اپنی رسومات تھیں۔ ایسی آبادی کو صرف فوجی حکومت ہی راہ راست پر رکھ سکتی تھی یہ عام سوچ تھی لیکن میرے والد نے اس مفروضے کو جمہوری حکومت کی کامیاب تشکیل دے کر ناکام ثابت کر دیا اور بتا دیا کہ انتخابات فیصلہ کرتے ہیں کہ ملک پر حکومت کون کرے گا نہ کہ فوجی طاقت۔ ۱۹۷۷ء کا سال شروع ہوا تو کسی کو بھی ذرہ برابر شک نہیں تھا کہ حکومت مارچ میں دوبارہ منتخب ہو جائے گی۔

جب میرے والد پاکستان میں انتخابات کی تیاریاں کر رہے تھے میں یونین میں مناظروں کی تنظیم کرنے کے لئے آکسفورڈ واپس آ گئی۔ "سرمایہ داری فتح پائے گی" بطور یونین صدر میرے پہلے مباحثہ کا موضوع تھا جس کے لئے یونین کے سابق صدر اور بائیں بازو کے ایک پروقار اور موثر خطیب طارق علی کو مخالفت میں بولنے کی دعوت دی گئی۔

"مغرب کچھ عرصہ کے بعد تیسری دنیا کے خرچ پر مزید زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔" ہمارا دوسرا موضوع مباحثہ تھا جس کا مقصد شمال، جنوب کی واضح تقسیم کی طرف توجہ مبذول کرانا تھا۔

جس عرصہ میں پاکستان میں سیاسی حزب مخالف پی پی پی کے خلاف ایک مشترکہ گروہ میں مجتمع ہو رہی تھی اور ملک کے علاقائیت پسندوں، مذہبی بنیاد پرستوں اور صنعت کاروں نے نو پارٹیوں کے اتحاد کا نام پاکستان قومی اتحاد یعنی پاکستان نیشنل الائنس رکھ دیا تھا۔ میں ان دنوں آکسفورڈ یونین کی روایات کے مطابق پانچویں مزاحیہ مباحثے کے انتظام میں مصروف تھی اس مباحثے کا موضوع تھا "یہ ایوان (راک اینڈ رول) "رول" سے زیادہ "راک" کو پسند کرے گا" راک موسیقی اس پروقار ہال میں پہلی مرتبہ گونج اٹھی جب کہ میگڈلین کالج کے دو دوستوں نے "جیزس کرائسٹ سپر سٹار" کی موسیقی کی لے میں یونین
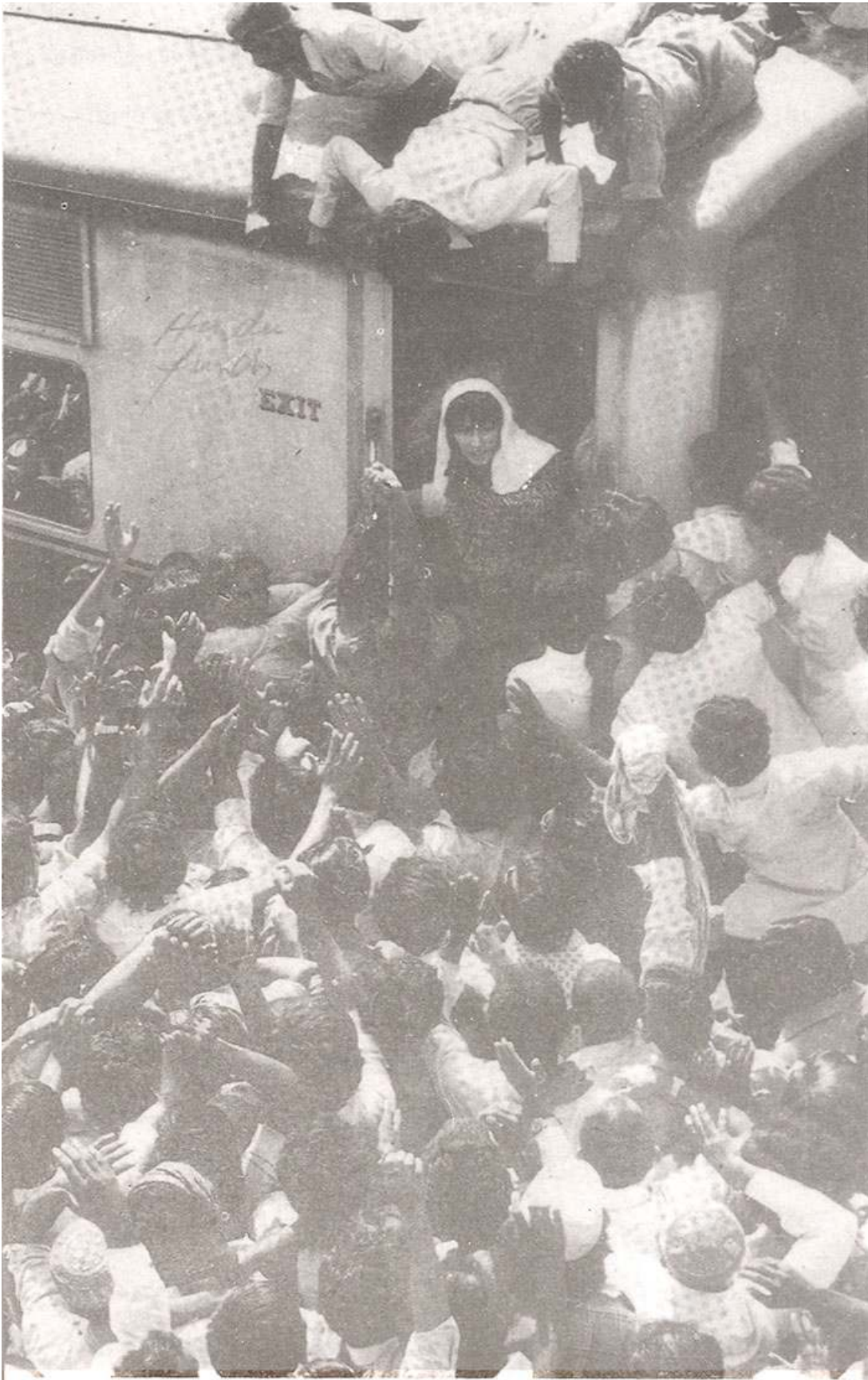
محترمہ بے نظیر بھٹو رابطہ عوام مہم کے دوران ٹرین پر سفر کرتے ہوئے

کی بابت ایک دو گانا گایا اس کے بعد مجھے کندھوں پر اٹھا کر ہال سے باہر لایا گیا۔

جن دنوں میں آکسفورڈ یونین کا صدارتی دفتر نیلے رنگ میں پینٹ کروا رہی تھی اور مباحثے کے پروگرام پاکستانی جھنڈے کے سبز اور سفید رنگوں کے کاغذوں پر، پاکستان میں پی این اے کے ایک راہنما اور پاک فضائیہ کے سابق کمانڈر انچیف اصغر خان اعلان کر رہے تھے کہ حزب مخالف کا اتحاد مارچ کے انتخابات کے نتائج قبول نہیں کرے گا۔ کیونکہ ان میں دھاندلی کی جائے گی۔ میں نے اس الزام کی طرف توجہ نہ دی یہ جانتے ہوئے کہ میرے والد تمام جمہوری ممالک میں نافذ انتخابی طریق کار پر ہی عمل کر رہے ہیں اور ایک آزاد الیکشن کمیشن کا تقرر بھی کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح الیکشن ٹریبونل اور اعلیٰ عدالتوں کے دائرہ اختیار میں انتخاباتی قوانین کا اجراء بھی ہو چکا ہے تاکہ انتخابات کے غیر جانبدارانہ اور منصفانہ تعین کا یقین دلایا جا سکے۔ یہ یقیناً عجیب قسم کی مہم تھی جس میں اصغر خان پی پی پی کی ناگزیر جیت کو قبول نہ کرنے کے لئے ملک کو تیار کر رہے تھے۔

انتخابی مہم اس وقت گھمبیر شکل اختیار کر گئی جب ۱۸ر جنوری ۱۹۷۷ء کو جو امیدواروں کی نامزدگی کی آخری تاریخ تھی قومی اتحاد نے میرے والد اور وزرائے اعلیٰ کے انتخابی حلقوں میں کسی امیدوار کو کھڑا نہ کیا۔ "کس قدر عجیب بات تھی" میں نے خیال کیا جب میں نے انگلستان میں اخبارات میں یہ خبر پڑھی۔

"وہ کیوں وزیراعظم اور چاروں وزرائے اعلیٰ کو بلا مقابلہ منتخب ہونے کے لئے چھوڑ رہے ہیں؟" شائد قومی اتحاد کے امیدوار یہ جانتے ہوئے کہ وہ میرے والد کو شکست نہیں دے سکتے، شرمندگی سے بچنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ خیال کچھ زیادہ ہی قابل فہم تھا ان کی دلیل نہ صرف بے ہودہ تھی بلکہ اخبارات کی شہ سرخی کی زینت بھی بنی۔

"ہمیں اغواء کر لیا گیا اور کاغذات نامزدگی پیش کرنے نہیں دیئے گئے"۔ حزب مخالف چلائی اور یہ بھی دعویٰ کیا ان کے تجویز کنندگان اور مویدین کو پولیس نے اس وقت تک روکے رکھا جب تک آخری تاریخ گزر نہیں گئی۔ انگلستان میں بیٹھے ہوئے ان کے تمام الزامات مجھے فضول لگ رہے تھے۔ میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ یقین نہ کر سکی کہ قومی اتحاد

کے اراکین کو اغواء کر لیا گیا اور نہ ہی چیف الیکشن کمشنر نے بغیر کسی ثبوت کے ان کی اس بات کو وزن دیا۔ اگر انہیں اغواء کیا گیا تو یہ ان کی اپنی سازش ہو گی لیکن یہ ان کی ہوشیاری کی چال تھی۔ پاکستان میں اغواء کے واقعات کے پیچھے ہر قسم کا سبب ہو سکتا ہے اور اسی لئے غالباً اکثر لوگ قومی اتحاد کے دعویٰ کو سچ سمجھتے تھے کہ ان کے ساتھ دھوکا کیا گیا۔

میں نے انتخابی مہم کی خبروں کا بغور مطالعہ شروع کر دیا جو انگریزی اخبارات اور پاکستانی اخبارات جنہیں میرے والدین میرے لئے بھیجتے تھے اور دوسرے ایشیائی جریدوں میں چھپتی تھیں۔ قومی اتحاد لحہ بہ لحہ زیادہ غیر ذمہ دار اور سرکش ہوتا چلا جارہا تھا۔ "بھٹو پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا" حزب مخالف نے نعرہ بازی شروع کر دی۔ "وہ ہر ایک کا گھر قومی تحویل میں لینا چاہتا ہے اور ہر عورت کے سونے کے زیورات ضبط کرنا چاہتا ہے" انہوں نے تضحیک کے انداز میں کہا کہ "بھٹو امیروں کا امیر ہے، وہ عوام کا آدمی نہیں، وہ سیول رو کا سوٹ اور اطالوی جوتے پہنتا ہے اور سکاچ وسکی پیتا ہے"۔

ایوب خاں کے وزراء نے بھی یہی الزام لگایا تھا۔ میرے والد کے جواب نے مجھے خوش کر دیا تھا کیونکہ وہ کھلی شخصیت تھے اور وہ جو کچھ گھر میں کرتے تھے کبھی باہر چھپایا نہیں تھا۔ "میں انکار نہیں کرتا کہ ۱۸ گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد میں کبھی کبھی تھوڑی سی شراب پیتا ہوں" "لیکن دوسرے سیاستدانوں کی طرح میں لوگوں کا خون نہیں پیتا۔" انہوں نے لاہور کے ایک عوامی جلسہ میں یہ جملے کہہ دیئے۔

انتخاب کے نتیجہ کے بارے میں مجھے کوئی شک نہیں تھا۔ قومی اتحاد کے راہنما نہ تو بڑے آدمی تھے نہ ہی نیک خو۔ زیادہ تر میرے والد سے عمر میں بڑے تھے اور اپنی زندگی نبھا چکے تھے۔ میرے والد جیسے تعلیم یافتہ بھی نہیں تھے حکومت اور بین الاقوامی سفارت کاری میں ان جیسا تجربہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ پاکستان میں میرے والد کی در حقیقت ایک ممتاز حیثیت تھی جرنیلوں کی حکومت میں، سیاست میں قوم کے چیدہ چیدہ امتیازی حیثیت رکھنے والے لوگ آگے نہ آسکے تھے۔ حقیقی طاقت دراصل سول سروس، فوج اور صنعتکاروں کے پاس تھی میرے والد کے مخالفین چھوٹے لوگ تھے صوبائی شہرت تک محدود جن کی تنگ نظری

نے ماضی میں بھی پاکستان کو ناکام کیا تھا اور مستقبل میں بھی ایسا ہی کرے گی۔ ان کی کذب بیانیاں خطرناک ہو گئی تھیں۔ "بھٹو ایسا برا مسلمان ہے" اصغر خان نے دعویٰ کیا "وہ اب سیکھ رہا ہے کہ پانچوں نمازوں کی ادائیگی کیسے ہوتی ہے" مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا جب میں نے فروری میں "فار ایسٹرن اکنومک ریویو" میں یہ الزام پڑھا۔ میں گھر میں اپنے والدین کے ساتھ اکثر نماز پڑھتی تھی لیکن میں نے اپنے والد کا جواب لطف لے کر پڑھا جب انہوں نے ایک رپورٹر کے سوال پر "پی ایل او کا راہنما یاسر عرفات انہیں ملنے کیوں آرہا ہے؟" یہ جواب دیا "وہ مجھے نمازیں پڑھنی سکھانے کے لئے آرہا ہے"۔ نظام مصطفیٰ کی نعرہ بازی میں، اتحاد کے رہنما سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے مذہب کو بے باکانہ استعمال کر رہے تھے۔ "ان کی پارٹی کے خلاف ووٹ" "اللہ کے خلاف ووٹ دینے کے مترادف ہے" جماعت اسلامی کے سربراہ نے ایک عوامی جلسہ میں یہ بات زور دے کر کہی، قومی اتحاد کے لئے ووٹ دینے کا ثواب ایک لاکھ برس کی نمازوں کے برابر ہے"۔ تاہم حزب مخالف کے باشعور رہنما جانتے تھے کہ مذہبی مسئلہ دھاکہ خیز بن سکتا ہے اور وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ مذہب کے نام پر کیچڑ اچھالنے کے باوجود وہ سمجھتے تھے کہ پی پی پی کی مذہب سے عقیدت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہ میرے والد ہی تھے جنہوں نے ملک کو ۱۹۷۳ء میں پہلا اسلامی آئین دیا اور جنہوں نے پاکستان میں پہلی وزارت مذہبی امور قائم کی۔ یہ ان کی انتظامیہ تھی جس نے پاکستان میں غلطی سے مبرا قرآن مجید کی اشاعت کا آغاز کیا تھا۔ پاکستانی حاجیوں کی مقررہ تعداد کے کوٹے کو ختم کیا جو سابقہ حکومتوں نے مکہ جانے والے حاجیوں کے سلسلہ میں عائد کیا ہوا تھا۔ اسلامیات یعنی مذہبی تعلیم کو پرائمری اور ہائی سکولوں میں لازمی مضمون کی صف میں شامل کیا۔ میرے والد نے پاکستانیوں کو قرآن حکیم کی زبان سکھانے کے لئے ٹیلی ویژن پر عربی پروگرام کا اجراء کیا اور ماہ رمضان اور ماہ شوال کے طلوع قمر پر الجھاؤ دور کرنے کے لئے رویت ہلال کمیٹی کو تشکیل دیا۔ میرے والد کے ماتحت حکومت نے اصرار جاری رکھا کہ پاکستان عیسائیت کی بجائے اسلامی تشخص اجاگر کرنے کے لئے ریڈ کراس کے نام کو ہلال احمر سے تبدیل کر دے۔

مجھے اس بات پر کوئی پریشانی محسوس نہیں ہوئی جب میں نے حزب مخالف کی مہم کے بنیاد پرست عناصر کے متعلق خبر پڑھی۔ میرا خیال تھا کہ لوگوں کی وسیع اکثریت جانتی ہے۔ کہ شریعت کی بنیاد پرستوں کی تشریح پر عمل پاکستانیوں کے لئے ان فوائد کا خاتمہ کر دے گا جو انہوں نے انسانی حقوق اور اقتصادی ترقی کے سلسلہ میں حاصل کئے ہیں۔ بنکوں کا طریق کار، یکسر منسوخ ہو جائے گا کیونکہ اسلام کی کڑی تشریح کے مطابق منافع کو سود قرار دیدیا جائے گا۔ اور خواتین کی ترقی کے لئے ہر قدم جو میرے والد نے آگے بڑھایا ہے پیچھے ہٹانا پڑے گا۔ انہوں نے محکمہ امور خارجہ، سول سروس اور پولیس میں داخلہ کے لئے عورتوں کے لئے راہ کھول دی تھی۔ تعلیم نسواں کو فروغ دینے کے لئے انہوں نے اسلام آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی آسامی کے لئے ایک خاتون کو نامزد کیا تھا۔ اور حکومت میں ایک خاتون کو گورنر سندھ اور ایک اور کو قومی اسمبلی میں ڈپٹی سپیکر بنوایا تھا۔ مواصلات میں بھی عورتوں کے لئے آسامیاں کھولی گئیں تھیں۔ خبریں نشر کرنے کے لئے خواتین نے پہلی دفعہ ٹیلی ویژن پر آنا شروع کر دیا تھا۔

انہوں نے میری والدہ کو بھی زیادہ بہتر کردار ادا کرنے پر اکسایا۔ ۱۹۷۵ء میں میری والدہ نے خواتین پر اقوام متحدہ کی بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ میکسیکو شہر میں پاکستانی وفد کی راہنمائی کی۔ مجھے بہت فخر محسوس ہوا جب انہیں کانفرنس کی نائب صدر چنا گیا۔ اب وہ قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لے رہی تھیں جو سیاست میں خواتین کے لئے میرے والد کے مثبت رویئے کی علامت تھی۔ لیکن جیسے ہی انتخابی دن قریب آیا۔ قومی اتحاد کے حملے پی پی پی کے خلاف وحشت ناک ہو گئے۔ اصغر خان دھمکیاں دے رہا تھا کہ وہ ۸ر مارچ کو حکومت پر قبضہ کر لینے کے بعد پی پی پی کے رہنماؤں کو نظر بندی کے کیمپوں میں دھکیل دے گا۔ اور اس نے میرے والد کو قتل کرنے کی لاف زنی بھی کی۔

"کیا میں بھٹو کو اٹک کے پل پر پھانسی لٹکاؤں یا لاہور کے کسی کھمبے پر؟" حزب مخالف کا رہنما بلند بانگ دعویٰ کر رہا تھا۔ اس خبر نے مجھے بھی ہلا دیا۔ افواہ پھیلائی گئی تھی کہ اصغر خان کے جونیئر فوجی افسران میں رشتہ دار ہیں۔ جنہوں نے ۱۹۷۴ء میں میرے والد کے خلاف

ناکام سازش کاارتکاب کیا تھا کیا وہ دوبارہ فوج میں فرقہ بندی پیدا کر رہا ہے؟

آکسفورڈ میں میں نے اپنے آپ کو بہت دوری پر محسوس کیا۔ میرے والد نے پاکستان میں جمہوریت کے فروغ کے لئے کوشش کی تھی لیکن اب پتہ چلا کہ تمام لوگ اس ذاتی نظم و ضبط کو سیکھ نہیں سکے جو جمہوریت کی ضرورت ہے۔ کراچی کے نواح میں قومی اتحاد کے ایک امیدوار نے ایسے اشتہارات تقسیم کئے جن میں میرے والد کو مشین گن سے فائر کرتے ہوئے قریب کھڑے ایک جوان بچے کو قتل کرتے ہوئے دکھایا۔

میری ایک سکول کی دوست نے فروری میں کراچی سے خط لکھا کہ "حزب مخالف نے اپنے کردار کا بدترین مظاہرہ کیا ہے یہاں تک کہ سیاسی طور پر میرے جیسی بے حس بند گو بھی ان کی باتوں کی طرف متوجہ ہو گئی ہے" "اب پورے پاکستان کو پہلے سے زیادہ یہ احساس ہوا ہے کہ ہمیں تمہارے والد کی اس وقت اشد ضرورت ہے خدانخواستہ اگر کسی اور نے زمام اقتدار سنبھال لی تو ہم بطور قوم کے تباہ ہو جائیں گے۔"

انتخابی شب کو میں کرائسٹ کالج کے بالمقابل میر کے کمروں میں اس کے ساتھ شامل ہو گئی تاکہ فون پر نتائج سن سکیں۔ لندن میں پاکستانی سفیر اور میرے والد کے ایک وزیر نے مجھے ٹیلی فون پر نتائج کے آتے ہی خبر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میر کی پیش گوئی تھی کہ پی پی پی قومی اسمبلی کی ۱۵۰ سے ۱۵۶ سیٹوں کے درمیان تعداد جیت جائے گی۔ جب فون کی گھنٹی بجی، تو وہ میرے والد تھے جن کی آواز انتخابی مہم کی وجہ سے بیٹھی ہوئی تھی انہوں نے خبر دی کہ پی پی پی نے ۲۰۰ سیٹوں میں سے ۱۵۴ سیٹیں جیت لی تھیں۔ "مبارک باد پاپا، میں آپ کے لئے بہت خوش ہوں" میں ٹیلی فون پر چلائی، پی پی پی کی فتح نے مجھے اس قدر جوشیلا بنا دیا کہ میں انتخابی تناؤ کو بھول گئی مگر یہ بھی میری بھول تھی۔

قومی اتحاد کی دھمکی کے مطابق، انہوں نے دعویٰ کیا کہ انتخابات میں دھاندلی ہوئی ہے اور اعلان کیا کہ وہ تین دن بعد منعقد ہونے والے صوبائی انتخابات کا بائیکاٹ کریں گے۔ حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن میں اضافہ ہو گیا۔ موٹر سائیکلوں پر سوار نوجوانوں کے جھنڈ کے جھنڈ کراچی کی سڑکوں پر یکایک دوڑتے ہوئے نظر آنے لگے اور اپنی راہ میں سینماؤں،

بنکوں اور شراب کی دکانوں کو چھوڑتے ہوئے ان گھروں کو آگ لگانا شروع کر دی جن پر پی پی پی کے جھنڈے لہرا رہے تھے ایک گھر میں ایک ہی خاندان کے تیرہ افراد کو اذیت دی گئی اور جب ان میں سے ایک نے پانی طلب کیا تو پانی دینے کی بجائے بدمعاشوں نے اس کے منہ میں پیشاب کر دیا۔ پیپلز پارٹی کے ایک رکن کو بری طرح مارا گیا اور سڑک کے ایک کھمبے پر لٹکا کر اسے پھانسی دی گئی یہاں تک کہ پولیس نے اسے رسی کاٹ کر اتارا۔ موت کی دھمکیاں پی پی پی کے لاتعداد وزراء اور ارکان پارلیمینٹ کو دی گئیں اور مدرسوں سے ان کے بچوں کے اغواء کی دھمکیاں بھی دی گئیں۔

کراچی کی فضاء ایک ڈراؤنا خواب بن رہی تھی۔ ہر صبح میں اپنی ڈاک کی صندوقچی سے پاکستانی اخبارات کا پلندہ حاصل کرنے سے قبل سینٹ کیتھرین کالج کے مشترکہ کمرے میں انگریزی اخبارات اچکنے کے لئے بھاگ کر جاتی۔ میر اور میں ان پر بے یقینی کے عالم میں پل پڑتے۔ ہم نے امریکہ اور انگلستان میں جمہوریت کو دیکھا تھا جہاں سیاسی مخالفین دہشت ناک حملوں اور غنڈہ ازم کے طریقے اختیار نہیں کرتے اور ہم دونوں کی رائے میں قومی اتحاد کا وطیرہ بدترین گھٹیا پن تھا۔ جس کے نتائج میں شبہات بڑھتے گئے۔ صاف ظاہر تھا کہ قومی اتحاد کو انتخابات میں کوئی دلچسپی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ شائد ان کی مسلسل سرکشی حکومت میں کسی کی مداخلت کا راستہ ہموار کر رہی تھی یعنی فوجی آمریت کا۔ فوج ہی اس معمہ کی چابی تھی۔ لیکن مسلح افواج کی وفاداری پر شبہ کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ میرے والد فوج میں اچھی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ چند سینئر افسروں پر ضیاء کا بطور چیف آف آرمی سٹاف انتخاب ضیاء کی حمایت کو اور بھی پختہ کرتا تھا۔ ہماری ثقافت کے مطابق کوئی شخص اپنے محسن سے غداری نہیں کرتا تاہم اصغر خان فوج کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ان کے نام ایک خط بھی جاری کیا جس میں مسلح افواج کو حکومت پر قبضہ کرنے کی دعوت کا اشارہ تھا۔ لیکن کسی پر بھی اس بات کا اثر نہیں ہوا۔ اس کی بجائے بحریہ، فضائیہ اور بری افواج کے تینوں چیف آف سٹاف نے میرے والد کی منتخب سول حکومت کے حق میں ایک بیان جاری کر دیا۔ قومی اتحاد کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

کراچی اور حیدر آباد میں تقریباً تین ہفتوں کی بے چینی کے بعد قومی اتحاد نے لاہور میں فساد اور لوٹ مار شروع کر دی یہاں پر بھی سکوٹروں پر سوار بیس سے تیس آدمیوں کے جھنڈ نے بازاروں میں دکانوں پر پتھر پھینکے تاکہ دکاندار خوف سے دکانیں بند کر دیں۔ بعض اوقات فسادیوں نے بینکوں اور بسوں پر پٹرول چھڑکا اور ان کو آگ لگا کر بھاگ گئے۔ آکسفورڈ میں اخبارات کے مطالعہ کے بعد میں اور میں قومی اتحاد کی ایجی ٹیشن کو برانگیختہ کرنے کی کوششوں سے بہت پریشان ہوئے۔ جمہوری طریقہ اپناتے ہوئے اپنی شکست قبول کرنے کی بجائے یہ پرانی طرز کے سیاستدان قانون کی بے حرمتی اور افواہیں پھیلانے پر مامور تھے۔ قومی اتحاد نے ایک یہ افواہ بھی اڑائی۔ "بیگم بھٹو اپنے سوٹ کیسوں کے ہمراہ بھاگ گئی ہے۔ بھٹو بھی عنقریب بھاگ جائے گا"۔

میرے والد کو پی پی پی کی طاقت، پر اس قدر یقین تھا کہ انہوں نے نئے صوبائی انتخابات کے انعقاد کی پیش کش کر دی اور اگر قومی اتحاد کو اکثریت حاصل ہو گئی تو جنرل الیکشن بھی دوبارہ منعقد کئے جائیں گے۔ مگر قومی اتحاد کے راہنماؤں نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ وہ بھٹو صاحب کے ساتھ بات کرنا تو درکنار، ان کے ساتھ بیٹھنے کو بھی تیار نہیں تھے۔ ان کی تشفی صرف اس وقت ہوتی جب وہ مستعفی ہو جاتے۔ منصفانہ اور جمہوری انتخابات میں اتنی بڑی اکثریت حاصل کرنے کے بعد یقیناً کوئی ایسا جواز نہیں تھا کہ وہ مستعفی ہوں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ قومی اتحاد کے دہشت گردی کے طریقے آکسفورڈ میں مجھ تک بھی پہنچ گئے۔ مارچ کے اواخر میں ایک سہ پہر کو میں بھونچکا ہو کر رہ گئی جب باڈلیئن لائبریری سے واپسی پر سکاٹ لینڈ یارڈ کا ایک ملازم میں نے اپنا منتظر کھڑا پایا۔ "مس بھٹو، میرا مقصد تمہیں گھبراہٹ میں ڈالنا نہیں لیکن ہمیں کچھ ایسی رپورٹیں ملی ہیں جن سے تمہاری جان کو خطرہ محسوس ہوتا ہے" برطانوی افسر نے مجھے بتایا۔ میرے خیال کے مطابق سکاٹ لینڈ یارڈ سے آکسفورڈ تک کی طویل مسافت طے کرنے کی کسی افسر کو کوئی ضرورت پیش نہ آتی اگر واقعی اس کے پیچھے کوئی ایسی تشویشناک بات نہ ہوتی چنانچہ اس دن کے بعد آکسفورڈ کو ماہ جون میں الوداع کہنے تک میں نے اس کی ہدایات پر پوری احتیاط سے

عمل کیا۔ کار کے نیچے کسی دھماکہ خیز مواد کو چیک کرنے کے بعد دروازہ کھولنا، تالا کھولنے سے پہلے پوری طرح معائنہ کرنا کہ کہیں اس کو کسی نے خراب نہ کر دیا ہو میں نے سکاٹ لینڈ یارڈ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے یہ بھی کیا کہ اپنے روز مرہ کے پروگرام کو تبدیل کر دیا اور پہلے سے طے شدہ اپنے دیگر پروگراموں میں بھی ردوبدل شروع کر دیا۔ اگر میری کلاس ۱۰ بجے شروع ہوتی تو میں کبھی جلدی ہی ساڑھے نو بجے روانہ ہو جاتی اور کبھی دیر سے ۵۵ - ۹ بجے روانہ ہوتی۔ میں اب بھی ان حفاظتی تدابیری پر عمل کرتی ہوں جو سکاٹ لینڈ یارڈ نے مجھے سکھائی تھیں۔

پاکستان میں، قومی اتحاد کی تحریک اپریل کے شروع میں ختم ہوتی دکھائی دے رہی تھی اور یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ شورش جلد ختم ہو جائے گی کیونکہ اب گھر سے بدلتی ہوئی خوش آئند خبریں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ تاہم اچانک لوگوں کو امریکی ڈالروں کی تھیلیاں ملنے لگیں اور وہ اپنی ملازمتوں کو تیاگ رہے تھے۔ میری دوست سمیعہ نے مجھے لکھا کہ میری کزن فخری کے ملازم اور ان کے دوست بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ "ہم قومی اتحاد کے مظاہروں میں شریک ہو کر زیادہ تنخواہ حاصل کرتے ہیں" ملازمین کا دعویٰ تھا............ اس نے مزید لکھا کہ مارچ سے اب تک امریکی سکّوں کے سیلاب کی وجہ سے ڈالر کی قیمت بلیک مارکیٹ میں بھی ۳۰ فیصد تک گر گئی تھی۔ بغیر کسی ظاہری مالی نقصان کے، نجی ٹرک اور بس ڈرائیوروں نے کراچی میں ہڑتال کر دی تھی۔ اسی طرح کارخانوں کو پیداوار کم کرنے پر مجبور کر دیا گیا کیونکہ کارکن وقت پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ وہی ٹرک اور بسیں قومی اتحاد کے مظاہروں میں لوگوں کی سواری کے لئے فوری طور پر دستیاب ہو جاتی تھیں۔

ایشیائی سازشوں کے ہمیشہ ماہر رہے ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں میرے والد اور پی پی پی کے دیگر اراکین کا حتمی یقین تھا کہ اس تمام بے چینی میں امریکی ملوث ہیں۔ میں بھی اسی نتیجہ پر پہنچی تھی کیونکہ پاکستان میں بھی اقتصادی کساد بازاری کا وہی طریقہ اختیار کیا گیا تھا جو چلی میں صدر آلنڈے اور اس کی جمہوری منتخب حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے سی آئی اے نے فوجی تعاون سے اختیار کیا تھا۔ ہماری خفیہ ایجنسی نے قومی اتحاد کے اراکین اور امریکی سفارت

کاروں میں ملاقاتوں کی مبینہ خبریں ارسال کی تھیں۔ قومی اتحاد کی آغاز کردہ ہڑتالوں کے نتائج مشکوک اثرات کے حامل تھے۔ جب میرے والد نے اقتدار حاصل کیا ان پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ ۱۹۷۵ء میں امریکنوں نے پاکستانی فوجیوں کے ساتھ اعلیٰ ترین سطح پر خفیہ ملاقاتیں کی تھیں تاکہ کسی حکومت کو ہڑتال کے ذریعے ناکارہ بنانے کے طریقے سکھائے جا سکیں۔ ان خفیہ ملاقاتوں کی مشقوں کا نام پہیہ جام اپریشن رکھا گیا۔

مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ پاکستان کی جمہوری منتخب حکومت کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے عملی طور پر تگ و دو کر رہا ہے۔ لیکن مجھے ہنری کسنجر کا ایک جملہ جو اس نے ۱۹۷۶ء کے موسم گرما میں پاکستان کے دورے کے دوران میرے والد سے کہا تھا، رہ رہ کر یاد آرہا تھا۔ اس وقت مسئلہ یہ تھا کہ میرے والد کا پختہ عزم تھا کہ فرانس سے نیو کلیائی افزدوگی کے پلانٹ کو حاصل کرنے کیلئے گفت وشنید جاری رکھی جائے تاکہ اس پلانٹ کے ذریعے پاکستان توانائی میں کفالت حاصل کر سکے۔ جب کہ تیل کی فلک بوس قیمتیں اقتصادیات کو بری طرح تباہ کر رہی تھیں۔ نہ صرف ہماری اقتصادیات بلکہ خوشحال مغرب کی بھی۔ ڈاکٹر کسنجر دوسری طرف پوری طرح مصر تھا کہ میرے والد یہ گفت وشنید مکمل طور پر بند کر دیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت واضح طور پر اس پلانٹ میں ایٹم بم پیدا کرنے کی صلاحیت دیکھ رہی تھی اور یہ اسلامی بم جیساکہ مشہور کر دیا گیا آزاد دنیا کے بہترین مفاد میں یقیناً نہیں تھا۔ ملاقات صحیح پٹڑی پر نہ چل سکی اور میرے والد جب گھر واپس پہنچے تو غصے سے لال پیلے تھے۔ ہنری کسنجر بد تمیزی اور تکبر سے پیش آیا، انہوں نے مجھے بتایا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے وزیر خارجہ نے صاف طور پر بتایا کہ نیوکلیائی افزدوگی کے پلانٹ کا فرانس سے معاہدہ امریکہ کے لئے ناقابل قبول ہے۔ معاہدہ کو یا تو منسوخ کر دیا جائے یا اس قدر تاخیر سے عمل در آمد کیا جائے کہ اس وقت نئی ٹیکنالوجی کی ایجادات سے نیوکلیائی پلانٹ سے نقصانات کے امکان بالکل ختم ہو جائیں۔ دوران ملاقات ہنری کسنجر نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ وہ میرے والد کو ایک ذہین اور ممتاز سیاستدان تصور کرتا ہے۔ چونکہ وہ ان کا خیر خواہ ہے اس لئے متنبہ کر رہا ہے۔ "فرانس سے معاہدہ پر نظرثانی کرو

ورنہ ایک خوفناک مثال بنا دیئے جانے کا خطرہ مول لو"۔

میں متذکرہ بالا گفتگو کو اپنے ذہن سے محونہ کر سکی اگرچہ اب جمی کارٹر تین ماہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا صدر تھا اور ہنری کسنجر کی بجائے سائرس وانس وزیر خارجہ تھا۔ لیکن امریکی انتظامیہ میں تبدیلیوں کا مطلب امریکی مراکز طاقت میں تبدیلی نہیں تھا۔ اپنے سات سالہ حکومتی مطالعات میں اس نتیجہ پر پہنچی تھی کہ سی آئی اے خود مختار ادارہ تھا اور اس کی پالیسیاں ایک دن میں وضع نہیں ہوتی تھیں۔ کیا یہ ان کی پالیسی تھی کہ اگر میرے والد کو نیوکلیائی پلانٹ کے معاہدہ سے دستبرداری پر مجبور نہ کر سکے تو ان سے نجات حاصل کرنے کی پالیسی پر عمل کریں؟ کیا میرے والد غیر شعوری طور پر ان کے دام میں نہیں پھنس گئے تھے جب مقررہ شیڈول سے ایک برس پہلے انہوں نے انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا تھا؟۔

میں اپنے والد پر سی آئی اے کی خفیہ رپورٹوں کی فائل تصور میں دیکھ رہی تھی۔ یہ وہ آدمی ہے جس نے ویت نام کی جنگ میں امریکی پالیسی کی مخالفت کی تھی جس نے کمیونسٹ چین سے تعلقات میں بہتری پیدا کی تھی۔ جس نے ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی حمایت کی تھی اور جس نے تیسری دنیا کے ممالک کی کانفرنسوں میں سپر پاورز (اعلیٰ ترین قوتوں) سے آزادی کا نعرہ لگایا تھا۔ کیا وہ اپنی حیثیت سے زیادہ اونچی پرواز کرنے لگے تھے؟۔

خفیہ اداروں کی ایک اور رپورٹ آئی یہ اسلام آباد میں دو امریکی سفارت کاروں کی ٹیپ شدہ گفتگو تھی۔ "پارٹی ختم ہو چکی ہے وہ اب جا چکا ہے" ایک نے میرے والد کی حکومت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "حضرات، پارٹی ابھی ختم نہیں ہوئی" میرے والد نے قومی اسمبلی میں اس گفتگو کا جواب دیا۔ "اور یہ اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک میں اس عظیم قوم کے لئے متعینہ مقاصد کی تکمیل نہیں کر لیتا" دریں اثناء گلیوں میں امداد یافتہ بنیاد پرستوں کی ساکھ مزید گر چکی تھی۔

"بھٹو ہندو ہے، بھٹو یہودی ہے" وہ نعرہ زن تھے حالانکہ یہ دونوں مذاہب ایک دوسرے کی ضد تھے اور میرے والد پکے مسلمان تھے۔

"میں نہیں کہہ سکتی کہ موجودہ حالت کے بارے میں کیا لکھوں" میری والدہ نے خط میں تحریر کیا "میں بھی اتنا ہی جانتی ہوں جتنا اخبارات میں چھپتا ہے اور یہ اخبارات تم تک بھی پہنچ ہی جاتے ہیں" "مارننگ نیوز ایک صحیح غیر جانبدار اخبار ہے اور سنسنی خیزی میں یقین نہیں کرتا۔ اس لئے تمہیں بھی اتنا ہی علم ہے جتنا ہمیں"۔

"میں نے صنم (میری ہمشیرہ ۱۹۷۵ء میں ریڈ کلف میں داخل ہوئی تھی) اور میر کو لکھا ہے کہ اس موسم گرما میں کسی دوست کو مدعو نہ کریں۔ مجھے علم نہیں کہ انہیں میرے خطوط پہنچے یا نہیں کیونکہ بہت سے گم ہو جاتے ہیں۔ اگر تمہیں یہ خط مل جائے تو انہیں بھی مطلع کر دو"۔

قومی اتحاد کے راہنماؤں نے میرے والد کی ایک پر امن حل کیلئے بات چیت کی پیش کش کو متواتر مسترد کیا۔ پی پی پی کے معاونین کے قتل، گھروں میں آتش زنی اور لوٹ مار نے میرے والد کو مجبور کر دیا کہ وہ قومی اتحاد کے راہنماؤں کو نظر بند کر دیں۔ شائد ان کی عارضی نظر بندی عوام کو تشدد پر اکسانے میں مزاحم ہوگی اور ملک میں سکون حاصل ہو گا۔ لیکن ۲۰ر اپریل کو آئین کے مطابق کراچی، لاہور اور حیدر آباد ایسے بڑے شہروں میں سول حکومت کی امداد میں قانون بحال کرنے کے لئے فوج کو دعوت دی گئی۔ احتجاجات میں کمی آگئی، ۲۲ر اپریل کو بلائی گئی قومی سطح پر ہڑتال اور مظاہرہ ظہور پذیر نہ ہوا۔ اسی طرح لانگ مارچ کی دعوت جو قومی اتحاد کی طرف سے دی گئی ناکام ہو گئی اس لانگ مارچ میں بیس لاکھ لوگوں کے اجتماع نے وزیر اعظم ہاؤس کا محاصرہ کرنا تھا۔ لانگ مارچ کی ناکامی نے قومی اتحاد کے ایجی ٹیشن کے غبارے کو پنکچر کر دیا اور ہمیشہ کے لئے اس کی ہوا نکال دی۔ میرے والد راولپنڈی کی سڑکوں پر جہاں بھی گئے پر مسرت ہجوم نے ان کا استقبال کیا۔ لیکن قومی اتحاد کے ایجی ٹیشن نے ملک کا معتدبہ نقصان کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں نئی کاریں اور بسیں بھسم کر دی گئی تھیں۔ کراچی میں کارخانوں کی بندش سے کروڑوں روپے کا نقصان ہوا۔ لاکھوں روپے کی جائیدادیں تباہ کر دی گئیں۔ ہزاروں زندگیاں ختم ہو گئیں میں نے ۳ر جون کے اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر سکون کا سانس لیا کہ قومی اتحاد میرے والد کے ساتھ

گفت و شنید پر آخر کار آمادہ ہو گیا تھا جب کہ میرے والد بھی نئے انتخابات کا ڈول ڈالنے کے لئے حکومت کی تحلیل کے لئے تیار نظر آ رہے تھے۔

پاکستان میں عقل اور دلیل کی فضاء واپس آ گئی تھی۔ گفت و شنید کے چوتھے دن میرے والد نے فوج کا کنٹرول واپس لے لیا اور ایک ہفتہ بعد قومی اتحاد کے نظر بند رہنما اور اس ہلچل میں مقید دوسرے افراد کو رہا کر دیا گیا۔ میرے والد کے اعلان کے بعد کہ اکتوبر میں نئے انتخابات منعقد کئے جائیں گے۔ قومی اتحاد کے ضدی ترین راہنماؤں نے بھی مستقبل کی پر امیدی کا اظہار کیا۔ "سرنگ کے دوسرے سرے پر مجھے روشنی کی کرن دکھائی دے رہی ہے میری دعا ہے کہ یہ سراب ثابت نہ ہو" نیوز ویک کے ۱۳ر جون کے شمارے میں مخالفین میں سے ایک راہنما کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا گیا جس نے میرے والد سے ملاقات کی تھی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے تعلقات میں بھی بہتری آنے لگی تھی۔ پاکستانی وزارت خارجہ کے سیکرٹری مسٹر عزیز احمد امریکی وزیر خارجہ سائرس وانس سے پیرس میں ملاقات کے لئے روانہ ہوئے۔ حکومت کی بیدخلی میں امریکی حکومت کے ملوث ہونے کے شبہ میں دلائل پر مبنی ۵۵ صفحات کی وزارت خارجہ کی رپورٹ بھی وہ اپنے ساتھ لیتے گئے۔ میرے والد نے مجھے بتایا کہ اس پورٹ کو وزیر خارجہ وانس نے ایک طرف رکھ دیا۔ "نہیں، مسٹر عزیز احمد، ہم اب پاکستان سے نئے سرے سے تعلقات استوار کرنا چاہتے ہیں"۔ امریکی وزیر خارجہ گویا ہوئے "ہم اپنی طویل اور قریبی رفاقت کی قدر کرتے ہیں جو ہمارے ملک کی تمہارے ملک سے قائم رہی ہے"۔

کیا امریکیوں نے میرے والد کی حکومت کے خلاف افراتفری پھیلانے میں کوئی کردار ادا کیا ہے؟۔ ہمیں اس کا واضح ثبوت کبھی نہیں مل سکے گا۔ میں نے اپنے امریکی دوستوں کے ذریعہ اس بات کا پتہ چلانے کی کوشش بھی کی کیونکہ امریکہ کا "خبر کی آزادی کا ایکٹ" اس بارے میں معاون ثابت ہو سکتا تھا مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ سی آئی اے نے چھ دستاویزات واپس بھیجیں جن میں سے ایک میں ۱۹۶۵ء کی پاک ہند جنگ میں جب میرے والد ملک کے وزیر خارجہ تھے۔ پاکستان کی چینی امداد کا تذکرہ تھا اور ایک تار میں اسی عرصہ

کے دوران راولپنڈی میں سے ہوتی ہوئی سویلین قافلوں کی سامان حرب لیجاتے ہوئے نقل و حرکت کا ذکر تھا۔ صرف ایک دستاویز میں میرے والد اور پی پی پی کا ذکر تھا اور وہ بھی صرف اس مزاحمت کا جو ۱۹۷۳ء کے مجوزہ آئین کی تیاری کے وقت پیش آئی۔ "ذوالفقار علی بھٹو سے متعلقہ ریکارڈ حاصل کرنے کے لئے تمہاری عرضداشت کے جواب میں ہم سی آئی اے کے کسی ریکارڈ کی موجودگی یا عدم موجودگی کا نہ تو انکار کر سکتے ہیں، نہ ہی تصدیق کر سکتے ہیں" تمہیدی چھٹی میں لکھا تھا "ایسی خبر یا اطلاع جب تک اس کا سرکاری طور پر اعتراف نہ کیا گیا ہو قومی حفاظت کے اصول کے تحت مخفی درجہ بندی میں شمار ہوتی ہے اس وجہ سے ہم ایسے ریکارڈ کی موجودگی یا عدم موجودگی کی نہ ہی تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ ہی انکار۔ اسی لئے ذوالفقار علی بھٹو سے متعلقہ دستاویزات کے حصول کے لئے تمہاری عرضداشت کے مطابق تعمیل سے قاصر ہیں۔"

۱۹۷۷ء میں پاکستان میں جو واقعات بھی رونما ہوئے، اس وجہ سے ہوئے کہ کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو ان واقعات کے انعقاد کے ذمہ دار تھے۔ اگر قومی اتحاد کے راہنماؤں نے اپنے مفاد کے بجائے پاکستان کے قومی مفاد کو پیش نظر رکھا ہوتا، اگر میرے والد کے چیف آف سٹاف نے اپنے ذاتی مفاد کے بجائے قومی مفاد کو ترجیح دی ہوتی، حکومت کا تختہ نہ الٹا ہوتا۔ یہ ہم سب کے لئے سیکھنے کا ایک اہم سبق تھا اور ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اپنے قومی مفاد میں عمل کیا مگر ہم نے اپنے قومی مفاد کا ذرہ بھر خیال نہیں کیا۔ بعض لوگ ۱۹۷۷ء کے واقعات کا سارا الزام امریکہ پر دھر دیتے ہیں۔ اگر ہم میں کچھ لوگ ایسے نہ ہوتے جنہوں نے امریکی سازش میں ان سے تعاون کیا تھا اور جنہوں نے ملک کی خدمت کے برعکس اپنے اقتدار کے مواقع کو سامنے رکھا تھا تو پاکستان کی منتخب حکومت کو نقصان نہ پہنچتا۔ لیکن آکسفورڈ کی ایک طالبہ کے طور پر یہ بات ابھی میری سمجھ سے باہر تھی۔

سورج اپنی بھرپور تمازت سے چمک رہا تھا جب میں اپنے چوبیسویں یوم پیدائش کی صبح جاگی۔ ۲۱ر جون کا موسم گرما کا دن اپنی پوری حدت کے ساتھ طلوع ہوا اور پاکستان واپسی سے پہلے ملکہ ایلزبتھ ہاؤس کے باغات میں میں اپنی طرف سے دی جانے والی ایک بڑی

الوداعی اور اپنی سالگرہ کی دعوت کی منتظر تھی۔ آکسفورڈ میں اپنے خطاب کی کتاب میں مندرج تمام اصحاب کو دعوت دی گئی تھی اور جو لوگ اس پارٹی میں شریک ہوئے ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہر مدعو کنندہ تشریف لے آیا تھا۔ سٹرابری اور کریم کے پیالوں پر طبع آزمائی کرتے ہوئے ہم نے ماضی کی یادوں کو دہرایا اور ایک دوسرے کے گھروں کے پتوں کا تبادلہ کیا۔

میں آکسفورڈ اور اپنے متعدد دوستوں سے الوداع پر رنجیدہ تھی۔ میں اپنی چھوٹی پیلی کار کو چھوڑنے پر غمگین تھی جسے میں موسم خزاں میں فروخت کرنے پر آمادہ تھا۔ چار سال تک میرے کمرے کے باہر کا ڈاک بکس دوستوں کے پیغامات کے لئے بلٹین بورڈ بنا رہا۔ اور اسی طرح جو شیلے ٹریفک وارڈنوں کے لئے پارکنگ ٹکٹوں کا آشیانہ بھی، لیکن میں پاکستان میں نئے منتظر امکانات کے سلسلہ میں بھی بہت پر جوش تھی۔ میرے والد نے عبوری طور پر کچھ ایسی تجاویز کا ذکر کیا تھا جن میں موسم گرما کے دوران وزیراعظم آفس میں کام کرنا اور بین الصوبائی مشترکہ مفادات کی کونسل میں حصہ لینا شامل تھے تاکہ میں مشترکہ صوبائی ضروریات سے واقف ہو سکوں۔ ماہ ستمبر میں انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے اقوام متحدہ کے لئے پاکستانی وفد کے رکن کے طور پر بھیج رہے ہیں تاکہ بین الاقوامی سیاسیات کا سامنا کرنے کے قابل ہوسکوں۔ میں نومبر میں پاکستان واپس لوٹوں گی تاکہ دسمبر میں وزارت خارجہ کے منعقد ہونے والے امتحانات کے لئے مطالعہ کر سکوں۔ یہ میرا مستقبل تھا جو میرے سامنے صاف شفاف پڑا تھا۔

میرے والد بھی میری آمد کے اتنا ہی منتظر تھے جتنا میں گھر واپس جانے کے لئے بیتاب تھی۔ "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں پاکستان میں تمہاری ذہنی ہم آہنگی کے لئے اپنی بھرپور کوشش کروں گا تاکہ تمہارا مستقبل جلد ہی خوشگوار ہو جائے۔ اس کے بعد تمہیں اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہونا ہے۔ البتہ میرے مزاج کے طنزیہ تیروں کو تمہیں برداشت کرنا ہوگا۔ بدقسمتی سے میں اب اس عمر میں اپنے مزاج کو تبدیل نہیں کر سکتا اگرچہ میں اپنی پہلوٹی بیٹی کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ تم بھی زودرنج مزاج رکھتی

ہو اور تمہاری آنکھوں سے فوراً ہی ٹپ ٹپ آنسو گرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جیسے میری اپنی آنکھوں سے بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں ایک ہی گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں۔

"آؤ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کا معاہدہ کرلیں تم ایک متحرک طبیعت کی مالک ہو۔ ایک متحرک انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ صحرا کو حدت کے بغیر اور پہاڑوں کو برف کے بغیر دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم اپنی دھوپ کی چمک اور اپنی قوس قزح، اپنی باطنی اقدار اور اخلاقیات میں تلاش کرو گی۔ اور یہیں تمہیں، کاملیت کا حصول ممکن ہو گا۔ ہم دونوں قابل تعریف کامیابیوں کے لئے مشترکہ طور پر جدوجہد کریں گے۔ کیا تم شرط لگاتی ہو کہ ہم اس میں سرخرو ہو جائیں گے"۔

۲۵ر جون ۱۹۷۷ء کو میر اور میں اپنے والدین اور دیگر اہل خاندان کے پاس راولپنڈی میں بذریعہ طیارہ پہنچ گئے۔ شاہ نواز سوئٹزرلینڈ میں اپنے سکول سے واپس آیا اور صنم ہارورڈ سے۔ یہ آخری مرتبہ تھا کہ ہمارا سارا خاندان ایک جگہ اکٹھا ہوا۔

باب ۵

المرتضیٰ سے تاثرات
ضیاء الحق کی مہیب غداری

المرتضیٰ کی کھڑکیوں میں سے میں نے ماہ فروری کے سورج کو اپنے گرفتار کرنے والوں کی بندوقوں پر چمکتے ہوئے دیکھا۔ جب ہماری نظر بندی چوتھے مہینے میں داخل ہوتی ہے تو مجھے احساس ہوتا ہے جیسے ہمارے گھر ہی کو نظر بند کر دیا گیا ہو۔ مختلف مملکتوں کے سربراہ اور بین الاقوامی سیاستدان یہاں میرے والد سے ملاقات کے لئے آیا کرتے تھے مثلاً پڑوسی ملک کے شاہ ایران، متحدہ عرب امارات کے صدر شیخ زید، پرنس کریم آغا خان، ریاستہائے متحدہ امریکہ کے سینٹر جارج میک گورن، برطانوی کابینہ کے وزیر ڈنکن سینڈیز۔ میرے والد اپنے مہمانوں کے لئے شکاری پارٹیوں کا بندوبست کرتے تھے اگرچہ وہ شکار کو بذات خود اتنا پسند نہیں کرتے تھے۔ میرے بھائی تاہم پکے نشانہ باز تھے مگر کبھی کبھی مہمانوں کی انا کو مہمیز دینے کے لئے ہوشیاری سے ان کی طرف سے ہرن یا پرندوں کا شکار کر دیتے تھے۔

عام دنوں میں بھی المرتضیٰ میں ہنسی خوشی اور مذاق کی آوازیں آتی رہتی تھیں اکثر میرے والد دفعتاً گانا شروع کر دیتے تھے، سندھی لوک گیتوں کو دیہاتی انداز میں گاتے ہوئے یا مغرب کی دل پسند دھنوں کو آزماتے ہوئے، جنوبی بحر الکاہل کے موسیقاروں کی دھنیں جو انہوں نے نیویارک میں سنی تھیں، فرینک سناترا کا مشہور گانا جو کراچی میں مقبول تھا اور ان

کی میری والدہ سے محبت کا غماز اور ان کا مخصوص گانا ''کیو، سراسرا'' میں اب بھی ان کو گاتے ہوئے سن سکتی ہوں۔ ''جو ہونا ہے ہو گا، مستقبل، مستقبل کو کون جانتا ہے؟'' کسے اس تاریک مستقبل کا پتہ تھا؟ جو ۵ر جولائی ۱۹۷۷ء کی صبح سویرے ان پر فوری طور پر نازل ہو گیا اور فوجی سازشیوں نے ان کا تختہ الٹ کر ہمارے لئے ذاتی المیے کا آغاز کر دیا اور پورے پاکستان کے لئے دائمی پریشانی کا۔

۵ر جولائی ۱۹۷۷ء صبح ۴۵ - ۱ بجے وزیر اعظم کی رہائش گاہ، راولپنڈی

''اٹھو جاگو فوراً کپڑے پہنو'' میری والدہ نے تیزی میں پکارا اور میری ہمشیرہ کو جگانے کے لئے میرے کمرے سے ہوتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''فوج نے قبضہ کر لیا ہے، فوج نے قبضہ کر لیا ہے''

چند منٹ بعد میں گھبراہٹ میں اپنے والدین کے سونے کے کمرے میں پہنچ گئی۔ مطلقاً یہ نہ جانتے ہوئے کہ کیا ہو رہا ہے؟ ایک فوری انقلاب! یہ انقلاب کیسے برپا ہو سکتا ہے؟ صرف ایک روز پہلے ہی پاکستان پیپلز پارٹی اور حزب مخالف کے رہنماؤں میں متعلقہ انتخابات پر تصفیہ ہوا ہے۔ اگر فوج نے قبضہ کر لیا ہے تو کون سے فوجی افسران اس میں ملوث ہیں؟ فقط دو روز پہلے جنرل ضیاء اور اس کے کور کمانڈر فوج کی وفاداری کا یقین دلانے کے لئے میرے والد کے پاس آئے تھے۔ میرے والد فون پر فوج کے چیف آف سٹاف جنرل ضیاء اور وفاقی وزراء سے رابطہ کر رہے ہیں۔ پہلی آواز جو موصول ہوئی وہ وزیر تعلیم کے گھر سے تھی۔ ''فوجی جوان یہاں پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے میرے والد کو پیٹا ہے اور پکڑ کر لے گئے ہیں'' سسکیاں بھرتے ہوئے حفیظ پیرزادہ کی بیٹی نے کہا۔ وہ چند گھنٹے قبل میرے والد کے پاس تھے اور حزب مخالف سے معاہدہ پر خوشی کا اظہار کر کے گئے تھے۔ جب میں اندورن خانہ اپنی ہمشیرہ سے ہنسی مذاق میں مشغول تھی تو میں نے ان کے سگاروں کے شعلے اور لان میں ان کی ہنسی کی آوازیں سنی تھیں۔ ''سکون سے رہو'' پاپا نے حفیظ پیرزادہ کی بیٹی کو پر اعتماد لہجے

ملائشیا کے دارالحکومت کوالالمپور میں وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو پریس کانفرنس سے خطاب کر رہی ہیں۔ ان کے صاحبزادے بلاول ہمراہ ہیں

میں تلقین کی۔ "اپنے خاندان کے وقار کا خیال رکھو" ـــــــ اگلی کال پر گورنر سرحد سے بات ابھی پوری نہیں کی تھی کہ ٹیلیفون کٹ گیا۔

میری والدہ کا چہرہ زرد ہو گیا میری والدہ نے آہستہ آواز میں مجھے بتایا کہ تمہارے پاپا کو سازش کا علم ایک پولیس کے سپاہی سے ہوا، اس نے فوجی سپاہیوں کو وزیراعظم کی رہائش گاہ کو گھیرے میں لیتے ہوئے دیکھا تھا اپنی زندگی خطرے میں ڈالتے ہوئے وہ جوانوں سے نظر بچاتے ہوئے پیٹ کے بل بڑے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ "بھٹو صاحب کو بتا دو کہ فوج انہیں قتل کرنے کے لئے آ رہی ہے" اس نے زور دے کر عرس سے (جو میرے والد کا خادم تھا کہا) "انہیں فوراً چھپ جانا چاہئے چھپ جانا چاہئے۔" میرے والد نے یہ پیغام سکون سے سنا "میری زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے" انہوں نے عرس کو جواب دیا۔ "اگر فوج نے مجھے قتل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے تو وہ مجھے ضرور قتل کر دیں گے۔ چھپنے کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی تم میں سے کسی کے مزاحمت کرنے کا...... انہیں آنے دو" پولیس کے سپاہی کی بروقت تنبیہ نے شاید ہم سب کی زندگیاں بچالیں۔

"وزیراعظم چیف آف آرمی سٹاف سے بات کرنا چاہتا ہے" میرے والد نے صنم کے ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے کہا خوش قسمتی سے صنم کی لائن پرائیویٹ تھی جس پر وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے گفتگو کرتی تھی معجزانہ طور پر یہ لائن کاٹنے کا کسی کو خیال نہیں آیا۔

"جناب مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہ کام کرنا پڑا" ضیاء وزیراعظم اور حزب مخالف کے درمیان طے پا جانے والے معاہدہ کا کوئی حوالہ دیئے بغیر بول اٹھا۔ "ہمیں کچھ دیر کے لئے آپ کو حفاظتی نگہبانی میں لینا ہے میں ۹۰ دنوں میں نئے انتخابات کروا دوں گا۔

آپ یقیناً دوبارہ وزیراعظم منتخب ہو جائیں گے اور میں جناب آپ کو سلامی دے رہا ہوں گا۔"

اب میرے والد کو پتہ چلا کہ اس بغاوت کی سربراہی کون کر رہا ہے، انہوں نے تشویش

کے انداز میں آنکھیں سکیڑ لیں جب ضیاء نے انہیں بتایا کہ جہاں وہ چاہیں وہاں انہیں لے جایا جائے گا، مری میں وزیراعظم کے ریسٹ ہاؤس میں، لاڑکانہ میں ان کے آبائی گھر میں جہاں بھی وہ چاہیں، البتہ ان کے اہل خانہ راولپنڈی کے وزیراعظم ہاؤس میں مزید ایک ماہ قیام کر سکتے ہیں۔ آرمی کے جوان ان کے پاس ۳۰ - ۲ بجے صبح پہنچ جائیں گے۔

"میں لاڑکانہ جاؤں گا اور میرا کنبہ کراچی جائے گا" میرے والد نے کہا یہ وزیراعظم کی سرکاری رہائش گاہ ہے چونکہ اس وقت میں وزیراعظم نہیں ہوں۔ اس لئے میرے اہل خانہ شام تک یہاں سے چلے جائیں گے۔"

ٹیلیفون ختم کرتے ہیں تو میرے والد کا چہرہ سنجیدہ ہے جب وہ ایک اور کال کرنے کے لئے رسیور اٹھاتے ہیں تو صنم کا ٹیلیفون بھی کٹ جاتا ہے۔

میرے دونوں بھائی میر اور شاہ نواز کمرے میں داخل ہوتے ہیں، ظاہر ہے انہوں نے جلدی میں لباس پہنا ہے۔

"ہمیں مزاحمت کرنا چاہیئے" میر کہتا ہے۔

"فوجی بغاوت کی کبھی مزاحمت مت کرو" میرے والد خاموشی سے کہتے ہیں۔

"جرنیل ہمیں مار دینا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے قتل کا انہیں کوئی بہانہ کیوں مہیا کریں؟" میں کانپ اٹھتی ہوں جب مجھے دو سال قبل صدر مجیب کے خلاف سازش اور اس کے قتل کا واقعہ یاد آتا ہے اور جب اس کے خاندان کے تمام افراد اس کے گھر ہی میں قتل کر دیئے گئے تھے۔ بنگلہ دیش فوج کل کی پاکستانی فوج ہی کا علیحدہ شدہ حصہ تھی۔ وہ فوج ہماری فوج سے مختلف انداز عمل کیوں اختیار کرتی؟

"ضیاء ہی اس بغاوت کا سرغنہ ہے" میری والدہ میرے دونوں بھائیوں کو بتاتی ہیں کیونکہ ہم اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے تھے۔ "اصغر خان اور دوسرے قومی اتحاد کے رہنماؤں کو بھی حراست میں لیا گیا ہے۔ اسی طرح وفاقی وزراء پیرزادہ، ممتاز . نیازی اور کھر کو بھی...... ضیاء کہتا ہے کہ وہ اصغر خان کے خلاف غداری کا مقدمہ چلائے گا اور اسی طرح نیازی اور کھر کو بھی نہیں چھوڑے گا...... وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ۹۰ دنوں میں انتخابات

منعقد کرا دے گا۔ "

" وہ اپنا قبضہ مستقل جاری رکھے گا اور ۹۰ دنوں میں انتخابات بھی کرا دے گا؟ " شاہ کہتا ہے اس نے چھوٹی سی عمر سے اب تک ہم سب سے زیادہ گھر میں وقت گزارا ہے اور سیاسی طور پر زیادہ بالغ نظر ہے۔ ناقابل جواب کئی سوالات ہوا میں معلق ہیں۔ ضیاء نے ان سیاسی رہنماؤں کو کیوں حراست میں لیا ہے؟ کیا یہ اصل مقاصد کو چھپانے کا طریقہ ہے؟ کیا وہ بھی اس سازش میں اس کے ساتھ شریک ہیں؟ ہم اطلاعات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اکٹھا کرتے ہیں تاکہ کوئی باشعور کہانی بن سکے جب کہ اس دنیا میں فوراً ہی شعور کی کمی محسوس ہونا شروع ہوجاتی ہے۔

ضیاء نے بغاوت برپا کرنے میں اس قدر دیر سے اہتمام کیوں کیا؟ ایجی ٹیشن تو ماہ اپریل میں اپنی موت آپ مرچکا تھا۔ چند گھنٹے قبل قومی اتحاد سے مذاکرات کامیابی سے مکمل ہوچکے تھے۔

" ضیاء نے غلط اندازہ لگایا " میرے والد کہتے ہیں "اس کا خیال تھا کہ قومی اتحاد سے مذاکرات ناکام ہوجائیں گے اور اسے قبضہ کرنے کا بہانہ مل جائے گا اس نے حتمی معاہدہ پر دستخطوں سے پہلے ہی اپنا وار کر دیا۔ "خدا ہی علیم و خبیر ہے کہ ہم پر کیا گزرے گی؟ " میری والدہ خاموشی سے کہتی ہیں۔ وہ اپنے لباس تبدیل کرنے والے کمرے میں جاتی ہیں اپنا سیف کھولتی ہیں اور کچھ رقم نکالتی ہیں "صبح سویرے تمہارا کراچی روانہ ہونے کا پروگرام طے ہوچکا ہے " وہ میرے بھائیوں کو کچھ پیسے دیتے ہوئے بتاتی ہیں۔ " بے نظیر. صنم اور میں تمہیں وہیں ملیں گی اگر ہم شام تک نہیں پہنچتی تو تم ملک چھوڑ کر باہر چلے جانا۔ " صبح کے دو بج گئے ہیں۔ ہم فوج کی آمد کے منتظر ہیں تاکہ پاپا کو لے جائیں۔ ہم میں سے کوئی سونے کے کمرے سے باہر نہیں آتا کہ اپنی روانگی کی تیاری کر سکے۔ ہمیں مطلق پتا نہیں کیا ہونے والا ہے؟ کیا جنرل ضیاء ہم سب کی پاکستان واپسی کا انتظار کرتا رہا تاکہ پورے خاندان کا یکدم صفایا کر سکے؟ ان بھیانک خیالات سے میں چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہوں مگر نہیں کر سکتی...... صدر مجیب کی دو بیٹیاں موت کے منہ سے اس لئے بچ گئی تھیں کیونکہ وہ

ملک سے باہر تھیں ان میں سے ایک بعد میں حزب مخالف کی رہنماء بن گئی کیا پاکستانی فوج ہمارے ساتھ ایسی ہی غلطی دہرانا چاہے گی؟

میرے بھائیوں بہن اور میں نے گھر جانے کے لئے بذریعہ طیارہ الگ الگ سفر کیا شاہ نے سوئٹزرلینڈ کے اپنے سکول سے، صنم ہارورڈ سے اور میں نے آکسفورڈ سے...... ہمارے والدین نے کسی حادثہ کے خوف سے ہمیں اکٹھا سفر کرنے کی اجازت نہ دی۔ "خدا کا شکر ہے تم نے تعلیم مکمل کرلی اور اب گھر میں ہو" میرے والد نے دس روز پہلے میری پذیرائی کرتے ہوئے کہا۔ "اب تم میری امداد کرو" وزیراعظم سیکرٹریٹ میں ان کے دفتر کے پہلو میں میں نے اپنا آفس جمالیا...... سرکاری رازوں کو پوشیدہ رکھنے کے قانون کی قسم کھائی اور ان کی فائلوں کے متن کو اختصار سے لکھنے کا کام سرانجام دینا شروع کردیا...... ساتھ ہی اپنے تاثرات بھی لف کرنے شروع کئے...... ایک ہفتے یا گھنٹوں میں کس قدر تبدیلی لائی جاسکتی تھی۔

میری والدہ ریڈیو کو کوئی خبر سننے کے لئے آن کرتی ہیں اگرچہ اتنی صبح سویرے کونسی نشریات سنائی دے سکتی ہیں چنانچہ کچھ بھی نہیں...... جب ہم فوجی جوانوں کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں میرے والد مطمئن ہوکر بیٹھ گئے ہیں۔

"ذمہ داری کا بوجھ میرے کندھوں سے اتر گیا ہے" وہ کہتے ہیں "حکومت ایک امانت ہے اور میں نے اسے ایمان داری سے نبھایا اب یہ بوجھ مجھ پر نہیں ہے" ہم اپنے والدین کے سونے کے کمرے میں صوفے پر بے حس و حرکت بیٹھے ہیں جب کہ میرے والد اپنی روزمرہ عادت کے مطابق سکون سے اپنی کرسی پر بیٹھے میز پر پڑے فائلوں کے انبار کی ورق گردانی میں مصروف ہیں۔

ایک سیاہ فائل وہ مطلقاً نہیں پڑھتے بلکہ تمام متن پر چپ چاپ دستخط کردیتے ہیں۔ "میرا پہلا کام بطور وزیراعظم قتل کے مجرموں کی سزا کو تبدیل کرنا تھا" وہ کہتے ہیں "میرا آخری عمل بھی یہی ہوگا میں زندگی کے لئے اپیل کرنے والوں کی درخواستیں پڑھنا پسند نہیں کرتا۔" میں انہیں گلے ملنے کے لئے آگے بڑھتی ہوں مگر وہ آہستہ سے مجھے پیچھے دھکیل

دیتے ہیں۔ "اب جذباتیت کے لئے کوئی وقت باقی نہیں" وہ مجھے سمجھاتے ہیں۔ "بہت کڑا وقت آنے والا ہے"

۳۰ - ۲ بجے ہیں پھر ۳۰ - ۳ بجے لیکن میرے والد کو ساتھ لے جانے کے لئے کوئی جوان نہیں آتا...... میں شدید بےچینی محسوس کرتی ہوں آرمی والے کیا سوچ رہے ہیں ۰۰ - ۴ بجے کے قریب میرے والد کا ملٹری سیکرٹری پہنچتا ہے اس کی آنکھیں سرخ ہیں اور وہ صدمے کی حالت میں ہے، وہ جنرل ہیڈکوارٹرز سے آیا ہے جہاں اسے جنرل ضیاء نے بلایا تھا اس کے الفاظ ہیں جنرل ضیاء کو افسوس ہے کہ میرے والد کو لاڑکانہ جانے نہیں دے سکتا۔ امید ہے کہ میرے والد کے لئے یہ زیادہ باعث تکلیف نہیں ہو گا کہ انہیں مری میں وزیراعظم ریسٹ ہاؤس میں ان کے عہدے کے مطابق باعزت طور پر رکھا جائے تمام انتظامات ۰۰ - ۶ بجے روانگی کے لئے مکمل کر لئے گئے ہیں۔

"حیرت ہے وہ اپنے پروگرام تبدیل کیوں کرتے رہتے ہیں" صنم پوچھتی ہے "میری ٹیلیفون کال نے ضیاء کو ضرور تلملا دیا ہو گا" میرے والد کہتے ہیں "وہ غالباً پریشان ہو گا کہ اس سے گفتگو کرنے سے پہلے میں نے اپنے وفادار افسروں کو جوابی حملے کے لئے فرمائش کی ہوگی۔"

ہم پھر بےچینی سے انتظار کرنے لگتے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد ہمارا ایک بیرا بتاتا ہے کہ گھر کے منیجر کو جگایا گیا ہے اور وزیراعظم کے مری ریسٹ ہاؤس کی تزئین و صفائی کا انتظام کرنے کو کہا ہے۔

جنرل ضیاء نے کہا تھا کہ وہ ۳۰ - ۲ بجے مجھے گرفتار کرنے آئیں گے اب ۰۰ - ۶ بجے ہیں انہوں نے ابھی ریسٹ ہاؤس کو بھی تیار نہیں کیا۔ "انہوں نے باقی سب کی گرفتاری کا پروگرام بنایا تھا لیکن میرا نہیں۔" پاپا آہستہ سے کہتے ہیں۔ ان الفاظ کی اہمیت کمرے کی خاموشی میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

"حرامزادہ ہم سب کو سوتے میں قتل کر دینا چاہتا تھا" شاہ میرے کان میں کہتا ہے۔ "جاؤ اور اپنا سامان باندھو" میری والدہ میرے بھائیوں کو کہتی ہیں۔ "تمہاری پرواز

۰۰ - ۷ بجے صبح روانہ ہوگی۔ " ہم بی بی سی کی اردو کی صبح کی نشریات پر ریڈیو لگاتے ہیں وہاں صرف اتنی سی خبر سننے کو ملتی ہے کہ فوج نے حکومت پاکستان پر قبضہ کر لیا ہے۔ "تمہارا مضمون عالمی حکومتیں" تھا تم بتاؤ کیا ضیاء انتخابات منعقد کرائے گا۔ "

"ہاں، کرائے گا، پاپا" میرا جواب ہے ابھی تک میں طالب علمانہ منطق اور مثالیت پسندی میں یقین رکھتی ہوں۔ "انتخابات کی بذات خود نگرانی کر کے ضیاء مخالفین کو کسی ایسے دعویٰ سے مرحوم کر دے گا کہ دھاندلی کی گئی ہے اور ایجی ٹیشن کے آغاز کے بہانے سے بھی۔

"بےوقوف مت بنو، پنکی میرے والد خاموشی سے کہتے ہیں" افواج اقتدار چھوڑنے کے لئے حاصل نہیں کرتیں اور نہ ہی جرنیل بغاوت کا ارتکاب اس لئے کرتے ہیں کہ انتخابات منعقد کریں اور جمہوری آئین کو بحال کریں۔

مجبوری میں والدین کے کمرے سے باہر آتی ہوں تاکہ سامان باندھ سکوں میرے والد کئی برس پہلے ہی ہمیں وزیراعظم ہاؤس کو الوداع کہنے کی تربیت دیتے رہے تھے اگرچہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہمیں بندوق کی نوک پر کرنا پڑے گا۔ ان کا اصرار تھا کہ اس رہائش گاہ کو اپنا گھر تصور نہ کریں، بلکہ ایک سرکاری عمارت سمجھیں جب انہیں ان کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا تو وہ سرکاری رہائش گاہ کو جلد از جلد چھوڑنا چاہتے تھے، اپنے فوجی پیش رو یحییٰ خان کی طرح نہیں جو عہدے سے برطرف ہونے کے باوجود مہینوں سرکاری رہائش گاہ کو استعمال کرتا رہا۔ "اتنا سامان ہی اپنے پاس مت رکھو جو ایک دن میں باندھ نہ سکو، میرے والد نے ہمیشہ ہمیں نصیحت کی لیکن میں اس اہم اصول پر عمل پیرا نہ ہو سکی...... میں دو ہفتے قبل آکسفورڈ سے اپنی کتابوں اور کپڑوں کے ساتھ راولپنڈی پہنچ گئی تھی۔ میں نے پہلے اپنا اسباب کراچی کے پتہ پر بحری جہاز کے ذریعے بھجوانے کا سوچا تھا مگر میں ایسا نہ کر سکی۔ میں اپنے والد کے سلسلے میں زیادہ ہی مصروف رہی۔

میں مکمل اضطراب کی حالت میں رہی جب کہ میں اپنا سامان باندھ رہی تھی اور اپنے والدین کے سونے کے کمروں میں بھاگ دوڑ کرنے کے دوران مجھے یہ خدشہ بھی تھا کہ

میرے والد کو مجھے علم ہوئے بغیر کہیں وہ لوگ لے نہ جائیں۔ میں اپنی ایرانی بلی "شوگر" کے اوپر سے پھلانگتی رہی جو ہمارے تناؤ کو محسوس کر لیتی ہے اور میاؤں میاؤں کرتے ہوئے میری ٹانگوں کے ساتھ اپنے جسم کو رگڑ رہی ہے۔ کمرہ تقریباً خالی ہوچکا ہے جب والدہ اندر آتی ہیں۔

"صبح کے ۰۰ - ۸ بجے ہیں" اور فوجی جوان ابھی تک نہیں آئے افسر مہمانداری بتاتا ہے کہ مری ریسٹ ہاؤس ابھی تک تیار ہو رہا ہے لیکن کون جانتا ہے کیا ہونے والا ہے؟ خدا کا شکر ہے لڑکوں کو جانے کی اجازت مل گئی تھی تاہم دن کی روشنی نے کچھ سکون بخشا ہے سامان باندھنے کی مصروفیت نے میرے تناؤ کو کچھ کم کر دیا ہے...... میری والدہ اور میں صنم کے ملحقہ کمرے میں جاتی ہیں۔ وہ اپنے ملبوسات، تصویریں اور ریکارڈوں کے البم دھڑا دھڑ اپنے ٹرنک میں پھینک رہی ہے یہاں تک کہ بہت پرانے گیتوں کے ریکارڈ بھی "میں نہیں چاہتی وہ میری کسی چیز کو چھوئیں" وہ غصے میں کہتی ہے جینز اور ایک شرٹ پہنے ہوئے ہے اور بالوں میں ابھی تک کنگھی بھی نہیں کی۔

"پنکی بیٹے، جلدی آؤ تمہارے پاپا جا رہے ہیں" میں والدہ کو ۰۰ - ۹ بجے سے کچھ ہی پہلے پکارتے ہوئے سنتی ہوں۔

گھر کے عملے کا ایک شخص بھی اونچی آواز میں پکارتا ہے "جلدی کرو، صاحب جا رہے ہیں" اس نے سرخ اور سفید رنگوں کی وزیراعظم ہاؤس کی وردی پہنی ہوئی ہے اس کی آنکھوں میں آنسو رواں ہیں۔

میں اپنی آنکھوں میں بھی آنسو ابلتے ہوئے محسوس کرتی ہوں۔ صنم کی آنکھیں سرخ ہیں "اس حالت میں پاپا کو کیسے الوداع کہہ سکیں گے؟" میں کہتی ہوں، "جلدی کرو۔ آنکھوں میں دوائی کے قطرے ڈال لو میرے پاس ہیں۔" صنم کہتی ہے، ہم اس کے کمرے تک بھاگتی ہیں اور کانپتے ہاتھوں سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دوائی ڈالتی ہیں۔ آنکھیں جھپکتے ہوئے ہم سفید اور سنہری رنگوں میں سجی ہوئی راہ داری سے بڑے دروازے تک پہنچتی ہیں۔ لان میں سے بلکتی ہوئی آوازیں سنائی دے رہی ہیں جہاں گھر کا عملہ اکٹھا

عوام کے دکھ درد میں شریک وزیر اعظم بے نظیر بھٹو

ہو گیا ہے۔

پاپا وزیراعظم کی سیاہ مرسیڈیز میں بیٹھے ہوئے ہیں جیسے ہی کار حرکت میں آتی ہے صنم اور میں روتے ہوئے عملے کے پاس سے گزر کر باہر کے دروازے تک آتی ہیں۔ ''الوداع پاپا'' میں اپنے بازو زور زور سے ہلاتے ہوئے چیخ پڑتی ہوں وہ ہماری طرف دیکھتے ہیں۔ نیم مسکراہٹ کے ساتھ کار میں آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کار وزیراعظم کی رہائش گاہ کے دروازوں سے باہر نکل جاتی ہے جب کہ صبح کا سورج لائسنس پلیٹ پر کنڈلی مارے ہوئے چیتوں کے درمیان وزیراعظم کی سنہری مہر پر چمک رہا ہے۔

میرے والد کو فوجی گاڑیوں کے جلوس میں مری لے جایا جاتا ہے جہاں انہیں ''حفاظتی نگرانی'' میں رکھا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح ضیاء نے سیاسی مخالفین کی حراست کو جائز ثابت کرنے کے لئے گھڑی تھی انہیں پہاڑوں میں کشمیر جانے والی سڑک کے قریب برطانوی دور کی یادگار سفید نو آبادیاتی عمارت میں تین ہفتوں کے لئے رکھا جائے گا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہم نے بطور خاندان وہاں گزاری تھیں، طویل ست گھڑیوں میں سکریبل کا کھیل کھیلتے ہوئے...... اب میرے والد فوج کی نگرانی میں مری کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ میرے والد کی سول حکومت کا خاتمہ ہوچکا ہے ایک مرتبہ پھر پاکستان پر جرنیل حکومت کرنے لگے ہیں۔

مجھے یہ سمجھ لینا چاہئے تھا کہ یہ بغاوت ختم ہوچکی ہے اور میرے والد کی گرفتاری نے پاکستان میں جمہوریت کو ختم کر دیا ہے۔ ۱۹۷۳ء کا آئین معطل ہوچکا تھا مارشل لاء نافذ کر دیا گیا تھا لیکن میں اپنی طالب علمانہ سوچ اور سادہ لوحی سے چمٹی رہی کہ ضیاء انتخابات کرا دے گا جن کا اگلے چند ہفتوں میں اس نے بار بار وعدہ کیا۔ ''میں اس بات کو کلی طور پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے کوئی سیاسی عزائم نہیں ہیں نہ ہی افواج اپنے سپاہیانہ پیشے کو خیرباد کہیں گی۔'' ضیاء نے بغاوت کی صبح ہی اپنی نشری تقریر میں اعلان کیا تھا۔ ''میرا واحد مقصد آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے انعقاد کو یقینی بنانا ہے جو اس سال اکتوبر کے مہینے میں منعقد ہوں گے۔ انتخابات کے فوراً بعد اقتدار عوامی نمائندوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ میں

حتمی یقین دہانی کراتا ہوں کہ میں اس طے شدہ پروگرام سے انحراف نہیں کروں گا" وہ جھوٹ بول رہا تھا۔

مارشل لاء حکم نمبر۵:۔

جو شخص مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے اجازت لئے بغیر ٹریڈیونین، سٹوڈنٹ یونین یا سیاسی پارٹی کے جلسے منظّم کرے گا یا اس میں حاضری دے گا دس کوڑے اور پانچ سال قید کی سزا کا مستوجب ہو گا۔

مارشل لاء حکم نمبر۱۳:۔

فوج پر تقریر یا تحریر میں کسی طرح کی تنقید کی سزا دس کوڑے اور پانچ سال قید ہوگی۔

مارشل لاء حکم نمبر۱۶:۔

فوج کے کسی رکن کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق کے خلاف ورغلانے کی سزا موت ہوگی۔

"کوئی شخص لوٹ مار نہیں کرے گا" بغاوت کے دن جاری کردہ مارشل لاء حکم نمبر۶ کے مطابق زیادہ سے زیادہ سزا قطع ید ہوگی۔

لوگوں کو مزید خوفزدہ کرنے کے لئے ضیاء نے مذہبی بنیاد پرستوں کی قوتوں کو بھی کھلا چھوڑ دیا۔ رمضان کے ماہ صیام میں روزہ رکھنا یا نہ رکھنا پاکستان میں مسلمانوں کے ذاتی صوابدید پر چھوڑا جاتا رہا ہے۔ ضیاء کے احکام کے تحت پبلک ریستوران اور طعام گاہیں............

طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک بند کر دی گئیں۔ یونیورسٹیوں میں کیمپس میں پانی بند کر دیا گیا۔ پانی کے فواروں اور غسل خانوں میں نہانے کیلئے پانی نہیں تھا مبادا کوئی روزہ خور پانی پی لے۔ بنیاد پرستوں کے ٹولے کھلے عام گلیوں میں گھوم رہے تھے اور آدھی رات کو لوگوں کے گھروں کے دروازے کھٹکھٹارہے تھے تاکہ انہیں سحری تیار کرنے کیلئے جگایا جاسکے۔ تمباکونوشی، آب نوشی اور کھلے عام کھانے کی سزا قید تھی۔ پاکستان میں ذاتی ترجیح کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی صرف مذہبی حکومت کے آہنی بازو کا دور دورہ شروع ہو گیا تھا۔

جب ہم راولپنڈی سے ۷۰ کلفٹن واپس پہنچے تو میرے والد کی نظربندی اور پاکستان پر ظلمتوں کے گھمبیر سایوں پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پی پی پی کے ہزاروں حامی ہمارے باغات میں اکٹھے ہوگئے۔ میر مردوں سے گفتگو کرتے رہے اور میری والدہ نے متواتر جدوجہد کی وجہ سے فشار خون میں مبتلا ہونے کے باعث عورتوں سے بات کرنے کیلئے مجھے بھیج دیا۔ "فقط اتنا کہو کہ حوصلہ رکھو" میری والدہ نے بتایا "حوصلہ رکھو. حوصلہ رکھو" میں نے یکے بعد دیگرے ہر آنیوالی خاتون کو کہا اپنی اردو میں لڑکھڑاتے ہوئے کیونکہ آٹھ سال غیر ممالک میں رہنے کی وجہ سے اردو زبان کمزور پڑ گئی تھی۔

ضیاء نے میرے والد کو بدنام کرنے کی مہم اخبارات میں شروع کر دی۔ "بھٹو نے مجھے قتل کرنے کی سعی کی" "بھٹو نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی" ۔ میرے والد کے سیاسی مخالفین کے بیانات سے اخبارات اٹے پڑے تھے۔

احتجاج کرنے والے لوگ سب قائم دائم تھے۔ "اس بدنامی کی مہم کا مقابلہ کرنے کیلئے تمہیں تیار رہنا چاہئے۔ یہ "اپریشن فیئر پلے" کا حصہ ہے۔ میرے والد نے مری سے اپنی ٹیلیفون کالوں میں ایک روز کہا۔ ضیاء اپنی بغاوت کو اسی نام سے پکارتا تھا۔ "مری میں ریسٹ ہاؤس کے عملے کو ایک ایک کر کے کم کر رہا تھا شائد وہ اس طرح مجھے تنگ کرنا چاہتا

ہے" میرے والد نے کہا۔

میرے والد کی جرائت اور مزاح کی حس بلند تھی۔ "ایک صحافی نے آج فون کیا اور پوچھا "آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں" انہوں نے ایک روز بتایا "میں نے اسے بتایا کہ میں آج کل نپولین کے بارے میں زیادہ سے زیادہ مطالعہ کر رہا ہوں تاکہ پتہ چلے اس نے اپنے جرنیلوں کو کس طرح قابو میں رکھا تھا جب کہ میں اپنوں کو نہ رکھ سکا" میرے والد کی بلند حوصلگی نے گھر میں ہمیں اپنا توازن برقرار رکھنے میں خاصی مدد کی۔ بجائے اداس اور مایوس ہونے کے ہم مضبوط پراعتماد اور بلند حوصلہ رہے۔ اول بات یہ تھی کہ میرے والد حیات تھے۔ دوسرے عوام ان کے حامی تھے۔ پی پی پی کی شہرت کا گراف اتنا ہی بلند تھا جتنا پہلے تھا جب کہ پاپا نے میر کو لاڑکانہ اپنے حلقہ انتخاب میں بھیج دیا میں اور شاہ نے ۷۰ کلفٹن میں ہزاروں لوگوں سے ملاقاتیں جاری رکھیں جو اپنے تعاون کا یقین دلانے کیلئے ہر روز آتے تھے۔ ہمارے اپنے اخبار روزنامہ "مساوات" کے رپورٹرز اور فوٹوگرافرز ہر روز کی کارروائی رقم کرتے تھے۔

اگلے روز "مساوات" جو پی پی پی کے نقطہ نظر کو اجاگر کرنے والا واحد اخبار تھا رپورٹ کر دیتا کہ پی پی پی کے حلقے کیا محسوس کر رہے ہیں اور حکومت کے حمایت یافتہ اخبارات کا پی پی پی مخالف پروپیگنڈہ کیا کہہ رہا ہے جس کی مذمت بھی چھاپی جاتی۔

میرے والد کی نظر بندی کے بعد روزنامہ "مساوات" کی اشاعت صرف لاہور میں چند ہزار سے ایک لاکھ تک ڈرامائی طور پر بڑھ گئی جب پریس طلب کے مطابق اخبار نہ چھاپ سکی تو بازار میں ایجنسی پر "مساوات" کی تمام کاپیاں اصل سے دگنی تگنی قیمت پر بکنا شروع ہو گئیں۔

"مساوات" بلیک مارکیٹ میں دس روپے فی کاپی کے حساب سے بک رہا ہے" میں نے اپنے والد کو خوشی خوشی یہ خبر دی۔ اشاعت کی یہ تعداد ایسے معاشرے میں حیرت کن تھی جہاں ناخواندگی کی شرح بہت زیادہ تھی اور اشتہارات وغیرہ کی شکل میں سرکاری سرپرستی بھی ناپید تھی۔

"ضیاء آج مجھے ملنے کیلئے آرہا ہے" میرے والد نے ۱۵ر جولائی کو مجھے ٹیلی فون پر بتایا اگلے دن اخبارات میں شائع شدہ تصویر میں میرے والد سنجیدہ دکھائی دیتے تھے ان کا چہرہ ملک کی سیاسی حالت کی گھمبیرتا کا عکاس تھا۔ ضیاء اس کے برعکس احساس گناہ کا شکار تھا۔ اس کا ہاتھ اس کے سینے پر دھرا ہوا تھا اور چہرے پر غلامانہ مسکراہٹ کا انداز۔ "ضیاء نے انتخابات منعقد کرنے کا اپنا عزم دہرایا اور سیاسی جماعتوں کے درمیان خود ایک ریفری کا کردار ادا کرنے کا ارادہ بھی" میرے والد نے اپنی ملاقاتوں کے بعد ٹیلی فون پر ہمیں بتایا۔ ضیاء اس بات پر کیوں زور دیتا ہے کہ وہ دیانتدار ہے۔ میرے والد کو اتنا بھی یقین نہیں تھا کہ وہ منصفانہ اور مساویانہ سلوک کا متحمل ہو گا۔ ہمیں بھی یقین نہیں تھا۔ میرے والد اور پی پی پی کے خلاف حکومت کی تحویل میں میڈیا نے جو باؤلاپن فضا میں پھیلادیا تھا اس کا تو یہی نتیجہ معلوم ہوتا تھا کہ ہمیں ضیاء پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔

کتنے ہی نامعلوم عوامل سامنے تھے۔ پاکستان کی تاریخ اور قبل ازیں دو مارشل لاؤں کے عہد کا موازنہ کرنے پر پتہ چلا کہ یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ سرکاری ملازموں کو بھی گرفتار کیا گیا تھا۔ بشمول افضل سعید سیکرٹری وزیراعظم، راؤ رشید مشیر وزیراعظم، خالد احمد کھرل ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ (جو ہمارا ضلع تھا)۔

محمود مسعود سربراہ فیڈرل سیکورٹی فورس اور متعدد دوسرے سرکاری ملازمین کا سیاست سے کیا تعلق تھا؟ حکومت کیا معجزہ دکھانا چاہتی تھی؟

ضیاء نے اپنے متعدد انٹرویوز میں کہا کہ فوج نے بغاوت کی "ہنگامی منصوبہ بندی" کی ہوئی تھی۔ اس طرح اعتراف کیا کہ بغاوت کا منصوبہ بہت پہلے تشکیل دیا جاچکا تھا۔

یہ چیز ظاہر کرتی تھی کہ سرکاری ملازمین کی گرفتاری کے پیچھے باقاعدہ فوجی منصوبہ بندی تھی اور یہ فوری لمحاتی سوچ نہیں تھی۔ اس کے پیچھے کون تھا۔ فوجی منصوبے میں پریس میں ہمارے متعلق بہتان طرازی پر مبنی خبریں شائع کرنے کا مقصد کیا تھا ہمارے لئے سراسر معمہ تھا۔ اگر ضیاء منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات منعقد کرانا چاہتا تھا تو اس رویئے کا مظاہرہ عقل سے باہر تھا۔

دریں اثناء صحافی ۷۰ کلفٹن میں میرے والد کے بارے میں، پی پی پی کے بارے میں اور انتخابات کے انعقاد کے بارے میں ٹیلی فون پر متواتر استفسار کررہے تھے۔ ضیاء اب بھی انتخابات کے انعقاد کا وعدہ کررہا تھا۔

"سب کو چائے پر مدعو کرو" پاپا نے مشورہ دیا .... میں نے ایسا ہی کیا۔ میری حیرانی کی حد نہیں تھی کیونکہ ۷۰ کلفٹن کا کھانے کا کمرہ پوری طرح بھر گیا یہاں تک کہ ایئر کنڈیشننگ کا اثر بھی زائل ہوگیا۔ گرمی میں کوئی کمی محسوس نہیں ہورہی تھی۔ میری کزن فخری اور لیلیٰ اور اس طرح سمیعہ اور اس کی ہمشیرہ نے ہماری امداد کی .... میں صحافیوں کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے بہت گھبراہٹ محسوس کررہی تھی لیکن ایک سوال نے مجھے بہت صدمہ پہنچایا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ مسٹر بھٹو اور جنرل ضیاء نے مسٹر بھٹو کی شہرت کو بڑھانے کیلئے مل جل کر سازش کا ارتکاب کیا۔" ایک صحافی نے سموسہ کھاتے اور چائے پیتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل نہیں" میرا مختصر سا جواب تھا کیونکہ میرا خوف اور بے یقینی جو اپنے والد کی گرفتاری کی رات میں نے محسوس کی مجھے یاد آرہی تھی لیکن اگلے روز جب میں نے پی پی پی کے مہمانوں کو یہ روداد سنائی تو مجھے یہ سن کر اور بھی حیرانی ہوئی کہ یہ کہانی افواہ کی صورت میں پھیلائی گئی تھی تاکہ ہمارے حمایتی الجھن کا شکار ہوجائیں اور فوجی قبضہ کے خلاف جو عوامی ردعمل شعلہ فشاں ہے اسے اس طرح کم کیا جاسکے۔ یہ افواہ اور اس طرح کی مزید افواہیں گردش میں تھیں۔

پاکستان ایسے ملک میں جہاں خواندگی کی شرح بہت کم ہے افواہ اور بازاری گپ سچائی کی جگہ لے لیتی ہیں۔ افواہیں چاہے جس قدر بھی غیر منطقی ہوں ایک اندرونی قوت رکھتی ہیں اور اعلیٰ طبقے کے تعلیم یافتہ افراد تک کو بھی متاثر کرجاتی ہیں۔ "کیا یہ حقیقت ہے کہ تم اپنے ہینڈ بیگ میں ایک چھوٹا سا ویڈیو ٹیپ کیمرہ ساتھ رکھتی ہو تاکہ سیاسی راہنماؤں سے ملاقاتوں کی تصاویر بنائی جاسکیں۔ ایک قدیم سکول کی سہیلی نے مجھے پوچھا مجھے اس کا یقین نہیں آیا۔ کس طرح ممکن ہے کہ ہینڈ بیگ میں سے کیمرہ فلمیں بھی بناتا رہا۔ میں نے اسے پوچھا۔ "اوہ

میں نے تو یہ سوچا بھی نہیں" اس کا جواب تھا "میں نے اخبار میں پڑھا تھا"۔

موسم گرما کی شدید بارشوں کا الزام بھی میرے والد کے سر دھر دیا گیا جو بغاوت کے دو ہفتوں بعد شروع ہو گئی تھیں۔ "بنیاد پرستوں نے یہ کہانی پھیلائی کہ بھٹو صاحب ہی ان زبردست بارشوں کا باعث ہیں تاکہ اپنے خلاف بغاوت کا انتقام لے سکیں" ایک پی پی پی کے ملاقاتی نے مجھے بتایا۔ بعض لوگوں نے غالباً اس افواہ پر یقین کر لیا تاکہ سیلاب کی تباہ کاریوں کا جواز مل سکے جس نے ان کے گھروں کا صفایا کر دیا اور کھڑی فصلوں کو تباہ کر دیا لیکن لاہور کے غریب غیر مراعات یافتہ طبقے نے ان باتوں پر پھر بھی یقین نہیں کیا اگرچہ سیلاب نے ان کا بے بہا نقصان کیا اور پی پی پی کے حامیوں کا حقیقی قلعہ بھی یہی تھا۔

"لوگوں سے اپنا مضبوط رشتہ استوار رکھنے کیلئے لاہور جاؤ" میرے والد نے کہا "انہوں نے بارشوں سے بہت نقصان اٹھایا ہے اور سیلاب بھی بہت تباہ کن تھے۔"

"لاہور اپنے آپ چلی جاؤں اس سے پہلے کسی پارٹی فریضے پر میں وہاں کبھی نہیں گئی۔ میرے دل میں ہول اٹھنا شروع ہو گیا۔ "مساوات میں اپنے پروگرام کا اعلان کرو اور شاہ کو اپنے ساتھ لے جاؤ" میرے والد نے مجھے بتایا۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر میں اور شاہ لاہور پہنچ گئے۔ ہزاروں پی پی پی کے حامی ایئرپورٹ پر ہمارے استقبال کیلئے پہنچ گئے اور مارشل لاء حکم نمبر۵ کے باوجود جس میں کسی سیاسی جلسے کا اہتمام کرنے یا اس میں حاضر ہونے پر پانچ سال قید کی سزا دی جا سکتی تھی لوگوں نے پی پی پی کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ہجوم اس قدر پرجوش تھا کہ شاہ اور مجھے اپنی کار تک پہنچنے کیلئے بڑی مشکل سے راستہ ملا۔ میرا اٹھارہ سالہ بھائی اور میں اس غیر متوقع مظاہرہ سے بہت متاثر ہوئے ہم تو صرف وزیراعظم کے بچے تھے اور ہماری کوئی سیاسی حیثیت نہیں تھی۔

ہجوم بیگم خاکوانی صدر خواتین ونگ پنجاب کے بنگلہ پر اور بھی بڑا تھا جہاں لوگ گھر کے باغ سے باہر گلی تک پھیلے ہوئے تھے۔ شاہ اور میں اس ہجوم کی وجہ سے استقبالیہ کمرے میں پسینے میں شرابور ہو گئے۔ کمروں کی روشنی نے بھی ہماری آنکھیں تقریباً اندھی کر دیں کیونکہ لوگ ہماری تصویریں دھڑا دھڑ کھینچ رہے تھے۔ استقبالیہ کے درمیان میں مجھے ٹیلی فون پر

وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو دورہ لاہور کے دوران پیپلز پارٹی کے راہنماؤں کے ہمراہ' اسلم گل' عزیز الرحمٰن چن' الطاف قریشی نمایاں ہیں

بلایا گیا۔ ''یہ وزیر اعظم بھٹو کا ہے'' یہ پیغام ہجوم میں سرسراتا ہوا مجھے ملا۔ ''چیئرمین بھٹو بلارہے ہیں''۔

سینکڑوں لوگ رہائشی کمرے میں میرے ساتھ ہی داخل ہوگئے۔ ''تم کیسی ہو'' میرے والد نے مجھے پوچھا وہ شاہ اور میرے استقبال سے قطعی بے خبر تھے جب میں نے انہیں بتایا کہ ایئرپورٹ پر اور لاہور میں یہاں ہزاروں لوگ استقبال کیلئے جمع تھے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ''میری طرف سے انہیں سلام دو'' میں نے ٹیلی فون بند کیا اور متوقع ہجوم کی طرف مڑی ''میرے والد نے ان تمام لوگوں کیلئے اظہار ہمدردی بھیجا ہے جنہوں نے گھروں اور فصلوں کا نقصان اٹھایا ہے'' میں لڑکھڑاتی اردو میں کہتی چلی گئی۔ ''پی پی پی متاثرہ خاندانوں کی بحالی کیلئے امداد کی طالب ہے۔''

میرے والد اور پی پی پی کی اس واضح حمایت پر ضیاء نے قومی اتحاد کی حمایت کا ڈول ڈالا۔ تمام پارٹیوں کے نظربند راہنماؤں سے ملاقاتیوں کو ملنے کی اجازت ہے ضیاء نے یہ اعلان نامہ جاری کردیا۔ لیکن اس کی یہ چال کامیاب نہ ہوئی بڑے بڑے ہجوم مری میں وزیراعظم ریسٹ ہاؤس کے باہر میرے والد سے ملاقات کیلئے اکٹھے ہوگئے۔ جب کہ حزب اختلاف کے راہنماؤں کی نظربندی کی رہائش گاہیں سونی پڑی تھیں۔ یہ حالت دیکھ کر ضیاء نے ملاقاتوں کی اجازت بند کرنے کیلئے دلیل گھڑی۔ ''غلط استعمال کی وجہ سے، سیاسی نظربند راہنماؤں سے لوگوں کے ملاقات کے حق کو ختم کیا جاتا ہے'' چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے ۱۹ر جولائی کو اعلان جاری کیا۔ بغاوت کے بعد حالات ضیاء کی خواہشات کے مطابق نہیں چل رہے تھے.......... پاکستان کے لوگ عموماً اس راہنما کا پیچھا چھوڑ دیتے تھے جو اقتدار کے سنگھاسن سے علیحدہ ہوچکا ہو اور اپنی تمام تر حمایت نئے آنے والے راہنما کے حق میں انڈیل دیتے تھے۔ لیکن اس مرتبہ ضیاء کا میرے والد کو سازش سے اتارنا الٹے نتائج کا حامل ثابت ہوا۔ میرے والد کو چھوڑنے کی بجائے لوگوں کی وفاداری سوفیصد ان کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ضیاء نے میرے والد اور دوسرے نظربند راہنماؤں کو بغاوت کے تین ہفتوں کے بعد رہائی کا حکم دیدیا۔ لاکھوں لوگ مارشل لاء کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستان

کے بڑے بڑے شہروں میں میرے والد کے استقبال کیلئے پہنچے۔ مغرب میں کبھی اتنا ہجوم اکٹھا نہیں ہوتا جتنا ایشیا میں لیکن ہمارے معیار کے مطابق بھی ہجوم جو میرے والد کی تقریر سننے آتے ہر طرح سے بہت بڑے تھے۔

میرے والد سب سے پہلے کراچی پہنچے جہاں ان کے استقبال میں ہجوم کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ قیاس لگانا بھی ممکن نہیں تھا۔ ریلوے سٹیشن سے ہمارے گھر تک کا راستہ آدھ گھنٹے کا تھا مگر میرے والد کو دس گھنٹے لگے۔ ان کی کار میں ۷۰ کلفٹن پہنچنے تک گڑھے پڑ گئے۔

کچلے جانے کے خوف سے میرے بھائی، بہن اور میں بڑے دروازے سے باہر ہجوم میں اپنے والد کے استقبال کیلئے نہیں گئے۔ بلکہ ہم ان کی آمد کا منظر دیکھنے کیلئے چھت پر چڑھ گئے۔ اگرچہ ہم نے جذباتی ہجوم پہلے بھی دیکھے تھے مگر اس مرتبہ یہ بے مثال تھا اتنی تعداد میں لوگ انہیں دیکھنے، انہیں چھونے اور ان کے قریب جانے کی تگ و دو کر رہے تھے کہ ہمارے گھر کی چار دیواری ان کے بوجھ تلے ٹوٹ گئی۔

"اوہ، پاپا میں آپ کو آزاد دیکھ کر کس قدر خوش ہوں اندازہ نہیں کیا جاسکتا" میں نے والدین کے سونے کے کمرے میں اس رات انہیں کہا۔

"آزاد ابھی تو ہوں مگر" میرے والد کا جواب تھا۔

"ضیاء دوبارہ آپ کو گرفتار کرنے کی کوشش نہیں کرے گا" میں نے کہا "اس نے ہجوموں کا حجم دیکھ لیا ہے"

"چپ"، انہوں نے انگلی کو دائرے میں گھماتے ہوئے مجھے متنبہ کیا............ غالباً ان کے خیال میں کمرے میں جاسوسی کے آلات لگائے گئے تھے۔ میں نے اپنی ضد میں زور دے کر کہا "ضیاء بزدل ہے غدار ہے۔"

اس نے بہت بڑی غداری کی ہے" میں نے بلند آواز سے کہا یہ امید رکھتے ہوئے کہ میرے الفاظ ریکارڈ ہو رہے ہونگے۔ اور یہ یقین کرتے ہوئے کہ ایسے بڑے بڑے ہجوم والد کے محافظ ثابت ہونگے۔

"تم بے احتیاطی کر رہی ہو" میرے والد نے زور دیکر کہا "تم مغرب کی کسی جمہوریت میں نہیں ہو تم اپنے گھر میں بھی مارشل لاء کے ماتحت ہو۔"

مارشل لاء کے سائے مزید تاریک نظر آئے جب ہم سب اپنے والد کے ہمراہ اپنے گھر لاڑکانہ گئے۔ ایک مرتبہ پھر ہجوم بڑی تعداد میں میرے والد کے استقبال کیلئے اکٹھا ہو گیا اور مجھے جھوٹی طمانیت کا احساس ہوا اور اپنے والد کے خاندان کے ساتھ گھر واپس آنے پر خوشی میں اضافہ بھی ہوا جب المرتضٰی میں ہم اپنے والدین کے سونے کے کمرے میں اکٹھے ہوئے تو ہر شے مانوس اور حسب معمول لگی .... میرے والد کے ایک رشتہ دار اسلام آباد میں ایک بڑے افسر کا پیغام لے کر آئے "حکومت" "میرے والد کو قتل کے ایک مقدمہ میں ملوث کرنے والی ہے" افسر نے بتایا۔

"قتل" ایک سرد لہر پورے کمرے میں دوڑ گئی۔ میری والدہ اور والد نے خاموشی سے ایک اچٹتی نگاہ ایک دوسرے پر ڈالی "تم بچوں کو ملک سے باہر سکولوں میں واپس بھیجنے کے انتظامات مکمل کرنا شروع کر دو۔ ان کے تمام کاغذات اور بینک کی کتابیں مکمل ہونی چاہئیں۔ خدا معلوم کیا ہونے والا ہے۔ والدہ نے بھی صاد کیا پھر انہوں نے میری طرف دیکھا تم بھی کچھ عرصہ کیلئے پاکستان سے باہر جانے کا سوچ لو۔ اگر تم چاہو تو کسی گریجوایٹ کورس میں داخلہ لے لو یہاں تک کہ ملکی حالات میں بہتری پیدا ہوجائے۔ میں نے انہیں سرد مہری سے دیکھا۔ پاکستان چھوڑ جاؤں؟ میں تو ابھی پاکستان اپنے گھر پہنچی ہی ہوں۔

"ملازمین کو بھی مشکلات کا سامنا کرنا ہو گا" میرے والد نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مارشل لاء کے ماتحت کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔" صبح ہوتے ہی انہوں نے تمام عملے کو بلایا۔ "تم سب کے سامنے تکالیف اور مشکلات آئیں گی" انہوں نے کہا "اگر تم اس وقت ہماری ملازمت چھوڑ کر گاؤں اپنے گھروں میں جانا چاہو تو فبہا۔ کیونکہ جنرل ضیاء کی حکومت میں میں تمہیں حفاظت مہیا نہیں کر سکوں گا۔ عملہ کے کسی رکن نے ملازمت چھوڑنے کا انتخاب نہیں کیا اور میں نے گھر چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ کچھ روز بعد میرے والد لاہور چلے گئے۔

"جیئے بھٹو، جیئے بھٹو" لاہور میں جو پنجاب کا دارالحکومت ہے اور فوج کی مضبوط آماجگاہ، ۳۰لاکھ کا ہجوم نعرہ زن تھا پاکستان میں اتنا بڑا ہجوم کبھی اکٹھا نہیں ہوا۔ کوئی طریقہ نہیں تھا جس کے ذریعہ ضیاء میرے والد کی سیاسی حمایت کو کم کر سکتا ایک دوسرا پیغام آیا۔ "جناب" محکمہ کے ایک افسر نے بتایا جو میرے والد کی قیام گاہ سابق وزیراعلیٰ کے گھر میں کسی طرح وارد ہو گیا تھا "جنرل ضیاء اور فوج آپ کو مار دینا چاہتے ہیں۔ وہ گرفتار سرکاری ملازمین کو اذیت دیکر آپ کے خلاف قتل کا جھوٹا مقدمہ قائم کرنے کیلئے بیانات لینا چاہتے ہیں۔" وہ افسر لرزہ براندام تھا۔ "خدا کے واسطے، ملک سے باہر چلے جائیں۔ اس نے میرے والد سے التجا کی۔ آپ کی زندگی خطرے میں ہے۔" لیکن میرے والد دھمکیوں میں آنے والے تھے نہ ہی دہشت گردی سے ڈرنے والے۔ "میں زیادہ دیر تک شائد آزاد نہ رہ سکوں" صرف یہی ایک اشارہ تھا جو انہوں نے لاہور سے ٹیلی فون پر رات کو اپنے آخری پیغام میں دیا۔

جب وہ ۷۰ - کلفٹن واپس آئے۔ سیاسی جلسے تواتر سے ہو رہے تھے۔ ضیاء نے ۱۸ر اکتوبر کو انتخابات کے انعقاد کا پروگرام بنایا تھا اور ۱۸ر ستمبر سے ایک ماہ کی انتخابی مہم کی اجازت دینے والا تھا۔ جب میرے والد نچلی منزل میں پارٹی راہنماؤں کے ساتھ ملاقاتوں میں مصروف رہتے تھے میں اوپر کی منزل میں کھانے کے کمرے میں اردو کے اسباق پڑھنے میں مصروف رہتی تھی۔ "تمہیں اپنی اردو کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے" میرے والد نے مجھے بتایا "میری بجائے تمہیں بولنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" میں اردو اخبارات کا مطالعہ بغور کرتی اور ایک اتالیق سے سیاسی اصطلاحات کی شدبد حاصل کرتی۔ "یہ کیسے جا رہی ہے" میرے والد نچلی منزل میں سیاسی ملاقاتوں کے وقفوں کے دوران اوپر کھانے کے کمرے میں دروازہ کھول کر میرے استاد سے پوچھتے۔

اگست کے آخر میں میں اپنے والد کے ہمراہ راولپنڈی بذریعہ طیارہ پہنچ گئی۔ لوگوں کے ہجوموں کو استقبال سے روکنے کے خیال سے جیسے یہ ہجوم میرے والد کے کراچی اور لاڑکانہ ریلوے سٹیشنوں پر استقبال کیلئے آئے، ضیاء نے ایک فوجی حکم کے ذریعہ سیاستدانوں کے

بذریعہ ٹرین سفر کی ممانعت کر دی۔ راولپنڈی میں اس نے ایئرپورٹ پہنچنے کے تمام راستے فوجی جوانوں کی گشت بڑھا کر مسدود کرنے کی کوشش کی۔ لیکن لوگوں کی بہت بڑی اکثریت رکاوٹوں سے بچتے ہوئے ایئرپورٹ کے راستے کے دونوں اطراف اور کار کے ارد گرد جمع ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ جب ہماری کار راولپنڈی میں ایک بڑے ہجوم کے گھیرے میں پھنسی ہوئی تھی، بشیر ریاض، صحافی اور پی پی پی کا حامی، میری والدہ کو کراچی میں میرے والد کے خلاف ایک اور دھمکی سے متنبہ کر رہا تھا۔

"ضیاء کے ایک بااعتماد ذریعہ نے جو میرا دوست ہے بتایا ہے کہ بھٹو کو بھول جائیں وہ دوبارہ کبھی اقتدار میں نہیں آئے گا"۔ "ضیاء نے انہیں قتل کے الزام میں پھانسی پر چڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے"۔ "اس نے ایک "بلینک چیک" مجھے دیکر میری وفاداری خریدنے کی کوشش کی لیکن میں نے انکار کر دیا"۔ اور ضیاء نے اپنے شکنجے کو مزید کسنا شروع کر دیا، پہلی مرتبہ مجھے بھی اس میں پھانسنے کی کوشش کی۔ راولپنڈی میں کھوکھر خاندان کے ساتھ ایک چائے پارٹی میں گئی۔ پی پی پی کے حامیوں کا یہ ایک بڑا خاندان ہے وہاں ایک سو کے قریب خواتین مدعو تھیں۔ تین کھوکھر ہمشیرگان نے مجھے کچھ کہنے کیلئے زور دیا دو بہنیں تو پی پی پی کی عہدیدار تھیں اور تیسری بہن عابدہ وزیراعظم ہاؤس میں میرے والد کی سیکرٹری رہ چکی تھی۔ "حوصلہ رکھو" میں نے مجتمع خواتین کو اپنی زبانی رٹی ہوئی دو منٹ کی اردو تقریر میں کہا۔ "اپنے حوصلے بلند رکھو"۔ جب وہاں سے روانہ ہوئی تو میں دروازے پر منتظر پولیس جوانوں کے ایک دستے کو جس میں خواتین سپاہی بھی شامل تھیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ "یہ سب آپ ہی کی وجہ سے جمع ہیں" ایک بہن نے مجھے بتایا۔ مجھے مزید حیرانی اسی رات بعد میں ہوئی جب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء کا ایک نوٹس مجھے ملا جس پر میری یادداشت کے مطابق جنرل عارف کے دستخط تھے جس میں مجھے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر تنبیہ کی گئی تھی۔ مارشل لاء کے نفاذ کے ڈیڑھ ماہ بعد جنرل ضیاء کی طرف سے مجھے پہلی سرکاری تنبیہ ملی تھی۔ لیکن میں نے اس کو سنجیدگی سے نہ لیا۔ "تصور کرو" میں نے اپنے والد کے سونے کے کمرے میں کھسکتے ہوئے ہنسی میں کہا "ایک چائے کی پارٹی میں جانے

بیگم نصرت بھٹو اور سری لنکا کی سابق وزیر اعظم بندا نائکے کی ایک یادگار تصویر سری لنکا کی موجودہ صدر کمارا ٹنگا بھی تصویر میں نمایاں ہیں

پر وہ مجھے مارشل لاء کیلئے ایک خطرہ سمجھتے ہیں"۔ یہ ہنسی کی بات نہیں" میرے والد نے خاموشی سے کہا۔ "مارشل لاء خطرناک اور مہلک کاروبار ہے"۔ اور یہ خطرناک کاروبار بڑھتا گیا۔ یہ سب عیاں تھا کہ حزب مخالف میرے والد کی پاکستان پیپلز پارٹی کو منصفانہ انتخابات میں کبھی شکست نہیں دے سکتی تھی۔ انتخابی مہم کے آغاز سے دو ہفتے پہلے ضیاء نے اپنے گماشتوں کے ذریعہ سے میرے والد کو دوبارہ گرفتار کر لیا۔

۳ر ستمبر، ۰۰ - ۴ بجے صبح، ۷۰ - کلفٹن کراچی

میں اپنے سونے کے کمرے میں خوابیدہ ہوں جب سیڑھیوں پر قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ سنائی دیتی ہے۔ چونکہ یہ ماہ رمضان ہے میں سمجھتی ہوں کہ گھر کا کوئی ملازم میرے لئے سحری کا کھانا لارہا ہے۔ اس کی بجائے پانچ سفید کپڑوں میں ملبوس اشخاص دفعتاً کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آجاتے ہیں۔ میں ان کے سر کے بالوں کے کٹے ہوئے انداز اور جسمانی صحت سے فوراً سمجھ جاتی ہوں کہ وہ پاکستان آرمی کے کمانڈو ہیں۔ میں کتنی ہی مرتبہ وزیراعظم ہاؤس میں انہیں ڈیوٹی ادا کرتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ لیکن وہ سفید کپڑوں میں کیوں ملبوس ہیں؟۔

وہ اپنی مشین گنوں کے دہانے میری طرف موڑتے ہیں جبکہ چھٹا کمانڈو کمرے میں اچھلتا کودتا ہے۔ میرے ڈریسنگ ٹیبل کی اشیاء ہاتھ مار کر پھینک دیتا ہے کپڑوں کو کیلیوں سے اتار دیتا ہے کتابوں کو الماری کی درازوں سے پرے پھینکتا ہے ٹیبل لیمپ کو توڑ دیتا ہے اور میرے بستر کے ساتھ رکھی میز پر ٹیلیفون کی تاروں کو اکھیڑ دیتا ہے۔

میں خوف زدہ حالت میں پوچھتی ہوں "تم کیا چاہتے ہو؟" مرد ایک مسلمان عورت کے اندرون خانہ اس طرح نہیں آیا کرتے۔ "اگر تم زندہ رہنا چاہتی ہو تو خاموش رہو" ان کا لیڈر کہتا ہے۔ وہ اور اس کے ساتھی دروازے تک جاتے ہیں اور میرا کمرہ بری طرح ابتری کی حالت میں ہے۔ "کیا تم میرے والد کو قتل کرنے آئے ہو؟" میں اس شخص سے پوچھتی ہوں جو اچھلتا کودتا ہے۔ ایک سیکنڈ وہ مجھ پر رحم کھانے کے انداز میں دیکھتا ہے۔

"نہیں" ایک پل کی ہچکچاہٹ کے بعد کہتا ہے۔ پھر اس کا چہرہ سخت ہوجاتا ہے۔ "اگر تم جانتی ہو تمہارے لئے اچھا کیا ہے تو حرکت مت کرو" وہ کہتا ہے اور اپنے پستول کو مجھ پر لہراتا ہے۔ پھر وہ دروازہ کھٹاک سے بند کردیتا ہے اور دوسروں کے ہمراہ روانہ ہوجاتا ہے۔

عجلت میں میں کچھ کپڑے اپنی ٹی شرٹ کے اوپر پھینکتی ہوں۔ فرش پر پڑے ڈھیر سے کوئی کپڑا اٹھاتے ہوئے۔ میری ہمشیرہ دہشت کے عالم میں کمرے کے اندر دوڑ کر آتی ہے "ٹھہرو ٹھہرو۔ تم کہاں جارہی ہو۔ وہ ہم سب کو قتل کردیں گے"۔ صنم چیختی ہے "خاموش رہو" میں اس کو کاٹتی ہوں "مجھے پاپا تک پہنچنا ہے" میں صنم کے ہمراہ کمرے میں باہر نکلتی ہوں اور ہال میں سفید کپڑوں میں ملبوس فوجی کمانڈوز کو بندوقیں لہراتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ فوراً وہ ہم سب کو مویشیوں کی طرح نچلی منزل کے استقبالیہ ہال میں دھکیلتے ہیں۔ جہاں ان کے مزید ساتھی بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ میں سامنے کے دروازے کی چٹخنی کھولتی ہوں تاکہ ملحقہ کمرے میں صحن پار کرکے پہنچ جاؤں جہاں میرے بھائی رہتے ہیں لیکن کمانڈو مجھے گھیر لیتے ہیں اور صوفے پر میری بہن کے ہمراہ بندوق لہرا کر بیٹھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کمانڈوز جوڑوں کی شکل میں کمرے کے دروازوں پر ایستادہ ہوجاتے ہیں ان کی بندوقیں اٹھی ہوئی ہیں۔

مجھے اپنے والد تک پہنچنا ہے۔ وہ خطرے میں ہیں۔ مجھے ان تک ضرور پہنچ جانا چاہئے۔ کمانڈو آدھی رات کے وقت وردی پہنے بغیر ہمارے گھر میں گھس آئے تھے اسکی کیا ضرورت تھی۔ میرے والد کو گرفتاری کا وارنٹ لے کر یا مارشل لاء حکم کے تحت خاموشی سے کسی وقت بھی ساتھ لے جاسکتے تھے۔ اس کی بجائے وہ ہمیں خوف زدہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد کیا تھا؟ شائد وہ لوگوں تک یہ خبر پہنچنے نہیں دینا چاہتے تھے کہ ان کا میرے والد سے کیا سلوک تھا؟۔ لیکن میرا مصمم ارادہ تھا کہ اس بات کو ان کی بیٹی سے چھپانے میں کسی کو کامیاب نہیں ہونے دونگی۔

"کیا آپ فوجی ہیں" باورچی خانہ کے دروازے پر کھڑے جوان سے اردو میں پوچھتی

ہوں وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں لیکن فوجی ڈسپلن کی وجہ سے جواب نہیں دیتے اور چپ رہتے ہیں۔ میں ایک گہری سانس لیتی ہوں۔ "ان فوجی جوانوں کو دیکھو" میں بلند آواز میں اپنی بہن کو اردو میں کہتی ہوں یہ لوگ اتنے بے شرم کیسے ہوسکتے ہیں؟ یہ ان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو ہی تھے جو ان کو ہندوستان کے قیدی کیمپوں سے واپس لائے تھے جہاں ان کے جرنیلوں نے انہیں خوار ہونے کیلئے بھیج دیا تھا۔ اور یہ اس طرح اس کا بدلہ ہمیں دے رہے ہیں .... ان کے گھر میں داخل ہوکر اور گھر کے تقدس کو "پامال کرکے"۔

میں کنکھیوں سے انہیں دیکھتی ہوں وہ ایک دوسرے کو گھبراہٹ میں دیکھتے ہیں۔ "یہ کس کا گھر ہے؟" ان میں سے ایک استفسار کرتا ہے۔ مجھے فوراً خیال آتا ہے کہ ان میں سے بعض کو علم بھی نہیں کہ وہ کہاں اور کیوں آئے ہیں۔ "کیا تمہیں علم نہیں کہ تم وزیراعظم پاکستان کے گھر میں بلااجازت داخل ہوگئے ہو؟ میں نفرت سے انہیں پوچھتی ہوں"۔ بزدلوں کی طرح وہ اپنی رائفلیں نیچی کرلیتے ہیں۔ میرے لئے اب موقع ہے۔ میں تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھ جاتی ہوں اور اپنے والدین کے کمرے میں داخل ہوجاتی ہوں کوئی مجھے روکتا نہیں۔

پاپا بستر کے کنارے پر بیٹھے ہیں، والدہ ابھی تک تکئے پر سر رکھے ہیں چادریں ان کی ٹھوڑی تک کھنچی ہوئی ہیں۔ اور کانوں میں جوپلگ ٹھونسے ہوئے تھے تاکہ پاپا رات گئے گھر آئیں تو انکی نیند خراب نہ ہو اب ان کے ہاتھوں میں ہیں۔ کمانڈو کھنچے ہوئے ہتھیاروں کے ساتھ آکر انہیں گھیرے میں لے لیتے ہیں۔ وہ جوان جو میرے کمرے میں اچھلتا رہا تھا یہاں بھی والدین کے کمرے میں اچھلتا ہوا چلتا ہے اور کمرے کے دروازے پر سجاوٹ کیلئے لٹکتی تلواروں کو پکڑنے کی کوشش کررہا ہے۔ "تم کیا کررہے ہو؟" میرے والد خاموشی سے اسے پوچھتے ہیں۔ میرے والد کی آواز میں وہی تحکمانہ رعب ہے اور وہ جوان فوراً رک جاتا ہے۔

میرے والد مجھے اس کے قریب ہی بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ ایک منظر بڑا مضحکہ خیز

محسوس ہوتا ہے جب ایک موٹا ساٹھگ ایسا آدمی والدہ کی نازک نیلی اور سفید پوشش کی ایک کرسی پر براجمان ہونے کی کوشش کر رہا ہے "یہ کون ہے؟" میں اپنے والد کو سرگوشی کے انداز میں پوچھتی ہوں "صغیر انور، ایف آئی اے کا ڈائریکٹر" وہ مجھے بتاتے ہیں۔

"کیا تمہارے پاس گرفتاری کے وارنٹ ہیں؟" میرے والد ایف آئی اے کے ڈائریکٹر سے سوال کرتے ہیں۔ "نہیں" وہ بے ڈھنگے پن میں جواب دیتا ہے جبکہ نگاہیں نیچے قالین پر جمائے ہوئے ہے۔ "تو پھر کس الزام میں مجھے میرے گھر سے لے جا رہے ہو؟" میرے والد پوچھتے ہیں۔ "میں آپ کو فوجی ہیڈکوارٹرز میں لے جانے کے احکام کی تکمیل کر رہا ہوں"۔ انور جواب دیتا ہے۔ کس کے احکام پر؟" میرے والد پوچھتے ہیں۔ "جنرل ضیاء کے" وہ جواب دیتا ہے۔

"چونکہ مجھے اس گھڑی تمہارے آنے کی توقع نہیں تھی، مجھے تیاری کیلئے آدھ گھنٹہ چاہئے"۔ میرے والد سکون سے اسے کہتے ہیں۔ "میرے ملازم کو بھیجو تاکہ میرے کپڑے باندھ دے"۔ صغیر انور انکار کر دیتا ہے کیونکہ وہ کہتا ہے کسی کو بھی وزیراعظم سے ملنے کی اجازت نہیں۔ "عرس کو بھیج دو" میرے والد دہراتے ہیں۔ انور ایک کمانڈو کو اشارہ کرتا ہے۔

عرس، صحن میں باقی ملازمین کے ساتھ بندوقوں کی زد میں کھڑا ہے۔ "خاموش رہو۔ ہاتھ پیچھے کمر پر رکھو" کمانڈو ان پر چیختے ہوئے انگریزی میں پکارتا ہے۔ جو ذرا ہچکچائے یا انگریزی کا مطلب نہیں سمجھے ان کو پستول کا دستہ مار کر سمجھایا گیا۔ ان کی نقدی، ان کی گھڑیاں چھین لی گئیں۔

"عرس کون ہے؟" اس کمانڈو نے استفسار کیا جسے گھر سے بھیجا گیا تھا۔ "میں ہوں" عرس نے جواب دیا اسے بولنے پر پستول کا دستہ اس کے سر پر مارا گیا۔ عجیب ڈھونگ رچاتے ہوئے، کمانڈو پوری قطار میں گھوما ہر فرد کو پوچھتے ہوئے کہ کیا تم عرس ہو؟ جب متعدد لوگوں نے "نہیں" میں سرہلایا تو آخر میں وہ میرے والد کے ذاتی ملازم کے پاس آیا اور اسے پوچھا کہ کیا وہ عرس ہے۔ اس نے "ہاں" میں سرہلا دیا کیونکہ اب تک وہ سیکھ چکا تھا کہ اسے بولنا نہیں۔ عرس کو گلے اور پاؤں سے پکڑ کر جسمانی طور پر اٹھا کر سیڑھیوں سے اوپر

لیجایا گیا۔ اور بندوق کی نوک پر اس نے میرے والد کے کپڑے باندھنے شروع کئے اور پھر وہ تھیلے بغیر نمبر پلیٹ کے وہاں کھڑی کار تک لے گیا، کمانڈوز نے اپنا خود کار اسلحہ اس کے سر اور سینے کی طرف کئے رکھا۔

اوپر کی منزل میں میرے والد غسل خانہ میں نہاتے ہیں اور لباس تبدیل کرتے ہیں۔ میں اس قدر پرسکون نہیں رہ سکتی جتنے پرسکون وہ نظر آتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور بزدلی کیا ہوگی کہ گھر میں ہر طرف اسلحہ لہرایا جائے۔ "پیچھے ٹھہرو" ایک کمانڈو چیخ کر مجھے کہتا ہے جب میں والد کے ہمراہ نیچے سیڑھیاں اترتی ہوں۔ میں اسے نظرانداز کر دیتی ہوں۔ وہ مجھے گزرنے دیتے ہیں نچلی منزل میں صنم اور پاپا آنکھیں ملاتے ہیں۔ "تم بے شرم بزدل ہو" میری عام طور پر شرمیلی بہن اپنے والد کے گرفتار کنندگان پر چیختی ہے جو انہیں کار کی طرف لے جا رہے ہیں۔

ایک مرتبہ اور میں اپنے والد کو نامعلوم مقام کی جانب پکڑ کر لیجاتے ہوئے دیکھتی ہوں اور بالکل نہیں جانتی کہ دوبارہ ملاقات بھی ہوگی کہ نہیں۔ میں ایک ثانئے کے لئے لرز جاتی ہوں میرا قلب ڈوب رہا ہے اور منجمد ہو رہا ہے۔ "پنکی" میرے کانوں میں آواز پڑتی ہے۔ میں مڑ کر دیکھتی ہوں کہ میرا بھائی شاہ نواز صحن میں ملازمین کی قطار میں کھڑا ہے۔ "اس کو چھوڑو" میں سپاہیوں پر چلاتی ہوں۔ میں اپنی آواز اور نئے لہجے پر خود بھی خوف زدہ ہوں۔ لیکن سپاہی پرے ہٹ جاتے ہیں۔ گھر کے اندر واپسی پر دیکھتی ہوں کہ میری والدہ کا چہرہ چاک کی طرح سفید ہو چکا ہے۔ ان کا بلڈ پریشر مزید نیچے گر گیا ہے۔ اور شاہ نواز، صنم اور میں باری باری دوران خون تیز کرنے کیلئے ان کے پاؤں کی مالش کرتے ہیں۔ میں ڈاکٹر کو بلانے کیلئے ٹیلی فون کرتی ہوں لیکن لائنیں تو تمام کٹ چکی ہیں۔ میں دروازے پر ایستادہ گارڈوں سے التجا کرتی ہوں کہ ڈاکٹر لانے کیلئے مجھے جانے دیں لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جب صبح ہمارا بڑا ملازم ۷۰ - کلفٹن پہنچتا ہے اور ایک سندھی گارڈ کی ہمدردیاں حاصل کرتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ کیا واقعہ وقوع پذیر ہوا ہے اور اس طرح میرے والد کی گرفتاری کی خبر باہر نکلتی ہے۔ دوست محمد اپنے سکوٹر پر گھنٹوں کراچی کے نواح میں چکر لگاتا ہے اور پارٹی کے راہنماؤں کو، المرتضیٰ میں میرے بھائی میر کو، ہمارے رشتے داروں کو،

اخبارات کو اور میری والدہ کے ڈاکٹر کو اصلی خبر سے مطلع کرتا ہے۔ لیکن جب ڈاکٹر اشرف عباسی دروازے پر آتی ہیں تو انہیں اندر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ آخر دوپہر کو حکومت کا مقرر کردہ ڈاکٹر میری والدہ کو انجکشن لگاتا ہے جس کی انہیں اشد ضرورت تھی۔

ایک فوجی کرنل دوپہر کے بعد ایک خالی کاغذ لیکر پہنچتا ہے۔ "جنرل ضیاء چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر نے حکم دیا ہے کہ تم اور تمہاری والدہ اس پر دستخط کرو" وہ جنگی نیلی اور بھوری رنگ کی وردی میں ملبوس کہتا ہے۔ میں انکار کر دیتی ہوں۔ "میں تمہیں دستخط کرنے پر مجبور کر دونگا" وہ دھمکاتا ہے اس کی منکے جیسی چھوٹی آنکھیں اور بھی تنگ ہوجاتی ہیں اور اس کا لہجہ مزید سخت محسوس ہوتا ہے۔ "تم مجھے قتل کر سکتے ہو لیکن دستخط کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے" میں اپنی آواز میں ایک نیا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہتی ہوں۔ "تمہارا جنرل ضیاء بھی مجھے دستخط پر مجبور نہیں کر سکتا"۔ "تم نہیں جانتی ہو کہ تمارے لئے اچھائی کس چیز میں ہے" وہ صاف مگر مردہ آواز میں پکارتا ہے اور واپس مڑکر چلا جاتا ہے۔

۵-۰۰ پانچ بجے شام فوج کو گھر سے واپس بلا لیا جاتا ہے۔ شاہ نواز اور میں فوراً پاکستان پیپلز پارٹی کے دفتر میں جاتے ہیں جہاں بعض پارٹی عہدیداروں پر خوف مسلط ہے۔ جبکہ بعض ارکان قومی سطح پر ہڑتال اور مظاہروں پر زور دیتے ہیں .... پارٹی کے اعلیٰ عہدیدار انتظار کرنے کا کہتے ہیں تاکہ میرے والد سے رابطہ ہوسکے۔ میرے والد سے رابطہ! کون جانے اس میں کتنا وقت لگے گا؟

میری والدہ کی حالت اگلے روز زیادہ خراب ہوجاتی ہے۔ انھوں نے میرے والد کے وکیل سے گفتگو کی ہے۔ میرے والد کو خفیہ دھمکیاں جو ملی تھیں سچ تھیں۔ اب میرے والد کے خلاف جو الزام لگایا گیا وہ قتل کی سازش کا تھا۔ "قتل؟" مجھے تو یہ تک علم نہیں کہ جس شخص کے قتل کی سازش کا میرے والد پر الزام لگایا جارہا ہے وہ کون ہے؟

ایک جھوٹا سیاستدان جس کا نام احمد رضا قصوری تھا اور جو ابھی بھی زندہ ہے میری والدہ نے مجھے تفصیل سے بتایا۔ کسی نے تین سال قبل لاہور میں اسکی کار پر جس میں وہ اور اس

کے خاندان کے دیگر افراد بیٹھے ہوئے تھے گھات لگاکر حملہ کر دیا۔ قصوری کا والد جو ایک ریٹائرڈ مجسٹریٹ تھا مارا گیا تھا۔ لیکن قصوری جو پی پی پی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہوا تھا نے دعویٰ کیا کہ حملے کا ہدف وہ خود تھا۔ یہ سیاستدان جو اب حزب مخالف ہیں شامل ہو گیا ہے۔ اپنی متعدد عداوتوں کے لئے مشہور تھا اور اس سے پہلے بھی اپنی زندگی پر قتل کی پندرہ وارداتوں سے جانبر ہوچکا ہے۔ اس آخری حملے میں اس نے میرے والد کے ملوث ہونے کا شبہ ظاہر کیا اور پولیس اسٹیشن میں ایف آئی آر درج کرادی۔ جمہوری پاکستان میں اس وقت اتنی آزادی تھی کہ پولیس نے وزیراعظم پاکستان کے خلاف رپورٹ درج کرلی۔ عدالت عالیہ کی تفتیش کے نتیجہ میں میرے والد کو اس جرم سے بری کر دیا گیا تھا اور اس افسوسناک حادثہ کو بھلایا بھی جاچکا تھا۔

۱۹۷۷ء تک قصوری دوبارہ پی پی پی میں شامل ہوچکا تھا اور مارچ کے انتخابات میں پارلیمینٹ کے پی پی پی ٹکٹ کے لئے درخواست بھی دے چکا تھا۔ جب پی پی پی نے ٹکٹ کسی اور شخص کو دینے کا فیصلہ کیا تو قصوری نے میرے والد کے خلاف الزامات کو دوبارہ فائل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اب جب کہ نئی انتخابی مہم میں صرف دو ہفتے رہ گئے تھے، ضیاء نے اس پرانے الزام کو استعمال کرکے میرے والد کو گرفتار کرنے کا ایک بہانہ بنایا۔ لیکن ایک مرتبہ پھر ضیاء کا منصوبہ ناکام ہوگیا۔ عدالت عالیہ کے جس جج نے یہ الزامات سنے اس نے ریکارڈ کردہ تمام مواد کا جائزہ لینے کے بعد اسے "متضاد اور نامکمل" قرار دیا اور میرے والد کو کسی طرح بھی اس قتل میں ملوث نہیں پایا۔ اس نے میرے والد کی گرفتاری کے دس دن بعد ان کی ضمانت پر رہائی کا حکم دیدیا۔ میں دوبارہ مستقبل کی خوش امیدی پر خوش تھی۔ "اگر سول عدالتوں نے وزیراعظم کو رہا کر دیا ہے تو میں بھی انہیں مارشل لاء حکم کے ماتحت گرفتار کرنا نہیں چاہتا" ضیاء نے صحافیوں سے اس فیصلے پر یہ تبصرہ کیا۔

میرے والد ۱۳ر ستمبر کو سیدھے گھر کراچی پہنچے اور اگلی صبح شاہ نواز کے ساتھ ماہ رمضان کے خاتمہ پر لاڑکانہ میں میرے بھائی میر کے پاس جاکر عید منانے کا پروگرام بنایا۔ اب ہم پر دباؤ بھی شدید ہوگیا۔ صرف پانچ دن بعد انتخابی مہم کا آغاز ہونا تھا۔ اور میرے
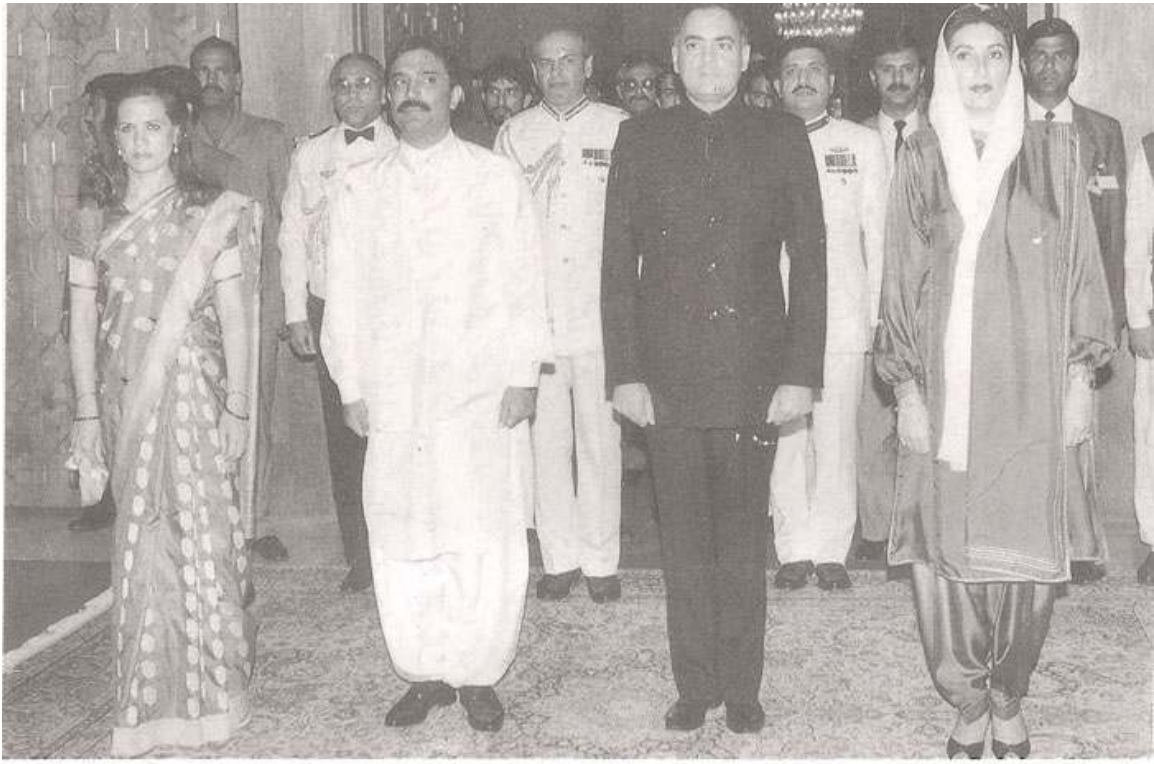
بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی کے دورہ پاکستان کے موقع پر محترمہ بے نظیر بھٹو وزیر اعظم پاکستان، جناب آصف زرداری اور مسز سونیا گاندھی

والد نے اگلے تیس دنوں میں ۹۰ جلسوں سے خطاب کرنے کا پروگرام طے کیا تھا۔ معمول کے مطابق پورا کنبہ والدین کے سونے کے کمرے میں اس رات جمع ہوا جہاں گفتگو نے ایک غیر متوقع موڑ لیا۔ "تم جانتی ہو نصرت! پنکی کی اب شادی ہو جانا چاہئے"۔ میرے والد نے بستر پر لیٹتے اور سگار کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "میں اس کیلئے بر تلاش کرو نگا" میں صوفے پر سیدھا تن کر بیٹھ گئی۔ "میں ابھی شادی کرانا نہیں چاہتی" میں نے احتجاج کیا "میں تو ابھی کچھ عرصہ پہلے گھر پہنچی ہوں"۔ صنم اور شاہ کو بچپن کی طرح مجھے تنگ کرنے کا موقع مل گیا۔ "تمہیں شادی کرنا ہوگی، تمہیں شادی کرنا ہوگی" انہوں نے گنگنانا شروع کر دیا۔ "دراصل" میرے والد نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "میں نے اپنی پسند کا ایک لڑکا دیکھ لیا ہے" میری والدہ مسکرائیں غالباً شادی کا منصوبہ پہلے ہی بن چکا تھا۔ "میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی آپ مجھے "ہاں" کہنے پر مجبور نہیں کر سکتے"۔ میں نے باغیانہ انداز میں کہا۔ "تم اپنے والد کو "نہیں" بھی تو نہیں کہہ سکتی" پاپا نے کہا جو شاہ اور صنم نے کورس میں گنگنایا۔ "نہیں، نہیں، نہیں" میں نے پکارا اور اتنے میں میرے والد کے لئے عشائیہ کی ٹرالی آگئی جس سے میں مزید جھگڑے میں پڑنے سے بچ گئی۔ بفضل خدا، گفتگو کا عنوان بدل گیا۔ لیکن نیا مضمون اور بھی پریشان کن ثابت ہوا۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ ضیاء کسی قیمت پر مجھے نہیں چھوڑے گا اس لئے مجھے بھاگ جانا چاہئے" پاپا نے اپنے طعام کے دوران کہا۔ "پی پی پی کے ایک راہنما نے آج مجھ سے رقم مانگی تاکہ وہ فرار اختیار کر سکے۔ اس نے مجھے بھی مشورہ دیا کہ میں بیرون ملک چلا جاؤں" میں نے کہا "لیکن میں چوہا نہیں ہوں جو مفرور ہو جاؤں۔ میں یہیں رہوں گا اور ضیاء کا سامنا کرو نگا"۔

"اور آپ انتخابات جیت جائیں گے اور جنرل ضیاء پر غداری کا مقدمہ چلائیں گے، میں نے بلند آواز سے کہا۔ "احتیاط کرو، پنکی" میرے والد نے دیواروں کی طرف جاسوسی آلات کا اشارہ کرتے ہوئے مجھے خبردار کیا۔ مگر میں اپنے والد کو حراست سے آزاد ہونے پر اور دوبارہ گھر میں دیکھ کر محتاط رہنے کے متعلق بھول چکی تھی۔ میں نے ضیاء کی غداری پر

اپنے تبصرے کو جاری رکھا یہاں تک کہ میرے والد غصے میں آ گئے۔

"چپ رہو" انہوں نے ناراضگی سے کہا۔ "تم نہیں جانتی ہوں کہ تم کیا کہہ رہی ہو"۔ ہم نے ایک دوسرے پر نگاہ ڈالی اور غصے اور رنج میں میں کمرے سے باہر نکل گی۔ میں اب معترف ہوں کہ انہیں علم تھا واقعات کیا موڑ لینے والے ہیں اور وہ حقیقت پسند تھے جسے میں دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ انہیں پتہ چلا کہ جنرل ضیاء کس قدر سنگ دل ہے اور وہ مجھے اشتعال انگیز بیانات کے اظہار سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن میں اس وقت بہت اڑیل مزاج تھی اور ایسی چیزوں سے لاپرواہ .... میں نے کتنی ہی مرتبہ بعد میں خدا کا شکر ادا کیا کہ انہوں نے لاڑکانہ جانے سے پہلے مجھے صحیح معنوں میں حقائق کا سامنا کرنے کیلئے تیار کر دیا۔ "جو کچھ میں نے کل رات تمہیں کہا اسے دل کی گہرائیوں میں مت لے جاؤ" انہوں نے میری چار پائی کے ایک کنارے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے"۔

انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔

"میں سمجھتی ہوں پاپا، اور میں بھی معافی مانگتی ہوں" میں نے انہیں الوداعی بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ مجھے انکی خاکستر رنگ کی قمیض شلوار اور شالیمار کی خوشبو کا نظارہ ابھی تک یاد ہے۔ یہ آخری مرتبہ تھا جب میں نے انہیں آزاد دیکھا۔

۱۷ ستمبر ۱۹۷۷ء ۳۰ - ۳ بجے صبح - المرتضیٰ

بھاول، لاڑکانہ میں گھر کے عملہ کا ایک فرد، جو کچھ وہاں ہوا اسے دہراتا ہے کیونکہ اتنا عرصہ میں وہاں نہیں تھی۔

۷۰ فوجی کمانڈو اور پولیس کے جوانوں نے صبح دو بجے المرتضیٰ کی دیواروں کو پھاندا اور ڈنڈوں سے چوکیداروں کو پیٹتے ہوئے گھر میں داخل ہوگئے۔ "دروازہ کھولو" وہ چلائے۔ بڑے دروازے کو کوٹنا شروع کر دیا۔ جب کہ میں اور دیگر ملازمین دروازے کو اندر سے پکڑے ہوئے تھے۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" ہم چلائے۔

"بھٹو"

انتظار کرو، ہم انہیں جگاتے ہیں"

"دروازہ کھولو" وہ چلائے۔ انہوں نے اپنا سارا وزن دروازے پر ڈال دیا یہاں تک کہ وہ اندر کی طرف جھک گیا۔ میر نے اس ہلچل کی آواز سنی اور بھٹو صاحب کو جگانے چلا گیا۔ "انہیں بتادو کہ دروازہ توڑنا ضروری نہیں" والد نے اسے کہا "صرف دو افسروں کو اندر آنے دو، مجھے اپنی چیزیں اکھٹا کرنے کیلئے کچھ وقت درکار ہے"۔ لیکن وہ جانتے تھے وہ سب اندر آجائیں گے۔ ان کا سوٹ کیس بندھا ہوا تھا اور ان کا بریف کیس بھی تیار تھا۔ دس منٹ بعد بھٹوصاحب کو لیجایا گیا۔ ہم سب کو بندوق کی نوک پر گھر کے اندر مقفل کر دیا گیا۔ گھر کے اندر اور باہر حفاظتی افواج کا پہرہ تھا۔ ہم سب رو پڑے۔ میر بابا بہت غصے میں تھا۔ اس نے کراچی فون کرنا چاہا مگر لائنیں کٹ چکی تھیں۔ اگلی صبح وہ گارڈوں کو غچہ دیکر نکل آیا اور نزدیک ہی ایک اور گھر میں بیگم صاحبہ کو اطلاع دینے کیلئے داخل ہوگیا۔ خبر اس وقت تک پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی اور ہزاروں لوگ المرتضٰی کے باہر دروازوں پر جمع ہوگئے تھے۔

"جیئے بھٹو، جیئے بھٹو،" وہ سب نعرہ زن تھے۔

پولیس نے بہت سوں کو گرفتار کرلیا۔

میرے والد کو پہلے سکھر جیل اور بعد میں کراچی جیل لیجایا گیا پھر وہ انہیں لاہور لے گئے۔ ضیاء یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ کہ لوگوں کو پتہ چلے انہیں کہاں رکھا گیا ہے۔ اس مرتبہ ضیا کا پختہ ارادہ تھا کہ وہ میرے والد کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردے۔ دوبارہ میرے والد کو اسی پرانے قتل کا مرتکب قرار دیا گیا لیکن اس دفعہ ضیاء نے انہیں پھانسنے کے مکمل انتظامات کر رکھے تھے۔

باب ٦

میرے والد کا عدالتی قتل

مارچ ۱۹۸۰ء ۔ المرتضیٰ میں وقت ذرہ ذرہ کر کے بے پیندے کی شیشے کی گھڑی سے ٹپک رہا ہے۔ میں اپنے آپ کو تمام انسانی تجربوں سے کٹی ہوئی زندہ در گور محسوس کرتی ہوں۔ میری والدہ نظر بندی کی نامختتم گھڑیاں تاش کے کھیل " پیشنس " میں صرف کر رہی ہیں۔ لیکن المرتضیٰ میں پانچ ماہ کی مسلسل مقفل زندگی کے بعد میں ہمیشہ کی نسبت زیادہ بے چینی محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے اس بات کا شائبہ بھی نہیں کہ کب اور شائد ہی کبھی ہمیں رہا بھی کیا جائے گا۔ یہ سب کچھ ضیاء کی مرضی پر ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت نے اپنی پسند کا اظہار کر دیا ہے۔ جیسے ہی موسم سرما بہار میں تبدیل ہو رہا ہے، یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ امریکنوں کو ضیاء کی فوجی آمریت، جمہوریت کی واپسی کی نسبت زیادہ فائدہ مند معلوم ہوتی ہے۔ افغانستان میں بڑھتی ہوئی روسی موجودگی کا تقاضا ہے کہ صدر کارٹر مارچ ۱۹۸۰ء میں ۴۰۰ ملین ڈالر کی امداد پیش کرتا ہے لیکن ضیاء اس کو مونگ پھلی کا نام دے کر مسترد کر دیتا ہے۔ افغانستان سے مہاجرین کی تعداد روز بروز کثرت سے پاکستان داخل ہو رہی ہے جو افغانستان میں جنگ کی شدت کے ساتھ سیلاب کی شکل حاصل کر لے گی۔ ہمارے دروازوں پر دستک دیتے ہوئے مہاجرین اور روسی افواج کا اجتماع ضیاء کے لئے غیر ملکی امداد کے حصول کی سنہری تدبیر

ہے۔ جس سے پاکستان اسرائیل اور مصر کے بعد امریکی امداد حاصل کرنے والا تیسرا بڑا ملک بن جائے گا۔ افغانستان پر سویت افواج کا حملہ پاکستان میں عرف عام کے طور پر "بریژینف کا ضیاء کو کرسمس کا تحفہ" خیال کیا جاتا ہے۔ اور میری والدہ اور میں المرتضیٰ میں حراست کی زندگی گزار رہے ہیں۔

صنم جیل کے عملہ اور فوجی افسران کے جلو میں نایاب اور متوقع ملاقات کے لئے پہنچ جاتی ہے۔ ایک بیٹی کو بھی اپنی ماں اور بہن سے فوجی حکام کی مستقل موجودگی کے بغیر ملاقات کی اجازت نہیں دی جاتی۔ میری والدہ مسلسل نچلی سطح پر بلڈ پریشر کے باعث بیمار ہیں اور اپنے بستر پر لیٹی ہوئی ہیں میں استفسار کرتی ہوں کہ کیا کسی خاتون افسر کی موجودگی میں ملاقات کا انتظام ہو سکتا ہے؟ جیسے ہی صنم اور میں زنان خانہ کے کوارٹرز میں جانے کی تیاری کرتی ہیں میں قدموں کی چاپ کو پیچھے آتی سنتی ہوں۔ یہ پولیس کی خاتون افسر نہیں بلکہ کیپٹن افتخار ہے جو ایک فوجی افسر ہے میں اسے بے یقینی میں گھورتی ہوں۔ کوئی مرد جب تک وہ رشتہ دار نہ ہو خواتین کے کمروں میں نہیں جا سکتا۔ ہماری تہذیب میں بعض لوگ تو مرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ اجنبیوں کو اس تقدس کو پامال کرنے کی اجازت دیں۔

"جیل کے قوانین اس بارے میں واضح ہیں کہ صرف خاتون پولیس افسران ہی خاتون قیدی کے کمرے میں داخل ہو سکتی ہیں" میں اسے یاد دلاتی ہوں۔

"میں موجود رہوں گا" وہ کہتا ہے۔

"تب ہم ملاقات ہی نہیں کریں گے، میں اپنی بہن کو واپس بلوا لوں گی"۔

صنم پہلے ہی والدہ کے کمرے میں جاچکی تھی۔ پس میں خواتین کے مخصوص کمروں کی طرف راہداری میں چلتے ہوئے صنم اور اپنی والدہ کو بتاتی ہوں کہ یہ ملاقات ملتوی کر دی گئی ہے۔ مجھے اپنے پیچھے شور سنائی دیتا ہے۔ کیپٹن افتخار میرے پیچھے آرہا ہے۔

"تمہارا کیا خیال ہے تم کہاں جارہے ہو؟۔ تمہیں اندر آنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی" میں لحہ بھر بھونچکا ہو کر اسے کہتی ہوں۔

لیکن وہ سنی ان سنی کر دیتا ہے۔ "کیا تم جانتی ہو میں کون ہوں" وہ بلند آواز میں کہتا

ہے۔ "میں پاکستانی فوج کا کپتان ہوں اور جہاں چاہوں جاسکتا ہوں۔ "

"تم جانتے ہو میں کون ہوں؟" میں اتنی ہی بلند آواز میں جواب دیتی ہوں۔ "میں اس شخص کی بیٹی ہوں جو تمہیں ڈھاکہ کی ذلت آمیز شکست کے بعد واپس پاکستان لایا۔ "

کیپٹن افتخار مجھے مارنے کے لئے ہاتھ اوپر اٹھاتا ہے اور وہ غصہ جسے میں دبا رہی ہوں اور ضبط کر رہی ہوں پھٹ پڑتا ہے۔

"تم اس گھر میں ہاتھ اٹھاتے ہو تم بے شرم آدمی ہو۔ تم اس گھر میں ہاتھ اٹھانے کی جرات کرتے ہو جہاں اس آدمی کی قبر کا سایہ جلوہ فگن ہے جس نے تمہیں موت سے بچایا۔ تم اور تمہاری فوج ہندوستانی جرنیلوں کے قدموں میں گر گئی تھی۔ یہ میرے والد تھے جنہوں نے تمہیں تمہاری عزت واپس دلائی۔ اور تم اس کی بیٹی پر اپنا ہاتھ اٹھا رہے ہو۔ "

وہ فوراً اپنا ہاتھ نیچے کرتا ہے۔ "ہم دیکھیں گے کیا ہونے والا ہے" وہ منہ سے جھاگ پھینکتا ہے اور واپس مڑ جاتا ہے صنم کی ملاقات منسوخ کر دی جاتی ہے میں اس عدالت کو ایک خط لکھتی ہوں جہاں میری والدہ اور میں نے المرتضیٰ میں اپنی نظر بندی کے خلاف اپیل دائر کی ہوئی تھی۔ ۱۹۷۹ء میں مارشل لاء کے ماتحت بھی سول عدالتوں کو فوجی قوانین کے مطابق گرفتاریوں کے خلاف مقدمات کی سماعت کا اختیار تھا۔ میں من و عن جو کچھ ہوا تمام واقعہ بیان کرتی ہوں۔ جنرل ضیاء نے چادر اور چار دیواری کے تقدس کا اکثر اپنی تقریروں میں ذکر کیا تھا جس کا مطلب خواتین کی اندرون خانہ زندگی ہے لیکن نہ ہی اسے اور نہ ہی کیپٹن افتخار کو اس احترام کا کوئی خیال ہے۔ میں جیلر کو وہ خط دیتی ہوں اور وہ مجھے اس کی رسید دے کر وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس خط کو عدالت میں بھجوائے گا۔ اس وقت مجھے مطلق علم نہیں کہ یہ رسید کتنی قیمتی ہے۔

"میں سوچنے کی حس رکھتی ہوں اس لئے میرا وجود ہے" آکسفورڈ میں اس فلسفیانہ دعویٰ کی شناخت میں مجھے ہمیشہ دقت محسوس ہوئی اور اب اور بھی زیادہ مشکل پیش آرہی

ہے۔ میں اس وقت بھی سوچنے میں محو ہو جاتی ہوں، جب سوچنا نہیں چاہتی لیکن جوں جوں دن گزر رہے ہیں۔ مجھے یقین نہیں رہتا کہ میرا وجود بھی ہے یا نہیں۔ صحیح معنوں میں وجود کا مطلب ہے کہ کوئی شخص تبدیلی لاسکتا ہے، کوئی عمل کر سکتا ہے، اور اس کے رد عمل کا باعث بن سکتا ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ میں کچھ بھی عمل کرنے کے قابل نہیں ہوں جہاں میرے نقوش موجود ہیں۔

میرے والد کے نقوش ہی میرے کارکردگی کے محرک ہیں۔ استقلال، عزت، اصول...... میرے والد بچپن میں جو کہانیاں ہمیں سنایا کرتے تھے ان کا نتیجہ بھٹو خاندان کی اخلاقی فتح پر منتج ہوتا تھا۔ "ووڈسٹاک کے جنگلات میں روپرٹ مجھ پر پل پڑا" میرے والد آکسفورڈ کے آس پاس ہسنز اوَ کے روپرٹ سے اپنے مقابلہ کی داستان سنانی شروع کرتے جو انتھنی ہوپ کے ناولوں کا شیطانی کردار تھا۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوکر میرے والد ایک تصوراتی تلوار گھماتے۔ وہ میرے کندھے کو زخمی کر دیتا ہے۔ میری ایک ٹانگ کاٹ دیتا ہے۔ لیکن میں جنگ جاری رکھتا ہوں۔ کیونکہ کوئی بھی باوقار آدمی لڑتے ہوئے موت کو گلے لگانا پسند کرتا ہے۔ "جب کہ ہم سحر زدہ تمام کارروائی سنتے ہیں، پاپا حملے کو روک دیتے ہیں۔ وہ تلوار گھونپ دیں گے، خون جو زخم سے رستا ہوا معدے میں پہنچتا ہے۔ اس کی پرواہ نہیں کریں گے۔ اچانک جھپٹتے ہوئے وہ روپرٹ کا خاتمہ کر دیں گے۔ پھر تھک ہار کر کرسی میں دھنس جائیں گے۔ "ایک عظیم داغ" وہ اپنی قمیص اٹھاکر ہمیں اپنڈکس (آنت) کا داغ دکھا کر کہتے۔

اس کہانی اور بھٹو خاندان کی دوسری داستانوں سے استحکام محسوس کرتے ہوئے مجھے بغاوت کے بعد اس بات میں یقین کرنے کے لئے کبھی تامل نہیں ہوا کہ میرے والد آخر کار ضیاء پر فتح حاصل کرلیں گے۔ میرے والد نے جو داستانیں ہمیں سنائی تھیں ان میں پر تاثیر مقابلوں اور حقیقی طاغوتی قوت جس سے میرے والد کا واسطہ پڑنے والا تھا کے درمیان تمیز کرنے کا ابھی میں نے خیال بھی نہیں کیا تھا۔

ستمبر ۱۹۷۷ء :۔ ٹھوس اینٹوں کی دیواروں کو نوکیلی تاروں سے لپیٹ دیا گیا۔ چھوٹی

پاکستان کے ممتاز سیاسی راہنما نوابزادہ نصراللہ خان' ملک محمد قاسم' ایئر مارشل ریٹائرڈ اصغر خان ایک تقریب میں محترمہ بے نظیر بھٹو کے ہمراہ

بلند کھڑکیوں کو لوہے کی تاروں سے ڈھانپ دیا گیا۔ عظیم فولادی دروازے، کوٹ لکھپت جیل۔ بڑے دروازے کے کھلتے ہی لوہے کے گھسٹنے کی آوازیں شور کرتی ہیں جب میں وہاں قدم رکھتی ہوں۔ اس سے قبل میں نے کبھی جیل کا اندرون ملاحظہ نہیں کیا تھا۔ سامنے فولاد کی ایک اور دیوار تھی جس کی حفاظت بندوق بردار پولیس کے سپاہی کر رہے تھے فولاد کی دیوار میں ایک چھوٹے سے دروازے پر میرے ارد گرد مرد، عورتیں اور بچے کھانے کے ٹفن بکس اٹھائے ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ پاکستانی جیلوں میں قیدیوں کی آسائش کا کوئی سامان نہیں۔ کپڑے، بستر، پلیٹیں اور خوراک قیدیوں کے رشتے دار ہی مہیا کرتے ہیں۔ وہ قیدی جن کے گھر والے غربت کی وجہ سے انہیں یہ چیزیں مہیا نہیں کر سکتے۔ اور وہ قیدی جنہیں قید با مشقت کی سزا ملتی ہے۔ ''سی'' کلاس میں رکھے جاتے ہیں۔ جہاں پچاس پچاس تک قیدی فرش پر جوؤں سے بھری چٹائیوں پر سونے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ کونے میں رفع حاجت کے لئے ایک سوراخ کیا ہوتا ہے اور پانی میں پکی ہوئی دال ایک روٹی کے ٹکڑے سے تناول کرتے ہیں۔ سو درجے گرمی میں پنکھے ناپید ہیں قیدیوں کے غسل کا کوئی انتظام نہیں اور نہ ہی منہ ہاتھ دھونے کا کوئی بندوبست۔ پولیس والے مجھے جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں والد سے ملانے کے لئے لے گئے۔

''قتل کے اس دوبارہ الزام کے بعد ضیاء ہمارے خلاف زیادہ کھل کر سامنے آرہا ہے باقی بچوں کو ملک سے باہر فوراً چلے جانا چاہئے اس سے قبل کہ ضیاء جانا ناممکن بنادے'' میرے والد مجھے کہتے ہیں ''خاص طور پر لڑکوں کو چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ملک سے باہر ہونا چاہئے''۔

''ہاں پاپا'' میں کہتی ہوں یہ جانتے ہوئے کہ میر اور شاہ اب ملک چھوڑنا نہیں چاہیں گے۔ اپنے والد کے قید میں ہوتے ہوئے وہ اپنی تعلیم پر کیسے توجہ دے سکیں گے؟۔ وہ لاڑکانہ اور کراچی میں انتخابات کی پرزور تیاریاں کر رہے ہیں۔ جن کے انعقاد کا ضیاء ابھی تک وعدہ کر رہا ہے۔

''تم نے اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے۔ لیکن اگر تم انگلستان واپس جانا چاہو اور بحفاظت

زندگی گزار سکو تو میری اجازت ہے تم جاسکتی ہو" میرے والد کہتے رہے۔ "اگر یہیں رہنے کا سوچو تو یہ جان لو کہ ہمارے لئے سخت موسم کا سامنا ناگزیر ہے۔"

"میں یہیں ٹھہروں گی، پاپا اور آپ کے مقدمہ میں معاون ثابت ہوں گی" میں انہیں کہتی ہوں۔ "تمہیں مضبوط اعصاب کا مظاہرہ کرنا ہوگا" وہ کہتے ہیں۔

چند روز بعد میر بادل ناخواستہ انگلستان روانہ ہوگیا۔ اسے آئندہ کبھی والد کی صورت دیکھنا نصیب میں نہیں تھا۔ نا ہی شاہ نواز کو جو طویل سفر کے بعد چند روز پہلے کوٹ لکھپت جیل آیا تھا۔ تاکہ سوئٹزرلینڈ تعلیم کے لئے روانہ ہوسکے۔

"مجھے اپنے والد کو ملنے کی اجازت ہے" شاہ نے پہلے دروازے کے اندر کھڑے محافظوں کو بتایا۔ "میں انہیں الوداع کہنے کے لئے آیا ہوں"۔

"ہمیں تمہارے اندر جانے کی اجازت نہیں ملی" محافظوں نے کہا "ہم تمہیں اندر نہیں جانے دیں گے"۔

میرے والد نے جو اندرونی فولاد کی دیوار کے ساتھ ساتھ اپنے وکلاء سے ملاقات کے لئے گزر رہے تھے شاہ کو محافظوں سے تکرار کرتے ہوئے سن لیا۔

"تم میرے بیٹے ہو۔ کسی احسان کے لئے ان لوگوں کو مت کہو" انہوں نے بلند آواز میں میرے بھائی کو کہا۔ "جاؤ اپنی تعلیم حاصل کرو اور محنت کرو۔ مجھے تمہاری کامیابیوں پر فخر ہوگا۔"

شاہ نواز دو روز بعد لیسن میں امریکی کالج جانے کے لئے روانہ ہو گیا صنم جلد ہی ہارورڈ واپس ہوگئی۔ دس روز بعد، ۲۹ر ستمبر ۱۹۷۷ء کو مجھے پہلی مرتبہ گرفتار کرلیا گیا۔

لوگ ــــ لوگوں کا انبوہ۔۔

شلوار قمیص میں ملبوس نوجوانوں کے گروہ درختوں کی شاخوں اور سڑک کے کھمبوں سے لٹکے ہوئے، بسوں اور ٹرکوں کی چھتوں پر بے خطر کھڑے ہوئے، خاندانوں کے خاندان

کھڑکیوں، چھتوں اور بالکنیوں سے جھانکتے ہوئے عوام الناس کا وہ انبوہ کہ مدہوش ہوتا ہوا آدمی بھی سیدھا ہی کھڑا رہنے پر مجبور ہوجائے برقعہ پوش خواتین ہجوم کے کناروں پر ایستادہ، پبلک میں ایک نظریہ کی خاطر مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے گرفتار کردہ وزیراعظم کی بیٹی ان سے گفتگو کرنے آئی ہوئی تھی۔ ایک خاتون کا سیاسی پلیٹ فارم سے خطاب لوگوں کے لئے اس قدر اجنبی نہیں تھا جتنا میں نے محسوس کیا۔ اس سے قبل متعدد دوسری عورتوں نے برصغیر میں اپنے شوہروں، بھائیوں اور والدین کے سیاسی پرچموں کو تھامے رکھا تھا۔ سیاسی خاندانوں کی عورتوں تک وراثت کا انتقال جنوبی ایشیاء کی روایت بن چکا تھا۔ ہندوستان میں اندرا گاندھی، سری لنکا میں سریماوا بندرانائیکے، پاکستان میں فاطمہ جناح اور میری والدہ میرے ذہن میں کبھی بھی یہ خیال نہ تھا کہ قرعہ فال مجھ پر بھی پڑے گا۔

فیصل آباد کے صنعتی شہر میں ایک عارضی سٹیج پر کھڑے ہوئے میں شدید گھبراہٹ کا شکار تھی۔ ۲۴ سال کی عمر میں میں اپنے آپ کو سیاسی رہنما یا عوامی مقرر بننے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن میرے سامنے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ "پیاری بیٹی، تمہیں انتخابی مہم میں حصہ لینا ہوگا۔ ہمیں تمہارے والد کے طے کردہ پروگرام کو تقسیم کرنا ہوگا" میری والدہ نے کراچی میں ایک ہفتہ قبل بتا دیا تھا۔ دیگر پی پی پی کے راہنماء یا تو گرفتار تھے یا اپنے اپنے پروگراموں کے پابند۔

"لیکن میں نے کیا کہنا ہے مجھے کچھ علم نہیں" میں نے والدہ کو بتایا تھا۔ "گھبراؤ مت" انہوں نے کہا "ہم تمہیں تحریری تقریر مہیا کر دیں گے۔" "بھٹو کو رہا کرو" عوام الناس نعرہ زن ہیں۔ وہی نعرہ جو لوگوں نے راولپنڈی میں ایک دن پہلے میری والدہ کے سامنے لگایا تھا۔ میں سٹیج پر ان کے پیچھے کھڑی دیکھ رہی تھی اور سیکھ رہی تھی۔ "گھبراؤ مت اگر والد جیل میں ہیں تو تمہاری ایک والدہ بھی ہے جو ابھی تک آزاد ہے" انہوں نے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ "میرے پاس ٹینک اور بندوقیں نہیں ہیں۔ لیکن میرے پاس دنیا کی کسی بھی طاقت سے ٹکر لینے کے لئے عوام یعنی غریب عوام کی ناقابل شکست طاقت ہے۔" انکی آواز مستحکم تھی مگر ان کے ہاتھوں میں خفیف سالرزہ تھا جب انہوں نے

لوگوں کو جمع کیا اور میرا دل اپنی والدہ کے لئے دھڑک رہا تھا۔ میری والدہ نے عوامی زندگی کی خواہش نہیں کی تھی ان کو پی پی پی کی راہنمائی کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالنے کی بھی خواہش نہیں تھی جب کہ میرے والد حراست میں تھے وہ کم بلڈ پریشر کی وجہ سے بیمار بھی تھیں اور کمزوری بھی محسوس کر رہی تھیں۔ جب پارٹی راہنماؤں نے چیئرپرسن شپ کے عہدہ پر تنازعہ کرتے ہوئے ان کا نام متفقہ امیدوار کے طور پر تجویز کیا تو انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن جب میرے والد نے قید خانہ سے انہیں پارٹی کے فیصلہ کو قبول کرنے کا خط لکھا تو انہوں نے منظور کر لیا۔ پہلے موعودہ انتخابات کے انعقاد میں صرف دو ہفتے باقی تھے، اور لوگ پی پی پی کو اقتدار سونپنے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔

آبادی کی ایک وسیع اکثریت کے لئے ضیاء کا "اپریشن فیر پلے" منصفانہ کی بجائے غیر منصفانہ ثابت ہو رہا تھا۔ بغاوت ہوئے ابھی دو ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ضیاء کی حکومت نے آٹے اور چاولوں کی قومیائی گئی ملیں ان کے اصل مالکوں کو لوٹا دیں اور مزید ملوں کو غیر قومیانے کا وعدہ بھی کیا۔ ملک کے طول و عرض میں صنعت کاروں نے ٹریڈ یونین کے منتظمین کو ملازمت سے علیحدہ کر کے جشن منایا۔ صرف لاہور میں پچاس ہزار محنت کشوں کو گھر بھجوا دیا گیا۔ "تمہارا باپ بھٹو اب کہاں ہے؟" صنعت کاروں نے محنت کشوں کو طعنے دیئے جن کے لئے ملازمت کے تحفظ کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ دیگر محنت کشوں کو ملازمت سے برخاست ہونے اور مزدوری میں کمی کے خدشات بڑھ چکے تھے...... کسانوں کو متعینہ قیمت پر فصلوں کو فروخت کرنے کی بجائے من مانی قیمت دیتے ہوئے کہا گیا۔ "لو یا چھوڑ دو" ایک مرتبہ پھر جاگیرداروں، زمینداروں اور مل مالکان نے منافع دھڑا دھڑ اپنی جیبوں میں ٹھونسنا شروع کر دیا۔ پیاز ۱۹۷۵ء کی نسبت پانچ گنا زیادہ قیمت پر، آلو دگنی قیمت پر اور اسی طرح انڈے اور آٹا ۳۰ فیصد زیادہ قیمت پر، پاکستان بھر میں پی پی پی کے جلسوں میں میرے والد کی حکمت عملی کے الٹ پالیسیاں اختیار کرنے پر شدید نعرہ زنی ہوئی۔ ایک ہی نعرہ مشہور ہو گیا "بھٹو کو رہا کرو، بھٹو کو رہا کرو۔"

فیصل آباد میں میں نے وہی تقریر زور دار طریقے سے ادا کی جس کی پریکٹس اسلام آباد

میں میں نے اپنے کمرے میں بار بار کی۔ اوپر دیکھو، نیچے مت دیکھو، کمرے کے عقب کی طرف بھی مخاطب ہو جاؤ۔ آکسفورڈ یونین میں تقریر کرنے کا کتنا خوبصورت انداز سیکھا تھا۔ اب کھیلوں کے میدان میں میرے سامنے انسانوں کا لا انتہاء ہجوم پھیلا ہوا تھا۔

"حکومت کے عمال کو مشتعل مت کرو اور ضیاء کو انتخابات کی تنسیخ کا کوئی بہانہ مت دو" میری والدہ نے مجھے محتاط رہنے کے لئے کہا تھا لیکن ہجوم بے قابو تھا۔ "مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا" ایک مقامی خاتون کارکن نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "میں نے زندگی بھر اتنا بڑا عوامی جلسہ نہیں دیکھا" کسی شخص نے مجھے مائیکرو فون تھما دیا جس کی تاریں ان لاؤڈ سپیکروں سے جڑی ہوئی تھیں جو "ارتھ" نہیں کئے گئے تھے تاروں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں، اور ارد گرد پھیل جاتی تھیں۔ جب میں تقریر میں مصروف تھی تو سٹیج پر بیٹھے لوگ تاروں کے گرد کپڑا لپیٹ رہے تھے اور مائیکرو فون کو میرے لئے خود پکڑ رہے تھے۔ نہیں، یہ آکسفورڈ یونین نہیں ہے۔

"جب ہندوستان میں اندرا گاندھی کے ساتھ مذاکرات ہوئے تو اپنے والد کے ہمراہ میں بھی وہاں گئی تھی۔ میرے والد نے بستر پر سونے کی بجائے فرش پر سونے کو ترجیح دی" میں نے اپنی تیار شدہ تقریر میں اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہوئے کہا "آپ فرش پر کیوں سوتے ہیں" میں نے پوچھا، "ہندوستان میں میں بستر پر نہیں سو سکتا" ان کا جواب تھا "جب ہمارے جنگی قیدیوں کو بستر میسر نہیں اور وہ زمین پر سوتے ہیں۔" ایک شور اٹھا۔ ایک دن قصور میں اور دوسرے دن اوکاڑہ میں، سبز کھیتوں کے پاس سے گزرتے ہوئے جہاں کسان جھاڑ جھنکار کاٹتے ہوئے کھیتوں کو پانی دیتے ہیں۔ پی پی پی پنجاب کے زراعتی قلب سے گھاس پھونس کاٹ رہی تھی سڑکوں پر دورویہ استقبالی لوگوں کے کھڑے ہونے کی وجہ سے ہماری چلنے کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی۔ پنجاب فوجی جوانوں کا گھر تھا فوج کے ہر عہدہ کے لوگ میرے والد کے حلقہ بردار تھے اور مخلص پیرو کار تھے۔ انہوں نے جوانوں سے پروقار سلوک کیا۔ سردیوں کے موسم میں مغربی پاکستان میں خندقوں میں پڑے جوانوں کو گرم کپڑے مہیا کئے۔ تنخواہیں بڑھائیں اور افسران کے عہدے تک ترقی کے بڑے مواقع

عطا کئے۔ اب سپاہیوں کے اہالیان خاندان ہماری حمایت میں بہت بڑی تعداد میں نکلے تھے۔ ہم ضیاء کی توقیر کے برابر وہاں بھی عزت حاصل کر رہے تھے۔

"مجسٹریٹ ملاقات کا منتظر ہے" میری میزبان نے خوف زدہ حالت میں مجھے کہا جب میں اپنے دورے کے تیسرے مرحلے پر ۲۹ر ستمبر کو ساہیوال پہنچی۔ "گھر کو ہی سب جیل قرار دیا گیا ہے۔ تمہیں پندرہ روز کے لئے نظر بند کیا جاتا ہے" مجسٹریٹ نے مجھے بتایا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ گھر کو پولیس نے محصور کر لیا تھا ٹیلیفون کاٹ دیا گیا اور وقفہ وقفہ سے پانی اور بجلی بھی۔ گر دونواح کی تمام سڑکوں کے راستے بند کر دیئے گئے وہاں کے رہائشی اپنے گھروں سے باہر ہی رہنے پر مجبور تھے میرے میزبان مرد و خواتین جو بعد میں پارٹی کو چھوڑ گئے میرے ساتھ ہی نظر بند کر دیئے گئے۔ میں شدید غصے میں تین روز اپنے سونے کے کمرے ہی میں تلملاتی رہی جب کہ ایک خاتون پولیس سپاہی باہر راہداری میں میری نگرانی پر ایستادہ تھی۔ الزامات کیا تھے؟ میں نے کوئی قانون شکنی نہیں کی تھی حتیٰ کہ مارشل لاء کی خلاف ورزی بھی نہیں کی تھی۔ میں فقط انتخابات کے مہینے کے دوران جنہیں ضیاء کی منظوری حاصل تھی انتخابی مہم میں اپنے والد کی نمائندگی کر رہی تھی۔ اس وقت میں مطلقاً یہ شعور نہیں رکھتی تھی کہ کس خطرناک کھیل میں مجھے الجھایا جا رہا تھا۔ "میری بیٹی زیورات پہنا کرتی تھی، اب قید کی زنجیریں پہن کر وہ فخر کرتی ہوگی" میری والدہ نے کراچی کے ایک انتخابی جلسے میں کہا جہاں لوگوں کی حاضری نے اپنے پچھلے تمام ریکارڈ مات کر دیئے تھے۔ ہمارے جلسوں میں حاضرین کی حیرت کناں تعداد نے پی پی پی کو سیاسی طور پر شکست دینے کی ضیاء کی تمام امیدوں کو ملیا میٹ کر دیا تھا۔ جیل کا بھٹو آزاد بھٹو سے زیادہ طاقتور ثابت ہو رہا تھا۔ اگلے روز ضیاء نے ٹیلیفون پر انتخابات کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔ اس لمحے مجھ پر انکشاف ہوا کہ ملک میں کوئی قانون نہیں ہے۔

۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۷ء:۔

وہ تاریخ جس روز میرے والد کے خلاف سازش برائے قتل کے مقدمہ کا آغاز ہوا۔ عام مقدمات قتل کے برعکس جو پہلے زیریں عدالتوں میں شروع کئے جاتے ہیں اس مقدمہ کا آغاز عدالت عالیہ لاہور میں ہوا اور اس طرح میرے والد کو پہلی اپیل کرنے کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ وہ جج جس نے میرے والد کو چھ ہفتے قبل ضمانت پر رہا کیا تھا عدالت عالیہ کے اپنے منصب سے ہٹا دیا گیا اور خصوصی منتخب پانچ ججوں کا ایک بنچ اس مقدمہ کی سماعت کے لئے تشکیل دیا گیا تھا۔ اس نئے بنچ کا پہلا کارنامہ میرے والد کی ضمانت کی تنسیخ تھی۔ اب انہیں مارشل لاء ناظم اعلیٰ ضیاء الحق کے احکامات کے تحت فوجداری الزامات میں گرفتار رکھا گیا تھا۔ کم از کم میں اپنے والد کی طرف سے اپنی والدہ کے ساتھ کام کرنے میں ابھی تک آزاد تھی۔ انتخابات کی تنسیخ کے اعلان کے فوری بعد مجھے نظر بندی سے رہائی مل گئی تھی۔ پارٹی کے ایک حمایتی نے میرے والد کے مقدمہ کے دوران پی پی پی کے اجلاسوں اور دفتر کے لئے پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں ایک غیر آراستہ مکان استعمال کے لئے دیدیا تھا۔ ہم میں سے ہر روز کوئی ایک برطانوی دور حکومت میں تعمیر شدہ ایک خوبصورت عمارت میں عدالتی کارروائی سننے کے لئے جاتا۔ قیمتی سرخ قالین بچھے ہوئے عدالتی کمرے کو منقش چوبی چھت سمیت ہر جگہ آرائشی کپڑے سے سجایا ہوا تھا۔ ججوں کی آمد سے پہلے جب ہر شخص کھڑا ہو جاتا، طویل سبز کوٹ اور سفید عمامہ میں ملبوس ایک بیرا چوبی عصا (جس کا دستہ نقرئی تھا) اٹھائے داخل ہوتا۔ سیاہ چوغے اور سفید وگیں پہنے ہوئے تمام جج صاحبان ایک سرخ ریشمی چھتر کے نیچے پانچ بلندپشت کی کرسیوں پر بیٹھتے۔ میرے والد کے وکلاء کلف شدہ سفید قمیصوں، سفید پتلونوں، خوبصورت کالروں اور اپنی سیاہ جیکٹوں پر سیاہ ریشمی چوغوں میں ملبوس کمرہ عدالت میں پہلے سے موجود ہوتے۔ عدالت میں قطار در قطار رکھی چوبی بینچوں پر دیگر حاضرین کے ساتھ میں بھی بیٹھ جاتی اور کچھ آسائش بھی حاصل کرتی۔ بادی النظر میں یہ مقدمہ برطانوی قانون کی عمدہ روایات کے مطابق چلتا دکھائی دیتا لیکن در حقیقت ایسا نہیں تھا۔

وزیر خارجہ پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کے دورہ چین کے موقع پر چینی وزیر اعظم جناب چو این لائی کی ایک تصویر، بیگم نصرت بھٹو، بے نظیر بھٹو، مرتضیٰ بھٹو، صنم بھٹو اور شاہنواز بھٹو بھی ہمراہ ہیں

میرے والد کے خلاف مقدمہ فیڈرل سیکورٹی فورس کے ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود کے اقبالی بیانات پر مبنی تھا۔ مسعود محمود ان سرکاری ملازمین میں شامل تھا جنہیں بغاوت کے فوراً بعد زیر حراست لیا گیا۔ اور جسے ہماری اطلاع کے مطابق میرے والد کے خلاف جھوٹی شہادت دینے پر مجبور کرنے کے لئے اذیت بھی دی گئی۔ دو ماہ فوجی حراست میں رہنے کے بعد مسعود محمود نے وعدہ معاف گواہ بننے کا فیصلہ کیا جو ایسا گواہ ہوتا ہے کہ جرم میں دوسروں کا ساتھی ہوتا ہے۔ اور اس وعدے پر معافی کا حقدار بنتا ہے کہ وہ دیگر مجرموں کے بارے میں پوری ''سچائی'' کا اظہار کرے گا۔ اب مسعود محمود کا یہ دعویٰ تھا کہ میرے والد نے سیاستدان قصوری کے قتل کا اسے حکم دیا تھا۔

مسعود محمود کا بیان ہی واحد شہادت تھی جو میرے والد کا مبینہ سازش سے کوئی تعلق ظاہر کرتی تھی۔ دوسرے چار شریک جرم ملزمین بھی فیڈرل سیکورٹی فورس کے ہی ارکان تھے جنہوں نے مبینہ طور پر حملے میں حصہ لیا اور جنہوں نے ڈائریکٹر جنرل کے احکام کی تعمیل کی۔ مسعود محمود کی طرح ان کو بھی بغاوت کے فوراً بعد حراست میں لیا گیا۔ اس حملے کا چشم دید گواہ کوئی بھی نہیں تھا۔

ایف ایس ایف کے چاروں ملزم اراکین اپنے وکلاء کے ساتھ ہی بیٹھتے تھے۔ مگر میرے والد کے آس پاس خفیہ پولیس کے ایجنٹ ہوتے تھے۔ اور انہیں لکڑی کے ایک کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا جو اس مقدمہ کے لئے خاص طور پر تیار کیا گیا تھا۔ ''میں جانتا ہوں آپ آرام دہ زندگی کے عادی رہے ہیں اس لئے بینچ کی بجائے آپ کے لئے کرسی مہیا کی گئی ہے'' قائم مقام چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین نے میرے والد کو طنزاً یہ الفاظ مقدمہ کی سماعت کے پہلے دن کہے جس کا دورانیہ پانچ ماہ ثابت ہوا۔ عدلیہ کے اعلیٰ عہدے پر متعینہ جج مولوی مشتاق ضیاء کے آبائی علاقہ ہندوستانی پنجاب کے ضلع جالندھر کا رہنے والا تھا۔ اور میرے والد سے پرانی عداوت رکھتا تھا۔ یہ وہی جج تھا جس نے ایوب خان کے خلاف میرے والد کے مقدمہ میں سماعت کی تھی۔ پی پی پی کے دور حکومت میں چیف جسٹس کی اسامی کے لئے اسے نظر انداز کیا گیا تھا اور عدالت عظمیٰ میں ترقی کے نااہل قرار دیا گیا تھا اور یہ فیصلہ وزیر قانون ، اٹارنی

جنرل اور میرے والد کا مشترکہ فیصلہ تھا کہ وہ نااہل اور ناقابل ہے۔ اور ضیاء کی بغاوت کے جلد بعد اس نے چیف الیکشن کمشنر کی تقرری کو منظور کر لیا تھا اور اس طرح حکومت کی عدلیہ اور انتظامیہ میں علیحدگی کی پالیسی کا مذاق اڑایا تھا۔ اس سے غیر جانبداری کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

عدالت کی جانبداری عیاں تھی۔ سماعت کے پہلے ہی روز ایف ایس ایف کے ایک ملزم میاں عباس نے جو ایک نیک اور جرأت مند انسان تھا عدالت میں کھڑے ہو کر بیان دیا کہ وہ اپنی شہادت سے انکاری ہے۔ "میرا اقرار نامہ مجھ پر اذیت دے کر حاصل کیا گیا ہے" اس نے اعلان کیا۔ دوسرے روز وہ عدالت سے غیر حاضر تھا۔ وہ بیمار تھا۔ استغاثہ نے جج کو بتایا۔

مدعی علیہ کے وکلاء نے میرے والد کے خلاف گواہوں کے بیانات کی نقول حاصل کرنے کے لئے استدعا کی۔ چیف جسٹس نے "مناسب موقع آنے تک" کے الفاظ کے ساتھ استدعا کو موخر کر دیا۔ جیسے جیسے مقدمہ کی سماعت آگے بڑھی، صفائی کے بڑے وکیل مسٹر ایم ڈی اعوان کو چیف جسٹس نے اپنے چیمبر میں بلا کر دھمکی دی کہ "اپنے مستقبل کا خیال کرو" جب مسٹر اعوان نے میرے والد کی مناسب قانونی مدافعت پر مستقل مزاجی سے اصرار کیا تو چیف جسٹس نے مسٹر اعوان کے عدالت میں پیش کردہ دیگر مقدمات پر غیر موافق فیصلے دے کر انتقام لینا شروع کر دیا۔ مسٹر اعوان نے اپنے موکلین کو کوئی دوسرا وکیل پیش کرنے کا مشورہ دیا۔

میں عدالت میں موجود تھی جب مولوی مشتاق نے مسعود محمود کے ڈرائیور کے بیان کو مسخ کرنے کی کوشش کی تاکہ میرے والد اور ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر جنرل میں تعلقات کی کسی خاص نوعیت کو ثابت کیا جا سکے۔ "کیا یہ سچ ہے کہ تم مسعود محمود کو وزیر اعظم سے ملاقات کے لئے لے کر گئے؟" چیف جسٹس نے سوال کیا۔

"نہیں" خوف زدہ ڈرائیور نے جواب دیا۔

"لکھو" میں مسعود محمود کو وزیر اعظم سے ملاقات کے لئے لے کر گیا، مولوی مشتاق

نے عدالت کے سٹینو گرافر کو ہدایت کی۔

"اعتراض، جناب عالی" وکیل صفائی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مسترد کیا جاتا ہے" مولوی مشتاق نے اپنی دبیز سفید بھنویں سکیڑتے ہوئے جواب دیا۔ تب وہ گواہ کی طرف مڑا۔ "تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ تمہیں یاد نہیں لیکن ہو سکتا ہے تم محمود کو وزیر اعظم سے ملاقات کے لئے لے کر گئے ہو" اس نے کہا۔

"نہیں جناب، میں اسے کار میں لے کر نہیں گیا" ڈرائیور نے جواب دیا۔

"لکھو، مسعود محمود خود گاڑی چلا کر وزیر اعظم سے ملاقات کے لئے گیا" چیف جسٹس نے سٹینو گرافر کو ہدایت کی۔

"اعتراض" وکیل صفائی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جاؤ" مولوی مشتاق دہاڑا۔ وہ ڈرائیور کی طرف مڑا۔ "مسعود محمود خود گاڑی چلا کر وزیر اعظم سے ملاقات کے لئے جا سکتا تھا۔ کیا ایسا نہیں؟" ۔ اس نے پوچھا۔

"نہیں جناب" ڈرائیور نے لرزتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں؟" مولوی مشتاق چلایا۔

"کیوں کہ چابیاں میرے پاس تھیں" ڈرائیور نے لرزاں لہجے میں کہا۔

جان میتھیوز، انگلستان کا ایک قانون دان جو نومبر میں مقدمہ کی سماعت دیکھنے کے لئے آیا کارروائی سن کر شدید صدمہ سے دو چار ہوا۔ "خود مجھے بھی اس طریقہ کار پر تشویش تھی جس طرح گواہ کے ملزم کی حمایت میں جواب پر ججوں کی طرف سے فوری مداخلت ہوتی تاکہ جواب میں کمی بیشی کے بعد تبدیلی لائی جا سکے" ۔ اس نے بعد میں ایک انگریز صحافی کو بتایا۔ وکلائے صفائی کو مزید تشویش ہوتی تھی۔ سماعت کے اختتام پر کوئی ایک اعتراض جو کیا گیا یا شہادت میں تضادات کی نشان دہی کی گئی ۷۰۶ صفحات کی کارروائی میں شمہ بھر اس کا اشارہ نہیں ملتا۔

غیر جانبداری کا ذرہ بھر اہتمام بھی نہیں کیا گیا تھا۔ جب میں ایک صبح عدالت میں پہنچی تو ایف آئی اے کا ڈپٹی ڈائریکٹر عبدالخالق گواہوں کو سمجھا رہا تھا کہ انہوں نے شہادت کے

دوران کیا کہنا ہے۔ "یہ کس قسم کا انصاف ہے؟" میں نے بلند آواز میں احتجاج کیا۔ لوگ وہاں جمع ہونا شروع ہوگئے۔ "اس کو لے جاؤ" خالق نے پولیس اہلکاروں کو کہا کہ یہ استغاثہ کو پریشان کرنے کے لئے ایک ڈرامہ رچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ "اسے لے جاؤ" خالق دوسری مرتبہ چلایا۔ جیسے ہی پولیس نے میری طرف پیش قدمی کی راہداری سے آوازیں آنا شروع ہوئیں کہ میرے والد قید خانہ سے پہنچنے والے ہیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے والد مجھے اس حالت میں دیکھ کر متفکر ہوں کہ مجھے عدالت سے باہر دھکیلا جارہا ہے اس لئے میں اس ہنگامے سے خود ہی ہٹ گئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ استغاثہ نے گواہوں کو شہادت میں صیقل کرنے کے لئے عدالت کے نزدیک ایک کمرہ کرائے پر لیا جہاں پینے اور کھانے کا سامان بھی مہیا کیا گیا۔

ریمزے کلارک، ریاستہائے متحدہ امریکہ کے سابق اٹارنی جنرل میرے والد کے مقدمہ کی کارروائی سننے کے لئے امریکہ سے پاکستان آئے۔ بعد میں انہوں نے اخبار "دی نیشن" میں ایک مضمون لکھا۔ "استغاثہ کا کیس ان متعدد گواہوں پر مبنی ہے جنہیں اس وقت تک نظر بند رکھا گیا جب تک انہوں نے اقرار نہیں کر لیا، جنہوں نے اپنے اعترافات اور گواہی کو ہر مرتبہ دہرائے جانے پر تبدیل کیا اور اس میں اضافہ کیا، جو اپنی گواہی اور ایک دوسرے کی گواہی میں تضادات کا شکار تھے جو سوائے مسعود محمود کے (ایف ایس ایف کا ڈائریکٹر جنرل) وہی کچھ کہہ رہے تھے اور ایک گواہ کہتا جن کی شہادت سے واقعہ کے بارے میں چار مختلف نظریات معرض وجود میں آئے جن کی چشم دید گواہوں نے توثیق نہیں کی اور نہ ہی کسی براہ راست شہادت یا واقعاتی شہادت نے صاد کیا" انہوں نے لکھا۔

میں انصاف میں یقین رکھتی تھی۔ میں قوانین، اخلاقیات، حلفیہ بیانات اور عدالتی کارروائی میں یقین رکھتی تھی۔ لیکن میرے والد کے مقدمہ کے ڈھونگ میں کچھ بھی باقی نہیں تھا۔ وکیل صفائی نے فوج کی ایک لاگ بک دکھائی جس کے مطابق قصوری پر حملہ آور ہونے والی مبینہ جیپ متعلقہ روز لاہور ہی میں نہیں تھی۔ سفر کا یہ رجسٹر صحیح نہیں تھا۔ استغاثہ نے اعتراض کیا حالانکہ انہوں نے مقدمہ کے سلسلہ میں جو شہادتیں پیش کیں ان کاغذات

میں لاگ بک بھی شامل تھی۔ وکیل صفائی نے ایف ایس ایف کے سفری کاغذات پیش کئے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ غلام حسین ایک افسر جس نے اس قتل کی کوشش کو منظّم کیا اس روز کراچی میں کسی دوسرے فرض منصبی کی ادائیگی کے لئے موجود تھا۔ درحقیقت وہ کراچی میں حملہ سے دس روز قبل گیا تھا اور دس روز بعد تک وہیں موجود رہا کاغذات سے صاف عیاں تھا...... ان دستاویزات کو جھٹلایا گیا اگرچہ اس سے قبل کسی استغاثہ کے گواہ نے اس بات کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ اس قتل کے کیس کی جعل سازی کا ناقابل تردید ثبوت اس وقت سامنے آیا جب میرے والد کے وکلاء نے گولی چلنے کے متعلق ماہر اسلحہ کی رپورٹ کی کاپی حاصل کی۔ جن مقامات سے حملہ آوروں نے گولی چلانے کا دعوی کیا کار میں گولی لگنے کے سوراخوں سے ان کی مطابقت نہیں تھی۔ قاتلوں کی تعداد دو نہیں بلکہ چار تھی جو استغاثہ کے دعویٰ کے برعکس تھی۔ علاوہ ازیں ایف ایس ایف کی بندوقیں جنہیں مبینہ ملزموں نے قتل کی کوشش کرتے وقت استعمال کیا گولیوں کے ان خولوں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی تھیں جو مقام حادثہ سے برآمد ہوئے۔ "ہم نے کیس جیت لیا ہے" ریحانہ سرور جس کی ہمشیرہ میرے والد کے وکلاء میں شامل تھی نے پر مسرت لہجے میں عدالت ہی میں مجھے بتایا۔ چائے کے وقفہ کے دوران یہی بات میں اپنے والد کو بتانے کے لئے بھاگی۔ جب کہ دوسرے ملزمین جنھوں نے جرم کا اقرار کیا تھا اپنے اہل خاندان سے گپ شپ میں آزاد تھے میرے والد کو بھاری پولیس گارڈ کی حفاظت میں عقب کے ایک چھوٹے سے کمرے میں بند کر دیا جاتا تھا۔ "پاپا، ہم جیت گئے ہیں، ہم جیت گئے ہیں" میں نے انہیں ماہر اسلحہ کی رپورٹ کے بارے میں بتایا۔ میں ان کے چہرے سے مترشح پیار اور مہربانی کی اس نگاہ کو کبھی بھلا نہ سکوں گی جو انھوں نے میرے ولولہ انگیز لہجے کو سن کر اپنائی۔ "تم نہیں سمجھتی ہو پنکی، کیا سمجھتی ہو؟" انھوں نے آہستہ سے جواب دیا۔ "انھوں نے مجھے پھانسی دینا ہے ان کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ تم یا کوئی اور کیا شہادت لاتا ہے۔ وہ مجھے قتل کرنے کا بہرحال تہیہ کئے ہوئے ہیں خواہ میں نے قتل نہ بھی کیا ہو"۔

میں انہیں مبہوت ہو کر دیکھتی رہی مجھے ان کی بات کا یقین نہیں آرہا تھا اور نہ ہی میں

ایسی بات میں یقین کرنا چاہتی تھی۔ کمرے میں ہم سب لوگ بشمول وکلاء ان کی بات کا یقین نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ تو جانتے تھے وہ اس وقت سے ہی جانتے تھے جب ضیاء کے فوجی سپاہی کراچی آدھی رات کو انہیں لینے کے لئے آئے تھے۔ "بھاگ جاؤ" ان کی ہمشیرہ نے مفروضہ قتل کے الزام کے بارے میں افواہیں سن کر ان سے التجا کی تھی۔ بعض دوسرے احباب نے بھی ان کو ملک چھوڑ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ ان کا جواب تب بھی وہی تھا جو اب ہے "میری زندگی خدا کے ہاتھوں میں ہے کوئی دوسرا کچھ نہیں کر سکتا" انہوں نے مجھے جائے کے کمرے میں بتایا۔ میں اللہ تعالیٰ کے پاس جانے کے لئے تیار ہوں جب بھی وہ مجھے بلائے۔ میرا ضمیر صاف ہے۔ جو چیز میرے نزدیک اہم ہے وہ میرا نام ہے، میری عزت، اور تاریخ میں میرا مقام ہے۔ اور میں اس کے لئے ہر جنگ لڑنے کو تیار ہوں۔

میرے والد کا عقیدہ تھا کہ ایک آدمی کو قید کیا جا سکتا ہے لیکن خیال کو قید نہیں کیا جا سکتا۔ تم آدمی کو قتل کر سکتے ہو مگر سوچ کو نہیں۔ لیکن ضیاء کورچشم تھا اور لوگوں کو کوئی دوسرا پیغام دینے پر تلا ہوا تھا۔ اپنے وزیراعظم کی طرف دیکھو وہ ایک عام آدمی ہی کی طرح گوشت پوشت کا بنا ہوا ہے۔ اس کے اصول اسے کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں؟۔ اسے قتل کیا جا سکتا ہے جس طرح تمہیں قتل کیا جا سکتا ہے۔ دیکھو ہم تمہارے وزیراعظم کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔ تصور کرو ہم تمہارے ساتھ بھی کیا کرنے والے ہیں۔ میرے والد نے جو کچھ آئندہ ہونے والا تھا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن مجھے ان کے الفاظ دور سے آتے سنائی دیئے۔ اور میں نے انہیں فاصلے پر ہی رکھا۔ ورنہ میں ایک الزام کے بعد دوسرے الزام کی تکرار سے مایوس ہو کر بیٹھ جاتی اور لڑنے کا ارادہ ترک کر دیتی۔ ان کی عزت کی جنگ میری عزت کی جنگ بن گئی۔ کراچی میں میرے والد کی گرفتاری کے دوسرے دن ضیاء نے مارشل لاء حکم نمبر۲۱ جاری کیا۔ قومی اسمبلی کے تمام اراکین، سینیٹرز اور صوبائی حکومتوں کے تمام اراکین کو حکم دیا جاتا ہے کہ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۷ء تک (پاکستان پیپلز پارٹی کے عہد حکومت کے سال) کے اپنے سرمائے کے گوشوارے بشمول

تمام جائیدادوں، بیعناموں، اراضی، مشینری، زیورات، بیمہ پالیسیوں اور دفتری اخراجات کی کل تفاصیل فوجی حکومت کے حوالے کریں۔ بصورت دیگر سات سال کی قید بامشقت اور جائیداد کی قرقی کی سزا کے مستوجب ہوں گے۔ اگر فوجی حکومت نے فیصلہ کیا کہ جائیدادیں اور اثاثے سیاسی اثرورسوخ کے ذریعہ حاصل کئے گئے یا حکومت کی جائیداد کو غلط استعمال کیا گیا، مجرم افراد کو منتخب یا نامزد سیاسی آسامیوں پر تعیناتی سے نااہل قرار دیا جا سکے گا۔ آمرانہ طور پر کسی کو نااہل قرار دینے کے فیصلے پر عمل کرتے ہوئے مارشل لاء حکام نے ارکان پارلیمینٹ کو فوجی حکومت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لئے نئے قانون کو بیدردی سے استعمال کیا۔ نااہلی کے شکار ان اراکین کے لئے اپیل کا صرف ایک راستہ تھا کہ حکومت کے نامزد کردہ جس ٹریبونل نے ان کو نااہل قرار دیا تھا اسی کے سامنے درخواست دیں۔ البتہ جن لوگوں نے حکومت سے تعاون کیا انہیں معجزانہ طور پر دوبارہ اہل قرار دیدیا گیا۔ نااہل سیاستدانوں کی فہرست میں پہلا نام میری والدہ کا تھا حالانکہ وہ صرف تین ماہ کے لئے پارلیمینٹ کی رکن رہی تھیں۔ ٹریبونل کے سامنے ان کو کئی مرتبہ جانا پڑا اور حکومت کو ان کے خلاف الزام تراشنے میں بہت دقت پیش آئی۔ ان کی پیشی بار بار ملتوی کی گئی۔ لیکن موسم خزاں اور سرما ۱۹۷۷ء میں سب سے بڑا ہدف میرے والد تھے جن کی شہرت کو داغدار کرنے کے لئے ضیاء نے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا۔

"بھٹو نے پیپلز پارٹی کے لئے کارکنوں کے حکومت کے فنڈ خرچ کر کے بائیسکل اور موٹر سائیکل خریدے، مسٹر بھٹو نے سرکاری خرچ پر لاڑکانہ اور کراچی کے اپنے گھروں میں ائر کنڈیشنز لگائے، مسٹر بھٹو نے سفارت خانوں کے ذریعے سرکاری فنڈ خرچ کر کے باہر سے گھریلو استعمال کے لئے ڈنر سیٹ اور ملبوسات منگوائے" حکومت نے میرے والد کے خلاف بدعنوانی، پیسوں کا غبن اور مجرمانہ الزامات کے ڈھیر پر ڈھیر لگا دیئے یہ جانتے ہوئے کہ قید خانہ کی کوٹھڑی سے ان کے لئے ان الزامات کی تردید ممکن نہیں ہو گی۔ انہوں نے ان کے ذاتی سیکرٹری کو گرفتار کر کے مزید احتیاط کا ثبوت دیا۔ لیکن میرے والد ساٹھ سے زائد الزامات کا سامنا کرنے میں اپنے منظم فائل سسٹم کی وجہ سے ایک طاقتور مخالف ثابت

وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کے ۶۷ ویں یوم پیدائش پر گڑھی خدا بخش میں ان کے مزار پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہی ہیں

ہوئے۔ مجھے اپنے والد کے خلاف مبینہ الزامات کی تردید کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ کراچی میں ان کے کاغذات میں مل گئیں۔ شب و روز میں نے خاندان کے حسابات میں مغز ماری کی جن نقول کی وکلاء کو ضرورت تھی وہ انہیں بھیجتی رہی اور اگلے اقدامات کے لئے نئی ہدایات حاصل کرتی رہی۔ میرے والد نے ہر خرچ کا ریکارڈ رکھاہوا تھا۔ تھائی لینڈ میں ۱۹۷۳ء میں اپنے سفر کے دوران ۲۴ ڈالروں کے کپڑے کی خریداری کی رسید یا ۱۹۷۵ء میں اطالوی وال پیپر کی ۲۱۸ ڈالروں کی خرید کی رسید تک وہاں موجود تھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وزیراعظم کو بلاقیمت سرکاری میڈیکل مراعات کے باوجود انہوں نے اپنی مطالعہ کی عینکوں کی قیمت اپنی جیب سے ادا کی تھی۔ لیکن الزامات کی ہماری تردیدیں اخبارات کی زینت نہ بن سکیں اور صرف الزامات کا ہی تذکرہ ہوتا رہا۔ ہم نے تردیدوں کی اپنی نقل نویسی کی مشینوں پر نقول تیار کیں اور عوام الناس میں تقسیم کیں۔ ہم نے ایک پمفلٹ بھی تیار کیا جو بعد میں کتابی شکل میں نمودار ہوا اس کانام ''بھٹو، افواہ اور حقیقت'' رکھا اس میں اپنے والد کے خلاف افواہوں کا تفصیلی ذکر کرنے کے بعد حقیقت پر سے نقاب اٹھایا گیا تھا۔ پمفلٹ کو تیار کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ کسی قسم کی تحریر جو میرے والد کے حق میں لکھی جاتی اسے ''غداری'' سے موسوم کیا جاتا۔ طباعت اور تقسیم کنند گان کے لئے جیل کی سزا تھی اور تمام مواد بحق سرکار ضبط کر لیا جاتا۔ یہ تردیدیں پاکستانی اور غیر ملکی صحافیوں کے لئے مفید تھیں جنہیں میرے والد اور پی پی پی کے خلاف حکومت کے پروپیگنڈے کے طوفان کا سامنا ہوتا۔ لیکن ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ کرتے رہنا فائدہ مند ہوتا ہے۔

''ہمیں عوام الناس کو ہڑتال کے لئے، مظاہروں کے لئے، کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے کال دینی چاہئے'' میں نے پارٹی کے راہنماؤں کو اتھاہ مایوسی کے عالم میں کہا۔ یہ لوگ رات کے وقت ہمارے کرائے کے مکان میں خفیہ ملاقاتوں کے لئے آتے تھے۔ لیکن بزدلی کی وجہ سے انہوں نے لیت و لعل کی۔ ''کچھ بھی مت کرو، جب تک ہم پارٹی لائن طے نہ کر لیں'' وہ بار بار یہی کہتے رہے۔ میں خود اور دوسرے نوجوان ارکان بھی ان کی بے حسی دیکھ

کر بے صبرے ہو رہے تھے۔ "چلو مزاروں پر دعائیں مانگنے کے لئے چلتے ہیں" میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ حکومت جو اسلام، اسلام، اسلام کا نعرہ لگا کر ہر شخص کو اپنے اسلامی انداز سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہی ہے اولیاء اللہ کے مزاروں پر ہمیں دعائیں مانگنے پر گرفتار نہیں کر سکتی۔ اس خیال نے نوجوانوں کے دلوں میں جگہ بنالی۔ پی پی پی کے اراکین مسجدوں اور مزاروں پر قرآن خوانی اور میرے والد کی رہائی کی دعاؤں کے لئے ملک بھر میں اکٹھا ہونا شروع ہو گئے لیکن میں غلطی پر تھی حکومت مزاروں پر بھی تشدد سے باز نہیں آئی۔ گرفتاریاں اور کوڑے زنی جاری رہی۔ دسمبر تک ۷۰۰ کے قریب ارکان گرفتار کر لئے گئے۔ لاڑکانہ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر خالد احمد کے کیس سے ہی اس بات کا اظہار ہو جاتا ہے کہ حکومت نے مسعود محمود اور بغاوت کے بعد گرفتار کئے گئے سرکاری ملازمین سے جو سلوک کیا اس نے ان لوگوں کو میرے والد کے خلاف جھوٹی گواہی دینے کے لئے کیسے مجبور کیا ہو گا۔

دو فوجی جوان ضیاء کا تحریری حکم لے کر لاہور میں خالد احمد کھرل کے گھر آئے اور اسے ساتھ لے گئے "اگر میں کل تک تمہیں ٹیلی فون نہیں کرتا، تو سمجھ جانا کہ معاملہ سنگین ہے" اس نے اپنی بیگم کو جاتے جاتے کہا اگلے کئی روز تک کوئی ٹیلی فون نہیں آیا جب آخر کار ایک ماہ بعد اسے پتہ چلا تو وہ اسلام آباد کے ایک قید خانے میں تھا اس کی بیوی بیگم عذرا نے مجھے بتایا اگر میں اپنے خاوند کا پتہ لگانے میں کامیاب نہ ہوتی تو شاید بہتر ہوتا۔ "میں اس دن کو بھول نہیں سکتی، اس کا چہرہ زرد تھا ہونٹ خشک تھے اور پھٹے ہوئے بھی اس کے منہ کے گرد سفید تھوک کی لیپ کی ہوئی تھی اس کے نازک حصوں پر بجلی کے جھٹکے دیئے گئے تھے وہ چاہتے تھے کہ خالد احمد عدالت میں مسٹر بھٹو کے خلاف شہادت دے۔"

خالد کو پانچ مہینے قید تنہائی میں رکھا گیا عذرا ہر شام ایک پبلک باغ میں جاتی جہاں سے قید خانہ کے چھت پر نظر پڑ سکتی تھی۔ اسے دن میں آدھ گھنٹے کیلئے ورزش کی اجازت تھی۔ "اس نے بتایا "میں ایک بنچ پر گھنٹوں بیٹھی رہتی کہ اس کی ایک جھلک ہی دیکھ سکوں تاکہ مجھے یقین ہو کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔"

خالد احمد اور متعدد دوسرے قیدیوں کی زندگی میری والدہ کی سپریم کورٹ میں اس درخواست کی وجہ سے بچ گئی جو انہوں نے میرے والد کی پہلی گرفتاری کے بعد پیش کی جس میں میرے والد کے نظر بندی کے سلسلہ میں مارشل لاء کی قانونی حیثیت کو چیلنج کیا گیا تھا۔ نومبر ۱۹۷۷ء میں سپریم کورٹ نے مارشل لاء کو نظریہ ضرورت کے تحت جائز قرار دیا اور قرآنی قانون سے استنباط کیا جس میں ایک مسلمان کو زندہ رہنے کیلئے کسی اور خوراک کی عدم دستیابی کی صورت میں خنزیر کا گوشت کھانے کی بھی اجازت دی گئی تھی۔ لیکن عدالت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ مارشل لاء ایک محدود عرصہ کیلئے جائز ہے اور حکومت کے لئے نو ماہ کا عرصہ آزاد اور منصفانہ انتخابات کے انعقاد کیلئے ضروری قرار دیا۔

ججوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اعلیٰ سول عدالتوں کو فوجی عدالتوں کے فیصلوں پر نظرثانی کا قانونی اختیار حاصل ہے۔ سول عدالتوں کی نظرثانی کی اس شق کے بغیر، ہزاروں لوگوں کو جن میں سیاسی کارکن بھی شامل تھے، اپنی نظر بندی کے خلاف اپیل کا حق نہ ملتا۔ اگرچہ اپیلیں جن میں میری اپیل بھی نظر بندی کے خلاف شامل تھی ایک طویل مدت کے بعد عدالتوں تک پہنچیں تاہم اطمینان کی کم از کم ایک صورت عدالتوں کے ذریعے حاصل ہو سکتی تھی۔

عدالت عالیہ نے خالد احمد کو دسمبر ۱۹۷۷ء میں رہا کر دیا کیونکہ اس کے خلاف ثبوت کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا اور گرفتاری کے حکم کا بھی جواز نہیں تھا۔

"ہمیں اوپر سے احکام ملے تھے" فوجی افسروں کا بیان تھا لیکن جس طرح حکومت نے ہر عدالت کے فیصلہ کو نظرانداز کر کے میرے والد کو دوبارہ گرفتار کر لیا تھا۔ اسی طرح انہوں نے خالد احمد کے ساتھ بھی کیا۔ اس کی رہائی کے ایک ہفتہ بعد سابق کمشنر کو اس کے ایک دوست نے متنبہ کیا کہ سرکاری کار اور ایئرکنڈیشنر کے ناجائز استعمال کی بنا پر مارشل لاء حکم نمبر ۲۱ کے ماتحت اسے دوبارہ گرفتار کر لیا جائے گا۔ ایئرکنڈیشنر! "میں نے اس سے ملک چھوڑنے کی التجا کی" عذرا نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔ اس کا خاوند اسی شب لندن چلا گیا۔ اس کے خلاف متعدد مقدمات، درج کئے گئے جن کے باعث وہ ابھی تک

ملک سے باہر ہے۔ عذرا نے اپنے دونوں بچوں کی پرورش اکیلے ہی سرانجام دی ہے اس خاندان اور دوسرے خاندانوں پر جبرواذیت کا سلسلہ دسمبر ۱۹۷۷ء میں شروع ہوا اور دو ہفتے بعد اس میں تیزی سے اضافہ ہو گیا۔

آنسو گیس چیخیں، لوگوں میں افراتفری، میرے کندھے میں شدید چبھتا ہوا درد "ممی! آپ کہاں ہیں؟ کیا آپ ٹھیک ہیں ممی؟"

۱۶ر دسمبر ۱۹۷۷ء ہندوستان میں فوجی شکست کی برسی کا دن۔

قذافی سٹیڈیم لاہور میری والدہ اور میں نے مقدمہ کے سر درد سے ذہنی افاقہ کے لئے کرکٹ میچ دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے پاس خواتین انکلوژر کے ٹکٹ تھے لیکن جب ہم پہنچیں تو ہر دروازہ مقفل پایا۔ ہم ایک انکلوژر میں جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا، داخل ہو گئیں جیسے ہی ناظرین کی نظر ہم پر پڑی وہ تالیوں اور نعروں کے ساتھ استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے لیکن کرکٹ کے کھلاڑی اچانک گراؤنڈ سے باہر دوڑ پڑتے ہیں۔ پولیس کے سپاہیوں کا ٹولہ ایک دم وہاں نمودار ہوتا ہے۔

ووش کی آواز۔ کوئی چیز میرے چہرے کے پاس سے گڑگڑاتی گزرتی ہے۔ "آنسو گیس، آنسو گیس" میں لوگوں کی چیخوں کی آوازیں سنتی ہوں۔ لوگ گھبراہٹ میں مقفل دروازوں کی طرف دوڑتے ہیں۔ میرے لئے سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ دکھائی دینا بند ہو جاتا ہے۔ ہماری طرف پھینکے گئے زہریلے بادلوں میں میرا دم گھٹنا شروع ہو جاتا ہے کیا پھیپھڑوں میں آگ لگ سکتی ہے؟ اف میرا کندھا! میں تقریباً گر پڑتی ہوں میرے اردگرد تاریکی میں پولیس لوگوں کو ڈنڈوں سے ڈھیر کر رہی ہے۔

"ممی!" میں بلند آواز سے پکارتی ہوں "ممی"؟

"میں انہیں لوہے کی سلاخوں پر جھکا ہوا دیکھتی ہوں میری آواز سن کر وہ سر اوپر اٹھاتی ہیں۔ ان کے سر کے پھٹنے سے خون ندی کی طرح بہہ رہا ہے۔

"ہسپتال!" "ہمیں اپنی والدہ کو فوراً ہسپتال لے جانا ہے" میں چیخ کر پکارتی ہوں۔

"نہیں" میری والدہ خاموشی سے کہتی ہیں۔ "ہم پہلے مارشل لاء کے ناظم کو ملنے جائیں

گے" خون ان کے چہرے پر اور پھر لباس پر دھار بن کر گر رہا ہے۔ ہم ہجوم میں سے راستہ بناتے ہیں اور ایک کار مل جاتی ہے۔ ہمیں مارشل لاء کے ناظم کے گھر تک لیجاؤ۔ وہ کہتی ہیں۔ دروازے کے محافظ ہمیں دیکھ کر دکھ محسوس کرتے ہیں اور ہمیں اندر جانے دیتے ہیں جیسے ہی میری والدہ کار سے باہر اترتی ہیں جنرل کی جیپ بھی ہمارے پیچھے پہنچ جاتی ہے۔

"جنرل! آج کا دن یاد رکھو" اقبال (جسے ضیاء نے پنجاب کا مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر مقرر کیا تھا) کا سامنا کرتے ہی کہتی ہیں۔ "آج کے دن ڈھاکہ میں تم نے ہندوستانی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے اور آج میرا خون بہا کر تم نے دوبارہ شرمندگی اٹھائی ہے تم جنرل عزت کا لفظ جانتے ہی نہیں ہو صرف بے عزتی کا لفظ جانتے ہو۔"

وہ انہیں بھونچکا ہو کر دیکھتا ہے۔ بڑے وقار کے ساتھ میری والدہ مڑتی ہیں اور گاڑی میں دوبارہ بیٹھ جاتی ہیں ہم سیدھے ہسپتال جاتے ہیں جہاں زخم بند کرنے کیلئے ۱۲ ٹانکے لگائے جاتے ہیں۔

اسی دوپہر مجھے گھر سے گرفتار کیا جاتا ہے جب کہ والدہ کو ہسپتال سے گرفتار کیا گیا۔

اگلے روز ضیاء ٹیلیویژن پر پنجاب انتظامیہ کو اس سانحے میں نظم وضبط کے بہترین قیام پر مبارکباد پیش کرتا ہے اور میرے والد نے اس سانحہ کی تفصیل معلوم کرنے کے بعد "لعنت ہے" کے الفاظ بولے تو انہیں عدالت کے کمرے سے نکال دیا گیا۔

"اسے پرے ہٹالو جب تک ہوش میں نہیں آتا" چیف جسٹس کہتا ہے۔ اگلے روز میرے والد غلط سماعت مقدمہ پر درخواست گزارتے ہیں۔ درخواست رد کر دی جاتی ہے۔

لاہور کے بے آراستہ گھر میں مقید اور والدہ ہسپتال میں گرفتار...... میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا ضیاء ہمارے جذبات کو کچلنے کیلئے کسی بھی حد تک جاسکتا ہے۔ مجھے اب کوئی شک نہیں تھا کہ کرکٹ گراؤنڈ میں ہم پر حملہ پہلے سے سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا گیا پولیس نے دروازوں کو مقفل ہی اس لئے کیا تھا تاکہ ہم ایک کھلے دروازے سے اندر داخل ہوں تو

بانس کے ڈنڈوں اور آنسو گیس کی بارش میں پھنسا دیئے جائیں اس کے نتائج کثیر تھے۔ خواتین کو اس سے قبل پریشان کرنے اور سزا دینے میں الگ نہیں کیا گیا تھا۔ ہم ایسے دور میں داخل ہو رہے تھے جس کا تجربہ اس سے قبل پاکستان میں کبھی نہیں کیا گیا تھا۔ نقل نویسی کی مشینوں اور ٹائپ رائٹروں کے درمیان گھرے ہوے لاہور کے گھر میں اس قید تنہائی سے زیادہ تاریک کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

ایک ہفتہ کے دوران میری والدہ نظر بندی کے ایام کاٹنے کے لئے مجھ سے آملیں ان کا سر ٹانکوں سے جڑا ہوا تھا۔ ہمیں بے یقینی کے عالم میں کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ کیا یہی کچھ ہو رہا ہے جو ہمیں نظر آ رہا ہے؟ ہمارے ذہن اس کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھے۔ اور اسی چیز نے میرا یقین ہے ہمیں ابھی تک سنبھالا ہوا تھا۔ ہر نیا ظلم صدمہ تو لاتا ہے مگر ایک نیا ولولہ اور عزم بھی غصے کی حالت نے مجھے سرکشی اور قوت ارادی بخشی...... وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں بے وقار کر سکتے ہیں تو وہ اپنی سعی کریں اور آزمالیں اس وقت یہ میری سوچ تھی۔

پاکستان میں واپسی پر میرا پہلا سال نظر بندی میں گزرا۔ اس سے ایک سال قبل جب میں اکسفورڈ سے پاکستان آئی تھی اور المرتضیٰ میں اپنے گھر ٹھہری تھی تو اپنے والد کی سالگرہ کے دن ضیاء کو ملی تھی اب میرے والد سالگرہ جیل میں منا رہے تھے۔ میری والدہ اور میں نے پندرہ روزہ نظر بندی کے ہر دن کی پڑتال کی۔ والدہ نے یہ سارا وقت تاش کھیل کھیل کر گزارا یا وقتاً فوقتاً ٹیلیویژن دیکھ کر۔

میری والد صاحب سے مقرر کردہ ملاقات آئی اور گزر گئی اور مجھے بہت غمگین کر گئی...... میں ان سے مل کر ہمیشہ ہی خوش ہوتی تھی اور ان ہدایات پر عمل کرتی جو وہ اپنی کوٹھڑی میں جمع کردہ زرد رنگ کے وکالت کے کاغذوں پر میرے لئے تحریر کر کے رکھتے تھے۔ مجھے کوٹھڑی کے گندے فرش اور بہتے ہوئے پانی کے سبب وہ جگہ ناقابل رہائش محسوس ہوئی مجھے مطلق علم نہیں تھا کہ اس سے بھی بدتر رہائش گاہیں ان کے مقدر میں لکھی گئی ہیں۔

حکام نے میرے والد کو ذہنی مریض قیدیوں کے نزدیک ہی رہائش گاہ مہیا کی اور وہ تمام رات شور و غل مچاتے رہتے۔ انہوں نے اس بات کو بھی یقینی بنایا کہ وہ دوسرے سیاسی قیدیوں کو سامنے صحن میں کوڑے لگائے جاتے دیکھ سکیں۔ بعض اوقات ان کے منہ میں مائیکروفون بھی ٹھونس دیئے جاتے لیکن حکومت ان کے عزم و جذبہ کو توڑ نہ سکی۔ ''میرا حوصلہ بلند ہے۔'' میرے والد نے جیل خانے کی ایک ملاقات میں مجھے یقین دلایا۔ ''میں لکڑی کا بنا ہوا نہیں ہوں جو جلد جل جاتی ہے۔''

تاہم غم و غصہ کی بھیانک آگ قید خانے سے باہر جل رہی تھی اوائل ماہ جنوری ۱۹۷۸ء میں حکومت نے لوگوں کا پہلا قتل عام کیا۔ میری والدہ اور میری گرفتاری سے قبل پی پی پی نے میرے والد کے یوم پیدائش ۵ر جنوری کو یوم جمہوریت کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا۔ کالونی ٹیکسٹائل مل۔ ملتان میں محنت کش مزدوروں نے جن کو ماضی میں بونس ملتے تھے اور اب صنعت کار مالکوں نے بند کر دیئے تھے اپنے مطالبات منوانے کیلئے ہڑتال کر رکھی تھی اب اس دن مظاہرہ کرنے کا پروگرام بنایا ان کو اس بات کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔

یوم جمہوریت سے تین روز قبل فوجی جوانوں نے مل کے دروازے مقفل کر دیئے خود چھت پر چڑھ گئے اور نیچے پھنسے ہوئے مزدوروں پر گولی چلا دی...... یہ بدترین قسم کا قتل عام تھا جو برصغیر میں کبھی وجود پذیر نہیں ہوا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ایک صد مزدور قتل ہوئے۔ کوئی شخص بھی صحیح تعداد نہیں جانتا۔ بعض دو صد کہتے ہیں اور بعض تین صد...... مردہ اجسام کافی دنوں تک کھیتوں میں اور گڑھوں میں ملتے رہے۔ ضیاء نے محنت کشوں کو جو پی پی پی کی حمایت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے متنبہ کیا۔ ''جھک جاؤ یا قتل ہو جاؤ۔''

یوم جمہوریت ظلم کا بدترین دن ثابت ہوا۔ پی پی پی کے ہزاروں حامیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ پورے ملک میں ستم کشی کے زخم مزید گہرے ہو گئے۔

ہر شخص جس نے ''بھٹو زندہ باد'' کا نعرہ لگایا اسے کوڑے فوراً لگائے گئے اکثر سزا کے ایک گھنٹے کے اندر اندر...... کیونکہ سول عدالتیں اب بھی اپیلیں سماعت کرنے کی مجاز تھیں...... کوٹ لکھپت جیل میں قیدیوں کی ٹانگیں اور بازو پھیلا کر چمڑے کی پیٹیوں سے ٹکٹکیوں پر باندھا گیا۔ ڈاکٹروں کو مظلوم ملزموں کی نبضیں چیک کرنے کیلئے پاس ہی کھڑا کیا گیا تاکہ

موت واقع ہونے سے قبل ہی تاز یانے لگانا بند کر دیا جائے۔ اکثر اوقات ملزموں کو نمک سنگھا کر ہوش میں لایا جاتا تاکہ متعینہ تعداد کا بقیہ کوٹا جو عام طور پر دس سے پندرہ کوڑے تھا پورا کیا جاسکے۔

جیل سے باہر بر سر عام کوڑے لگانے کا سلسلہ مزید بڑھ گیا۔ متحرک فوجی عدالتوں کی طرف سے فوری فیصلے اور فوری سزائیں مارشل لاء کا ایک افسر دیتا جو بازاروں میں گشت کرتا اور یہ فیصلہ دیتا کہ سوداگر اوزان میں دھوکہ دہی کے مرتکب تھے۔ قیمت زیادہ مانگ رہے تھے یا غیر معیاری مال بیچ رہے تھے۔ سکھر میں ایک فوجی افسر نے مطالبہ کیا کہ کوئی بھی آدمی ان کے حوالے کر دیا جائے۔ "ہمیں کسی نہ کسی کو کوڑے لگانا ہیں۔" دکانداروں کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا کریں۔ آخر کار وہ افسر کو ایسے دکاندار کے پاس لے گئے۔ جو چینی بلیک مارکیٹ میں فروخت کر رہا تھا۔ اگرچہ بازار کا ہر دکاندار اس جرم کا ارتکاب کر رہا تھا مگر اس آدمی کو فوری طور پر اور بر سرعام کوڑے مار دیئے گئے۔ زندگی بھر مجھے اس ظلم و بربریت کا سامنا کرنے کی کوئی تربیت نہیں دی گئی تھی۔ معاشرے کا تمام تانا بانا جسے میں نے امریکہ اور انگلستان میں دیکھا اور ۱۹۷۳ء کے پاکستانی آئین کے تحت ملک بھر میں آزمایا گیا پوری طرح بکھر رہا تھا۔

جس روز ہماری نظر بندی ختم ہوئی جیل کے دروازے کھول دیئے گئے تاکہ مجسٹریٹ اندر آسکے نہ کہ ہم باہر جاسکیں اس کی بجائے اس نے مزید پندرہ روزہ نظر بندی کے نئے احکام ہمارے حوالے کئے۔ ایک اور قانونی ضابطے کے پرزے اڑا دیئے گئے۔ میرے والد کی سول حکومت کے زمانہ میں نظر بندی کے احکامات کا دائرہ اختیار بہت کم کر دیا گیا تھا...... کسی کو مجموعی طور پر تین ماہ کے لئے ایک سال کے عرصہ میں بیک مشت یا بالترتیب نظر بند نہیں کیا جاسکتا تھا۔ عدالتیں ۲۴ گھنٹوں کے اندر اندر درخواستوں کی سماعت کرتی تھیں۔ اب ایک نئی اور ہولناک تاریخ پاکستان میں رقم کی جارہی تھی۔

نظر بند کر دیا، شہر بدر کر دیا، نظر بند کر دیا

میرے والد کی سماعت مقدمہ کے دوران حکومت نے میری والدہ اور مجھے اپنے آمرانہ

اختیارات استعمال کرتے ہوئے اتنی مرتبہ رہا کرنے اور دوبارہ گرفتار کرنے کے احکامات جاری کئے کہ ہمارے لئے زندگی میں کسی نظم وضبط کو قائم رکھنا ناممکن ہو گیا۔ ۱۹۷۸ء کے ابتدائی چند مہینوں میں مجھے اتنی مرتبہ نظر بند اور محدود کیا گیا کہ حکومت کو خود بھی پتہ نہیں ہوتا تھا کہ میں آ رہی ہوں کہ جا رہی ہوں۔

ماہ جنوری کے وسط میں، میری والدہ کو اور مجھے لاہور میں نظر بندی سے رہا کر دیا گیا میں فوراً کراچی پرواز کر گئی کیونکہ انکم ٹیکس حکام نے مجھے پیش ہونے کیلئے کہا تھا۔ الزام ؟ الزام ؟ اپنے دادا کے اثاثوں اور ادائیگیوں کی فہرست پیش کروں وہ دادا جو میری چار سالہ عمر میں فوت ہو چکے تھے۔ میں نہ تو ان کی وارث تھی اور نہ کسی طور سول یا فوجی قانون کے مطابق اپنے دادا سے متعلق سوالات کا جواب دینے کی پابند تھی۔ لیکن حکام کو اس بات سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ جواب دینے میں ناکامی پر اطلاع نامہ کا اصرار تھا، میرے خلاف یک طرفہ فیصلہ ہو جائے گا۔ میں ۷۰ کلفٹن میں نصف شب کے قریب پہنچ گئی۔

"کھٹ کھٹ کی آواز" میں دو بجے شب اپنے بستر پر اٹھ بیٹھی۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے گھبراہٹ میں پکارا کیونکہ چار ماہ قبل کمانڈوز نے جو دھما چوکڑی میرے کمرے میں مچائی تھی اس وقت سے گھبراہٹ نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ "پولیس نے گھر کو محصور کر لیا ہے" دوست محمد نے مجھے بتایا میں نے لباس پہنا اور سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی۔ "ہم نے تمہیں ۷ بجے صبح کی پرواز سے لاہور جانے کیلئے بندوبست کر لیا ہے۔ تمہیں سندھ سے صوبہ بدر کر دیا گیا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے استفسار کیا۔ "میں تو اپنے خلاف تمہاری حکومت کے تراشیدہ الزامات کا جواب دینے کیلئے یہاں پہنچی ہوں۔"

"جنرل ضیاء نے وزیراعظم برطانیہ کو کرکٹ میچ دکھانے کا پروگرام بنایا ہے۔" افسر نے مجھے بتایا۔

مجھے یک دم چپ لگ گئی۔ "اس چیز کا میرے ساتھ کیا واسطہ ہے؟" میں نے سوال کیا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہاں کرکٹ میچ ہونے والا ہے۔"

چیف مارشل لاء کے ایڈ منسٹریٹر کسی ہنگامے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔
"ہو سکتا ہے تم میچ دیکھنے کا فیصلہ کر لو اس لئے انہوں نے تمہاری صوبہ بدری کا فیصلہ کیا ہے۔" افسر نے بتایا۔ پولیس کی حفاظت میں ٦ بجے صبح مجھے ایئرپورٹ لیجایا گیا اور لاہور کے طیارہ پر سوار کر دیا گیا۔ مجھے ایک دن کے لئے کراچی ہی میں پابند کیوں نہ کر دیا گیا؟

دو روز بعد میں لاہور میں اپنے دوستوں کے ساتھ ٹھہرانے پر شامل تھی جب پولیس نے گھر کو محصور کر لیا۔ "تمہیں پانچ روز کے لئے نظر بند کیا جاتا ہے۔"

گرفتار کنندہ افسر نے مجھے بتایا "کیوں؟" میں نے دوبارہ پوچھا "داتا صاحبؒ کا سالانہ عرس ہے" افسر نے کہا اور یہ میں بھی جانتی تھی۔ داتا صاحبؒ ہمارے مقدس ترین اولیاء اللہ میں سے ایک ہیں۔ "اگر چاہو تو تم بھی مزار پر جا سکتی ہو۔"

مجھے اپنی والدہ کے ساتھ نظر بند کر دیا گیا وہ تاش کھیلتی رہتیں اور میں فرشوں پر قدم ناپتی رہتی۔ ہماری ڈاک بند کر دی گئی۔ ہمارا ٹیلیفون کاٹ دیا گیا جب اوائل فروری میں باہر آئی تو میں فوراً اپنے والد سے ملنے کے لئے آئی...... اپنی نظر بندی کے باعث میں تین مرتبہ ضروری ملاقاتیں نہ کر سکی۔ لیکن میں کسی عدالتی کارروائی سے غیر حاضر نہیں رہی۔

اگرچہ چیف جسٹس نے عالمی پریس کو یقین دلایا تھا کہ مقدمہ کی سماعت سب کے سامنے ہو گی۔ عدالت کا کمرہ ٢٥ر جنوری کو تمام حاضرین کیلئے بند کر دیا گیا، جب میرے والد نے اپنی شہادت شروع کی۔ استغاثہ کی شہادت سننے کیلئے پوری دنیا کو مدعو کیا گیا مگر صفائی کی شہادت سننے کیلئے قدغن لگا دی گئی۔ عدالت کے جانبدارانہ رویئے کے باعث میرے والد نے اپنے وکلاء واپس بلا لئے تھے۔ اب انہوں نے شہادت دینے سے مطلقاً انکار کر دیا۔
وہ خاموشی سے عدالتی کارروائی سنتے رہتے پنجاب کے چیف جسٹس نے بند کمرے کی کارروائی سے یہ فائدہ اٹھایا کہ سندھیوں کے خلاف اپنے تعصب کا کھلم کھلا اظہار کرنا شروع کر دیا۔
میرے والد پاکستان کے جنوبی صوبہ سندھ سے تعلق رکھتے تھے۔ میرے والد اور پی پی پی ہائی کمانڈ دونوں نے اس عدالتی تعصب کی وجہ سے دوبارہ مقدمہ کی سماعت کا مطالبہ کیا مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

جب کہ میں مقدمہ کی تیاری میں معاون تھی، میری والدہ پنجاب کے مختلف شہروں کا دورہ کرتی رہیں، قصور بھی ان میں شامل تھا۔ جہاں مسلمان بزرگ بابا بلھے شاہؒ کا مزار ہے۔ "میری خواہش ہے تم سندھ میں جاؤ" میرے والد نے کوٹ لکھپت جیل میں مجھے بتایا۔ "تم اور تمہاری والدہ سارا وقت پنجاب میں رہی ہو۔ پی پی پی کے کارکنوں کو کہو کہ تمہارے سندھ کے دورے کا پروگرام وضع کریں۔"

مجھے اندیشوں نے گھیرے رکھا جب میں کراچی سے لاڑکانہ اس بہانے جانا چاہتی تھی کہ اپنے اجداد کی قبور پر دعائیں کرونگی۔ والدہ نے کراچی میں مجھے تحریر بھیجی اور تنبیہ کی کہ "ضیاء کی مذمت نہ کرو اور نہ ہی اس پر تنقید مگر مسائل کا ذکر کرو خاص طور پر مہنگائی کا۔ پارٹی کا جھنڈا بلند رکھنے اور پارٹی کی تنظیم کو چلانے کیلئے وہیں رہو۔" انہوں نے لاہور سے مجھے خط لکھا اور اس سے پہلے خفیہ طور پر کپڑے کے ایک کارخانے کے محنت کشوں کے اہل خاندان کو ان کے قتل عام کے بعد تشفی دینے کیلئے ملتان گئیں۔ انہوں نے مجھے ان خاندانوں کے نام بھجوائے تاکہ میں وہاں جاؤں اور جن کے افراد قید میں ڈالے گئے ہیں، ان کے گھروں میں بچوں کی تعداد کے مطابق کچھ رقم بھی تقسیم کروں۔ "اگر گھر کا کمانے والا شخص ایک ہی ہے تو ان کے پتے بھی لکھنا تھے تاکہ قید سے رہائی تک ان کے خاندانوں کو کچھ رقم ہر ماہ ملتی رہے۔ "تم مرسیڈیز گاڑی کا استعمال کرو کیونکہ یہ مضبوط ہے قابل اعتماد ہے اور جلد رفتار پکڑتی ہے۔ پیار کے ساتھ، تمہاری والدہ" روزنامہ مساوات نے میرے سفر کا اعلان کیا اور ان تمام شہروں کا جو راستے میں پڑتے تھے۔ ۱۴ر فروری کو میں سندھ میں اپنے پہلے دورے پر روانہ ہوئی۔ مساوات سے ایک تقریر لکھنے والا، ایک رپورٹر اور ایک فوٹو گرافر ساتھ لیتی گئی۔ پی پی پی سندھ کی خواتین ونگ کی سربراہ بیگم سومرو میری سرپرست کے طور پر میرے ساتھ تھیں۔

ٹھٹھہ جہاں سکندر اعظم نے اپنے جوانوں کو ستانے کیلئے کچھ وقت دیا۔

حیدر آباد جہاں چھتوں پر قدیم طرز کے ٹھنڈی سمندری ہواؤں کی آمد کے لئے جھروکے رکھے ہوئے ہیں تاکہ کمرے ٹھنڈے رہیں۔ سارا راستہ بڑے بڑے ہجوموں نے ہماری کار

کا استقبال کیا...... ضیاء نے عوامی سیاسی جلسوں پر پابندی لگا دی تھی۔ اس لئے ہم نے بڑے گھروں کی چار دیواری کے اندر صحنوں میں اجتماعات سے خطاب کیا۔ یکے بعد دیگرے گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر نیچے صحنوں میں لوگوں کو مچھلیوں کی طرح جھمگٹا کئے ہوئے دیکھا۔

"میرے بھائیو اور معزز بزرگو! میں نے اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر بلند آواز میں پکارا کیونکہ حکومت نے مائیکروفون اور لاؤڈ سپیکر کے استعمال کو بھی ممنوع قرار دیا تھا۔ "میں آپ کیلئے چیئرمین بھٹو کا سلام لائی ہوں۔"

تھرپارکر اور سانگھڑ:۔

جب بھی ممکن ہوا میں نے بار ایسوسی ایشنوں اور بار کلبوں میں بھی خطاب کیا اور ہر جگہ غیر آئینی حکومت اور اپنے والد اور پی پی پی اراکین کے خلاف ناروا سلوک پر احتجاج کیا۔

سانگھڑ چھوڑنے پر فوجی ٹرکوں نے میری کار کو آگے پیچھے سے لوگوں کو بھگا کر الگ کر دیا ہمیں سنگین کی نوک پر ایک گھر میں لے گئے۔ "تم اپنا سفر جاری نہیں رکھو گی" ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ہمیں بتایا۔

" تمہارے پاس احکامات ہیں؟" میں نے پوچھا "میں وہ تحریر خود دیکھنا چاہتی ہوں۔"

اس کے پاس کوئی احکامات نہیں تھے۔

"حکومت نے ہمیں صرف خوفزدہ کرنے کیلئے اسے بھیجا تھا" مخدوم خلیق جو پی پی پی کے ایک راہنما تھے اور ہمارے ساتھ ہم سفر تھے نے کہا۔ "آؤ ہم آگے چلیں"

اگلے روز ہم نواب شاہ کے لئے روانہ ہو گئے جہاں سب سے بڑا اجتماع اکٹھا ہوا لیکن جونہی ہم خیرپور۔ نواب شاہ سرحد پر پہنچے، قانون کے محافظوں نے ہمارا راستہ روکا ہوا تھا۔ اس مرتبہ ایسا کرنے کے احکام بھی وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

۱۸ر فروری کو مجھے نواب شاہ سے شہر بدر کر کے کراچی بھیج دیا گیا...... شہر چھوڑ کر کہیں نہ

جانے پر پابندی لگادی۔ پر میری والد کے ساتھ پندرہ روزہ متعین ملاقات بھی نہ ہو سکی۔

مارچ ۱۹۷۸ء "مجھے ضیاء کے قریبی حلقوں سے پتہ چلا ہے کہ لاہور ہائی کورٹ بھٹو صاحب کو موت کی سزا دے گی۔" کراچی کے ایک صحافی نے مجھے بتایا۔

اگرچہ مجھے خود اس خبر پر یقین کرنے میں تامل تھا۔ میں نے غم زدگی کے عالم میں اپنی والدہ کو لاہور میں اور سندھ اور کراچی کے پی پی پی کے سربراہوں کو بتا دیا اس خبر کی علامات ہر جگہ نظر آ رہی تھیں۔

تین مجرموں کو جو سیاسی قیدی نہیں تھے لاہور میں مارچ میں سرعام پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ سرعام پھانسی! اخبارات اور ٹیلیویژن نے اس خبر کو بہت اچھالا۔ پھانسیاں ایک کھلے میدان میں دی جانی تھیں اور ان کی تشہیر ایسے کی گئی جیسے کسی ڈرامے کی افتتاحی تقریب ہو...... دو لاکھ انسان اس بھیانک منظر کا نظارہ کرنے کیلئے جمع تھے اور سیاہ ٹوپ سروں پر چڑھائے دو لاشیں پھانسی کے پھندے سے لٹک رہی تھیں۔ میں اب یہ بات سمجھی ہوں کہ حکومت میرے والد کی سزائے موت کیلئے عوام الناس کو نفسیاتی طور پر تیار کر رہی تھی۔ لیکن اس وقت میں اسے بدترین نشانی سے زیادہ نہیں سمجھی۔ مجھے ایک سال قبل کی اصغر خان کی انتخابی مہم میں تقریریں یاد آئیں جن میں اس نے کہا تھا "کیا میں بھٹو کو اٹک کے پل پر پھانسی دوں یا کسی کھمبے سے لٹکاؤں؟۔"

عدالتی فیصلے پر ردعمل میں اضافہ ہو رہا تھا۔ فوجی سپاہیوں کو سفید کپڑوں میں حکومت کی تمام عمارتوں اور بینکوں پر متعین کر دیا گیا۔ راولپنڈی میں بکتر بند گاڑیوں میں فوجی جوانوں کی گشت شروع ہو گئی۔ سندھ میں مشین گنوں سے مسلح ٹرکوں نے گلیوں میں گھومنا شروع کر دیا۔ پی پی پی کے اراکین کو وسیع تعداد میں گرفتار کر لیا گیا، خواہ ان کا کوئی جرم تھا یا نہیں کیونکہ میرے والد کے خلاف فیصلہ سنانے سے پہلے پیش بندی کے طور پر ایسا کیا گیا تاکہ کسی گڑبڑ کا امکان نہ رہے۔ جرم کے الفاظ یہ تھے۔ "چونکہ بھٹو کے مقدمہ کا فیصلہ سنائے جانے کے بعد تم فلاں...... گڑبڑ کر سکتے ہو اس لئے تمہیں گرفتار کیا جاتا ہے" حکومت کو کیسے

علم تھا کہ فیصلہ کیا ہونے والا تھا اگر عدالتیں ضیاء کے اعلان کے مطابق آزاد اور منصفانہ کارروائی کی اہل تھیں۔ پنجاب سے ۸۰ ہزار، صوبہ سرحد سے ۳۰ ہزار اور سندھ سے ساٹھ ہزار گرفتاریاں کی گئیں۔ اتنی تعداد میں لوگ پکڑے گئے کہ پاکستان بھر میں ہر جگہ نظر بندی کے کیمپ لگ گئے۔ ریس کورس کو کھلے قید خانے میں تبدیل کر دیا گیا۔ کھلے کھیتوں کو نظر بندی کیمپوں میں بدل دیا گیا ان کے گرد کانٹے دار تاریں بچھا دی گئیں اور مسلح فوجیوں کا پہرہ لگا دیا گیا۔ کھیلوں کے میدانوں کو بھی جیل بنا دیا گیا۔ عورتوں کو بھی گرفتار کیا گیا بعض تو اپنے ننھے بچوں کے ساتھ تھیں۔

۱۵ر مارچ ۱۹۷۸ء:۔

کشور قیوم نظامی، سابق رکن صوبائی اسمبلی کی بیگم کا بیان۔

میرے خاوند کو اور مجھے صبح ایک بجے گرفتار کیا گیا۔ پولیس نے پورے گھر کو محصور کر لیا۔ ہمارا بچہ چند ماہ کا تھا لہٰذا میں اسے کھلے فوجی ٹرک میں جیل تک اپنے ساتھ ہی لے گئی۔ کوٹ لکھپت جیل کے منتظمین نے بتایا کہ خواتین سیاسی قیدیوں کے لئے ان کے ہاں کوئی جگہ نہیں۔ مجھے آخر کار ایک چھوٹے سے سٹور روم میں بند کر دیا گیا۔ جہاں چھ دوسری خواتین بھی بند تھیں۔ جن میں ریحانہ سرور جو بھٹو صاحب کی ایک وکیل کی ہمشیرہ تھیں اور بیگم خاکوانی صدر پنجاب خواتین ونگ بھی شامل تھیں۔ ''ہمیں کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟۔ بیگم خاکوانی نے پولیس سپاہی سے پوچھا۔ '' ''کیونکہ بھٹو کے بارے میں فیصلہ ہونے والا ہے'' سپاہی نے جواب دیا ''تمہیں کیسے علم ہے کہ فیصلہ بھٹو صاحب کے خلاف ہو گا؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔ پولیس کا سپاہی چپ ہو گیا۔

ہماری تلاشی لی گئی اور میٹرن نے میری شادی کی انگوٹھی اور گھڑی اتار کر رکھ لی۔ جب مجھے رہا کیا گیا تو بتایا گیا کہ دونوں چیزیں گم ہو گئی تھیں۔ کمرے میں رفع حاجت کا کوئی انتظام نہیں تھا، کونے میں چند اینٹیں رکھی گئی تھیں اور نہ ہی بستر مہیا کیا گیا۔ ہم کسی طرح بھی سو نہیں سکتی تھیں۔ پولیس نے آدھی رات کو ملحقہ صحن میں سیاسی قیدیوں کو کوڑے مارنے

شروع کر دیئے۔ مردوں کی کمر پر لکیریں پینٹ کر دی گئیں تاکہ کوڑوں کا شمار کیا جاسکے۔ کوڑے مارنے والا آدمی جو ایک پہلوان تھا صرف لنگوٹی میں ملبوس تھا اور اپنے جسم کو روغن مل چکا تھا...... وہ کچھ فاصلے سے دوڑ کر آتا اور پوری طاقت سے کوڑا رسید کرتا...... جب کہ ایک فوجی افسر ایک طرف بیٹھا کوڑوں کی گنتی کرتا جاتا۔ ہر دورے میں بیس سے تیس مردوں تک کو کوڑے لگائے جاتے۔ ہم ساری رات ان کی چیخیں سنتی رہتیں۔ "جیئے بھٹو" وہ بلند آواز سے ہر کوڑے پر چیختے۔ میں نے اپنے کانوں کو ڈھانپ لیا اور دعا کرتی رہی کہ خدایا! میرا شوہر ان میں نہ ہو۔ اسے ستمبر ۱۹۷۷ء میں کوڑے مارے جا چکے تھے۔ ہماری قید کے دوسرے روز پولیس نے اچانک ہمیں رہا کر دیا۔ جب ہم جیل کے دروازوں سے باہر نکلیں ہمیں دوبارہ حراست میں لے لیا گیا۔ اس مرتبہ امن و امان برقرار رکھنے کا بہانہ تھا۔ حکومت نے اس امر کا اعتراف کر لیا تھا کہ عدالت کے فیصلہ کی پیش آگاہی کی وجہ سے گرفتاری کسی جرم کی بنا نہیں بنتی۔ اور ہمیں اسی سٹور روم میں دوبارہ دھکیل دیا گیا۔ مسٹر بھٹو جن کی کوٹھڑی ہمارے کمرے سے نظر آتی تھی انہیں پتہ چلا تو انہوں نے اپنے وکیل کے ذریعہ پھلوں کی ٹوکری ہمیں پہنچائی۔ "دیکھو ضیاء معزز خاندانوں کی خواتین سے کیا سلوک کرتا ہے؟" ان کی تحریر کردہ پرچی پر رقم تھا۔ مجھے دو ہفتے کی حراست کے بعد گھر بھیج دیا گیا کیونکہ میرا بچہ بیمار پڑ گیا اور وہاں کوئی دوائی دستیاب نہیں تھی۔ دوسری خواتین ایک ماہ تک وہیں رہیں۔

میری حراست کے احکامات ۱۸ر مارچ کی صبح سویرے ان سب کی گرفتاری کے احکامات کے بعد موصول ہوئے۔ "پولیس تمہیں ملنا چاہتی ہے" صبح ساڑھے چار بجے ایک مانوس پیغام ملا۔ میں اس کی وجہ جانتی تھی مگر میرا دل ماننے کو نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنی والدہ کے پاس دوڑ کر جانا چاہتی تھی مگر وہ لاہور میں پہلے ہی زیر حراست تھیں۔ میں سمیعہ، اپنے وکلاء، میر یا شاہ نواز یا صنم کے پاس کہیں بھی بھاگ جانا چاہتی تھی۔ مجھ میں یہ سب کچھ اکیلے سہنے کی ہمت نہیں تھی لیکن میں بھاگ نہ سکی۔ "میرے خدا، ہم سب کی مدد کر" میں بار بار خود کلامی کرتی تھی اور خالی کمرے میں قدم ناپتی رہی۔

رونے چلانے کی آوازیں سہ پہر کے وقت شروع ہوئیں۔ باورچی خانہ سے، باغ سے، ۷۰ - کلفٹن کے دروازے سے، میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی دل پھٹنے کے قریب ہو گیا۔ اچانک سامنے کا دروازہ کھلا اور میری کزن فخری دھڑام سے فرش پر گری۔ "قاتل" اس نے چیختے ہوئے کہا غم میں اپنے سر کو فرش پر پٹکتے ہوئے پھر کہا "قاتل"۔

ضیاء کے ججوں نے میرے والد کو قصوروار گردانا اور انہیں موت کی سزا دی۔ فخری نے جو دروازے پر فوجی پہرہ داروں کے پاس سے بھاگتی ہوئی گزری تھی ان کو بھونچکا کر دیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کی نظر بندی کے احکام اسے تھما دیئے گئے۔ اسے میرے ساتھ ہی ایک ہفتہ کے لئے نظر بند کر دیا گیا۔ میری نظر بندی تین ماہ کے لئے تھی۔

لوہے کے دروازے ایک کے بعد دوسرا اور درمیان میں طویل گندی گزر گاہیں۔ پولیس کی سپاہیوں نے میری تلاشی جاری رکھی میرے بالوں میں، میرے بازوؤں پر اپنا ہاتھ گزارتے ہوئے میرے سینے اور میرے کندھوں کو ٹٹولتے ہوئے۔ اس کے بعد دروازوں میں لوہے کی سلاخوں والی تین کوٹھڑیاں۔

"پنکی! کیا تم ہو"۔

میں کوٹھڑی میں جھانکتی ہوں مگر تاریکی کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آتا۔ جیل کے اہل کار دروازہ کھولتے ہیں اور میں اپنے والد کی موت کی کوٹھڑی میں قدم رکھتی ہوں۔ اندرون مرطوب اور بدبودار ہے۔ اتنی موٹی سیمنٹ کی دیواریں ہیں کہ سورج کی کرن داخل ہونے کی بھی کوئی راہ نہیں ہے۔ چار پائی چھوٹی سی کوٹھڑی کے نصف فرش پر بچھی ہوئی ہے۔ اور دبیز لوہے کی زنجیروں سے زمین میں گڑی ہوئی ہے۔ میرے والد کو کوٹھڑی میں داخلہ کے بعد چوبیس گھنٹے چار پائی کے ساتھ ہی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ ان کے ٹخنوں پر داغ بن گئے تھے۔ چارپائی کے ساتھ ہی ایک کھلا سوراخ تھا جہاں سزا یافتہ قیدیوں کو بول و براز کی ضروریات پورا کرنا پڑتی تھیں۔ بدبو سے جی متلا رہا ہے۔

"پاپا"۔

میں انہیں گلے ملتی ہوں اور اپنے بازو ان کے بدن کے گرد لپیٹ لیتی ہوں۔ ان کا وزن تیزی سے کم ہو چکا ہے جب میری آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہوتی ہیں تو میں دیکھتی ہوں ان کا جسم کیڑوں کے کاٹنے سے زخمی ہے۔ مچھر ان کی کوٹھڑی کی رطوبت اور حدت میں پلتے ہیں۔ جسم کا کوئی حصہ سرخ آبلوں سے خالی نہیں ہے۔

میں حلق میں آنسوؤں کا پانی بھرا ہوا محسوس کرتی ہوں۔ میں اسے نگل جاتی ہوں۔ میں ان کی موجودگی میں بالکل نہیں روؤنگی۔ لیکن وہ مسکرا رہے ہیں۔ مسکراہٹ! وہ عجیب ہیں۔ "تم یہاں کیسے آئی ہو؟" وہ پوچھ رہے ہیں۔

"میں نے صوبائی انتظامیہ کو ایک درخواست دی تھی کہ خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے جیل مینوئل کے مطابق ہفت روزہ ملاقاتوں کے میرے حق کو مسلا گیا ہے" میں انہیں بتاتی ہوں۔ ہوم سیکرٹری نے مجھے آپ سے ملاقات کی اجازت دیدی۔ میں انہیں بتاتی ہوں کہ کس طرح مجھے فوجی ٹرکوں، کاروں اور جیپوں کے ایک قافلہ کی شکل میں یہاں لایا گیا۔ "حکومت بہت گھبراہٹ میں ہے" فسادات کی پوری تفصیل بیان کرتے ہوئے انہیں بتاتی ہوں کہ ان کی سزائے موت کے اعلان کے ایک ہفتہ کے اندر اندر سندھ کے متعدد دیہاتوں میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔ لاڑکانہ کے نزدیک ۱۴۶ جھگیوں کے گاؤں سے ۱۲۰ افراد گرفتار کئے گئے۔ پولیس نے اس دکاندار کو بھی گرفتار کر لیا جس نے دکان کی دیوار پر ایک فلم سٹار کے ساتھ میرے والد کی تصویر بھی آویزاں کی ہوئی تھی۔

"مختلف ممالک کی جس کثیر تعداد نے ضیاء سے میرے والد کی جان بخشی کی اپیلیں کی ہیں وہ ناقابل یقین ہے" میں انہیں بتاتی ہوں۔ "میں سب کچھ بی بی سی پر سنتی ہوں۔ بریزنیف نے ایک خط لکھا ہے اور اسی طرح ہوا کوفینگ نے یہ حوالہ دیتے ہوئے کہ کس طرح آپ نے چین کے ساتھ قریبی تعاون کا ڈول ڈالا تھا اسد نے شام سے، انور سادات نے قاہرہ سے، صدر عراق اور سعودی حکومت نے، اندرا گاندھی اور سینٹر میک گورن نے اپیل کی تھی۔ سوائے پریذیڈنٹ کارٹر کے، تقریباً ہر فرد نے اپیل کی تھی۔ کینیڈا کے دارالعوام نے متفقہ قرار داد پاس کی تھی جس میں حکومت سے آپ کی سزائے موت کو تبدیل کرنے کی

اپیل کی تھی۔ برطانوی پارلیمینٹ کے ۱۵۰ ارکان نے بھی اپنی حکومت پر مناسب اقدام لینے پر زور دیا۔ یونان، پولینڈ، ایمنسٹی انٹرنیشنل، سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ، آسٹریلیا اور فرانس سبھی نے اپیلیں کی ہیں۔ پاپا! کوئی وجہ نہیں کہ ضیاء اس فیصلے پر عملدر آمد کے لئے مصر رہے۔

"یہ دل خوش کن خبر ہے" وہ کہتے ہیں "لیکن ہماری طرف سے کوئی اپیل نہیں کی جائے گی"۔

"لیکن پاپا آپ کو اپیل کرنی چاہیئے" میں صدمے کی حالت میں انہیں کہتی ہوں۔

"ضیاء کی عدالتوں کے ذریعے، پوری کارروائی جعلی ہے اسے طول دینے کا کوئی فائدہ نہیں"۔

باتوں کے دوران وہ سر سے مجھے اور قریب ہونے کا اشارہ کرتے ہیں۔ جیل کے اہل کار کوٹھڑی کے دروازے سے باہر کھڑے ہمیں سن رہے ہیں دیکھ رہے ہیں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ کاغذ کا ایک ٹکڑا میرے ہاتھ میں تھما دیا گیا ہے۔

"پاپا! آپ دل چھوٹا نہیں کرسکتے" میں بلند آواز میں جیل کے عملہ کی توجہ دوسری طرف ہٹانے کے لئے کہتی ہوں۔

"میرا خدا جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں" میرے والد جواب دیتے ہیں۔

"میں یوم قیامت پر اپنی اپیل اس کی اعلیٰ ترین عدالت میں پیش کروں گا۔

اب تم جاؤ، ایک گھنٹہ ہو چکا ہے۔ جاؤ اپنی مرضی سے نہ کہ ان کے حکم پر۔ میں ان سے چمٹ جاتی ہوں۔ "یہ کاغذ حکام کے ہاتھ نہیں آنا چاہیئے ورنہ تمہاری ملاقاتیں منسوخ ہو جائیں گی" وہ چپکے سے میرے کان میں کہتے ہیں۔

"پاپا! میں دوبارہ ملنے آؤں گی"۔

جیل سے باہر نکلنے پر میری تلاشی لی گئی۔ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ لاہور کے نزدیک جب میں نظر بند والدہ کو ملنے کے لئے گئی تو دوبارہ تلاشی لی گئی اور پھر ایک دفعہ اور جب میں مل کر باہر آئی۔ کچھ نہ مل سکا۔ بعض اوقات تلاشی لینے والے ہمارے ہمدرد نکلتے اور برائے نام تلاشی

کا تکلف کرتے۔ لیکن مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ وہ لمحہ کب آنے والا تھا۔ کراچی واپس اپنی نظر بندی کی جگہ پر جانے کے لئے جب ائرپورٹ پہنچی تو مجھے تین گھنٹے تک ایک کار میں فوجی گاڑیوں کے حصار میں بٹھایا گیا۔

آخر کار طیارہ پرواز کے لئے تیار تھا۔ کار کی کھڑکیوں سے میں دیکھ رہی تھی کہ تمام مسافر سوار ہو گئے ہیں۔ انجن چلنا شروع ہو گئے۔ طیارے کی روشنیوں کی چمک باہر پڑ رہی تھی۔ پولیس نے مجھے کار سے باہر نکالا اور مجھے تیزی سے چلاتے ہوئے سیڑھیوں تک لے گئے جب کہ ایک بندوق بر دار سپاہی میرے آگے اور ایک پیچھے تھا۔ واکی ٹاکی ریڈیو کی آواز گونجی اور اچانک سپاہیوں نے الٹے قدم واپس آنا شروع کر دیا۔ اور دوبارہ کار کا رخ کر لیا۔ ایئرپورٹ سیکورٹی سے وابستہ ایک عورت کو میں نے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا میں اس کے بھدے موٹے جسم پر نگاہ رکھے ہوئے تھی جب اس نے اس شب ہوائی اڈے پر کمر پر ہاتھ دھرے میری طرف بڑھنا شروع کیا۔ میں اسے اچھی طرح پہچانتی تھی وہ ائرپورٹ کے حفاظتی عملے میں تھی اور ائرپورٹ پر اکثر میں نے اسے آتے جاتے ڈیوٹی پر دیکھا تھا۔ اور وہ غیر ہمدرد تھی۔ حکومت نے جان بوجھ کر اسے میری تلاشی پر متعین کیا تھا۔ وہ ان اہلکاروں کی طرح کمینہ معلوم ہوتی تھی جو تلاشی کے دوران انگوٹھیاں اور گھڑیاں رکھ لیتے ہیں اور واپس نہیں کرتے۔ کوئی چیز تلاشی کے دوران بے معنی نہیں خواہ وہ چھوٹی اور بے قیمت ہی کیوں نہ ہو۔ اس نے لپ سٹکوں کو بھی خولوں سے علیحدہ کر دیا اور میری ملاقاتی ڈائری کا ہر ورق پڑھنا شروع کر دیا۔ اسے اس کام میں مزا آتا تھا۔

"میں اس عورت سے تلاشی نہیں کراؤں گی میں اس عورت سے تلاشی نہیں کراؤں گی" میں چیختے ہوئے پکاری اور پیچھے ہٹتی ہوئی بندوقوں کے نرغے میں کھڑی ہو گئی۔ "اپنے والد سے ملاقات پر جیل میں تلاشی لی گئی۔ اپنی نظر بند والدہ سے ملنے کے لئے جاتے وقت اور آتے وقت تلاشی لی گئی۔ تلاشی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے تلاشی بہت ہو چکی ہے"۔

فوجی گاڑیوں کے قافلہ نے میرے گرد گھیرا ڈال لیا۔ مزید بندوق بردار سپاہی آ گئے مزید پولیس آ گئی۔ تمہاری دوبارہ تلاشی لی جائے گی۔ پولیس افسر نے اصرار کیا۔ ورنہ

تمہیں طیارے پر کراچی جانے نہیں دیا جائے گا۔

"میرے لئے یہ بھی ٹھیک ہے" میں چلائی۔ "میرے پاس اب باقی کیا بچا ہے؟" تم نے میرے والد کو سزائے موت دی ہے تم نے میری والدہ کا سر پھوڑا ہے۔ تم مجھے کراچی میں اکیلا رہنے کے لئے بھیج رہے ہو، میری والدہ کو لاہور میں تنہا رکھ رہے ہو۔ اور میرے والد کو موت کی کوٹھڑی میں بند کیا ہوا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے بات نہیں کر سکتے ایک دوسرے کو تسلی نہیں دے سکتے۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ میں زندہ رہتی ہوں یا مردہ، جو تم چاہتے ہو کرو"۔

میں تقریباً پاگل ہو چکی تھی۔ میرے پاس اور چارہ کار بھی کیا تھا؟۔ مجھے دیوار سے لگا دیا گیا تھا۔ حفاظتی عملہ کی عورت میرے چلانے سے خوف زدہ ہو کر پس منظر میں چلی گئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر وہ میری تلاشی لے گی تو میرے، والد کا پیغام یقیناً اس کے ہاتھ آجائے گا۔

"چلو چلو اسے چھوڑ دو" جوانوں نے کھسر پھسر شروع کر دی۔

"تم جا سکتی ہو" افسر نے کہا۔

کراچی کی پرواز میں میں تقریباً بے ہوش تھی۔ میرا کان پہلی مرتبہ درد کر رہا تھا۔ ٹھک ٹھک کی آوازیں اس قدر چڑ چڑا پن پیدا کر رہی تھیں کہ ۷۰ کلفٹن پہنچنے پر مجھے نیند آنا دوبھر ہو گئی حکومت نے آخر ایک ڈاکٹر کو میرے معائنہ کے لئے بلایا۔

اپنے والد کا رقعہ میں نے پڑھا، میری غیر قانونی نظر بندی کے خلاف قانونی جنگ لڑنے کے بہت سے نکات پر مجھے مشورہ دیا گیا تھا میں نے عدالت میں پیش کرنے کے لئے مسودہ تحریر کرنے کی کوشش کی۔ مگر بیماری کی شدت کی وجہ سے یہ کوشش ادھوری ہی چھوڑنی پڑی۔

گھر کے جانور۔۔

گھر کے پالتو جانوروں پر کیا بیت رہی تھی یہ بھی عجیب داستان تھی۔ جس دن میرے

والد کو سزائے موت سنائی گئی ان کا ایک بلّا جاں سے گزر گیا۔ ایک منٹ پہلے وہ تندرست تھا مگر ایک منٹ بعد وہ مر گیا۔ اگلے دن کتیا کی ایک اور بچی مر گئی جس کی بظاہر کوئی وجہ نہیں تھی۔ ۷۰ کلفٹن میں میں نے بھی ایک سیامی بلی پالی ہوئی تھی وہ بھی تیسرے روز مر گئی۔

جب گھر کے مالک کو خطرہ ہو بعض مسلمانوں کا عقیدہ ہے جانوروں پر اس کا اثر طاری ہو جاتا ہے اور وہ موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ میں جب بیمار تھی تو یہی نتیجہ میرے تصور میں آیا کہ میرے والد کو کوئی عظیم خطرہ ہے جس کے سبب ایک نہیں بلکہ تین جانور موت کے گھاٹ اتر گئے ہیں۔ یہ تصور بے چینی کی علامت تھا۔ ہر صبح جب میں بی بی سی کی خبریں سننے کے لئے چھ بجے ریڈیو لگاتی میں دعا کرتی کہ ضیاء کی موت کی خبر ہو۔ لیکن وہ ابھی حیات تھا۔

اپنے والد کے نکات پر مبنی درخواست میں ۷۰ - کلفٹن میں اپنی نظر بندی کو میں نے عدالت میں چیلنج کر دیا۔ عدالت نے میرے مقدمہ کی سماعت اپریل میں ملتوی کر دی۔ اور دوبارہ مئی میں۔ ہر مرتبہ مجھے اپنی درخواست نئے سرے سے پیش کرنا پڑتی۔ ۱۴ر جون کو میرا وکیل میرے لئے سالگرہ کا بہترین تحفہ لایا۔ میری نظر بندی کی وجوہات کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔ جسٹس فخرالدین نے نظر بندی کے پہلے مقدمہ میں یہ فیصلہ سنا دیا۔ مجھے رہا کر دیا گیا۔ کم از کم اپنی صحت کا تو اب خیال رکھ سکوں گی۔ جون کے آخر میں مڈایسٹ ہسپتال کراچی میں میرے کان اور ناک کی ہڈی کا پہلا آپریشن ہوا جب میں بے ہوشی سے ہوش میں آنا شروع ہوئی تو میرے دبے ہوئے خوف باہر آ گئے۔ ''وہ میرے والد کو قتل کر رہے ہیں، وہ میرے والد کو قتل کر رہے ہیں'' میں نے اپنی چیخیں بلند ہوتی ہوئی سنیں۔ میری ناک میں روئی بھری ہوئی تھی اور مجھے سانس لینا دوبھر ہو گیا تھا۔ اگرچہ والدہ جو لاہور میں نظر بند تھیں کی طرف سے اطمینان تھا۔ اور انہیں پولیس کے پہرہ میں مجھے دیکھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ جب صحت مند ہوئی تو ایک عالم حزن و ملال سے واسطہ پڑا ہمارے اخبار ''مساوات'' کا کراچی ایڈیشن اپریل میں بند کر دیا گیا تھا۔ اور چھاپہ خانہ پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔ ایڈیٹر اور پرنٹر دونوں کو قابل اعتراض مواد کی اشاعت پر گرفتار کر لیا گیا تھا۔ یہ وہ اصطلاح تھی جس کا حکومت نے میرے والد کے مقدمہ میں ہمارے لئے وافر استعمال کیا۔ دوسرے اخبارات
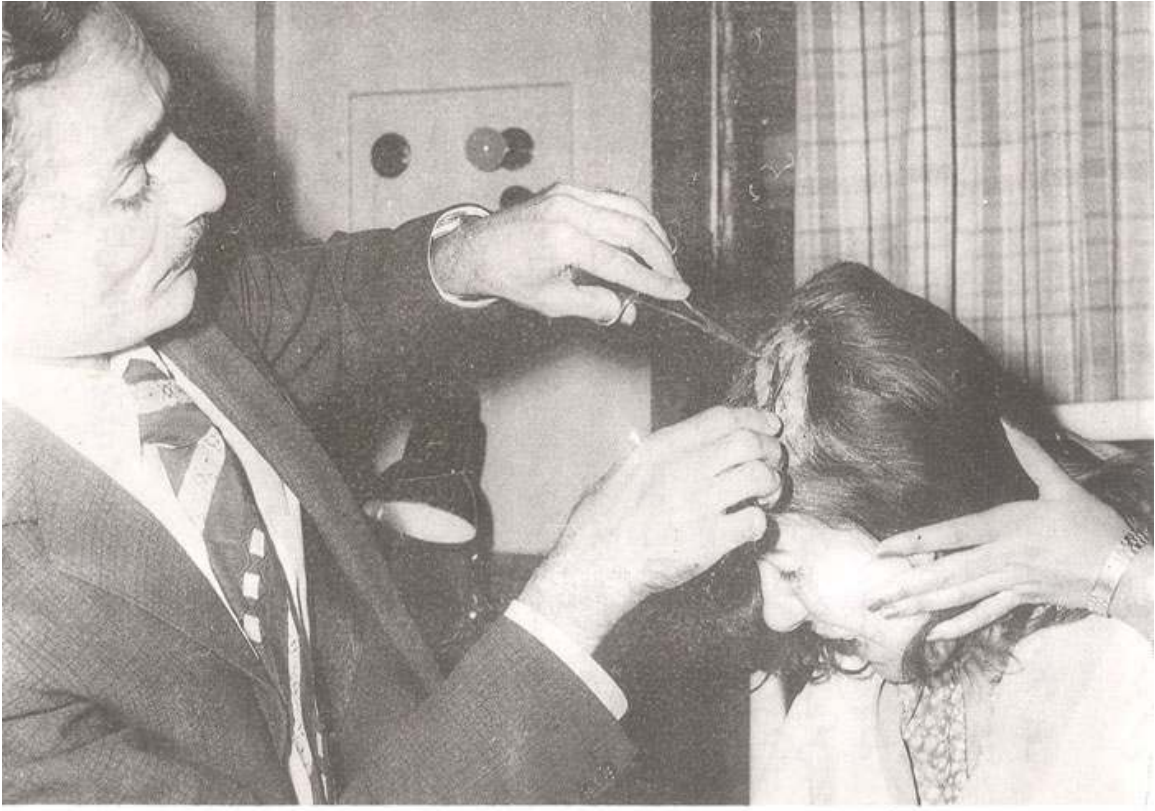
فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء کے اہل کاروں کے تشدد کا شکار بیگم نصرت بھٹو ایک ہسپتال میں

کے صحافیوں نے احتجاجاً ہڑتال کر دی۔ ۹۰ صحافیوں کو حراست میں لیا گیا اور چار کو کوڑوں کی سزاء سنائی گئی ان چاروں میں پاکستان ٹائمز کے ایک سینئر ایڈیٹر بھی تھے جو جسمانی طور پر معذور تھے۔

بین الاقوامی حلقوں نے آخر کار نوٹس لینا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۷۸ء کے موسم گرما تک "مساوات" کے ایڈیٹر اور پرنٹر، ان پچاس سیاسی قیدیوں میں شامل تھے جن کو انسانی حقوق کے عالمی ادارے ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اپنی فہرست میں شامل کر لیا تھا۔ حکومت کے کسی تعاون کے بغیر ایمنسٹی والے ۳۲ دیگر اشخاص کے متعلق تحقیق کر رہے تھے۔ اگرچہ ضیاء نے ایمنسٹی کے دو نمائندوں سے سال کے اوائل میں حقائق کے متلاشی وفد سے مکمل تعاون کا وعدہ کیا تھا۔ حکومت نے مارچ میں جاری کردہ ایمنسٹی کی رپورٹ پر کوئی عمل در آمد نہیں کیا۔ میں خود بھی ایمنسٹی کے دو نمائندوں کو جنوری میں ملی تھی۔ میں نے ضیاء کے مارشل لاء قوانین کے تحت بنیادی انسانی حقوق کے خاتمہ، فوجی عدالتوں میں شہریوں اور سیاسی قیدیوں کے مقدمات کی سماعت، چوری کے مجرموں کے قطع ید کے فیصلے اور دیگر ظالمانہ سزاؤں پر اپنی فکر مندی کا اظہار کیا تھا۔ ان میں قطع ید کے سلسلہ میں مجرم اگر دائیں ہاتھ استعمال کرنے والا ہے تو بایاں ہاتھ اور اگر بائیں ہاتھ والا ہے تو دایاں ہاتھ کاٹنے کی سفارشات تھیں۔ میں انہیں اپنے والد کے مقدمہ کی غیر منصفانہ کارروائی کے بارے میں بتانے کے لئے بے چین تھی اور انہیں سمجھایا کہ وہ کیا غیر انسانی حالات تھے جن میں انہیں قید تنہائی میں رکھا گیا تھا۔ یقیناً وہ اس کی تصدیق بھی چاہتے تھے ایمنسٹی کے نمائندوں نے جیل میں میرے والد کو ملنے کی اجازت چاہی ان کی درخواست کو مسترد کر دیا گیا۔

۲۸ اپریل ۱۹۷۸ء۔

کوٹ لکھپت جیل، ڈاکٹر ظفر نیازی، میرے والد کے دانتوں کے ماہر ڈاکٹر

جب میں نے کوٹ لکھپت جیل میں مسٹر بھٹو سے ملاقات کی۔ تو میں نے ان کے

مسوڑھوں کی ابتر حالت دیکھی۔ قید خانے کی صفائی کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور ان کی خوراک ناکافی۔ ان کے مسوڑھوں کے خلیوں میں سوجن تھی اور وہ درد انگیز تھے۔ لیکن میرے پاس ان کے علاج کا کوئی موقع نہیں تھا۔ تاہم مجھے یقین نہیں تھا کہ اس غیر انسانی ماحول میں انہیں علاج کا کوئی فائدہ بھی ہو گا یا نہیں۔ اپنی ملاقات کے بعد میں نے حکومت کو ایک رپورٹ لکھ دی تھی کہ بطور مسٹر بھٹو کے ایک معالج کے جب تک ان کی رہائش کے حالات میں سدھار نہیں ہوتا میرے علاج کا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے علم تھا کہ حکومت پر اس رپورٹ کا خاطر خواہ اثر نہیں ہو گا۔ غیر ملکی سفارت کار بھی میرے مریض تھے اور حکومت کو میرے خیال میں تشویش تھی کہ ان سے بھٹو صاحب کے بارے میں کوئی بات نہ کروں۔ میں نے اپنی رپورٹ کی ایک کاپی اپنی بیگم کو بھی دی تاکہ "اگر فوج مجھے گرفتار کرے تو وہ اس رپورٹ کو غیر ملکی پریس میں چھپنے کے لئے بھیج دے" دو دن بعد پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا۔

ڈاکٹر نیازی اور ان کے خاندان پر تشدد کا آغاز ہوگیا تھا...... اسے دو مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ پہلی مرتبہ جب وہ اپنے کلینک میں ایک مریض کا بے ہوشی کے انجکشن کے بعد علاج کر رہا تھا۔ "اپنے مریض کے علاج کے لئے صرف ایک گھنٹہ چاہئے۔" اس نے پولیس سے استفسار کیا۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور اسے مریض کو کرسی پر اسی حالت میں چھوڑنا پڑا۔ اس پہلی مرتبہ گرفتاری کے دوران پولیس نے رات دو بجے گھر پر چھاپہ مارا گدوں کو الٹاتے ہوئے الماری سے کپڑوں کو باہر پھینکتے ہوئے کوئی چیز تلاش کرتے ہوئے جو اس پر ڈال دی جائے۔ انہیں ایک شراب کی آدھی بوتل ملی جو ڈاکٹر نیازی کا ایک امریکی ماہر دندان دوست کلینک میں چھوڑ گیا تھا۔ جو ہر تین ماہ بعد ڈاکٹر نیازی کے کلینک پر پریکٹس کرنے آتا تھا۔ ڈاکٹر نیازی پر گھر میں شراب رکھنے کا الزام لگا دیا گیا۔

ڈاکٹر نیازی جو پی پی پی کا رکن نہیں تھا۔ اور نہ ہی سیاسی آدمی، شراب رکھنے کے جرم میں چھ ماہ کے لئے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ جب اسے رہا کیا گیا تو اس وقت میرے والد کو کوٹ لکھپت جیل سے راولپنڈی سنٹرل جیل کی موت کی ایک کوٹھڑی میں منتقل کیا جا چکا تھا۔

ڈاکٹر نیازی نے میرے والد کا معائنہ کرنے کے لئے فوراً درخواست دی اس کی درخواست کو مسترد کر دیا گیا۔

۲۱ر جون ۱۹۷۸ء:۔
راولپنڈی سنٹرل جیل، ۲۵ واں یوم پیدائش

میں راولپنڈی میں فلیش مین ہوٹل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں اپنے والد سے ملاقات کے لئے منتظر بیٹھی ہوں۔ اپنی گھڑی کو بار بار تک رہی ہوں۔ والدہ کہاں ہے؟ میرے والد کے وکلاء نے میرے یوم پیدائش پر عدالتی حکم کے ذریعے اپنے والد سے ہم دونوں کی ملاقات کا اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا۔ اب دوپہر ہو گئی ہے میں ۹ بجے صبح سے انتظار کر رہی ہوں کہ لاہور سے میری والدہ کو بذریعہ طیارہ پولیس لے کر آنے والی ہے۔ مگر وہ ایک بار پھر لیت و لعل کر رہے ہیں۔

مجھے والدہ کے بارے میں خدشات پیدا ہو جاتے ہیں انہیں شدید قسم کا درد سر لاحق ہے اور بہت تھکن محسوس کرتی ہیں۔ واقعات کا دباؤ ان پر بری طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ اور ان کا بلڈ پریشر پہلے درجے سے بھی نیچے گر رہا ہے۔ لاہور سے پنڈی میں میرے والد کو ملنے کے لئے آتے ہوئے ہوائی جہاز کی پرواز کے دوران دو مرتبہ بے ہوش ہو چکی ہیں۔ وکلاء نے حکومت کو درخواست دی ہے کہ انہیں اسلام آباد میں نظر بند رکھا جائے جہاں سے بذریعہ کار آسانی سے ملاقات کے لئے آسکیں۔ لیکن انہیں پھر بھی لاہور ہی میں نظر بند رکھا ہوا ہے۔ اس مرتبہ پھر وہ تنہا ہیں۔ ان کا ساتھی صرف ایک بلی کا بچہ ہے جو میں اپنی جیب میں ٹھونس کر ان کے لئے لے گئی تھی۔ بلی کی چوں چوں بھی ایسی حالت میں راحت افزا ہے۔ والدہ کا خیال ہے۔ بلی کا بچہ اپنا ننھا سا پنجہ ان کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے جب وہ اکیلی تاش سے دل بہلانے کی کوشش کرتی ہیں۔

میں اپنی شلوار قمیض کو ہموار کرتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنے یوم پیدائش پر اپنے والدین کو سمارٹ نظر آؤں اور یہ ظاہر کروں کہ میرا حوصلہ بلند ہے۔ ایک بجے بعد از دوپہر، دو بجے۔ حکومت کی یہ من پسند چالیں ہیں۔ میں اس تعداد کو گن بھی نہیں سکتی، جب میری نظر بندی کے دوران اپنے والد سے ملاقات کے متعینہ وقت پر گھنٹوں مجھے انتظار کرنا پڑا اور بتانے والا بھی کوئی نہیں تھا کہ کب ملاقات ہوگی۔ ہر دو ہفتے بعد کی میری ملاقاتیں مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ حکومت کو بھی اس بات کا علم ہے۔ پس یا تو وہ جان بوجھ کر تاخیر سے آئیں گے تاکہ مجھے ان سے ملاقات کیلئے صرف آدھ گھنٹہ مل سکے یا دانستہ طور پر آئیں گے ہی نہیں۔ وہ اب تک کیوں نہیں آئے؟ حکومت عدالتی حکم کی نافرمانی کیسے کر سکتی ہے؟۔

تین بجے سہ پہر، ساڑھے تین بجے سہ پہر، جیل کے قوانین کے مطابق تمام ملاقاتیوں کو غروب آفتاب سے پہلے پہلے واپس چلے جانا چاہئے۔ مجھے اپنا گزشتہ یوم پیدائش یاد ہے۔ آکسفورڈ کے سبزہ زار میں میری پارٹی، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دس سال قبل منعقد کی گئی ہو۔ میں ششدر رہوں آیا وہ پارٹی ہوئی بھی تھی یا نہیں۔

چار بجے سہ پہر مجھے پیغام ملتا ہے کہ میری والدہ ایئرپورٹ سے پہنچ گئی ہیں۔ ''پنکی! یوم پیدائش کی مبارک باد'' وہ جیل کے دروازے پر مجھ سے لپٹ کر کہتی ہیں۔ ہم دونوں اکٹھی والد کی کوٹھڑی کی سمت بڑھتی ہیں۔

''پنکی! یہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ تم سال کے طویل ترین دن میں پیدا ہوئی تھیں'' میرے والد ہماری آمد پر پکار اٹھتے ہیں۔ ''حکومت بھی تمہارے یوم پیدائش پر سورج کو جلدی غروب ہونے پر مجبور نہیں کر سکتی''۔

انہیں اب قید خانہ کے اندرونی صحن میں ایک دوسری نیم تاریک کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا۔ اندرونی صحن میں چاروں طرف فوجی خیمے تان دیئے گئے۔ فوجی پہرے دار کانٹے دار اور

مقفل دروازے پر متعین کر دیئے گئے ہیں۔ سول مقدمہ کا کیسا ناٹک رچایا ہے؟ یہ فوجی اپریشن ہے ہم فوجی چوکی کے اندر ایستادہ ہیں۔

ان کی نیم تاریک نیم روشن مرطوب کوٹھڑی صرف ٦ × ٩ فٹ کے رقبہ پر محیط ہے۔ ان کی کوٹھڑی کی سلاخوں پر کوئی جالی نہیں لگائی گئی جیسی بالکل متصل پہرے داروں کی کوٹھڑیوں کے دروازے پر لگی ہوئی ہے۔ فضاء مکھیوں اور مچھروں کی وجہ سے بھاری بھر کم محسوس ہوتی ہے۔ ایک چمگادڑ چھت سے لٹک رہی ہے، جب کہ چھپکلیاں دیواروں پر اوپر نیچے دوڑ رہی ہیں۔

ہم ان کی ننگی دھات کی چارپائی پر نظر دوڑاتی ہیں۔ "کیاانہوں نے وہ گدا آپ کو نہیں دیا جو دو ہفتے قبل آپ کے لئے بھجوایا تھا" میری والدہ انہیں پوچھتی ہیں۔ "نہیں" وہ کہتے ہیں۔ میرے والد کی کمر پر باریک سی چارپائی کی وجہ سے زخموں کے نشان پڑ گئے ہیں۔ انہیں دومرتبہ انفلوئنزا اور بغیر ابلے پانی کے استعمال کی وجہ سے معدے میں شدید خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ تین مختلف موقعوں پر انہیں خون کی قے آئی ہے اور ناک سے بھی خون بہا ہے۔

اگرچہ جسم بہت پتلا ہوگیا ہے مگر ناقابل یقین بات ہے کہ وہ خوش دکھائی دیتے ہیں۔ کم از کم میں نے ایسا ہی محسوس کیا۔ شاید میں انہیں کسی اور حالت میں دیکھنا ہی نہیں چاہتی۔

"میں چاہتا ہوں تم عید پر لاڑکانہ جاؤ اور اپنے اجداد کی قبروں پر دعامانگو"۔ وہ کہتے ہیں۔

"لیکن پاپا! آپ سے اگلی ملاقات نہیں ہوسکے گی" میں احتجاج کرتی ہوں۔ "تمہاری والدہ ابھی تک نظربند ہیں اس لئے سوائے تمہارے کوئی دوسرا وہاں نہیں جاسکتا" وہ کہتے ہیں۔

میں مشکل سے تھوک نگلتی ہوں۔ میں اپنے خاندانی قبرستان میں عید پر پہلے کبھی نہیں گئی۔ اور نہ ہی نوڈیرو میں اپنے خاندانی افراد اور دیہاتیوں کا روایتی ملاقاتوں پر استقبال کیا ہے۔ خاندان کے دوسرے افراد نے میرے بھائیوں کی ہمیشہ نمائندگی کی، جب کبھی وہ والد

صاحب کے پاس ماہ رمضان کے خاتمہ پر اپنی سکول کی تعطیلات میں حاضر ہوئے مجھ پر تنہائی کے احساس نے کپکپی طاری کر دی مجھے توقع تھی میرے والد جلد ہی رہا ہو جائیں گے۔

"لعل شہباز قلندرؒ کے مزار پر جاکر دعامانگو" میرے والد اصرار کرتے ہیں۔ "میں گزشتہ عید پر وہاں حاضر نہیں ہوا تھا" لعل شہباز قلندرؒ ہمارے مشہور اولیاء اللہ میں سے ایک تھے۔ میری دادی اماں میرے والد کی بچپن میں بیماری پر جب وہ تقریباً قریب المرگ تھے، اس مزار پر دعامانگنے کیلئے گئی تھیں۔ کیا اللہ تعالیٰ اب اسی شخص کیلئے بیٹی کی دعا قبول کرلے گا۔

ہم ایک قیمتی گھنٹے تک صحن میں سر جوڑ کر اس قدر قریب بیٹھے ہیں کہ جیل کے تین اہلکار جو ڈیوٹی پر ہیں ہماری آپس کی باتیں نہ سن سکیں۔ لیکن اس مرتبہ وہ ہمارے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کرتے ہیں اور ہمارے زیادہ نزدیک نہیں آتے۔

"تم اب ۲۵ برس کی ہو" میرے والد مذاق کرتے ہیں۔ "کسی بھی منصب کے حاصل کرنے کی اہل ہو۔ اب ضیاء کبھی انتخابات منعقد نہیں کرائے گا"۔

"اوہ پاپا" میں پکارتی ہوں۔

ہم ہنستے ہیں یہ کیسے ممکن ہوا؟ حالانکہ جیل کا تختہ دار ہماری زندگیوں پر سایہ محیط کئے ہوئے ہے۔ فوج، میرے والد ہمیں بتاتے ہیں، ان کو پھٹ پڑنے پر اکساتی ہے۔ ہر شب وہ ان کی کوٹھڑی کی چھت پر چڑھ جاتے ہیں اور اپنے بھاری بوٹوں کی کھڑپ کھڑپ سے انہیں تنگ کرتے ہیں۔ یہی چال اس وقت بھی چلی گئی جب انہوں نے مجیب الرحمٰن کو بنگلہ دیش کی خانہ جنگی کے وقت گرفتار کر کے قید خانے میں ڈالا۔ توقع یہ کی جاتی ہے کہ قیدی جذباتی ہو کر پہرہ داروں کے ساتھ سخت مزاجی سے پیش آئے گا اور فوج کو یہ بہانہ مل جائے گا کہ کسی سپاہی نے طیش میں آکر گولی چلادی۔ لیکن میرے والد چال کو سمجھتے تھے اور اپنی صفائی میں اس طرز عمل کو بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ میں فلیشن مین ہوٹل میں واپس آگئی اور میرے پیچھے پیچھے فوجی گاڑیوں کا قافلہ، جس سے میں اب مانوس ہو چکی تھی، یہ قافلہ کبھی دو یا تین فوجی گاڑیوں پر مشتمل ہوتا اور کبھی سات آٹھ یا دس فوجی ٹرکوں پر۔ گلیوں میں لوگ قافلے پر گھورتے جیسے ہی میں پاس سے ہو کر آگے بڑھتی بعض ہمدردی میں دیکھتے ....

بعض لوگ آنکھیں نیچی کر لیتے .... شائد وہ ان باتوں پر یقین کرنا نہیں چاہتے تھے جو وہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

ایک پراسرار خاموشی شہر پر چھائی ہوئی تھی بلکہ پورے ملک پر چھائی ہوئی تھی۔ تمام قوم ایک معلق جذبے اور جوش میں گندھی ہوئی تھی۔ عام افواہ تھی کہ ایک لاکھ آدمی گرفتار ہو چکے تھے۔ "ضیاء وزیراعظم کے خلاف سزا پر عمل نہیں کرے گا۔ "یہ ممکن ہی نہیں" لوگ آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ گفتگو کا ایک ہی عنوان تھا میرے والد کا مقدمہ، ان کی سزائے موت، ان کی سپریم کورٹ میں اپیل۔

میرے والد کی غیر رضامندی کے باوجود ہم نے راولپنڈی میں سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی تھی۔ "میں اپنی بیوی اور بیٹی کا احسان مند ہوں، اپنے رشتے کی وجہ سے نہیں بلکہ برتر وجوہات کی بنا پر" میرے والد نے یحیٰی بختیار کو لکھا جو پاکستان کے سابق اٹارنی جنرل اور سپریم کورٹ میں میرے والد کے قانونی مشیروں کی ٹیم کے سربراہ تھے۔ "اس خطرناک دور میں دونوں نے علو ہمتی اور بہادری کا مظاہرہ کیا ہے انہیں میرے فیصلوں پر حتمی اور سیاسی حق ہے"۔

عدالت نے مئی میں مقدمہ کی سماعت کا آغاز کر دیا تھا۔ اگرچہ دوسرے مقدمات میں سپریم کورٹ میں اپیل کرنے کیلئے ایک ماہ کی مدت دی جاتی تھی، میرے والد کے مقدمہ میں صرف ایک ہفتہ دیا گیا۔ میرے والد کے وکلاء کا قیام فلیشن مین ہوٹل میں تھا جہاں ہم نے اپیل کی پیشی کیلئے دفتر قائم کر لیا تھا۔ ڈاکٹر نیازی کی نوجوان بیٹی یاسمین نیازی بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئی اور میرے ملاقاتیوں کے ساتھ اوقات کار کا پروگرام تیار کرتی اور اسی طرح امینہ پراچہ بھی جو وکلاء کی ٹیم اور غیر ملکی پریس کے درمیان رابطہ رکھتی۔ مزید براں آکسفورڈ کی میری پرانی دوست وکٹوریا شوفیلڈ جو آکسفورڈ یونین کی میری صدارت کے بعد صدر بنی تھی میری امداد کیلئے پاکستان آچکی تھی۔

بعض اوقات بجبر و اکراہ صبح سویرے اٹھتی۔ جلدی اٹھو۔ کپڑے پہنو، دن کا سامنا کرو۔ مزید الزامات کی تردید کرو۔ پارٹی ارکان سے جو جیل میں نہیں ملاقات کرو۔

محترمہ بے نظیر بھٹو، پاکستان پیپلزپارٹی کے مرکزی سیکرٹری جنرل سینیٹر رفیق احمد شیخ، پیپلزپارٹی پنجاب کے صدر سینیر صوبائی وزیر ملک مشتاق احمد اعوان

صحافیوں کو جو راولپنڈی میں جمع ہو گئے ہیں انٹرویو دو۔ حکومت کی حکم بر دار پریس میرے والد کے خلاف صرف الزامات کی تشہیر کرتی۔ لاہور میں روزنامہ "مساوات" جس کی کراچی شاخ کو حکومت نے بند کر دیا تھا، اور غیر ملکی عالمی پریس ہی سچی خبریں نشر کرنے کیلئے ہماری آخری امید تھے۔ گارڈین کے نامہ نگار پیٹر نیس وانڈ اور ڈیلی ٹیلیگراف کے بروس لوڈن ہمارے لئے مانوس چہرے تھے۔

حکومت نے ماہ جولائی کے اواخر میں "قرطاس ابیض" کی پہلی قسط شائع کی جس میں مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کی کارکردگی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ فلیشں مین میں ہم جھوٹے الزامات کے جواب میں اپنے والد کے بیان پر متواتر کام کرتے جو وہ اپنی صفائی میں سپریم کورٹ میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ ہر روز وکٹوریا اور میں ہاتھ سے لکھے صفحات کو جو وکلاء راولپنڈی سنٹرل جیل سے ہمارے لئے لے کر آتے دوبارہ نقل کرتیں۔ کاغذ کے دونوں طرف میرے والد کا لکھا مسودہ ٹیڑھی میڑھی حالت کی وجہ سے پڑھنا مشکل ہوتا۔ ان کا لکھنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہو گا کیونکہ وہ ماہ اگست کی گرمی میں رمضان کے روزے اپنی موت کی کوٹھڑی میں باقاعدہ سے رکھ رہے تھے۔ وکلاء ٹائپ شدہ صفحات واپس میرے والد کے پاس لے جاتے جو ان کو ترتیب دیتے اور ٹائپ کیلئے دوبارہ ہمیں بھجوادیتے۔ ہم نے ان کا جواب جس کیلئے ہمارا خفیہ نام "ریگی" تھا لاہور میں خفیہ پریس کو بھجوادیا۔

لیکن اس سے پہلے کہ مسودہ سپریم کورٹ میں پیش کر دیا جاتا اس کی مطبوعہ نقول قبضے میں لے لی گئیں۔ مسودے کو سپریم کورٹ میں دوبارہ پیش کرنے اور غیر ملکی پریس میں تقسیم کرنے کیلئے پی پی پی کے کارکن تمام رات تین سو صفحات پر مشتمل مسودہ کی فوٹو کاپیاں کرتے رہے۔ فوٹو کاپیاں کرنے والی مشین کا مقام اور وہ دوست جنہوں نے محنت شاقہ سے فوٹو کاپیاں کیں ان سب کی شناخت کو کلی طور پر خفیہ رکھنا پڑا۔

فلیشں مین ہوٹل کے گرد پھندے کو تنگ کیا جارہا تھا۔ ایک شب پولیس نے ہوٹل کے عین سامنے ڈرانے دھمکانے کا پروگرام بنایا ہمارے ایک معاون کو گرفتار کیا اور ملٹری کورٹ میں بعجلت تمام سزا دلوادی۔ ہم مستقلاً اس دھمکی کی زد میں کام کرتے رہے کہ خدا

معلوم اب کیا ہونے والا ہے؟۔

جب آخر کار جواب کا مسودہ سپریم کورٹ میں پیش کیا گیا۔ چیف جسٹس نے اس کی اشاعت پر پابندی لگادی۔ تاہم اس وقت تک مسودے کی متعدد نقول سمندر پار پہنچ چکی تھیں۔ بعد میں مسودہ کو ہندوستان میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ کتاب کا نام تھا "اگر مجھے قتل کر دیا گیا" اور یہ کثیر تعداد میں شائع ہوئی۔ تواتر سے افواہیں پھیل گئیں کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ کسی لمحے بھی آنے والا ہے۔ چیف جسٹس انوار الحق نے مقدمہ کی سماعت کے آغاز میں اعلان کیا تھا کہ اپیل کو جلداز جلد پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے گا اور میرے والد کے وکلاء پرامید تھے۔ بنچ کے نو ججوں میں سے پانچ جج شہادت پر اس طرح تبصرہ کر رہے تھے اور سوالات کر رہے تھے کہ عدالت عالیہ لاہور کے فیصلے کو خارج کر دیا جائے گا۔ لیکن اچانک ماہ جون میں انوار الحق نے عدالت کی کارروائی ملتوی کر دی اور ایک کانفرنس میں حصہ لینے کیلئے جکارتہ چلا گیا۔ ہم سب نے محسوس کیا کہ اپیل کی سماعت کو دانستہ طور پر طویل کیا جارہا تھا اور ملتوی کرنے کا غالباً یہی سبب تھا تاکہ جو جج واضح طور پر میرے والد کو بری کرنے کے حق میں تھا اور بنچ پر صرف وہی ایسا جج تھا جس کو فوجداری مقدمات خصوصاً قتل کے مقدمات کا وسیع تجربہ تھا، وہ جولائی کے اواخر میں ریٹائر ہونے والا تھا۔ ہماری درخواست کے باوجود چیف جسٹس انوار الحق نے اسے سماعت کی تکمیل تک رہنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ایک دوسرے آزاد خیال جج کو ماہ ستمبر میں فارغ کر دیا گیا جب اپنی آنکھ کے پیچھے جریان خون نے اسے عارضی طور پر سر درد اور کمزوری کا شکار کر دیا۔ اس کی درخواست کہ عدالت مختصر عرصہ کیلئے کارروائی ملتوی کر دے تاکہ اس کی صحت بحال ہو جائے، مسترد کر دی گئی۔ اس طرح توازن ہمارے خلاف ہو گیا۔ یعنی چار کے مقابل تین کا۔ سپریم کورٹ کا چیف جسٹس ویسا ہی متعصب تھا جیسا اس کا لاہور ہائی کورٹ کا ثانی تھا۔ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی طرح جس کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم تھے، انوار الحق بھی ضیاء کے پیدائشی ضلع جالندھر انڈیا کا رہنے والا تھا۔ اور ابھی تک انتظامیہ اور عدلیہ کے درمیان علیحدگی کا کوئی شائبہ بھی نہیں تھا۔ جب ضیاء ستمبر ۱۹۷۸ء میں حج پر مکہ روانہ ہوا تو انوار الحق نے قائم مقام

صدر کا حلف اٹھایا۔ چیف جسٹس کے عدالتی خلوت خانہ سے چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کے دفتر تک ٹیلی فون کی ہاٹ لائن بھی رابطہ کے لئے بچھادی گئی تھی۔

مجھے انوار الحق کا میرے والد کے خلاف تعصب کا اس وقت انکشاف ہوا جب برس ہا برس بعد وطن سے جلاوطنی کے دوران سپریم کورٹ کے ایک جج صفدر شاہ سے ملاقات ہوئی۔ اپیل کی سماعت کے دوران انوار الحق، صفدر شاہ کو ایک طرف لے گیا اور سمجھانے لگا۔ ''ہم جانتے ہیں کہ بھٹو بے گناہ ہے مگر پاکستان کو بچانے کیلئے اسے ختم کرنا ضروری ہے''۔ صفدر شاہ نے میرے والد کی باعزت برائت کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اور اس لئے انوار الحق اور حکومت نے اس پر تشدد کیا جس کے سبب اسے وطن سے جلاوطن ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کے باوجود سپریم کورٹ میں مقدمہ کی سماعت کے دوران ضیاء اور انوار الحق دونوں یہ دعویٰ کرتے رہے کہ میرے والد کی اپیل آزاد عدلیہ کے روبرو سنی جاری تھی۔ ''ہم شہادت کو کھلے دل سے قبول کر رہے ہیں'' انوار الحق نے اصرار کیا۔

ہم کیا کر سکتے تھے؟۔ حکومت کا عدالتوں، فوج، اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر کنٹرول تھا۔ میرے والد کی شہادت کو داغدار کرنے کیلئے جھوٹے الزامات سے بھرپور قرطاس ابیض حکومت نے وقتاً فوقتاً چار زبانوں میں جاری کئے اور ان کو غیر ملکی سفارتخانوں میں تقسیم کیا۔ اسی دوران مدعی احمد رضا قصوری یورپ اور امریکہ کے دورے پر گیا .... گراں ہوٹلوں میں قیام کیا اور پاکستان میں میرے والد کے مقدمہ میں انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھنے کے متعلق سرکاری پراپیگنڈے کے حق میں پریس کانفرنسیں کیں۔ قصوری کا دعویٰ تھا کہ وہ یہ تمام اخراجات اپنی جیب سے کر رہا ہے۔ لیکن ضیاء کے مارشل لاء قوانین کے تحت جو گوشوارے اس نے اور پی پی پی کے ہر رکن نے پیش کئے اس کے دعویٰ کے ثبوت کی نفی کرتے تھے اور مالی انکشافات نے اس کی بے ضابطگی واضح طور پر ثابت کر دی۔ اس کے اخراجات کیلئے ادائیگی اگر حکومت نے نہیں کی تو کس نے کی؟۔

''میں چاہتا ہوں کہ ستمبر میں تم صوبہ سرحد کا دورہ کرو'' میرے والد نے مجھے کہا۔ ''ہمیں عوام کا حوصلہ بلند رکھنا ہے۔ میری ماؤ والی ٹوپی اپنے ساتھ لے جاؤ وہ

۷۰ - کلفٹن میں میرے لباس والے کمرے میں پڑی ہے۔ اسے پہنو اور تقریر کے دوران اسے اتار کر زمین پر رکھ دو۔ انہیں بتاؤ میرے والد نے کہا تھا کہ ان کی ٹوپی ہمیشہ عوام کے قدموں میں پڑی رہے گی"۔

میں نے انہیں بغور سنا لیکن مجھے ان کی صحت کے بارے میں تشویش تھی۔ ہر مرتبہ جب میں نے انہیں جیل میں دیکھا وہ پہلے سے زیادہ کمزور لگے۔ ان کے مسوڑھے گہرے سرخ ہو چکے تھے اور جگہ جگہ متورم تھے۔ اکثر انہیں بخار رہتا تھا۔ والدہ اور میں مرغی کے گوشت کے سینڈوچ بنا کر لے جاتے تاکہ انہیں کھانے کی خواہش ہو۔ ہم سینڈوچوں کو گیلے کپڑے میں لپیٹ کر لے جاتیں تاکہ وہ نرم اور تازہ رہیں۔ لیکن میرے والد نے ہماری ستمبر کی ملاقات کے دوران کھانے کی طرف رغبت کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ اس کی بجائے وہ مجھے تقریروں کے مواد کے مختلف نکات سکھاتے رہے جو میں نے آئندہ کرنا تھیں۔

"مارشل لاء کے نتیجہ میں خود مختاری کے تمام مسئلہ کو اجاگر کیا جائے گا" انہوں نے بتایا "لوگوں کو یاد دلاؤ کہ کس طرح بذریعہ جمہوریت میں نے متحدہ پاکستان میں اعتماد کو بڑھایا تھا اور صرف جمہوریت میں واپسی ہی ملک کو متحد رکھ سکتی ہے"۔

ان کے چہرے پر تشویش کے اثرات تھے جب میں وہاں سے آئی۔ "پنکی! میں تمہیں کسی خطرے میں مبتلا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے بدترین مایوسی کے عالم میں وہ تمہیں گرفتار کر لیں۔ میں نے اس مسئلہ پر آغاز ہی سے دھیان دیا ہے لیکن مجھے ساتھ ہی ان ہزاروں کارکنوں کا بھی خیال آتا ہے جن کو ہمارے نظریہ کی بلندی کیلئے کوڑے لگائے جاتے ہیں اور اذیتیں دی جاتی ہیں"۔

"پاپا! مزید کچھ نہ کہیں" میں نے جلدی میں کہا۔ "مجھے علم ہے کہ بطور باپ آپ بیٹی کیلئے متفکر ہیں۔ لیکن آپ میرے صرف باپ ہی نہیں ہیں۔ آپ میرے سیاسی راہنما بھی ہیں جیسے ان ہزاروں دوسروں کے ہیں جو مصیبت میں مبتلا ہیں"۔

"محتاط رہو پنکی" انہوں نے میرے جاتے جاتے آواز دی۔ "تم قبائلی علاقہ میں جا رہی ہو مت بھولو کہ وہ کتنے قدامت پسند ہیں۔ تقریر کرتے ہوئے بعض اوقات تمہارا

دوپٹہ سر سے لڑھک جاتا ہے دوبارہ سر پر رکھنا یاد رکھو"۔

"میں محتاط رہوں گی، پاپا" میں نے انہیں یقین دلایا۔

"خوش قسمت رہو، پنکی" میں نے انہیں کہتے ہوئے سنا۔

وکٹوریا بھی شمال مغربی سرحدی صوبہ اور قبائلی علاقوں میں میرے ہمراہ آئی۔ یہ علاقے مغرب میں افغانستان اور شمال میں چین سے متصل ہیں۔ یاسمین بھی ہمارے ہمراہ تھی۔ جو اس نوجوان لڑکی کیلئے ایک بہادرانہ شعار تھا باوجودیکہ وہ ایک روایتی پابندی رسم و رواج پاکستانی خاندان کی ایک رکن تھی۔ اس نے ایک شب بھی کبھی گھر سے باہر نہیں گزاری تھی حتیٰ کہ میں نے فلیشن مین ہوٹل میں ایک رات دیر تک ٹھہرائے رکھا تھا۔ اس کی وادی نے چاروناچار میرے پاس رہنے کی اجازت دیدی تھی حکومت سے کسی خطرے کی بنا پر نہیں بلکہ اس روایت کی وجہ سے جو نا کتخدا لڑکیوں کو گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں دیتی۔

لیکن حکومت کے ظالمانہ رویوں کی وجہ سے بہت سے دوسرے خاندانوں کی طرح نیازیوں میں بھی بغاوت کے آثار پیدا ہوگئے تھے۔ کثیراخراجات اٹھنے کے باوجود نیازی خاندان مصر تھا کہ میں ہوٹل کی بجائے ان کے گھر میں خاندان کے ایک فرد کی طرح قیام کروں انتقاماً حکومت نے اس خاندان کو متواتر ہراساں کیا۔ ٹیکسوں کے دعوے ان کے خلاف کھڑے کئے گئے۔ ان کے گھر کے مقابل گلی میں خفیہ ایجنسیوں کے ٹرک کھڑے رہتے جو مسز نیازی کا مارکیٹ تک اور ان کے بچوں کا سکول تک پیچھا کرتے۔ خفیہ ایجنٹ ڈاکٹر نیازی کے مریضوں کو بھی تنگ کرتے یہاں تک کہ ان کی پریکٹس صفر ہو گئی۔

پی پی پی کے مقامی راہنماؤں کے ہمراہ ہم اکٹھے مردان گئے جو کبھی گندھارا بدھ مت کی تہذیب کا مرکز ہوتا تھا۔ ایبٹ آباد جو ایک سابقہ برطانوی پہاڑی صدر مقام تھا اور پشاور جو صوبہ سرحد کا دارالحکومت ہے جس کی زرد اینٹوں کی دیواروں نے وسط ایشیاء کے حملہ آوروں سے صدیوں تک حفاظت کی۔ صوبہ سرحد اور خودمختار قبائلی علاقوں میں جہاں پٹھان سختی سے اس محاورہ پر عمل کرتے ہیں کہ بے عزتی کا انتقام ضرور لینا ہے اور مہمان کی خاطر تواضع بھی فرض ہے میں نے ہر سٹاپ پر تقریر کی اور الفاظ بے کدو کاوش دل کی

گہرائیوں سے نکلتے رہے۔ پٹھان اپنی عزت کی حفاظت کیلئے بہت شہرت رکھتے ہیں۔ ''میرے والد نہ صرف اپنی عزت کی خاطر لڑرہے ہیں بلکہ پورے ملک کی عزت کیلئے جنگ آزما ہیں'' میں نے ہجوموں کو مخاطب کر کے کہا جن میں لوگ اتنے ہی اکھڑ اور کھردرے تھے جیسے درہ خیبر کے پہاڑوں کے نقوش۔ ہم سرسبز چاولوں کے تہ در تہ کھیتوں کے شہر سوات گئے اور اسی طرح کوہاٹ جہاں نمک کا سلسلہ ء کوہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جس کی فضاء میں نمک کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ میں نے تقریریں اردو میں کیں کیونکہ میں پشتو جو ان کی علاقائی زبان ہے نہیں جانتی تھی۔ مگر پٹھانوں نے مجھے پھر بھی انہماک سے سنا۔ مجھے کسی جگہ بھی بطور ایک عورت ہونے کے کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا حالانکہ قبائلی علاقوں میں عورتوں پر شدید قسم کی پابندیاں ہیں۔ ملک بھر میں اذیتیں، میرے اہل خاندان کی اذیتیں ہم سب کی اذیتیں جنس کی کسی تفریق کی قائل نہیں تھیں۔ ''راشا، راشا بے نظیر راشا'' لوگ پشتو میں چیخ چیخ کر پکار رہے تھے۔ ''خوش آمدید بے نظیر، خوش آمدید''۔

''شاباش'' میرے والد نے میرا استقبال کیا جب وہ اپنی کوٹھڑی کے دروازے پر ایستادہ تھے اور اپنے ہاتھوں سے تالی بجا رہے تھے جب میں راولپنڈی واپس آئی اور پنجاب کے دورے پر روانہ ہونے والی تھی۔ لاہور میں مجھے سننے کیلئے پارٹی کے ایک عہدے دار کے گھر پر پی پی پی کے ہزاروں متحرک کارکن جمع ہوگئے۔ حکومت کی سخت سزاؤں کے باوجود، پارٹی کارکنوں کا جذبہ ء قربانی لازوال تھا۔ ''مقدمہ کا فیصلہ نامنصفانہ ہے ہم اس کے خلاف گرفتاریاں دے کر احتجاج کریں گے'' پی پی پی کے وفادار دوستوں نے مجھے بتایا'' سزائے موت پر عمل کرنے سے پہلے ضیاء کو ہم سبھی کو حراست میں لینا ہو گا۔ سرگودھا میں جہاں جاگیرداروں کا اثر و رسوخ باقی ہے زیادہ بڑے ہجوم جمع ہوئے۔ ہماری تحریک میں سرگرمی پیدا ہو رہی تھی اور حکومت نے اسے دبانے کا فیصلہ کر لیا۔ سرگودھا سے میری روانگی کے بعد پی پی پی کے سینکڑوں کارکنوں کو حراست میں لیا گیا ان میں میرا وہ میزبان بھی شامل تھا جس کا صرف یہ جرم تھا کہ اس نے اپنے گھر کو مجھے استعمال کرنے کی اجازت دی تھی۔ اس

پر اسے ایک سال کی قید بامشقت اور ایک لاکھ روپے جرمانے کی سزا دی گئی۔

حکومت چڑچڑی ہو گئی ہے۔ "ابھی ہمیں ملتان نہیں جانا چاہئے" پارٹی کے کچھ کارکنوں نے لاہور واپسی پر دلیل پیش کی۔ "اس سرگرمی کو جاری رہنا چاہئے"۔ بعض دوسروں نے جواب دیا۔ "جب جذبات بلندی پر ہیں تو ہمیں گرفتاری پیش کرنے سے بھی احتراز نہیں کرنا چاہئے" "اگر ہم اس وقت تھوڑا سا پیچھے ہٹتے ہیں تو ہمیں زیادہ مقدمات پر جانے اور زیادہ لوگوں سے رابطہ کا موقع ملے گا" بحث جاری رہی۔ یہ دوسری چال کامیاب رہنے کی توقع میں اس پر عمل کیا گیا اور میں حکومت کے عائد کردہ ایک اور الزام کی جواب دہی کیلئے کراچی واپس چلی گئی۔

دریں اثناء جمہوریت سے عوام کی وابستگی نئی رفعتوں تک پہنچ چکی تھی۔ اپنے راہنما کے متصورہ انجام کے خلاف آخری حربے کے طور پر احتجاج کیلئے مختلف شہروں میں ایک کے بعد دوسرے کارکن نے خودسوزی کرنا شروع کردی۔ "مساوات" میں ان کی تصویریں چھپیں تو میں نے ان میں سے دو اشخاص کو پہچانا۔ ایک عزیز تھا جو چند ماہ قبل فلیشن مین ہوٹل میں میرے پاس اس درخواست کے ساتھ آیا تھا کہ میں اس کے ہمراہ ایک تصویر کھنچواؤں۔ اگرچہ میں تھکی ہوئی تھی مگر میں نے وعدہ کرلیا اور مجھے اپنی چھوٹی سی کوشش پر بھی ہمیشہ فخر رہے گا کہ میں نے اس شخص کے ہمراہ تصویر کھنچوائی جو ہمارے لئے زندہ جل مرا۔

دوسرا جیالا ایک عیسائی پرویز یعقوب تھا جس نے سب سے پہلے خودسوزی کی۔ ستمبر ۱۹۷۷ء میں میرے والد کی گرفتاری کے چند دن بعد وہ ایک جانکاہ تجویز لے کر میرے پاس آیا۔ اس نے ایک مائل پرواز طیارہ کو ہائی جیک کرکے مسافروں کو یرغمال بنانا تھا۔ میں نے اسے کہا "تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے بے گناہ لوگ مارے جائیں گے اور اس غیر قانونی حرکت سے تم بھی حکومت سے مختلف نہیں رہو گے۔ ہم اپنے اصولوں کے مطابق لڑیں گے اور ان کی طرح پست ذہنیت کا مظاہرہ نہیں کریں گے" اس نے لاہور میں خودسوزی کرکے اپنی آخری قربانی پیش کردی تھی۔

جب ہجوم شعلے بجھانے کیلئے آگے بڑھا تو پرویز کی زندگی بچائی جاسکتی تھی مگر مارشل لاء حکام نے اس تک کسی کو بھی پہنچنے نہ دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ اس کے درد و اذیت کا نظارہ کرسکیں تاکہ بھٹو کے چاہنے والوں کو دوبارہ ایسا کرنے کی جرات نہ ہو۔ لیکن ان کی ایسی کوششوں کے باوجود لوگوں کے جذبات بھڑکے اور اگلے چند ہفتوں میں پانچ مزید آدمیوں نے اپنے منتخب وزیراعظم کی زندگی بچانے کی خاطر خودسوزی کی۔

حکومت نے دعویٰ کیا کہ خودسوزی کرنے والے کارکنوں کو پارٹی نے رقم دے کر ایسا کرنے پر اکسایا۔ میں نے ملتان میں اپنی تقریر کیلئے مختصر اشارے تحریر کرتے ہوئے نوٹ کیا۔ ''کیا انسانی زندگی کی پیسوں میں کوئی قیمت ادا کی جاسکتی ہے؟ نہیں یہ بہادر آدمی اپنے نظریات کے پجاری ہیں جن کی جمہوریت اور نیکی سے وابستگی ذاتی کرب و اذیت سے ماورا ہے ہم انہیں سلام کرتے ہیں'' لیکن مجھے تقریر کرنے کا موقع نصیب نہ ہوا۔

۴ر اکتوبر ۱۹۷۸ء ملتان ائیر پورٹ

پنجاب کے اپنے دورے پر روانہ ہونے پر کراچی سے ملتان کی پرواز میں سوار ہونے کے لئے کراچی ائیر پورٹ پہنچی تو پرواز میں تاخیر ہوتی گئی۔ یاسمین اور میں صبح ۷ بجے پہنچیں مگر پرواز دوپہر سے قبل روانہ نہ ہوسکی۔ جب ہم ملتان پہنچیں تو ہمیں سبب کا پتہ چلا۔ طیارے کو مقام آمد پر پہنچانے کی بجائے رن وے کے سرے پر لے جاکر کھڑا کر دیا گیا۔ اور اسے فوراً فوجی ٹرکوں اور جیپوں نے گھیرے میں لے لیا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس دو جوانوں نے پوچھا ''مس بے نظیر بھٹو کہاں بیٹھی ہے؟''۔

ائیر ہوسٹس نے میری طرف اشارہ کیا۔

''ہمارے ساتھ آؤ'' وہ کہتے ہیں۔

''کس وجہ سے؟''۔

''سوالات مت پوچھو''۔

ایک چھوٹا طیارہ پاس ہی کھڑا ہے جب یاسمین اور میں نیچے آتی ہیں۔ ''تم اس طیارے میں سوار ہوجاؤ'' وہ افسر کہتے ہیں۔ ''یہ یہیں ٹھہرے گی'' وہ یاسمین کی طرف اشارہ کرکے

کہتے ہیں میں یاسمین پر نگاہ ڈالتی ہوں۔ اس کی آنکھیں چہرے پر بھاری بھاری محسوس ہوئیں۔ ایک نوجوان لڑکی اور وہ بھی ایک اجنبی شہر میں اکیلی خدا جانتا ہے کہ اس سے کیا سلوک ہوتا ہے؟۔ کتنے بنیاد پرست اور مارشل لاء کے اہل کار پاکستان بھر میں ان خواتین پر چیختے ہیں جنھوں نے میرے والد کی حراست، اپنے شوہروں، بیٹوں اور سب سے بڑھ کر اپنی بیٹیوں کی حراست کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے اپنے گھروں کی مقدس دیواروں کو پہلی مرتبہ خیرباد کہا ہے۔ یاسمین بھی فکر مند ہے کہ میرے ساتھ کیا سلوک ہو سکتا ہے؟۔ تعداد میں حفاظت محسوس ہوتی ہے۔

"میں اس کے بغیر نہیں جاؤں گی" میں پولیس کو کہتی ہوں۔

"طیارے میں سوار ہو جاؤ" وہ آنکھیں بھینچتے ہوئے کہتے ہیں۔

"میں سوار نہیں ہوں گی" یاسمین کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور فرش کے پار کھینچنا شروع کر دیتے ہیں۔ "مت چھوڑو، یاسمین!" میں اسے چیختے ہوئے پکارتی ہوں اور وہ میرے ساتھ چمٹے رہنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔

جہاز کے مسافر جن کے درمیان میں سے ہمیں نیچے لایا گیا خوف زدہ ہمیں دیکھتے ہیں جبکہ یاسمین اور مجھے سیمنٹ پر گھسیٹا جا رہا ہے۔ میری شلوار پھٹ جاتی ہے۔ میری ٹانگوں کی جلد کھرچی جاتی ہے اور خون بہنا شروع ہو جاتا ہے یاسمین چیخ رہی ہے لیکن ہم ایک دوسرے کو نہیں چھوڑتیں۔

پولیس کے ریڈیو سیسنا کی سیڑھیوں پر بج اٹھتے ہیں۔ معمول کے مطابق وہ پریشان ہیں، اور اوپر سے ہدایات کے منتظر ہیں۔ جب پولیس والے مصروف ہیں تو میں اور یاسمین دوڑ کر سیسنا میں سوار ہو جاتی ہیں۔ یہ طیارہ تین سواریوں کے لئے مخصوص ہے۔ پائلٹ پولیس کو بتاتا ہے کہ اگر وہ فوراً پرواز پر روانہ نہیں ہوتا تو فضاء اتنی تاریک ہو جائے گی کہ اسے جہاز اتارنا مشکل ہو جائے گا۔ کہاں اترنا ہے؟ ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ ملتان کا کور کمانڈر پائلٹ کے پیغام پر سیخ پا ہے وہ پولیس کو ہدایت کرتا ہے کہ پائلٹ کو روانہ ہونے دیں۔ لیکن جہاز رن وے سے اوپر نہیں اٹھتا۔

"میں نے صبح سات بجے سے نہ کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے" پائلٹ آہستہ سے پولیس کو

وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کراچی میں قائد عوام فلائی اوور کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں

بتاتا ہے۔ وہ اس کے لئے فوراً لنچ بکس لے آتے ہیں۔ اس نے کور کمانڈر کو پانی کے لئے میری خواہش مسترد کرتے سنا تھا۔ اور ہمارے حوالے کر دیتا ہے۔ ''میں تو کھاچکا ہوں یہ بکس میں نے آپ کے لئے حاصل کیا ہے'' وہ کہتا ہے پانچ گھنٹے بعد ہم واپس راولپنڈی پہنچ جاتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ پنڈی ہے کیونکہ میں اس سپاہی کو پہچانتی ہوں جو مجھے طیارے سے لینے آتا ہے۔ کم از کم اتنا تو ہوا کہ یاسمین اپنے گھر آگئی۔ جب میں طیارے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرتی ہوں تو پائلٹ میری طرف مڑتا ہے ۔ میں اس کے مہربان چہرے پر تشویش کے آثار دیکھتی ہوں اس کی آنکھیں اشک آلودہ تھیں۔ ''میں سندھی ہوں'' اس نے صرف یہی کہا یہ کہنا ہی سب کچھ تھا۔

میری والدہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں جب میں اس گھر میں پہنچی جہاں ان کی نظر بندی کا دسواں مہینہ شروع ہوچکا تھا۔ ''کیا پر مسرت حیرانی ہے'' انہوں نے کہا، یہ سوچتے ہوئے کہ میں ان سے ملاقات کے لئے آئی ہوں۔ ان کی آنکھیں دراز ہوگئیں جب انہوں نے میرے پھٹے ہوئے کپڑے اور خون آلودہ ٹانگیں دیکھیں۔ ''اوہ! میں سمجھ گئی ہوں'' انہوں نے اپنی دھیمی پڑتی ہوئی آواز میں کہا۔ ہم پھر دونوں اکٹھی نظر بند تھیں۔

میں نے میر کو امریکہ خط لکھا جہاں وہ اقوام متحدہ سے اپیل کرنے کیلئے گیا تھا تاکہ حکومت پر معتدبہ دباؤ ڈال سکے۔ ''پاپا نے مجھے تمہاری راہنمائی کے لئے چند سطور لکھنے کو کہا ہے۔ وہ تنقید نہیں کر رہے صرف مشورہ دے رہے ہیں چنانچہ انہوں نے جو کچھ کہا'' درج ذیل ہے۔

ا۔ ''قیصر کی بیگم کو شکوک سے بالاتر ہونا چاہئے۔'' پریس نے یہاں پراپیگنڈہ کیا ہے کہ تم لندن میں عیاشی کی زندگی بسر کر رہے ہو حالانکہ پاپا یہ بات نہیں مانتے۔ لیکن وہ چاہتے ہیں کہ میں تمہیں یاد دلادوں کہ تمہیں محتاط ترین زندگی بسر کرنی چاہئے۔ کوئی فلمیں نہیں، فضول خرچی نہیں ورنہ لوگ طنزاً کہیں گے کہ تم عیاشی کر رہے ہو جب کہ تمہارا والد موت کی کوٹھڑی میں کراہ رہا ہے۔

۲:۔ کسی کو انٹرویو مت دو اور مکمل طور پر ہندوستان اور اسرائیل سے بچو ایک ہندوستانی اخبار کو تمہارے انٹرویو سے یہاں غلط نتائج نکالے گئے ہیں۔ اور اسی طرح سے بعض دوسری باتیں۔

میں میر کو تحکمانہ لہجے میں خط لکھنا نہیں چاہتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کتنی محنت کر رہا ہے اس نے میری چھوٹی گاڑی بیچ دی تھی اور اس رقم کو حکومتی الزامات کے خلاف میرے والد کے جواب کو لندن میں طباعت کے لئے استعمال کیا۔ وہ حکومت کے ہر غیر ملکی رکن سے ملاقاتیں کرتا اور انگلستان میں اپنے والد کی سزائے موت کے خلاف پاکستانی جلوسوں کی راہنمائی بھی۔ میں خواہش کرتی کہ کاش ہم دونوں متحدہ طور پر یہ لڑائی لڑتے۔ لیکن اس کے اور شاہ کے لئے جو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر بیرون ملک یہ لڑائی لڑ رہے تھے ممکن نہیں تھا کہ واپس پاکستان آتے، کیونکہ یہاں آتے ہی انہیں گرفتار کر لیا جاتا۔ ہم سب اکیلے اکیلے یہ جنگ لڑنے پر مجبور تھے۔

۱۸ر دسمبر ۱۹۷۸ء سپریم کورٹ راولپنڈی

عدالتی کمرے میں لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا جو اپنے وزیراعظم کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے بیتاب تھے۔ ایک طویل عدالتی جنگ کے بعد میرے والد کے وکلاء نے ان کی مدافعت کے لئے سپریم کورٹ میں پیش ہونے کا حق منوالیا تھا۔ عدالتی کمرے میں صرف ۱۰۰ نشستوں کی گنجائش تھی مگر وہاں ۳۰۰ سے چار سو تک لوگ جمع ہو چکے تھے۔ جو چار دن تک ان کے خطاب کو سننا چاہتے تھے...... وہ قانونی کتابوں کے گٹھوں پر بیٹھ گئے بغلی راستوں میں جگہ بنالی اور عدالتی بنچ کے بالکل سامنے بیٹھے۔ ہزاروں لوگ وہ بھی تھے جنہیں اندر آنے نہیں دیا گیا...... وہ باہر انتظار کرتے رہے تاکہ جب میرے والد پولیس کی گاڑی میں ۹ بجے صبح عدالت میں آئیں یا جب دوپہر کو واپس جیل جانے کے لئے باہر نکلیں تو وہ انہیں دیکھ سکیں۔

میں بھی وہاں جانے کے لئے بری طرح بیتاب تھی لیکن میں نظر بند تھی اور میری

درخواست جس میں عدالت میں حاضری کی اجازت مانگی گئی تھی مسترد کر دی گئی تھی۔ تاہم میری والدہ جنہیں ایک سال کی نظر بندی کے بعد رہا کر دیا گیا تھا وہاں جا سکتی تھیں۔ میرے والد کے خدمت گار عرس نے کسی طرح عدالتی پاس حاصل کر لیا تھا۔ اسی طرح مسز نیازی، یاسمین، وکٹوریا اور امینہ نے بھی بندوبست کر لیا۔ بعد میں وکٹوریا کا ارادہ میرے والد کی مشکلات کے بارے میں ایک کتاب بعنوان "بھٹو، مقدمہ اور پھانسی" تحریر کرنے کا تھا۔ اس کا بہتر نام "عدالتی قتل" ہوتا۔

میرے والد کا بیان بہت بلند پایہ تھا میری والدہ نے مجھے بتایا کہ چار دنوں میں جب انہیں عدالت کو خطاب کرنے کی اجازت دی گئی انہوں نے قتل کے مقدمہ میں اپنے خلاف سازش کے الزامات کو یکسر مسترد کیا۔ لاہور ہائی کورٹ کی سماعت کے دوران شہادتوں میں بے قاعدگیوں اور تضادات کی نشان دہی کی۔ اس بات کو بھی رد کیا۔ کہ وہ صرف نام کا مسلمان ہے۔ اور اس الزام کو بھی کہ اس نے انتخابات میں خود دھاندلی کی۔ "ہماری زر خیز وادی سندھ کے ہر سرکاری یا غیر سرکاری ملازم کے ذہن میں جو سوچ یا خیال پیدا ہوتا ہے میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں" انہوں نے کہا۔ فی البدیہہ اور بغیر نوٹس کے بولتے ہوئے میرے والد نے حیرت زدہ ہجوم پر اپنی ذہانت اور خطابت کا ایک مرتبہ پھر جادو جگا دیا۔

"ہر وہ شخص جو گوشت پوست کا بنا ہوا ہے اس دار فانی سے ایک دن کوچ کر جاتا ہے میں زندہ رہنے کے لئے زندگی نہیں چاہتا مجھے انصاف چاہئے"

انہوں نے کہا "سوال میری بے گناہی کے ثبوت کا نہیں سوال تو یہ ہے کہ استغاثہ بغیر کسی شک اور شبہ کے اپنا کیس ثابت کرے۔ میں ذوالفقار علی بھٹو کی ذات کے لئے اپنی بے گناہی ثابت کرنا نہیں چاہتا بلکہ ان اعلیٰ اقدار کو قائم کرنا چاہتا ہوں کہ کس طرح اتنی گھمبیر بے انصافی کا ڈول ڈالا گیا ہے ڈریفس کے مقدمہ کو بھی یہ کیس پس پشت ڈال دیتا ہے۔"

میرے والد کا عدالت میں بیان باوجود قبیح حالات کے جن میں انہیں رکھا گیا تھا بہت

شاندار تھا فوج کے حکام نے مسلسل کئی راتوں تک انہیں سونے نہیں دیا اور موت کی کوٹھڑی میں چھ ماہ سے زائد عرصے تک انہیں سورج کی روشنی سے بھی محروم رکھا اور ۲۵ دن تک تازہ پانی کی بوند بھی انہیں میسر نہیں تھی۔ وہ زرد اور کمزور ہو گئے تھے والدہ نے مجھے بتایا تھا۔ لیکن انہیں عدالتی بیان کے دوران کچھ طاقت حاصل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "کچھ سر چکراتا ہے" انہوں نے عدالتی کمرے میں اعتراف کیا۔ "میں لوگوں کے ہجوم اور مقدمہ کی تیز رفتار سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا" انہوں نے ہجوم کی طرف نگاہ کرتے ہوئے کہا "البتہ لوگوں کو دیکھ کر اطمینان محسوس ہوتا ہے"

عدالتی کمرے میں لوگ ان کی ہر مرتبہ کی آمدورفت پر احترام میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ عوام کے سامنے اپنی پرانی عادت کے مطابق بے داغ لباس اور سلیقہ کے ساتھ وزیراعظم کے طور پر جانا پسند کرتے۔ عرس ۷۰ کلفٹن سے ان کے وہ تمام ملبوسات لے آیا تھا جو انہوں نے مانگے تھے اور عدالت میں پہلے دن وہ بہترین سلے ہوئے سوٹ، ریشمی قمیص اور ٹائی اور جیب میں رنگین رومال پہنے ہوئے حاضر ہوئے ان کی ڈھیلی پتلون سے یہ عیاں تھا کہ ان کا کتنا وزن کم ہو گیا ہے۔ پہلے پہل حکام نے انہیں عدالت میں مرکزی دروازے سے بلاٹوک آنے جانے دیا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ کس شوق سے ان کے ساتھ مصافحہ کے لئے جمع ہو جاتے ہیں اور وہ کس طرح ان کے محبت بھرے جذبات کا مسکرا کر اور انہیں تھپ تھپا کر جواب دیتے ہیں حفاظتی پہرے داروں نے ان کے گرد گھیرا ڈالنا شروع کر دیا۔ سماعت کے آخری تین دنوں میں حفاظتی عملہ کے چھ سپاہیوں نے انہیں ایک تنگ دائرے میں محصور رکھا۔

۲۳ر دسمبر کو اپیل کی سماعت مکمل ہو گئی۔ میری والدہ اور میں نے ۲۵ر دسمبر قائداعظمؒ کے یوم پیدائش پر انہیں ملنے کی اجازت مانگی۔ ہماری درخواست رد کر دی گئی ہمیں انہیں ملنے کی اجازت نئے سال کے پہلے دن دی گئی نہ ہی پانچ روز بعد ان کی ۵۱ ویں سالگرہ پر۔

۶ر فروری ۱۹۷۹ء کو سپریم کورٹ کا فیصلہ سنایا گیا۔ جس میں چار اور تین کی نسبت سے

سزائے موت برقرار رکھی گئی۔

میری والدہ اور مجھے ۱۱ بجے صبح فیصلے کی اطلاع ملی یعنی سنائے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد۔ ہمیں ضیاء کے عدالتی ججوں سے کسی معجزے کی توقع تھی لیکن چار پنجابی ججوں نے جن میں دو عارضی تقرر پر تھے اور اس فیصلہ کے بعد انہیں مستقل کر دیا گیا۔ نچلی عدالت کے فیصلہ کو برقرار رکھا، جب کہ اقلیتی صوبوں کے تین ججوں نے ان کی رہائی کا فیصلہ دیا۔ میرے والد کی یقینی موت نے مجھے جسمانی طور پر بھی بیمار کر دیا۔

میری والدہ منگل کی اپنی معمول کی ملاقات کے لئے میرے والد کے پاس جانے والی تھیں کہ مارشل لاء حکام نے انہیں کرائے کے ہمارے مکان میں نظر بندی کے احکام پہنچائے۔ لیکن والدہ نے انہیں دھمکایا۔ وہ ابھی مخمصے میں ہی تھے کہ میری والدہ جلدی سے دروازے کے باہر بھاگیں اور اپنی تیز رفتار کار "جیگوآر" میں بیٹھ گئیں۔ "دروازہ کھولو" انہوں نے گھر کے ارد گرد کھڑے پولیس کے پہرے داروں کو حکم دیا جو ملتان ائیر پورٹ سے میری گرفتاری کے بعد سے یہاں موجود تھے۔ انہوں نے یہ نہ جانتے ہوئے کہ میری والدہ کی نظر بندی کے احکام بھی جاری ہوگئے ہیں دروازہ کھول دیا۔ تیز رفتاری کے ساتھ وہ پیچھے آتی ہوئی جیپوں سے آگے نکل گئیں اور راولپنڈی سنٹرل جیل پہنچ گئیں، چونکہ جیل کے حکام ان کی آمد کے منتظر تھے۔ اس لئے انہوں نے انہیں اندر جانے دیا۔ وہ ایک فولادی دروازے سے نکلیں پھر دوسرے سے......، وہ چاہتی تھیں کہ ان کی نظر بندی کے احکام جیل کے حکام کو وائرلیس سے ملنے سے قبل وہ موت کی کوٹھڑی تک پہنچ جائیں۔ میرے والد کی کوٹھڑی کے سامنے صحن میں فوجی پہرے داروں کے خیموں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتی گئیں۔ آخر کار آخری دروازہ بھی کھل گیا۔

میرے والد اپنی موت کی کوٹھڑی میں تھے۔ "اپیل مسترد کر دی گئی ہے" وہ اتنا کہنے میں کامیاب ہو گئیں اس سے پہلے کہ جیل کے حکام اور پولیس ان تک پہنچتی۔ ان کا چہرہ سنجیدگی سے سخت ہو گیا تھا۔ جب انہیں گھر واپس لایا گیا۔ "میں نے کام پورا کر لیا" انہوں نے مجھے بتایا۔ "میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہارے والد کو فیصلہ سناتے وقت ان لوگوں
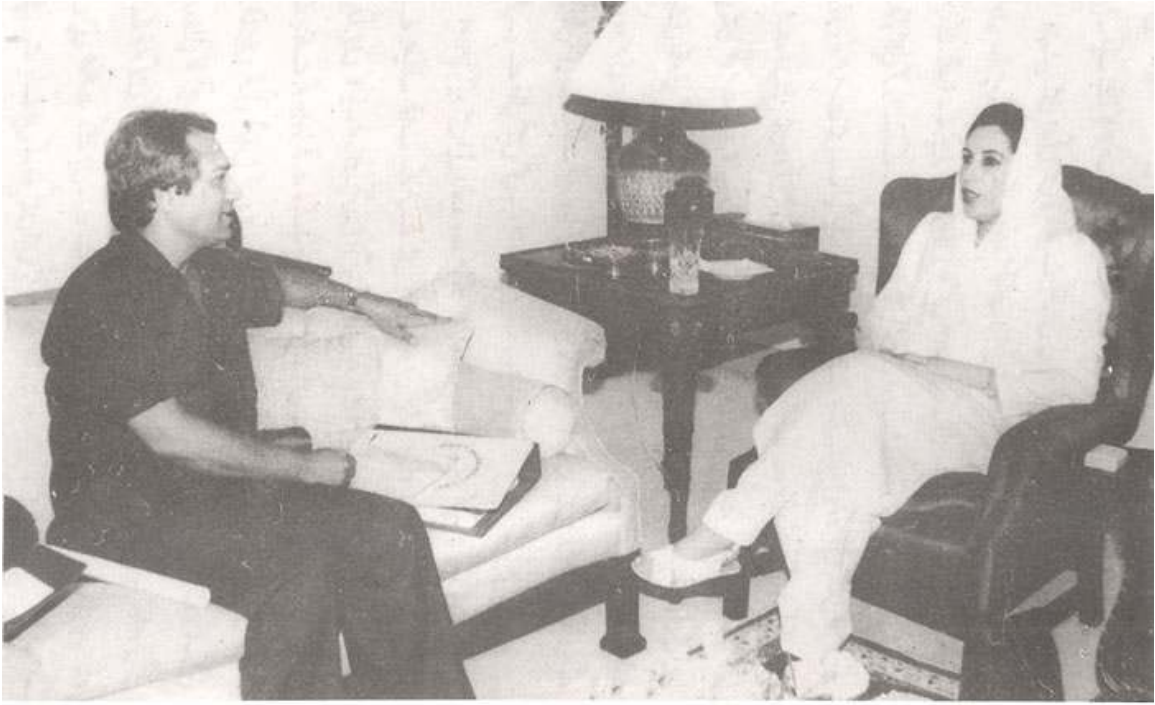
روزنامہ مساوات کے چیف ایڈیٹر سجاد بخاری' وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے ہمراہ

کو قبیح طمانیت کا احساس ہو" ایک مرتبہ پھر ہم دونوں کو زیر حراست کر دیا گیا۔ اور اب صرف ایک ہفتے کا عرصہ والد کی سزائے موت کے خلاف اپیل کے لئے باقی تھا۔

فلیشں مین ہوٹل میں وکلاء نے نظر ثانی کی درخواست پر بلا توقف کام جاری رکھا۔ انہوں نے سپریم کورٹ کے ۱۵۰۰ صفحات (جن میں انوار الحق نے ۸۰۰ سے زیادہ صفحات رقم کئے تھے) کے فیصلے کی چار نقول حاصل کرنے کی درخواست دی۔ ایک سیکرٹری کو اس کی فوٹو کاپی کروانے کے لئے بھیجا۔ فوٹو کاپی کرتے ہوئے اسے اور فوٹو کاپی مشین کے مالک دونوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ چار وناچار وکلائے صفائی نے اپنی فوٹو کاپی مشین حاصل کی اور اسے فلیشں مین ہوٹل میں منتقل کر لیا۔ یہ کام خطرے سے خالی نہیں تھا۔ آغاز سال ہی میں حکومت نے ٹائپ رائٹروں اور فوٹو کاپی مشینوں کی فروخت پر تجارتی حلقوں میں پابندی لگا دی تھی تاکہ زیر زمین سرگرمیاں جاری رکھنے کے لئے لٹریچر کی طباعت پی پی پی یا کسی دوسری سیاسی انجمن کے لئے ممکن نہ ہوسکے۔ کسی ٹائپ رائٹر یا فوٹو کاپی مشین کا فقط استعمال بھی خلاف ملک قرار دیا گیا جب کہ کسی ایسی نئ مشین کی ہمیں فروخت گرفتاری کے خطرے سے خالی نہیں تھی۔ وکلاء کام کرتے رہے۔

اسلام آباد میں اپنی والدہ کے ساتھ نظر بند، میں نے اپنے آپ کو ایک نہ ختم ہونے والے بھیانک خواب کے نرغے میں محصور محسوس کیا۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد گرفتاریوں کا ایک اور دور شروع ہوگیا۔ سکول اور یونیورسٹیاں بند کر دی گئیں ضیاء ہر قسم کے ہنگامے کو بزور قوت دبانے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے احتجاج کے آغاز سے قبل ہی گرفتاریاں کرنی شروع کر دیں تاکہ یہ لہر مزید نہ پھیل سکے۔ فوجی حکومتوں کی ظالمانہ کارروائی کا نتیجہ عوام کی مکمل سرد مہری پر منتج ہوتا ہے۔ جب خطرہ یا تناؤ بلند درجے تک پہنچ جائے تو لوگوں کو اپنی بقا کی فکر شروع ہو جاتی ہے وہ بے رخی اختیار کر لیتے ہیں۔ خاموشی ہی میں اپنی حفاظت سمجھتے ہیں۔ وہ بے حسی میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ وہ اس خوف کی وجہ سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں کہ وہ کہیں اس ظلم کا خود شکار نہ ہو جائیں۔

لیکن میں تو لاتعلق نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ میرے والد کی موت کے سرکاری منصوبے میں

تیزی آرہی تھی۔ میں نے آئینہ دیکھا تو میں اپنے آپ کو نہ پہچان سکی اندرونی تناؤ کی وجہ سے میرا چہرہ سرخ اور پھنسیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں اتنا وزن کھو چکی تھی کہ میری ٹھوڑی، جبڑا اور ابرو باہر کو نکل پڑے تھے۔ میرے رخسار پچک گئے تھے۔ اور جلد کھنچ گئی تھی۔

میں نے اپنی ورزش کو باقاعدگی سے جاری رکھا۔ یعنی صبح سویرے پندرہ منٹ تک ایک ہی جگہ دوڑتے رہنا۔ لیکن میری توجہ میں مرکزیت ختم ہو چکی تھی اور میں سوبھی نہیں سکتی تھی۔ والدہ نے مجھے مسکّن دوائی دی۔ میں نے دو ملی گرام دوائی لی مگر نیند پھر بھی اچاٹ تھی۔ میرے ذہن میں طوفان بپا تھا۔ ایک اور مسکن دوائی "ایٹیوان" کھا کر دیکھ لو، میری والدہ نے مشورہ دیا۔ اس پر میں نے رونا شروع کر دیا میں نے "موگاڈان" کھا کر آزمایا۔ کوئی فائدہ نہ ہوا۔

۱۲ر فروری ۱۹۷۹ء سہالہ پولیس کیمپ

حکام نے والدہ کو اور مجھے صبح ہی بتا دیا کہ وہ ہمیں راولپنڈی میں میرے والد کے قید خانے سے چند میل کی دوری پر واقع پولیس ٹریننگ کیمپ سہالہ میں منتقل کر رہے ہیں ایک بنجر پہاڑی کی چوٹی پر خار دار تاروں میں گھری الگ تھلگ عمارت میں لیجایا گیا۔ کوئی چیز بھی ہمیں مہیا نہ کی گئی نہ کمبل اور نہ ہی خوراک بالکل کچھ بھی نہیں۔ المرتضیٰ کے گھریلو عملہ کے دو ارکان ابراہیم اور بشیر ہر روز طویل فاصلہ طے کر کے ہماری ضروریات کی اشیاء دے جاتے۔

۱۳ر فروری ۱۹۷۹ء

وکلاء نے ۵ بجے صبح اس دن درخواست کی تکمیل کی جس دن پیش کئے جانے کی آخری تاریخ تھی۔ عدالت نے درخواست کی نظرثانی تک میرے والد کی پھانسی کا حکم امتناعی جاری کر دیا۔ ۲۴ر فروری کو عدالت میں سماعت کا آغاز ہوا۔ دریں اثناء پوری دنیا کے سربراہان ممالک کی طرف سے جان بخشی کی اپیلوں کا تانتا بندھ گیا۔ "تمام سیاستدان ایک

ساتھی سیاستدان کی زندگی کو بچانا چاہتے ہیں۔ مگر کسی غیر سیاستدان نے جان بخشی کی اپیل نہیں کی" ضیاء نے ہرزہ سرائی کی اور سربراہان ممالک کی ان اپیلوں کو سوائے ٹریڈ یونین کارروائی کے مطلقاً کسی لائق نہ سمجھا۔

میں نے آغاز ماہ مارچ میں اپنے والد سے ملاقات کی..... میں حیران تھی وہ اب تک کیسے زندہ ہیں۔ انہوں نے جب سے سزائے موت کی تصدیق ہوئی تھی ڈاکٹری علاج سے انکار کر دیا تھا۔ اور کوئی دوائی نہیں کھاتے تھے۔ انہوں نے کھانا بھی چھوڑ دیا تھا اس لئے نہیں کہ دانتوں اور مسوڑھوں میں درد تھا بلکہ اپنے علاج کے خلاف احتجاج کے طور۔ پر انہیں اب ان کی کوٹھڑی میں مقفل رکھا جاتا اور ملحقہ کمرے میں قید خانے کے عمال نے جو کموڈ ان کے لئے رکھا تھا وہ اسے استعمال کرنے سے قاصر تھے۔

عام طور پر ملاقات کے دن کا میں شدت سے انتظار کرتی اور اس مرتبہ خاص طور پر کیونکہ انہیں حیرت زدہ کرنے کے لئے میرے پاس ایک تحفہ تھا میری والدہ آخری گرفتاری سے قبل کراچی گئیں تو وہاں سے میرے والد کا کتا "ہیپی" نظر بندی میں میری دلچسپی کے لئے ساتھ لیتی آئیں۔ میں "ہیپی" کو بہت پسند کرتی تھی۔ ہم سب ہیپی کو پسند کرتے تھے۔ وہ ایک سفید بالوں کا مخلوط النسل کتا تھا جسے میری ہمشیرہ والد کے لئے لے کر آئی تھیں۔ "اب خاموش رہنا" میں نے آہستہ سے ہیپی کو کہا جب اسے کوٹ کی تہ میں چھپائے ہوئے راولپنڈی سنٹرل جیل پہنچی۔ تلاشی کے پہلے مرکز پر میں خوش قسمت تھی کہ جیل سپرنٹنڈنٹ وہاں نہیں تھا۔ کرنل رفیع جو فوجی پارٹی متعینہ جیل کا سربراہ تھا اور ہماری ہر حرکت پر نگاہ رکھتا تھا بھی نہیں تھا۔ "ہیپی" اور میں تلاشی کی دوسری رکاوٹ تک پہنچ گئے۔ خوش قسمتی سے وہاں پر متعین خواتین سپاہیوں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ "ہمیں کتے کی تلاشی کا کوئی حکم نہیں" ایک خاتون نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔ میں قید خانے کے آخری حلقے میں پہنچ گئی۔ "جاؤ اور انہیں خود تلاش کرو" میں نے ہیپی کو چھوڑتے ہوئے کہا۔

ہیپی زمین پر ناک گھسیٹتے ہوئے ایک کوٹھڑی سے دوسری تک گیا۔ میں نے اس کی
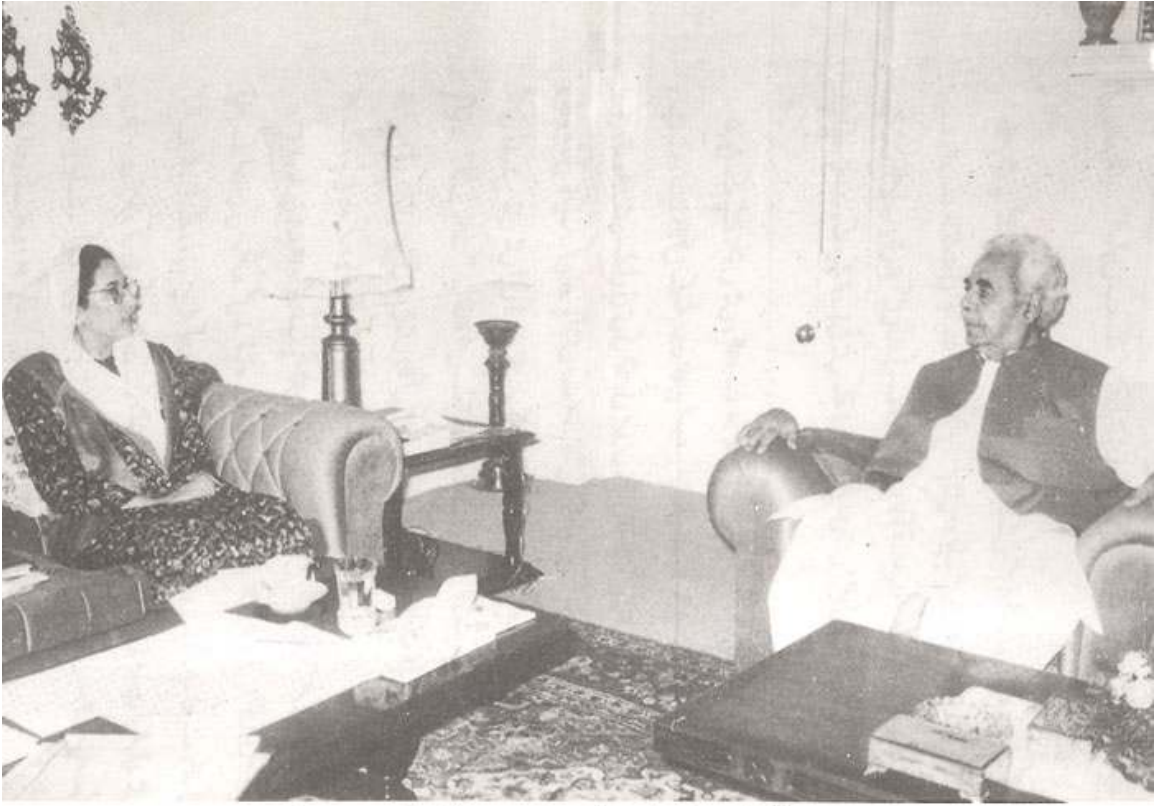
وزیراعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو' اور وزیراعلیٰ پنجاب سردار عارف نکئی

جھنجھناتی ولولہ انگیز آواز سنی جب وہ میرے والد کی کوٹھڑی تک پہنچ گیا والد کے لئے یہ حیرت انگیز واقعہ تھا۔ "انسانوں سے کتے کس قدر زیادہ وفادار ہیں" میرے والد نے میرے پہنچنے پر کہا۔

حکام شدید غصے میں تھے جب انہیں کتے کے بارے میں علم ہوا۔ ہیپی کو دوبارہ کبھی میرے والد سے ملاقات کی اجازت نہ ملی۔ کم از کم میں وہ ایک لمحہ حیرت و خوشی کا لمحہ انہیں دینے میں کامیاب رہی جو ہمیں زندگی کے وہ دن یاد دلاتا تھا جب ہم سب ماں، باپ اور چار بچے ایک چھت کے نیچے اور باغ میں کتے بلیوں کی ہمراہی میں معمول کی گھڑیاں گزار رہے تھے۔

مارچ کے پہلے ہفتوں میں وکلاء نے عدالت میں نظرثانی کی اہمیت پر دلائل کے انبار لگا دیئے۔ وہ اپنے دلائل کے حجم سے تکان محسوس کرنے لگے تھے۔ جب مارچ کے آغاز میں میری والدہ اور میں نے بی بی سی کی شام کی سروس سننا چاہی تو ہمیں پتہ چلا کہ میرے والد کے وکلاء صفائی کا ایک رکن اور پاکستان کے ممتاز قابل احترام وکیلوں میں سے ایک مسٹر غلام علی میمن فلیش مین میں اپنی ڈیسک پر کام کرتے ہوئے دل کا دورہ پڑنے سے وفات پاگیا۔ "اللہ، یااللہ" یہ الفاظ اس نے تب کہے جب وہ سپریم کورٹ کے اکثریتی فیصلے کے خلاف اپنی آخری عدالتی جرح میں دلائل لکھوا رہا تھا۔ مارشل لاء کا ایک اور شکار پار ہو گیا۔ ہم نے ریڈیو بند کر دیا۔ ہم کچھ کہنے میں بے بس تھیں۔

۲۳ر مارچ ۱۹۷۹ء کو جب پاکستان کے بانی محمد علی جناح کے آزاد مسلم ریاست کے قیام کے اعلان کی سالگرہ تھی۔ ضیاء نے اعلان کیا۔ کہ وہ موسم خزاں میں انتخابات منعقد کرائے گا۔ اگلے روز، سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ میرے والد کی درخواست مسترد کر دی گئی عدالت نے متفقہ طور پر سفارش کی کہ سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا جائے۔ ایک مرتبہ پھر ہماری امیدیں سرسبز ہو گئیں۔ فیصلہ اب صرف ضیاء کے اختیارات تک محدود ہو گیا۔

سات روز، یہ سات دن کسی شخص کے لئے سب کچھ تھے جو ضیاء کو میرے والد کو پھانسی

نہ دنے کی ترغیب دلا سکتا ہو۔ اور ضیاء کے پاس ایسا کرنے کیلئے کافی وجوہات تھیں۔ ایسا منقسم فیصلہ خاص طور پر میرے والد کے کیس جیسا جس میں چار اور تین کی نسبت تھی پاکستان میں موت کی سزا پر کبھی بھی منتج نہیں ہوا تھا۔ تاریخ عدالت میں ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کی سزائے موت کو قید تاحیات بدلنے کی سفارش کو حکومت کی انتظامیہ نے قبول کرنے سے بھی انکار نہیں کیاتھا۔ اور برصغیر کی تاریخ میں قتل کے پس پردہ سازش کے لئے کبھی موت کی سزا نہیں دی گئی تھی۔

ضیاء پر غیر ملکی سربراہان کی طرف سے بھی دباؤ تھا۔ غیر ملکی سربراہان کی طرف سے دوبارہ پیغامات آنے شروع ہوگئے۔ برطانیہ عظمیٰ کے وزیراعظم کیلیگان نے ضیاء سے تیسری مرتبہ جان بخشی کی اپیل کی تھی۔ سعودی عرب جو بنیاد پرست اسلام کا مرکز تھا وہاں سے بھی اپیل موصول ہوئی۔ صدر کارٹر نے بھی اس مرتبہ اپیل کرنا مناسب سمجھا۔ لیکن ضیاء کی طرف سے جواب نہیں آ رہا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں میرے والد کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی تھیں۔ لوگوں کو جھوٹی امید دلاتے ہوئے پھانسی کی کوئی حتمی تاریخ طے نہیں کی گئی تھی۔ کوئی شخص بھی ماننا نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ میرے والد کو اس کا علم تھا۔ کہ عدالت کی متفقہ سفارش اور اسلامی حکومتوں کے ساتھ ضیاء کے وعدے کہ وہ سزائے موت کو قید تا حیات میں بدل دے گا جھوٹے ثابت ہوں گے۔ ضیاء نے اس بات کا بھی عندیہ دیا تھا کہ میرے والد کی طرف سے یا ان کے خاندان کی طرف سے جان بخشی کی اپیل کو سزائے موت کو بدلنے کا بہانہ بناسکے گا۔ لیکن میرے والد جو اپنی موت کے برحق اور اٹل ہونے پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ رحم کی اپیل کرنے سے مسلسل انکار کرتے رہے۔ "ایک بے گناہ آدمی اس جرم کے لئے رحم کی اپیل کیوں کرے جو اس نے کیا ہی نہیں" میرے والد ہمیں بھی اپیل سے منع کرتے ہوئے اس بات پر اصرار کرتے رہے ان کی معمر ترین ہمشیرہ جو حیدر آباد میں رہائش پذیر میری پھوپھیوں میں سے ایک تھیں نے بہرحال اپیل کر دی۔ اور آخری وقت ختم ہونے سے ایک گھنٹہ قبل ضیاء کے گھر کے دروازے پر پہنچا دی۔ لیکن ضیاء کی طرف سے پھر بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ علامتیں واضح ہوتی گئیں۔ راولپنڈی سنٹرل جیل

میں میرے والد کی کوٹھڑی میں جو بھی فرنیچر تھا اٹھالیا گیا۔ یہاں تک کہ چارپائی بھی اٹھالی گئی اور انہیں فرش پر اپنے بستر پر لیٹنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ ان کے شیو کرنے کا استرا بھی غائب کر دیا گیا اور صاف ستھری شیو کرنے والے شخص کے چہرے پر ملگجی رنگ کی ریش کے بال اگ آئے تھے۔ وہ بہت بیمار اور بہت کمزور تھے۔

سہالہ میں مجھے مزید پندرہ روز کی نظر بندی کا حکم دیا گیا کیونکہ بصورت دیگر میں اپنے والد کی رہائی کے لئے احتجاجی سیاست کا رخ کرنے والی تھی اور مارشل لاء کی کار گزاری کے لئے رکاوٹ ثابت ہو سکتی تھی۔

کسی شخص کو علم نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے کیا ضیاء حقیقتاً اپنی بات پر اڑا رہے گا۔ اور میرے والد کو سردار لٹکا دے گا۔ اور عالمی مذمت اور عدالتی سفارش کی کوئی پراہ نہیں کرے گا؟ اگر ایسا ہی ہے تو کب؟ اس کا جواب ہم پر ۳/ اپریل کو عیاں ہو گیا جب میری والدہ کو اور مجھے آخری ملاقات کیلئے لے جایا گیا۔

یاسمین! یاسمین! وہ انہیں آج قتل کر دیں گے۔

امینہ! تم بھی یہاں ہو، بس آج رات ہی، آج رات ہی۔

وکلاء نے ایک نظر ثانی کی درخواست تیار کی۔ امینہ کراچی پرواز کر گئی جہاں اس نے اور میرے والد کے وکلاء میں سے ایک مسٹر حفیظ لاکھو نے عدالت میں درخواست دینے کی سعی کی۔ رجسٹرار نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ یہ درخواست ججوں کے حوالے کیجئے۔ رجسٹرار نے انہیں بتایا۔ لیکن جج بھی درخواست کو وصول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ایک جج تو ان سے پیچھا چھڑانے کے لئے عدالتی کمرہ کے عقبی دروازہ سے بھاگ گیا۔ امینہ اور مسٹر لاکھو سینئر جج کے گھر پر گئے اور اس کے دروازے پر درخواست قبول کرنے کی استدعا کی۔ جج نے انہیں ملنے سے انکار کر دیا۔ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ امینہ واپس اسلام آباد پرواز کر گئی۔
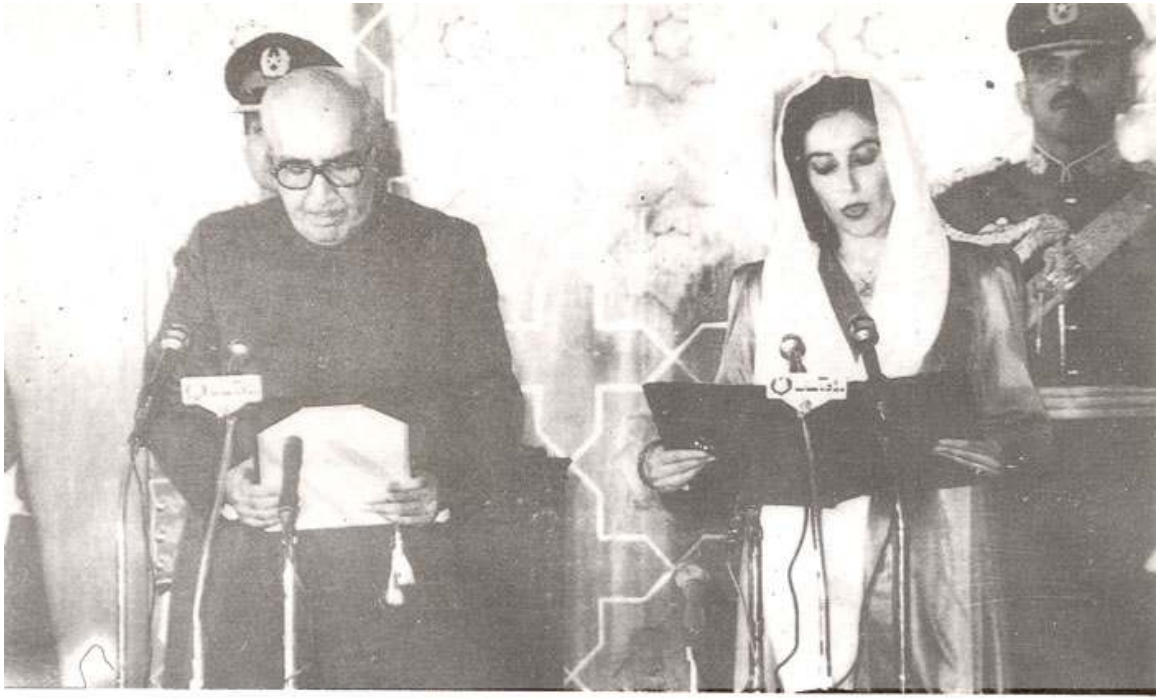
محترمہ بے نظیر بھٹو پہلی مرتبہ وزیر اعظم پاکستان کی حیثیت سے یکم نومبر ۱۹۸۸ء کو حلف اٹھا رہی ہیں۔

۳ ؍ اپریل ۱۹۷۹ء

ٹک، ٹک۔ مارشل لاء فوجیوں نے گڑھی خدا بخش کی سمت رواں تمام سڑکیں کاٹ دی ہیں۔ اور ہمارے خاندانی قبرستان کو محصور کرلیا ہے۔ ٹک، ٹک۔ امینہ ایئرپورٹ سے سیدھی نیازی ہاؤس جاتی ہے۔ اور اس وقت اکیلے رہنا نہیں چاہتی ٹک، ٹک۔ ''بس آج کی رات ہے'' ڈاکٹر نیازی آہستہ آہستہ اور بار بار فون پر کہہ رہے ہیں جب کہ یاسمین اور امینہ گھر کی تاریکی میں خاموشی سے لیٹی ہیں مگر نیندیں اچاٹ ہیں۔

ٹک، ٹک۔

ایک فوجی ٹرک صبح سویرے راولپنڈی جیل سے سرعت کے ساتھ حرکت کرتا ہے تھوڑی دیر بعد، یاسمین کو ایک چھوٹے طیارے کی اسلام آباد کے اوپر سے پرواز کی آواز آتی ہے۔ وہ یقیناً خیال کرتی ہے کہ یہ طیارہ کسی عرب راہنما کا ہے جو میرے والد کو محفوظ جگہ پر اڑائے لئے جارہا ہے لیکن جس جہاز کی پرواز کی آواز اس نے سنی ہے وہ میرے والد کی میت کو لاڑکانہ ہمارے گھر کی جانب لے جارہا ہے۔

باب ۷

المرتضیٰ سے رہائی

جمہوریت کا مارشل لاء کو اعلان مبارزت

جیسے ہی ۴ر اپریل ۱۹۸۰ء کو میرے والد کے قتل کی برسی نزدیک آتی ہے لوگ جوق در جوق المرتضیٰ کے پاس سے گزرتے ہوئے گڑھی خدابخش میں میرے والد کی قبر کی طرف رواں دواں ہیں۔ اب اپنی نظربندی کے چھٹے مہینے میں میری والدہ اور میں ان کی قبر کی زیارت کیلئے حکومت سے اجازت طلب کرنے کی درخواست دیتی ہیں، اگرچہ میرا خیال ہے کہ وہ منظور نہیں کریں گے۔ حکومت میرے والد کی یاد میں اور پی پی پی کی حمایت میں عوامی مظاہروں سے اس قدر خوفزدہ ہے کہ ہمارے آبائی گاؤں کو جانے والی تمام سڑکیں سو میل کے دائرے میں بند کر دی گئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت لوگوں پر جتنی بھی بندوقیں تانتی پھرے، میرے والد کی روح کا بھوت ضیاء پر بری طرح مسلط ہوچکا ہے۔ ان کی زندگی میں میرے والد کی بطور مدبر، سیاستدان اور سماجی مساوات کے خواب دیکھنے والے شخص کی حیثیت میں بہت تعریف کی جاتی تھی۔ ان کے قتل کے بعد ان کے چاہنے

والوں کی نظر میں وہ شہید کا بلند رتبہ حاصل کر چکے ہیں اور بعض کے نزدیک ایک ولی اللہ کا۔ ایک مسلمان ملک میں کوئی بھی وقت صحیح معنوں میں طاقتور نہیں ہے۔

المرتضیٰ سے دس میل دور میرے والد کے مدفن سے کرامات کی نشانیوں کی رپورٹیں آنا شروع ہو گئی ہیں۔ ایک لنگڑا لڑکا چلنا شروع کر دیتا ہے۔ ایک بانجھ عورت بیٹے کو جنم دیتی ہے۔ میرے والد کی شہادت کے ایک سال میں ہزاروں لوگ ہمارے آبائی قبرستان میں زیارت کیلئے آئے تاکہ گلاب کی ایک پتی یا قبر کی مٹی کو زبان پر رکھ کر دعا مانگیں۔ مقامی انتظامیہ نے ان نشانات کو توڑ پھوڑ دیا ہے جو صحرا میں الگ تھلگ قبرستان کی سمت بتانے کیلئے لگائے گئے تھے۔ لیکن لوگ پھر بھی آتے رہتے ہیں۔

پولیس اور فوجی جوان انہیں ہراساں کرتے ہیں۔ ان کا نام پوچھتے ہیں۔ اگر کاروں پر ٹرکوں کے ذریعہ آتے ہیں تو کار یا ٹرک کا نمبر پلیٹ درج کر لیتے ہیں۔ اگر پیدل سفر کیا ہے تو ان کے گھروں کے پتے نوٹ کرتے ہیں۔ اکثر ان کا کھانا ضبط کر لیا جاتا ہے۔ اور پارٹی کے جگ جو مقامی دیہاتی، مسافروں کیلئے باہر رکھ دیتے ہیں خالی کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن لوگ پھر بھی آتے ہیں۔ صحرا میں والد کی قبر پر ان کی فریم شدہ تصویریں اور گلاب اور گیندے کے پھولوں کے ہاروں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں۔

میرے والد کی برسی کے آٹھ دن بعد، ہماری نظر بندی کے خلاف عدالتی سماعت کراچی میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ جب میرے وکلاء اس خط کا ذکر کرتے ہیں جو میں نے پچھلے مہینے صنم کی والدہ سے متوقع ملاقات کے دوران کپتان افتخار کے خلاف اپنی بے عزتی پر احتجاجاً تحریر کیا تھا۔ ایڈووکیٹ جنرل کسی ایسے خط سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن میرے پاس جیلر کی دستخط شدہ رسید تھی اور ہمارے وکلاء ایک دن کا التواء چاہتے ہیں تاکہ دوسرے دن رسید پیش کی جاسکے۔ عدالت تک خط کو نہ پہنچنے دینا توہین عدالت کے زمرے میں آتا ہے جس کی سزا چھ ماہ قید ہو سکتی ہے۔ انہیں علم ہے کہ میرے پاس ثبوت ہے۔ حکام توہین عدالت کی پیش بندی کیلئے کچھ نہ کچھ تو کریں گے۔ اسی شب میری والدہ کو اور مجھے اچانک ہی رہا کر دیا گیا۔ مجھے وہ جیلر دوبارہ کہیں نظر نہیں آیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس کی ترقی روک

دی گئی اور سزا کے طور پر کسی جگہ متعین کر دیا گیا۔

آزادی

کسے علم تھا کتنے عرصے کیلئے آزاد ہیں۔ المرتضٰی سے ہماری رہائی کے بعد میری والدہ کراچی میں ٹھہر گئیں اور میں راولپنڈی پرواز کر گئی تاکہ ہماری چھ ماہ کی نظربندی کے دوران جو واقعات وقوع پذیر ہوئے ان کا پوری طرح علم حاصل ہوسکے۔ پرواز کے دوران میرے کان میں دباؤ ناقابل برداشت تھا خصوصاً پنڈی میں طیارے کی اترائی کے وقت۔ یاسمین کے گھر میں جب دوسری صبح نیند سے جاگی تو تکیئے کا غلاف بدبودار پیپ اور خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ میری دوستوں نے فوراً مجھے ہسپتال پہنچا دیا۔ ''تم بہت خوش قسمت ہو'' ڈاکٹر نے کانوں کو صاف کرنے کے بعد ایمرجنسی روم میں مجھے بتایا۔ طیارے میں ہوا کے دباؤ کی وجہ سے کان کا متعفن مواد باہر کی طرف پھٹ پڑا یہ اندر کی طرف بھی پھٹ سکتا تھا اور شدید نقصان کا باعث بنتا۔

مجھے پتہ نہیں تھا کہ کیا سوچوں، پہلے تو حکومت کے ڈاکٹر نے المرتضٰی میں اشارتاً کہا تھا کہ میں اپنے کان کی تکلیف کا بے بنیاد تصور کرتی رہتی ہوں اور پھر مجھے اس میں سوراخ کرنے کا قصوروار بھی ٹھہرایا تھا۔ لیکن اس ڈاکٹر نے مجھے یہ بتاتے ہوئے کہ میں خوش قسمت ہوں صرف ایک چٹ لکھی جس میں مجھے مشورہ دیا گیا کہ میں کراچی میں اپنے ڈاکٹر سے ہر دو ہفتے بعد کان چیک کراؤں۔ کیا ڈاکٹر نااہل تھا یا لوگ دانستہ میری بیماری سے غفلت برت رہے تھے۔ کسی نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ میں کان کے متعدی مرض میں مبتلا تھی جو کان کے اندرون نازک ہڈی کو آہستہ آہستہ کھا رہا تھا۔ میرے تھوڑے سے بہرہ پن کی یہی وجہ تھی۔ جراحت کے بغیر، مجھے بعد میں پتہ چلا پرانی سوزش میرے مستقل بہرہ پن اور چہرے کے فالج کا باعث بن سکتی تھی۔ لیکن کسی نے اس بارے میں مجھے نہیں بتایا۔

جب میں کراچی واپس پہنچی تو میری والدہ نے میرے متعلق بہت تشویش کا اظہار کیا۔ ''حکومت کو لکھو اور بیرون ملک چیک اپ کیلئے سفر کی اجازت مانگو'' میری والدہ نے اصرار کیا۔ ''تمہاری صحت کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں'' میں نے حکومت کو خط لکھا۔ ہمیں

کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ حکومت ہمیں ایسی جگہ رکھنے پر مصر تھی جہاں وہ ہم پر نگاہ رکھ سکیں۔

فوجی خفیہ ایجنسی کا عملہ ہر روز چوبیس گھنٹے بیرون ۷۰ - کلفٹن متعین رہتا۔ جب کبھی میری والدہ یا میں گھر سے باہر جاتی وہ ہمارا تعاقب کرتے۔ جو شخص بھی ہمیں ملنے آتا اس کی تصویر اتاری جاتی اور نمبر پلیٹ نوٹ کی جاتی۔ ہماری ٹیلی فون لائنیں ٹیپ کی جاتیں .... بعض اوقات کلک کلک کا شور ہوتا اور بعض اوقات لائنیں بے آواز ہو جاتیں۔

"تم لاڑکانہ کیوں نہیں چلی جاتیں تاکہ زرعی مالیات کو صحیح ڈھب پر ڈال سکو" میری والدہ نے مجھے ذرا صحت مند ہوتے دیکھ کر مشورہ دیا۔ "دو سال سے کسی نے بھی ہمارے حسابات جانچنے کی کوشش نہیں کی"۔

خفیہ ایجنٹوں نے اس وقت بھی میرا تعاقب نہیں چھوڑا جب میں واپس المرتضیٰ پہنچی تاکہ کھیتی باڑی کرنے والے منیجروں سے ملوں اور پودوں اور فصلوں کی کاشت اور پرداخت کی رپورٹیں حاصل کر سکوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ میں کس چیز کی توقع کروں۔ اور کیا چیز تلاش کروں۔ میرے والد یا بھائی بہن زمینوں کے جھنجھٹ سے نبٹتے تھے۔ جب میں حسابات کے کھاتوں کو دیکھ ہی رہی تھی، مجھے اکثر محسوس ہوا کہ جیسے میں باورچی خانے میں ہوں اور بابو کے ساتھ گھریلو اخراجات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ لیکن اب ایک ٹھوس مسئلہ پر تگ و دو میرے لئے باعث اطمینان تھی اور میرے ذہن میں مسلسل گرداب کی شکل میں متعدد سوالات کیلئے چند لمحوں کا سکون بھی۔ موسم گرما کی حدت میں ہر صبح میں جیپ میں امرودوں کے باغات، چاول اور گنے کے کھیتوں میں اپنی نئی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کیلئے جاتی۔ میں جھلستی ہوئی دھوپ سے حفاظت کیلئے ایک سکارف اور تنکوں کا ہیٹ سر پر رکھ کر مزارعوں کے ساتھ کھیتوں میں گھومتی پھرتی، ٹیوب ویل کے پانی سے بھری ہوئی زرعی نہروں کے سسٹم کو سیکھتی، چاول اور کپاس کی کاشت میں مدد کرتی، گنے کی کاشت کو بغور دیکھتی اور اسی طرح سیم و تھور کے مسائل کو جانچتی۔ جسمانی مشقت میرے لئے مرہم ثابت ہوئی۔ مزارعین، کامدار یا منیجروں اور حساب دان یا منشیوں نے بھٹو

زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پاکستان کے دشمنوں سے ہماری جنگ جاری رہے گی۔

بے نظیر بھٹو

خاندان کے ایک فرد کو اپنے درمیان پاکر بہت سکون محسوس کیا۔ "مالک کے قدموں تلے سونا اگتا ہے اب آپ کی موجودگی یہاں خوشحالی لائے گی" ان میں سے ایک نے یہ الفاظ کہے "ہم اب یتیم نہیں ہیں" مجھے کھیتوں میں زندگی بسر کرنا بہت پسند تھا تاہم لاڑ کانہ میں مردوں کے ساتھ کام کرنا عجیب سا لگتا تھا۔ دیہاتی علاقوں کی عورتیں بہت زیادہ قدامت پرست تھیں۔ گھروں سے باہر برقعہ پہنے بغیر شاذ و نادر ہی نکلتیں اور کار ڈرائیو کرنے کا تو تصور بھی نہیں تھا۔ لیکن میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ پاکستان میں ہمارے خاندان کا کوئی مرد باقی نہیں تھا۔ میرے والد حیات نہیں تھے اور میرے بھائی جو پاکستان واپس آتے تو فوراً گرفتار کر لئے جاتے، افغانستان میں رہائش پذیر تھے۔ نتیجتاً میں ہر صبح کھیتوں میں آتی جاتی رہی۔ میری یا ہم میں سے کسی کی زندگی میں روایت کیلئے کوئی جگہ باقی نہیں تھی۔

ایک طرح سے میں تذکیر و تانیث کے مخمصے سے ماورا ہو چکی تھی۔ اب کوئی شخص ایسا نہیں تھا جسے ہمارے ان حالات کا علم نہیں تھا جن کی وجہ سے ہم زمیندار خاندانوں کے رسم و رواج کو چھوڑنے پر مجبور تھیں جس کے مطابق گھر کی نوجوان خواتین کی مکمل حفاظت کی جاتی تھی اور بغیر کسی مرد رشتہ دار کی معیت کے اپنے گھروں سے باہر جانے پر پابندی تھی۔ ہماری روایت کے مطابق خواتین خاندانوں کی عزت شمار ہوتی ہیں۔ ان کی عزت کی حفاظت کیلئے انہیں پردے میں رکھا جاتا ہے اور اس لئے وہ نقاب میں باہر جاتی ہیں اور حتی الوسع گھر کی چار دیواری میں مقیم رہتی ہیں۔

میری چاروں پھوپھیاں یعنی میرے دادا کی پہلی بیوی کی بیٹیاں اس روایت پر پوری طرح کاربند ہیں۔ بھٹو خاندان میں کوئی مناسب چچازاد یا ماموں زاد کا رشتہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے وہ حیدر آباد میں اپنے صحنوں کی چار دیواری میں پردے کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھیں۔ خاندان میں ان کی بہت توقیر کی جاتی تھی کیونکہ سب کو علم تھا کہ ان کی شادیاں کیوں نہ ہو سکیں۔ اور وہ ہمیشہ خوش نظر آتیں کیونکہ ان کو کسی اور قسم کی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ "ان کے چہروں پر پریشانی کی کوئی لکیر نہیں" میری والدہ جب بھی ان سے ملاقات کے بعد واپس آتیں تو حیرانی سے کہتیں۔

مجھے ان کی زندگی بوریت کی زندگی محسوس ہوتی، لیکن میری پھوپھیاں خوش باش ہی لگتیں۔ انہوں نے اتنی عربی سیکھ لی تھی کہ قرآن مجید پڑھ سکیں۔ کھانے پکانے کی نگرانی کرتیں، گاجروں کا مزیدار اچار اور مٹھائی تیار کرتیں۔ کپڑے سیتیں اور کڑھائی کرتیں۔ ان کی ورزش صحن میں چکر لگانے تک محدود تھی۔ کبھی کبھی ملبوسات فروخت کرنے والا آدمی نئے کپڑوں کی گٹھڑیاں ان کے انتخاب اور پسند کیلئے دیواروں سے باہر رکھ جاتا۔ وہ پرانی نسل تھی اور میں نئی۔

المرتضیٰ میں ہر شام میں طلباء کے وفود اور دوسرے ملاقاتیوں سے ملتی جن سے فوجی حکومت کی مزاحمت کے بارے میں رپورٹیں اور ابھی تک مقید کارکنوں کی خبریں مجھ تک پہنچتیں۔ ہم خاندانوں سے اظہار ہمدردی کیلئے اور گرفتار شدگان سے جیل میں ملاقاتوں کیلئے لوگوں کی فہرستیں بناتے۔ سہ پہر میں آخر کار مجھے وقت اور فراغت مل جاتی کہ میں اپنے والد کے مزار پر سایہ کیلئے شامیانہ تعمیر کر سکتی اور اپنی والدہ کی خواہش کی تکمیل کہ المرتضیٰ کے پرانے چوب زدہ دریچوں میں شیشے لگواسکوں۔ "ٹھنڈا رہنے سے بہتر ہے کہ میں بغیر بجلی کے رہنے کا تجربہ کروں"۔ المرتضیٰ میں نظربندی کے دنوں کے تجربہ سے سبق سیکھنے کے بعد جب بجلی عموماً غائب ہوجاتی تھی مجھے نصیحت کرتے ہوئے کہتیں کون جانتا ہے کہ ہمیں یہاں دوبارہ کب نظر بند کر دیا جائے۔ ہمیں اس کیلئے تیار رہنا چاہئے"۔

مجھے ایک غیرمانوس مشرقی روایت کا حصے دار بننا پڑا۔ بھٹوخاندان میں سے اکیلی ہی موجود تھی۔ مجھے مقامی دیہاتیوں نے خاندان کی ایک بزرگ تصور کرتے ہوئے اپنی باہمی جھگڑوں اور مسائل کے حل کیلئے زمینوں پر تعمیر شدہ مٹی کی جھگی کے صحن میں آنا شروع کر دیا۔ جاگیرداری کے زمانے کی بچی کھچی رسومات کے مطابق جب قبائل کے سردار لوگوں پر اثرانداز ہونے والے ہر فیصلے پر تسلط قائم رکھتے تھے قبائلی انصاف کا یہ طریق کار دیہاتی علاقوں میں ابھی بھی نافذالعمل ہے۔ کیونکہ خود قبائل کا وجود ابھی نابود نہیں ہوا۔ اگرچہ میں بھٹو قبیلے کی سردار نہیں تھی لوگ اپنے مسائل کے فیصلوں کیلئے میرے پاس آنے پر مصر تھے۔ پاکستان میں انصاف کا حصول بہت ست، بہت بعید، بہت بیش قیمت اور بہت بگڑا ہوا تھا کہ لوگ بے اعتنا ہوگئے تھے۔ جیب خرچ کے حصول کیلئے لوگوں کی گرفتاری

پولیس کی عمومی شہرت بن چکی تھی اور رہائی کیلئے بھی رشوت لینا ان کا معمول بن گیا تھا۔ لوگ اپنے فیصلے اس شخص سے حاصل کرنے کو ترجیح دیتے تھے جس کے خاندان سے وہ برسوں سے مانوس تھے۔ لیکن مغرب میں آٹھ سال گزارنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں دیہاتی زندگی کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کی پوری طرح اہل نہیں تھی۔

"اس کے چچازاد نے ۴۰ سال قبل میرے بیٹے کو قتل کر دیا تھا" ایک بے دانت بوڑھے آدمی نے ایک صبح میرے سامنے دلائل دیتے ہوئے کہا جب میں رسی کی چارپائی پر عدالت سجائے بیٹھتی تھی۔ "تمہارے تایا کا اس وقت فیصلہ تھا کہ اس خاندان میں پیدا شدہ پہلی بیٹی سے میری شادی ہوگی۔ اور دیکھو یہی وہ لڑکی ہے (اشارہ کرتے ہوئے) مگر وہ آدمی اب مجھے اس کو دینے کیلئے تیار نہیں"۔

میں نے آٹھ سالہ بچی کو اپنے باپ کے پیچھے دبکی ہوئی بیٹھے دیکھا۔ "اس نے اس وقت تو ایک لفظ نہیں بولا جب میرے گھر بیٹی پیدا ہوئی" باپ نے دوبدو جواب دیا۔ "میرا خیال تھا اس نے اتنے سال قبل ارتکاب کئے گئے جرائم پر ہمیں معاف کر دیا تھا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ یہ شخص اس پر دعویٰ کرے گا تو میں اسے یہ سمجھ کر پالتا کہ وہ ہماری نہیں ہے اور کہ ایک دن مجھے اسے دینا پڑے گا۔ اب ہم اس کی شادی کسی اور خاندان میں کر رہے ہیں، ہم نے ان کے ساتھ وعدہ کر لیا ہے ہم اپنا وعدہ کیسے توڑ سکتے ہیں"۔

میں اس بے چاری چھوٹی بچی کی حالت دیکھ کر کانپ گئی جس پر پنجہ آزمائی کی جارہی تھی۔ دیہاتی علاقوں میں عورتوں کی قسمت خوشگوار نہیں تھی۔ بہت کم لڑکیوں کو اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کی آزادی تھی یا انہیں پوچھا جاتا کہ وہ کیا چاہتی ہیں۔ "تمہیں لڑکی نہیں ملے گی بلکہ اس کے بدلے ایک گائے اور بیس ہزار روپے ملیں گے" میں نے بوڑھے آدمی کو بتایا۔ "یہ میرا فیصلہ ہے تم نے اس وقت دعویٰ کیوں نہیں کیا جب اس لڑکی کی منگنی کسی اور جگہ کر دی گئی تھی" لڑکی کے بدلے گائے، یہ ایسی مساوات ہے جس کے خیال پر بھی ریڈ کلف میں عورتوں کی چال ڈھال پر مباحث کے دوران بھی ذکر ہوا تھا۔ لیکن یہ پاکستان تھا اور بوڑھا آدمی بہت طیش میں تھا اور بڑبڑاتا ہوا رخصت ہو گیا۔ میرے فیصلے نے اگلے روز تباہی مچا دی۔ "میری بیوی کو اغواء کر لیا گیا ہے" ایک آدمی میرے سامنے

چلایا۔ اس کے سسر نے بھی اس شور میں اضافہ کیا۔ "آسمان ہمارے سر پر گر پڑا ہے۔ ہماری زندگیاں ختم ہوگئی ہیں۔ تمام دن میری بیٹی کے بچے ماں کیلئے چلاتے رہے ہیں۔ تم اسے واپس دلانے کیلئے ہماری مدد کرو"۔

عورت کے اغواء پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے میں نے پوچھا "تمہیں کس پر شبہ ہے" جب انہوں نے مجھے بتایا تو میں نے کسی شخص کو گاؤں میں دیہاتی بزرگوں سے بات چیت کیلئے بھیجا۔ نوجوان عورت کو کامیابی سے واگزار کرلیا گیا تاہم وہ شدید طیش میں تھی۔

اس نے مجھے پیغام بھجوایا۔ "میں اپنے خاوند کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں" یہ تیسری مرتبہ ہے کہ میں گھر سے فرار ہوئی ہوں اور مجھے واپس لایا گیا ہے۔ میرا خیال تھا تم عورت ہونے کے ناطے میرا مسئلہ سمجھوگی اور میرے ساتھ ہمدردی کروگی۔ میں بہت سٹ پٹا گئی۔ کیا ہر ایک سوائے میرے جانتا تھا کہ ایک عورت کو اپنے خاوند کو چھوڑنے کی پاداش میں قبائلی روایتوں کے ظالمانہ قانون کے مطابق "صرف اغواء" کیا جاتا ہے؟۔ ایک ناراض بیوی اپنی مرضی سے نہیں جاسکتی۔ بے چاری نوجوان عورت، مجھے پتہ چلا دوبارہ گھر سے فرار ہونے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں تھا جب مجھے احساس ہوا کہ قبائلی روایتوں اور مساوات اور آزادانہ مرضی کی انسانی اقدار میں کھلا تصادم اور تضاد ہے۔

ایک جمہوری پاکستان اور فوجی آمریت کے تحت پاکستان میں فاصلہ بڑھتا ہی جارہا تھا، جب میں لاڑکانہ کے کھیتوں میں فیصلے کررہی تھی۔ ضیاء کی ہر صوبے میں قائم کردہ خصوصی فوجی عدالتیں جن کی صدارت ایک مجسٹریٹ اور قانونی تربیت سے نابلد دو افسران کررہے تھے، سزائے موت اور قید تاحیات پر مبنی فیصلے مرحمت فرمارہی تھیں۔ سینکڑوں ایسی فوجی عدالتیں بھی قائم کردی گئیں جہاں غیر تربیت یافتہ ایک افسر گواہی سنتا اور فوراً ایک سال قید بامشقت اور پندرہ کوڑوں کی سزا دے دیتا۔ جب کہ میرے فیصلوں پر عملدرآمد کی پابندی نہیں تھی اور قضیئے عدالتوں تک لیجائے جاسکتے تھے۔ فوجی عدالتوں میں ملزم کو کوئی وکیل کرنے کی اجازت تھی نہ فیصلے کے خلاف اپیل کا حق۔ عدالت کے متعلقہ افسر کو رشوت دے

کر یعنی دس ہزار روپے فی کوڑا کی شرح پر ملزم سزا پر فوری عملدر آمد سے بچ سکتا تھا۔ مارشل لاء کا پھندا مزید کسا جارہا تھا۔

مارشل لاء کا حکم نمبر ۷۸

سیاسی قیدیوں کیلئے مقدمہ چلائے بغیر ۱۲ مہینے کی سزائے نظربندی کو دہرایا گیا مگر ایک نیا موڑ دے کر۔ لوگوں کی اپنے گھروں یا گلیوں میں گرفتاری کی کوئی توجیہہ پیش کرنا حکومت کیلئے ضروری نہیں۔ ''نظربندی کیلئے وجوہات یا بنیادیں شخص مذکور کو بتانا ضروری نہیں'' حکم میں بیان کیا گیا۔ مارشل لاء حکام نظربندی کی مدت جتنا چاہیں اپنی صوابدید پر طویل کر سکتے ہیں۔ اب ہر شخص ہر جگہ حق اپیل کے بغیر گرفتاری کا مستوجب ہوگا اور یہ الزام کافی ہے کہ وہ مرد یا عورت اس سے بے خبر ہے اور اس کو غیر معین عرصہ کیلئے گرفتار کیا جاسکے گا۔ ۱۹ر جون کو وکلاء نے ایک جلوس نکالا جس میں مطالبہ کیا کہ نئے احکامات کو واپس لیا جائے اور بذریعہ انتخابات فوجی حکومت کی جگہ سول حکومت برسراقتدار لائی جائے۔ ۸۶ وکلاء کو پیٹا گیا اور بعد میں زیر حراست رکھا گیا۔ اس طرح ۱۲ وکلاء کو کراچی میں بعض دوسرے افراد سمیت ماہ اگست میں بحالی آئین ۱۹۷۳ء پر گرفتار کیا گیا حکومت نے پرتشدد خوف و ہراس پھیلاتے ہوئے طلباء اور ٹریڈ یونین راہنماؤں کی ان گنت تعداد کو گرفتار کرلیا۔

جب موسم گرما میں کراچی واپس آئی تو میری والدہ نے مجھے محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ لیکن حکومت کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ جب ہم ماہ اگست میں ایک خاندانی دوست کی شادی پر لاہور گئیں تو ہمارے ہوٹل کو پولیس نے محصور کرلیا اور ہمیں پنجاب سے صوبہ بدر کر دیا گیا۔ پولیس مسلح نگرانی میں ہمیں ایئرپورٹ تک لے گئی اور عازم کراچی طیارے میں ہمیں سوار کر دیا۔

صاف ظاہر تھا کہ تختہ الٹنے اور مارشل لاء لگانے کے تین سال بعد بھی ضیاء لوگوں کو ڈنڈے کے زور پر مطیع کرنے اور ان کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اس کی بجائے اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک رہی تھی۔ ضیاء کو کوئی سیاسی حمایت حاصل نہیں تھی، فقط فوج کے بل بوتے پر حکمران تھا۔ پاکستان قومی اتحاد کے ارکان نے جو

سیاستدانوں کا ایک مخلوط اتحاد تھا جس نے ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں میرے والد اور پی پی پی کی مخالفت کی تھی اور جن میں سے کچھ ضیاء کی کابینہ میں شامل ہو گئے تھے، قومی اتحاد کو چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ جب میرے والد کی شہادت کے چھ ماہ بعد ضیاء نے اپنی کابینہ کے وزیروں سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگادی تو پاکستان قومی اتحاد نے اپنے آپ کو سیاسی بیاباں میں سرگرداں پایا۔ نتیجتاً المرتضٰی میں اکتوبر ۱۹۷۹ء میں میری والدہ اور میری نظر بندی کے کچھ عرصہ بعد ہی، پاکستان قومی اتحاد کی بعض پارٹیوں نے ضیاء کے خلاف پی پی پی کے ساتھ تعاون کے اشارات دینے شروع کر دیئے۔ ہم نے ان اشارات کو سیاسی چال بازی سمجھا تاکہ اس شہ میں فوجی حکومت سے مزید مراعات حاصل کر سکیں۔ ''اگر تم ہمیں وزیر رکھنا نہیں چاہتے'' ''ہم پی پی پی میں شامل ہو جائیں گے'' وہ موثر انداز میں ضیاء کو بتا رہے تھے۔ اب ۱۹۸۰ء کے موسم خزاں میں ہمارے سابقہ دشمن قومی اتحاد نے دوبارہ سلسلہ جنبانی شروع کر دی۔ اس مرتبہ ہم نے اسے سنجیدگی سے لیا۔

انتہائی مایوسی کے عالم میں اپنی سیاسی بنیاد کھڑی کرنے کیلئے ضیاء اور اس کے باقیماندہ حمائتیوں نے رشوت دینا شروع کر دی۔ ہر روز ضیاء کی ترغیبی مہم کی نئی رپورٹیں موصول ہوتیں۔ ڈھوکی، پی پی پی کے ایک غریب رہنما کا لڑکا جو ایک سائیکل شاپ میں مزدوری کرنے کے روزانہ دو روپے لیتا تھا پی پی پی کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شمولیت پر ایک ہزار روپے کا حقدار تھا۔ مسلم لیگ ابھی تک ضیاء کی حامی جماعت تھی۔ پی پی پی کے ایک رکن غلام مصطفٰی جتوئی ایسی بااثر شخصیت کو جو صدر سندھ اور سابق وزیراعلٰی تھے ضیاء کی طرف سے خود حکومت کی وزارت عظمٰی پیش کی گئی جو وہ ان کے خیال میں قبول کرنے کیلئے تیار تھے۔ ضیاء کی طرف سے نئے سیاسی اتحادوں کا پراپیگنڈہ کیا گیا تاکہ لوگوں کو جھانسا دیا جاسکے کہ ملک میں ضیاء کی نفرت انگیز فوجی حکومت کی جگہ سول حکومت کے قیام پر سمجھوتہ ہو گیا ہے۔

''اس سے پہلے کہ ضیاء اپنی چالوں سے ہمیں مات دے، ہمیں اپنی چالوں سے اسے مات دینی چاہئے'' میری والدہ نے مجھے ماہ ستمبر میں اس وقت کہا جب جتوئی کو وزارت عظمٰی

کی پیش کش کی گئی۔ "اگرچہ اس خیال سے مجھے وحشت ہوتی ہے تاہم ہمیں پاکستان قومی اتحاد کی طرف سے مثبت رویوں کا استقبال کرنا چاہئے۔ ضیاء کے مخالفوں میں پھوٹ ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے"۔

پہلے پہل تو میں خوفزدہ ہو گئی۔ "اس سے پارٹی راہنماؤں میں زلزلہ برپا ہو جائے گا" میں نے احتجاج کیا۔ ہم کیسے بھول سکتے ہیں کہ سب سے پہلے انتخابات میں دھاندلی کے الزام لگانے والے یہی پاکستان قومی اتحاد کے لوگ تھے۔ جنہوں نے فوجی تسلط کیلئے راستہ ہموار کیا؟ یہ لوگ ضیاء کی کابینہ میں وزیر تھے جب اس نے پاپا کو موت کے گھاٹ اتارا۔

"لیکن ہمارے پاس اس کے سوا اور کونسا راستہ ہے؟" والدہ نے پوچھا۔ "اب اگر آج جتوئی ہے کل دوسرے بھی ہو سکتے ہیں۔ جب مثالی حالات موجود نہ ہوں تو بدنما حقائق کو قبول کرنا پڑتا ہے"۔

انہوں نے پی پی پی کی مرکزی ایگزیکٹو کمیٹی کے تقریباً ۳۰ ارکان کا اجلاس بلایا۔ ہمیں علم تھا کہ ہم ایک بہت بڑا خطرہ مول لے رہی ہیں۔ سیاسی ملاقاتوں پر پابندی تھی لیکن اگر ہم خاموش تماشائی بنے رہے تو اس کا مطلب حکومت کی کارروائیوں پر سرہلانا ہو گا۔ یہ اجلاس ایسی ہی دوسری ملاقاتوں کی طرح ۷۰ - کلفٹن میں منعقد کیا جارہا تھا۔ راہنما ملک کے دور دراز علاقوں یعنی صوبہ سرحد اور بلوچستان سے بھی تشریف لائے۔ اور متوقع طور پر مذاکرات میں کافی تلخی دیکھنے میں آئی۔ "پاکستان قومی اتحاد کے لوگ قاتل ہیں، قاتل ہیں" سندھ کے ایک رکن نے برملا کہا۔ "اگر آج ہم ان سے معاہدہ کرتے ہیں تو کل کو جنرل ضیاء سے براہ راست مذاکرات سے ہمیں کون سی چیز مانع ہو گی؟"

"لیکن ماؤزے تنگ نے چیانگ کائی شک سے اتحاد کیا جب جاپان نے چین پر حملہ کر دیا" معمر شخص شیخ رشید نے جواب دیا۔ وہ پارٹی میں اپنے آپ کو مارکسسٹ سمجھتے تھے۔ "اگر قومی مفاد میں وہ آپس میں متحد ہو سکتے تھے تو میں کہتا ہوں کہ ہمیں پاکستان قومی اتحاد سے اتحاد کر لینا چاہئے"۔

مباحثہ اپنے نشیب و فراز کے ساتھ جاری رہا۔ "ہم اس بات پر متفق ہیں کہ وہ موقع

پرست اور مفاد پرست ہیں" میں نے کہا "لیکن ہمارے پاس اب کیا چارہ باقی رہ گیا ہے؟ ہمیں یا تو پہل کرنے کے حق کو خیرباد کہنا پڑے گا یا پاکستان قومی اتحاد سے مذاکرات کی کڑوی گولی کو نگلنا ہوگا تاکہ پہل کرنے کا حق ہمارے پاس رہے۔ میری رائے ہے کہ ہم اعتدال پسندی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے ان کے ساتھ اتحاد قائم کریں مگر اپنی الگ شخصیت کی قیمت پر ہرگز نہیں"۔

سات گھنٹے کی جھک جھک کے بعد آخر کار عملیت پسندی کا بول بالا ہوا اور ہم میں سے ہر ایک نے پاکستان قومی اتحاد کے ساتھ سلسلہ جنبانی کو ترجیح دی۔ تحریک بحالی جمہوریت یعنی ایم آر ڈی کے تانے بانے کو تشکیل دیا گیا۔

"چونکہ ہم دونوں کا بیک وقت گرفتار ہو کر جیل میں رہنا سودمند نہیں، بہتر ہے کہ تم سیاسی طور پر دھیمے پن کا مظاہرہ کرو" میری والدہ نے مجھے بتایا۔ "اس طرح کم از کم ہم دونوں میں سے ایک جیل سے باہر رہ کر پارٹی کی راہنمائی کا کام سرانجام دیتا رہے گا"۔

چاروناچار مجھے متفق ہونا پڑا۔ لیکن اس سے مجھے کچھ تسکین بھی حاصل ہوئی۔ اگرچہ ایم آر ڈی (تحریک بحالی جمہوریت) کی تشکیل سیاسی شعور کا اچھا مظاہرہ تھا۔ ذاتی طور پر مجھے اپنے والد کے پرانے دشمنوں کے ساتھ اتحاد قبول کرنے میں دقت محسوس ہورہی تھی۔ سابقہ مخالف پارٹیوں کو بھی پی پی پی کے ساتھ مذاکرات میں ایسی ہی مشکل کا سامنا تھا۔ وہ آپس میں بھی کھل کر بات چیت کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ ابتدائی ملاقاتوں میں شدید مخالف پارٹیوں کے راہنما ایک دوسرے سے براہ راست بات چیت سے گھبراتے اور ایلچیوں کے ذریعہ مصروف گفتگو رہے۔ نئی متزلزل مخلوط جماعت کے سلسلہ میں تبادلہ خیالات میں تلخی کی بنا پر پورے طریقہ کار میں پیچیدگی پیدا ہوگئی خاص طور پر مجوزہ ایم آر ڈی کے چارٹر پر۔ آیا ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں دھاندلی ہوئی یا نہیں، آیا میرے والد کی موت بیان کرنے کیلئے لفظ "پھانسی" استعمال کیا جائے گا یا "قتل"۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء سے فروری ۱۹۸۱ء تک کے چار طویل مہینوں کے بعد تعطل دور ہوا اور تمام دس پارٹیوں نے ایک متفقہ لائحہ عمل طے کرنے میں کامیابی حاصل کی مگر یہ بھی کوئی آسان معاہدہ نہیں تھا۔

محمد خان جونیجو (جو بعد میں ضیاء کے مرغ دست آموز قسم کے وزیراعظم بنے) کی مسلم لیگ پارٹی معاہدہ کے آخری لمحات میں داغ مفارقت دے گئی۔ دوسری پارٹیوں کے راہنما اور نمائندے ۵ر فروری ۱۹۸۱ء کی رات کو ۷۰ - کلفٹن میں پہلی مرتبہ آمنے سامنے بیٹھے۔

میں نے اپنے والد کے سابقہ مخالفین کو ان کے گھر میں ان کی بیوہ جو پی پی پی کی چیئرپرسن تھیں اور بیٹی سے سیاسی معاہدہ کرتے ہوئے دیکھا۔ سیاست کس قدر عجیب چیز ہے؟ پاکستان جمہوری پارٹی کے نصراللہ خان ترکی ٹوپی پہنے ہوئے میری والدہ کے دائیں بازو کی طرف بیٹھے۔ اصغر خان کی معتدل مزاج تحریک استقلال کے بھرے ہوئے چہرے والے قصوری ان کے نمائندہ کے طور پر میرے بالمقابل براجمان تھے۔ مذہبی جماعت جمعیت العلمائے اسلام کے باریش راہنما کمرے کے ایک طرف تھے اور دوسری طرف بائیں بازو کی ایک چھوٹی سی پارٹی کے راہنما فتح یاب علی خان جنہوں نے کلف لگا ہوا چوڑی دار کرتا اور تنگ پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ تقریباً ۲۰ کے قریب افراد تھے جن میں سے کثرت سابقہ پاکستان قومی اتحاد کے راہنماؤں کی تھی۔ میں اپنے آپ کو یاد دلاتی رہی کہ اصل بات تو ضیاء کو اقتدار سے محروم کرنا اور متضاد خیالات کے باوجود سیاسی اتحاد کو مضبوط کر کے ضیاء کو انتخابات منعقد کرانے پر مجبور کرنا تھا۔ یہ امر بہت مشکل تھا۔

سگریٹ کا دھواں اور جذبات کا اشتعال بڑھتا رہا۔ ڈرائنگ روم کی دیواروں پر مخملیں پوشش اور چھت پر فانوس جگمگاتے رہے اور اجلاس اتنا طویل ہوگیا کہ دوسری صبح دوبارہ منعقد کرنا پڑا۔ ایک مرحلے پر پاکستان قومی اتحاد کے ایک سابق راہنما نے ۱۹۷۷ء کی متشدد تحریک میں اپنی پارٹی کے کردار کے جواز پر تقریر شروع کر دی۔ میں اپنے ہی گھر میں پی پی پی پر بالواسطہ تنقید سن کر حیران رہ گئی۔

"یہاں ہم جمہوریت کی خاطر ایک اتحاد کے بارے میں مذاکرات پر اکٹھے ہوئے ہیں نہ کہ اس بحث کیلئے کہ آپ ہمیں کیا سمجھتے ہیں یا ہم آپ کو کیا سمجھتے ہیں" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

تاہم مجھے ان سیاستدانوں کو اس حالت میں دیکھنا عجیب لگا کہ میرے والد کے دشمن آج
اسی کے پیالوں میں کافی پی رہے تھے، اسی کے ٹیلی فون پر اپنے دوستوں کو ہیجان خیز پیغام
دے رہے تھے کہ "ہاں ہاں میں ۷۰ - کلفٹن میں بیٹھا ہوں حقیقت یہی ہے کہ یہ مسٹر بھٹو
ہی کا گھر ہے"۔

یاسمین، امینہ اور سمیعہ مجھے رام کرنے میں سعی کرتی رہیں۔

"وہ تمہارے گھر آئے ہیں یہ پی پی پی کی طاقت کا ثبوت ہے" سمیعہ نے کہا۔ "تم
اس اتحاد کو تشکیل دینا چاہتی تھی" امینہ نے لقمہ دیا۔ "یہ سیاسی شعور کی بات ہے اس
راستے کی مشکلات کا سامنا کرو"۔ میں نے اپنے اعتراضات کو پی لیا اسی طرح ان راہنماؤں
نے بھی جنہوں نے آخر کار ایک ایک کر کے پارٹیوں کو متحد کرنے کے منشور پر دستخط کئے۔
اور ۶ر فروری ۱۹۸۱ء کو تحریک بحالی جمہوریت کی پیدائش ہوگئی۔ ایم آر ڈی کے منشور پر
دستخط ثبت ہونے کی خبر جب متعدد لوگوں نے بی بی سی کے نشریئے پر سنی پاکستان کے طول و
عرض میں برقی رو کی طرح دوڑ گئی۔ اس خبر نے لوگوں کو ایک نفسیاتی حوصلہ دیا اور ان کا
خیال تھا کہ یہ مارشل لاء حکومت کی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کا ابتدائیہ ہے۔ صوبہ
سرحد کے طلباء نے گلیوں میں آکر احتجاج کیلئے پہل کی۔ فوراً ہی ضیاء نے میری والدہ کو اور
مجھے شہربدری کے احکام بھجوادیئے تاکہ ہم زخمیوں کی تیمارداری نہ کرسکیں۔ بے چینی جلد ہی
سندھ اور پنجاب میں پھیل گئی جہاں یونیورسٹی پروفیسر، وکلاء اور ڈاکٹر ابھرتی ہوئی تحریک
احتجاج میں جوق در جوق شامل ہوتے چلے گئے۔ طلباء کے احتجاجی جلوس ملتان، بہاولپور،
شیخوپورہ اور کوئٹہ میں نکلنا شروع ہوگئے۔ ایم آر ڈی کی تحریک میں، خدا کا شکر ہے، ٹیکسی
ڈرائیور، دوکاندار اور چھوٹے تاجر بھی شامل ہوگئے۔ "ضیاء کا وقت اب ختم ہوگیا ہے"
عام افواہ پھیل گئی۔ کراچی کی ایمپریس مارکیٹ سے واپسی پر ہمارے باورچی نے رپورٹ دی
کہ "قصاب بھی ایم آر ڈی کی دعوت پر ہڑتال کرنے کیلئے تیار ہیں"۔

ضیاء سمجھ گیا کہ وہ شکنجے میں پھنس گیا ہے۔ اس نے کل پاکستان میں تمام یونیورسٹیاں بند
کردیں اور پانچ افراد سے زیادہ کے اجتماع پر پابندی لگادی۔ لیکن مظاہرے جاری رہے۔

"ٹائم" میگزین کے مطابق "مخالفت کی یہ سنجیدہ ترین لہر تھی جو جنرل ضیاء کا سامنا کر رہی تھی"۔

لاہور میں ۲۷ر فروری کو ایم آر ڈی کا خفیہ اجلاس بلایا گیا۔ ضیاء کا ردعمل فوری تھا۔ اس نے ایم آر ڈی کے بہت سے راہنماؤں کو ۲۱ر فروری کو گرفتار کر لیا۔ ایم آر ڈی اور پی پی پی کے دوسرے ارکان کو پنجاب سے صوبہ بدری کے بعد اپنے اپنے شہروں تک پابند کر دیا گیا۔ "پنجاب میں تمہارا داخلہ پبلک کے امن و امان اور مفاد میں خطرے سے خالی نہیں" گورنر پنجاب کے میرے نام احکام میں لکھا تھا۔

میری والدہ نے سیاسی میدان میں میری کارکردگی کو محدود رکھنے کے معاہدہ پر عملدر آمد میں مجھے ڈھیل دے دی۔ "کچھ عرصہ کیلئے سیاست میں متحرک نظر نہ آؤ۔ اگر مجھے گرفتار کر لیا جائے تو تمہیں راہنمائی کی بھاگ دوڑ تھامنا ہوگی" انہوں نے مجھے سختی سے کہا۔ حالات اس قدر دھماکہ خیز تھے کہ ضیاء کا تختہ کسی وقت بھی الٹ سکتا تھا۔ اور میں پابندیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ میری والدہ کو لاہور جاکر ایم آر ڈی کی خفیہ میٹنگ میں حاضر ہونا تھا۔ شہر کو جانے والی تمام سڑکیں پولیس نے بند کر دیں۔ اور ہر کار کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ ایم آر ڈی کے ارکان جو ابھی تک آزاد تھے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے جائے اجلاس میں پہنچنا شروع ہوئے۔ میری والدہ "دادی اماں" کے بھیس میں اپنے ۱۳ سالہ "پوتے" کے ہمراہ جو ہمارے گھر کے عملہ میں سے ایک ملازم کا بچہ تھا بذریعہ ٹرین لاہور گئیں۔ پولیس نے اجلاس کے دوران چھاپہ مارا اور تمام حاضرین کو گرفتار کر لیا جن میں میری والدہ بھی شامل تھیں انہیں واپس کراچی پہنچا دیا گیا۔ لیکن ایم آر ڈی اپنا الٹی میٹم جاری کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

مارشل لاء کو ختم کرو اور تین مہینے کے اندر اندر انتخابات کراؤ" ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ضیاء اقتدار فوراً چھوڑ دے بصورت دیگر مارشل لاء حکومت کو عوام کو ناقابل تسخیر عزم کے ذریعہ ہٹا دیا جائے گا" ایم آر ڈی نے لاہور میں اعلان کر دیا۔

ایم آر ڈی نے پاکستان بھر میں اندھادھند مظاہروں اور ہڑتالوں کیلئے ۲۳ر مارچ کی حتمی
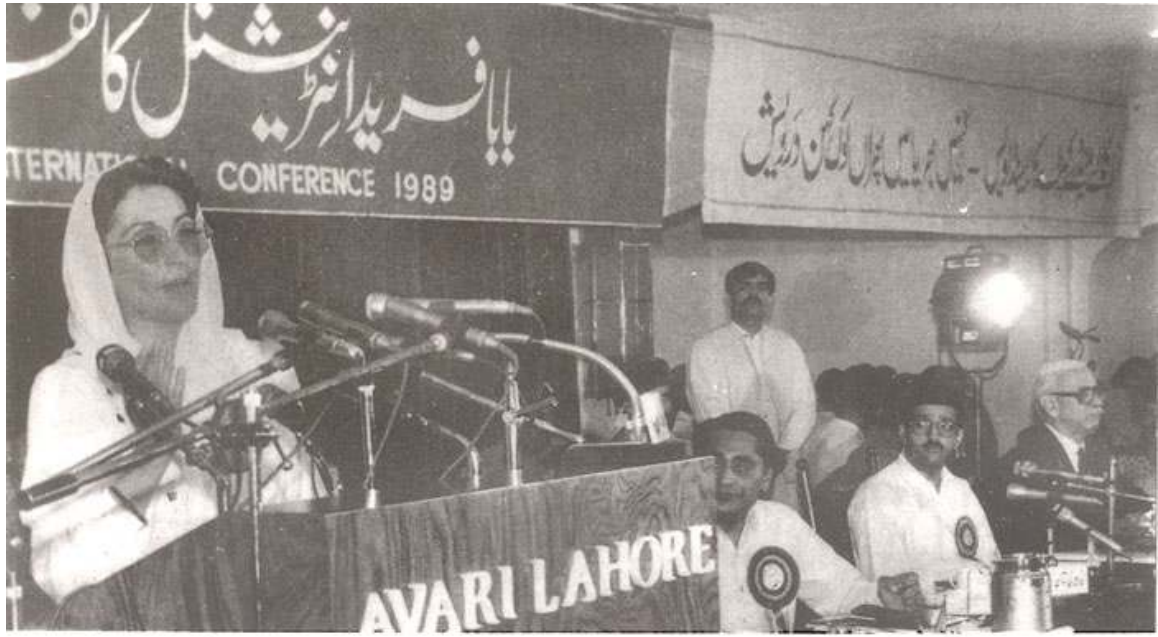
لاہور میں منعقدہ بابا فرید انٹرنیشنل کانفرنس میں وزیر اعظم بے نظیر بھٹو خطاب کر رہی ہیں۔ سابق گورنر جنرل ٹکا خان' اور ممتاز قانون دان سید افضل حیدر نمایاں نظر آرہے ہیں

تاریخ مقرر کر دی۔ ۱۹۷۹ء کے بلدیاتی انتخابات میں منتخب پی پی پی کے کچھ کونسلروں نے ہڑتال کے دن استعفیٰ دینے اور ضیاء کے استعفیٰ پر زور دینے کا اعلان کر دیا۔ ضیاء کے اقتدار کے خاتمہ اور پاکستان میں سول حکومت کی واپسی کیلئے گنتی شروع ہو چکی تھی۔ ضیاء کی قسمت میں بدبختی کا گھڑیال بجنا شروع ہو گیا تھا۔

۲ر مارچ ۱۹۸۱ء

میں ۷۰ - کلفٹن میں اپنے رہائشی کمرے میں پارٹی کارکنوں کے ایک گروہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہوں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ یہ ابراہیم خان ہے جو کراچی میں رائٹرز کا نمائندہ ہے۔

"آپ کا اس خبر کے بارے میں کیا ردعمل ہے؟"۔

کونسی خبر؟"۔

"پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز کا ایک طیارہ اغوا کر لیا گیا ہے"۔

"کس نے اغواء کیا" میں تلملا کر پوچھتی ہوں۔ پی آئی اے کا طیارہ اس سے قبل کبھی اغوا نہیں کیا گیا تھا۔

"ابھی تک اس کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں" وہ کہتا ہے۔ "کوئی شخص بھی نہیں جانتا اغواء کنندگان کون ہیں؟۔ وہ طیارے کو کہاں لیجارہے ہیں اور وہ کیا چاہتے ہیں؟ میں پتہ کرنے کی کوشش کروں گا اور آپ کو باخبر رکھوں گا۔ لیکن کیا آپ مجھے اپنا ردعمل بتاسکیں گی"۔

"تمام قسم کا اغواء برا ہے خواہ وہ طیارے کا ہو یا قوم کا" میں برجستہ جواب دیتی ہوں۔ جب میں ٹیلی فون بند کرتی ہوں تو پی پی پی کے حاضرین مجلس متوقع طور پر میری طرف نگاہ اٹھاتے ہیں۔

"ہمارا ایک طیارہ اغوا کر لیا گیا ہے، مجھے بھی صرف اتنا ہی پتہ چلا ہے"۔

باب ۸

قید تنہائی

سکھر جیل میں

سکھر جیل، ۱۳ر مارچ ۱۹۸۱ء

میں یہاں کیوں ہوں مجھے کچھ پتہ نہیں...... جیل اور اب صحرائے سندھ میں ایک دور دراز علاقہ میں جیل...... سردی محسوس ہو رہی ہے۔ میں قید خانے کے کلاک کی آواز سنتی ہوں...... رات کے ایک بجے پھر دو بجے نیند نہیں آ رہی ہے، میری کوٹھڑی کی کھلی سلاخوں میں سے صحرا کی سرد ترین ہوا اندر آتی ہے...... چاروں دیواروں میں کھلی سلاخیں لگی ہیں۔ کوٹھڑی ایک عظیم پنجرے کی مانند ہے۔ جگہ بہت وسیع ہے مگر اس میں رسی کی صرف ایک چارپائی بچھی ہے۔

میں چارپائی پر سکڑتی ہوں، کروٹ بدلتی ہوں، جب کہ مرے دانت بج رہے ہیں نہ میرے پاس نہ کوئی سویٹر ہے اور نہ ہی کمبل، کچھ بھی نہیں، صرف شلوار قیمض میں ملبوس ہوں جو میں اس وقت پہنے ہوئے تھی جب پانچ روز قبل مجھے کراچی میں گرفتار کیا گیا تھا۔ ایک خاتون جیلر کو میری حالت پر ترس آیا اس نے خاموشی سے ایک جوڑا جراب مجھے لا کر دے دیا۔ مگر وہ اس قدر خوفزدہ تھی کہ اس فیاضی پر کہیں پکڑی نہ جائے، چنانچہ اگلی صبح

ہی اس نے جرابیں واپس مانگ لیں۔ میری ہڈیاں درد کرتی ہیں، اتنا تو تھا کہ اندر میں چل پھر سکتی تھی، لیکن رات کو میری کوٹھڑی کی بجلی بند کر دی جاتی، ۰۰ - ۷ بجے شام کے بعد سرد اندھیرے کے سوا کچھ بھی سوجھتا نہیں۔

پولیس مجھے گرفتار کرنے کے لئے ۷ر مارچ کو کلفٹن میں آئی تھی مگر اس وقت میں وہاں نہیں تھی۔ میں اس شب سمیعہ کے پاس تھی کیونکہ میں اس پالیسی اجلاس سے دور رہنا چاہتی تھی جو میری والدہ ۷۰ کلفٹن میں ایم آر ڈی کے رہنماؤں کے ساتھ منعقد کر رہی تھیں۔ پولیس مجھے ڈھونڈنے میں ناکامی پر مکمل طور پر پاگل ہوچکی تھی۔ انہوں نے میری کزن فخری کے گھر پر بھی چھاپہ مارا، ۷۰ کلفٹن جہاں سے میری والدہ کو گرفتار کیا گیا تھا اس کا کونہ کونہ چھان مارا اور میری تلاش میں ہر جگہ کو تہ و بالا کر دیا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے وہ بھونرا ہے'' میری ہمشیرہ سنی نے پولیس سے استفسار کیا جب وہ میری تلاش میں دیا سلائی کی ڈبیاں بھی خالی کر رہے تھے۔

کراچی میں سب جگہ اپنے پر پھیلاتے ہوئے پولیس نے میری پرانی سکول کی سہیلیوں کے گھروں پر بھی چھاپے مارے...... یہاں تک کہ ایک پارسی خاندان پنتھکی کے گھر پر بھی...... ان کی ۲۵ سالہ بیٹی پاری کو پولیس تھانے میں لے گئی جہاں پولیس سات گھنٹے تک پوچھ گچھ کرتی رہی، پاری اور اس کا خاندان ایک مذہبی اقلیت کے ارکان تھے اور ضیاء کی نفاذ اسلام کی پالیسی کے مطابق ہر شخص جو مسلمان نہیں، گردن زدنی تھا۔ ''ہمیں علم ہے کہ اس ملک میں مذہبی اقلیتوں سے کیا برتاؤ کرنا ہے'' پولیس نے پاری کے رشتہ داروں کو متنبہ کیا جب وہ اس کی نظربندی کے خلاف احتجاج کے لئے حکام سے رابطہ کر رہے تھے۔

''تمہاری اس ملک کی سیاست میں کوئی جگہ نہیں تمہیں اپنے آپ کو ملوث نہیں کرنا چاہئے''

میری دو اور سہیلیوں پوچی اور ہیومو کے گھروں میں تلاشی کے بعد، پولیس نے اگلے روز مجھے کراچی میں اپنی والدہ کی ڈاکٹر اور سابقہ ڈپٹی سپیکر قومی اسمبلی کے گھر پر جالیا۔ ''پولیس باہر کھڑی ہے اور گھر کی تلاشی پر مصر ہے'' ڈاکٹر عباسی کے بیٹے صفدر نے ہمیں بتایا

جب کہ میں اس کے براہ راست ٹیلیفون کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام آباد میں اپنی دوستوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی...... ہم نے حیرت زدہ ہو کر اسے دیکھا، چونکہ مجھے ان چھاپوں کے بارے میں ابھی تک کچھ علم نہیں تھا اور میں ہر قسم کی ایم آر ڈی کی کارروائی سے محترز رہی تھی، میں نے خیال کیا کہ پولیس شاید ڈاکٹر عباسی یا ممکنہ طور پر اس کے بیٹے منور کو گرفتار کرنے کے لئے آئی ہے۔ "انہیں بتادو گھر پر چھاپہ مارنے کی کوئی ضرورت نہیں" میں نے صفدر کو بتایا "انہیں پوچھو وہ کس کی تلاش میں ہیں" وہ لمحہ بھر بعد واپس آیا۔ "وہ آپ کو پکڑنے آئے ہیں" اس نے کہا۔

اس مرتبہ گرفتاری میں کوئی انوکھی اور خوفناک بات تھی مجھے اس بات کا احساس اس وقت ہوا جب کھلی جیپ میں عقب کی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے سپاہیوں کے ہمراہ مجھے گھس جانے کو کہا گیا۔ اس سے قبل وہ مجھے نظر بندی میں لے جانے کے لئے کار استعمال کیا کرتے تھے میں نے انکار کر دیا اور آخر کار انہوں نے مجھے اگلی سیٹ پر بٹھایا...... فوجی گاڑیوں کا قافلہ جو خالی گلیوں میں ہمارا پیچھا کر رہا تھا کافی بڑا تھا...... منزل متوقع طور پر ایک پولیس کا تھانہ تھی۔ اس سے قبل مجھے کبھی پولیس تھانے میں نہیں لایا گیا تھا۔ کیا ہو رہا تھا کوئی مجھے بتا نہیں رہا تھا جب کہ میں ایک خستہ حالت کمرے میں پانچ گھنٹے تک بیٹھی رہی اور پولیس جوانوں کو سگریٹ پر سگریٹ پیتے اور داغدار دیواروں پر پان کی پیک تھوکتے ہوئے دیکھتی رہی، خوف کی ایک سرد لہر ان سب کے چہروں پر منجمد نظر آ رہی تھی۔ ضیاء اپنی ظلم و بربریت کی سابقہ حدود کو پار کر چکا تھا۔

حکام کو تو علم تھا مگر میں نہیں جانتی تھی کہ پاکستان بھر میں گرفتاریوں کی ایک بڑی لہر میں ہزاروں لوگوں کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل جن کی تعداد میں مبالغہ نہیں ہوتا، کے مطابق صرف مارچ ۱۹۸۱ء میں چھ ہزار افراد سے کچھ زیادہ کی گرفتاریاں عمل میں آ چکی تھیں۔ ۲ر مارچ ۱۹۸۱ء کو پی آئی اے کے طیارے کے اغواء کے بعد پانچ دنوں کے اندر اندر ضیاء نے ایم آر ڈی کی تحریک میں حمایت کو ختم کرنے کے لئے طیارے کے اغوا کو ایک بہانے کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا...... ہر وہ شخص جس کا ایم آر ڈی یا پی پی

پی سے ذرا بھر بھی تعلق تھا گرفتار کر لیا گیا۔

نیازی خاندان کے افراد کو اسلام آباد میں گرفتار کر لیا گیا...... پولیس اسینہ کی گرفتاری کے لئے بھی آئی لیکن جب اسے نو مہینے کی حاملہ پایا تو اس کی بجائے اس کے شوہر سلیم کو حراست میں لے لیا۔ شدید صدمے کی وجہ سے اسے زچہ خانہ جانا پڑ گیا۔ یحیٰ بختیار جو میرے والد کے وکلائے صفائی کے سربراہ تھے اور پاکستان کے سابق اٹارنی جنرل، انہیں بھی بلوچستان میں زیر حراست لے لیا گیا۔ فیصل حیات، سابق رکن قومی اسمبلی اور خالد احمد ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ کا بھتیجا اسے بھی گرفتار کیا گیا۔ اسی طرح پی پی پی کی سینکڑوں خواتین ارکان کو زیر حراست لیا گیا۔ فلش مین ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر قاضی سلطان محمود کو راولپنڈی میں تیسری مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ اسی طرح "مساوات" کراچی کے ایڈیٹر ارشاد راؤ اور پی پی پی سندھ کے سرکردہ رکن پرویز علی شاہ کو بھی زیر حراست لیا گیا۔ گرفتاریوں کی فہرست میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ ہمارے ساتھ حکومت کا سلوک بربریت کی ایک نئی سطح تک پہنچ گیا۔

"میری والدہ کہاں ہیں" میں نے تھانے کے عملہ سے استفسار کیا۔

"کراچی سنٹرل جیل میں" انہوں نے جواب دیا۔

"ریسٹ ہاؤس میں" میں نے پوچھا

ریسٹ ہاؤس نسبتاً بہتر جگہ تھی جہاں جیل حکام سے بآسانی ملاقات کی جا سکتی تھی۔ اور میرے والد کو گرفتاری کے بعد ابتدائی دنوں میں یہیں رکھا گیا تھا۔

"کوٹھڑی میں" انہوں نے بتایا۔

مجھے سانس چڑھ گئی سابق وزیر اعظم کی بیوہ سی کلاس کی کوٹھڑی میں جہاں نہ پانی نہ بستر اور نہ صاف ہوا ہی میسر تھی۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو" میں نے پولیس سے پوچھا۔

"تمہاری والدہ کے پاس" ان کا جواب تھا۔

وہ جھوٹ بول رہے تھے۔

مجھے پانچ روز تک کراچی سنٹرل جیل کے ریسٹ ہاؤس میں باہر کی دنیا سے قطعی طور پر لاتعلق رکھا گیا۔ ریسٹ ہاؤس کا فرنیچر ہٹا دیا گیا تھا اور مزید آسائش کی اشیا کم سے کم تر تعداد میں مہیا تھیں۔ وہاں کے عملہ نے میری والدہ کے کوائف سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا اورانہوں نے ان کی کراچی میں موجودگی سے بھی انکار کیا۔ مجھے اپنے وکلاء سے ملاقات کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔ میں اپنے کپڑے بھی ساتھ نہیں لاسکی جو میں نے پہنے ہوئے تھے وہی تھے جب مجھے گرفتار کیا گیا۔ مجھے بالوں کا برش، کنگھا، ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ یعنی کچھ بھی نہیں لینے دیا گیا۔ متواتر دباؤ کے باعث نسوانی الجھنوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے زیر علاج تھی مگر یہاں نہ کوئی دوائی تھی نہ کوئی ڈاکٹر یا ایسی خاتون جسے میں اپنی ضرورت بتا سکتی۔

"آپ کو صبح ۳۰ - ۲ بجے یہاں سے جانا ہوگا" ۱۲ر مارچ کی شب سپرنٹنڈنٹ جیل نے مجھے بتایا۔ وہ خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا۔

"تیار رہیں"

"مجھے کہاں لے جارہے ہیں" میں نے پوچھا مگر جوب ندارد۔

"میری والدہ کہاں ہیں" میں نے پوچھا پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں خوفزدہ ہوگئی۔ میں نے افواہیں سن رکھی تھیں کہ جیل حکام بعض اوقات متنازعہ قیدیوں کو رات کے وقت صحرا میں لے جاتے ہیں اور انہیں قتل کر دیتے ہیں۔ ان کی لاشوں کو ان کے خاندانوں کو اطلاع دینے سے پہلے یہ کہہ کر دفن کر دیا جاتا ہے کہ ان کے رشتے دار جیل سے فرار ہونے پر مارے گئے یا کہ انہیں مخفی اور اچانک دل کا دورہ پڑ گیا۔ جب میں ریسٹ ہاؤس پہنچی تھی تو میں نے سندھ ہائی کورٹ کو اپنی حراست کے خلاف ایک خط میں مطلع کر دیا تھا اور ان سے عدالت میں اپنے دفاع کی خود استدعا کی تھی یا پھر وکیل صفائی کے متعین کرنے کی جسے میرے پاس بھیج دیا جائے۔ اب میں قطعاً مایوس ہوگئی کہ میرا خط منزل تک پہنچے گا یا نہیں۔ "تم یہ خط عدالت تک ضرور پہنچا دو" میں نے جیل کے ایک حاکم پر زور دیا جب کہ میں صبح سویرے حکومت کے افسران کی آمد کا انتظار کرتی رہی۔ اس نے

خاموشی سے خط لیا اور اپنی جیب میں اڑس لیا۔ میں نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا۔ اگر اس نے خط پہنچا دیا، تو کم از کم اس بات کا ریکارڈ تو ہو گا کہ میں کہاں تھی اور کہاں سے مجھے لے جایا گیا۔

صبح ۳۰ - ۲ بجے خواتین سپاہیوں کی ایک بھاری تعداد وین میں آئی، پھر کچھ فوجی اور پولیس جوانوں کے ٹرک آئے...... ہماری تاریک کھڑکیوں والی کار خالی گلیوں میں گردن توڑ رفتار سے آگے بڑھی مبادا ہم پر گھات لگنے والی تھی۔ اچانک کار جھٹکے کے ساتھ رکی اور ریڈیو پر دو طرفہ گفتگو شروع ہو گئی۔ "ہوائی اڈے پر اسے تنہا رکھو" میں نے ہدایات کی بھنک سنی...... مجھے اطمینان ہوا کہ میں ایئرپورٹ پر ہوں۔ لیکن وہ مجھے کہاں لے جا رہے تھے مجھے طیاروں کی پروازوں کا پروگرام ازبر ہو گیا تھا اور اس وقت پاکستان میں کسی سمت کو کوئی پرواز نہیں تھی۔ شاید لاڑکانہ کی سمت ہو، میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ شاید راز رکھنے کے پیش نظر کسی خاص پرواز کا بندوبست کیا گیا تھا...... میں کسی طیارے کی آمد کا انتظار کرتی رہی مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی میں...... وہاں بیٹھی رہی ایک گھنٹہ دو گھنٹے تین گھنٹے چار گھنٹے یہاں تک کہ صبح نمودار ہو گئی۔

۳۰ - ۶ بجے ایک عام سا مسافر طیارہ نظر آیا مجھے اس میں بٹھا دیا گیا...... پولیس کی ایک خاتون میری ملحقہ نشست پر، دو خواتین سپاہی میرے عقب میں اور دو راہداری میں "ہم کہاں جا رہے ہیں" میں نے ایئرہوسٹس سے پوچھا...... خاتون سپاہی نے بات کاٹی۔ "تم زیر حراست ہو، کسی سے بات نہیں کر سکتی" اس نے کہا۔

کیا کچھ ہو رہا تھا...... میں نے کراچی جیل میں پچھلے پانچ دنوں سے اخبار نہیں دیکھا تھا اور مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ میری والدہ اور میرے ساتھ تشدد کا برتاؤ کیوں کیا جا رہا ہے۔ تحریک بحالی جمہوریت کی تشکیل کا شاخسانہ تھا یا ضیاء کو ہمارے چیلنج کا نتیجہ...... مجھے یقین ہے کہ گرفتاریوں کی موجودہ لہر کا باعث یہی بات تھی۔ میری گرفتاری سے قبل پورے ہفتے کے اخبارات گرفتاریوں کی خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ لیکن حکومت ہمارے ساتھ خصوصی طور پر تشدد کا سلوک کیوں کر رہی تھی اور طیارے کے دوسرے مسافر اور خود خواتین

پاکستان کے سیاسی قائدین کے ہمراہ وزیرِ اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کی ملاقات' مولانا فضل الرحمٰن' خان عبدالولی خان' ملک محمد قاسم تصویر میں نمایاں ہیں

سپاہیوں کی ہوائیاں کیوں اڑی ہوئی تھیں۔ ایئرہوسٹس نے مجھے اخبار دیا۔ ایم آر ڈی کی خبروں کی بجائے طیارے کے ہائی جیک یا اغوا کی خبریں زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھیں۔ ۵۵ پاکستانی سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کرتے ہوئے اغواء کنند گان نے طیارے کو افغانستان کے دارالحکومت کابل لے جانے کا حکم دیا تھا جہاں انہوں نے ایک مسافر فوجی افسر میجر طارق رحیم جو میرے والد کا ایڈی کانگ رہ چکا تھا کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ پائلٹ کو جبراً طیارے کو ملک شام کے دارالحکومت دمشق لے جانے کا حکم دیا گیا تھا۔

میرا سانس رک گیا جیسے ہی میں نے یہ خبر پڑھی...... اخباری رپورٹ پر کچھ یقین کرتے ہوئے اور کچھ یقین نہ کرتے ہوئے اغواء کنند گان اپنے آپ کو ایک مزاحمتی تنظیم الذوالفقار کا رکن بتلاتے تھے۔ الذوالفقار تنظیم کا صدر دفتر کابل بتایا جاتا تھا جہاں میرے بھائی مقیم تھے۔ اخباری مضمون کے مطابق اس تنظیم کا رہنما میرا بھائی میر تھا۔

۳۱، ۳۲، ۳۳ سر کے بالوں میں مزید سات مرتبہ برش پھیرنا چاہئے ۹۸،۹۷ سو تک گنتی پوری کرو جب دانتوں کو برش سے صاف کرو، کھلے صحن میں پندرہ منٹ تک چلو یہ میرا روز کا معمول قرار پایا۔ اس سے روگردانی مضر صحت ہوگی۔ اس مقفل چار دیواری میں میری کوٹھڑی کے سامنے خالی سلاخ دار کوٹھڑیوں کے ساتھ ساتھ قید خانے کے صحن میں سے ہوتا ہوا گندے پانی کا نالا گزرتا تھا۔ "اس احاطے کی دوسری کوٹھڑیوں کو" "مکمل طور پر میری وجہ سے خالی رکھا گیا ہے۔ "حکومت مجھے مکمل تنہائی کی سزا دینا چاہتی ہے۔" جیل کے حکام نے مجھے بتایا۔

سوائے جیل کے ان عمال کے جو صبح سویرے میرے کھلے پنجرے کا دروازہ کھولتے ہیں اور میرے لئے ایک برائے نام چائے کی پیالی، ڈبل روٹی برائے ناشتہ، برائے نام دال کا سوپ، ابلا ہوا کدو اور ہفتے میں دو بار مچھلی برائے لنچ دوپہر اور شام کے کھانے کے ساتھ لاتے ہیں میں نے کسی اور شخص کو نہیں دیکھا۔ شاذو نادر ہی ان پانچ مہینوں میں کوئی انسانی آواز کانوں میں پڑتی ہے جب کہ میں سکھر میں قید تنہائی کے دن کاٹ رہی ہوں۔ اور یہ آواز مجھے افسردہ کرنے کے لئے سنائی جاتی ہے۔ "آج ۵۰ مزید اشخاص گرفتار کر لئے گئے۔ جیل حکام اپنے ہفتہ وار دورے کے درمیان گفتگو کرتے ہیں۔ "آج ایک سیاسی

قیدی کو کوڑے لگائے جائیں گے۔"

افغانستان میں سویٹ فوجی مداخلت کی طرح، طیارے کا اغواء بھی ضیاء کے لئے ایک نازک مرحلہ تھا۔ بھرپور عوامی بغاوت سے اقتدار کے محل سے باہر نکلنے کی نوبت آگئی تھی اور ضیاء طیارے کے اغوا کو غلط طور پر پی پی پی سے منسلک کرنے کے لئے اسے پارٹی کی دہشت گردی ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ یہ وقت اس قدر غیر یقینی تھا کہ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ ضیاء نے اغواء کا ڈھونگ پی پی پی کو بدنام کرنے کے لئے خود رچایا ہے...... اگر یہی بات تھی تو بہت کامیاب تھی۔ اغواء کے ۱۳ دن بعد اور طیارے کو بم سے اڑانے کے حتمی مقرر کردہ وقت سے چند منٹ پہلے حکومت نے ۵۵ سیاسی قیدیوں کی رہائی کے مطالبات کو تسلیم کرلیا۔ حکومت کے لئے ۵۵ قیدیوں کی ایک اہمیت تھی جب کہ وہ دہشت گردی کے الزام میں حزب مخالف کے ہزاروں سیاسی ارکان کو گرفتار کرچکے تھے۔ ایم آر ڈی کے چیلنج کا اخبارات میں تذکرہ بھی بند ہوچکا تھا۔ صرف طیارے کا اغواء اور الذولفقار، کی خبروں سے تمام اخبارات کے صفحات بھرے ہوئے ہوتے تھے۔

سکھر میں جیل کی کوٹھڑی میں مقید مجھے ضیاء کی جملہ کوششوں کے بارے میں کچھ علم نہیں جو وہ پی پی پی کا اور خاص طور پر میرا اور میری والدہ کا الذوالفقار سے تعلق ثابت کرنے کے لئے کر رہا تھا۔ اس کی بجائے میں نے اپنی رہائی پر توجہ مرکوز رکھی۔ مجھے اطمینان حاصل ہوا جب میرے وکیل مسٹر لاکھو میری نظربندی کے خلاف اپیل لکھنے کے لئے سکھر جیل میں میری ملاقات کے لئے آئے۔ ایک مرتبہ پھر ایک دیانتدار جیلر میری مدد کو آئے جو خط میں نے سندھ ہائی کورٹ کے نام پر تحریر کیا تھا وہ انہیں پہنچا دیا گیا تھا۔ لیکن جیلر اور مسٹر لاکھو کی کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔

۲۳ر مارچ کو یعنی مسٹر لاکھو کی ملاقات کے تین یا چار روز بعد، فوجی حکومت نے ایک عبوری آئینی حکم جاری کیا "جنرل ضیاء کو آئین میں ترمیم کے اختیارات حاصل رہیں گے اور متصور کیا جائے گا کہ ہمیشہ حاصل رہے ہیں" یہ الفاظ حکم نامے میں درج تھے۔ اس نئے حکم کے تحت ضیاء نے مارشل لاء کی سزاؤں کے خلاف سول عدالتوں کے اپیل سننے کے حق کو یک سر منسوخ کر دیا...... اپیل جو میں نے مسٹر لاکھو کے توسط سے پیش کی اور ہر ایک سیاسی

قیدی کی اپیل جو عدالتوں میں زیر سماعت تھی اب بے سود ہو گئی۔ بغیر کوئی قانونی راہ اختیار کئے فوجی عدالتیں ہمیں گرفتار کر سکتی تھیں، مقدمات کی سماعت کر سکتی تھیں، سزائیں دے سکتی اور پھانسی پر لٹکا سکتی تھیں۔

ضیاء نے ''عبوری عدالتی حکم'' کو عدالتوں سے مخالف ججوں کی تطہیر کے لئے بھی استعمال کیا۔ تمام ججوں کو ضیاء کے بطور چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر اور مارشل لاء کی برتری کا حلف اٹھانے کے لئے کہا گیا۔ جن ججوں نے حلف اٹھانے سے انکار کیا انہیں برطرف کر دیا گیا۔ بعض دوسروں کو حلف اٹھانے سے پہلے ہی برطرف کر دیا گیا...... حکومت کے نئے حکم کے ماتحت عدالتی ججوں کی ایک چوتھائی سے نجات حاصل کر لی گئی...... ان میں وہ جج بھی شامل تھے جو سیاسی قیدیوں کے قید بامشقت اور سزائے موت کے فیصلوں کے خلاف اپنے فیصلے دیتے تھے۔ ''اگر سوال عدالتوں کے ساتھ شراکت اقتدار کا ہے تو میں اسے قبول نہیں کرتا'' ضیاء نے گارڈین میں اپنے انٹرویو میں برملا کہا۔ ''ان کا کام قانون کی ترجمانی ہے اور بس'' بین الاقوامی قانونی انجمنوں اور ایمنسٹی انٹرنیشنل نے حکومت سے زبردست احتجاج کیا مگر اس پر جوں تک نہ رینگی۔ پاکستان میں سول قانون کا وجود ختم کر دیا گیا۔ مسٹر لاکھو کو دوبارہ مجھے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

وقت۔ سنگدل اور اکتا دینے والا

اپنے دماغ کو متحرک رکھنے کے لئے میں نے ایک پتلی سی نوٹ بک میں جو ایک ہمدرد جیلر نے میری کوٹھڑی میں پہنچا دی ہر واقعہ درج کرنا شروع کر دیا۔ اس سے کچھ وقت مصروف گزر جاتا تھا۔ مجھے ایک دن میں ایک اخبار پڑھنے کی اجازت تھی۔ یہ عام طور پر ڈان کا نیا ایڈیشن برائے اندرون سندھ ہوتا تھا۔ اسے آہستہ آہستہ پڑھو میں نے اپنے آپ کو یاد دلایا اور لفظ بہ لفظ پڑھو، ماہی گیری کی خبریں، جمعہ ایڈیشن میں بچوں کے لئے معمے، نماز جمعہ

کی تفصیلات، باورچی خانہ کے نسخے وغیرہ، لیکن میں ایک گھنٹے میں سارا اخبار ختم کر لیتی تھی۔

"کیا تم میرے لئے "ٹائم" یا نیوز ویک لاسکتے ہو" میں نے سپرنٹنڈنٹ سے اس کے ہفت روزہ دورے پر پوچھا۔

"وہ کمیونسٹوں کے جریدے ہیں اور ان کی اجازت نہیں ہے" اس نے مجھے بتایا

"وہ کمیونسٹوں کے نہیں بلکہ سرمایہ داری کے مرکز سے شائع ہوتے ہیں" میں نے دلیل دی۔

"وہ کمیونسٹوں کے ہیں"

"آپ کے پاس لائبریری میں کونسی کتابیں ہیں" میں نے استفسار کیا۔

"ہمارے ہاں کوئی لائبریری نہیں"

جب مارچ ختم ہوا اور اپریل کا آغاز ہوا مجھے اخبار کی آمد سے خوف آنا شروع ہو گیا، طیارے کا اغواء پہلے صفحہ کی سرخی بنتا رہا۔ اسی طرح میرے بھائی میر کے ملوث ہونے کی خبریں...... میر نے پی آئی اے کے طیارے کے اغواء کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔ تمام حکومتی اخبارات نے اشارے دیئے کہ الذوالفقار تنظیم پی پی پی کا مسلح بازو ہے۔

کس قدر دھوکا دہی کا الزام لگایا گیا تھا۔ تمام بنیاد جس پر پی پی پی کی عمارت تعمیر کی گئی اس بات پر کھڑی تھی کہ ملک میں پر امن طریقے اور سیاسی ذرائع سے تبدیلی لائی جائے اور قانونی دائرے کے اندر رہ کر کام کیا جائے۔ آخر ہم کیوں انتخابات پر اتنا زور دے رہے تھے...... ضیاء کی ہر چال کے باوجود انتخابات میں حصہ لیا تھا اور مارشل لاء کی ہم پر تنی ہوئی بندوقوں کے باوجود انتخابات پر زور دے رہے تھے...... عوام کے دلوں اور وفاداریوں کو طاقت سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ ضیاء کو بھی اس بات کا پتہ تھا...... تاہم حکومت ایم آر ڈی، پی پی پی اور بھٹو خاندان کو تباہ کرنے کے لئے الذوالفقار کے بارے میں حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہی تھی۔

سکھر جیل کی کوٹھڑی میں تنہا ہونے کی وجہ سے مجھے یقین ہو چلا تھا کہ حکام مجھے مار دینے کی تیاری کر رہے ہیں۔ جیل عملے کے ایک رکن نے گھبراہٹ میں مجھے بتایا کہ مجھ پر یہیں خفیہ طور پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا کر سزائے موت دے دی جائے گی۔ دوسرے شخص نے بتایا کہ دوسرے صحن میں میرے لئے موت کی کوٹھڑی تیار ہو رہی ہے جہاں مجھے منتقل کر دیا جائے گا۔ سکھر میں حفاظتی پولیس کی نفری بھی بڑھائی جا رہی تھی کہ افواہیں عام پھیلی ہوئی ہیں کہ میری سزائے موت کی صورت میں میرے بھائی مجھے چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ بعض دوسری افواہیں بھی سرگرداں تھیں کہ مجھے بلوچستان کے ایک اذیتی مرکز میں منتقل کیا جا رہا ہے تاکہ پی آئی اے کے طیارہ کے اغواء میں اپنے ملوث ہونے کا اعتراف مجھ سے کرایا جائے۔ "تمہارے لئے خوفناک ایام آنے والے ہیں" ایک اہل کار نے ہمدردانہ طور پر مجھے بتایا۔

انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات جب سکھر جیل میں معائنہ پر آیا تو اس نے ان افواہوں کی تصدیق کی۔ "وہ لوگوں کو تمہیں الذوالفقار میں ملوث کرنے کے لئے اذیت دے رہے ہیں" ایک رحم دل ملگجی بالوں والے افسر نے آہستہ سے مجھے بتایا تاکہ میں آنے والے خطرات سے محتاط ہو جاؤں۔

"لیکن میں بے گناہ ہوں۔ وہ مجھے اس میں ملوث نہیں کر سکتے" میں نے سادہ دلی سے جواب دیا۔

انسپکٹر جنرل نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے تمہارے گھریلو شہر لاڑکانہ کے ایک لڑکے کو دیکھا ہے جس کے پاؤں کے ناخنوں کو اکھاڑا گیا تھا۔" اس نے آنسو بھری آنکھوں سے بتایا۔ "کتنے لوگ ہیں جو اتنی اذیت برداشت کرنے کے قابل ہوں گے"

میں اس پر اور جیل کے عملہ کی باتوں پر یقین کرنا نہیں چاہتی تھی۔ زندہ رہنے کے لئے حقیقت کو تسلیم نہ کرنا ضروری تھا۔ حقیقت کو تسلیم کرنے کا مطلب اس دھمکی کو تسلیم کرنا تھا۔ لاشعوری طور پر۔ تاہم میرا بدن تناؤ کی صورت میں اس حقیقت کو تسلیم کر رہا تھا۔ میرے اندرونی مسائل ابتر ہو گئے چونکہ میری کوٹھڑی میں پردہ داری ممکن نہیں تھی...... جیل

میٹرن کو سکھر جیل میں پہنچنے کے جلد بعد ہی میری نسوانی حالت کا پتہ چل گیا تھا اور ایک ڈاکٹر کو بھی بلا بھیجا گیا تھا۔ لیکن اس کی تشخیص کے بارے میں میرے ساتھ کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔

جیلر جو کھانا میرے لئے لاتے میں پرے ہٹا دیتی کیونکہ میرے لئے اس کا نگلنا مشکل ہو گیا تھا میں نے تقریباً کچھ نہیں کھایا تھا تاہم مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں فربہ ہو رہی تھی...... میرا معدہ بڑھ گیا تھا...... میری پسلی کی ہڈی بھی بڑی ہو گئی محسوس ہوتی تھی۔ اب مجھے حقیقت کا پتہ چلا ہے کہ مجھے بھوک نہ لگنے کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔

جیسے ہی روز بروز میرا وزن کم ہونے لگا تو جیل حکام کو تشویش ہونا شروع ہو گئی کہ وہ حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو کیا جواب دیں گے اگر میں ایسے ہی موت کے منہ میں چلی گئی جب کہ وہ مجھے سزائے موت دینے پر تلے ہوئے تھے۔ "اپنی تمام چیزیں سمیٹ لو، تمہیں کراچی منتقل کیا جا رہا ہے" جیل کی میٹرن نے ۱۶ر اپریل کی صبح مجھے بتایا حالانکہ ابھی مجھے سکھر جیل میں آئے ہوئے پانچ ہفتے ہی ہوئے تھے۔

"کیوں" میں نے استفسار کیا۔

"تمہاری صحت بہت گر گئی ہے۔ ہم تمہیں کراچی لے جا رہے ہیں" کراچی ایئرپورٹ پہنچنے پر پولیس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے میرے گھر لے جا رہے ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ ۷۰ - کلفٹن...... خالص ٹھنڈا پانی نہ کہ جیل کا زرد آلود پانی، رسی کی چارپائی کی بجائے میرا اپنا بستر، سلاخوں کی بجائے چار ٹھوس دیواریں میرا خیال تھا میری مصیبت ختم ہوئی مگر ایسا نہیں تھا۔

"یہ تو میرا گھر نہیں ہے" میں نے احتجاج کیا جب سفر کے بعد تھکی ماندی مجھے ایک ایسے گھر کے اندر لے گئے جو میں نے قبل ازیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"ہم پہلے تمہیں ایک اور ڈاکٹر کو دکھانا چاہتے ہیں" میرے نگران پولیس افسر نے تشریح کی "پھر تمہیں تمہارے گھر لے جائیں گے"

میں نے ایک نامانوس خاتون کو اپنی طرف آتے دیکھا "تم مجھے میرے گھر کیوں نہیں

لے جاتی ہو جہاں میرا اپنا ڈاکٹر مجھے دیکھ لے گا" میں نے کہا مگر پولیس جوانوں نے چپ سادھ لی۔

کم از کم ڈاکٹر رحمدل لگی۔ "سکھر کی ڈاکٹروں کا خیال ہے تمہیں رحم کا سرطان ہے" اس نے آہستہ سے مجھے بتایا جب کہ وہ میرا معائنہ بھی کر رہی تھی۔ "مجھے یقین نہیں ہے ہمیں تفتیشی اپریشن کرنا پڑے گا۔"

سرطان ۲۸ برس کی عمر میں؟ میں نے اسے بے یقینی کی حالت میں دیکھا کیا سرطان کا خطرہ حقیقی تھا یا وہ میری توجہ کسی اور طرف مبذول کرانا چاہتے تھے۔ اس ڈاکٹر کو بھی باقی ڈاکٹروں کی طرح حکومت نے خود نامزد کیا تھا۔

جب ہم باتیں کر رہی تھیں تو وہ ایک پیڈ پر کچھ تحریر بھی کر رہی تھی۔ "تم پریشان مت ہو میں تمہاری ایک دوست اور ہمدرد ہوں" اس نے مجھے وہ چٹ پڑھنے کے لئے دی۔ "تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو" لیکن کیا میں ایسا کر سکتی تھی میرے پاس ایسی کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں کسی پر اعتماد کروں۔ تم نے بتایا تھا کہ تم مجھے ۷۰ - کلفٹن لے جارہی ہو" میں نے پولیس کو کہا جب ہم کراچی کی سڑکوں پر جیپ میں گھوم رہے تھے۔ "یہ تو وہ راستہ نہیں"

"تم گھر بعد میں جاؤ گی" "پہلے ہم تمہیں تمہاری والدہ سے ملاقات کے لئے کراچی سنٹرل جیل لے جارہے ہیں۔" انہوں نے مجھ بتایا

میں بہت ہیجان میں مبتلا ہو گئی۔ ایک مہینہ سے بھی زیادہ عرصہ قبل ہماری گرفتاریوں کے بعد نہ تو میں نے اپنی والدہ کو دیکھا تھا نہ ہی ان کی آواز سنی تھی...... میں اپنی حالت. ایم آر ڈی کے حالات اور ہمارے خلاف غداری کے الزامات کے متعلق ان سے گفتگو کرنا چاہتی تھی مجھے یقین تھا کہ حکومت ہمارے خلاف مقدمہ کھڑا کرنے والی ہے۔

"ممی، ممی" میں اونچی آواز سے چلائی جب میں ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوئی۔

"ممی میں پنکی ہوں میں یہاں ہوں"

کوئی جواب نہیں آیا۔ ایک اور جھوٹ میری والدہ کو کسی دوسرے وارڈ میں رکھا گیا تھا.

ایک جیلر نے رازدارانہ لہجے میں مجھے بتایا اگلے روز مجھے ۷۰ کلفٹن لے جانے کی بجائے ایک بڑے سرکاری ہسپتال میں لے جایا گیا اس کی راہداریاں سنسان پڑی تھیں جہاں عموماً خاندان کے افراد کا ہروقت ہجوم رہتا تھا جو اپنے مریضوں کو آپریشن روم کے دروازے تک ساتھ لے کر جاتے تھے۔ اپنے خاندان کے کسی رکن کے بغیر میں نے اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا آپریشن کے بعد جب میں جاگی تو اپنی ہمشیرہ صنم کو دیکھ کر بہت اطمینان حاصل ہوا. کم از کم حکومت نے اسے آنے کی اجازت تو دی۔ لیکن وہ اس ملاقات پر بہت آزردہ معلوم دیتی تھی۔

صنم

ہسپتال کافی بڑا تھا میں مخمصے میں تھی کہ کہاں جاؤں اور کس سے اپنی ہمشیرہ کے بارے میں پوچھوں...... جیسے ہی میں نے اس کا نام پکارا، ہر شخص کو جیسے سانپ سونگھ گیا اور مجھے دیکھنے لگے...... میں انتہائی خوفزدہ ہوگئی میں نے کئی مہینوں سے گھر کے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ پاکستان اس وقت ایک خوفناک جگہ بن چکا تھا خاص طور پر بھٹو خاندان کے لئے، لیکن میرے لئے اور کہاں جائے پناہ تھی۔

"براے مہربانی میری امداد کیجئے" میں نے بڑے بڑے ہالوں میں سے گزرتے ہوئے فرداً فرداً کئی آدمیوں سے استفسار کیا۔ یہاں جاؤ، وہاں جاؤ، مجھے کہتے رہے۔ اچانک میں نے ایک عورت کے چیخنے کی آواز سنی۔ "میرے خدایا یہ تو میری بہن ہے" میں نے نزدیک کھڑی خاتون کو کہا۔ "وہ تمہاری بہن نہیں ہے وہ تو ایک معمولی اپریشن کے لئے یہاں آئی ہے" اور زچگی کی تکلیف میں ہے" اس خاتون نے جواب دیا جو مجھے خفیہ پولیس کی ایجنٹ نظر آرہی تھی۔

میں جانتی تھی وہ پنکی تھی۔ یہ میرا یقین تھا۔ میں چیخوں کی آواز کے پیچھے دوڑی اور دیکھا کہ اسے ہسپتال کی ٹرالی میں آپریشن روم سے ہسپتال کی راہداریوں میں تیزی سے دھکیلا جا رہا تھا اور پولیس نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اس کے بازوؤں میں اور ناک میں ٹیوبیں لگی ہوئی تھیں۔ "وہ مجھے قتل کر دینا چاہتے ہیں وہ مجھے قتل کر دینا چاہتے ہیں پاپا" وہ چلا رہی تھی اور ابھی تک نیم بےہوشی کے عالم میں تھی۔ "انہیں روکو، کوئی ہے انہیں روکو" میں نے اس کے سر میں ایک سفید بال دیکھا میری نظر میں یہ کسی شے کی حد تھی بوجھ کا آخری تنکا۔ اتنے برسوں سے وہ قید میں تھی، کوئی شخص اس کے پاس نہیں تھا اور اسے اس کے بدلے میں کیا ملا...... ایک سفید بال میں وارڈ میں اس کی چارپائی کے پاس بیٹھی رہی تاآنکہ وہ جاگ گئی...... میرا خیال تھا وہ یہ سہ پہر مجھے اس کے ساتھ گزارنے دیں گے مگر انہوں نے مجھے صرف آدھ گھنٹے تک وہاں رہنے دیا...... باہر جانے سے پہلے میں اس کی ڈاکٹر سے ملی۔ "اپنی بہن کو بتاؤ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے" ڈاکٹر نے کہا۔ لیکن مجھے دوبارہ ملنے کا موقع نہیں ملا۔ اسی سہ پہر وہ اسے واپس کراچی سنٹرل جیل لے گئے۔

میرے کانوں میں شور مچا ہوا، تاریکی کبھی آنکھوں میں زیادہ محسوس ہوتی کبھی کم...... کراچی سنٹرل جیل میں آنکھیں کھولتی ہوں تو ایک خاتون سپاہی کو اپنے تھیلے کی تلاشی لیتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ وہ سکھر میں میری نوٹ بک کے صفحات الٹ پلٹ رہی ہے۔ "تم کیا کر رہی ہو" میں لڑکھڑاتی زبان میں اسے پوچھتی ہوں۔ وہ پریشان ہوکر مجھے دیکھتی ہے۔ "اچھا" کہہ کر وہ نوٹ بک واپس بیگ میں رکھ دیتی ہے۔ جب وہ چلی جاتی ہے، میری چھٹی حس مجھے اکساتی ہے اور میں بستر سے اٹھ کھڑی ہوتی ہوں...... بخار کی اور ہذیانی کیفیت میں میں غسل خانے کی طرف لپکتی ہوں اور نوٹ بک کو جلا دیتی ہوں۔ ایک گھنٹے کے دوران ایک پولیس کا جوان اور ایک خاتون سپاہی واپس آتے ہیں۔ "تمہاری بہن نے تمہیں کوئی چیز دی تھی وہ کہاں ہے؟" وہ مطالبہ کرتے ہیں شاید وہ اس نوٹ بک کے متعلق یہی خیال کرتے ہیں۔ "میں نہیں جانتی تم کیا کہہ رہے ہو" میں کہتی ہوں، تم جھوٹ بول رہی ہو وہ مجھ پر چیختے ہیں اور میرے ہینڈ بیگ اور کپڑوں کے بنڈل کی تلاشی لیتے ہیں ان کا غصہ کچھ نہ
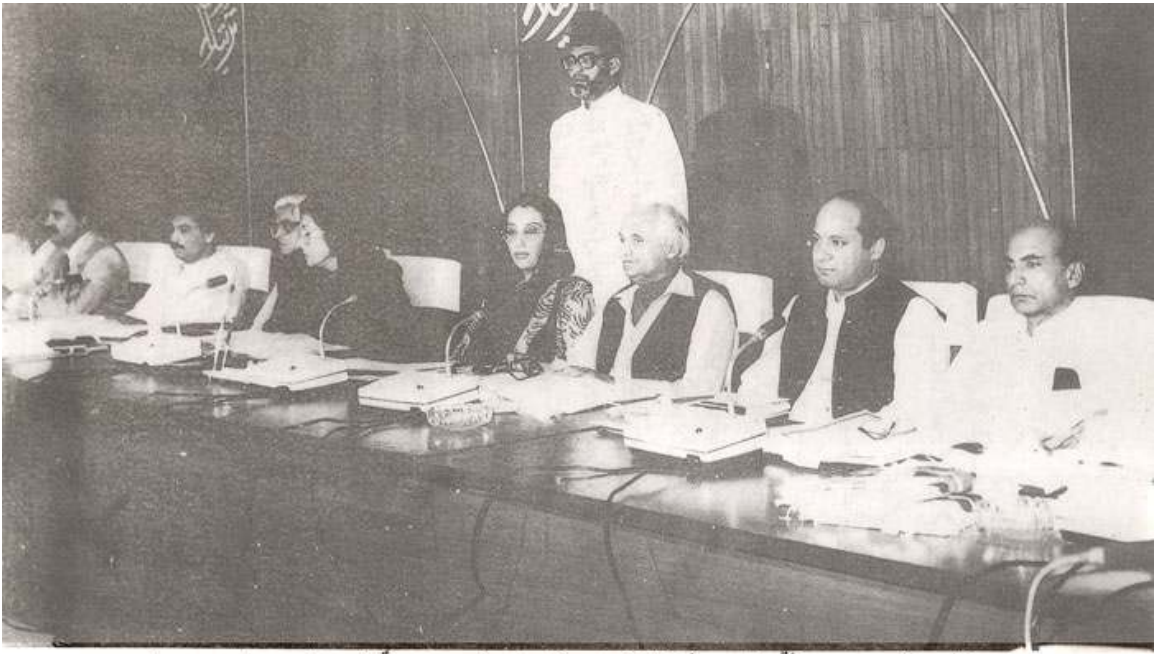
اپنے پہلے دور حکومت میں وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو ایک اجلاس کی صدارت کر رہی ہیں۔ بیگم نصرت بھٹو وزیر اعلیٰ پنجاب نواز شریف،
وزیر اعلیٰ سندھ قائم علی شاہ، گورنر سرحد امیر گلستان جنجوعہ، سید فیصل صالح حیات اور مخدوم امین فہیم تصویر میں نظر آرہے ہیں

ملنے پر دوبالا ہوجاتا ہے۔

اٹھو جلدی کرو، دو خواتین سپاہی اگلی صبح مجھ پر چلاتے ہوئے کہتی ہیں۔ میں اس قدر کمزور ہوں کہ اٹھ نہیں سکتی۔ "ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ۴۸ گھنٹے تک تم نے حرکت نہیں کرنی" میں احتجاج کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ پولیس عورتیں اس طرف توجہ نہیں دیتیں۔ اور میری چند چیزیں بیگ میں ڈال دیتی ہیں...... جیسے ہی وہ مجھے ایک کار میں دھکیلتی ہیں اور پھر طیارے میں، مجھے دل ڈوبتا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی آوازیں دور فاصلے سے آتی سنائی دیتی ہیں۔ تاریکی کی لہریں مجھ تک دوڑتی چلی آتی ہیں۔ برائے مہربانی مجھے ان میں مت ڈوبنے دو۔ میں بے ہوش ہونا نہیں چاہتی۔ لیکن میں مدہوشی میں ڈوب جاتی ہوں۔ جب میں سکھر میں جیل کی کوٹھڑی میں کئی گھنٹوں کے بعد ہوش میں آتی ہوں تو کچھ آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ "وہ زندہ ہے" ایک آواز آتی ہے۔ "اسے اتنی جلدی ہسپتال سے نہیں لانا چاہئے تھا" ایک دوسری آواز آتی ہے۔ میں دوبارہ مدہوشی کی تاریکی میں ڈوب جاتی ہوں۔ لیکن اس مرتبہ زیادہ سکون محسوس ہوتا ہے۔ میں زندہ بچ گئی ہوں۔

مجھے اس وقت مطلق احساس نہیں تھا کہ میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ جام صادق علی، پی پی پی حکومت کا ایک سابق وزیر جو لندن میں جلاوطنی کے دن کاٹ رہا تھا سالہا سال بعد اس نے مجھے بتایا کہ ہسپتال میں میرے داخلہ کے دنوں میں اسے پاکستان سے خوفناک ٹیلی فون آیا تھا کہ "کچھ کرو، ورنہ وہ بے نظیر کو آپریشن روم کی میز پر ختم کرنے پر تلے بیٹھے ہیں" اس نے پریس کانفرنس منعقد کی جس میں میری زندگی کے خطرے کا انکشاف کیا اور اس طرح پیشگی واویلا مچانے پر حکومت کو میری طرف سے محتاط ہونا پڑا۔

آپریشن کے کئی ہفتوں بعد تک میں تھکی تھکی اور خون کی کمی محسوس کرتی رہی۔ اور چلنا پھرنا دوبھر ہوگیا۔ جیل کا نچلا عملہ کھلم کھلا میرا ہمدرد بن گیا تھا۔ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر انہوں نے ایک قلم اور ایک نوٹ بک مجھے پہنچائے اسی طرح نیوز ویک کے کچھ پرانے شمارے بھی۔ ایک نے تو مجھے تازہ پھلوں کی ٹوکری بھی دی۔ میں نے جتنا ممکن ہو سکا سکھر جیل کی دیواروں کے واقعات رقم کئے اپنی نوٹ بک میں، اخبارات کے حاشیوں پر اور ہر کاغذ

کے ٹکڑے پر جو مجھے مل سکا۔

جیل ڈائری سے مختصرات

۲۰ر اپریل ۱۹۸۱ء:۔ حکومت کا حامی اردو اخبار جنگ بی بی سی کے ساتھ میر مرتضیٰ بھٹو کے انٹرویو کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ طیارے کے اغواء کے وقت کابل میں موجود تھا مگر اسے اس واقعہ کا مطلقاً علم نہیں تھا حتیٰ کہ یہ وجود میں آ گیا۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے کہا کہ اس کی والدہ اور ہمشیرہ جو پاکستان میں تھیں انہوں نے الذوالفقار سے کوئی ایسا معاہدہ نہیں کیا تھا۔ اس کا پاکستان پیپلز پارٹی سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ ہی والدہ اور ہمشیرہ کے ساتھ کوئی رابطہ ہے۔

۲۱ر اپریل ۱۹۸۱ء ڈان، ”ریڈیو آسٹریلیا نے کل شب میر کے حوالے سے بتایا کہ وہ پچھلے دنوں بمبئی میں تھا اور یہ کہ الذوالفقار تنظیم جسے پاکستان حریت پارٹی بھی کہا جاتا ہے پاکستان کو کسی وقت بھی اتھل پتھل کر سکتی ہے اور اب اس نے انتظامیہ کو بزور تشدد مفلوج کرنے کی قسم اٹھا رکھی ہے۔ الذوالفقار نے، میر نے کہا، اندرون پاکستان کم از کم ۵۴ کارروائیاں کی ہیں جن میں کراچی سٹیڈیم میں پوپ کی آمد سے ذرا پہلے کا بم دھماکہ بھی شامل ہیں۔ جب اس کی تنظیم کے صدر مقام کابل کے متعلق سوال کیا گیا تو اس نے بتایا۔ ”ہمارا کچھ عملہ وہاں مقیم ہے مگر ہمارا صدر مقام پاکستان کے اندر ہی موجود ہے“۔

یہ خبریں پڑھنے کے ساتھ ہی میرا دل ڈوبنے لگا...... کاش میں میر سے مل سکتی۔ اس سے گفتگو کر سکتی۔ ہمارے درمیان پانچ سال کا فاصلہ تھا۔ اب تو صرف اخبار میں ان کی تصویریں دیکھ کر ہی پتہ چلتا تھا کہ وہ کیسے لگتے ہیں؟۔ جہاں تک میں سمجھ سکی، میر کی مایوسیاں، غصہ اور بیانات خواہ وہ حقیقی تھے یا حکومت کے ایماء پر توڑے مروڑے گئے، میرے لئے اور پی پی پی کے دوسرے ارکان کے لئے مشکلات پیدا کرنے کا سبب بن رہے تھے۔ ضیاء پی پی پی کو بیک جنبش قلم ختم کرنے کیلئے انہیں بہانے کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ وہ میرے بھائیوں تک تو نہیں پہنچ سکتا تھا مگر ہم تک پہنچنا آسان تھا۔

۲۸ر اپریل کو میر کا نام پاکستان کے مفروروں کی فہرست میں سب سے اوپر رکھ دیا گیا۔ اور ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر غیر متوقع طور پر جیل خانے کے معائنہ کے دوران مجھے ملنے آگیا۔ وہ جیل سپرنٹنڈنٹ بعض دوسرے افسران کی معیت میں میری کوٹھڑی میں آیا۔ ہم دونوں وہاں پڑی دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"مجھے قید کیوں کیا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"الذوالفقار کی وجہ سے" اس کا جواب تھا۔

"میرا الذوالفقار سے کوئی تعلق نہیں۔"

"ہمیں الذوالفقار کا بنیادی نقشہ تمہارے کمرے سے ملا جس میں پوری سکیم کی تفصیلات درج تھیں" اس نے بتایا۔ وہ کیا اول فول کہہ رہا تھا مجھے کچھ علم نہ ہو سکا۔

"میں نے طیارے کے اغواء ہونے کے واقعہ سے قبل الذوالفقار کا نام بھی نہیں سنا تھا" میں نے اصرار کیا۔

"تمہارے الذوالفقار سے تعلق، سٹیڈیم میں بم کا دھماکہ اور لالہ اسد کے بارے میں عدالت ہی فیصلہ کرے گی"۔

لالہ اسد؟ سندھ میں طلباء ونگ کا نائب صدر؟ میں لالہ اسد کو جانتی تھی وہ خیرپور یونیورسٹی میں انجینئرنگ کا طالب علم تھا۔ میں یقین نہیں کر سکتی تھی کہ وہ الذوالفقار میں ملوث تھا، اگر واقعی اس نام کی کوئی تنظیم تھی۔ لیکن حکومت الذوالفقار کے نام کو استعمال کر کے پی پی پی کے وفادار کارکنوں کو ختم کرنے کا بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ ایک اور شخص ناصر بلوچ کو اغواء کنندگان کے ساتھ شریک جرم ثابت ہونے پر گرفتار کیا گیا ہے۔ یہ بات ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے مجھے بتائی۔ میں اسے جانتی تھی۔ ناصر بلوچ عظیم کراچی سٹیل ملز میں پی پی پی کی مزدور شاخ کا نمائندہ لیڈر تھا۔

صبح کی گفتگو کے نتیجہ میں جو اندازہ میں لگا سکی وہ میں نے اپنی ڈائری میں درج کیا۔

"حکومت کا خیال ہے کہ میں نے الذوالفقار کے لالہ اسد اور دوسرے اراکین کے ساتھ مل کر سٹیڈیم میں بم دھماکہ کی سازش میں حصہ لیا۔ میں اس پر یقین ہی نہیں کر سکتی۔ یہ کتنا

غیر حقیقی اور عجیب معلوم ہوتا ہے۔ بے گناہوں کو دھر لیا گیا ہے۔ مجرم حکومت کر رہے ہیں۔ یہ کیا دنیا ہے؟" دنیا دو روز بعد انتہائی طور پر بد شگون ہوتی گئی۔

روزنامہ جنگ کی سرخی تھی "پکڑے گئے کاغذات ثابت کرتے ہیں کہ بھٹو خواتین کو کارروائی کا قبل ازیں علم تھا" میرا دل ایک سیکنڈ کے لئے رک گیا اور ایک سرد لہر میری ہڈیوں میں اتر گئی۔ وہ اسی بنیادی نقشے کا حوالہ دے رہے ہوں گے جس کا ذکر ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے کیا تھا کہ میرے کمرے میں پایا گیا تھا حکومت واضح طور پر ملک کو بھٹو خاندان کے خلاف ایک اور مقدمے کے لئے تیار کر رہی تھی۔

"ہم ایک ہولناک خواب میں پکڑے گئے معلوم دیتے ہیں" میں نے اپنی ڈائری میں ۳۰ر اپریل کو تحریر کیا۔ "پہلا صدمہ تو الذوالفقار اور میر کے متعلق خبروں کا تھا۔ اب حکومت کا ارادہ ہمیں اس میں پھنسانے کا ہے جبکہ ہمیں اس کا کوئی علم نہیں۔ یہ سب کچھ عجیب و غریب محسوس ہوتا ہے۔ لیکن یہ اتنا عجیب بھی نہیں، کیونکہ پاپا کے ساتھ بھی ان لوگوں نے یہی کچھ کیا تھا...... اب وہ اسی دھوکا دہی کو دہرانا چاہتے ہیں جبکہ دنیا جانتی ہے کہ یہ دھوکا دہی ہے یا شاید ان کا خیال ہے کہ دنیا کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ فراڈ ہے۔ اصل بات تو سچائی کی ہے لیکن فوجی عدالت میں اس کے اظہار کا موقع ہی کب دیا جاتا ہے؟۔ سیاسی طور پر ہمیں شکست دینے سے معذور ہو کر ضیاء ہمیں جسمانی طور پر ختم اور تباہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہے"۔ جو کچھ میرے علم سے باہر تھا وہ ظلم اور سنگدلی کی گہرائی تھی جہاں تک حکومت ہمیں تباہ کرنے کی اپنی کوششوں تک جا سکتی تھی۔

کراچی میں بلدیہ مرکز اور ڈویژن ۵۵۵، لاہور میں شاہی قلعہ اور برڈ ووڈ بیرکس، پنجاب کے شمال میں اٹک کا قلعہ، بیرون راولپنڈی چکلالہ میں فضائیہ کا بیس، بلوچستان میں مچھ جیل اور کھلی کیمپ، ان اذیتی مرکزوں کے نام پی پی پی کے حامیوں کی زندگیوں میں رچ بس گئے تھے۔ اسی طرح ایمنسٹی انٹرنیشنل اور دوسری انسانی حقوق کی انجمنوں کی متفکرانہ رپورٹوں میں روز بروز ان مرکزوں کا نام معمول بن چکا تھا۔ اور تمام رپورٹیں پی پی پی کو، میری والدہ کو اور مجھے الذوالفقار تنظیم میں ملوث کرنے کے در پے تھیں۔

بہت مدت بعد مجھے ان اذیتی مرکزوں کی تفصیلات کا پتہ چلا، زنجیریں، برف کے بلاک، سرخ مرچیں قیدیوں کے اعضائے مخصوصہ میں ٹھونسنا، اپنے رفقاء اور دوستوں کی کہانیاں سن کر ذہن بیمار ہونے لگا تھا کہ انسان دوسروں پر ظلم کی ان انتہاؤں تک بھی جاسکتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کا ریکارڈ رکھنے کی ضرورت تھی جنہوں نے ضیاء کی مارشل لائی حکومت کے ظلم کو برداشت کیا۔

فیصل حیات، قانون دان، زمیندار، سابق رکن قومی اسمبلی

۱۲ر اپریل ۱۹۸۱ء کو صبح ۳۰ - ۳ بجے سپرنٹنڈنٹ پولیس اور فوجی خفیہ محکمے کے ایک کرنل کی قیادت میں ۴۰۰ پولیس جوانوں نے لاہور میں میرے گھر کو محصور کر لیا۔ انہوں نے ملازموں کو پیٹا اور دروازے توڑ کر گھر کے اندر گھس آئے۔ میری ہمشیرہ جو جگر کے آپریشن کے بعد بستر استراحت پر تھی اسے بستر سے گھسیٹ لیا گیا۔ وہ میری والدہ کو کمرے سے باہر گھسیٹ کر لے گئے اور میرے سونے کے کمرے کے دروازے کو توڑ ڈالا۔ "یہ الذوالفقار کا صدر مقام ہے" انہوں نے مجھے گردن سے پکڑتے ہوئے کہا۔ "ہم یہاں تمہارے زیر زمین کمرے میں ذخیرہ کئے ہوئے راکٹ لانچرز، بذوکا بندوقیں، سب مشین گنیں اور گولیاں ضبط کرنے کے لئے آئے ہیں" میں نے بھونچکا ہو کر انہیں دیکھا۔ "جو کچھ چاہتے ہو تم تلاشی لے لو" میں نے کہا "یہ میرے کنبہ کا گھر ہے کوئی ہیڈ کوارٹر نہیں...... یہاں زیر زمین کوئی کمرہ نہیں" تاہم انہوں نے مجھے گرفتار کر لیا۔ میں نے پہلے چوبیس گھنٹے جیل میں بغیر کچھ کھائے پیئے گزارے۔ تب انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور لاہور قلعہ میں لے گئے۔ یہ قلعہ ۴۵۰ برس قبل مغلوں کے شہنشاہ شاہ جہاں نے جو تاج محل کا خالق بھی تھا اینٹوں کی دیواروں سے چنوایا اور اس میں شیشوں کا خوبصورت محل تعمیر کرایا۔ موسم گرما میں چھتر کے سائے میں میرا کنبہ اور میں سیر کیا کرتے تھے۔ یہاں مغل بادشاہوں نے پانی کے تالابوں میں کنول کے پھول کھلائے تھے۔ لیکن طیارے کے

اغواء کے بعد لاہور قلعہ اپنی اذیت گاہوں سے مشہور تھا۔ یہ پاکستان میں فرانس کی اذیت گاہ بیسٹل کا متبادل تھا۔

تقریباً ۲۵ سے ۳۰ تک اراکین کو گرفتار کیا گیا تھا۔ جہانگیر بدر ایڈیشنل سیکرٹری جنرل پی پی پی پنجاب، شوکت محمود جنرل سیکرٹری، ناظم شاہ سیکرٹری مالیات، مختار اعوان سابق وفاقی وزیر اور بڑے بڑے سرکاری افسران...... حالات بہت افسوسناک اور گھمبیر تھے۔ ہر دو دن بعد مجھے پوچھ گچھ کے لئے لیجایا جاتا۔ مجھے وقت کا بھی پتہ نہیں کب؟۔ وہ صبح چھ بجے لینے آتے تھے یا شام کو یا عین نصف شب کے وقت کچھ پتہ نہیں کب؟۔ اگرچہ ہم قید خانے میں تھے ہمیں ہتھکڑیاں لگا کر لیجایا جاتا تاکہ بریگیڈئر راحب قریشی ناظم مارشل لاء کا چیف آف سٹاف اور عبدالقیوم صوبائی خفیہ محکمے کا سربراہ ہمیں رگڑا دے سکیں۔ ان دونوں آدمیوں کے نام اور چہرے میں زندگی بھر نہیں بھلا سکتا۔

"ہم تمہیں اپنی زندگی کا موقع مہیا کر رہے ہیں" انہوں نے مجھے کہا جب کہ میں گھنٹوں ان کے سامنے کھڑا رہنے پر مجبور کیا گیا۔ تم ایک نوجوان آدمی ہو...... اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ تمہارے سامنے تمہارا مستقبل پڑا ہے...... صرف تمہیں اتنا سا کام کرنا ہے کہ بیگم نصرت بھٹو اور مس بے نظیر بھٹو کے طیارے کے اغواء میں ملوث ہونے کی تصدیق کرنے کے لئے راضی ہو جاؤ"۔ میں نے انکار کر دیا۔ اور ان کے لالچ دینے کی تحریک میں اضافہ ہو گیا۔ "تم سیاست میں ہو" انہوں نے کہا "ہم تمہیں وزیر بنوا دیں گے"۔ تم کپڑے کی صنعت سے وابستہ ہو انہوں نے کہا۔ "تمہارے نئے مل لگانے کے اجازت نامے کو تمہاری سیاسی معاملات میں مصروفیت کی وجہ سے منسوخ کیا گیا۔ ہم اس اجازت نامے کو بحال کر دیں گے۔ اور تم دولت مند بن جاؤ گے"۔ جب میں نے اپنی مزاحمت جاری رکھی تو انہوں نے اپنی چالوں کو تبدیل کر لیا۔ "ہم تمہیں ۲۵ سال تک مقید رکھیں گے" انہوں نے دھمکی دی۔ "ہم مارشل لاء حکومت کے افسر ہیں۔ ہمیں کسی شہادت کی بھی ضرورت نہیں۔ ہم تمہیں ابھی اور یہاں مجرم گردان کر سزاء دے سکتے ہیں"۔ میں تین ماہ تک ایک چھوٹی سی کوٹھڑی جو ۵ × ۴ فٹ کی تھی میں مقید رہا۔ چھ فٹ کا قد آور آدمی

ہونے کی بناء پر نہ میں سیدھا لیٹ سکتا تھا نہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ میرے بلاک میں ایک ہی طرح کی چار کوٹھڑیاں تھیں جن کی سلاخیں مغرب کی جانب کھلی ہوئی تھیں دوپہر کے بعد سے شام تک سورج کی دھوپ اندرون کو تمتمائے رکھتی اور درجہ حرارت بعض اوقات ۱۱۵ تک پہنچ جاتا جو ناقابل برداشت ہوتا۔ اس حدت سے بچنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ ہماری کوٹھڑیوں کے باہر ایستادہ پنکھے راہداری کی گرمی بھی اندر پھینکتے اور اندر کی ہوا جہنم کی آگ محسوس ہوتی۔

میرے ہونٹ سوج گئے اور اس قدر درد انگیز تھے کہ کوئی چیز بھی نگلی نہ جاتی۔ میری جلد پر چھالے پڑ گئے اور چہرے سے لے کر پاؤں کے پنجوں تک گول سیاہ دائرے پورے جسم پر پھیل گئے۔ تمام بدن پر پھنسیاں بن گئیں۔ دھوپ سے بچنے کے لئے مایوسی کے اتھاہ عالم میں ایک سہ پہر میں نے اپنی قمیص سلاخوں پر باندھ دی مگر پہرہ داروں نے مکمل طور پر مجھ سے چھین لی۔ تین دن تک وہ قمیص مجھے واپس نہ ملی۔

میری کوٹھڑی کے بلاک میں دوسری کوٹھڑیوں کے قیدیوں نے ایک ایک کر کے اس تمازت کی شدت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ مجھے ان کے بے ہوش ہونے اور ہذیان میں کراہنے کی آوازیں صاف سنائی دیتیں۔ میں سب میں سے زیادہ نوجوان تھا۔ اس وقت میری عمر ۲۷ سال تھی اور میں زیادہ لمبے عرصے تک یہ کڑی آزمائش برداشت کرتا رہا۔ لیکن دو ماہ بعد میں بھی بے ہوش ہو کر گر گیا۔ دو دن بعد ہوش آئی تو میں زیر زمین کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ جسے حکام نے عارضی ہسپتال کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا تھا۔ جب ڈاکٹروں نے میرے مکمل ہوش میں آنے کی تصدیق کر دی تو مجھے دوبارہ اسی کوٹھڑی میں بھیج دیا گیا۔

راتیں دن کی نسبت زیادہ اذیت ناک ہوتی گئیں۔ نہ میری کوٹھڑی اور نہ ہی دوسرے قیدیوں کی کوٹھڑیوں میں کوئی بستر مہیا کیا گیا۔ بلکہ ایک چادر تک بھی میسر نہ تھی۔ ہمیں کوٹھڑی کے ٹوٹے پھوٹے سیمنٹ کے فرش پر سکڑنا پڑتا اور پاس ہی ایک کھلا بدبودار سوراخ بنا ہوا تھا جو رفع حاجت کے کام آتا۔ چیونٹیاں جسم پر رینگتیں، لال بیگ، چھپکلیاں، چوہے

اور ہر قسم کا کیڑا مکوڑا جان کو عذاب بنائے رکھتا۔ قید خانے کے حکام نے سات فٹ اونچی چھت پر ۵۰۰ واٹ کا بلب لٹکایا ہوا تھا جو ساری رات آنکھوں کو چندھیائے رکھتا۔ چھت کی گہرائی میں بلبوں کے ساکٹ یا خانے اس طرح ٹھونکے گئے تھے کہ کوئی شخص تار کو پکڑ کر خود کشی نہ کر سکے۔ شاید میں خود بھی خودکشی کر لیتا اگر یہ ممکن ہوتا۔

میری صحت تیزی سے ابتر ہوتی گئی۔ حفظان صحت کی حالت اتنی غیر تھی کہ وہاں زندہ رہنا معجزہ سے کم نہیں تھا۔ خوفناک خوراک جو ہمیں مہیا کی جاتی وہ سلاخوں کے باہر ٹرے میں رکھی ہوتی اور اسے دس سیکنڈ میں نگلنا ضروری تھا...... روٹی میں ریت اور کنکریاں ملی ہوتیں اور پتلے شوربا کے اوپر مکھیاں بھنبھاتیں۔ مجھے بار بار کبھی پیچش، کبھی ملیریا اور کبھی ہیضہ ہو جاتا۔ ایک مرتبہ میرا درجہ حرارت ۱۰۵ تک پہنچ گیا۔ میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ رات کے وقت تیز روشنی آنکھوں کو کاٹ رہی تھی اور میں کرب سے چیخ رہا تھا۔ میرا بدن کبھی جل رہا ہوتا اور کبھی سرد برفیلا ہو جاتا۔ جی متلاتا اور بہت دنوں تک قے آلود فرش پر پڑے رہنا پڑا۔ "دیکھو تمہیں کون ملنے آیا ہے" بریگیڈیئر قریشی اور میجر جنرل قیوم نے ایک دن مجھے کہا۔ پوچھ گچھ کے کمرے میں اپنے سامنے کھڑے مانوس چہرے کو پہچاننے کی کوشش میں آنکھیں جھپکاتا رہا۔ وہ میری والدہ کو لے آئے تھے۔ "یہ ۲۵ سال تک قید میں رہے گا" مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر میری والدہ کو کہہ رہا تھا۔ "۲۵ سال تک ورنہ اسے بھٹو خاندان کے افراد کے خلاف شہادت دینے پر راضی ہونا پڑے گا" میری والدہ کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ وہ ایک ٹوٹی پھوٹی ہوئی عورت تھی۔ اس کے بہنوئی پر تشدد کیا گیا۔ اور وہ اب جلاوطن تھا۔ اس کا بیٹا تقریباً برباد کر دیا گیا تھا۔ اور ہماری آبائی زرعی زمین بنجر بنا دی گئی تھی کیونکہ حکومت نے ہماری زمینوں کے لئے پانی کی سپلائی روک دی تھی۔

"کسی صورت بزدل مت بنو، فیصل" والدہ نے ان دونوں کے سامنے مجھے کہا۔ "اپنی مرضی کے خلاف کچھ بھی کرنے پر مجبور مت ہو۔ تم وہی کرو جو تمہارا ضمیر کرنے کے لئے کہتا ہے"۔

"میں نے اپنا ایمان خدا پر رکھا ہے" میں نے اسے بتایا۔ یہ لوگ تو صرف انسان ہیں۔ اگر خدا نے میری قسمت میں ۲۵ سال کی قید لکھی ہے تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن میں بھٹو خاندان کے اپنے اوپر اعتماد کو ٹھیس پہنچنے نہیں دوں گا"۔

میں ان سے غداری نہیں کر سکتا تھا۔ لاہور قلعہ میں کوئی بھی سیاسی قیدی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ہم تمام اچھی شہرت کے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے جن کی مذہبی اور سرکاری خدمات کی طویل تاریخیں تھیں۔ ہم تعلیم یافتہ تھے۔ ہمارا معاشرے میں معروف نام تھا۔ ہم جھوٹی گواہی نہیں دے سکتے تھے اور پھر ہمیشہ کے لئے بے توقیر زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے۔ ہم پر حکومت کی تحریص اور اذیت کوشی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ کوئی ایک بھی سابق سرکاری افسر بھٹو خاندان کے خلاف جھوٹی شہادت دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ تین مہینوں کی ناکارہ کوششوں کے بعد حکام آخر کار ہار گئے اور ہمیں مقامی ضلعی قید خانوں میں منتقل کر دیا۔ حکومت کو لاہور قلعہ سے ہمیں براہ راست معاشرے میں دوبارہ جانا شاید اس لئے پسند نہیں تھا کہ اس طرح ہماری حالت کی تشہیر سے ان کو پریشان ہونا پڑتا۔

قاضی سلطان محمود، سابق ملازم فلش مین ہوٹل راولپنڈی اور جنرل سیکرٹری پی پی پی راولپنڈی شہر

میں چیئرمین بھٹو کی سزائے موت کے خلاف احتجاجی جلوس کی سربراہی کے جرم میں سنٹرل جیل میانوالی میں ایک برس کی قید بامشقت کاٹ چکا تھا۔ پی پی پی کے ساتھ میرے متحرک تعلق کی وجہ سے مجھے ہوٹل کی ملازمت سے بغیر کسی معاوضہ کے برطرف کر دیا گیا تھا۔ طیارہ کے اغواء کے بعد مجھے دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ پہلے راولپنڈی جیل، پھر گوجرانوالہ، اور آخر میں لاہور قلعہ میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ بہت ہولناک جگہ تھی۔

"مس بھٹو اور الذوالفقار کے تعلق پر روشنی ڈالو" جیل حکام بار بار مجھ سے یہی استفسار کرتے رہے۔ جب میں نے کہا کہ اس نے تو کبھی بھی اس معاملہ میں میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی میں طیارہ کے اغواء کے سلسلہ میں کچھ جانتا تھا۔ انہوں نے چمڑے کی پیٹی سے میری پٹائی شروع کر دی اور میرے سر پر بانس کے ڈنڈے مارے۔ یہ تو فقط آغاز تھا۔

میں بہت چھوٹے قد کا آدمی ہوں یعنی تین فٹ اونچا اور ۴۸ پونڈ وزن کا۔ ان کے لئے مجھے کھیل بنانے کا آسان طریقہ تھا۔ جب میں نے ان کے جھوٹوں کی حامی نہ بھری انہوں نے مجھے بھاری ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ اور مجھے اپنے بازو سر کے اوپر رکھنے کا حکم دیا۔ میرے بازو کافی چھوٹے ہیں اور جب میں وزن کے بوجھ سے زمین پر گر گیا تو انہوں نے اپنے قدم میرے جسم پر رکھ دیئے اور زور و شور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ اکثر مجھے پیٹ کے اوپر جلد سے مجھے اٹھا لیتے اور یا تو زمین پر پٹک دیتے یا آپس میں گیند کی طرح لڑھکاتے رہتے۔

انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور مجھے چاروں طرف پھراتے رہے...... میں نہیں جانتا کہ کہاں کہاں۔ "تمہیں موت کے منہ میں دھکیل دیا جائے گا جب تک تم ہمیں بھٹو خواتین کے الذوالفقار تنظیم میں ملوث ہونے کی شہادت نہیں دو گے" ان ملاقاتوں میں انہوں نے مجھ سے یہی اصرار کیا۔ جب میں نے انکار کیا انہوں نے مجھے ایک پاؤں سے پکڑا اور قید خانے کی اونچی دیواروں پر لٹکا دیا۔ "تم کیوں مرنا چاہتے ہو" انہوں نے کہا "صرف اس اقبالی بیان پر دستخط کر دو" "تم اپنا کام کرو اور مجھے قتل کر دو" میں نے انہیں بتایا۔ "لیکن میں اس بات کا اقرار نہیں کر سکتا جس کا مجھے علم ہی نہیں" ۳۵ دنوں تک انہوں نے اسی طرح مجھے مسلسل اذیت دی۔ ان کے پسندیدہ مظالم میں سے ایک یہ ظلم تھا کہ مجھے اپنے سامنے بالکل ننگا کھڑا کر لیتے میری ٹانگوں کے درمیان ایک بانس کا ڈنڈا لہراتے اور مجھے اس پر لٹکنے کو کہتے۔ ایسی حالت میں مجھے دو یا تین منٹ بھی رہنا ناقابل عمل تھا اور میں منہ کے بل آگے کو گر جاتا۔ میری ناک اور دانتوں سے خون نکلتا جو ان کے لئے ہنسی کا باعث بنتا۔

"اوہ تم ایک اہم رہنما ہو" وہ مجھ پر طنز کرتے۔ "تم میں کونسی خوبی تھی کہ مسٹر بھٹو تمہیں پسند کرتے تھے؟۔ کیا تم میں کوئی مخصوص چیز ہے؟۔ تم تو قابل نفرت آدمی ہو۔ تم کوئی خوبصورت شخص نہیں ہو۔ تمہاری خصوصیت یہی ہو سکتی ہے کہ تم الذوالفقار سے خفیہ رابطہ رکھتے ہو" اس کے بعد وہ مجھے ٹھڈے مارتے اور پیٹتے۔ میری کمر، میری ٹانگوں اور میرے ہاتھوں کے زخموں میں جراثیم سرائت کر گئے۔ مگر وہ مجھے ڈاکٹر سے ملنے نہیں دیتے تھے۔

میں نے ۳۵ روز مزید قید تنہائی میں گزارے۔ مقفل کوٹھڑی میں دن رات تاریکی چھائی رہتی۔ میں گندگی اور زندہ قبر میں پڑا ہوا تھا۔ مجھے بہت کم خوراک دی جاتی۔ صرف ایک ڈبل روٹی کا ٹکڑا اور پتلی دال کے ساتھ ایک چپاتی۔ وہ کوٹھڑی کے دروازے میں ایک سوراخ میں سے خوراک پھینکتے۔ میں چھوٹے قد کی وجہ سے سوراخ تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ مجھے اپنی خوراک گندگی میں سے اکٹھا کرنا پڑتی تھی۔ وہ دن میں ایک چائے کی پیالی بھی دیتے۔ میں پیالے کو پکڑنے کی کوشش کرتا لیکن اکثر اوقات چائے گر جاتی۔ اگر میری قسمت ہوتی تو ایک دو گھونٹ مجھے مل جاتے۔ اکثر میرا سر اور پاؤں گرم چائے کے گرنے سے جل جاتے۔

جب مجھے دو ماہ بعد رہا کیا گیا تو میں نے راولپنڈی میں دوسرے سیاسی قیدیوں کے ایک استقبالیہ میں خطاب کیا۔ میری تقریر جنرل ضیاء کی حکومت میں سیاسی قیدیوں سے ہولناک سلوک اور حالات سے متعلق تھی۔ گارڈین نے انگلینڈ میں اس خبر کی تفاصیل رقم کیں۔ اور ایسوسی ایٹیڈ پریس نے تمام چہار دانگ عالم میں پھیلا دیں۔ مجھے ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا اور کوٹ لکھپت جیل میں دو سال اور چار مہینوں تک قید تنہائی میں رکھا گیا۔ ایک سرسری سماعت کی فوجی عدالت نے مجھے تین سال کی قید بامشقت کی سزاء سنائی...... مجھے ملتان اور جیل پھر اٹک جیل میں بھیج دیا گیا۔ آخر کار ۱۵ر جون ۱۹۸۵ء کو مجھے رہا کیا گیا۔

پرویز علی شاہ سینئر وائس پریذیڈنٹ پی پی پی سندھ، سابق متحرک رکن پی پی پی سندھ، اور سابق پبلشر و چیف ایڈیٹر ہفت روزہ ”جاوید“

۲۴ر مارچ ۱۹۸۱ء کو میں اپنے بیٹوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا تھا۔ جب ایک بغیر نمبر کار مجھ تک آئی اور سفید کپڑوں میں ملبوس چند آدمیوں نے اندر داخل ہونے کے لئے کہا۔ انہوں نے بتایا وہ پولیس کے افراد ہیں لیکن ان کے پاس کوئی وارنٹ نہیں تھے۔ وہ

میرے گھر والوں کو خبردار کئے بغیر مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے اب تک تین مرتبہ گرفتار کیا جاچکا تھا۔ پہلی مرتبہ یکم اکتوبر ۱۹۷۷ء کو اپنے والد کے ساتھ جب ضیاء نے انتخابات منسوخ کئے تھے۔ تب پولیس سے بھری ہوئی کاریں اور جیپیں اندرون سندھ خیرپور میں میرے گھر تک آئیں، جہاں میں پی پی پی کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑ رہا تھا۔ "جلدی کرو" پولیس نے میرے بازو اور والد کے بازو کو ہتھکڑیاں لگاتے ہوئے حکم دیا۔ اور گلیوں میں سے پیدل لے گئے، جبکہ کاریں اور جیپیں ہمارے پیچھے پیچھے تھیں۔ حیرت زدہ حالت میں لوگ پٹڑیوں پر اکٹھے ہو کر ہمیں تکتے رہے۔ باعزت خاندانوں کے افراد سے تو کیا، عام مجرموں سے بھی یہ سلوک روا نہیں رکھا جاتا۔ پہلے مجھے اس قدر شرم محسوس ہوئی کہ میں نے اپنے رومال سے ہتھکڑیوں کو ڈھانپ لیا۔ لیکن جب میں نے ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھے تو رومال اتار لیا۔ پولیس تھانے میں ۲۵ روز فرش پر سوتے ہو گئے تو ایک میجر نے مجھے رہا کر دیا لیکن میرے والد کو سکھر جیل میں ایک برس کی سزائے قید کے لئے بھیج دیا۔ ایک برس بعد جب خیرپور میں ہزاروں لوگ بھٹو صاحب کی رہائی کے لئے گرفتاریاں پیش کر رہے تھے، وہ دوبارہ آئے...... اس مرتبہ میں گھر پر نہیں تھا۔ مگر پولیس کے سپاہی میری تلاش میں گھر کے زنان خانے میں بھی داخل ہوگئے جہاں آج تک کئی نسلوں سے کبھی بھی کوئی غیر آدمی داخل نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے الماریوں سے کپڑے اتار پھینکے اور درازوں کو فرش پر خالی کر دیا۔ آخر کار انہوں نے مجھے ایک دوست کی شادی کی برات سے گرفتار کیا جہاں میں گیا ہوا تھا اور ۲۱ دوسرے قیدیوں کے ساتھ ۱۰ × ۷ فٹ کے ایک کمرے میں مقید کر دیا۔ مجھ پر آتش زنی کا الزام لگایا گیا۔ جب انہیں کہیں سے کوئی شہادت نہ ملی تو عوام کو بھڑکانے کے جرم میں ایک سال کے لئے جیل بھیج دیا۔

لیکن ۱۹۸۱ء کی گرفتاری بدترین تھی۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور چھ گھنٹے گاڑی میں سفر کے بعد کراچی سے خیرپور سنٹرل جیل میں لے آئے۔ جہاں مجھے تین روز تک بغیر خوراک کے رکھا گیا۔ پھر وہاں سے حیدر آباد جیل میں اور پھر آدھی رات کے وقت کراچی کے فریئر پولیس اسٹیشن میں لے گئے۔ "کم از کم ایک پیالہ چائے تو دیدو" میں نے

پولیس سے التجا کی۔ "تمہیں ہر وہ چیز ۵۵۵ میں ملے گی جو تم چاہتے ہو" پولیس نے جواب دیا۔ کراچی میں سی آئی اے (مرکزی خفیہ ایجنسی) کے صدر مقام ۵۵۵ کی بہت شہرت تھی۔

ایک مرتبہ پھر مجھے پولیس کی گاڑی میں سوار کرایا گیا۔ اس دفعہ مجھے ایک تاریک ترین کوٹھڑی میں چھوڑ دیا گیا، جس کی چھت میرے سر کو چھوتی تھی۔ "خبردار!" بہت سی آوازیں نکلیں جب میرا پاؤں دوسرے قیدیوں پر پڑا۔ نہیں معلوم ہمیں تاریکی میں کتنا عرصہ گٹھڑی بنے ہوئے گزارنا پڑے۔

مجھے انٹر سروسز انٹیلی جنس کے سربراہ کرنل سلیم کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے مجھے ایک کاغذ اور پنسل دی۔ "تحریر کرو کہ مس بھٹو بم دھماکہ کی سرغنہ ہے، اور بیگم بھٹو طیارہ کے اغواء میں ملوث ہے" اس نے مجھے بتایا۔ "میں ایک ایسی چیز کیسے لکھ سکتا ہوں جس کا مجھے علم نہیں" میں نے جواب دیا۔ اس نے دوبارہ لکھنے کو کہا۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس نے ۵۵۵ کے مشہور اذیت دہندہ لالہ خان کو بلالیا۔ اس نے میری ٹانگوں کو لکڑی کی ایک کڑکی میں پھنسا دیا اور باندھ دیا اور میرے گھٹنوں پر ایک لمبی چھڑی سے مارنا شروع کر دیا۔ درد بڑھتا گیا۔ بڑھتا گیا یہاں تک کہ میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنا شروع ہو گئے۔ "مجھے بم دھماکہ یا طیارہ کے اغواء کے سلسلہ میں کچھ پتہ نہیں" میں التجا کرتا رہا۔ لالہ مجھے مارتا رہا۔ جب اس نے مارنا ختم کیا تو میں کوئی بھی ٹانگ ہلا نہیں سکتا تھا۔ "کھڑے ہو جاؤ ورنہ تم پھر کبھی چلنے کے قابل نہیں ہو گے۔" اس نے سرد مہری سے مجھے کہا۔

مجھے ایک اور کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا۔ خفیہ ایجنسی کی چار مختلف شاخوں کے ارکان میرے پاس آئے اور مجھے بے نظیر اور بیگم صاحبہ کو ملوث کرنے کے لئے زور دیتے رہے۔ میرے انکار پر انہوں نے لالہ کو بلالیا۔ بعض اوقات مجھے صرف نظارہ کراتے کہ کس طرح وہ لوگوں کو الٹا لٹکاتا اور اتنا پیٹتا کہ وہ چیخ پڑتے۔ مجھے بعض مرتبہ چھت سے لٹکا دیا جاتا کہ صرف میرے پنجے فرش کو چھوتے اور گھٹنوں اس طرح لٹکتا چھوڑ دیا جاتا۔ اکثر رات کے وقت میری کوٹھڑی کے گرد ایستادہ پہرے دار مجھے سونے نہ دیتے۔ احمقانہ سوال پوچھنے

رہتے اور میرے جواب نہ دینے پر اپنی چھڑیوں سے ٹھونکتے۔ جب میں مکمل طور پر تھک جاتا اور ہر روز کی خوراک دو گلاس پانی اور پانی جیسی دال کو ہضم کر بیٹھتا اور بھوک سے ادھ موا ہونے لگتا تو ایک تفتیش کنندہ کے ہمراہ مجھے دوپہر کے کھانے پر بلایا جاتا۔ "اپنی طرف دیکھو، تم تعلیم یافتہ ہو اور اچھے خاندان کے چشم و چراغ ہو" وہ کہیں گے جیسے ہی میں اپنے جیل کے گندے لباس میں دوپہر کے شاندار کھانے اور گرم گرم چائے کے گلاسوں کے سامنے بیٹھتا۔ "اپنے لئے کیوں مشکلات پیدا کرتے ہو۔ صرف اتنا کہہ دو کہ بے نظیر اور بیگم بھٹو طیارہ کے اغواء میں ملوث ہیں اور تمہاری تمام تکالیف ختم ہو جائیں گی" جب میں انکار کر دیتا تو مجھے وہاں سے اٹھا دیا جاتا اور اذیت شروع ہو جاتی۔

تین ماہ بعد مجھے کراچی سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ اور بعد میں خیرپور جیل میں منتقل کر دیا جہاں میرے اہل خاندان کو ماہانہ ایک ملاقات کی اجازت دی گئی۔ سات مرتبہ مجھے ایک فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور حکومت نے نہ تو کوئی گواہ پیش کئے اور نہ ہی کوئی الزامات لگائے گئے۔ ۱۹۸۵ء کے ماہ فروری میں حکومت نے آخر کار مجھے پاکستان کے نظریہ، سلامتی اور حفاظت کے خلاف سیاسی خیالات کا پراپیگنڈہ کرنے کے جرم میں ایک سال کی سزائے قید کا فیصلہ سنایا۔ مجھے ان چار سالوں کی گرفتاری کی مدت کی کوئی رعایت نہ دی گئی جو میں اب تک کاٹ چکا تھا۔ میری بیوی کو کراچی میں ہمارے چھوٹے سے بزنس کا اہتمام کرنے اور تین بچوں کی پرورش کے انتظام نے ذہنی دباؤ کی وجہ سے اعصابی شکست سے دو چار کر دیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے پرویز علی شاہ کو "ضمیر کا قیدی" قرار دیا۔ ایم آر ڈی کی تشکیل اور طیارہ کے اغواء کے بعد کے دہشت ناک عرصہ میں متعدد قیدی "ضمیر کے قیدی" ہی تھے۔ ۱۹۸۱ء کے پورے سال میں ایمنسٹی نے رپورٹ دی۔ پاکستان میں سیاسی قیدیوں کی تعداد میں جنہیں اذیتیں دی گئیں بتدریج ڈرامائی انداز میں اضافہ ہوتا گیا۔ زیادہ تر مظلوم جن پر مصائب ڈھائے گئے طلباء، ٹریڈ یونین محنت کش، سیاسی پارٹی کے اراکین، اور سیاسی پارٹیوں کے وکلاء تھے۔ لیکن طیارے کے اغواء کے بعد قیدیوں کی ایک نئی قسم نمودار ہوئی۔ ۱۹۸۱ء میں پہلی مرتبہ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ایسی پریس رپورٹیں

موصول کیس جن کے مطابق چار خواتین سیاسی قیدیوں کو اذیتیں دی گئیں تھیں۔ ایمنسٹی کی رپورٹ نے اس مدت کا احاطہ کرتے ہوئے بیان کیا۔ "ناصرہ رانا، اور بیگم عارف بھٹی پی پی پی اراکین کی بیگمات، فرخندہ بخاری پی پی پی کی ایک کارکن اور مسز صفوراں چھ بچوں کی ماں۔"

میں ان سب کو جانتی تھی۔

ناصرہ رانا ـــــ ۱۳ر اپریل لاہور

میرا شوہر جو ایم آر ڈی کارکن تھا۔ اپریل کے ابتدائی دنوں میں کراچی میں تھا جب پولیس میرے رہائشی کمرے میں دروازہ توڑ کر آدھمکی "تم کون ہو؟" میں نے خوف زدہ ہو کر اس مرد سے پوچھا جو مجھ پر بندوق تانے کھڑا تھا۔ وہ وردی میں ملبوس نہیں تھا۔ بلکہ کھلے گلے کی قمیص اور سیاہ پتلون میں، اس کی گردن کے گرد سونے کی زنجیر مجھے اب بھی یاد ہے۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں میں کون ہوں" اس نے بارعب آواز میں کہا۔ "میں پاک فوج کا میجر ہوں" وہ بندوق کا سرا میری پیشانی پر بھونک رہا تھا۔ میں نے اسے پرے دھکیل دیا۔ اس نے رائفل کے دستے سے مجھے چوٹ لگائی۔ اور میرے ہاتھ اور انگلی کی ہڈیاں توڑ ڈالیں جبکہ میری بارہ برس کی بیٹی نے چیخنا شروع کر دیا۔

"تمہارا شوہر کہاں ہے؟" اس کا مطالبہ تھا...... اس دوران فوجی جوانوں نے پورا گھر اتھل پتھل کر دیا۔ "وہ یہاں نہیں ہے" میں نے اسے بتایا۔ اس نے رائفل کا دستہ پھر اٹھایا۔ "تمہارے گھر میں خفیہ راستے کا دروازہ کدھر ہے؟" اس نے پوچھا۔ "یہاں کوئی خفیہ راستہ نہیں ہے" میں نے جواب دیا۔ اس نے مجھے اور میری بیٹی کو ایک کمرے میں مقفل کر دیا اور بالآخر وہ چلے گئے۔

پندرہ روز بعد وہ پھر آدھمکے۔

"ہمارے ساتھ آؤ تم زیر حراست ہو" ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مقامی مجسٹریٹ

نے کہا۔

"تمہارے پاس وارنٹ ہیں" میں نے پوچھا۔

"ہم خود وارنٹ ہیں" انہوں نے جواب دیا۔

وہ مجھے جیل میں لے گئے جہاں مجھے تمام رات کھڑا رہنے پر مجبور کیا۔ ہر گھنٹے بعد ایک نیا تفتیشی افسر آجاتا۔

"تمہارا شوہر بے نظیر بھٹو اور بیگم بھٹو کی طرح الذوالفقار کا رکن ہے۔ ہم جانتے ہیں، یہ حقیقت ہے۔ تم بھی اس کی تصدیق کرو، تصدیق کرو۔

گھنٹے گزرتے گئے۔ لیکن میں بھی ضد پر قائم رہی...... مجھے محسوس ہوا میرے گھٹنے تڑخ جائیں گے۔ میں نے نزدیکی کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کی۔ "پیچھے ہٹ جاؤ" وہ چیخے۔ دو دن بعد وہ مجھے لاہور قلعہ میں لے گئے جہاں مجھے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں ایک اور سیاسی قیدی کے ساتھ بند کر دیا۔ وہ قیدی بیگم بھٹی تھی جس کا شوہر پنجاب کی صوبائی حکومت کا وزیر مالیات رہ چکا تھا۔

بیگم بھٹی

گیارہ مختلف ایجنسیوں نے ہم سے تفتیش کی۔ "تمہارے شوہر کہاں ہیں؟" وہ ہم پر چلاتے رہے۔ "وہ دہشت گرد ہیں جو بھٹو خواتین کے ساتھ کام کر رہے ہیں"۔ جیل حکام نے ہمیں ساری رات جگائے رکھا...... بغیر کسی آرام کے یہ تیسری رات تھی۔ "کوئی نیند نہیں، مسز رانا" وہ چیخے جبکہ ڈنڈوں سے سلاخیں کھڑ کھڑاتے رہے "جاگو بیگم بھٹی"۔

اگلے روز ہمیں خفیہ ایجنسی کے سربراہ میجر جنرل قیوم کے سامنے لے گئے...... وہی سوالات اور وہی جوابات۔ ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ میجر جنرل قیوم نے مجھے بالوں سے پکڑا اور میرا سر دیوار پر دے مارا۔

تمہارا خاوند کہاں ہے؟۔ وہ چلایا۔

میں نہیں جانتی۔

اس نے جلتے ہوئے سگریٹ ہمارے بازوؤں پر رکھے یہاں تک کہ ہم اپنی جلد کے سڑنے کی بو سونگھ رہی تھیں۔

"تمہارے شوہر کہاں ہیں؟"۔

میں بے ہوش ہونا شروع ہو گئی۔ کچھ فاصلے سے ناصرہ بیگم کی چیخ سنائی دی۔ "ہم تمہیں توڑ پھوڑ دیں گے" میجر جنرل قیوم چلایا۔ یہ آخری الفاظ تھے جو میں سنتے سنتے بے ہوش ہو گئی۔

ناصرہ

سال کے گرم ترین موسم میں ہم پانچ ہفتوں تک لاہور قلعہ میں رہیں۔ دھوپ کی تمازت بے رحم تھی۔ "اب تم ہمیں ہماری خواہش کے مطابق بات بتا دو" دوپہر کے وقت مرکزی صحن میں پہرہ کے نیچے ہمیں چھوڑتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ہم گھنٹوں وہاں کھڑی رہیں سیاہ دھبے ہماری آنکھوں کے آگے ناچتے رہے۔ سر پھٹنا شروع ہو گئے اور زبانیں سوج گئیں۔ پہرہ دار ہمارے سامنے ہنس ہنس کر پانی پیتے رہے۔ ایک گھنٹہ گزر گیا دوسرا تیسرا...... خدا ہی جانتا ہے ہم کتنا عرصہ اسی حالت میں کھڑی رہیں گی۔ پہرہ دار ہر تین گھنٹوں بعد ڈیوٹی بدلتے رہے۔

تین مرتبہ وہ ہمیں اپنے مخصوص کمرے میں لے گئے۔ ہماری کلائیوں کے گرد گیلے اسفنج باندھ دیئے گئے اور ان میں سے بجلی کی تاریں گزاری گئیں۔ ہر چند سیکنڈ بعد وہ ہمیں بجلی کے جھٹکے دیتے۔ ایک پھر ایک اور پھر ایک اور۔ ہمارے بدن مڑ گئے اور سخت ہوتے گئے۔ میرے ٹوٹے ہوئے ہاتھ پر پٹی لپٹی تھی اور وہ خصوصاً حساس تھا۔ میں صدمے سے چیخ پڑی۔ میں مجبور تھی۔ "ہم تمہاری جگہ اذیت دینے کے لئے تمہارے والد کو لے آئیں گے" انہوں نے دھمکی دی۔ "تمہاری بیٹی کو لے آئیں گے" یہ جھٹکے متواتر دو گھنٹے تک دیئے جاتے رہے۔

بیگم بھٹی

ہماری کوٹھڑی میں کوئی چارپائی تھی نہ بستر۔ انہوں نے ہمیں بوریاں دیں۔ جب میں نے ایک بوری کو فرش پر بچھایا تو اس میں سے تین فٹ لمبا سانپ رینگتا ہوا باہر نکلا۔ "مت چلاؤ" میں نے ناصرہ کو اور اپنے آپ کو مخاطب کیا۔ تاہم سانپ نے مجھے جوش دلا دیا، اور میں نے اسے بوری میں ہی پکڑ لیا۔ دیوار سے پٹخنا شروع کیا اور اپھر اس کی گردن مروڑ دی۔ پولیس کی خاتون سپاہی اسے دیکھتے ہی چلائی۔

حکام نے ہمیں ایک بیان دستخط کرنے کے لئے دیا کہ وہ اس سانپ کی موجودگی کے ذمہ دار نہیں تھے...... وہ کوٹھڑی میں خود ہی گھس آیا تھا۔ ہم نے دستخطوں سے انکار کر دیا۔

بے نظیر کو ملوث کرو، بیگم صاحبہ کو ملوث کرو، اپنے شوہروں کو ملوث کرو، ہماری تفتیش جاری رہی۔ "اگر تمہاری بیوی میری پوزیشن میں ہو تو کیا وہ بتا دیگی" میں نے تفتیش کنندہ سے استفسار کیا۔ "ہاں" اس کا جواب تھا۔ "تب تو وہ بہت بے شرم عورت ہے" میں نے کہا۔

ناصرہ

مجھے پہرہ داروں میں سے ایک نے خبر دی کہ میرا شوہر پکڑا گیا ہے اور اسے لاہور قلعہ میں لایا جارہا ہے۔ میں نہیں جانتی انہوں نے اس سے کیا سلوک کیا۔ میں جاننا بھی نہیں چاہتی۔ جب اسے اذیت دی گئی تھی سو اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ اس کا رنگ نیلا پڑ گیا اور سانس لینا مشکل ہو گیا۔ وہ اسے ہسپتال لے گئے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے۔ کہ وہ اذیت دہی کے دوران مر جائے۔ یہ معجزہ تھا کہ وہ بچ گیا۔

سکھر کی قید تنہائی میں مجھے ان اذیتوں کے بارے میں مطلقاً علم نہیں تھا۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ ڈاکٹر نیازی طیارہ کے اغواء کے بعد اپنی بیوی اور بچوں کے اصرار پر پولیس کی تیسری مرتبہ گرفتاری سے چند منٹ پہلے پاکستان چھوڑ گیا تھا۔ اسے کابل میں دل کا تقریباً مہلک دورہ پڑا تھا جو اس کے ذہن پر تناؤ اور دباؤ کا فطری نتیجہ تھا۔ اور لندن میں بائی پاس آپریشن سے اس کی جان بچی جہاں وہ ۱۹۸۸ء تک مقیم رہا۔

یاسمین بھی مشکل سے گرفتاری سے بچی۔ "کیا یاسمین نیازی گھر پر ہے؟" پولیس نے گھر کے باہر دروازے پر پوچھا۔ "نہیں" یاسمین نے حاضر جوابی سے کام لیا۔ جب پولیس نے اس کی بجائے اس کی والدہ کو لے جانے کا فیصلہ کیا تو یاسمین اور مسز نیازی نے آپس میں مشورہ کیا اور کھسر پھسر لڑائی کے انداز میں ہونے لگی "میں انہیں بتانے لگی ہوں کہ میں کون ہوں" یاسمین نے اپنی والدہ کو کہا "اگر تم ایسا کرو گی تو میں جان دیدوں گی۔ سو یا تو مجھے قید ہو جانے دو یا میری لاش حاصل کرو یہ تم پر ہے کہ کیا منتخب کرنا چاہتی ہو" یہ اس کا جواب تھا۔ یاسمین خاموشی سے اپنی والدہ کی گرفتاری کو دیکھتی رہی اور وہ اسے راولپنڈی سنٹرل جیل لے گئے جہاں اسے تین دوسری خواتین کے ساتھ ایک کوٹھڑی میں رکھا جو میرے والد کی موت کی کوٹھڑی کے بالکل بالمقابل تھی۔

مسز نیازی کی قید کے پانچ دنوں میں کوٹھڑی میں قیدی عورتوں کا اتنا جمگھٹا ہو گیا کہ انہیں سونے کے لئے اپنی اپنی باری مقرر کرنا پڑی۔

یاسمین تین ماہ کے لئے چھپی رہی جبکہ پولیس نے اس کی تلاش جاری رکھی۔ وہ بہت خطرے میں تھی کمزور صحت ور اپنی بیٹی کے لئے پریشانی کے باعث ڈاکٹر نیازی نے یاسمین کے لئے لندن کا پی آئی اے کا ٹکٹ خرید لیا۔ لیکن وہ ملک سے باہر نکلنے میں کیسے کامیاب ہوتی؟۔ قید سے اپنی رہائی کے بعد مسز نیازی نے برطانوی سفارت خانہ میں ٹیلیفون کیا۔۔ خوش قسمتی سے یاسمین کی جائے پیدائش انگلستان تھی اور سفارت کار نے کہا اگر مسز نیازی اپنا پاسپورٹ مہیا کر دیں جس میں یاسمین کا بطور چھوٹی بچی سفر کرنے کا اندراج ہے تو ۴۸

گھنٹوں میں اسے برطانوی پاسپورٹ جاری کر دیا جائے گا۔ مسز نیازی کو ایک صندوق کی تہہ میں ۱۸ سالہ پرانا پاسپورٹ مل گیا۔

"میں یاسمین کے ہمراہ ائیرپورٹ تک نہیں جاسکتی تھی کیونکہ میرے پہچانے جانے کا خطرہ تھا۔ میں نے اسے برقعہ پہنا دیا اور اس کی ہمشیرہ کو اس کے ہمراہ بھیج دیا۔ " مسز نیازی نے مدتوں بعد بتایا تو اس کی آواز میں لرزہ طاری تھا۔ "یاسمین کو ضیاء کے ذاتی احکام پر گرفتار کیا جانا تھا۔ اس کی گرفتاری کا حکم اسلام آباد میں جاری کیا گیا تھا۔ ہر صوبے میں اس کی حراست کے احکام پہنچ چکے تھے مفروروں کی کوئی ایسی فہرست نہیں تھی جس میں اس کا نام درج نہ ہو۔ وہ خدا کے فضل سے ملک سے باہر پہنچ گئی۔ "

"تمہارے پاسپورٹ پر ویزا کا اندراج نہیں" امیگریشن افسر نے یاسمین کو ائیرپورٹ پر بتایا۔ "یہ عجیب بات ہے" یاسمین نے کہا۔ "کہیں کوئی غلطی ہو گئی ہے" جب اس نے فہرست پر اس کا نام دیکھنا چاہا تو ائیرپورٹ کی بجلی چلی گئی۔ ایک منٹ تک ائیرپورٹ پر گھپ اندھیرا چھایا رہا اور مسافروں میں اپنی اپنی پروازوں تک پہنچنے کے لئے بھگدڑ مچ گئی جب روشنی دوبارہ آئی تو امیگریشن افسر نے جلدی سے اس کے پاسپورٹ پر مہر لگادی اور اسے طیارے کی طرف بھیج دیا۔

یاسمین آرام سے لندن پہنچ گئی جہاں اس نے اپنے چچازاد طارق سے شادی کر لی جو خود بھی سیاسی پناہ گزین تھا۔ وہ اب بھی اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ وہیں رہائش پذیر ہیں۔

موسم گرما کی حدت ماہ مئی میں سکھر پہنچی۔ ایک خشک کاٹتی ہوئی تمازت جس نے میری کوٹھڑی کو تنور میں تبدیل کر دیا۔ گرم ہوائیں میری کوٹھڑی کی کھلی اطراف سے متواتر چلتی رہتیں اور ہواؤں کا درجہ حرارت اندرونی سندھ کے صحرا میں گھرے ہونے کی وجہ سے **۴۳** سینٹی گریڈ تک اور پھر **۴۸** سینٹ گریڈ تک پہنچ جاتا۔ ایک مسلسل گرد باد میری کوٹھڑی میں گھومتا رہتا۔ پسینے کی چپچپاہٹ سے جسم پر میل کی تہہ جم جاتی۔

میری جلد پھٹ گئی اور میرے ہاتھوں میں چھلکوں کی مانند اتر آتی۔ میرے چہرے پر

پھنسیاں ابھر آئیں۔ پسینہ ان میں گرتا تو تیزاب کی سی جلن محسوس ہوتی۔ میرے سر کے بال جو کافی گھنے تھے مٹھی بھر بھر کے اترنے شروع ہوگئے۔ میرے پاس کوئی آئینہ نہیں تھا۔ لیکن میں اپنی انگلیوں کے سروں سے اپنی کھوپڑی کی کھال محسوس کر سکتی تھی۔ گیلی، برادہ جیسی اور ننگی، ہر صبح اپنے سرہانے پر بالوں کا بنا گچھا دیکھتی۔

کیڑے مکوڑے میری کوٹھڑی میں حملہ آور افواج کی طرح در آئے۔ جھینگر، مچھر، بھڑیں، شہد کی مکھیاں، وہ ہر وقت میرے چہرے پر بھنبھناتی رہتیں یا میری ٹانگوں پر رینگتی رہتیں۔ میں ان کو ہٹانے کے لئے بازو جھٹکتی مگر وہ اتنی تعداد میں تھیں کہ میری کوشش بے سود ثابت ہوتی۔ کیڑے فرش پر پڑی ہوئی دراڑوں میں سے آجاتے اور کبھی صحن سے سلاخوں میں سے داخل ہوتے۔ بڑے کالے چیونٹے، لال بیگ، چھوٹی سرخ چیونٹیوں کے جھنڈ، مکڑیاں، میں رات کو ان کے کاٹنے سے بچنے کے لئے جسم کو چادر سے چھپالیتی۔ مگر گرمی سے سانس لینا بھی دشوار ہوجاتا تو چادر اتار پھینکتی۔

پانی، میں ٹھنڈے صاف پانی کے خواب دیکھتی۔ جیل میں جو پانی پینے کے لئے دیا جاتا، گدلا اور پیلا ہوتا۔ اس میں سے باسی انڈے کی باس اٹھتی، پانی کا ذائقہ بھی ناپید ہوتا اور پیاس تو بالکل نہ بجھتی، لیکن جیل حکام نے وہ تازہ پانی بند کر دیا جو مجیب، ایک وکیل جو نزدیک ہی رہتا تھا۔ مجھے بھجوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "یہ تمہاری بھلائی کے لئے ہے" جیل سپرنٹنڈنٹ نے مجھے بتایا۔ "یہ لوگ تمہارے دشمن ہیں تمہارے اپنے پارٹی راہنما تمہیں اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔" دوسرے دن اس نے مجھے بتایا کہ وہ تازہ سنگترے جو مجیب نے میرے لئے بھیجے تھے، مجھے بھجوانے کی بجائے وہ خود کھا گیا تھا۔ "یہ تمہاری زندگی کو بچانے کی غرض سے کیا گیا" اس نے مزید کہا۔ "وہ ان میں زہر کا ٹیکہ بھی لگا سکتا تھا" وہ لغویات کا ڈرامہ کھیل رہا تھا۔

"کیا تم مجھے کیڑے مار دوا مہیا کر سکتے ہو" میں نے جیل کے حکام سے کہا۔

"بالکل نہیں، یہ زہریلی دوا ہے ہم نہیں چاہتے ایسی کوئی چیز تمہاری دسترس میں ہو" انہوں نے کہا۔
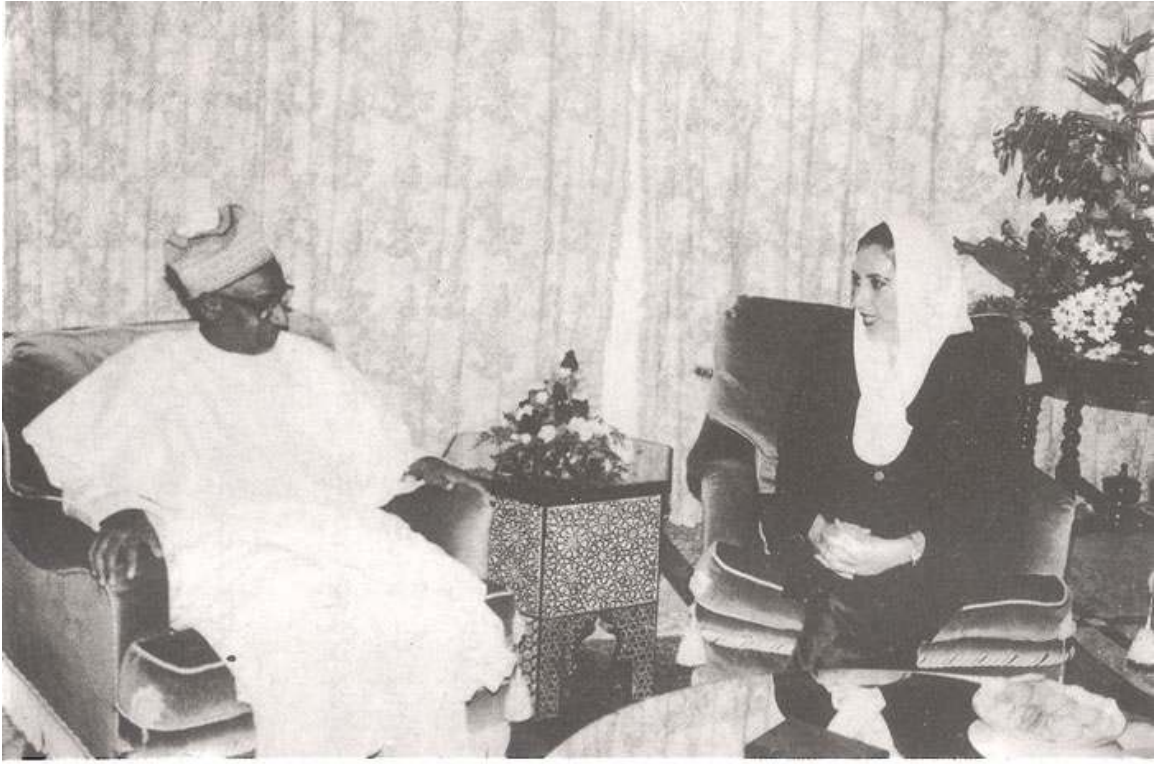
اسلامی کانفرنس کے سیکریٹری جنرل حامد الغابد' وزیر اعظم پاکستان بے نظیر کے ہمراہ

یہ تمام گفتگو زہر پر کیوں مرکوز ہو رہی ہے؟ مجھے اچانک یہ احساس ہوا کہ کیا وہ نفسیاتی طور پر میرے ذہن میں خود کشی کا تصور تو اجاگر نہیں کر رہے؟ اس سے زیادہ صاف ستھرا حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ حکومت اعلان کرے کہ بے نظیر بھٹو نے اپنے آپ کو خود قتل کر لیا ہے؟ مسئلہ حل ہو گیا۔ اور ثبوت بھی مہیا ہو جائے گا جب میری کوٹھڑی میں فینائل کی ایک بوتل صفائی کے بہانے ہر وقت پڑی رہنے لگی۔ بوتل کے لیبل پر ایک کھوپڑی اور آر پار دو ہڈیوں کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ "اس کی کوٹھڑی چھوڑنے سے پہلے یقین کر لو کہ بوتل یہاں نہ پڑی رہے" جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے با آواز بلند اس عورت کو کہا جس نے کوٹھڑی کی صفائی کی اور وہ ہر مرتبہ اپنے ہفت روزہ معائنہ پر یہی کہتا تھا۔ "فینائل کو اپنی آنکھوں سے دور مت ہونے دو۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے مصائب کا خاتمہ اس طریقے سے کرنے پر تیار ہو جائے" لیکن فینائل کی بوتل جہاں پڑی تھی وہیں پڑی رہی۔

کیا وہ میرے ذہن سے کھیل رہے تھے؟۔ میرے کان میں دوبارہ تکلیف شروع ہو گئی۔ گرد اور پسینے کے قطرے میرے چہرے پر متواتر گرنے سے میری حالت مزید ابتر ہو گئی۔ لیکن جیل کا ڈاکٹر یہی کہتا رہا کہ کوئی خرابی نہیں۔ "تم قید تنہائی کی وجہ سے شدید دباؤ میں ہو" اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ایسی حالت میں اکثر لوگ درد اور تکلیف کو وہاں محسوس کرنا شروع کر دیتے ہیں جہاں وہ مطلق نہیں ہوتی" مجھے اس کی باتوں پر کچھ کچھ یقین ہو تا گیا۔ شاید شاں شاں کی آوازیں جو مجھے دن رات پریشان کرتی ہیں۔ میرا تصور ہی ہوں۔ کاش اس قدر گرمی نہ ہوتی۔

میری پیاری ترین پنکی! میری والدہ نے کراچی سنٹرل جیل سے مجھے ۲۳ر مئی کو خط لکھا اور گرمی کی شدت کم کرنے کا ایک نسخہ بھی تحریر کیا۔ "دن میں تین یا چار مرتبہ اپنے جسم پر پانی ڈالو تاکہ حدت کم محسوس ہو۔ اس کو آزماؤ۔ میں پہلے اپنا سر جھکاتی ہوں اور گردن کے پیچھے اور سر کے اوپر پانی کے مگ ڈالتی ہوں تب کپڑوں سے اپنا پورا جسم ڈھانپ لیتی ہوں۔۔ پھر پنکھے کے نیچے بستر پر لیٹ جاتی ہوں اور اس طرح کپڑوں کے خشک ہونے تک بہت ٹھنڈک نصیب ہوتی ہے در حقیقت کپڑوں کے خشک ہونے کے بعد بھی کچھ دیر تک ٹھنڈک۔

کا اثر باقی رہتا ہے۔ اس طریقے سے پھنسیوں سے حفاظت رہتی ہے۔ یہ شاندار نسخہ ہے میں اس کی پرزور سفارش کرتی ہوں پیار کے ساتھ "تمہاری ممی"۔

میں نے ان کی رائے پر عمل کیا اور ہر صبح پانی کی بالٹی اپنے سر پر انڈیلتی۔ سکھر میں کراچی کی نسبت زیادہ شدید گرمی تھی اور میرے پاس کوئی پنکھا بھی نہیں تھا۔ لیکن گرم ہوا میں کپڑوں کے خشک ہونے تک مجھے کافی آرام محسوس ہوتا مگر میں یہ جاننے سے قاصر رہی کہ اس طرح پانی کے قطرے میرے کان میں پڑتے رہنے کی وجہ سے میرے کان کی بیماری جڑ پکڑ رہی ہے۔ "تم صرف ایسا تصور کر رہی ہو" جیل ڈاکٹر میری تسلی کے لئے متواتر یہی کہتا رہا۔ وہ ماہر نہیں تھا۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ دانستہ ایسا کر رہا تھا۔ یا اپنی کم علمی کی بنا پر۔

۲۵۰ مرتبہ ایک ہی جگہ پر دوڑتے رہنا۔ ۴۰ مرتبہ ڈنڑ پیلنا۔ بازوؤں کو ہلانا۔ ۲۰ مرتبہ گہری سانسیں لینا۔ اخبارات پڑھنا۔ ایسی خبریں پڑھنے سے اجتناب کرنا جن میں مجھے اور میری والدہ کو طیارہ کے اغواء میں دانستہ ملوث کیا جاتا۔ اس کی بجائے اپنی توجہ کشیدہ کاری پر مرکوز کرنا جس کا سامان مجیب اور اس کی بیگم الماس نے مجھے بھجوایا تھا۔ میرا معمول بن گیا کپڑا، دھاگہ اور کشیدہ کاری کی ایک کتاب بھی بیگم الماس نے مجھے بھجوائی تھی۔

"میں نے ٹرالی کا کپڑا اور چار رومال ختم کر لئے ہیں" میں نے وسط مئی میں اپنی ڈائری میں تحریر کیا۔ "جب میں آزاد ہو جاؤں گی تو ہر ایک کو یہ دکھا کر بور کروں گی کہ یہ کچھ ہے جو میری جیل کے دنوں کی کمائی ہے" دراصل کشیدہ کاری کے کام میں آوارہ خیالی کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن قید تنہائی میں عدم فرصت میں دماغ کو کسی تعمیری کام میں مصروف رکھنے سے دن کی بوریت میں معتدبہ کمی محسوس ہوتی ہے۔ اور اس کا سودمند اثر مرتب ہوتا ہے۔ میں نے اپنے جریدہ میں کم از کم ایک گھنٹے تک کچھ نہ کچھ ہر روز تحریر کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کیا۔ "فرانس نے فرانسوا متراں کو بعد از جنگ فرانس کا پہلا سوشلسٹ صدر منتخب کر لیا ہے۔" میں نے ۱۱ر مئی کو اپنی ڈائری میں رقم کیا۔ "اینگلو امریکن ذرائع ابلاغ نے بدترین جسکارڈ دشمن مہم چلائی تھی۔ یہ انتخابات یورپ کی سیاسیات پر بعید از قیاس

اثرات مرتب کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ فرانس اپنی پالیسیاں سوشلزم کے مطابق کرنے میں اپنے داخلی مناقشات میں الجھ جائے۔ اس سے فرانس کی جارحانہ خارجہ پالیسی میں ولولہ اور جوش ختم ہو کر رہ جائے گا۔ پھر عرب اور افریقی اقوام میں فرانسیسی اثرات کی جگہ پر کرنے کے لئے کون آئے گا؟ باقی جمہوریہ جرمنی کے ساتھ فرانس کے تعلقات کیا نہج اختیار کریں گے اگر اب "ٹیکنو کریٹ" اور "دوست" جسکارڈ اور شمڈٹ کے تعلقات ٹوٹ گئے اس کے اثرات نزدیکی ملک اٹلی پر کیا مرتب ہوں گے؟"۔

اسی روز میں نے حزب مخالف کے آئرش سیاسی راہنما بابی سینڈز کی موت کی خبر پڑھ کر لکھا "۶۶ روز کی بھوک ہڑتال کے بعد، بابی سینڈز آخر کار برطانوی جیل میں موت کی خونی پنجوں کا شکار ہو گیا۔ برطانوی حکومت کی نظروں میں بابی سینڈز ایک دہشت گرد تھا۔ لیکن اپنے ہم وطنوں کے لئے باب سینڈز نے سیاسی آزادی اور حقوق کی جنگ لڑی۔ پوری دنیا کی یہی حکائت ہے" اکثر اوقات تو میں کئی کئی دن اپنی ڈائری میں کچھ بھی درج نہ کرتی۔ "میں نے کچھ عرصہ کے لئے کوئی مناسب تحریر ڈائری میں نہیں لکھی۔ "میں نے ۸ر جون کو اپنی ڈائری میں یہ جملہ لکھتے ہوئے اپنے آپ کو سرزنش کی۔ "اپنے آپ کو یہ پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ لکھنے کی کونسی چیز رہ گئی ہے کیونکہ اخبارات سے خبریں کبھی بھی مختصر کر کے رقم کی جا سکتی ہیں۔ کچھ نہ لکھنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اظہار میں روانی، لفظوں اور فقروں کی مانوسیت اور اظہار خیالات کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے آہستہ آہستہ لیکن یقیناً میرا ایک اپنا اسلوب بن گیا۔ "ایک دن یا ایک ہفتہ کی نسبت ایک گھنٹہ میرے لئے بہت آہستگی سے گزرا ہے۔ بہرحال میں یہاں تک تو پہنچی ہوں" میں نے ۱۱ر جون کو رقم کیا۔ "مطابقت" شائد لفظ صحیح نہیں میں ایسی حالت سے مطابقت رکھ ہی نہیں سکتی جو قابل نفرت ہو۔ مطابقت کا مطلب شکست ہوتا ہے۔ میں نے مقابلہ کیا ہے۔ ہر ایک لمحہ گھسٹتا گیا ہے لیکن یہ گزر ہی گیا ہے۔ اس آزمائش میں اللہ تعالیٰ کی مدد ہی سے پورا اتری ہوں۔ اس کے بغیر میں تباہ ہو چکی ہوتی۔ "سکھر جیل میں میری نظر بندی ۱۲ر جون کی دوپہر کے وقت ختم ہو جانا تھی...... مجھے کوئی خیال نہیں تھا کہ مجھے آزاد کر دیا جائے گا یا مزید نظر بند کر دیا

جائے گا تاکہ ممکنہ مقدمہ اور موت کا سامنا کر سکوں۔ " آخر میں موت تو آنی ہے مگر مجھے اس کا خوف نہیں" میں نے ڈائیری میں لکھا۔ "حکومت میں صرف حیوانوں کا کام ہے کہ انسانوں کو ملیامیٹ کر دیں۔ وہ نظریات کو ملیامیٹ نہیں کر سکتے۔ جمہوریت کا نظریہ باقی رہے گا اور ہم جمہوریت کی ناگزیر فتح میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کم از کم میں قید تنہائی کی یکسانیت سے آزاد ہو جاؤں گی جہاں آدمی زندہ بھی ہے اور نہیں بھی۔"

اس دن ۱۱ بجے جب میری نظر بندی ختم ہوئی۔ ڈپٹی مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کا حکم پہنچ گیا۔ "اسے بہت خوشی ہوئی ہے" اس نے لکھا۔ "کہ وہ ایک نیا نظر بندی کا حکم دے رہا ہے سکھر میں میری اسیری کی مدت میں ۱۲ر ستمبر تک کا اضافہ کر دیا گیا۔"

۲۱ر جون ۱۹۸۱ء میرا ۲۸ واں یوم پیدائش، سکھر سنٹرل جیل میری ہمشیرہ صنم

مجھے اپنی بہن سے اس کی یوم پیدائش پر ملاقات کی اجازت دی گئی۔ یہ نظر بندی کے دوران اس کا تیسرا یوم پیدائش تھا۔ کراچی سے میری پرواز کو دانستہ تاخیر سے بھیجا گیا تاکہ ملاقات کا وقت صرف ایک گھنٹہ رہ جائے۔ آخر کار جب میں اس کی جیل کی کوٹھڑی تک پہنچی تو میں شدت جذبات سے رو رہی تھی اور بہت مایوسی کے عالم میں تھی میری تلاشی لی گئی پھر تلاشی لی گئی اور پھر تلاشی لی گئی۔ قید خانے کی میٹرن نے میرے سر کے بالوں کی بھی تلاشی لی حالانکہ وہ اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ میرے بیگ کو خالی کیا۔ "کازماپولیٹن" نامی میگزین جو میں اس کے لئے لے جارہی تھی۔ اس کا ہر صفحہ پلٹ کر دیکھا۔ انہوں نے مجھے ان کے سامنے اس کھانے کو چکھنے کے لئے کہا جو میں اس کے لئے لے جارہی تھی مبادا وہ زہریلا ہو۔ "اس طرح مجھے اسے ملنے کے لئے کچھ وقت باقی نہیں رہے گا۔" میں نے احتجاج کیا جبکہ جیلر آہستہ آہستہ تالے کھول اور لگا رہے تھے۔ اور یہ تقریباً چار دروازے تھے جو جیل کی دیواروں اور اس کی کوٹھڑی کے درمیان بنائے گئے تھے۔ وہ صرف اسے دکھ پہنچانا چاہتے تھے۔ اور انہیں اس کے یوم پیدائش کا کوئی خیال نہیں تھا۔ اس نے میرا اس

طرح استقبال کیا جیسے وہ ایک باوقار میزبان ہو اور میں ایک باعزت مہمان۔ اس روز اس نے مجھے کچھ سنگترے پیش کئے جو سکھر میں ایک دوست نے بھجوائے تھے اور ساتھ ہی معذرت کی کہ اس کے پاس ان کو رکھنے کے لئے نہ کوئی پلیٹ ہے اور نہ ہی چھیلنے کے لئے چاقو۔ ''انہیں خطرہ ہے میں اپنی کلائیاں زخمی کر لوں گی'' یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ مجھے اس قدر خفت ہوئی۔ میں تو اپنی مایوسی کو رو رہی تھی اور شکایت سے بھری بیٹھی تھی۔ اور ایک وہ تھی کہ سکھر کے دہکتے تنور میں بیٹھی تھی مگر کوئی حرف شکایت اس کے لبوں پر نہیں آیا۔ وہ کس قدر بیمار اور کمزور لگ رہی تھی میں نے اس کے سر کو خوف سے دیکھا۔ بال گر چکے تھے اور کھوپڑی کی کھال نظر آ رہی تھی۔

''کوئی گپ شپ سناؤ'' اس نے کہا جیسے کہ ہم واپس اپنے سونے کے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے پاس اسے بتانے کے لئے ایک اہم بات تھی مگر کمرے کی سلاخوں کے باہر ایک موٹا سا پولیس کا سپاہی اور کوٹھڑی کے اندر ایک خاتون سپاہی بیٹھے ہوئے تھے تاکہ وہ ہماری تمام باتیں حرف بحرف سن سکیں۔ سوائے چار پائی کے اور کوئی جگہ بیٹھنے کے لئے نہیں تھی۔ میں اس کے بہت قریب بیٹھ گئی۔

''ناصر میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''ان کو کھسر پھسر مت کرنے دو'' پولیس سپاہی نے کوٹھڑی کی سلاخوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔

خاتون سپاہی ہماری طرف پلٹی۔ ''اوہ سنی! یہ بہت خوبصورت خبر ہے'' مجھے یہ خبر سن کر از حد مسرت ہوئی ہے میری بہن نے کہا۔ خاتون سپاہی ہمارے اور بھی نزدیک آئی...... اس کا چہرہ میری بہن اور میرے تقریباً درمیان تھا۔ ''میں ایسی حالت میں شادی نہیں کرنا چاہتی جب کہ ممی اور تم دونوں جیل میں ہو'' میں نے اپنی بہن کو خاموشی سے کہا۔ ''میں نے ناصر کو بتا دیا ہے کہ وہ اس وقت تک انتظار کرے جب تک ہمارا خاندان اکٹھا نہیں ہو جاتا۔''

''لیکن یہی وجہ ہے کہ تمہیں انتظار نہیں کرنا چاہئے'' پنکی نے مجھے بتایا۔ ''کون جانتا

ہے ہمیں کب رہائی نصیب ہوگی؟ تمہارا اکیلے رہنا ہمیں تشویش میں رکھتا ہے۔ خاوند کی حفاظت میں تم زیادہ خوش رہو گی اور ہمیں تمہارے بارے میں کوئی فکر نہیں رہے گی۔"

"اوہ پنکی! ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہونا تھا" میں کہتے ہوئے اس کے گلے سے لپٹ گئی۔

"نہیں" پولیس سپاہی چلایا۔ خاتون سپاہی نے ہم دونوں کو جدا کیا اور اس نے اپنا پاؤں ہمیں الگ کرنے کے لئے چارپائی پر رکھ دیا۔

"خدا کے واسطے" پنکی نے کہا۔ "ہم سیاست پر باتیں نہیں کر رہے...... ہم ذاتی خاندانی باتیں کر رہی ہیں...... کئی مہینوں کے بعد میں اپنی بہن سے ملی ہوں۔ آج میرا یوم پیدائش ہے...... کیا تم ہمیں ذاتی باتیں بھی نہیں کرنے دوگی؟۔"

پولیس سپاہی نے ادھر دھیان ہی نہیں دیا۔ اور اپنی نوٹ بک میں ہماری گفتگو نقل کرتا رہا۔ باقی وقت وہ خاتون سپاہی ہمارے درمیان کھڑی رہی۔ میں دوبارہ روئے بغیر نہ رہ سکی۔ جب مجھے اسے اس خالی خولی کوٹھڑی میں ان خوفناک لوگوں میں تنہا رہنے کے لئے چھوڑ کر جانا پڑا۔ "میں تمہاری اور ناصر کی پرمسرت زندگی کی دعا کرتی ہوں۔" اس نے مجھے جاتے جاتے کہا۔ "ہیپی برتھ ڈے پنکی" میں مشکل سے اتنا ہی کہہ سکی جبکہ پولیس سپاہی مجھے جلدی جلدی دور لے گیا۔

بیگم نصرت بھٹو
کراچی سنٹرل جیل
۹ر جون ۱۹۸۱ء

بنام مس بے نظیر بھٹو
سکھر سنٹرل جیل

میری دلاری بے بی!

جب تمہیں میرا یہ دوسرا خط ملے گا تو تمہارا یوم پیدائش نزدیک ہی ہو گا۔ میری یاد

داشت ان دنوں کی یاد دلاتی ہے جب انگلستان میں جہاں تمہارے والد تعلیم حاصل کر رہے تھے میری ڈاکٹر نے خوش آئند خبر سنائی کہ میں امید سے ہوں ۔ اوہ ! ہم کس قدر جذباتی اور مسرور تھے۔ تم ہماری پہلی بچی ہمارا پیار تھیں ہم نے یہ اچھی خبر نہایت شاندار طریقے سے منائی۔ تب کراچی میں پنٹو کے ہسپتال میں تمہاری پیدائش کے بعد میں ساری رات سو نہ سکی کیونکہ میری خواہش تھی کہ تم میرے بازوؤں میں رہو اور میں تمہارے خوبصورت سنہری گھونگر، تمہارا گلابی چہرہ اور تمہاری لانبی انگلیوں والے ہاتھ تکتی رہوں۔ میرا دل تمہیں دیکھ کر پھڑ پھڑاتا تھا۔

جب تمہارے پاپا انگلستان سے آئے تو تم تین ماہ کی تھیں۔ وہ اپنے والدین کے سامنے شرم محسوس کرتے مگر جب ہم اکیلئے ہوتے وہ تمہیں متواتر تکتے اور تکتے رہتے۔ تب تمہارے چہرے اور ہاتھوں کو چھوتے اور ایسی پیاری بچی کی معجزانہ پیدائش پر تمہیں حیرت سے دیکھتے۔ وہ مجھے پوچھتے کہ اسے کیسے اٹھاؤں تو میں نے تمہیں اٹھایا اور انہیں پکڑایا یہ کہتے ہوئے کہ "اپنا ایک ہاتھ تمہارے سر کے نیچے رکھیں اور دوسرا ہاتھ جسم کے ارد گرد" وہ کہتے تم ہو بہوان جیسی ہو۔ وہ کس قدر خوش نظر آتے تھے۔ وہ تمہیں اپنے بازوؤں میں سمیٹے کمرے میں چکر پر چکر لگاتے۔ میں مزید تفاصیل بیان نہیں کر سکتی کیونکہ میری آنکھیں ان دنوں کی یاد میں بھیگ چکی ہیں۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب تم نے دس ماہ کی عمر میں زمین پر پہلا قدم اٹھایا مجھے وہ دن یاد ہے جب کوئٹہ میں میں اپنے پہلے یوم پیدائش سے صرف ایک ہفتہ پہلے تم نے باشعور باتیں کیں۔ وہ دن بھی یاد ہے جب ساڑھے تین سال کی عمر میں میں تمہیں نرسری سکول میں داخلہ کے لئے لے گئی۔ جب تمہارے لئے محبت اور شفقت سے ننھے ننھے لباس سیتی اور ان پر کشیدہ کاری کرتی۔ روزانہ پنج گانہ نماز کے بعد تمہارے مستقبل کی خوشی. صحت اور طویل زندگی کی دعائیں مانگتی۔

آج بھی ۲۱ رجون ہے اور میں تمہیں پرمسرت یوم پیدائش کی مبارکباد دیتے ہوئے دعائیں مانگتی ہوں کہ خدا تمہیں اور بھی بہت سے یوم پیدائش نصیب کرے...... میں تمہیں

کوئی چھوٹا سا تحفہ بھی نہیں بھیج سکتی اور جیل خانے میں ۹۰ دنوں تک مقید ہونے کی وجہ سے تمہیں چوم بھی نہیں سکتی۔ مجھے امید ہے میری پیاری بیٹی تم مناسب خوراک کھاتی ہو اور بہت سا پانی پیتی ہو۔ پھل اور سبزیاں کھانا مت بھولنا۔ میں تمہارے اچھے مستقبل کی دعاؤں کے ساتھ ختم کرتی ہوں۔

تمہاری محبت میں سرشار

تمہاری ممی

پھل سبزیاں، پانی، والدہ کے کتنے عمدہ خیالات ہیں۔ مجھے بری طرح ان کی یاد آئی نظر بندی کا ایک نیا حکم۔ وہ کب تک انہیں یوں ایذا دیتے رہیں گے؟۔ میرے نئے نظر بندی کے احکام نے مجھے "اے" کلاس قیدی کا درجہ دیدیا تھا۔ اور میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، ریفریجریٹر (جس میں ٹھنڈے خالص پانی کا تصور بھی شامل تھا) اور ایک ایئر کنڈیشنر کی حقدار تھی۔ مجھے تھوڑی دیر کے لئے خوشی کی لہر محسوس ہوئی اگرچہ میرے تخیل سے بعید ہی تھا کہ ایک کھلی جیل کی کوٹھڑی کو ایئر کنڈیشنر سے کیسے آراستہ کیا جاسکتا ہے مجھے اس مخمصے میں پڑنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ مجھے "اے" کلاس قیدی کا درجہ دینے کا صرف اتنا ہی فائدہ ہوا کہ اب مجھے رات کے وقت سامنے صحن میں ٹہلنے کی آزادی دیدی گئی۔ جلد ہی جیل سپرنٹنڈنٹ نے مجھے اس عظیم تحفے کا بتایا کہ مجھے رات کے وقت کوٹھڑی میں قید نہیں کیا جائے گا۔ "مجھے تمہارا اے کلاس کا درجہ مطلوب نہیں" میں نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو لکھا۔ "میں تمہارے جھوٹ کے پلندہ کا حصہ دار بننا نہیں چاہتی۔"

میں نے آزادی کا خواب دیکھا تھا میں نے آکسفورڈ میں ساربون ریستوراں میں کھمبیاں اور گوشت کے قتلے کھانے کا خواب دیکھا تھا۔ میں نے نیو انگلینڈ میں تازہ سیبوں کا جوس اور بریگھم کی پودینہ ملی آئس کریم کھانے کا خواب دیکھا تھا۔ میرے والد نے اپنی موت کی کوٹھڑی میں اس شخص کی خیالی صورت کے دھیان میں وقت گزارا تھا جن کو وہ جانتے تھے۔ اوُاس شخص کے بارے میں ہر تفصیل سے مکمل طور پر آگاہ ہوچکے تھے۔ میں نے اپنی ریڈکلف میں کمرہ نشین یولندا کارزیکی کا تصور کیا جو آخری خبر آنے تک بطور ماہر

اقتصادیات میسا چوسیٹس میں کام کر رہی تھی۔ میں نے پیٹر گیلبریتھ کا تصور کیا جو واشنگٹن میں سینٹ کی خارجہ تعلقات کی کمیٹی میں کام کر رہا تھا اور میری ہم عمر این اولیئری اپنی گرل فرینڈ سے شادی کر چکا تھا۔ میں نے ہارورڈ میں ان کا تعارف کرایا تھا۔ وقت گزر تا گیا۔ ''یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے'' میرے والد نے جیل میں مجھے بتایا تھا۔ ''جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم باوقار طریقے سے دن گزاریں۔''

مجھ میں اتنا صبر نہیں تھا۔ مجھے وہاں سے باہر نکلنا تھا۔ بہرحال مجھے ایسا کرنا تھا کیونکہ جنرل عباس مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سندھ، نے کہا تھا کہ حکومت ہمیں جسمانی، اخلاقی اور مادی طور پر تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے انہوں نے اپنے ارادوں کی تکمیل کی خاطر ماہ مئی میں عدالت میں ۷۰ کلفٹن المرتضیٰ، ہماری زرعی اراضی اور دیگر جائیداد بذریعہ نیلام بیچنے کا مقدمہ درج کر دیا تھا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ کیا ہوچکا ہے۔ اگر میں زندہ بچ گئی تو کیا میری رہائش کے لئے کوئی گھر ہو گا جہاں میں واپس جاسکوں۔ کیا میں دوبارہ اپنے بستر پر سو سکوں گی؟۔ جیسے جیسے موسم گرما کی حدت کا تندور دہکتا گیا۔ میرا خبط ۷۰ کلفٹن یا المرتضیٰ میں منتقل ہونے کے لئے بڑھتا گیا۔ تاہم مجھے محسوس ہوا کہ دونوں میں سے ایک گھر میں جسمانی موجودگی حکومت کو ان پر قبضہ کرنے میں مانع رہے گی۔ اس ضمن میں میری بار بار کی درخواستیں میری توقع کے مطابق رد ہوتی رہیں۔ ''ہم اتنے جوانوں کو پہرے کے لئے مصروف نہیں رکھ سکتے'' انہوں نے مجھے بتایا شاید ایک جوان عورت کی نظر بندی کے لئے گھر کے ارد گرد پوری رجمنٹ کے پہرہ کی ضرورت تھی۔

جیل سپرنٹنڈنٹ نے میرا حوصلہ پست کرنے کے لئے نئی چال چلنا شروع کی ''تمہاری پارٹی کے عہدہ دار تمہیں چھوڑ رہے ہیں'' اس نے مجھے بتایا کہ پی پی پی کے اراکین کے مخالف پارٹیوں کے اراکین سے ملاقاتوں کی خبریں سنانی شروع کر دیں بلکہ حکومت کے عمال سے بھی رابطے کی۔ ''وہ تمام تمہیں چھوڑ رہے ہیں تم اپنی زندگی یہاں کیوں ضائع کر رہی ہو؟ اگر تم سیاست سے کنارہ کشی کر لو تو تمہاری تمام مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔''

میں نے اللہ تعالیٰ سے طاقت بخشنے کی دعا کی۔ ''اگر حکومت کے ظلم کی مزاحمت کرنے

بے نظیر بھٹو اپنی رابطہ عوام مہم کے دوران ایک ٹرک پر سوار' سامنے قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو کی قد آور تصویر نمایاں ہے

کے لئے میں تنہا رہ جاؤں تو بھی مجھے اس کی پرواہ نہیں" میں نے انہیں بتایا۔ "مجھے تمہارے جھوٹ پر مطلقاً اعتماد نہیں۔ اگر ہر کوئی شخص ہتھیار ڈال دیتا ہے تو میں ہرگز ایسا نہیں کروں گی" مجھے بالکل ان خبروں پر یقین نہیں تھا کہ پی پی پی کے رہنما جن میں سے کچھ کو ،ہ جولائی میں رہا کر دیا گیا تھا پارٹی کو چھوڑ جائیں گے میں نے ان باتوں پر اعتبار کرنا ہی نہیں چاہا۔

میں نے اپنی رہائی کے لئے ایک خاص دعا مانگنا شروع کر دی جو جیل کی ایک میٹرن نے مجھے سکھائی تھی۔ "قل ھو اللہ احد" (کہو کہ خدا ایک ہے) میں نے قرآن کریم کی ۱۱۲ ویں سورۃ ۱۴۱ مرتبہ ورد شروع کر دیا اور پانی کے ایک مگ پر پھونک مار کر کوٹھڑی کے چاروں کونوں میں چھڑکا۔ میں نے ہر ایک قیدی کے لئے دعا مانگی۔ میں نے اپنی والدہ کے لئے دعا کی۔ میں نے اپنے لئے دعا کی۔ چوتھے بدھ کے روز جیل کی میٹرن نے مجھے بتایا کہ جیل کا دروازہ کھلنے کی امید رکھنی چاہئے اور واقعی دروازہ کھل گیا۔

سکھر میں میری نظر بندی کے چوتھے مہینے کے چوتھے بدھوار کو میری کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور جیل حکام تھوڑی دیر کے لئے مجھے کراچی والدہ سے ملاقات کے لئے لے گئے۔ اس کے بعد کے چار بدھواروں کی میری اسی سورۃ کے ورد کرنے کے باعث میری والدہ کی کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا گیا۔ انہیں خون کی قے آنے پر نظر بندی سے رہا کر دیا گیا جیل کے ڈاکٹروں نے السر کی تشخیص کی یعنی معدے کے پھوڑے کی اور کھانسی کی ابتر شکل کی وجہ سے انہوں نے ٹی بی کے خدشے کا بھی اظہار کیا۔

مجھے اپنی والدہ کی صحت کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا اور ان کی رہائی کا بھی جیل کی ایک میٹرن نے مجھے بتایا۔ میرا جوش بڑھ گیا جب میں نے اپنی دعاؤں کو ثمر آور ہوتے دیکھا اور سکھر میں اپنی کوششوں میں دگنا اضافہ کر دیا۔ میں نے اپنا ورد مزید بڑھا دیا اور زیادہ سے زیادہ پانی کونوں میں چھڑکنا شروع کر دیا۔ میری دعائیں دوسرے مریضوں کے لئے اور خود اپنے لئے بھی تھیں۔ "اللہ الصمد" (خدا ابد تک ہے) ماہ اگست کے چوتھے بدھوار کو، کوٹھڑی کا دروازہ پھر کھلا۔ "تم جا رہی ہو" میٹرن نے مجھے بتایا۔ میں نے اپنی چیزوں کو مجتمع

کیا۔

"خدایا! میں نے دعا کی، مجھے اپنے گھر ۷۰ کلفٹن میں بھجوائیو"۔

فوجی اور پولیس جوانوں کا قافلہ ۷۰ کلفٹن کے نزدیک نہیں گیا۔ اس کی بجائے وہ مجھے کراچی سنٹرل جیل لے گئے اور میری والدہ کی پرانی کوٹھڑی میں نظر بند کر دیا۔
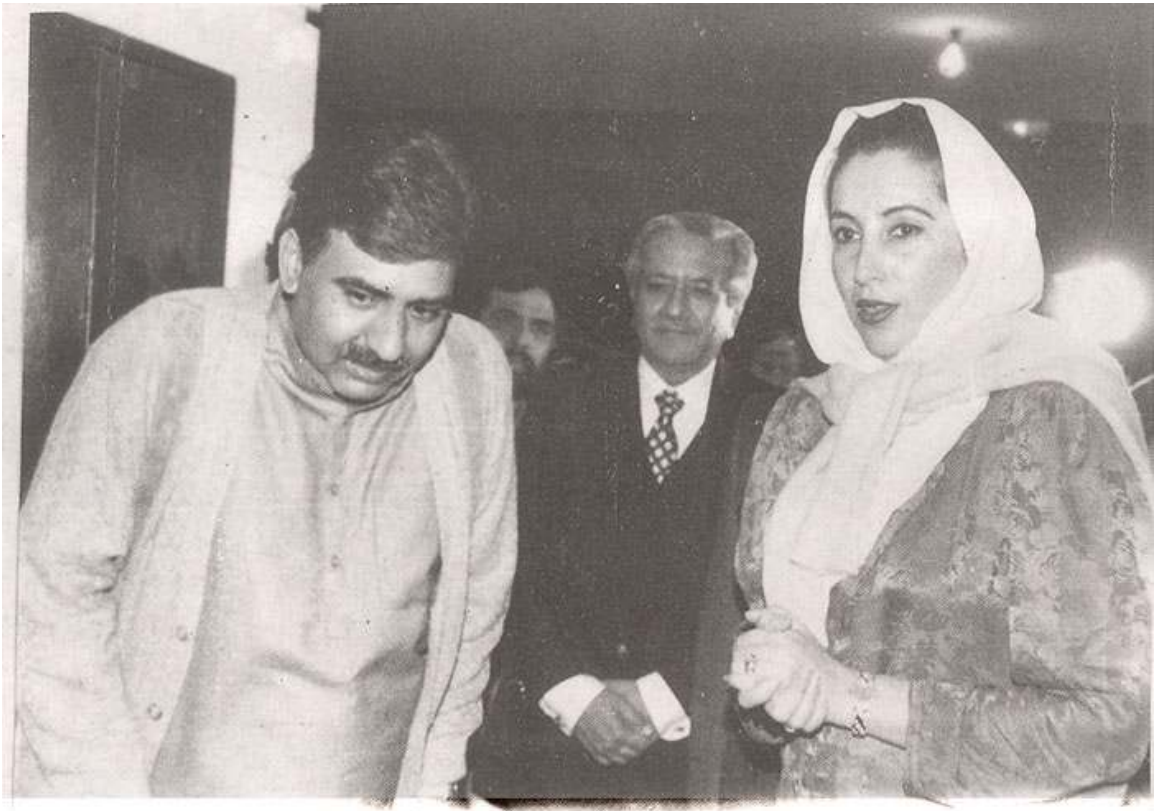
پیپلز پارٹی لاہور کے صدر اور ریلوے کے پارلیمانی سیکریٹری خالد گھرکی، وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے ہمراہ

باب – ۹

اپنی والدہ کی پرانی جیل کوٹھڑی میں مقید

کراچی سنٹرل جیل کی روداد

کراچی سنٹرل جیل، ۱۵ر اگست ۱۹۸۱ء:۔

سیمنٹ کی پٹڑیاں، لوہے کی سلاخیں، مکمل خاموشی، میں مکمل تنہائی میں واپس آگئی ہوں۔ مقفل وارڈ میں ارد گرد کی کوٹھڑیوں کو خالی کرا لیا گیا ہے۔ میں انسانی آواز کی دھمک سننے کے لئے بیتاب ہوں۔ وہاں صرف خاموشی کا پہرہ ہے۔

کراچی کے مرطوب موسم میں کوٹھڑی شدید گرم ہے۔ اور چھت کا پنکھا کوئی راحت میسر نہیں کرتا۔ بجلی پھر غائب ہو گئی ہے۔ ہر روز برقی رو دغا دے جاتی ہے بعض اوقات تین گھنٹوں کے لئے اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ عرصہ کے لئے۔ جیل حکام بتاتے ہیں کہ بڑے بجلی کے اسٹیشن میں کوئی خرابی اس کا باعث ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ رات کے وقت جیل کے دوسرے حصوں میں چکا چوند روشنی ہوتی ہے صرف میری کوٹھڑی کا بلاک روشنی سے محروم ہے۔

حکام نے مجھے ''اے'' کلاس کوٹھڑی میں رکھا ہے جو بلند مرتبہ سیاسی قیدیوں کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن ایک مرتبہ پھر مجھے ''اے'' کلاس کی مراعات نہیں دی گئیں۔ میرے

دائیں اور بائیں کوٹھڑیاں جو عام طور پر بیٹھک اور باورچی خانہ کے طور پر استعمال ہوتی تھیں اب خالی اور مقفل ہیں۔ کوٹھڑی جس میں مجھے رکھا گیا ہے چھوٹی اور گندی ہے۔ بیت الخلاء میں فلش سسٹم نہیں وہ ہر وقت لال بیگوں اور مکھیوں سے بھرا رہتا ہے۔ اس کی بدبو کوٹھڑی کے باہر صحن میں بہتی ہوئی گندی نالی کی بدبو سے مل کر فضاء کو متعفن رکھتی ہے۔ پانی کی بالٹی میں مردہ کیڑوں کی بھرمار ہے۔

صبح سویرے میں چابیوں کے کھڑکنے اور تالوں کے کھلنے کی آوازیں سنتی ہوں جو میری خوراک کی آمد کی نشان دہی کرتی ہیں۔ بغیر ایک لفظ کہے "گرے یونیفارم میں ملبوس قید خانے کی میٹرن جو کوٹھڑیوں کے سرے پر صحن ہی میں سوتی ہے کھانے کے ٹفن بکس لاتی ہے جو حکام کی اجازت سے ۷۰ کلفٹن سے آتے ہیں۔ میرا اگلا آغاز میں گھٹا گھٹا محسوس ہوتا ہے جب میں بڑی احتیاط سے تیار کردہ کھمبیوں سے بھرے ہوئے کریم آمیز چکن کے ٹکڑے، کباب اور چکن تکے کے ٹفن بکس کھولتی ہوں۔ اگرچہ مجھے بھوک کم محسوس ہوتی ہے اور چند لقمے ہی کھا سکتی ہوں۔ تاہم میں اپنی والدہ کے متعلق سوچتی ہوں جنہوں نے گھر کے باورچی خانہ میں میرے لئے اتنی احتیاط سے خوراک تیار کروائی۔

مجھے ممی کے متعلق پریشانی ہے۔ انہیں کراچی سنٹرل جیل میں میرے دوسرے ہفتے کے آغاز میں میرے ساتھ ملاقات کی اجازت دی گئی تھی اور اگرچہ انہیں دیکھ کر مجھے گوناں گوں اطمینان حاصل ہوا تاہم ان کی شکل دیکھ کر میں سٹپٹا گئی۔ یہ زرد، اترے ہوئے چہرے اور اعصابی تشنج اور بھورے بالوں والی خاتون اس خاتون سے مختلف نظر آرہی تھی جو پراعتماد، خوش وضع فرد کے روپ میں میری والدہ کہلاتی تھیں۔

ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں جب انہوں نے مجھے دیکھا کہ میں ان کی پرانی جیل کوٹھڑی میں مقید ہوں۔ لیکن ہم دونوں نے جی کڑا کر کے مسکرانے کی کوشش کی اور جیلروں کو نظرانداز کر دیا جو ہمارے گرد وہ خبر سننے کے لئے جمع ہو گئے تھے جو وہ مجھے رک رک کر بتانے لگی تھیں۔ مجھے جیل ہی میں کھانسی کی شکایت ہوئی تھی انہوں نے مجھے بتایا۔ ان کا خیال تھا یہ شاید گرد کی بنا پر تھی لیکن بعد میں انہوں نے خون تھوکنا شروع کر دیا تھا۔

متعدد مرتبہ معائنہ کے بعد، جیل کے ڈاکٹروں اور حکام نے انہیں ٹی بی کے خدشے کا اظہار کیا۔ اس تشخیص سے ہمیں کوئی حیرانی نہ ہوئی۔ پاکستان میں اکثر لوگوں کو ٹی بی کی شکایت ہے۔ مسلسل گرد پھانکنے سے پھیپھڑوں پر اثر پڑتا ہے۔ اور بد خوراکی کی وجہ سے پورا نظام معطل ہو جاتا ہے۔ جیل میں حفظان صحت کے ناکافی انتظامات جیل کے ہم مسکنوں کو ٹی بی اور اسی قسم کی دوسری بیماریوں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ قیدی عموماً فرش پر ہی تھوکتے ہیں اور فضاء میں جراثیم پھیلاتے رہتے ہیں۔

ان کے ڈاکٹر کے خدشات بد تر تھے۔ میری والدہ نے مجھے بتایا۔ اگرچہ وہ ابھی سانس کی نالی کے تجزیاتی طریقے سے گزرنے کے مرحلہ کے مطابق صحت مند نہیں تھیں ان کے ڈاکٹر کا اندیشہ پھیپھڑوں کے سرطان کا بھی تھا۔ پھیپھڑوں کا سرطان۔ میں ان سے بغل گیر ہوئی اور کوشش کی کہ انہیں میرے صدمے کا علم نہ ہو میں نے اپنے آپ کو مضبوط اعصاب کی ظاہر کرنے پر توجہ دی تاکہ میری والدہ کی تسلی ہو اور جیلروں میں خفیہ ایجنسی کے ایجنٹوں کو بھی حیرانی ہو جو جنرل ضیاء کو رپورٹ پہنچاتے رہتے تھے۔

"شاید یہ پھیپھڑوں کا سرطان نہ ہو سانس کی نالی کے تجزیاتی معائنہ کا انتظار کریں" میں نے اپنی والدہ کے اندیشوں کو دور کرنے کے لئے پوری مضبوطی کے ساتھ کہا۔

"ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اگر بروقت علاج ہو جائے تو آرام ممکن ہے" انہوں نے کہا۔

"اگر ضروری ہوا تو کسی غیر ملک میں بھی علاج کے لئے جا سکتی ہوں"۔

" آپ کو جلد از جلد ایسا کرنا چاہئے" میں نے خود کلامی کے انداز میں خود کو کہتے ہوئے سنا، اگرچہ ان کے پاکستان چھوڑ کر باہر جانے کے خیال سے میرا دل ٹوٹ رہا تھا۔

"لیکن پیاری بٹی تمہارا کیا ہو گا؟۔ تمہیں اکیلی چھوڑ کر میں کیسے جا سکتی ہوں"۔

میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں ٹھیک ہوں۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ ان سے ملاقات کے بعد تین دنوں تک میں چھت کو تکتی ہوئی بے سدھ بستر پر پڑی رہی اور غیر شعوری طور پر ڈپریشن اور مایوسی کا شکار رہی۔ ورزش کرنے، نہانے دھونے اور کپڑے تبدیل کرنے کی

ہمت مفقود ہو چکی تھی۔ کھانے اور پینے کی خواہش مر چکی تھی۔ میرے خدا، میں نے سوچا پہلے والد سے محروم ہوئی اور اب والدہ سے بھی محروم ہو رہی ہوں۔ میں سمجھتی تھی کہ یہ خود ترسی کا مرحلہ ہے، لیکن یہ محرومی کا خیال میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ میری والدہ کی طرف سے اس خوشخبری کا بھی کوئی ہمت افزا اثر نہیں تھا کہ صنم اور شاہ اپنی اپنی منگیتروں سے ماہ ستمبر میں شادی کر رہے ہیں۔ ہمارے والد نے اپنی اسیری کے دوران ہمیں محتاط رہنے کے لئے کہا تھا کہ کبھی لوگوں کے سامنے خوش رہنے کا تاثر نہ دینا جبکہ لوگ مصیبت میں مبتلا ہیں۔ "اگر سینما جاؤ تو برقع پہن کر جاؤ" انہوں نے ہدایت کی تھی...... اب میرے بھائی اور بہن نے میرے مستقل جیل میں رہنے کے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ وہ اپنی آرام دہ زندگیاں بسر کر رہے تھے اور اپنی شادی کی خوشیاں منا رہے تھے۔ شاید میرا وجود اب ان کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

پانی پیئے بغیر تین دنوں کے بعد میں اپنے آپ کو کمزور اور اکھڑی اکھڑی محسوس کر رہی تھی۔ "ضیاء کے ہاتھوں میں اس قدر مت کھیلو کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤ"۔ میرے دماغ میں ایک آواز نے مجھے خبردار کیا۔ جب میں نے پانی کی بالٹی میں سے پانی کا ایک مگ اپنے اوپر جبر کر کے پیا تو کچھ بہتر محسوس کیا۔ اور ہر روز وہ معمہ حل کرنا شروع کیا جو ممی کے ارسال کردہ اخبار میں مندرج تھا اور جسے میں اب تک نظرانداز کرتی آ رہی تھی۔ لیکن اخبار کی طباعت دھندلی سی نظر آ رہی تھی اور آدھے سر کا درد عود کر آیا جو کراچی سنٹرل جیل میں منتقلی کے بعد ابتدائی دنوں میں محسوس ہوتا تھا۔ میرے دانتوں اور مسوڑھوں میں درد ہوتا تھا اور میرے کان میں بھی ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ میرے بال بھی گرنا شروع ہو گئے تھے۔ میری صحت کے مسائل جزوی طور پر بدن کے نظام میں توازن برقرار نہ رہنے سے بھی پیدا ہوئے ہیں۔ یہ بات میرے ڈاکٹر نے مجھے بتائی، اس نے مزید بتایا کہ نظام ہائے قلب، عضلات، انہضام، تنفس اور اعصاب...... قوت اور خوراک کا اپنا اپنا حصہ استعمال میں لاتے ہیں مگر ذہنی دباؤ کے زمانے میں اعصابی نظام پوری طرح مستعد ہو جاتا ہے اور دوسرے جسمانی نظاموں سے بھی اپنا حصہ وصول کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس طرح انہیں کمزور
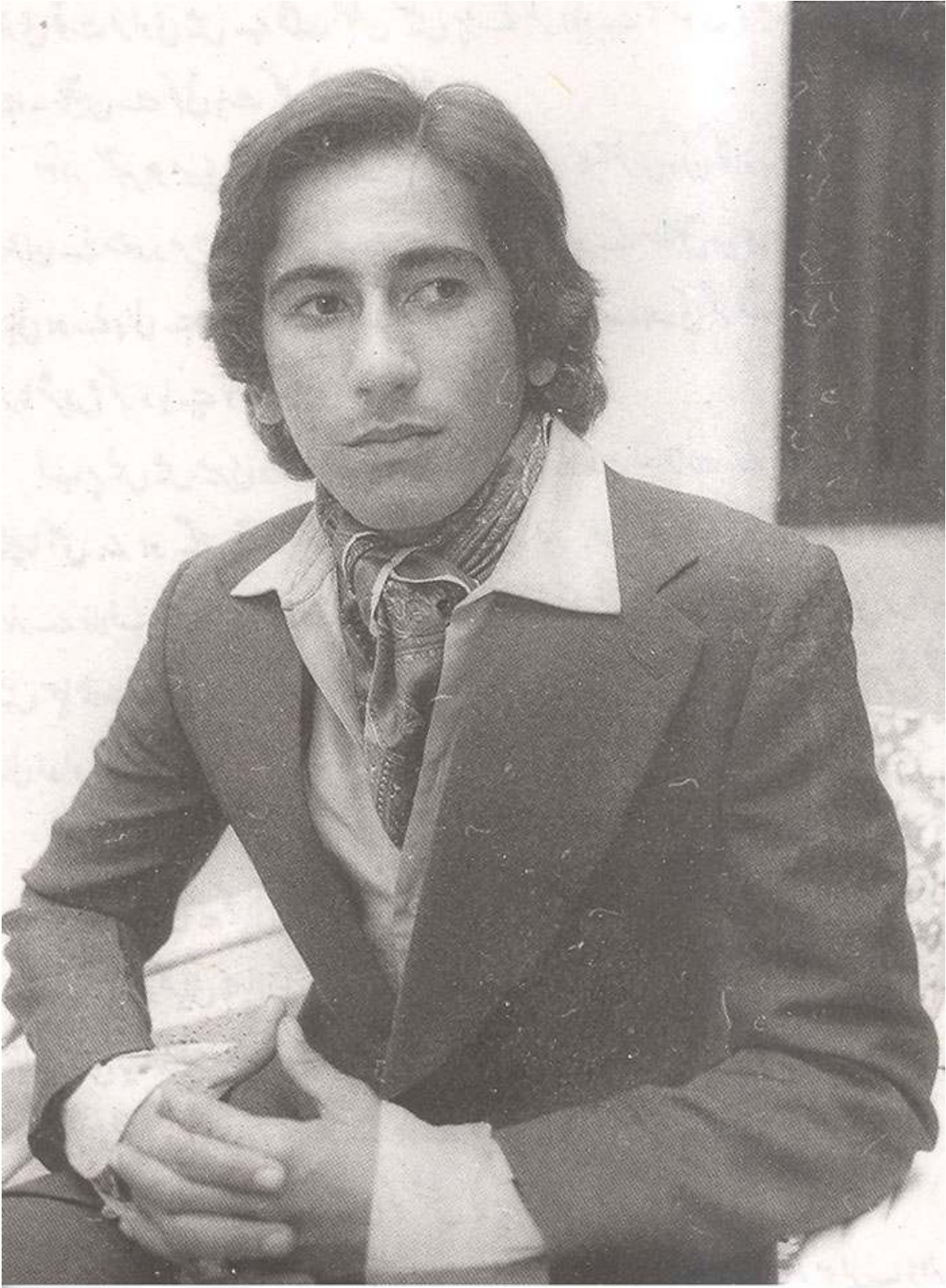
بے نظیر بھٹو کے شہید بھائی شاہنواز بھٹو

کرنے کا باعث بنتا ہے۔ قلب خصوصاً ایسی حالت میں متاثر ہوتا ہے جو اس بات کی تشریح ہے کہ ہمارے سیاسی قیدی اتنی بڑی تعداد میں کیوں دل کے دوروں کی زد میں آتے ہیں۔ ہماری قوت ارادی میں بے شک شکن نہیں پڑتے مگر ہمارے جسموں کو قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ یقین سے کوئی بات کہی نہیں جا سکتی۔

۱۳ر ستمبر جو میری نظر بندی کے حکم کے مطابق قید کا آخری دن تھا دور نہیں تھا۔ جیل میٹرن نے متعدد مرتبہ مجھے ہولے سے بتایا کہ اس کی شنید کے مطابق سیاسی قیدیوں کی جلد ہی رہائی ہونے والی ہے۔ اگر حکومت نے طیارے کے اغواء کے بعد کی گرفتاریوں پر ہاتھ ڈھیلا کرنا شروع کر دیا ہے تو مجھے کیوں رہا نہیں کیا جائے گا؟۔

اب پریس میں میری والدہ کے اور میرے الذوالفقار سے تعلقات کے بارے میں بیانات چھپنا بھی بند ہو گئے تھے۔ تمام اذیت رسانیوں اور جھوٹی شہادتوں کے باوجود حکومت ہمارے خلاف مقدمہ تیار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی جسے عالمی رائے عامہ کی عدالت میں سچا ثابت کر سکتی اور ضیاء مغرب سے خاص طور پر ریاستہائے متحدہ امریکہ سے متوقع مخفی مالی امداد کے عطیات کو کھونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

پاکستان نے ۱۹۷۹ء سے امریکہ سے امداد حاصل نہیں کی تھی جب سے امریکہ کو یہ شبہ ہوا تھا کہ پاکستان نیوکلیائی ہتھیار بنا چکا ہے یا بنانے کی صلاحیت حاصل کر چکا ہے۔ کارٹر انتظامیہ نے نیوکلیائی پھیلاؤ کی اپنی پالیسیاں نافذ کر دی تھیں اور پاکستان سے رابطہ منقطع کر لیا تھا۔ لیکن یہ افغانستان پر سویت حملے سے قبل کی بات تھی۔ پاکستان کے نیوکلیائی پروگرام پر امریکی تشویش کی پردہ پوشی کرتے ہوئے ضیاء اب پاکستانی سرحدوں پر روسی افواج کی موجودگی سے کماحقہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ریگن انتظامیہ نے پاکستان کو اقتصادی اور فوجی امداد کا ایک چھ سالہ ۲ء۳ ارب ڈالر کا پیکج پیش کیا تھا جو اس پیشکش سے دوگنا زیادہ تھا جو اس سے قبل کارٹر انتظامیہ کا پیش کردہ تھا اور جسے ضیاء نے فوراً ہی مسترد کر دیا تھا۔ امریکہ نے ضیاء کی خواہش کے مطابق چالیس ایف سولہ طیارے اضافی امداد کے طور پر پیش کئے تھے۔ ۱۹۸۱ء کے موسم خزاں میں

کانگرس میں پیش کیا جانے والا یہ پیکج ضیاء کے لئے بہت خوش آئند تھا مگر ان لوگوں کے لئے ناامیدی کا باعث تھا جو کمیونسٹوں کے خلاف پاکستان کو لڑانے کے امریکی شوق اور انسانی حقوق اور بحالی جمہوریت کی تشویش میں ایک گونہ توازن دیکھنے کے متمنی تھے۔

ضیاء کی پوزیشن مزید مستحکم ہو گئی تھی کیونکہ پاکستان کو لاکھوں مہاجرین کی امداد کے نام پر امریکہ، سعودی عرب اور چین سے اور مزید براں اقوام متحدہ ہائی کمشنر برائے مہاجرین، عالمی خوراک پروگرام اور دیگر بین الاقوامی امدادی انجمنوں سے امداد ملنا شروع ہو گئی تھی۔ کوہ ہندوکش کے دروں کے ذریعے جنگ سے متاثرہ لاکھوں افغانی مہاجرین قدیم زمانے کے تاجروں اور سمگلروں کے راستے استعمال کرتے ہوئے پاکستان آئے تاکہ یہاں جنگ کے خاتمہ کا انتظار کریں یا مجاہدین کے باغی گروہوں سے مل کر لڑائی میں حصہ دار بنیں۔ مہاجر کیمپ، ہسپتال مدرسے اور مراکز خدمت سرحد کے ساتھ ساتھ قائم کر دیئے گئے اور اس طرح حکومت کے اراکین کو پاکستان میں آمدہ بین الاقوامی امداد سے متمتع ہونے کا موقع مل گیا۔ اقوام متحدہ کے ایک افسر کا اندازہ تھا کہ کل امداد کا صرف تیسرا حصہ مہاجروں تک پہنچ سکا اور میں نے بعد میں رچرڈ ریوز کی کتاب "پشاور کا راستہ" میں یہی کچھ پڑھا۔ مجاہدین تک ہتھیار بھی پاکستان کے توسط سے پہنچتے تھے اور اس طرح ضیاء اور اس کے حواریوں کو پاکستانی اسلحہ خانوں میں ان ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی کا موقع ملا اور ان ہتھیاروں کی فروخت سے کمیشن کی موٹی موٹی رقمیں بھی حاصل ہوئیں۔ ایک امریکی صحافی نے مجھے بعد ازاں بتایا کہ واشنگٹن انتظامیہ کو بھی امداد کا تیسرا حصہ منزل تک پہنچنے کی توقع تھی۔

مجھے شبہ تھا کہ افغانستان کی جنگ میں پاکستان کے کردار کو پوری طرح ملوث کرنے میں سی آئی اے نے اپنا پارٹ ادا کیا تھا۔ لیکن میں یہ اندازہ کر نہیں پائی تھی کہ سی آئی اے نے ضیاء اور اس کی حکومت کو مستحکم کرنے میں اپنا کیا کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس کا علم مجھے مجلّہ "ویل" پڑھنے سے ہوا جس میں امریکی صحافی باب ووڈورڈ نے "سی آئی اے کی خفیہ جنگیں" کے عنوان سے مضمون لکھا۔ "سب سے نازک اور اہم مرحلہ ضیاء کی وہ رضا مندی تھی جس کی وجہ سے سی آئی اے کو پاکستان کے توسط سے افغانستانی باغیوں کی بڑھتی

ہوئی امداد کو مہیا کرنے کی اجازت ملی۔ سی آئی اے کا ڈائریکٹر کیسی، خود سی آئی اے اور ریگن انتظامیہ تمام اپنے مفاد میں ضیاء کو برسراقتدار دیکھنا چاہتے تھے اور حکومت کی اندرونی پالیسیوں کو جاننا بھی ضروری سمجھتے تھے۔ اسلام آباد میں سی آئی اے اسٹیشن دنیا میں عظیم ترین تھا"۔ میں سی آئی اے ڈائریکٹر کیسی اور ضیاء کے باہمی تعلقات کی گہری نوعیت کا ادراک نہیں رکھتی تھی۔ "کانگریس نے امریکی تجارت کو غیر ملکوں میں بزنس حاصل کرنے کے لئے کسی قسم کی رشوت کی ادائیگی ممنوع قرار دیدی تھی" ووڈورڈ نے لکھا۔ "تاہم ایسی ادائیگیاں یا مالی معاونت غیر ملکی راہنماؤں اور خفیہ ایجنسیوں کو پیش کرنا استثنیٰ میں آتا تھا یعنی قانونی رشوتیں جائز تھیں۔ کیسی کا یہی خیال تھا۔ مثال کے طور پر اس نے پاکستان کے ضیاء سے ایک یا دو مرتبہ سالانہ ملاقاتیں لازمی قرار دی تھیں۔ جلد ہی ریگن انتظامیہ میں وہی ایسا رکن تھا جس نے ضیاء کے ساتھ قریب ترین تعلقات قائم کر رکھے تھے"۔

یہ تمام واقعات ضیاء کی شخصیت کے منفی پہلوؤں کو یعنی ایک قاتل اور ظالم آمر کی بجائے ایک عالمی مدبر کے روپ میں بدل رہے تھے۔ اس کے مشہور جملے مثلاً ۱۹۷۸ء میں ڈیلی میل کے ایک نامہ نگار سے چائے پیتے ہوئے اس نے کہا: - "ہم لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیں گے، اگرچہ تھوڑی تعداد میں" اب ایسے حوالوں میں بدل گئے کہ "پاکستان جنگی محاذ سے ملحقہ ریاست ہے جو خدا کو نہ ماننے والے کیمونسٹوں کے خلاف جہاد یا مقدس جنگ لڑنےوالوں کی مدد کر رہی ہے" امریکی حکومت کے کارندے نہ چاہتے ہوئے بھی ضیاء کی بنیاد پرستی کی حقیقتوں کو نگلنے کے لئے تیار تھے۔ میں نے پہلی دفعہ انٹرنیشنل ہیرلڈ ٹریبیون کے ایک مضمون کا حوالہ مقامی پریس میں چھپا ہوا دیکھا جس میں ضیاء کو "فیاض آمر" کہہ کر پکارا گیا تھا۔

میں نے اخبارات کی حوصلہ شکن رپورٹیں پڑھنے کی بجائے اپنی مصروفیت کا رخ ورزش کے پروگرام کی طرف موڑ دیا۔ ہر روز ایک گھنٹے کے لئے اپنی کوٹھڑی کے بلاک کے سامنے گزرتی ہوئی تنگ راہداری میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ لگاتا۔ اگرچہ مجھے

بھوک بھی ہوتی چاروناچار ۷۰ کلفٹن سے آئے ہوئے کھانے کو جبراً پیٹ میں دھکیلنا معمول بن گیا تھا۔ جب ماہ اگست سے ماہ ستمبر میں داخل ہوئے تو مجھے خوش آئند مستقبل کی جھلک محسوس ہونا شروع ہوئی۔ صنم کی شادی ۸ ر ستمبر کو طے پائی تھی اور میں نے اس میں شامل ہونے کی اجازت کے لئے درخواست دیدی تھی۔ ہوسکتا ہے مجھے رہا ہی کر دیا جائے۔

میں تصوراتی تصویر میں کھو گئی کہ ابھی کوئی قدموں کی چاپ میری کوٹھڑی کی طرف بڑھ رہی ہے تاکہ میری رہائی کی خوشخبری مجھے دے سکے۔ میں نے یہی تصور اس وقت کیا جب میری کوٹھڑی والے بلاک کا تالا مجھے ٹفن بکس دینے کے لئے کھولا جارہا تھا اور رات کو اس لمحے بھی جب میٹرن مجھے دیکھنے آئی...... میں نے ہر پیر کی صبح قدموں کی چاپ میں اسی تصور کی بھنک سننا شروع کی جو دراصل ایک چھوٹے قد کے اعصابی مریض کے ہلکے ہلکے قدم تھے۔ وہ دراصل جیل سپرنٹنڈنٹ کے قدموں کی آواز ہوتی تھی۔ بعض مرتبہ وہ اپنے نائب کی معیت میں آتا تھا اور بعض دفعہ اکیلا ہی...... اس کا پیغام ہمیشہ ایک ہی نوع کا ہوتا تھا۔ "تم اپنی زندگی جیل کی دیواروں میں مقید ہو کر کیوں برباد کر رہی ہو، جبکہ پارٹی کے دیگر ارکان آزاد ہیں اور پر مسرت زندگی گزار رہے ہیں" وہ ہر ہفتے مجھ سے یہی سوال کرتا۔ "اگر تم فی الوقت سیاست ترک کر دو تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا" حکومت کا کیا منشاء تھا؟ میں جانتی تھی کہ سرکاری ہمت افزائی کے بغیر سپرنٹنڈنٹ کو ایسی باتیں کہنے کی کبھی جرات نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر بھی اگر ضیاء کی خواہش مجھے رہا کرنے کی ہوگی تو میں رہا ہو جاؤں گی...... اگر اس نے نہ چاہا تو نہیں ہوں گی۔ لیکن مجھے بلیک میل کرنے کی ان کی کوشش کا مقصد کیا؟ وہ کیوں چاہتے ہیں میں سمجھوتہ کر لوں؟ کیا وہ حقیقتاً سمجھتے ہیں کہ میں راضی ہو جاؤں گی؟ یا ان کا مقصد میری قوت ارادی کو ختم کرنا ہے جیسے ایوب خان نے میرے والد کی قوت ارادی کو توڑنا چاہا تھا۔

"تمہیں ہم کل ہی رہا کر دیں گے" سپرنٹنڈنٹ مجھے کہتا۔ "صرف تم خود ہی اپنے آپ کو جیل میں مقید رکھ رہی ہو...... تم لندن یا پیرس جانا پسند نہیں کرو گی؟ تم نوجوان عورت ہو اور اپنی جوانی قید خانے کی نذر کر رہی ہو۔ مگر کس مقصد کے لئے؟ تم اپنے وقت

آنے کا انتظار کر سکتی ہو اور وہ ضرور بالضرور آئے گا"۔ جب وہ یہ باتیں کہہ کے چلا جاتا تو میں پریشان ہو جاتی۔ اگرچہ میرا طبعی میلان اس کے لالچی پھندے میں پھنسنے کا نہیں تھا مگر میں اس کی نیت کی گہرائی جانچنے سے قاصر تھی...... کیا وہ میری بھلائی چاہتا تھا یا برائی؟ میں اپنے تازہ اور لازمی رجحان سے متنفر تھی کہ ہر شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ لیکن زندہ رہنے کے لئے میں اور کیا کچھ کر سکتی تھی؟۔ حکومت مجھے ڈانوا ڈول کرنا چاہتی تھی میں نے شبہ کیا...... میں نے فیصلہ کر لیا کہ رات کو میری کوٹھڑی کے ارد گرد نامانوس شور شرابا کر کے وہ مجھے اپنے قدموں سے اکھیڑنا چاہتے تھے۔ کھسر پھسر دو مرد اور ایک عورت دبی دبی آوازوں میں باتیں کرتے ہوئے۔ بعض اوقات صبح سویرے ایسی آواز سن کر میری آنکھ کھل جاتی۔ قدموں کی چاپ۔ ایک آدمی کے بھاری بھاری قدموں کی آوازیں قریب سے قریب تر آتی جارہی تھیں۔ "کون ہے؟" میں نے اپنی چادر کے نیچے سے دروازے کی طرف دیکھ کر پکارا۔ خاموشی۔ "کیا تم نے قدموں کی آوازیں سنیں؟" میں نے میٹرن سے پوچھا۔ "میں نے تو کچھ بھی نہیں سنا" اس نے کہا میں نے یہ شکایت درج کرا دی تو انہوں نے کہا۔ "تم صرف تصور کر رہی ہو"۔

چھن، چھن۔ ایک نئی آواز کسی عورت کی پازیب میں گھنٹیوں کی چھنا چھن۔ پھر کھسر پھسر کی آوازیں۔ میں صبح سویرے اور پھر مزید سویرے جاگ جاتی اور پھر نیند مکمل طور پر اچاٹ ہو گئی۔ جب پرانی میٹرن کی جگہ نئی آگئی تو میں نے دوبارہ کوشش کی۔ "کیا رات کو تمہیں شور کی آوازیں نہیں سنتیں؟" میں نے بے دانت جھریوں زدہ بوڑھی پٹھان عورت سے پوچھا جو اب صحن میں سوتی تھی۔

خاموش! ظاہر کرو تم نے کچھ نہیں سنا۔ اس نے جواب دیا جبکہ اس کی آنکھیں ادھر ادھر تک رہی تھیں اور کپکپاتے ہوئے ہاتھ یونیفارم کی تہوں کو ہموار کر رہے تھے۔

"لیکن وہ کون ہے" میں نے اس کی تصدیق پر مزید جاننا چاہا۔

"یہ چڑیل ہے" اس نے آہستہ سے کہا۔

چڑیل، یہ عورت کا بھوت ہے جس کے پاؤں آگے کی بجائے پچھلی طرف ہوتے ہیں۔

"دنیا میں چڑیل کا کوئی وجود نہیں" میں نے خرو مندی بھگارتے ہوئے میٹرن کو بتایا۔
"وجود ہے" اس نے اصرار کیا۔ "یہاں ہرایک عورت نے یہ آواز سنی ہے۔ تم ظاہر کرو تم نے نہیں سنی تو تمہیں وہ کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائے گی"۔

چھن، چھن، وہ شب اور آنے والی بہت سی راتوں میں میری سوچ سمجھ مجھے دغا دے گئی۔ وہ عورتوں کے حلقے میں کیوں نہیں جاتی میرے وارڈ میں کیوں آتی ہے۔ میں یہ تصور کر کے کانپ اٹھتی یہ شور کی آوازیں جاری رہیں۔

چھنا چھن، چھنا چھن کوئی شخص، کوئی چیز میرے وارڈ کے باہر پڑے کوڑا کرکٹ کے ڈبوں کو کھٹکھٹا رہی تھی جیسے کوڑے میں سے کوئی چیز تلاش کی جارہی ہو۔ کوٹھڑی تک قدموں کی چاپ پھر سنائی دینا شروع ہوئی۔ باوجود اس امر کے کہ وارڈ کے مقفل دروازے کے کھلنے کی آواز تک نہیں آئی تھی۔ "یااللہ! یہ کیا ہے؟" "یااللہ میری مدد کرو" دروازے کے باہر سے میرے ٹفن بکس کے اٹھانے کی آواز سنائی دی۔ اس کا ڈھکنا کھلا اور کسی نے بکس کو دیوار پر دے مارا۔ "اللہ! میں نے اپنے حواس مجتمع کئے اور کوٹھڑی کے دروازے تک پہنچی۔ ٹفن بکس کیچڑ میں الٹا پڑا تھا اور وہاں کوئی شخص موجود نہیں تھا۔

"تم خاصے ذہنی دباؤ میں معلوم ہوتی ہو" جیل سپرنٹنڈنٹ نے اپنے اگلے دورے کے موقع پر مجھے کہا۔ بالآخر اس نے مجھے بتایا کہ میری کوٹھڑی کے بلاک کو اس جگہ تعمیر کیا گیا تھا جہاں برطانوی عہد میں پھانسی گھاٹ ہوتا تھا۔ "ہو سکتا ہے یہ کوئی ایسی روح ہو جو بے چین ہو اور جسے آرام میسر نہیں آسکا" جیلر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ یہ خیال اطمینان کو تہ و بالا کرنے کے لئے کافی تھا۔ اسی طرح پٹھان میٹرن کی تشریح بھی قابل اطمینان نہیں تھی۔
"میرا شوہر رات کو چوکیداری کرتا تھا اور اسے چوروں نے قتل کر دیا تھا" اس نے مجھے بتایا ــــــ اس ذکر پر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "اس کے قاتل کا کہیں پتہ نہیں چلا یہ اس کی بے چین روح بھی ہو سکتی ہے۔" میں توہم پرست نہیں ہوں اور مجھے خدشہ تھا کہ حکومت میرے حوصلے کا امتحان لے رہی ہے جیسے اس نے میرے والد کے ساتھ راولپنڈی جیل میں سلوک روا رکھا تھا۔ لیکن احتیاطاً میں نے پھانسی گھاٹ کی گمشدہ روحوں کے لئے

دعائیں مانگنا شروع کر دیں چند مہینوں بعد آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ میں اب بھی یقین کے ساتھ ان آوازوں کا سبب نہیں جان سکی۔

میں نے اس آیت کا ورد شروع کر دیا جو سکھر جیل کی میٹرن نے مجھے سکھائی تھی یعنی قرآن کی سورت پڑھنے کے بعد پانی کی بالٹی پر پھونک مارنا اور اس پانی کو کوٹھڑی کے کونوں میں چھڑکنا شروع کر دیا۔ کوٹھڑی بے ڈھنگی شکل کی تھی اور اس کے چار کونے نہیں تھے اور مجھے خوف تھا کہ میرے ورد کا خاطر خواہ اثر نہیں ہو گا۔ ''کیا میں صنم کی شادی میں شامل ہو سکوں گی؟ مجھے اپنی درخواست کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ ''قل ہو اللہ احد'' کا میں نے ورد کیا۔ دوسرے بدھ کے بعد اور تیسرے بدھ سے پہلے، پٹھان میٹرن صبح سویرے میرے پاس آئی۔ میں نے اپنی چارپائی کے پاس آوازیں سنیں۔ اس نے مجھے بتایا وہ کہہ رہے تھے ''وہ آج جا رہی ہے'' یہ بوڑھی عورت پاگل ہے میں نے خیال کیا۔ دو گھنٹے بعد جیل حکام آئے۔ تم فوراً جا رہی ہو۔ انہوں نے مجھے بتایا تمہیں اپنی ہمشیرہ کی شادی میں شامل ہونے کی اجازت مل گئی ہے''۔

۷۰ - کلفٹن دروازے کے ساتھ کندہ پیتل کی پلیٹیں ویسے ہی چمک رہی تھیں ''سر شاہ نواز بھٹو'' ذوالفقار علی بھٹو، بار ایٹ لاء'' چھ مہینے کی تناؤ کی کیفیت میں کچھ کمی محسوس ہوئی جب پولیس کا قافلہ بڑے دروازے کے سامنے ہی رک گیا اور مجھے اکیلے اندر جانے دیا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں اس گھر کو دوبارہ نہیں دیکھ سکوں گی۔ یا تو حکومت ۷۰ کلفٹن کو قرق کر لے گی یا مجھے سکھر جیل میں خاموشی سے مار دیا جائے گا اور میں دوبارہ گھر نہیں جا سکوں گی۔ لیکن میں یہاں تھی اور زندہ بھی۔ یہ میرا گھر تھا جہاں میری ہمشیرہ کی شادی کے سلسلہ میں صحن کی دیواروں کو روشنی کی لڑیوں سے مزین کیا گیا تھا...... ہم دونوں زندہ بچ گئی تھیں۔

جب گھر کے مانوس دروازے واہوئے تو زندگی کی ایک نئی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ جب چوکیدار نے مجھے سلام کیا اور قافلہ صحن میں اندر آ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دوسری زندگی بخشی ہے۔ اس پاک ہستی کی امداد تھی کہ دشمن مجھے شکست دینے میں

ناکام رہا۔ قوت اور ارادے کا ایک نیا جذبہ مجھ میں سرائت کر گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا کہ میرا دوسرا جنم ہوا۔

ڈھول، رقص، یاسمین اور گلاب کے ڈھیروں ہار، گھر کا پورا عملہ سامنے کی ڈیوڑھی میں اکٹھا تھا اور ڈھولک کی تھاپ پر اپنے بازوؤں کو لہراتے ہوئے لوک رقص میں مصروف، چوکیدار، بیرے اور سیکرٹری سبھی جمع تھے۔ میں نے ملازموں کے انچارج دوست محمد کو دیکھا جو قید خانے کے پہرہ داروں سے تیز تر دوڑتا ہوا میرے والد تک جیل میں سب سے پہلے پہنچا تھا۔ عرس میرے والد کا خاص خدمت گزار جسے میرے والد کی گرفتاری کے لئے فوجی جوانوں کے چھاپہ مارنے کے دوران پستول سے پیٹا گیا تھا۔ بشیر اور ابراہیم جو میری والدہ کی اور میری سہالہ میں خدمت کرتے تھے جب میرے والد کو پھانسی دی گئی۔ اور نذر محمد جس نے میرے والد کی میت کو موصول کیا اور انہیں دفنایا۔

ان کے چہرے رقص کرتے ہوئے اور گاتے ہوئے اس وقت مسکراہٹوں سے کھلے ہوئے تھے۔ کار سے باہر قدم رکھتے ہی مجھے خیال آیا کہ شادی کی فضاء کس قدر دلآویز تھی۔ وہ میری طرف دوڑے تاکہ ہاروں سے میری گردن کو بھر دیں۔ "براتیوں کے لئے بچا کر رکھو" میں نے بلند آواز میں کہا جب ہاروں کا ڈھیر میرے کانوں کو چھونے لگا۔ "نہیں، نہیں ہم پھول آپ کے لئے لائے ہیں" انہوں نے بیک زبان کہا" ہم آپ کو گھر میں دیکھ کر کتنا خوش ہوئے ہیں۔

گھر، مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ فضاء پٹاخوں کی آواز سے گونج اٹھی جیسے ہی میرے عزیز و اقارب سامنے کے منقش چوبی دروازوں سے باہر نکلے۔ میری والدہ کی بہنیں وہاں تھیں۔ خالہ جو لندن سے آئی تھیں۔ خالہ زاد زینت لاس اینجلس سے، میری خالہ زاد فخری جسے میرے والد کی سزائے موت کے بعد میرے ساتھ نظر بند کر دیا گیا تھا۔ میرے والد کی ہمشیرہ پھوپھی منا اور ان کی حیدر آباد ہی سے تین سوتیلی بہنیں جنہوں نے مجھے مبارک باد دی۔ آنٹی منا ہی نے میرے والد کی زندگی بچانے کے لئے ضیاء کو عرضداشت بھیجی تھی جو بے سود ثابت ہوئی۔ دیگر اقارب ہندوستان، امریکہ، انگلستان، ایران اور فرانس سے آئے تھے۔

اور ان کی وجہ سے گھر کے تمام کمرے اور میرے بھائیوں کے رہائشی کمرے بھی جو پچھلے چار سالوں سے خالی پڑے تھے اب بھر گئے تھے۔ لیلا، نشلی، ہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئیں خوب ہنسیں اور چلائیں۔ مجھے ان سے دوبارہ ملاقات کی قطعی امید نہیں تھی۔ اور انہیں بھی یہی کچھ محسوس ہوتا تھا۔ دل میں ناگفتہ خوف تھا کہ میں شاید جیل سے زندہ واپس نہ آؤں۔

گرم پانی سے غسل کی عیاشی، پاؤں کے نیچے قالین، پینے کے لئے صاف ٹھنڈا پانی، اہل خاندان کے ہمراہ ضیافت، میں دو دن اور دو راتیں نہیں سوئی میں اپنی آزادی کا کوئی لمحہ ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میری والدہ تو جلد ہی سو جاتی تھی مگر میں صبح تڑکے تک صنم سے باتیں کرتی جاتی تھی۔ صنم کے بستر پر سونے کے جلد ہی بعد والدہ جاگ اٹھتیں...... میں قریبی اعزا سمیت ان سب کے زیادہ سے زیادہ نزدیک زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ جو وقت میرے اپنے لئے بچتا اس میں ایشیاء ویک، فارایسٹرن اکنومک ریویو، ٹائم اور نیوز ویک کے پرانے شمارے عمیق نگاہی سے پڑھتی رہتی۔ میں نے اپنے سونے کے کمرے کی دیواروں کو بھی رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ فوج کے پچھلے چھاپہ میں، مجھ پر جلد ہی انکشاف ہو گیا حکومتی اہلکاروں نے میرے والد کے میرے نام تمام خطوط چرا لئے تھے، جب میں ملک سے باہر تعلیم کے حصول کے لئے گئی ہوئی تھی۔ اس طرح میرے بھائیوں، بہن کی اور میری ناقابل تبدیل تصویریں اور میرے زیورات جن میں والدہ کی طرف سے مجھے دی گئی ایک دل پسند انگوٹھی اور میری دادی اماں کی طرف سے دی گئی سرے دانی کا زریں سرپچو سب چیزیں غائب تھیں۔ لیکن میرے سونے کے کمرے کے تقدس کی خلاف ورزی کا احساس مجھے زیادہ ستارہا تھا۔ میں نے کمرے کی دیواروں کو رگڑا اور پھر رگڑا تاکہ ان لوگوں کے انگشتی نقوش کو جڑ سے اکھاڑ سکوں اور اس طرح نفسیاتی اطمینان حاصل کروں۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ یہ کمرہ اور یہ گھر تمہارے پاس باقی رہ گئے۔ میں اپنے آپ سے باتیں کرتی۔ چند مہینے قبل تو اس بات کا یقین بھی نہیں تھا کہ یہ سب کچھ تمہیں دوبارہ مل سکے گا۔ وہ تمہیں دوبارہ جیل نہیں لے جائیں گے۔ "کیا وہ ایسا کریں گے؟" میرے کزن عبدالحسین نے پوچھا اور وہ یہ

وزیر اعظم چین مسٹر لی پنگ اپنے دورۂ پاکستان کے موقع پر وزیر اعظم پاکستان بے نظیر بھٹو کے ہمراہ گارڈ آف آنر کا معائنہ کر رہے ہیں

بھول گیا کہ وہ پاکستان میں ہے سان فرانسسکو میں نہیں، میں نے اس کی پر امیدی پر یقین نہیں کیا اگرچہ قرائن ابھی اس کے خلاف نہیں تھے۔

۷۰ - کلفٹن میں ہر چیز معمول پر تھی اور روائتی طور پر پوری آسائش کے ساتھ ۔ گھر کا عملہ اندر اور باہر بھاگ دوڑ کر رہا تھا، باغ میں ایستادہ منقش خیموں میں بوفے کھانے کی میزیں سجاتے ہوئے مہمانوں کی نشستوں کے لئے خوبصورت بازوؤں والی کرسیوں کو ترتیب سے رکھتے ہوئے۔

صنمی کے ہاتھوں پر مہندی سجانے کے لئے ایک ماہر فن کارہ گھر میں بلائی گئی تھی۔ جس کا پیشہ ہی شادی والے گھروں میں خواتین کے ہاتھوں پر خوبصورت اور پیچیدہ نمونے بنانا تھا۔ مہندی آرٹسٹ نے میری بہن کی ہتھیلی پر خوبصورت نقش و نگار اور بیل بوٹے بنائے اور مہندی کو پائیداری بخشنے کے لئے اس میں لیموں کا رس اور چینی بھی ملائی۔

صنم کی شادی پاکستانی معیار کے مطابق اتنی بڑی نہیں تھی صرف ۵۰۰ مہمان بلائے گئے تھے اور ہر رسم پر عمل بھی نہیں کیا جا سکا تھا۔ میں مہندی کی رسم کے لئے اور اسی طرح نکاح اور شادی کی رسومات کے مطابق نئے ریشمی جوڑے اپنے لئے نہیں بنوا سکی تھی حالانکہ گھر میں مجتمع متعدد خواتین نئے ملبوسات میں آئی تھیں۔ لیکن مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی میں نے اپنی الماری کے کپڑوں کو کافی مدت سے چھیڑا تک نہیں تھا نہ ہی پہنا تھا۔ اس لئے اپنا پرانا گلابی ریشمی جوڑا مجھے نیا ہی لگ رہا تھا۔

"والدہ مجھے میک اپ کرنے پر مجبور کر رہی ہیں" صنمی نے کہا اور دوڑتے ہوئے میرے سونے کے کمرے میں آئی۔ "اور مجھے ساڑھی پہننے کے لئے بھی مجبور کیا جا رہا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں نیلے جینز کے جوڑے ہی میں شادی کے لئے تیار ہو جاتی۔ میرے لئے کچھ کرو"

"شادی ایک دفعہ ہی ہوتی ہے" میں نے کہا "ممی نے ابھی تک بہت مصیبتیں برداشت کی ہیں۔ ان کی خوشی کی خاطر ہی سب کچھ کر لو"۔

"یہ دلہن چاند سے زیادہ حسین ہے ہاں وہ ہے ہاں وہ ہے" گانے کی آواز نے، گھر کو

پر رونق بنایا ہوا تھا جب میں پہلی شب گھر میں داخل ہوئی۔ "یہ دلہن چاند سے حسین تر ہے" ہماری رشتے دار خواتین صنم کی سہیلیوں کے ساتھ مل کر رقص اور روائتی گیتوں کی پریکٹس کر رہی تھیں۔ اپنی آزادی کا کوئی لمحہ ضائع نہ کرتے ہوئے اور نہ جانتے ہوئے کہ کتنا عرصہ میں آزاد رہوں گی میں اپنی عزیز رشتہ داروں اور سہیلیوں کے ساتھ گھل مل گئی۔ ہماری دنیائیں کتنی متضاد بن گئی تھیں لیکن ان میں حقیقی دنیا کونسی تھی؟ دو مرتبہ میں جیل کو "اپنا گھر" پکارنے پر پکڑی گئی۔

صنی اپنے ہونے والے شوہر کے ہمراہ آئینوں کے درمیان مہندی کی رسم پوری کرنے کے لئے سبز گدے پر بیٹھی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ چونکہ یہ شادی والدین کی طے کردہ نہیں تھی، اس لئے ان کے درمیان آپس میں کوئی گھبراہٹ کے آثار نہیں تھے۔ لیکن رسمیں تو پورا کرنی پڑتی ہیں۔ صنی نے اپنا دوپٹہ احتیاط سے اپنے چہرے پر رکھا تاکہ دولہا کی نظر شادی سے قبل اس پر نہ پڑ جائے مگر مجھ سے باتیں کرتے ہوئے وہ اپنا دوپٹہ اٹھا لیتی تھی۔

"ناصر جی، ناصر جی! ہونے والے بہنوئی! صنم کو اپنی دلہن بنانے سے پہلے ہماری سات شرائط ماننا ہوں گی"۔ صنی کی سہیلیوں اور رشتہ دار خواتین نے ہمارے سامنے گاتے ہوئے فرمائش کی۔ "پہلی شرط یہ ہے کہ صنم کھانا نہیں پکائے گی"۔

"میں باورچی رکھ لوں گا" ناصر نے گاتے ہوئے جواب دیا۔

"صنم کپڑے نہیں دھوئے گی" دلہن کی سہیلیوں نے گایا۔

"میں کپڑے لانڈری میں دے دوں گا" ناصر نے گایا...... ہر شرط پر گاتے ہوئے جواب دیتا رہا۔ یہاں تک کہ اب اس کے عزیزوں کی باری آگئی کہ صنم کو تنگ کریں۔

دونوں طرف سے رشتے دار خواتین حنا سے بھری پلیٹیں جن کو چاندی کے ورق اور جلتی شمعوں سے سجایا گیا تھا لے کر آئیں۔ ایک ایک کر کے ناصر کی عزیز دار خواتین صنم کے ہاتھ پر پڑے پان کے پتے پر چٹکی بھر حنا لگاتیں اور تھوڑی سی مٹھائی اس کے منہ میں دیتیں۔

اور اس کے سر پر پیسے وارتیں تاکہ وہ نظر بد سے بچی رہے۔ میری والدہ کی راہنمائی میں ہم سب نے بھی ناصر کو اسی طرح مہندی لگائی۔ گھر میں جشن کی فضاء اچانک اس وقت ختم ہو گئی جب ایک ملازم بھاگتا ہوا ہم تک آیا۔ "پولیس دروازے پر ہے "اس نے کہا اور پورے کمرے میں ایک خوفناک خاموشی چھا گئی۔ میں نے سوچا پولیس مجھے پکڑنے آئی ہے۔ لیکن ہمارا ہیڈ ملازم خبر لایا کہ وہ میری والدہ کی گرفتاری کے لئے آئے تھے۔ مہمانوں کی سانس رُک گئی۔ ممی کے لئے ایک اور نظر بندی مہلک ہوگی۔ "ان کو اندر بلالو، دوست محمد! میں نہیں چاہتی کہ ہمارے مہمانوں کی موجودگی میں وہ دروازے توڑیں" میری والدہ نے سکون سے کہا۔ پولیس جو مضطرب دکھائی دیتی تھی اندر آگئی۔ "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میری والدہ نے اپنی بیماری کے باوجود بارعب لہجے میں پوچھا۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے مارشل لاء کا حکم دکھایا۔ یہ ان کی گرفتاری کے لئے نہیں تھا۔ خدا کا شکر ہے بلکہ ان کے لئے اطلاع نامہ تھا کہ انہیں پنجاب بدری کا حکم دیا گیا تھا۔ ان کا ابھی کوئی ارادہ پنجاب جانے کا نہیں تھا۔ اور ضیاء کو اس بات کی خبر تھی۔ اس کا مقصد صرف ہمیں پریشان کرنا تھا اور ہماری خوشیوں کو تہ و بالا کیونکہ وہ بھٹو خاندان کی خوشیاں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اور یہ پریشانی بڑھتی گئی۔ اگلی صبح شادی پر باجہ بجانے والوں نے جن کو میری والدہ نے پیشگی اطلاع دے کر بلایا ہوا تھا اچانک پیغام بھجوایا کہ وہ نہیں آرہے۔ "ان کو مائیکروفون کے استعمال کا اجازت نامہ نہیں مل سکا" انہوں نے بتایا مارشل لاء کے احکام کے مطابق لاؤڈ سپیکروں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ہمیں مطلق علم نہیں تھا کہ حکومت نے کوئی مداخلت کی تھی یا باجے والے ہی خوف زدہ تھے۔ یہ خوف زدگی ہمارے شادی کے مہمانوں تک پہنچ گئی جب حکومت کی خفیہ ایجنسیوں کے عملہ نے جو ۷۰ کلفٹن کی سڑک کے دوسری طرف اپنی گاڑیوں میں متعین تھے ان کی کاروں کی نمبر پلیٹوں کو نوٹ کر لیا۔ حکومت نے اس سے قبل مہمانوں کی فہرست حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ میری والدہ کے سیکرٹری نے اشک آلودہ آنکھوں کے ساتھ اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ حکومت نے اسے قرار واقعی نتائج کی دھمکی دی تھی اگر اس نے فہرست انکے حوالے نہ کی۔

.. اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کیڈٹ کالج حسن ابدال میں ایک نمائش دیکھ رہی ہیں۔ جنرل ٹکا خان اور جنرل نصیراللہ بابر ہمراہ ہیں۔

______ تمام ملک کو شادی کے بارے میں اندھیرے میں رکھا گیا۔ بھٹو خاندان کے کسی فرد کی کوئی خبر اخباروں کی زینت بننے نہیں دی جاتی تھی جب تک خبریں ان کے خلاف کوئی منفی پہلو نہ ہو۔ ویسے پاکستانی صحافی ان پابندیوں کو سر کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ صنم کی منگنی کا اعلان کرتے وقت انہوں نے یہ بھی تحریر کیا کہ ناصر کا دادا ہمارے اپنے دادا کی طرح ریاست جونا گڑھ کا وزیراعظم رہ چکا ہے۔ "ریاست جونا گڑھ کے دو سابقہ وزرائے اعظم کے پوتی اور پوتے کی شادی" خبر کی ہیڈ لائن دی گئی تھی۔ صنم کی شادی اور کراچی جیل سے میری عارضی رہائی کی خبر اس طرح دی گئی۔ "بہن، بہن کی شادی میں شامل ہوتی ہے"۔

۷۰ کلفٹن کے دروازوں کے اندر صنم کی شادی کو ذاتی خاندانی معاملہ ہی رکھا جائے گا۔ ہمارا فیصلہ تھا میری ہمشیرہ نے پہلے ہی کافی تکلیف اٹھائی ہے۔ اسے خواہ مخواہ سیاست کی خار زار دنیا میں کھینچا گیا جب کہ سیاست میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ صرف اس لئے کہ اس کے نام کا لاحقہ بھٹو تھا۔ اس نے ہارورڈ سے اکیلے ہی گریجوائٹ کا امتحان پاس کیا تھا۔ صرف دو ماہ بعد جب ہمارے والد کو قتل کیا گیا تھا۔ اسے اکسفورڈ میں داخلہ مل گیا تھا لیکن وہ اپنی توجہ تعلیم پر مرکوز کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی اور مجبوراً پاکستان واپس آ گئی تھی۔ لیکن انجام کیا ہوا؟۔ اپنے ہی گھر میں قیدی بن کر رہ گئی کیونکہ ۷۰ - کلفٹن میں وہ اکیلی تھی، ماں اور بہن کبھی گرفتار ہوتے کبھی جیل سے باہر اور دونوں بھائی جلاوطن تھے۔ اس کی دوستوں کا حلقہ بھی چھوٹا تھا وہ بطور بھٹو کے کسی قسم کی توجہ کو ناپسند کرتی تھی اور اپنے والد کے بارے میں سوالات کے جوابات سے احتراز کرتی تھی۔ وہ ان چند لوگوں سے ہی ملنا پسند کرتی تھی جن سے مدتوں سے پہچان تھی...... ان میں ناصر شامل تھا جو شاہ نواز اور میر کا ہم جماعت رہا تھا۔

صنم سے شادی مت کرو - حکومت تمہیں تباہ کر دیگی، اس کے چچاؤں نے ناصر کو متنبہ کیا تھا جب اس نے صنم سے شادی کی تجویز کا اظہار کیا۔ "یہ میرا فیصلہ ہے آپ کا نہیں" اس نے جواب دیا۔ "میں اس لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔ جو قیمت بھی مجھے ادا کرنا پڑے

میں اس کیلئے تیار ہوں۔ " اور اس نے قیمت ادا کی۔ حکومت کے پاس غیر پسندیدہ لوگوں کو سزا دینے کے کئی طریقے ہوتے ہیں:۔ ٹیکس کی تحقیقات شروع کرنا، پرمٹ روک دینا، زرعی اراضی کیلئے پانی بند کر دینا وغیرہ۔ اس ضمن میں ناصر کا کمزور پہلو ذرائع مواصلات کے سامان کا بزنس تھا جو وہ پاکستان کے حکومتی اداروں کو فروخت کیا کرتا تھا۔ ٹھیکوں میں اس کی بولیوں کو نظرانداز کیا جانے لگا اور اس طرح اس کے بزنس کو نقصان پہنچایا گیا..... اس کی فروخت ۷۵ فیصد کم ہوگئی۔ وہ اور صنم اب لندن میں رہتے ہیں جہاں ناصر کو سب کچھ نئے سرے سے شروع کرنا پڑا۔ تاہم اپنی شادی کے بعد وہ خوش و خرم ہیں۔

اس کے سر پر قرآن مجید کا سایہ کرتے ہوئے، میری والدہ اور میں نے صنم کو سیڑھیوں سے نیچے اترنے میں مدد دیتے ہوئے سامنے ہال میں تیار کی گئی نکاح کی اسٹیج تک اس کی راہنمائی کی۔ صنم نے اس رسم کے موقع پر سبز ساڑھی زیب تن کی۔ سبز رنگ ہمارے ہاں خوشی کا رنگ متصور ہوتا ہے۔

"کیا تم ناصر حسین ولد نسیم عبدالقادر کو بطور اپنے خاوند کے قبول کرتی ہو؟ " ہمارے چچازاد عاشق علی بھٹو نے پوچھا۔ اس پر صنم مجھے اور والدہ کو دیکھ کر مسکرائی اور خاموش رہی یہ جانتے ہوئے کہ عاشق علی دو گواہوں کی موجودگی میں یہی سوال تین بار پوچھے گا۔ اس نے دوبارہ پوچھا وہ پھر بھی چپ رہی۔ اسلام کے مطابق لازمی ہے کہ عورت سمجھتی ہو اور اپنی آزادانہ مرضی سے شادی پر رضامند ہو۔ تیسری مرتبہ سوال دہرائے جانے پر صنم نے بالآخر "ہاں" کردی اور شادی کے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ عاشق علی یہ اچھی خبر لے کر دوسرے کمرے میں مجتمع مردوں کے پاس گیا۔ مولوی صاحب نے ناصر کو کلمات پڑھائے اور میری بہن صنم بھٹو خاندان کی وہ پہلی خاتون بن گئی جس نے اپنی مرضی کے مطابق شادی کی۔

ناصر کے دو قریبی دوست اسے ڈائس پر لائے اور دلہن کے قریب بٹھایا۔ ناصر کی خالہ زاد اور چچازاد لڑکیوں اور دوستوں نے ایک ریشمی شال دونوں کے سر پر سائبان کی طرح رکھی اور ان کے درمیان رکھ کر مصحف آرسی کی رسم ادا کی۔ میں نے اپنے آنسوؤں پر

ضبط کیا جب صنم اور ناصر نے شریک، حیات بن کر آئینے میں پہلی مرتبہ ایک دوسرے پر نگاہ ڈالی۔ ڈائس گلاب، گیندے اور یاسمین کے پھولوں کے ہاروں سے لدا ہوا تھا۔ رات کے وقت ہر طرف بھینی بھینی خوشبو پھیل رہی تھی صنم اور ناصر نیلے مخملیں سٹولوں پر بیٹھے تھے اور ان کے گرد میزوں پر میٹھے بادام، سونے میں منقش انڈے، اخروٹ اور خشک پھل چاندی کے اوراق میں لپٹے ہوئے رکھے تھے۔ شمعیں ان کے عقب میں شمع دانوں میں جل رہی تھیں اور ان کی زندگی ہمیشہ روشنی میں گزرنے کی علامت بن گئی تھیں۔ صنم کی کامیاب خالہ زاد سہاگنوں نے پسی ہوئی شکر دونوں پر واری تاکہ ان کا مستقبل ایسا ہی میٹھا رہے۔ پٹاخوں کی گڑگڑاہٹ فضا میں پھیل گئی۔ جشن کی خوشیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔

میری والدہ اور میں صنی اور ناصر کے ہمراہ بیٹھ گئیں جبکہ مہمانوں نے مبارک باد دینے کیلئے قطار باندھ لی۔ ان میں سے اکثر جیل کاٹ چکے تھے۔ اور یہ ان کے کمزور جسموں سے مترشح تھا۔ "تم کتنی ٹھیک ٹھاک نظر آ رہی ہو!" انہوں نے مجھے کہا۔ میرا خیال تھا ان کا مطلب تھا کہ حکومت کے ہتھکنڈوں کے باوجود تمہیں توڑ نہیں سکے جیسے میرے والد سپریم کورٹ میں پیشی کے باوجود حواس باختہ نہیں تھے۔ "تمہیں دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور میں اسی کلمے کو دہراتی رہی۔ میرا سر فخر سے بلند تھا اگرچہ باطن میں میں ہل چکی تھی۔

"کیا مجھے پھر جیل جانا ہوگا؟" حکام نے ابھی تک مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہجوم میں مجھے اپنا وکیل مجیب نظر آیا جس نے مجھے بتایا کہ اگلی صبح اس کی ہوم سیکرٹری سے ملاقات طے ہے۔ چونکہ میری نظر بندی ایک ہفتے سے کم دنوں میں ختم ہونے والی تھی، وہ حکام سے کہے گا کہ مجھے باقی ماندہ مدت کیلئے ۷۰ - کلفٹن ہی میں رہنے کی اجازت دیدیں۔

جب مہمان اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، تو میں نے وہ میگزین اور اخبارات جمع کرنے شروع کر دیئے جو میرے جیل جانے کی صورت میں میں اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرونگی۔ اور اگر ممکن ہوا تو صفائی کے تولیوں کا پیکٹ اور کیڑے مار دوائی کی بوتل بھی۔ میں تمام رات جاگتی رہی...... اپنی خالہ زاد بہنوں سے اور سمیعہ سے باتیں کرتی رہی اور

ہارورڈ اور آکسفورڈ کے اپنے پرانے دوست پیٹر گلبریتھ کو آخری لمحے ایک خط بھی لکھا۔ پیٹر کے زیرانتظام امریکی سینٹ کی تعلقات خارجہ کمیٹی کی طرف سے جنوبی ایشیاء کا قلمدان تھا، میری والدہ نے مجھے بتایا، اور وہ کچھ عرصہ پہلے امریکی دفاعی مفادات کے سلسلہ میں پاکستان کا دورہ کر چکا تھا۔ اس نے کراچی سنٹرل جیل میں مجھ سے ملاقات کی کوشش کی تھی۔ اس نے بتایا، لیکن حکومت نے اس کی درخواست پر خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ بعد میں اس نے تمام کارروائی کا احوال مجھے بتایا۔

پیٹر گلبریتھ ، اگست ۱۹۸۱ء

میں سینٹ کی خارجہ تعلقات کی کمیٹی کے اقلیتی گروپ کے رہنما سینیٹر کلے بورن پیل کا خط پاکستان لیتا گیا جس میں حکومت سے میری بے نظیر سے ملاقات کے اجازت نامے کی درخواست کی گئی تھی۔ میں نے وزارت خارجہ پاکستان اور امریکی سفارتخانہ میں پرزور حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی حالانکہ اس وقت امریکی سفارت کار بھٹو خاندان کے کافی مخالف تھے۔

حکومت نے سینیٹر پیل کی اور میری درخواست کو بالکل درخوراعتنا نہیں سمجھا۔ اگرچہ امریکی سفارت خانے نے بھٹو خواتین سے میرے تعلقات کی کافی حوصلہ شکنی کی، میں نے بیگم بھٹو سے ملاقات کیلئے ۷۰ - کلفٹن کے چکر لگائے، وہ زرد اور بہت تھکی تھکی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ بے نظیر کی سکھر اور کراچی جیلوں میں پچھلے پانچ مہینوں سے مقید رہنے پر بہت زیادہ فکرمند تھیں۔

بیگم بھٹو نے مجھے اپنے، صنم اور فخری کے ساتھ کراچی بوٹ کلب میں جانے کیلئے مدعو کیا۔ جب ہم ۷۰ - کلفٹن سے روانہ ہوئے، بیگم بھٹو نے مجھے مسکرانے کیلئے کہا تاکہ حکومت کے حفاظتی عملہ کے افراد سڑک کے دوسری طرف ایک کار سے اپنے دوربین کیمروں کے ذریعے تصویریں کھینچ لیں۔ دوپہر کے کھانے کے دوران میرا ذہن برابر پنکی کی قید کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخری بار میں اسے جنوری ۱۹۷۷ء میں آکسفورڈ میں ملا تھا۔

پنکی ابھی آکسفورڈ یونین کی صدر منتخب ہوئی تھی اور صدارتی دفتر میں زیر تعلیم طلباء سے اظہار انسیت کیلئے عدالت لگائے بیٹھی تھی۔ اس وقت سے پنکی کی زندگی نے ناقابل توقع اور ناقابل فہم جہت اختیار کرلی تھی۔ میں اس کی گھر واپسی، باپ کے تختہ الٹنے، زندگی بچانے کا مقدمہ لڑنے اور پھر زندگی ہارنے کی داستان پر غور کرتا رہا اور پنکی کے بارے میں بھی کہ اسے قید میں کتنا طویل عرصہ گزارنا پڑا اور کن خوفناک حالات میں۔ چونکہ میں نے حقوق انسانی کے بیشتر مقدمات سنے میں جانتا تھا کہ ایسا ہوتا ہے لیکن یہ پھر بھی ناقابل تصور تھا کہ میری ایک ساتھی بھی اس شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے۔ جب میں بوٹ کلب سے روانہ ہوا، تو میں نے ایک طویل اطلاع نامہ بنام بے نظیر بیگم بھٹو کو دیا جو میں نے ایک شب پیشتر وکیل کے پیڈ پر تحریر کیا تھا۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں واپسی پر میں نے پاکستان کو متوقع امداد پر تعلقات خارجہ کمیٹی کیلئے ایک رپورٹ تیار کی۔ رپورٹ میں ثابت کیا گیا کہ امداد دینے کی وجہ سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کو ایک غیر عوامی فوجی آمریت کے حمائتی قرار دیئے جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہئے اور ایسی صورت میں ایران میں امریکی تجربے کو دہرانا لاحاصل امر ہوگا۔ میں نے ایک طاقتور حقوق انسانی پالیسی کے نفوذ پر زور دیا تاکہ یہ تنبیہ کے طور پر استعمال کی جاسکے اور دوسرے ممالک کو پتہ چلے کہ ہماری امداد جمہوری ملکوں اور حکمرانوں کو فائدہ پہنچانے کیلئے تھی۔ ذاتی حیثیت میں میں نے سینیٹر پیل اور کمیٹی کے سربراہ سینیٹر چارلس پرسی کو رپورٹ دی کہ بھٹو خواتین سے کس طرح کا سلوک کیا جارہا ہے۔ دونوں ان کی امداد پر کمربستہ تھے۔ میری خواہش تھی کہ بے نظیر کو بھی پتہ چل جائے کہ اسے بھلایا نہیں گیا۔

سورج ابھی کراچی میں طلوع ہی ہوا تھا جب میں نے پیٹر کا دلچسپ خط پڑھا اور بار بار پڑھا۔ اس میں اس کی بیوی این اور ان کے بیٹے کی پیدائش کی خبر بھی درج تھی۔ سادہ دنوں کی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں میں نے اسے جواب میں لکھا۔

۱۰ر ستمبر ۱۹۸۱ء

ڈیئر پیٹر

کل شب صنمی کی شادی تھی۔ آج تمام گھر گہری نیند میں ہے۔ اس وقت صبح کے ۰۰ - ۶ بجے ہیں اور میری آزادی کے چند گھنٹے ابھی باقی ہیں۔ میں جلد ہی جواب دینا چاہتی ہوں تاکہ بتاسکوں کہ تمہارے خط نے مجھے حقیقی خوشی عطا کی۔ مجھے تمہاری خبر ملی اپنے دوستوں کی خبر ملی اور یہ کہ تم زندگی میں بہت کامیاب جارہے ہو۔ تمہاری خبر اور تمہارے بھائی جیمی کی کامیابی کیلئے میں ہمیشہ دعاگو ہوں۔

ہارورڈ کی پرانی یادیں اور ماضی کی آوازیں جو معصومیت کی عمر کو تازہ کرتی ہیں ایک طرح سے اب بے چین بھی کرتی ہیں۔ کیاانہوں نے ہمیں پڑھایا تھا کہ زندگی اتنے خوفناک خطرات اور المیوں سے لبریز ہوسکتی ہے؟ کیاوہ الفاظ ہی تھے جو ہمیں سکھائے گئے یاایک طرح سے ہم سیکھ ہی نہ سکے یا شائد ان کے مطالب میری فہم سے بعید تھے۔ آزادی اور حریت. وہ مضامین جو ہم نے تحریر کئے اور جو مسودات اپنے اتالیقوں کیلئے تیار کئے تاکہ اچھے گریڈ مل سکیں، کیاہم صحیح معنوں میں جانتے تھے کہ وہ الفاظ جن پر ہم بحث و مباحثہ کرتے تھے ان کی کیا قدروقیمت ہے؟ ان کی وہی قیمت ہے جو ہمارے لئے ہوا کی ہے جس کے بغیر سانس لینا دوبھر ہوجائے...... جو ہمارے لئے پانی کی ہے جسے ہم پیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی زندگی کی تیزوتند حقیقتیں ورمونٹ کی برفوں اور ہارورڈ کے صحنوں سے بہت بعید ہیں۔ بعد میں صبح کے وقت ہی میں ممی کے سونے کے کمرے میں چائے لیکر گئی توانہوں نے مجھے اپنے پاس ٹھہرنے کیلئے کہا. "ہوسکتا ہے مجیب سے ہم دونوں اکٹھے کوئی اچھی خبر سنیں" انہوں نے مزید کہا۔ تھوڑی دیر بعد، میرا وکیل پہنچ گیا۔ ہوم سیکرٹری نے میری درخواست مسترد کردی ہے. جب تک میں یہ لکھ کر نہیں دیتی کہ سیاست پر پابندی کی خلاف ورزی نہیں کرونگی، اس وقت تک مجھے جیل میں رکھا جائے گا۔ اس نے مجھے بتایا پولیس صبح ۰۰ - ۱۰ بجے آئی۔ میرے رشتے دار اور گھر کا عملہ مجھے الوداع کہنے کیلئے صحن میں جمع ہوگیااور کچھ لوگ چلتی کار

کے پیچھے بھی دوڑتے رہے۔ کلفٹن کے بعد ایرانی سفارتخانہ کے پاس سے گزرے۔ کلفٹن باغ جہاں بچے پتنگ اڑا رہے تھے، روسی سفارتخانہ۔ لیبیا کا سفارت خانہ اور پھر اٹلی کا سفارت خانہ سب کے پاس سے گزرتے گئے۔ جیل کے عقب کی گلیوں میں سے کار اپنی پوری رفتار پر بجلی کی طرح گزر گئی۔

کراچی سنٹرل جیل میں جیلر کی چابیوں سے تالے کے بعد تالا کھولنے کی مانوس آوازوں نے میرا استقبال کیا۔ میں بلند خشتی دیوار میں بنائے گئے چھوٹے فولادی دروازے میں سے تیزی سے گزری اور اپنی کمر سیدھی رکھے ہوئے بے دریچہ مٹی کی راہداری میں سے گزرتے ہوئے اپنے وارڈ میں پہنچ گئی۔ میں کسی کو یہ تصور کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ دو دن کی آزادی نے مجھے سست بنا دیا ہے۔ مجھے امید تھی کہ وہ میری تلاشی نہیں لیں گے۔ ۷۰ - کلفٹن چھوڑنے سے پہلے میں نے میگزین اور اخبارات اپنے بیگ میں ٹھونس لئے تھے۔ جب میں آرام سے اپنی کوٹھڑی میں پہنچ گئی، تو بجلی معمول کے مطابق غائب تھی۔ فی الفور میں نے شکایت کی اطلاع دی۔ اگلے دوروز میں بیمار رہی اور صفراء کی قے کرتی رہی۔ آیا یہ نفسیاتی تھی یا حقیقی، میں کچھ کہہ نہیں سکتی مگر میں بیمار تھی۔

تیسرے روز، ۱۳ر ستمبر کو میں نے کچھ بہتری محسوس کی۔ ایک جیلر ڈسٹرکٹ مارشل لاء انتظامیہ کا ایک غیر متوقع تو نہیں مگر مایوس کن حکم لے کر نازل ہوا۔ کراچی سنٹرل جیل میں میری نظر بندی میں مزید تین ماہ کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ میں نے اب اپنی بروز بدھ دعا کا ورد ہفت روزہ کی بجائے روزانہ شروع کر دیا۔ اس ورد کا خاطر خواہ نتیجہ پہلے تو نکلتا رہا تھا۔ شاید روزانہ ورد کرنے سے میری کوٹھڑی کے دروازے دوسرے اور تیسرے بدھ کے درمیانی دنوں میں ہمیشہ کیلئے کھل جائیں گے۔ ورد کے کماحقہٗ اثرات کیلئے میں نے ۳۰ر ستمبر یعنی دعا کا تیسرا بدھ متصور کیا۔ ناکامی کی صورت میں اوائل اکتوبر کا بدھ ہوگا جب مارگریٹ تھیچر کی پاکستان آمد متوقع تھی۔

ضیاء کو مجھے ایک دن تو آزاد کرنا تھا اور میں متوقع تاریخوں کی منتظر رہتی، جن پر میں نے اپنی امیدوں کا تاروپود بن رکھا تھا۔ میں مارگریٹ تھیچر کو تب سے جانتی تھی جب وہ بطور

سربراہ حزب مخالف وزیراعظم ہاؤس راولپنڈی میں میرے والد سے ملنے آئی تھیں۔ میں دوبارہ لندن میں ایوان زیریں میں ان کے دفتر میں چائے پر اس وقت ملی تھی جب میں اکسفورڈ یونین کی صدر تھی۔ اگر تھیچر کی آمد پر مجھے رہا نہ کیا گیا تو شائد عید پر رہا کر دی جاؤں جو اس سال ۹ر اکتوبر کو منائی جائے گی۔ حکومت ہمیشہ رمضان کے آخر میں مذہبی فریضہ کے تقدس میں ہمیشہ چند قیدیوں کو رہا کر دیتی ہے۔

ان تاریخوں میں سے کسی دن بھی مجھے رہا نہیں کیا گیا۔ چودھری ظہور الٰہی جو ضیاء الحق کی فوجی کابینہ میں ایک وزیر تھا جس نے وہ قلم ضیاء سے بطور تحفہ وصول کیا تھا جس سے اس نے میرے والد کی موت کے وارنٹ پر دستخط کئے تھے اور جس نے میرے والد کے پھانسی دیئے جانے پر مٹھائی تقسیم کی تھی لاہور میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کار میں سوار مولوی مشتاق حسین زخمی ہو گیا تھا۔ یہ شخص لاہور ہائی کورٹ کا سابق چیف جسٹس تھا جس نے میرے والد کو سزائے موت دی تھی۔ کار میں سوار تیسرا شخص ایم - اے رحمان تھا جو زخمی ہونے سے بچ گیا تھا۔ یہ میرے والد کے مقدمہ قتل میں خصوصی پبلک پراسیکیوٹر تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ خدائی انتقام ہے۔ میں نے اخبار میں ظہور الٰہی کے قتل کی خبر پڑھی۔ "اب اس کی بیوی، اس کی بیٹی اور اس کے خاندان کو پتہ چلے گا کہ غم کس چیز کا نام ہے؟" میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیا۔ "میں خوشی کا اظہار تو نہیں کرتی کیونکہ کسی کی موت پر مسلمان کیلئے خوشی کا اظہار جائز نہیں۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اس امر سے تسلی ضرور حاصل ہوتی ہے کہ برائی کرنے والے سزا سے بچ نہیں سکتے"۔

میری تشفی عارضی تھی۔ حکومت نے اعلان کیا کہ اس آخری تشدد کی ذمہ دار ایک مرتبہ پھر الذوالفقار ہے اور پھر گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ میر نے کوئی مدد نہیں کی جب قتل کے تیسرے روز بی بی سی کے ساتھ انٹرویو میں اس نے الذوالفقار کے نام پر ساری ذمہ داری خود قبول کر لی۔ حملے پر ایک بحث چھڑ جاتی تو ظہور الٰہی کا شیطانی کردار سامنے آتا جو اس نے میرے والد کی موت میں ادا کیا، لیکن اب ساری توجہ الذوالفقار کے مفروضہ اراکین کو ختم کرنے پر مرکوز ہو گئی۔

دہشت گرد! قاتل! سیاسی ظالم! اخبارات کی شہ سرخیاں چیخ رہی تھیں۔ ایک مرتبہ پھر حکومت نے سیاسی مخالفوں کو کچلنے کیلئے الذوالفقار کا نام استعمال کرنا شروع کر دیا۔ پی پی پی کے ایک کے بعد دوسرے نوجوان راہنما کو زیر حراست لیا گیا اور ہزاروں دوسرے کارکنوں کی گرفتاری کیلئے وارنٹ جاری کئے گئے...... چار نوجوان مرد ہری پور جیل لے جائے گئے اور انہیں بری طرح اذیت دی گئی۔ ان میں سے ایک کا والد، مجھے بعد میں علم ہوا، احمد علی سومرو پی پی پی کے ایک اذیت یافتہ رکن کی ملاقات کیلئے آیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو دور سے دیکھنے کیلئے بہت بڑی رقم پولیس کو پیش کی تاکہ اسے یہ یقین ہو جائے کہ اس کا بیٹا زندہ ہے یا مردہ۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق صرف ہری پور جیل میں ۱۰۳ قیدی تھے جبکہ ایک نزدیکی قصبے میں ۲۰۰ افراد محبوس تھے۔

خواتین کو بھی دوبارہ گرفتار کیا جانے لگا۔ ناصرہ رانا شوکت کو لاہور قلعہ میں بھجوا دیا گیا۔ ایک مرتبہ پھر پی پی پی کے جنرل سیکرٹری کی بیگم کو بجلی کے جھٹکے دیئے گئے اور ۲۳ دن تک بغیر نیند کے پوچھ گچھ جاری رکھی۔ "قتل میں اپنے خاوند کو ملوث کرو" اسے حکم دیا گیا۔ "بے نظیر کو ملوث کرو، بیگم بھٹو کو ملوث کرو"۔ اس بہادر خاتون نے کیا کچھ اذیتیں برداشت کیں، سمجھ سے باہر ہے۔ اگلے سات مہینوں تک اسے ایسی کوٹھڑی میں رکھا گیا جہاں رفع حاجت کی کوئی آسائش موجود نہیں تھی...... صرف ایک کنالی تھی جسے ہفتے میں دوبار بدل دیا جاتا۔ اس نے پورا موسم سرما بغیر سوئیٹر، بستر اور کمبل کے سیمنٹ کے ٹھنڈے فرش پر گزارا اور نمونیا سے مرتے مرتے بچی۔ جب بالآخر اسے گھر میں نظر بند کیا گیا تو نہ ہی چلنے اور نہ ہی بولنے کے قابل تھی۔

ظلم و بربریت کی اس نئی لہر کے دوران، مارگریٹ تھیچر اپنے دورے پر آئی۔ دو سال قبل بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق، یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی مغربی سربراہ حکومت پاکستان کے دورے کا سوچ بھی سکے گا۔ جب کہ ضیاء نے میرے والد کی زندگی بچانے کے سلسلہ میں تمام عالمی زعماء کی درخواستیں مسترد کر دی تھیں لیکن افغانستان پر سوویت حملے کے بعد مغرب نے اپنی تمام پابندیاں نرم کر دی تھیں۔ اس کے برعکس بی بی

ملک و قوم کی دعاؤں میں موجود -- بے نظیر بھٹو

سی کی رپورٹ کے مطابق اب برطانیہ ضیاء کے بین الاقوامی تشخص کو مثبت انداز میں تعمیر کرنے کی ہرممکنہ کوشش میں مصروف ہوگیا تھا۔ یہ جاننا قابل ستائش تھا کہ عالمی نظروں میں ضیاء ابھی بھی قابل نفریں قاتل تھا اور بیرونی طاقتوں کی سرپرستی کے بغیر اقتدار میں نہیں رہ سکتا تھا۔ تاہم اخبارات میں یہ پڑھ کر صدمہ ہوا کہ افغان مہاجرین کے ایک کیمپ کے دورے کے بعد مارگریٹ تھیچر نے ضیاء کو ایک سرٹیفکیٹ سے نوازا کہ وہ "آزاد دنیا کی آخری امید ہے"۔

مجھے اخبارات میں پڑھ کر بھی شدید مایوسی ہوئی کہ ریگن انتظامیہ امریکی امداد بحال کرنے کی خاطر اپنی کانگریسی مہم میں دانستہ پاکستان کی سیاسی حالت کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہی تھی۔ "بھٹو کی پی پی پی ہو سکتا ہے اس امداد کی مخالف ہو لیکن عام لوگوں کا بڑا ہجوم مخالف نہیں جو سمجھتا ہے کہ پاکستان کو اپنی حفاظت کیلئے پرانے متروک ہتھیاروں سے جنگ لڑنے پر مجبور کردیا گیا ہے۔" امریکہ کے پاکستان میں نامزد کردہ سفیر رانلڈ سپیئرز نے ماہ ستمبر میں سینیٹ کی تعلقات خارجہ کمیٹی کے روبرو تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ وہ مکمل طور پر غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔ اول تو پی پی پی ہی عام لوگوں کے بڑے ہجوم کی صحیح نمائندہ تھی اور دوسرے ہم نہ پہلے اور نہ اب ہی بیرونی امداد کے مخالف تھے لیکن صرف اس امداد کے جو پاکستان میں اب فوجی قبضے کو دوام بخشنے میں مدومعاون ثابت ہو۔ مگر اب سب دلیلیں معکوس ہوگئی تھیں۔ نائب وزیر مملکت جیمز برکلے جو تمام امدادی پیکیج کو منظم کرنے کا ذمہ دار تھا اس نے یہاں تک تصدیق کی کہ انتخابات "پاکستان کی سلامتی کے مفاد میں" نہیں ہیں جیسے کہ ہم بطور ایک جمہوری پارٹی ان کے دشمن تھے اور آمر دوست تھا۔

مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا کہ شہ سرخیوں کے پیچھے بعض امریکی سیاستدان مسٹر برکلے کے اخذ کردہ نتائج کو خاموشی سے چیلنج کر رہے تھے۔ پیٹر گلبریتھ واشنگٹن واپس پہنچ چکا تھا۔ اور اس کا مصمم ارادہ تھا کہ وہ پاکستان میں حقوق انسانی کی خلاف ورزی کے مسئلے کو اٹھائے گا اور میری رہائی کی کوشش کریگا۔ سینیٹر پیل کی معیت میں، پیٹر نے براہ راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ ہر مرتبہ جب امریکی سینیٹ میں پاکستان کا مسئلہ پیش کیا جائے وہ انسانی حقوق

اور میری نظربندی کے مسائل پیش کریگا۔ نہ ہی امریکی انتظامیہ اور نہ ہی ضیاء کی آمریت کو پاکستان میں سیاسی قیدیوں کے مسئلہ کو بھلانے کی اجازت دی جائے گی۔ بالآخر انہیں امید تھی کہ اس قدر دباؤ بڑھایا جائے گا کہ حکومت پاکستان فیصلہ کرے کہ مسلسل میری اور دیگر افراد کی غیر منصفانہ نظربندی کے مسئلہ کا سامنا کرنے کی بجائے بہتر ہے کہ مجھے رہا کر دیا جائے۔

بہت بعد میں مجھے پتہ چلا کہ کس طرح سنیٹر پیل نے جو پاکستان کو دوبارہ امداد دینے کا مخالف تھا اپنی چال پر عملدر آمد کرانے میں کامیاب ہوا۔ "ایف - ١٦ ضیاء حکومت کی امریکی امداد کا واضح نشان تھا" انڈیا ٹوڈے نے سنیٹر پیل کو نائب وزیر مملکت برکلے کو کہتے ہوئے رپورٹ کیا۔ "ایمنسٹی انٹرنیشنل نے یقین سے کہا ہے کہ پاکستان میں حقوق انسانی کی خلاف ورزی ایک مستقل وطیرہ بن چکا ہے۔ کیا تم محسوس کرتے ہو کہ وہ ٹھیک کررہے ہیں؟" جب مسٹر برکلے نے مبہم انداز میں جواب دینے کی کوشش کی، تو سنیٹر پیل نے واضح طور پر حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صدر ضیاء پھانسی دیئے گئے یا قتل کئے گئے سابق وزیراعظم بھٹو کی بیوہ اور بیٹی کے خلاف انتقامی کارروائی کررہا ہے"۔ سنیٹر نے الزام لگایا۔ "مجھے حیرانی ہے کہ کیا انتظامیہ نے بھٹو خاندان کی نظربندی اور بدسلوکی کے بارے میں حکومت پاکستان کو کوئی یاد دہانی بھی کرائی یا نہیں؟"۔ جواب میں، نائب وزیر مملکت برکلے نے وعدہ کیا کہ وہ "خفیہ سفارت کاری" کے ذریعے کوشش جاری رکھے گا جس کا مطلب کچھ نہ کرنے کا ہوتا ہے۔ لیکن سنیٹر پیل نے اپنا مطلب بیان کردیا تھا۔

امریکی کانگرس میں نئی انتظامیہ کی درخواست کی روائتی توقیر اور افغانستان کے بارے میں ان کی بے چینی نے دوسرے معاملہ کو پس پشت ڈال دیا۔ جس میں سنیٹر پیل اور دیگر اراکین کے ضیاء کے حقوق انسانی کے ریکارڈ اور پاکستانی نیوکلیائی پروگرام پر اعتراضات شامل تھے۔ جب کہ کانگرس نے مجوزہ امدادی پیکیج منظور کرلیا، سنیٹر پیل اپنے ہم پیشہ افراد سے مل کر یہ ترمیم پاس کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ "پاکستان کی امداد منظور کرتے

ہوئے، کانگرس چاہتی ہے کہ پاکستان میں شہری آزادیوں کی مکمل بحالی ہو اور ایک نمائندہ حکومت جلد تشکیل دی جائے" اگرچہ پیل کی ترمیم کا عملی طور پر اثر نہیں ہوا تاہم ضیاء کی آمریت کے محل پر ایک چھوٹا سا دھماکہ تو ممکن ہوا۔

کراچی سنٹرل جیل میں عید آئی اور گئی مگر میری رہائی ممکن نہ ہوئی۔ پٹھان میٹرن نے مجھے بتایا کہ جن قیدیوں کو اس تعطیل پر رہائی دی گئی تھی اس میں سیاسی قیدی بھی شامل تھے۔ جس سے مجھے ان کے اور ان کے اہل خانہ کیلئے بہت خوشی محسوس ہوئی۔ جیل کے عملے نے بھی عید پر جوش و جذبہ کے ساتھ میری خاطر خواہ پذیرائی کی۔ ایک جیلر کی بیوی نے میری ایک قمیض منگوائی تاکہ وہ میرے لئے عید کا لباس بنوا سکے جب کہ ایک اور جیلر نے مجھے پیغام بھجوایا کہ وہ سامنے کی ڈیسک پر بیٹھ کر حکام پر اس وقت تک دباؤ ڈالتا رہے گا جب تک میری کوٹھڑی کے بلاک کی بجلی بحال نہیں کی جاتی۔ "مجھے امید ہے کہ ایسے لوگوں کو اچھے وقتوں میں یاد رکھا جائے گا،" میں نے اپنی ڈائری میں لکھا تاہم ہر ایک سیاسی قیدی جسے عید پر رہا کیا گیا اس کے بدلے میں دس کو گرفتار بھی کیا گیا۔ طلباء کے رہنما لالہ اسد کی، میں نے اخبار میں پڑھا، شکاری کتوں کی طرح تلاشی جاری تھی۔ لالہ اسد پارٹی کا وفادار حمائتی تھا اور میری دعا تھی کہ وہ پولیس کے ہاتھوں سے پھسلا رہے۔ ۱۹۸۱ء میں اپنی مدت آزادی کے آخری دنوں میں جب میں طلباء کو مارشل لاء کے خلاف احتجاج کرنے کی پاداش میں جیل کاٹنے پر تہنیتی سرٹیفکیٹ دینے کیلئے خیرپور گئی، تو میں لالہ اسد کے بیٹے ذوالفقار۔ (اس کا نام میرے والد کے نام پر رکھا گیا تھا) کی سالگرہ منانے کیلئے اس کے گھر گئی۔ لالہ اسد نے میرے والد کی حمایت میں دو سال قید بامشقت کی سزا کاٹی تھی۔ اس کے والد نے جو مغربی پاکستان کی کابینہ میں وزیر رہ چکے تھے اور پاکستان کی آزادی کیلئے قائداعظم محمد علی جناحؒ کے شانہ بشانہ لڑے تھے میرے دورے کے دوران مجھے ملنے کو کہا۔ بیمار اور بستر استراحت پر لیٹے رہنے والے بوڑھے آدمی نے مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کے بیٹے کو سیاست چھوڑنے پر راضی کروں۔

"میں نے زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہنا" لالہ اسد کے والد نے مجھے کہا،" میں نے اپنے

بیٹے کی سیاسی زندگی میں کبھی مداخلت نہیں کی جب مسٹر بھٹو جیل میں تھے۔ لیکن اب جبکہ وزیراعظم ہم میں نہیں ہیں، مجھے بیٹے کی اپنی نگہبانی اور اس کی اپنی بیوی اور بچے کیلئے اشد ضرورت ہے۔ جب میں دنیا سے چلا جاؤں تو اسے تمہارے لئے اور تمہاری پارٹی کیلئے کام کرنے کی آزادی ہوگی۔ لیکن اپنی بقیہ زندگی کیلئے مجھے اپنے بیٹے کی ضرورت ہے"۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں لالہ اسد سے بات کرونگی اور میں نے کی۔ مجھے پتہ نہیں کہ میرے جانے کے بعد کیا ہوا کیونکہ ایک ماہ بعد مجھے گرفتار کرلیا گیا اور سکھر جیل میں بھیج دیا گیا۔ اب ایک سال بعد لالہ اسد کو الذوالفقار کے راہنما کے طور پر تلاش کیا جارہا تھا۔ مجھے علم نہیں کہ الزام درست تھا یا غلط۔

دہشت گردی، تشدد، کیا اس چکر کے خاتمہ کا کوئی طریقہ نہیں ہے؟ صرف پچھلے چند مہینوں میں تین صدور ہلاک ہوگئے تھے۔ بنگلہ دیش کا صدر ضیاء الرحمٰن، ایران کے صدر رجائی اور چند دن پہلے ۶ر اکتوبر کو مصر کے انوارالسادات۔ مجھے صدر سادات کی ہلاکت پر بہت افسوس ہوا اس کے اہل خاندان پر اور اس کی بہیمانہ موت پر بھی۔ بچپن میں. میں ان کے پیشرو جمال عبدالناصر کی بہت مداح تھی۔ خاص طور پر نہر سویز کی جنگ میں برطانوی نو آبادیاتی اور امریکی سامراجی پالیسیوں کے خلاف لڑنے کی بنا پر مجھے ان کی بہت قدر تھی۔ ناصر میرے لئے ایک دیو پیکر شخصیت تھی جو کل کے متروک بادشاہوں اور شہنشاہوں کی مٹی اور راکھ سے مساوات کی ایک نئی دنیا کی تعمیر میں کوشاں نظر آتی تھی۔ میں ۷۰ - کلفٹن میں اپنے والد کی لائبریری میں ناصر کے بارے میں ہر مطبوعہ کتاب پڑھنے میں گھنٹوں مصروف رہتی اور میں نے ان کی تصنیف کردہ کتاب "فلسفہ ء انقلاب" بھی پڑھی۔

میں سادات کی دلدادہ نہیں تھی جو اپنے ہی مربی کے خلاف ہوگیا تھا اور ۱۹۷۰ء میں مصر کی صدارت پر فائز ہوتے ہی اس کی پالیسیوں کے الٹ کام کرنا شروع کردیا تھا۔ لیکن اپنی کوٹھڑی میں سادات کی موت کی خبر پڑھ کر، غیر متوقع طور پر مجھ پر گہرا اثر ہوا۔ اگرچہ پاپا سادات کی اسرائیل کے ساتھ امن معاہدہ کی الگ تشکیل کے شدید ناقد تھے، سادات نے بہرحال میرے والد کی زندگی بچانے کی اپیل کی تھی۔ مصری صدر نے شاہ ایران اور اس کے

خاندان کو مصر میں پناہ دی تھی باوجودیکہ اسے اپنی شہرت کا نقصان اٹھانا پڑا۔ اور جب بادشاہ سرطان کے باعث وفات پاگیا، سادات نے اسے پورے شاہی اعزاز کے ساتھ دفنادیا۔ حالانکہ سیاست کی دنیا میں اس قسم کی فیاضی نایاب ہوچکی ہے اس نے سیاسی اختلافات اور تنازعوں کو اس راستے میں رکاوٹ نہیں بننے دیا جو اس کے خیال میں درست تھا۔ اب وہ بھی فوت ہوچکا ہے۔

ایک اداسی مجھ پر چھاگئی۔ رات کے بعد دوسری رات میں اپنی کشیدہ کاری میں مصروف ہوگئی۔ ۲۱ر نومبر کی رات جو میرے بھائی شاہ کا یوم پیدائش تھا، میں نے اپنا گلا گھٹتے ہوئے محسوس کیا اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ میں نے لیٹنے کی کوشش کی مگر آنسوؤں پر ضبط نہ کر سکی اور وہ بہتے چلے گئے۔ میرے بھائی کہاں تھے؟ وہ کیسے تھے؟ میر اور شاہ دونوں نے عید کے بعد شادی کرلی تھی۔ انہوں نے سابق سرکاری ملازم کی بیٹیوں یعنی دو سگی افغانی بہنوں فوزیہ اور ریحانہ سے کابل میں شادی کی تھی۔ ان کے بارے میں ہمیں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ ان مشکل اوقات میں میرے بھائیوں کو محبت، دل جمعی اور جذباتی سکون کے ذرائع میسر آگئے تھے۔ لیکن میں پھر بھی کیوں اداس تھی؟ میں پریشان خیالی کی نیند سوگئی۔ میر خفیہ طور پر پاکستان میں آچکا ہے۔ مجھے بار بار یہی خواب دکھائی دیا۔ وہ افغانستان سے پہاڑی دروں میں سے چلتا ہوا آیا ہے۔ دریائے سندھ کو عبور کیا ہے اور ۷۰ - کلفٹن میں ایک الماری میں چھپ گیا ہے۔ فوج نے گھر پر چھاپہ مارا ہے۔ جیسے ہی انہوں نے الماری کو کھولا، اور اسے وہاں دیکھا تو میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے غلط آفت رسیدہ کو دیکھا تھا۔ اگلی صبح میں نے اخبار میں پڑھا کہ پولیس نے لالہ اسد کو گولی ماردی ہے۔ میرے سر میں درد کی شدت بڑھ گئی۔ لالہ اسد پولیس کے ساتھ کراچی فیڈرل بی ایریا میں بندوق سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ اخباری رپورٹوں نے لکھا اور اس نے بھی ایک پولیس سپاہی کو قتل کردیا تھا۔ ایک مدت تک مجھے حقیقت کا پتہ نہ چل سکا۔ لالہ اسد درحقیقت، گولی چلنے کے وقت نہتا تھا۔ گولیاں چلاتے ہوئے ایک پولیس سپاہی کی

ملک و قوم کے لئے ہمہ وقت متفکر ۔۔ بے نظیر بھٹو

دوسرے سپاہی کو گولی لگی تھی۔ جب لالہ اسد نے ان کی گھات سے فرار ہونے کی کوشش کی تو اسے گولی کا نشانہ بنایا گیا اور سرد مہری سے ہلاک کر دیا گیا۔

لالہ اسد مردہ تھا۔ اب اس کا خون بھی جنرل ضیاء الحق کی وردی پر تھا۔ لالہ اسد کے والد کے کیا تاثرات ہونگے؟ اپنے آخری دنوں میں بیٹے کو اپنی حفاظت پر مامور دیکھنے کی بجائے وہ اس کی لاش وصول کر رہا ہو گا۔ یہ سب کچھ کب ختم ہو گا؟

"الذوالفقار کے دہشت گردوں کیلئے ایک ملک گیر مہم شروع کی گئی اور پولیس نے ہزاروں لوگوں کو گرفتار کرلیا" اخبار نے ۲۶ نومبر کو تحریر کیا۔ پولیس ملک بھر میں گھروں، نوجوانوں کے ہوسٹلوں اور ہوائی اڈوں میں تلاشی جاری رکھے ہوئے تھی۔ کراچی سے باہر جانے کے بحری، بری اور فضائی راستوں پر ناکے بٹھا دیئے گئے۔ خصوصی دوربینیں، پولیس کے حوالے کی گئیں تاکہ وہ کاروں کی کھڑکیوں پر میٹرھے شیشوں میں سے جھانک سکیں۔ میک اپ کرانے والے فن کاروں سے بھی پولیس نے رابطہ کیا تاکہ "مفروروں" کو بھیس بدلنے سے روکا جاسکے۔

میری پریشانی مزید بڑھ گئی۔ لالہ اسد کی موت پر پشیمانی سے مجھے بہت ذہنی تکلیف پہنچی۔ میں نے دعا کی کہ وہ مجھے میری بعض اوقات کی جھڑکیوں پر معاف کرے۔ میں نے ۷۰ - کلفٹن میں اس کی اور دوسرے طلباء کی تصویریں رکھنے پر اپنے آپ کو کوسا کیونکہ یہی تصویریں تھیں جو پولیس اپنے آخری چھاپے میں ساتھ لے گئی تھی۔ کیا انہوں نے انہی تصویروں کو اسے شناخت کرنے کیلئے استعمال نہیں کیا تھا؟

میں نے اپنے ہاتھوں کی پشت پر مکڑی کے جالے کی طرح پھیلی لکیروں کو دیکھا اسی طرح آنکھوں کے گرد، گالوں پر اور اپنی پیشانی پر لکیروں کا جائزہ لیا۔ میرا خیال تھا کہ سب کچھ سکھر میں گرم خشک موسم اور ہواؤں کا اثر تھا۔ لیکن وہ توانمٹ معلوم ہوتی تھیں۔ میں بہت تیزی سے بوڑھی ہوتی جارہی تھی۔

۱۱ر دسمبر کو جب میری نظر بندی ختم ہوگئی تو میں نئے احکام کی آمد کی منتظر تھی۔ مجھے علم تھا کہ اس گرفتاری کی تازہ مہم کے بعد وہ مجھے رہا نہیں کریں گے۔ میرا کھانا ایک گھنٹہ قبل پہنچ

چکا تھا۔ گھر والوں کو بھی "نئے نظر بندی کے حکم کی توقع تھی" لیکن سنیٹر پیل کے پیغام کے اثرات غالباً پاکستان میں نوٹ کر لئے گئے تھے۔ دو ہفتوں بعد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ غیر متوقع طور پر سہ پہر کے وقت مجھے ملنے آیا۔ "اپنا سامان باندھ لو" اس نے مجھے اچانک کہا۔ "تمہیں کل صبح ۵.۴۵ بجے پولیس کی نگرانی میں لاڑکانہ لیجایا جائے گا"۔ دن کے وقت جس میٹرن کی ڈیوٹی تھی وہ میرے جانے پر رو پڑی۔ پٹھان میٹرن بھی روئی اور اپنی معافی کی خواستگار ہوئی کہ شائد اسکی کسی بیوقوفی کی وجہ سے مجھے تکلیف اٹھانا پڑی ہو۔ میں روئی اور خود پر ہی روئی۔ اگرچہ میں نے گھر کی سب جیل میں منتقل ہونے کا خواب دیکھا تھا، مجھے کراچی سنٹرل جیل میں قائم کردہ خفیہ ایجنسیوں کے جال سے اچانک نکلنے پر خطرہ بھی محسوس ہو رہا تھا۔ ہمدرد جیلروں نے جو انٹرنیشنل ہیرلڈ ٹریبون، ٹائم اور نیوزویک کی وقتاً فوقتاً کچھ کاپیاں مہیا کی تھیں وہ مجھے بہت پسند آئیں۔ کراچی میں میں اپنی والدہ اور اپنی ہمشیرہ کے نزدیک تھی۔ اب المرتضٰی کے دیہاتی تنہائی کے ماحول میں ان سے بہت دور ہوں گی۔

۲۷ر دسمبر ۱۹۸۱ء کو پولیس علی الصبح ہی آدھمکی۔ میں نے اپنی خوفناک مرطوب کوٹھڑی کو آخری بار دیکھا۔ ایسی جگہ کو چھوڑنے پر میں کیسے غمگین ہو سکتی تھی؟ لیکن پھر بھی میں تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے سکھر کی مانوس فضا سے علیحدہ ہونے پر تھی۔ قید اور نظر بندی کے سالوں نے اپنا اثر دکھایا تھا۔ میں نامعلوم سے خوف کھانے لگ گئی تھی۔

باب ۱۰

سب جیل میں تنہائی کے مزید دو سال

مانوسیت، آسائش، گھر۔ اس حقیقت کو نظرانداز کرتے ہوئے کہ مسلح جوانوں کو گھر کی چار دیواری کے اندر متعین کر دیا گیا تھااور قید خانے کا عملہ میری نظر بندی کی نگرانی کے لئے ہر روز المرتضیٰ میں آتا تھا میں اپنی ظاہری خوش قسمتی میں عیاشی کر رہی تھی۔ گھر کے عملہ کے کچھ افراد کو دن کے وقت اندر آنے کی اجازت دی جائے گی، مارشل لاء حکام نے مجھے بتایا. میں ٹیلیفون کو استعمال کر سکتی تھی اور پندرہ دنوں میں تین ملاقاتیوں سے ملنے کی اجازت تھی دس مہینوں کی تنہائی کی نظر بندی کے بعد یہ مراعات کسی ۵ سٹار ہوٹل میں رہائش کے مترادف تھیں۔ میں نے پہلی شب گھر میں کافی دیر گرم پانی سے غسل کرنے اور اپنے ناخنوں کو تراشنے میں جشن کے طور پر منائی۔

لیکن میں نے جشن منانے میں عجلت سے کام لیا تھا...... میں ٹیلی فون پر اپنے رشتہ داروں سے گفتگو کر سکتی تھی مگر کسی سیاسی مسئلہ پر باتیں منع کر دی گئیں ٹیلی فون میں عموماً خرابی ہی رہتی تھی۔ اکثر میری کالیں کاٹ دی جاتیں یا لائن بالکل بے آواز ہو جاتیں بعد میں اس کا سبب معلوم ہوا کہ تمام فون کی لائنیں دیواروں سے باہر قائم کردہ فوجی مواصلاتی چوکی میں سے گزر کر جاتی تھیں۔

جس سال مجھے المرتضیٰ میں مقفل کیا گیا۔ پندرہ دنوں میں ملاقاتیوں سے وعدہ بھی ایک افسانہ بن گیا۔ صرف میری والدہ، صنم اور منا اجازت نامہ کی فہرست میں شامل تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کراچی میں رہائش پذیر تھی وہاں سے آنے کے لئے بذریعہ طیارہ اگرچہ ایک گھنٹہ صرف ہوتا تھا مگر یہ سفر اندرون سندھ پروازوں کے غیر معینہ اوقات نے مشکل بنا دیا تھا۔ لاڑکانہ میں میری سیاسی شناسائی تھی مگر جیل کے حکام ان میں سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں دیتے تھے...... دراصل میں تنہائی کی نظر بندی ہی میں واپس آ گئی تھی...... جب کبھی کوئی ملاقاتی آ جاتا، جو اکثر تو جیل کا ایک افسر ہوتا، میرا جبڑا نامانوس بولنے کی ورزش سے درد شروع کر دیتا۔ حقیقتاً مجھے اس لامتناہی خاموشی میں خود کلامی شروع کر دینا چاہئے تھی تاکہ کوئی تو انسانی آواز کانوں کی سماعت سے ٹکرائے مگر اس کا خیال ہی نہیں آیا۔ تاہم ہر تین ماہ بعد باقاعدگی سے نئے نظر بندی کے احکام آجاتے۔ ان کے الفاظ مجھے زبانی یاد ہوگئے تھے۔

"جب کہ ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی رائے ہے کہ مس بے نظیر بھٹو کو مارشل لاء کے مقاصد، پاکستان کی سلامتی، عوام کی بھلائی اور مفاد کے خلاف کام کرنے سے روکنے کیلئے اور مارشل لاء کی مستعد کار گزاری کے لئے یہ ضروری ہے کہ متذکرہ مس بے نظیر کو ...."

وقت ہمیشہ کی نسبت بہت مشکل سے گزرتا تھا۔ سہ پہر کو مطالعہ کے لئے کوئی اخبار بھی نہیں تھا۔ کوئی انٹرنیشنل ہیرلڈ ٹریبیون بھی نہیں تھا۔ ٹیلیویژن پر دیکھنے کیلئے کچھ بھی نہیں تھا۔ عربی زبان کے درسی پروگرام، سندھی، اردو اور انگریزی میں ضیاء کی خبریں، حکومت کی سیاسی کارکردگی پر مبنی دستاویزی فلمیں اور کچھ آدھ آدھ گھنٹہ کے ڈرامے میں خود رحمی کے جذبات اور ندامت کے حملوں میں گھری ہوئی پڑی رہتی۔ تمہیں اللہ تعالیٰ کی نااحسان شناسی نہیں کرنا چاہئے میں نے اپنی ہی مذمت کی۔ تمہارے پاس اپنا گھر ہے تم کھاتی ہو پہنتی ہو ان لوگوں کا سوچو جن کے پاس کچھ نہیں۔ میرے جذبات گھڑی کے پنڈولم کی طرح آگے پیچھے جاتے رہے۔

وقت گزاری کے لئے میں نے کھانے کی ترکیبیں سیکھیں اپنی والدہ کی باورچی خانہ میں چھوڑی

ہوئی کھانا پکانے کی پرانی کتابوں سے پکانے کی نئی نئی تراکیب پر عمل کرتی چولھے کام نہیں کر رہے تھے اور کھانا پکانے کے برتن بھی محدود تھے۔ انڈہ پھینٹنے کا آلہ بھی نہیں تھا۔ ہر کھانا جو پکایا مثلاً سالن، چاول، دال میرے لئے چھوٹی سی فتح مندی کا نشان بن گیا...... جس طرح المرتضٰی میں میری والدہ نے تین برس قبل ہماری نظر بندی کے دوران بھنڈی توری اور مرچیں اگائی تھیں اسی طرح جو کھانے میں پکا رہی تھی، ان کی بھی خاص اہمیت بن گئی۔ جب میں پکے ہوئے چاولوں کی ڈش دیکھتی تو مجھے احساس ہوتا کہ میں زندہ ہوں میں نے ہی اسے قابل طعام بنایا۔ میں کھانا پکاتی ہوں اس لئے میں موجود ہوں۔

مجھے اپنی والدہ کے بارے میں مستقل تشویش تھی کراچی سنٹرل جیل میں ملاقات پر چار ماہ قبل انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ڈاکٹر کو ان کے پھیپھڑوں میں سرطان کا خدشہ ہے۔ اگر واقعی انہیں سرطان ہے تو وہ وقت کے خلاف دوڑ لگا رہی ہیں۔ آغاز میں پھیپھڑوں کی تشخیص اور علاج سے سرطان پر قابو پایا جاسکتا تھا علاج کے بغیر پھیپھڑوں کا سرطان جلد جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ مزید تشخیصی معائنہ کے لئے جسم میں توانائی کی ضرورت تھی اور ڈاکٹر نے مخصوص خوراک تجویز کی تھی...... آخری معائنوں کا سلسلہ نتیجہ خیز ثابت ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کی حتمی رائے تھی کہ ان کے بائیں پھیپھڑے پر سایہ سا مہلک بھی ہو سکتا تھا۔ انہوں نے حکومت کو رپورٹ دی کہ بیگم بھٹو کو خصوصی علاج کی ضرورت ہے۔ جو پاکستان میں میسر نہیں۔ تاہم پاسپورٹ کی بحالی کیلئے میری والدہ کی درخواست تاکہ وہ ملک سے باہر علاج کر سکیں، درخور اعتنانہ سمجھی گئی۔ افواہ تھی کہ اس سلسلہ میں وزارت داخلہ بے بس ہے کیونکہ ضیاء میری والدہ کی فائل اپنے ساتھ بیجنگ لے گیا تھا۔

ایک ماہ گزر گیا اور حکومت نے میری والدہ کو پاکستان سے باہر جانے کا اجازت نامہ جاری نہ کیا۔ ایک اور ماہ گزر گیا۔ مایوس ہو کر میری والدہ کے ڈاکٹر نے کراچی میں ادویات سے علاج شروع کر دیا۔ میری مایوسی جب پہلے پہل ممی نے فون پر خبر بتائی تھی مزید کالوں کے بعد تلخی میں بدل گئی۔ ان کے بال جھڑ رہے تھے اور وزن کم ہو رہا تھا وہ افسوس کا اظہار کر رہی تھیں۔ ایسی حالت میں مجھے ملنے کیلئے آ نہیں سکتی تھیں۔ بطور بیٹی مجھے اپنی

معذوری کا احساس تھا کہ میں اس وقت ان کے پاس نہیں تھی اور نہ ہی کوئی مدد دینے کے قابل۔

اخبارات پر سنسر شپ کے باوجود ان کے ابتلاء کی خبر پورے ملک میں پھیل رہی تھی۔ ''لوگ ممی کو بھلا نہیں سکے'' صنم نے فون پر یقین دہانی کرائی۔ ''ہمیں ملک بھر سے ان کی صحت کے بارے میں استفسار کیا جا رہا ہے اور اسی طرح فخری کو بھی والدہ کے بارے میں تشویش کی کالیں موصول ہو رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سفارت خانوں کی استقبالیہ پارٹیوں میں، کافی پارٹیوں میں، اسی طرح بس سٹاپوں پر اور سینماؤں میں ان کی صحت ہی موضوع گفتگو ہے۔''

''ضیاء کو انہیں جانے دینا پڑے گا'' میں نے پر امیدی کا اظہار کیا اور اپنے آپ کو بھی یقین دلایا۔ لیکن اس واضح دباؤ کے باوجود ضیاء نے انہیں جانے نہیں دیا۔ اس کی بجائے ڈاکٹروں کی مبینہ تشخیص کے تین ماہ بعد ضیاء نے ایک فیڈرل میڈیکل بورڈ تشکیل دیا جو والدہ کی بیماری کا تعین کرنے کے بعد ان کے بیرون ملک علاج کی سفارش کر سکے گا۔

ایک فیڈرل میڈیکل بورڈ۔ ایک اور کمینہ پن ایوب خان کے زمانے کے بعد جب غیر ملکی سفر پر پابندی عائد تھی اب تک پاسپورٹ کے حصول کیلئے کبھی کوئی میڈیکل بورڈ تشکیل نہیں دیا گیا تھا جو شہریوں کو اجازت نامہ جاری کرے...... ضیاء کی اپنی حکومت کے ارکان معمولی بیماریوں کے علاج کے لئے سرکاری خرچ پر بیرون ملک جاتے رہے تھے جن کا علاج پاکستان میں بھی ممکن تھا۔ لیکن اپنے سیاسی مخالفوں کے لئے ضیاء نے میڈیکل بورڈ کھڑا کر دیا تھا۔ اب وہ اس کو میری والدہ کے علاج میں رخنہ بننے کے لئے استعمال کر رہا تھا کہ وہ باہر نہ جا سکیں۔

جب بورڈ کی بالآخر میٹنگ بلائی گئی تو اس میں اکثریت ضیاء کے چہیتوں کی تھی جس طرح سپریم کورٹ کے فیصلے کو ججوں کی تعداد کم کر کے اپنی مرضی کے مطابق برقرار رکھنے پر اصرار کیا گیا تھا بعینہ میڈیکل بورڈ کے لئے متوقع تین ڈاکٹروں کی بجائے سات ڈاکٹروں کو مقرر کیا گیا تاکہ ضیاء اپنی مرضی کا فیصلہ حاصل کر سکے تمام ساتوں ڈاکٹر حکومت کے ملازمین

تھے۔ بورڈ کا سربراہ ایک حاضر سروس میجر جنرل تھا۔

''بیگم صاحبہ مجھے ٹھیک ٹھاک معلوم دیتی ہیں'' اس جنرل نے بورڈ کی پہلی میٹنگ کے بعد غیر ذمہ دارانہ بیان دیا۔ نامزد کردہ بورڈ کے دوسرے اراکین نے مطالبہ کیا کہ میری والدہ کو ۱۴ دنوں پر محیط پھیپھڑوں کے ایکس رے اور خون کے ٹسٹ کروانا ہونگے۔ یہ اتنا تھکا دینے والا طریق کار تھا کہ انہیں بخار ہو گیا اور اس کے اختتام پر وہ فوراً بے ہوش ہو گئیں...... اگرچہ ٹسٹوں کے نتیجہ میں ظاہر ہوا کہ ان کے پھیپڑوں پر سائے کا حجم بڑھ گیا تھا اور ان کے خون میں سرخ جرثوموں کی معتدبہ کمی واقع ہو گئی تھی، بورڈ کے سربراہ نے رائے دی کہ انہیں سانس کی نالیوں کے ورم کا تجزیہ کرانا چاہتے جو نہ صرف غیر ضروری تھا بلکہ ان کی پہلے سے خراب حالت کو مزید بدتر کر سکتا تھا۔ میری والدہ کا کراچی میں طبیب ڈاکٹر سعید جو خود بھی بورڈ کا ایک رکن تھا اس نے بورڈ کے فیصلہ کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا۔ ہسپتال کے بے ہوش کرنے والے ڈاکٹر نے بھی ان کی رائے سے اتفاق کیا اور اصرار کیا کہ تشخیصی ٹیوب ان کے پھیپھڑوں میں گزارنے کیلئے ان کو بے ہوش کرنے والی دوا کے ان پر منفی اثرات غالب آسکتے ہیں۔ اور وہ انہیں برداشت کرنے کے قابل نہیں۔ میں المرتضٰی میں اپنی والدہ کے لئے دعائیں مانگتی رہی لیکن باقی ملک میں اس خوف نے کہ ضیاء میری والدہ کو مرنے دے گا، لوگوں میں عمل کا نیا جذبہ پیدا کر دیا۔ ''ہم مسٹر بھٹو کو نہیں بچا سکے'' لوگوں میں عام کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ ''ہم بیگم بھٹو کو اس طرح ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتے ہمیں حرکت میں آنا ہو گا۔'' حکومت کی طرف سے میری والدہ کے ساتھ سنگدلانہ سلوک نے پی پی پی کے وفادار حمائتیوں ہی کو نہیں جھنجھوڑا بلکہ ضیاء کی افسر شاہی کے بلند مرتبہ اصحاب اور فوجی خاندانوں پر بھی ہمدردی کی اس لہر نے خاطر خواہ اثر چھوڑا۔

''اندازہ لگاؤ کیا ہوا'' ''سندھ کے مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کی بیوی اور بہنوں نے آنٹی کی زندگی بچانے کے خواتین کے مظاہرہ میں خود بھی حصہ لیا'' فخری نے ٹیلی فون پر پرجوش انداز میں یہ بات بتائی۔

''کیا پولیس نے انہیں گرفتار کیا؟'' میں تقریباً چیختے ہوئے بولی کیونکہ مجھے اس بات پر

یقین نہیں آ رہا تھا۔ جنرل ضیاء کے بعد چار صوبائی مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر ہی ملک کے سب سے زیادہ بااختیار افسر تھے۔

"انہوں نے جرات نہیں کی۔ جب وہ آئے، تمام مظاہرین مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کے گھر میں دوڑ کر داخل ہو گئیں اور دروازے بند کر دیئے۔" فخری نے بتایا۔

میری والدہ کے ابتلاء نے "مجھے بعد میں پتہ چلا" احتجاج کی چنگاری باہر کے ملکوں میں بھی بھڑکائی۔ انگلستان میں اکسفورڈ کے میرے پرانے دوستوں کے ایک گروپ نے ڈاکٹر نیازی، امینہ پراچہ اور کچھ حقوق انسانی کے سرگرم کارکنوں کے ساتھ مل کر ایک مہم چلائی جس کا نام "بھٹو خواتین کو بچاؤ" رکھا گیا۔

اس گروہ نے سب سے پہلے میری والدہ کی رہائی پر توجہ مرکوز کی اور پارلیمینٹ میں ایوان بالا کے رکن لارڈ ایوبری کی معیت میں اراکین پارلیمینٹ میں سے بعض کو اپنا ہم نوا بنالیا۔ دو ممبران پارلیمینٹ جون لسٹر اور جوناتھن ایٹکن نے ایوان زیریں میں ایک تحریک پیش کر دی۔ "بیگم بھٹو کا طبی علاج۔" "یہ ایوان حکومت پاکستان پر زور دیتا ہے کہ بیگم بھٹو کو سرطان کے طبی علاج کے لئے ملک سے باہر سفر کی اجازت دی جائے۔" ۴ر نومبر کو الارڈ ایوبری نے ایوان بالا میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس میں ایک برطانوی ڈاکٹر نے میری والدہ کی نازک حالت کا نقشہ کھینچا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اراکین حکومت بھی میری والدہ کے بارے میں درخواستیں گزار رہے تھے۔ "پیارے سفیر!" "دو ماہ قبل وزیراعظم کی بیوہ مسز نصرت بھٹو نے اپنے پھیپھڑوں کی ابتر حالت کے علاج کیلئے ملک سے باہر جانے کی اجازت طلب کی تھی۔ انسانی ہمدردی کی بنا پر آپ کی حکومت پر زور دونگا کہ مسز بھٹو کی درخواست کو جلد از جلد شرف قبولیت بخش دے۔ فوری منظوری رحمدلی کا عمل متصور ہو گا اور ہمارے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کو مضبوط کرے گا۔" وزارت خارجہ کی سینٹ کمیٹی کے رکن سینٹر جان گلین نے واشنگٹن میں پاکستانی سفیر اعجاز عظیم کو ۵ر نومبر کو ایک خط لکھا۔

لیکن جنرل ضیاء نے میری والدہ کے طبیب ڈاکٹر سعید کا نہیں سوچا تھا۔ "میں تمہاری

رپورٹ پر دستخط نہیں کروں گا،" ڈاکٹر سعید نے میجر جنرل کو بتایا جو میڈیکل بورڈ کی سربراہی کر رہا تھا اور اس روز بعد میں ایک میٹنگ بھی بلائی تھی "میرا ضمیر بطور ڈاکٹر اجازت نہیں دیتا کہ میں مریض کی حالت کو خطرے میں ڈالوں۔"

"میرا ضمیر بھی اجازت نہیں دیتا" بورڈ کے ایک اور ڈاکٹر نے اعلان کیا اور اس خاموشی کے اصول کو توڑا جس کے مطابق فیڈرل بورڈ کو اپنے سربراہ کے راستے پر چلنا چاہئے تھا۔

"میرا ضمیر بھی اجازت نہیں دیتا" ایک دوسرے پھر تیسرے ڈاکٹر نے بھی کہا۔ میجر جنرل نے عجیب صدمے کے انداز میں ڈاکٹروں کی بغاوت کے سلسلے کو دیکھا...... ان تمام ڈاکٹروں نے ڈاکٹر سعید کے بیان پر دستخط کر دیئے کہ میری والدہ کو پاکستان سے باہر فوراً بھیج دیا جائے۔" "آپ بھی اس پر دستخط کریں ڈاکٹر سعید نے سربراہ کو کہا۔ "جب سب ڈاکٹر متفق ہیں تو میجر جنرل کس طرح انکار کر سکتا تھا۔"

ضیاء نے فوراً ہی اسے فوجی اور سول آسامیوں سے برخاست کر دیا۔

حکومت نے بورڈ کے اچانک فیصلے کے ایک روز بعد میری والدہ کو باہر جانے کی اجازت دے دی...... میں نے صبح کے اخبار میں خبر پڑھی تو بہت خوش ہوئی اور فوراً حکام کو درخواست دی کہ میں والدہ کے ملک سے باہر جانے سے قبل انہیں ملنا چاہتی ہوں۔" المرتضیٰ میں نظر بندی کے ایک برس بعد مجھے اچانک بتایا گیا کہ اپنا سامان باندھ لوں۔ ۱۲ پولیس کاروں، ٹرکوں اور جیپوں کا قافلہ موہنجوڈارو ایئرپورٹ پر مجھے لے گیا۔ وہاں پولیس نے فوٹوگرافروں کے کیمرے ضبط کر لئے جو پچھلے گیارہ ماہ میں پہلی مرتبہ مجھے عوام الناس کے درمیان دیکھ رہے تھے۔

سٹین گنوں سے مسلح پولیس کے جوان طیارے تک میرے ساتھ گئے۔ جب میں کراچی پہنچی اور مجھے ۷۰ - کلفٹن کی طرف ایک اور قافلے کی معیت میں لے جایا گیا تو ایک ہیلی کوپٹر اوپر اڑتا رہا۔ یہ انتظامات ایک بیٹی کے لئے تھے جو اپنی والدہ کو الوداع کہنے کیلئے آئی تھی۔

ممی اپنے بستر پر لیٹی زرد اور کمزور دکھائی دے رہی تھیں، ممی اپنی حقیقی عمر سے بہت زیادہ بوڑھی نظر آ رہی تھیں۔ ایک مرتبہ اور میں ذہنی الجھاؤ کا شکار ہو رہی تھی۔ سب سے زیادہ میری خواہش تو یہی تھی کہ وہ اپنے علاج کے لئے ضرور باہر جائیں...... تاہم نظر بندی میں اپنی تنہائی کے خیال سے مجھے وحشت ہوتی تھی میں نے اپنی تنہائی کے خوف آور خیالات سے جنگ کی جو سب جیل میں میرا استقبال کرنے والے تھے۔ اور اس دوران فخری سونے کے کمرے میں آ جا رہی تھی اور سیکرٹری جنرل تحریک بحالی جمہوریت اور دوسرے پارٹی کے لوگوں سے پیغامات لا رہی تھی۔ "بیگم بھٹو چلی گئیں تو کیا ہو گا" پیغامات دھڑا دھڑ آ رہے تھے۔ لیکن ممی کے پاس اب کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔

"میں بوجھل دل سے اور طبی مجبوری کی وجہ سے اپنے ملک اور اپنے لوگوں کو عارضی مدت کے لئے چھوڑ کر جا رہی ہوں۔" ممی نے اپنے الوداعی بیان میں کہا۔ "میرے خیالات ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گے۔ جدوجہد کرتے ہوئے عوام کے ہاتھ مظلومین اور مفلسوں کے ساتھ...... استحصال زدہ اور تفریق زدہ لوگوں کے ساتھ...... ان تمام افراد کے ساتھ جو ایک ترقی پسند اور خوشحال پاکستان کا خواب دیکھتے ہیں۔"

"حکومت اخبارات میں میری والدہ کے جانے کی غلط تاریخیں تحریر کرتی رہی تاکہ لوگوں کے جمع ہونے کے لئے حوصلہ شکنی ہو۔ حکومت کی گمراہی کا توڑ کرتے ہوئے۔ پی پی پی کے حمائیتوں کا ایک سیلاب ۷۰ کلفٹن سے گاڑیوں میں رواں دواں تھا اور ان کی روانگی کے آثار کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ ہم دیواروں کے اندر محبوس ان کی آوازیں سن رہی تھیں۔ "جیئے بھٹو" وہ نعرہ زن تھے۔ "بیگم بھٹو زندہ باد۔"

۲۰ر نومبر ۱۹۸۲ء کی شب میں نے ممی کا الوداعی بوسہ لیا اور انہیں اپنے والد کے مزار کی مٹی سے بند لاکٹ دیئے تاکہ وہ میرے بھائیوں اور نئی پیدا شدہ بھتیجیوں کو دیں۔ ان لاکٹوں میں قرآنی آیات بھی کندہ تھیں اور یہ سلامتی کے لئے پہنے جاتے تھے۔ ہم دونوں اشکبار ہو گئیں اور نہیں جانتی تھیں کہ مستقبل میں کیا ہو گا۔ "اپنا خیال رکھنا!" ممی نے مجھے کہا، ہم دونوں ۷۰ - کلفٹن کے منقش دروازے سے باہر نکلیں جہاں تیرہ برس پہلے ممی

ماں کے لئے باعث فخر بیٹی -- بے نظیر بھٹو

نے قرآن کریم کے سائے میں مجھے ہارورڈ کے لئے الوداع کہا تھا اور پھر وہ دروازے سے باہر منتظر جم غفیر میں گم ہو گئیں۔

سمیعہ وحید

دوست محمد بیگم بھٹو کو گاڑی میں ایئرپورٹ تک لے گیا۔ صنم اور فخری عقبی نشستوں پر بیٹھی تھیں۔ ہجوم بے کراں تھا جب ہم ۷۰ کلفٹن سے روانہ ہوئے۔ حکومت کے طریق کار سے بغاوت کرتے ہوئے جو ان کی روانگی کو خفیہ رکھنا چاہتی تھی۔ بیگم بھٹو نے کار کے اندر روشنیاں جلا دیں تاکہ لوگ انہیں دیکھ سکیں۔ مسز نیازی، امینہ میری بہن سلمیٰ اور میں اپنی کار میں ان کے پیچھے تھے۔ ہر چوک پر مزید کاریں قافلہ میں شامل ہوتی گئیں یہاں تک کہ ہمارے معاونین کی گاڑیوں کا ایک وسیع قافلہ رواں دواں ہو گیا۔ جب ہم ایئر پورٹ کے پل پر پہنچے تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کاریں جو بیگم بھٹو کے پیچھے آ رہی تھیں، بڑی سڑک کی ساتوں گلیوں کو روکے ہوئے تھیں۔ مخالف سمت سے آنے والی کاریں مجبوراً ایک ہی گلی سے جا رہی تھیں۔

ہجوم جو ایئرپورٹ پر ان کا منتظر تھا بہت بڑا تھا۔ جب ہم نے ایئر پورٹ کے سرے پر گاڑیاں روکیں، وہ ہماری گاڑیوں پر چڑھ دوڑے...... میں نے ایک شخص کے ننگے پاؤں دیکھے جو ہماری گاڑی کی چھت پر چڑھ گیا تھا۔ ''خدا آپ کے ساتھ ہو گا'' اس شخص نے بیگم بھٹو کو دیکھ کر پکارا جنہیں پارٹی اراکین پہیوں والی کرسی پر بٹھا کر ایئرپورٹ کے اندر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بالآخر ان کی کرسی کو ہجوم کے سروں پر سے ہو کر گزارنا پڑا۔ ایئر فرانس کے طیارے کی پرواز کے عملے کو بھی اندر جانے کیلئے وہی مشکل درپیش تھی۔ انہوں نے اپنے بیگ ایک دوسرے کی طرف اچھال کر پکڑائے...... یہ سو گز کا فاصلہ انہوں نے اس طرح طے کیا کہ یونیفارم میں شکن آلود ہو گئیں۔ ان کے سر کے ہیٹ بکھر گئے اور ایئرہوسٹس کے سروں کے بالوں کی پنیں گر پڑیں۔ یہ ایسا طوفانی الوداع تھا کہ

پاکستان میں اس سے قبل کبھی دیکھا نہیں گیا تھا لوگوں کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے وزیر اعظم کی بیوہ اور پی پی پی کے محبوب راہنما کو دوبارہ دیکھنے جا رہے تھے۔

ممی کو بیماری کی تجزیاتی مشین اور علاج کیلئے مغربی جرمنی میں ٹھہرنا پڑا، علاج کا مثبت اثر ہوا اور خوش قسمتی سے سرطان کا پھیلاؤ رک گیا...... اس دوران میں پولیس کی پہرداری میں ۷۰ - کلفٹن میں ہی رہی، جیل کے عملہ کے گیارہ افراد گھر کے اندر متعین تھے۔ باہر گھر کے اردگرد ہر دو فٹ پر فرنٹیئر فورس کا ایک جوان متعین تھا خفیہ ایجنسی کے کارندے سامنے کے دروازوں سے لے کر عقبی دروازوں تک ہر چیز پر پوری طرح نگاہ رکھنے تھے۔ مجھے ۷۰ - کلفٹن میں اس عداوتی ناکہ بندی میں مزید ۱۴ مہینوں تک محصور رہنا پڑا۔

میں نے جیکوبو ٹائمرمین کی کتاب "قیدی بغیر نام کے جیل کوٹھڑی بغیر نمبر کے" بڑی دلچسپی سے پڑھی، یہ تصنیف ارجنٹائن میں ایک اخباری ناشر کی بطور سیاسی قیدی اڑھائی سالہ قید کی سرگزشت تھی۔ "یہ درد آلودہ آنکھوں میں معکوس درد آلودہ انکھوں اور روحوں کا آئینہ تھی۔" میں نے اپنی ڈائری میں رقم کیا۔

"جب اس نے برقی کرسی میں اذیت کا نقشہ کھینچا تو الفاظ صفحات پر اچھلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، ٹائمرمین نے تحریر کیا...... "اور معجزانہ طور پر جسم کی جلد پر کوئی نشان یا داغ عیاں نہیں تھا۔ سیاسی قیدیوں کو کرسی کے جھٹکوں کے بعد ہوش میں لانے کے لئے پانی میں بھگو دیا جاتا۔ اور اذیت گاہ میں دوبارہ پھینک دیا جاتا۔ کیا وہ ارجنٹائن کا ذکر کر رہا تھا یا پاکستان میں فوجی حکومت کی اذیت گاہوں کا۔"

صدارتی حکم نمبر ۴ ر مورخہ ۲۴ ر مارچ ۱۹۸۲ء

خصوصی فوجی عدالتوں میں مقدمات اب خفیہ طور پر سنے جاسکتے ہیں۔ جب سماعت شروع ہو جائے تو اس ضمن میں کسی کو باخبر کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی یہ بتانے کی کہ ملزم کون تھے اور ان پر کیا الزامات تھے اور نتیجتاً کیا سزا دی گئی تھی۔ یہ یقین کرنے کے لئے کہ راز داری افشاء نہیں ہوئی۔ وکلاء یا کسی اور شخص کو مقدمہ کے بارے میں کوئی خبر عوام

میں نشر کرنے پر مجرم قرار دیا جاسکتا ہے۔

مارشل لاء حکم نمبر ۵۴ مورخہ ۲۳ر ستمبر ۱۹۸۲ء موثر بتاریخ ۵ر جولائی ۱۹۷۷ء۔ جب میرے والد کے خلاف سازش کی گئی۔ "سزائے موت اب ہر کسی کو ایسے جرم پر دی جاسکتی تھی جو عوام میں سلامتی کے بارے میں خدشات خوف اور مایوسی پھیلانے کا موجب ہو" "سزائے موت کا وہ شخص بھی مستوجب ہو گا جو ایسے جرم سے باخبر ہے اور مارشل حکام کو بتانے سے قاصر رہتا ہے۔ مزید بر آں ملزم اس وقت تک قصوروار متصور ہو گا جب تک وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت نہیں کرتا۔ "فوجی عدالت ملزم کو کسی ایسے الزام کا مجرم گردان سکتی ہے جس میں وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت نہ کر سکے۔" آرڈیننس کے الفاظ تھے۔

اکتوبر میں دو ہزار وکلاء کراچی میں شہری آزادیوں کی بحالی کے مطالبہ کے لئے جمع ہوئے۔ کانفرنس کے منتظمین گرفتار کر لئے گئے اور انہیں ایک ایک سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ دو ہفتوں بعد مسٹر حفیظ لاکھو جو میرے والد کے وکلاء میں سے ایک تھے کو کراچی بار ایسوسی ایشن کے سیکرٹری کے ہمراہ گرفتار کر لیا گیا۔

دسمبر میں اخبارات میں خبر پڑھی کہ ضیاء صدر ریگن اور کانگرس کے اراکین سے ملاقاتوں کے لئے واشنگٹن میں ہے صرف ماہ دسمبر میں پاکستان میں ۲۰ سے زائد سیاسی قیدیوں کو تختہ دار پر چڑھایا گیا۔ کیا کانگرس کے اراکین کو علم تھا کہ پاکستان میں حقوق انسانی کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہو رہی ہے؟ کیا انہوں نے اس طرف کوئی توجہ دی؟

مجھے مزید تین برس تک ان سوالوں کا جواب نہیں ملا۔ ضیاء کو توقع تھی کہ واشنگٹن میں اس کی آمد اسے مغرب میں نئی توقیر بخشے گی مگر سینٹ کی تعلقات خارجہ کمیٹی سے ملاقات کے دوران اسے شدید تنقید کا ہدف بننا پڑا۔ "جو اصحاب وہاں موجود تھے کہتے ہیں کہ جنرل سنجیدہ اور پر اعتماد تھا مگر صرف اس وقت تک جب تک سینٹر پیل نے پاکستانی سیاسی قیدیوں کے بارے میں کمیٹی کی تشویش اسے ایک خط کے ذریعے آگاہ نہیں کیا آگاہ کیا۔"

اور اینڈرسن نے واشنگٹن پوسٹ میں بھی لکھا۔ سرفہرست بے نظیر بھٹو کا نام تھا۔"

ضیاء بھڑک اٹھا جب سینٹر پیل نے میری نظر بندیوں کے بارے میں اس پر دباؤ ڈالا۔ ''سینٹر'' میں تمہیں اتنا بتا سکتا ہوں ''کہ بے نظیر ''میں'' نے قانون توڑا تھا۔ ''وہ ایسی جگہ رہائش پذیر ہے جو کسی بھی سینٹر کی رہائش گاہ سے بہتر ہے۔'' ضیاء نے جواب میں یہ دعویٰ کیا۔

''اور یہ کہ اسے متعلقین اور دوستوں سے ملنے کی اجازت ہے اور ''ایک ٹیلی فون بھی اس کے زیر استعمال ہے''

ضیاء کے دعاوی سن کر، پیٹر گلبریتھ نے آزمانے کیلئے فوراً ۷۰ کلفٹن میں ٹیلی فون کر دیا۔ اور فون اٹینڈ کرنے والے کو بتایا کہ وہ بے نظیر بھٹو سے بات کرنا چاہتا ہے۔

''تم اس سے بات نہیں کر سکتے وہ جیل میں ہے'' اس نے جواب دیا۔

میں امریکی سینٹ سے بول رہا ہوں ''پیٹر نے اصرار کیا'' تمہارے صدر ابھی یہاں تھے اور انہوں نے بتایا تھا کہ مس بھٹو ٹیلی فون استعمال کر سکتی ہے۔''

''تم اس سے بات نہیں کر سکتے، یہ منع ہے'' اس آدمی نے سختی سے جواب دیا اور ٹیلی فون بند کر دیا۔

میں نے ۲۵ر دسمبر، قائد اعظم کا یوم پیدائش، ۷۰ کلفٹن میں نظر بندی میں گزارا...... میں نئے سال کی پہلی تاریخ اور اپنے والد کے یوم پیدائش پر بھی تنہا تھی۔ ۱۹۸۳ء کے آغاز میں میں نے اس حقیقت کو پہچانا کہ ۱۹۷۷ء سے اب تک نئے سال کا دن صرف ایک تھا جب میں آزاد رہی ہوں...... رات کو میں اپنے دانت پیستی صبح سویرے اٹھتی تو میری انگلیوں کے جوڑ سوجے ہوئے ہوتے اور میرے ہاتھوں کی انگلیاں مضبوطی سے جڑی ہوئی ہوتیں کہ انہیں کھولنا دوبھر ہو جاتا۔

''میں خدا کی صدق دل سے شکر گزار ہوں ان تمام نعمتوں کے لئے جو اس نے مجھے عطا کی تھیں۔'' میں نے اپنے جریدے میں لکھا۔ ''میرا نام، میری عزت، میری شہرت، میری زندگی، میرے والد، میری والدہ، بھائی، بہن، تعلیم بات کرنے کی صلاحیت، میرے دونوں ہاتھ، ٹانگیں، بصارت، سماعت اور کوئی بدنما دھبہ نہیں'' خدا کی نعمتوں کی اتنی طویل

فہرست نے میرے احساس کمتری کو مٹانے میں مدد دی۔ دوسرے سیاسی قیدی موسم سرما میں اپنی ٹھنڈی کوٹھڑیوں میں بدتر حالت میں زندگی گزار رہے تھے۔

گھر کے عملہ کا ایک فرد ایک دن نیا اونی سکارف پہن کر گھر میں آیا...... ایسے متعدد سکارف افغان مہاجرین سے بلیک مارکیٹ میں سستے داموں خریدے جاسکتے تھے۔ اس نے مجھے بتایا...... میں نے خفیہ طور پر ایک پارٹی رکن کو پیغام بھیجا کہ پی پی پی کے رنگوں کے سرخ، سبز اور کالے سروں کے ایسے سکارف جو بعد میں ہم نے تمام سندھ میں جیل کے قیدیوں کو یہ سکارف جرابوں کے جوڑے اور سوئیٹر ہزاروں کی تعداد میں بھجوائے۔

میرے کان کا زخم پھر درد کرنے لگا اسی طرح میرے دانت مسوڑھے اور جوڑوں میں درد ہونے لگا۔ "تمہارے کان میں کوئی خرابی نہیں" حکومت کے کانوں کے ڈاکٹر نے بحریہ کے ہسپتال میں مجھے بتایا۔ ان کا دانتوں کا ڈاکٹر بھی نااہل معلوم ہوتا تھا وہ مجھے پوچھنے لگا۔ "تمہارا کون سا دانت درد کر رہا ہے۔" "میں خصوصی طور پر نشان دہی نہیں کر سکتی کہ کونسا دانت درد انگیز ہے...... جس کا تم ایکس رے چاہتی ہو؟ تم ڈاکٹر ہو میں نہیں، اس حصے میں درد ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم ایکس رے ضائع نہیں کر سکتے۔" اس نے جواب دیا۔

برطانوی پریس میں میری صحت کے بارے میں خبریں چھپنے لگیں تو پاکستانی سفارت خانہ کے وزیر اطلاعات نے جواب دیا "جب کبھی اس نے کسی بیماری کی شکایت کی اسے کراچی کے بہترین ہسپتال میں لے جایا گیا۔" قطب الدین عزیز نے گارڈین میں لکھا" شدید تمباکو نوشی کے باعث اسے مسوڑھوں کی تکلیف شروع ہوئی جس کیلئے اس کے نامزد کردہ ڈاکٹر سے اس کا علاج کرایا گیا۔" حکومت کس طرح جھوٹ بول رہی تھی کوئی ڈاکٹر بھی میرا نامزد کردہ نہیں تھا اور میں نے کبھی تمباکو نوشی نہیں کی تھی۔

میں گفتگو، میل ملاپ اور تبادلہ خیالات سے محروم کر دی گئی تھی...... میں خوش قسمت تھی کہ میری بلیاں ۷۰ کلفٹن میں موجود تھیں۔ لیکن وہ انسانی محبت کی کمی کو پورا نہیں کر سکتی

فرانس کے صدر فرانسوا متراں اپنے دورۂ پاکستان کے موقع پر وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے ہمراہ

تھیں۔ حکومت چاہتی تھی کہ میں کسی طرح کسی سے رابطہ نہ رکھ سکوں اس لئے میں حیران ہوئی جب مارچ ۱۹۸۳ء میں جام ساقی جسے مختلف الزامات میں دھر لیا گیا تھا اور جو ایک کیمونسٹ تھا کے مقدمہ میں مجھے عدالت میں شہادت دینے کے لئے بلایا گیا۔ الزامات میں سے نظریہ پاکستان کی نفی اور افواج پاکستان کے خلاف عوام میں بے چینی پھیلانے کے دو بڑے الزام تھے۔

میں جام ساقی سے کبھی بھی ملی نہیں تھی اس نے در حقیقت میرے والد کی مخالفت کی تھی لیکن پتہ چلا کہ جام ساقی نے ممتاز سیاست دانوں کو عدالت میں بلایا تھا تاکہ وہ مبینہ مسائل کی تعریف بتائیں تاکہ پتہ چلے کہ اس کے خلاف الزامات ٹھیک ہیں، یا غلط میں پہلے سے زیادہ مارشل لاء کی غیر قانونی حیثیت پر بحث کیلئے تیار تھی اگر چہ میں اس بات سے بے خبر تھی کہ مجھے ذاتی طور پر عدالت میں پیش کرنے سے حکومت کا کیا منشاء تھا۔ شائد وہ مجھے ایک کمیونسٹ کے ہمدرد ہونے کا طعنہ دیکر میری شہرت داغدار کرنے کے درپے تھے۔ لیکن میرے نزدیک سب سے اہم مسئلہ ہر شخص کے لئے آزاد اور کھلی سماعت کا حق تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ عدالت میں مجھے ایک پلیٹ فارم میسر آئے گا جہاں تقریباً دو سال کے عرصہ میں مجھے پہلی بار اپنے سیاسی خیالات کی تشہیر کا موقع ملے گا۔

جب ۲۵ر مارچ کو خصوصی فوجی عدالت کے جاری کردہ پہلے سمن حاضری کے لئے پہنچے تو میں نے جیل حکام کے ذریعے انہیں لکھا کہ میں ایک قیدی ہوں اور عدالت میں متعینہ وقت پر پہنچنے سے قاصر ہوں اگر عدالت کی خواہش ہے کہ میں شہادت دوں تو عدالت کو میری پیشی کے لئے تمام انتظامات خود کرنا ہونگے۔

وزارت داخلہ کے دفتر سے مجھے جلد ہی جواب مل گیا کہ اگلی صبح ۷ بجے جانے کے لئے تیار رہوں میں وقت پر تیار تھی ۱۱ بجے ایک نیا پیغام ملا۔ میری پیشی کا وقت تبدیل کر دیا گیا ہے اور اب اگلی صبح پہلے وقت پر ہی تیار رہنے کیلئے کہا گیا اور دوبارہ میری پیشی کو ۲۴ گھنٹے کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ حکومت میرے حمائیتوں کو الجھن میں ڈالنا چاہتی ہے جو مجھے دیکھنے کیلئے جمع ہو جائیں گے۔ جب وہ تیسرے دن مجھے لینے

کے لئے آئے تو پبلک سے مجھے الگ تھلگ رکھنے کے لئے ہر حربہ آزمایا گیا۔

گلیاں جن میں سے ہم نے سفر کیا بالکل سنسان تھیں کیونکہ تمام راستے میں پولیس نے رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں۔ کشمیر روڈ کی طرف، جانے والے تمام راستوں پر پولیس کی بھاری نفری ایستادہ تھی اور پیدل جانے والوں کے راستوں میں خاردار تاروں سے ناکہ بندی کی گئی تھی جب میں کھیلوں کے کمپلکس میں قائم شدہ عارضی انتظامات کے تحت مقرر کردہ فوجی عدالت میں پہنچی تو معلوم ہوا کہ عدالت میں بھی حاضرین کا صفایا کر دیا ہے۔تاہم جام ساقی اور دوسرے لوگوں کے متعلقین کو صرف انتظار گاہ میں بیٹھنے کی اجازت دی گئی اور وہ بھی اس شرط پر کہ ان میں سے کوئی بھی مجھ سے مخاطب نہیں ہوگا۔ میں ان چند وکلاء کو جو وہاں حاضر تھے اور سمیعہ، سلمیٰ اور اپنی کزن فخری کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی جنہوں نے کسی طرح رکاوٹیں عبور کر کے یہاں آنے کی خصوصی اجازت حاصل کر لی تھی...... سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ مجھے بات کرنے کا موقع تو ملا۔

عدالت کا کمرہ چھوٹا تھا۔ سامنے ایک کرنل کرسی نشین تھا اور اس کے دائیں بائیں ایک میجر اور ایک مجسٹریٹ...... ہم ان کے سامنے رکھی کرسیوں کی تین قطاروں میں بیٹھ گئے جام ساقی تمام وقت ہتھکڑیاں پہنے بیٹھا رہا۔ مجھے رنج ہوا یہ دیکھ کر کہ اتنے چھوٹے سے کمرے میں بھی فوج نے اسے لوہے کی زنجیریں پہنانا ضروری خیال کیا۔ جام ساقی خود ہی جرح بھی کر رہا تھا کیونکہ فوجی عدالتیں وکلائے صفائی کو ملزم کے دفاع میں بولنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔

مجھے صرف ایک دن اس کی صفائی کا موقع دیا گیا تھا۔ لیکن میں نے جام ساقی کے سوالات کے اتنے طویل جواب دیئے کہ میری شہادت دو دنوں تک جاری رہی...... اس کے سوالات کے چھوٹے یا آسان جوابات ممکن نہیں تھے۔ ہم پر نظریہ پاکستان کے خلاف کام کرنے کا الزام لگایا گیا ہے...... کیا پاکستان کا کوئی نظریہ ہے؟ انقلاب ایران کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا اسلام میں مارشل لاء کا کوئی جواز ہے؟

میں جانتی تھی کہ حکومت کے خلاف پوشیدہ طور پر چھپنے والا ادب منظر عام پر آ رہا تھا جس

میں فوٹو سٹیٹ کئے ہوئے اشتہارات اور خفیہ پریسوں میں ۸ مطبوعہ کتابچے بڑے بڑے شہروں کے دانشوروں میں تقسیم ہو رہے تھے اور پوشیدہ ذرائع سے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کئے جاتے تھے۔ کچھ اشاعت گھر منہ مانگی قیمت پر رات کے وقت اپنی پریس کھولتے اور ٹارچ کی روشنی میں مواد چھاپتے اور پھر پلیٹوں کو تباہ کر دیتے۔ مجھے ایک سنہری موقع دستیاب آ رہا تھا کہ میں مارشل لاء کی مذمت کروں اور پارٹی کو واضح لائن دے کر ہدایات دوں اور میں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ ''اس امر میں واضح تشریح کیلئے کہ اسلام میں مارشل لاء کا کوئی جواز ہے یا نہیں ہمیں سب سے پہلے مارشل لاء اور اسلام کے تصورات کا مکمل شعور حاصل کرنا ہو گا۔'' میں نے تیسرے سوال کے جواب میں کہا۔ ''اسلام اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھکنے کا نام ہے جب کہ مارشل لاء میں فوجی کمانڈر کے حکم کے آگے جھکنا ہوتا ہے۔ ایک مسلمان صرف اللہ کے آگے جھکتا ہے۔

مارشل لاء کی اصطلاح جہاں تک مجھے یاد ہے بسمارک اور پرشیائی شہنشاہیت کے دور سے اخذ کی گئی تھی۔ ان علاقوں کو اپنی سلطنت میں مدغم کرنے کیلئے جنہیں اس نے فتح کیا بسمارک نے ان علاقوں کے قوانین سے ماورا ایک ایسا قانون نافذ کیا جو اس کے ذہن کی اختراع تھا اور اسے بندوق کی نوک پر نافذ کیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل مارشل لاء قابض فوج کی حکومت کے حوالے سے یاد کیا جاتا تھا۔ قابض فوج کے کمانڈر کا حکم علاقے کے موجودہ احکام سے بالاتر ہوتا تھا۔

نو آبادیات کے زمانے میں مقامی لوگوں کو دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا تھا۔ ان کی مرضی کی حکومت ان کیلئے شجر ممنوعہ تھی۔ اپنی توقعات اور خواہشات کے مطابق اپنی قسمت تعمیر کرنے کا حق ان سے چھین لیا جاتا تھا اور جو کچھ ان کے لئے اقتصادی طور پر مفید ہوتا انہیں اس کا حق بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے نتیجہ میں اور اکثر نو آبادیات سے نو آبادیاتی طاقتوں کے اخراج کی وجہ سے، نئے آزاد ممالک کے لوگوں کو آزادی کے ثمرات چکھنے کا موقع کچھ عرصہ کیلئے حاصل ہوا یہ وہ دور تھا جب ناصر نکرومہ، نہرو اور سکارنو جیسے قومی راہنماؤں نے اپنے عوام کے لئے سماجی انصاف اور مساوات کے نفوذ پر

اصرار کیا۔ لیکن سابقہ نو آبادیاتی طاقتیں جو نئے انداز سے مجتمع ہو چکی تھیں۔ اپنے عوام کو خوش رکھنا چاہتی تھیں۔ اور خواہ یہ ان کی دانستہ یا نادانستہ کوشش تھی انہوں نے فوج اور ملائیت کی حمایت کا فیصلہ کر لیا۔ ملاء اور فوج کے اس اجتماع نےلوگوں سے اپنی قسمت کی تعمیر کا حق چھین لیااور انہیں اس کے ثمرات حاصل کرنے سے محروم کر دیا...... اس حالت کو سویت یونین اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی رقابت نے مزید پیچیدہ بنا دیا۔

نئی آزاد ریاستوں میں سے اکثر کسی نہ کسی شکل میں فوجی انتظامیہ کے زیر اثر حکومتیں چلا رہی ہیں۔ تاہم کوئی انتظامیہ جس کی بنیاد جبر پر رکھی گئی ہو اور جس میں عوام کی مجموعی رائے عامہ کا خیال نہ رکھا گیا ہو اسلام کے مرکزی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتی جو اجماع امت پر زور دیتے ہیں...... دوسرے فوجی حکومتیں بندوق کی زور پر اور طاقت کے سہارے پر بر سراقتدار آئی ہیں۔ جب کہ اسلام میں اقتدار کے غصب کرنے کا کوئی تصور نہیں۔ چنانچہ ہم اس نتیجے پر پہنچنے میں حق بجانب ہیں کہ اسلام میں مارشل لاء کا کوئی جواز نہیں۔" میرے بیان کی فوٹو سٹیٹ کاپیاں اخبارات کے دفتروں، بارایسوسی ایشنوں اور سیاسی قیدیوں کی کوٹھڑی میں بھی کسی نہ کسی طرح پہنچ گئیں۔

عدالت کے کمرے میں پریس کے نمائندوں کو داخلے کی اجازت نہیں تھی لیکن برطانوی اخبار کاایک نمائندہ داخلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ وہاں موجود تھا یہاں تک کہ ایک آدمی کمرے میں داخل ہوااور اس نے کرنل کے کان میں کھسر پھسر کی۔

"کہاں ہے؟" کرنل نے پوچھا۔ آدمی نے کمرے کے عقب میں اپنے سر کو ہلایا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم صحافی ہو" کرنل کی آواز گونجی "صحافیوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں۔ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔"

میں نے شلوار قمیص میں ملبوس آدمی پر ایک نگاہ ڈالی وہ سفید رنگ کا ایک پٹھان معلوم ہوتا تھا جسے عدالتی کمرے سے باہر لے جایا جارہا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کے پاس نشر کرنے کو خبر تھی۔ "مس بھٹو پرسکون اور اچھی صحت مند معلوم ہوتی تھی اور اس نے اپنی تقریر سے

ثابت کر دیا کہ اس نے اپنی پرانی فصاحت اور حاضر جوابی میں سے کچھ بھی نہیں کھویا۔ "
گارڈین کے نمائندے نے اپنی رپورٹ میں بعدازاں لکھا۔

میری صحت اتنی اچھی نہیں تھی جتنا ظاہر ہوتی تھی۔ میری عام طور پر کمزور صحت اپریل ۱۹۸۳ء میں پی پی پی کے کچھ راہنماؤں کی بےوفائی کے باعث زیادہ بگڑ گئی۔ ایک مرتبہ پھر ضیاء حرکت میں تھا کہ اپنی حکومت کے لئے ایک سیاسی بنیاد فراہم کر سکے۔ جو سازش کے دنوں سے اب تک اس کے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔ اگست میں ملک میں اسلام نافذ کرنے کے منصوبے کا تہیہ کرتے ہوئے ضیاء میرے والد کا تختہ الٹنے اور ۱۹۷۳ء کا آئین دفن کرنے کے بعد پہلی مرتبہ اندرون سندھ کے دورے پر جانے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔

اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں جب لوگوں نے اس کے دورے کے دوران اپنے غصے اور غضب کا اظہار کیا۔

میرے والد کی حکومت کے زیرانتظام، سندھیوں نے خاطر خواہ ترقی کی اور انہیں تمام سرکاری محکموں مثلاً کسٹمز، پولیس اور پی آئی اے میں ملازمتیں ملیں۔ یونیورسٹیوں میں ان کے لئے کوٹا سسٹم کا خاتمہ کر دیا گیا۔ انہیں زمین کے پلاٹ ملے اور انھوں نے نئے تعمیر شدہ ہسپتالوں، چینی کے کارخانوں اور سیمنٹ کے کارخانوں میں بڑے بڑے مشاہرے حاصل کرنے شروع کر دیئے...... ضیاء کے زمانے میں سب کچھ الٹا چلتا تھا۔ ایک مرتبہ پھر سندھ کے ساتھ تفریق روا رکھی جارہی تھی سندھ کی کچھ بہترین قسم کی زمین ریاست کے قبضہ میں تھی...... ضیاء نے اسے بےزمین کسانوں کی بجائے فوجی افسروں کے حوالے کر دیا۔ سندھی جو صنعت میں منیجر کی آسامیوں تک پہنچ گئے تھے انہیں ہٹا کر ریٹائرڈ فوجی افسروں کے لئے جگہ خالی کی گئی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ملک کی مالیاتی آمدنی کا ۶۵ فی صد حصہ سندھ کی کراچی بندرگاہ سے وصول ہوتا تھا اس میں سے بہت کم رقم واپس سندھ کو ملتی تھی۔ سندھ کی اقتصادی مشکلات نے اس غصے کی آگ کو ہوا دی جو میرے والد کے قتل کے بعد سرعت سے جل رہی تھی صوبے کی اکثریت سوچنے لگی تھی کہ اگر بھٹو صاحب سندھی نہ ہوتے تو انہیں پھانسی بھی نہ دی جاتی۔

۱۹۷۹ء کے بلدیاتی انتخابات کے بعد بدین اور حیدر آباد کے منتخب پی پی پی کونسلروں نے قرار دادیں پاس کیں جن میں میرے والد کے قتل کی مذمت کی گئی اور انہیں ملک و قوم کے لئے شاندار خدمات سرانجام دینے پر خراج تحسین پیش کیا گیا۔ انتقاماً ضیاء نے پورے سندھ میں پی پی پی کے کونسلروں کے خلاف نااہلی کی کارروائیاں شروع کر دی تھیں اب ضیاء اپنی مقبولیت باقی ماندہ کونسلروں سے حاصل کر رہا تھا اور انہیں صوبائی دورے کے دوران استقبال کا حکم پہنچا رہا تھا۔ میری دہشت کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے اخبارات میں اشارتاً پڑھا کہ وہ بھی اس طرح کی اطاعت گزاری پر مائل ہو رہے ہیں۔

میں اپنا پیغام باہر کس طرح بھیج سکتی تھی؟ ملازموں کی ۷۰ - کلفٹن سے باہر جاتے اور اندر آتے وقت تلاشی لی جاتی اور خفیہ محکمہ کے ایجنٹ موٹر سائیکلوں پر ان کا پیچھا کرتے جب وہ اپنے کاموں کے لئے جاتے تھے۔ آخر کار میں نے ایک ملازم کو پہرہ داروں کے سامنے بیماری کی اداکاری کرنے اور چھٹی پر لاڑکانہ جانے کا بہانہ کرنے کیلئے کہا۔

"مجھے امید ہے کہ تمہارا بیٹا ضیاء کے استقبال کے لئے نہیں جائے گا۔" میں نے سندھ پی پی پی کے سربراہ کے نام اپنے زبانی پیغام میں کہا...... اس کا بیٹا ایک کونسلر تھا...... جیسا تم جانتے ہو یہ پارٹی کی پالیسی ہے براہ مہربانی یہ پیغام دوسروں تک بھی پہنچاؤ" میں نے لاڑکانہ کے پی پی پی کونسلرز کو بھی پیغام بھجوایا "تم اور دوسرے کونسلر ہسپتال میں بیمار پڑ جاؤ یا لاڑکانہ چھوڑ جاؤ اور ڈھونڈے سے بھی مت ملو" ...... "ضیاء کو کسی قیمت پر ملنے کے لئے مت جاؤ"

میں غصے سے پاگل ہو گئی جب میں نے ٹیلی ویژن پر ان میں سے کچھ کو ضیاء سے ملتے ہوئے دیکھا۔ ظاہر تھا کہ ان میں سے بعض نے ایک اجلاس میں فیصلہ کیا کہ پارٹی کے لئے ان تمام کے خلاف کوئی کارروائی کرنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی علاوہ ازیں اور سیاستدان پارٹی کے اتحاد کو پس پشت ڈالتے ہوئے اپنی انفرادی اغراض کے لئے کام کر رہے تھے۔ شائد میں بہت زیادہ مثالیت پسند تھی اور ان لوگوں سے زیادہ ہی امید باندھ لی تھی...... میرے سامنے اب کوئی راستہ نہیں تھا سوائے ایک پی پی پی صدر کو ممنوعہ سیاسی ٹیلی فون کال

کرنے کے "میں چاہتی ہوں کہ تم ان تمام پی پی پی کونسلروں کو پارٹی سے خارج کر دو جنہوں نے ضیاء سے ملاقات کی ہے۔ انہوں نے پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی کی ہے" میں نے تیزی سے یہ پیغام دیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ ٹیلی فون کی نگرانی کی جارہی ہے اور میرے پاس وقت کی بھی قلت تھی۔ ٹیلی فون فوراً ہی ڈیڈ ہوگیا پھر دوبارہ کبھی بحال نہیں کیا گیا۔

میرے رشتے داروں کی بھی کوئی کال نہیں آتی تھی۔ چند ملاقاتی جو مجھے ملنے آیا کرتے تھے بند کر دیئے گئے۔ گیٹ پر تلاش کنند گان نے گھریلو عملے کی سرزنش شروع کر دی...... گھر کے صحن سے باہر جاتے اور آتے ہوئے ان کو اپنے جوتے اور جرابیں اتارنا پڑتیں...... ان کے سروں کے بالوں کی بھی تلاشی لی جاتی...... گوشت اور سبزی کے پیکٹ جو باورچی مارکیٹ سے لاتا انہیں کھول کر تلاشی لی جاتی گھر کا کوڑا باہر جاتا تو تلاشی کی رسم پوری کی جاتی۔

میں دوبارہ مکمل تنہائی میں ڈوب گئی۔ میں نتیجتاً بیمار پڑگئی۔ میرے کان کا درد۔ بہت بڑھ گیا۔ جب میں نے اپنے بائیں رخسار کو رگڑا تو کوئی احساس باقی نہیں تھیں۔ اور کانوں میں شور کی آوازیں بہت بڑھ گئیں۔

میں اپریل کی ایک شام کو جب ۷۰ کلفٹن کے استقبالیہ کمرے میں سے گزر رہی تھی تو مجھے فرش چھت کی طرف اٹھتا ہوا محسوس ہوا میں نے صوفے کے بازو کو پکڑنے کی کوشش کی تاکہ سر کا چکر ختم ہو اور میں سنبھل جاؤں مگر تاریکی کی ایک دیوار میرے سامنے آکھڑی ہوئی میں بے ہوشی کی حالت میں صوفے پر گر پڑی۔ خوش قسمتی سے ایک گھریلو ملازم نے مجھے گرتے ہوئے دیکھ لیا۔ "جلدی کرو جلدی کرو مس صاحبہ کے لئے ڈاکٹر کی فوری ضرورت ہے" وہ جیلروں کو بتانے کے لئے دوڑا۔ اور ایک مرتبہ پھر ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی میری حفاظت کررہا ہے۔ بجائے افسر شاہانہ دفتری طریق کار کے کہ پہلے محکمہ داخلہ کو طبّی علاج کے لئے لکھو پھر متعدد دن جواب کے منتظر رہو بعض اوقات ان کی طرف سے "ہاں" میں دو دو ہفتے بھی لگ جاتے تھے۔ پولیس مڈل ایسٹ ہسپتال کے ایمرجنسی کمرے سے چند گھنٹوں میں

ڈاکٹر کو لے آئی۔ اور ایک مرتبہ پھر میرے کان میں بیماری کا مواد اندر کی بجائے باہر کو پھٹ پڑا۔

ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد رائے دی "تمہاری حالت بہت خطرناک ہے تمہیں فوراً کانوں کے ماہر ڈاکٹر کے پاس جانا چاہئے"۔

"اگر آپ خصوصی طور پر ماہر کو دکھانے کی ضرورت کا نہیں لکھیں گے تو حکومت دعویٰ کرتی رہے گی کہ مجھے کانوں کی کوئی بیماری نہیں" میں نے اسے بتایا۔

نوجوان ڈاکٹر نے حکومت کے لئے اپنی مخصوص زبان میں کانوں کے ماہر ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت پر جرات سے زور دیا۔ اور اپنے ریکارڈ میں یہ بات درج کر دی۔

حکومت نے کان، ناک اور گلے کے اسی ماہر ڈاکٹر کو میرے معائنہ کے لئے بھیجا جس نے تین سال قبل میری ناک کی ہڈی کا آپریشن کیا تھا۔ وہ اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا اسی لئے اس تصنیف میں درج نہیں کیا گیا۔ لیکن وہی تھا جس نے مجھے زندگی میں استقامت دی اور شاید موت سے بچایا۔

"تمہارے کان میں سوراخ ہے" ڈاکٹر نے مجھے بتایا اس طرح میرے چار سال قبل کے خدشات کی تصدیق کی جو مجھے المرتضیٰ کے ایام نظر بندی میں حکومت کے ایک ڈاکٹر کے بارے میں پیدا ہوئے تھے۔ "اس سوراخ کی وجہ سے کان کے اندرونی حصوں میں بیماری کا اثر پھیل گیا ہے" میرے کان کے پیپ زدہ حصے کو باقاعدگی سے دھویا جاتا رہے گا تاکہ چہرے کی نس پر جو دباؤ پڑ چکا ہے اور جس کی وجہ سے بے حسی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس میں کمی آسکے۔ جب پیپ ختم ہو جائے گی تو اس کے بعد آپریشن کی نوبت آئے گی۔

"تمہیں بیرون ملک خوردبینی سرجری کے لئے جانا پڑے گا" اس نے کہا "ہمارے یہاں وہ تکنیکی مہارت میسر نہیں ہے۔ ہمیں کھوپڑی کو آری سے کاٹنا ہو گا۔ یہ خطرناک طریقہ ہے۔ تمہاری سلامتی کے لئے بیرون ملک علاج ہی بہتر ہو گا"۔

میں نے سرد مہری سے اسے دیکھا۔ کیا اس کا مطلب پاکستان میں اس قسم کی جراحت میں عام خطرات سے کچھ زیادہ خطرات کی نشان دہی ہے؟ میرے علم میں تھا کہ ۱۹۸۰ء میں

حکومت میرے ایک ڈاکٹر کو یہ کہنے پر اثر انداز ہوئی تھی کہ میرے کان کے درمیانی حصہ میں کچھ مشکل ہے اور اس کے لئے مجھے نفسیاتی علاج کی ضرورت تھی۔ "ہم تمہاری تشخیص کی مزید تصدیق کے لئے دس میڈیکل بورڈوں کی تشکیل پر بھی تیار ہیں" اسے بتا دیا گیا تھا۔ حکومت کے لئے کتنا آسان حل مل جاتا کہ میرا مسئلہ جسمانی نہیں فقط نفسیاتی تھا۔ لیکن ڈاکٹر نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اب یہ ڈاکٹر بضد تھا کہ میں پاکستان چھوڑ جاؤں "میں آپریشن یہاں بھی کر سکتا ہوں لیکن مجھے خطرہ ہے کہ مجھ پر دباؤ ڈالا جائے گا تاکہ بے ہوشی کے زیر اثر ان کی مرضی پر عمل در آمد کروں" اس نے کہا۔ "اگر میں انکار بھی کر دوں تو وہ کسی اور کو یہی کام کرنے کے لئے بلا لیں گے۔ ہر حالت میں تمہارا فائدہ بیرون ملک جانے ہی میں ہے"۔

میں نے حکومت سے طبی بنیادوں پر بیرون ملک جانے کی اجازت مانگی۔ کچھ عرصہ کوئی جواب نہیں دیا گیا...... مجھے خود بھی کچھ وقفے کی ضرورت تھی۔ "تم ابھی کئی مہینوں کے لئے عام بے ہوشی کی دوائی کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہو"۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا۔ "اپنے اعصابی نظام میں قوت پیدا کرنا ہوگی" اپنی والدہ کی طرح دودھ، گوشت کے قتلے، مرغی کا گوشت اور انڈے زیادہ سے زیادہ پروٹین خوراک کا جزو ہونی چاہئے۔

لیکن میرے کان کی بیماری میں خاص فرق نہ پڑا۔ مجھے چہرے کے بائیں جانب بے حسی بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میرا سر آہستہ آہستہ چکراتا رہتا اور کانوں میں شور کی وجہ سے باہر کی آوازیں سننا محال ہو جاتا۔ ڈاکٹر نے متعلقہ حکام سے اجازت لی کہ وہ ۷۰ - کلفٹن میں آکر اپنی ہفتہ وار آمد کے دوران پیپ زدہ حصے کو باقاعدگی سے دھوتا رہے گا۔ اور اسے بھٹو خاندان کی ایک فرد کے لئے اس تشویش کی قیمت ادا کرنا پڑی۔

"تم اکثر حیدر آباد اپنی کار میں جاتے ہو۔ کیا ایسا نہیں ہے؟" اس کے پڑوسی پولیس سپرنٹنڈنٹ نے اسے پوچھا جب اس نے ۷۰ - کلفٹن میں اپنی ہفت روزہ آمد ۷۰ - کلفٹن میں میرے علاج کے لئے شروع کی۔ "کیا تم نے وہ انگریزی فلم "موت کی خواہش" دیکھی ہے؟" اگلے روز نامعلوم ذرائع نے اس کے گھر ویڈیو فلم پہنچا دی۔ دھمکی آمیز ٹیلی

فون کالیں آنا شروع ہو گئیں۔ انکم ٹیکس حکام سے ایک نوٹس بھی آ گیا کہ وہ اپنی آمدنی کے معائنہ سے احتراز کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اس کی پیشہ وارانہ دیانت بھی زیر عتاب آ گئی اور اسے حکومت کی طرف سے ایک شوکاز نوٹس ملا کہ اسے ہسپتال کی ملازمت سے کیوں نہ برطرف کر دیا جائے؟۔ ڈاکٹر نے ان دھمکیوں کے باوجود میرا ہفت روزہ علاج جاری رکھا اور اپنی بے خوف جرات کا تحسین آمیز مظاہرہ کیا۔ صرف وہی بیرونی دنیا کا فرد واحد تھا جس سے میری گفتگو ممکن تھی ورنہ پیٹر گلبریتھ کے مطابق حکومت اس کے برعکس دعویٰ کر رہی تھی۔

پیٹر گلبریتھ :۔

حکومت پاکستان نے آخر کار جون کے اواخر میں اس خط کا جواب دیا جو سینٹر پیل اور دیگر سینٹروں نے پاکستان میں گرفتار شدہ مخصوص سیاسی قیدیوں کے بارے میں ضیاء کو دسمبر میں تحریر کیا تھا۔ ضیاء کے اس وقت کے تبصرے کو دہراتے ہوئے جوابی خط میں بے نظیر کی نظر بندی کے متعلق لکھا تھا۔

"وہ فی الوقت کراچی میں اپنی ہی رہائش گاہ میں نظر بند ہے۔ تاکہ کسی سیاسی کارروائی میں حصہ نہ لے سکے جو پاکستان میں ممنوع ہے۔ تاہم اسے تمام ممکنہ آسائشیں دستیاب ہیں۔ اور جب کبھی ضرورت پڑے اس کا علاج اس کے اپنے ڈاکٹر کرتے ہیں۔ اس کے دوستوں اور رشتے داروں کو اس سے ملنے کی اجازت ہے۔ آٹھ قریبی رشتے داروں کو تین تین کے گروپ کی شکل میں ایک وقت میں اس کے پاس ٹھہرنے کی اجازت ہے...... اسے اپنی مرضی کے ۲۴ ملازمین گھر پر رکھنے کی اجازت ہے اور اس کے استعمال کے لئے ایک ٹیلی فون بھی نصب ہے۔

جلد ہی بعد میں مجھے بے نظیر کی ایک کزن کی کال موصول ہوئی...... میں نے خط کے حقائق کا اس سے ذکر کیا تو اس نے کہا۔

"بالکل جھوٹ" وہ پھٹ پڑی۔ "کسی دوست کو اسے ملنے کی اجازت نہیں ملی۔

پچھلے تین مہینوں میں اس کی ہمشیرہ صنم صرف ایک بار ملنے میں کامیاب ہوئی۔ اس کی کزن فخری کو بھی بڑی مشکل سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ اسے باہر گھر کے باغ میں بھی جانے کی اجازت نہیں۔ وہ اکیلی ہے اور بیمار۔ مجھے اس کے بارے میں خاصی تشویش ہے"۔

میں نے سینٹر پیل کو ایک یادداشت لکھی۔ یہ اتفاق تھا کہ پاکستان کا وزیر خارجہ اور سابق سفیر پاکستان متعینہ واشنگٹن مسٹر یعقوب خاں شہر میں موجود تھا۔ یعقوب کے واشنگٹن میں بہت سے دوست تھے اور اس کی شہرت بھی بے لاگ اور صاف ستھرے جواب دہندہ کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ بے نظیر کے بارے میں یعقوب کسی دوغلاپن کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ جب سینیٹر پیل نے وزیر خارجہ سے اس ظاہری تضاد کا پوچھا جو بے نظیر بھٹو کے متعلق حکومت کے سرکاری خط اور اب موصول شدہ نئے حقائق کے درمیان تھا تو وہ فوراً چوکنا ہو گیا۔ یعقوب کو اس انکشاف پر صدمہ پہنچا تھا...... اس نے واپس پاکستان پہنچنے پر اس کی تحقیق کا وعدہ کیا۔

۲۱ر جون ۱۹۸۳ء :۔

سال کا طویل دن اور میرا ۳۰ واں یوم پیدائش، ہمیشہ خوش فہمی کا شکار...... میں نے سیکرٹری وزارت داخلہ کو خط لکھا کہ مہینوں سے میرے پاس کوئی ملاقاتی نہیں آیا۔ میں اپنے یوم پیدائش پر اپنی سکول کی چند دوستوں کو اپنے ہاں بلانے کی اجازت چاہتی ہوں۔ میری حیرانی اور خوشی کی انتہاء نہیں تھی جب حکومت نے اجازت دیدی۔

شام کے وقت سمیعہ اور پاری ایک چاکلیٹ کا کیک لئے گھر میں در آئیں۔ پاری نے بڑی محنت سے کیک کو خود تیار کیا تھا۔ پولیس خاتون کی زیر نگرانی ہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئیں اور ایک دوسرے کا منہ چوما۔ "خدا کا شکر کرو کہ کیک صحیح سلامت ہے" سمیعہ نے کہا۔ انہوں نے ہماری مکمل تلاشی لی۔ ہمیں خطرہ تھا کہ تم سے پہلے کہیں وہ ہی کیک کو نہ کاٹ دیں۔

وکٹوریہ شوفیلڈ اور انگلستان میں میرے دیگر دوست مجھے بھلا نہیں سکے تھے۔ جب میرا

یوم پیدائش نزدیک آیا تو وکٹوریہ نے آکسفورڈ یونین کے موجودہ صدر کو خط لکھا کہ میری نظر بندی کے دوران یہ میرا تیسرا یوم پیدائش ہے۔ ۲۱ر جون کو آکسفورڈ یونین نے میری عزت افزائی کے لئے ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی۔ یہ عزت افزائی عام طور پر سابق یونین کے صدر کے انتقال پر اختیار کی جاتی ہے۔ ایک اور پرانا دوست اور سابق صدر کیمبرج یونین ڈیوڈ جانسن بھی اس وقت آکسفورڈ یونین کے مناظرہ کے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے بعد میں آنے والے اتوار کے روز لندن کے ویسٹ منسٹرایبے اور سینٹ پال کے گرجوں میں میرے لئے خصوصی دعاؤں کا اہتمام کیا۔ یہ دونوں تقاریب فکر مندی اور دوستی کا خوبصورت اظہار تھیں۔

عین میرے یوم پیدائش پر حکومت کے ایک رکن کی طرف سے میرے لئے فکر مندی کے اظہار میں کئی خدشات پوشیدہ تھے۔ "آج شام پورے ۷ بجے تیار رہئے" جیل کے ایک کارندے نے مجھے بتایا۔ "ہم آپ کو سرکاری ریسٹ ہاؤس میں لے جائیں گے"

"کیوں؟" میں نے اسے پوچھا۔

"کیونکہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر آپ سے ملنا چاہتے ہیں" اس نے تقریباً فتح مندانہ انداز میں کہا۔

مارشل لا ایڈمنسٹریٹر۔ "میں جنرل کو ملنے نہیں جاؤں گی" میں نے کہا۔

جیل کے کارندے کو صدمہ پہنچا۔ "لیکن تمہیں جانا پڑے گا۔ تم ایک قیدی ہو" اس نے کہا۔

"مجھے پرواہ نہیں" میں نے اسے بتایا۔ "میں اسے نہیں ملوں گی۔ تم مجھے گھسیٹ کر لے جا سکتے ہو۔ اور اگر ایسا ہوا تو میں چلاؤں گی چیخوں گی اور وہاں ایک سین برپا کروں گی۔ میں اپنے گرفتار کرنے والوں کے پاس نہیں جاؤں گی۔ جیل کا کارندہ جلدی سے کھسک گیا، بڑبڑاتے ہوئے کہ میں ہوش میں نہیں تھی کہ جنرل عباسی سے ملاقات کا انکار میرے لئے اچھا نہیں ہو گا۔ لیکن میں نے پرواہ نہیں کی۔ ضیاء کے ہم جیسے مخالفوں کا فوجی حکمرانوں کے ساتھ کسی قسم کا رابطہ اپنے آپ کو فروخت کے مترادف خیال کیا جاتا تھا۔ ان کے پاس

جانے کا مطلب ان کی حکمرانی کو ماننا اور خاموشی سے اس حکمرانی کی تائید کرنا تھا۔

اس شب میں نے ایک سوٹ کیس میں اپنا سامان باندھنا شروع کیا یہ جانتے ہوئے کہ حکومت مجھے واپس جیل بھیج کر اپنا انتقام ٹھنڈا کرے گی۔ میں نے قید خانے میں ضروری احتیاج کی چیزیں مثلاً قلم، ڈائریاں، کیڑے مار ادویات اور غسل خانے کی ضروریات کی ایک مانوس فہرست کے مطابق اشیاء باندھ لیں۔ لیکن مجھے جیل لے جانے کے لئے کوئی بھی نہ آیا۔ اس کی بجائے میں حیرت زدہ رہ گئی جب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ۷۰ - کلفٹن میں خود ملاقات کے لئے آپہنچا۔

یہ ناقابل شنید واقعہ تھا۔ کہ متکبر فوجی حکمران جو دوسروں کو بلانے اور حکم دینے کے عادی ہوتے ہیں خود چل کر آئیں اور مخالفین کے ایک راہنما سے ملاقات کریں۔ میں سفید سر والے جنرل کو ۷۰ کلفٹن میں اپنی خاکی یونیفارم میں متعدد ملاقاتوں سے پہلی ملاقات کے دوران بیٹھے ہوئے بے یقینی میں گھورتی رہی۔ اس کا پیغام ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔

"میں جانتا ہوں تم بیمار ہو" وہ مجھے کہتا رہا۔ "یہ حقیقت ہے کہ میں فوج میں ہوں اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں فکر مند نہیں ہوں۔ یاد رکھو ہمارے خاندانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ نسلوں سے رابطہ رہا ہے۔ میں علاج کے لئے تمہارا بیرون ملک جانا پسند کرتا ہوں۔ لیکن ہم کوئی سیاسی پریشانی مول نہیں لینا چاہتے"۔

باب ۱۱

وطن بدری کا زمانہ

"ممی!"

"پنکی! تم رہا ہو گئی ہو اور آزاد ہو، میں نے کیسے کیسے اس دن کا خواب دیکھا ہے!"
میں آفاق پر نگاہ ڈالتی ہوں، ایک لامتناہی خلا جیسے ہی میں جنیوا ایئرپورٹ سے باہر قدم رکھتی ہوں۔

ٹیلی فون کی گھنٹی پہلے ہی سے بج رہی ہے جب ہم اپنی والدہ کے فلیٹ میں پہنچتی ہیں۔
"ہاں، ہاں" حقیقت میں وہ یہیں ہے" میں اپنی والدہ کو فون پر میر اور شاہ سے کہتے ہوئے سنتی ہوں۔ اس کی رہائی کے بارے میں تم نے بی بی سی پر جو کچھ سنا تھا، صحیح ہے"

میر، شاہ نواز۔ میرے بھائیوں کی اور میری آوازیں ہمارے ہیجان کی وجہ سے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ "تم کیسے ہو؟" میں ٹیلی فون لائن پر زور سے چلاتی ہوں اور ریسیور کو اپنے صحت مند کان کے ساتھ دبا کر رکھتی ہوں۔ "خدا کا شکر ہے، تم زندہ ہو" میر جواب میں چلاتا ہے۔ "میں کل تمہیں ملنے کے لئے آ رہا ہوں۔"

کم از کم ایک ہفتہ یہیں ٹھہرو میں بھی آؤں گا۔" شاہ بھی کہتا ہے۔ "اوہ شاہ! میں نہیں ٹھہر سکتی۔" میں اسے بتاتی ہوں۔ "مجھے ڈاکٹر کے پاس علاج کے لئے لندن جانا ہے۔" ہم ایک دوسرے سے جلد از جلد ملنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

فون کی گھنٹی مستقل بجتی رہتی ہے کبھی لاس اینجلس سے، کبھی لندن، کبھی پیرس سے۔ میری والدہ کے دوست اور رشتے دار انہیں میری رہائی پر مبارک بادیں دے رہے ہیں۔ میں ابھی ہر ایک سے بات کرنے کے لئے تیار نہیں تھی اور صرف یاسمین اور ڈاکٹر نیازی سے لندن میں گفتگو کی۔ اردشیر زاہدی، میرے والدین کا ایک دوست اور ایران کا امریکہ میں سابق سفیر۔ مچھلی کے سلونے انڈوں کے تحفہ کے ساتھ پہنچ گیا۔ ممی، صنمی اور میں تمام رات باتیں کرتے ہوئے جاگتی رہیں۔ یہ سب کچھ ناقابل یقین معلوم ہو رہا تھا۔ گزشتہ کل میں ایک قیدی تھی اور آج میں آزاد ہوں اپنی والدہ اور اپنی ہمشیرہ کے ساتھ۔ ہم سب اکٹھے ہیں۔ ہم سب زندہ ہیں۔

میر! ایک ننھی سی بھورے بالوں والی لڑکی میرے کوٹ کو کھینچ رہی ہے۔ "اپنی بھتیجی کو ملو" میر نے کہا، میری آزادی کے دوسرے روز والدہ کے فلیٹ میں کھڑے ہوئے۔ کیا میرا بھائی واقعی میرے ساتھ کھڑا تھا؟ میں نے اس کے ہونٹ ہلتے دیکھے اور اپنی آواز کو جواب دیتے سنا۔ ہماری دوبارہ ملاقات! کان بڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، کچھ یاد نہیں ہم نے ایک دوسرے کو کیا کہا۔ ۲۹ سال کی عمر میں میر کتنا خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ سیاہ آنکھیں ایک منٹ میں چمکتی اور دوسرے میں جھپکتی اس نے ۱۸ ماہ کی اپنی بیٹی کو بازوؤں میں اٹھا کر میرے آگے کر دیا تاکہ میں اس کا منہ چوم سکوں۔ "منتظر رہو جب شاہ سے تمہاری ملاقات ہوتی ہے۔" میر نے ہنستے ہوئے کہا۔ آخری بار جب شاہ سے ملاقات ہوئی تو وہ ۱۸ برس کا ایک لڑکا تھا۔ اب وہ اپنی مونچھوں سمیت ۲۵ برس کا تھا۔

میں نے الپس کی پہاڑیوں پر سے سورج کو ابھرتے دیکھا اور ٹھنڈی صاف ہوا کو چہرے سے ٹکراتے ہوئے محسوس کیا۔ یہ سب کچھ مجھے خوبصورت لگا اگرچہ میرا کان بند تھا اور منجمد تھا۔ ٹریفک حرکت میں آ رہی تھی اور میں نے نیچے گلی میں جھانکا۔ خفیہ ایجنسیوں کی گاڑیاں عمارت کے نزدیک ایستادہ نہیں تھیں۔ کوئی ایجنٹ نہیں تھے جو دروازوں کے پیچھے چھپے ہوں۔ کیا سب کچھ سچ تھا؟ میں نے اپنے کان کو ملا۔ مجھے درد محسوس ہوا جو اس بات کی یاد دہانی تھی کہ میں بیرون ملک کیوں آئی ہوں۔

دریں اثنا یورپ کے گرد و نواح میں بکھرے ہوئے پاکستانی جلاوطنوں اور انگلستان میں رہائش پذیر ۳۷۸۰۰۰ پاکستانیوں میں میری رہائی کی خبر فوراً ہی پھیل گئی۔ جب صنمی اور میں بذریعہ طیارہ لندن پہنچیں تو پاکستانیوں کا ایک ہجوم ہیتھرو ایئرپورٹ پر ہمارے استقبال کے لئے کھڑا تھا۔ فضا میں سیاسی نعروں کی آواز گونجی تو مجھے ایسے لگا جیسے میں کراچی میں واپس آ گئی ہوں۔

یاسمین نیازی، ہیتھرو ایئرپورٹ

تم ایئرپورٹ پر لوگوں کی تعداد کا اندازہ نہیں لگا سکتے جن میں برطانوی اخبارات کے رپورٹر بھی شامل تھے اور جو بے نظیر کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ایک دوسرے کو آگے پیچھے دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ تو ایسے ہی تھا جیسے وہ مردوں میں سے زندہ ہو کر آ گئی ہے۔ کوئی بھی تصور تک نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اسے دوبارہ دیکھ سکے گا۔ "وہ کون ہے؟ کوئی فلم سٹار یا کچھ اور!" ایک انگریز پولیس کے سپاہی نے مجھے پوچھا جو نہی وہ دوسرے پولیس سپاہیوں کے ساتھ مجمع کو کنٹرول کرنے میں لگا ہوا تھا۔ "وہ ہماری سیاسی راہنما ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ "ایک سیاستدان؟" وہ حیرت زدہ ہو گیا۔

"کیا تم جلا وطنی کاٹنے آئی ہو؟ پریس رپورٹر نے بے نظیر سے پوچھا جب وہ آخر کار دروازے سے باہر نکل آئی۔ اس کے جواب نے ایئرپورٹ پر ہجوم کو بہت سکون دیا اور اسی طرح لاکھوں دوسرے پاکستانیوں کو جنہوں نے بعد میں ریڈیو پر یہ خبر سنی یا اخبارات میں پڑھی "جلاوطنی؟" میں کیوں جلا وطنی میں جاؤں" اس نے جواب دیا۔ "میں انگلستان میں صرف اپنے علاج کے لئے آئی ہوں۔ میں پاکستان میں پیدا ہوئی اور پاکستان میں ہی مروں گی۔ میرے دادا وہاں مدفون ہیں۔ میرے والد وہاں مدفون ہیں۔ میں کبھی اپنے ملک کو نہیں چھوڑوں گی۔" اس کے الفاظ اس کے ہم وطنوں کے لئے ایک بہت بڑی پرامیدی

کا باعث تھے خصوصاً غریب لوگوں کے لئے۔ "میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔ " اس کا پیغام تھا. "میں اپنے آخری سانس تک تمہارے ساتھ رہوں گی۔ بھٹو خاندان ہمیشہ اپنے وعدوں کی پاسداری کرتا ہے۔ "

لندن کے نائٹس برج علاقہ میں آنٹی بہجت کا چھوٹا سا فلیٹ جہاں صنی اور میں ان کے مہمان خانے کے ایک کمرے میں برا جمان ہو گئیں۔ جو پھولوں اور پھلوں کی ٹوکریوں سے لد گیا۔ صحافی اور آکسفورڈ کے پرانے دوست مجھے ملنے کے لئے آئے اور اسی طرح پارٹی کے رہنما اور معاونین۔ لندن پی پی پی کے جلاوطن اراکین کے ان رہنماؤں کا جو ضیاء سازش کے بعد پاکستان سے بھاگ آئے تھے بنیادی ٹھکانہ تھا۔ فون مستقل طور پر بجتا رہتا اور ملاقاتوں کے اوقات کی درخواستیں کی جاتیں۔ "میں صرف دس منٹ لوں گا" ایک کے بعد دوسرا ملاقاتی کہتا اور وہ دریا کے بہاؤ کی طرح آتے جاتے رہے۔

انگلستان میں پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد صرف دروازے کے باہر گھر کی گھنٹی بجا کر کھڑے ہو جاتے۔ آنٹی بہجت اور ان کے شوہر انکل کریم بہت وسیع القلب تھے۔ مگر حالت کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ اس وقت مزید پیچیدہ ہو گئی جب آنٹی بہجت نے پاکستانی مردوں سے بھری ایک کار کو عمارت کے باہر سارا دن کھڑی دیکھا۔ یہ ایک آزاد ملک ہے۔ تم یہ کچھ برداشت مت کرو۔ " آنٹی بہجت نے نصیحت کی جب انہوں نے ایک کار کو جہاں بھی میں گئی میرا پیچھا کرتے دیکھ لیا۔ انہوں نے سکاٹ لینڈ یارڈ کو خبردار کر دیا اور معجزانہ طور پر وہ کار بھی یک لخت غائب ہو گئی۔ ہمیں اس میں اپنی فتح مندی کا چھوٹا سا نشان نظر آیا کہ ہم نے ضیاء کے ایجنٹوں کو مجھے اکیلا چھوڑنے پر مجبور کر دیا لیکن میرے دل میں شکوک باقی رہے۔

باوجود یہاں تمام آزادی کے، میں فلیٹ سے باہر جانے پر خوف زدہ تھی۔ ہر مرتبہ جب میں نے گھر کے دروازہ سے باہر قدم رکھا۔ میرا معدہ، میری گردن اور میرے بازو تناؤ سے کھنچ جاتے۔ میں دو قدم آگے بڑھتی تو مڑ کر پیچھے ضرور دیکھتی کہ کوئی میرا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ اتنے برس قید خانے کی دیواروں میں تنہا زندگی گزارنے کے بعد، لندن کی پر ہجوم

اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل بطروس غالی وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے ہمراہ

گلیاں بھی مجھے دھمکی آمیز محسوس ہوتیں۔ میں اب لوگوں کی، آوازوں کی، اور شور کی عادی نہیں رہی تھی۔ جب بھی ڈاکٹر سے ملاقات کے لئے جانا ہوتا، ٹیوب پکڑنے کی بجائے جو پہلی ٹیکسی مجھے نظر آتی، پکڑلیتی۔ جب میں اپنی منزل پر پہنچ جاتی اور گلی میں باہر نکلنے پر مجبور ہوتی خواہ فاصلہ تھوڑا ہی ہوتا، میرا دل دھک دھک کرنا شروع کر دیتا اور سانس اکھڑ جاتی۔ حقیقی زندگی سے دوبارہ مانوس ہونے میں وقت لگتا ہے۔

میں اپنے اوپر خود اعتمادی کی ایک تہ جمالیتی اور ہر ایک سے اپنی پریشانیوں کو چھپاتی۔ مجھے ایسا کرنا پڑا۔ میری طویل نظربندی اور میرے خاندان کے ساتھ فوجی حکومت کے سلوک نے متعدد پاکستانیوں کی آنکھوں میں ہمیں فوق الانسان آدمیوں کا رتبہ عطا کر دیا تھا۔ میری رہائی کی وسیع تشہیر نے اور انگلستان میں میری آمد نے مجھے ایک عوامی شخصیت کا روپ بخش دیا تھا۔ یہ کسی ایسے شخص کے لئے مناسب یا حوصلہ افزا بات نہیں جو مارشل لاء سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہو کہ ہائیڈ پارک کے ایک کونے میں اچانک بے چینی اور اضطراب کے حملہ کا شکار ہو جائے۔ گہرے سانس لو میں نے اپنے آپ کو کہا جب کبھی مجھے مجبوراً باہر جانا پڑا۔ سکون سے چلو اور پریشانی کا اظہار مت کرو۔

لندن پہنچنے کے چند روز بعد، ایک غیر متوقع ملاقاتی سے ملاقات ہوئی۔ پیٹر گلبریتھ کراچی سے ابھی پہنچا ہی تھا اور دوپہر کے کھانے پر مجھے ملنا چاہتا تھا، آنٹی بہجت نے مجھے بتایا۔ مجھے اپنی رہائی میں اس کے مبینہ کردار کا کچھ علم نہیں تھا اور میں اپنے ایک پرانے دوست کو ملنے کے لئے عمومی طور پر بیتاب تھی۔ اپنے آپ کو حوصلہ دیتے ہوئے میں فلیٹ سے باہر نکلی اور ٹیکسی میں رٹز ہوٹل کا راستہ لیا۔

پیٹر گلبریتھ

میں پرسکون نہیں تھا جب اسے ملنے کے لئے پہنچا۔ عجیب مضحکہ خیز صورت حالات تھی

کہ کسی کو ملے ہوئے سات سال کا عرصہ بیت چکا تھا جس دوران دونوں کو زندگی کا مختلف تجربہ ہوا۔ میں رٹز ہوٹل کی انتظار گاہ میں کچھ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا جہاں لوگ چائے پینے کے لئے اکٹھا ہوتے ہیں۔ وہ غیر متوقع طور پر صحت مند معلوم دیتی تھی جب وہ وہاں پہنچی اور ہم فوراً ہی کھانے کے لئے چلے گئے۔ مجھے کوئی خاص قسم کی توقعات تو نہیں تھیں لیکن وہ یقیناً مختلف محسوس ہوئی۔ وہ ایک نئی قسم کی خود اعتمادی کی مالک تھی بے تناؤ کی وہ خود اعتمادی جو ۱۹۷۷ء سے آکسفورڈ کے زمانہ میں، میں نے نہیں دیکھی تھی۔

وہ ہمیشہ ہی پر کشش تھی مگر اب تک ہر دل عزیز تھی اور سب کی توجہ کا مرکز۔ اس بات میں ایسا کوئی پہلو نمایاں نہیں تھا "مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے۔" اس نے درمیان سے کچھ کہانی سنائی اور میں نے واشنگٹن کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا اور ان تمام مساعی کا ذکر کیا جو سینیٹر پیل اور دیگر حضرات نے اس کے لئے سرانجام دیں، میں نے اسے اپنے مشترکہ دوستوں کے حالات زندگی سنائے اور اپنے بیٹے کی تصویریں بھی دکھائیں۔

جب ہم ٹھہرانے کے بعد اس کی خالہ کی رہائش گاہ میں پہنچے تو میں نے اسے ریاست کے خطرناک خارزار سے احتراز کا مشورہ دیا۔ "پاکستان میں تمہیں قید ہی نہیں، قتل کا خطرہ بھی مول لینا پڑتا ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ "تم امریکہ کیوں نہیں آ جاتیں تاکہ آرام سے زندگی گزارو۔ شاید تمہیں ہارورڈ کے بین الاقوامی امور کے مرکز میں فیلو شپ حاصل ہو جائے۔"

"تاہم اس نے میری رائے پر پرجوش ردعمل کا مظاہرہ کیا کہ وہ امریکہ کسی ثمر آور دورے پر روانہ ہو۔ وہ جانتی تھی کہ غیر ملکی اثرات اور پرچار پاکستان کے سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لئے کافی اہمیت کا حامل تھا۔ موجودہ مسئلہ جس کے متعلق چلتے چلتے گفتگو ہوتی رہی وہ اس کا کان تھا۔ میں بھولتا رہا کہ اس کا کونسا کان بہرہ تھا میں شائد غلط کان میں گفتگو انڈیلتا رہا۔

جنوری کے آخری ہفتہ میں میرے کان کی خورد بینی جراحت میں پانچ گھنٹے لگے۔ جب میں یونیورسٹی ہسپتال میں بے ہوشی سے ہوش میں آئی تو میرا سرجن مسٹر گراہم وہاں تھا۔ "مسکراؤ" اس نے مجھے کہا۔ میں سمجھی وہ میرا حوصلہ بڑھانا چاہتا ہے میں نے متزلزل انداز میں مسکرانے کی کوشش کی۔ بعدازاں اس نے جوس کا گھونٹ پینے کے لئے دیا۔ "اس کا کیا ذائقہ ہے" اس نے پوچھا "لذیذ" میں نے جواب دیا۔ اس نے میرے چارٹ پر کچھ علامتیں بنائیں۔ "تمہارا آپریشن بالکل ٹھیک ہوا ہے۔" اس نے کہا "تمہارے چہرے کے بائیں طرف کی نس زخمی نہیں ہوئی اور تمہارے ذائقہ کی حس بھی ختم نہیں ہوئی۔"

میں کولنگم باغات کے خوبصورت درختوں سے آراستہ علاقے میں کرائے کے ایک عارضی فلیٹ میں اپنی والدہ کے ساتھ آہستہ آہستہ جانبر ہوتی رہی۔ ہفتوں تک مجھے بستر پر سیدھا لیٹنا پڑا۔ دس منٹ سے زیادہ بیٹھنا بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ پھر میرا سر درد سے پھٹا جاتا اور جی متلانے اور چکرانے کے دورے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ جب بالاخر میں بیٹھنے کے قابل ہو جاتی تو کوئی کتاب پڑھنا اور کچھ لکھنا محال ہوتا اور سردرد کا عارضہ پھر بے حال کر دیتا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میرا سر پھٹ جائے گا۔ "تمہارا ردعمل غیر معمولی نہیں ہے۔" مسٹر گراہم مجھے تسلی دیتے جب میں اپنے کان کے معائنہ اور اپنی سماعت کے ملاحظہ کے لئے وقفے وقفے سے باقاعدہ ان کے پاس جاتی۔

میں چھ ہفتوں کے ملاحظہ کے بعد ان سے یہ خبر سن کر ہل گئی کہ ہو سکتا ہے کہ "نو مہینے سے ایک سال تک کے عرصہ میں مجھے ایک اور آپریشن کرانا پڑے۔" نو ماہ سے ایک سال تک میرا لندن میں اتنی طویل مدت تک رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں پاکستان واپس اپنے گھر جانے کا سوچ رہی تھی اگرچہ میری والدہ، آنٹی بہجت، صنی اور یاسمین مجھے یورپ میں ٹھہرنے پر زور دے رہی تھیں۔

"سیاست سے کچھ عرصہ کے لئے چھٹی لے لو اور میرے ساتھ رہو۔ اب واپس گئی تو ضیاء تمہیں دوبارہ جیل میں ڈال دے گا اور ہو سکتا ہے باہر زندہ نہ آؤ۔" میری والدہ نے مجھے سمجھایا۔ "جیل میں بھی حکومت کے خلاف میں مرکز ثقل کے طور پر زندہ رہوں
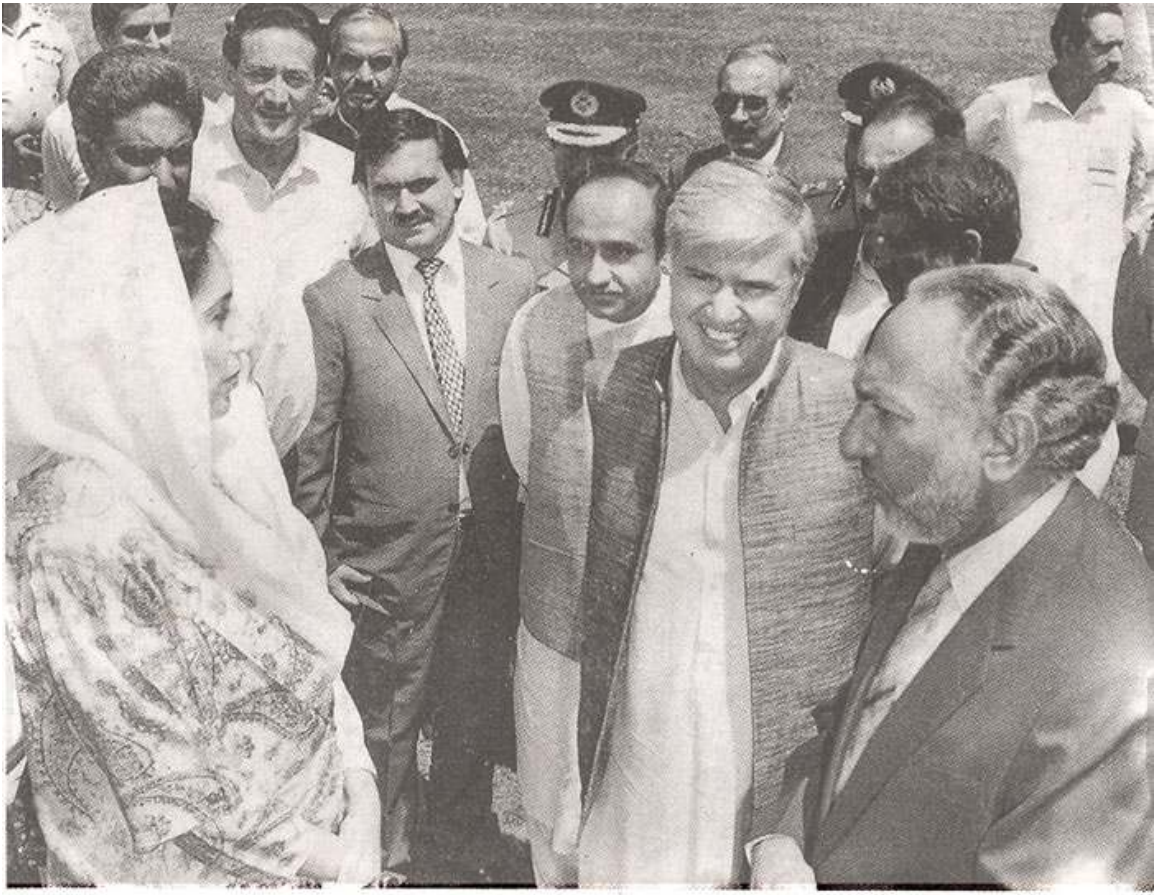
دورۂ سرحد کے موقع پر وزیر اعظم بے نظیر بھٹو، گورنر خورشید احمد خان اور وزیر اعلیٰ سرحد آفتاب احمد خان شیرپاؤ کے ہمراہ

گی۔ " میں نے ان کی دلیل کو کاٹا۔ "یہاں سے بھی حکومت کے خلاف تم عوام کے لئے مرکز اتحاد بن سکتی ہو"۔ انہوں نے اصرار کیا۔ ڈاکٹر کے الفاظ ان کی دلیل کو زور آور بناتے تھے مگر میں پھر بھی نارضامند تھی۔ نو ماہ کے طویل عرصہ میں بہترین طور پر اپنا وقت کیسے گزار سکتی تھی؟

جب قوت ذرا بحال ہوئی تو میں نے پاکستانی جیلوں میں بند ۴۰،۰۰۰ سیاسی قیدیوں سے حکومت کی بدسلوکی کا پردہ فاش کرنے کی مہم کو مہمیز دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اگرچہ پاکستان مغربی یورپی ممالک اور ریاستہائے متحدہ سے مالی امداد وصول کر رہا تھا مگر یہ جمہوری ممالک ضیاء کی حقوق انسانی کی خلاف ورزیوں کی جانب کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ ایک ممتاز اور کچھ عرصہ پیشتر رہا شدہ سیاسی قیدی کی حیثیت سے جو جلاوطنی کے دن گزار رہا ہو، میں اس پوزیشن میں تھی کہ پاکستان میں جو مظالم ڈھائے جارہے تھے ان کا پردہ چاک کروں۔ شاید اس طرح جمہوری ممالک ضیاء پر امداد بند کر دینے کی دھمکی کے حوالے سے کچھ دباؤ ڈالیں کہ وہ بلا جرم اور بغیر سماعت سالہا سال تک جیلوں میں لوگوں کو ٹھونسنے کا سلسلہ بند کرے اور صرف سیاسی مخالفت کی بنا پر بے گناہ افراد کی سزائے موت بھی ختم ہوسکے۔

۱۸ سیاسی قیدیوں پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جانے والا تھا جن پر حکومت کا تختہ الٹنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ ۵۴ دوسرے قیدیوں پر جو لاہور کی کوٹ لکھپت جیل میں بند تھے، الذوالفقار کے ساتھ مل کر بغاوت اور مجرمانہ سازش کے مقدمات بنائے گئے تھے۔ کراچی سٹیل مل کا مزدور لیڈر ناصر بلوچ کراچی میں چار دیگر ساتھیوں کے ساتھ طیارہ کے اغوا میں ساز باز کے جھوٹے الزامات میں دھرلیا گیا تھا جن پر فوجی عدالت میں سزائے موت بھی دی جاسکتی تھی۔ ضیاء کے فوجی انصاف کا کرشمہ تھا کہ بہت کم لوگوں کو خواہ وہ پاکستان کے اندر رہتے تھے یا باہر، یہ علم تھا کہ کہیں کوئی مقدمہ بھی زیر سماعت تھا اور اگر تھا تو ملزم کے خلاف کیا شہادت گزاری جارہی تھی۔

مجھے ناصر بلوچ کی گرفتاری کا علم ۱۹۸۱ء میں سکھر جیل میں جیل سپرنٹنڈنٹ سے حاصل ہوا تھا۔ ناصر بلوچ اور اس کے ساتھی ملزموں کا مقدمہ فوجی عدالت میں پیش کرنے کے لئے

دو سال کا طویل عرصہ لگا۔ صدارتی حکم نمبر ۴ کی رازدارانہ شقوں کے مطابق نہ صرف ایک ملزم مجرم تھا جب تک بے گناہ ثابت نہ ہو جائے بلکہ آفیشل سیکرٹ قواعد کے تحت عدالتی کارروائیوں کا انکشاف بھی ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ ان کے مقدمہ کی سماعت کے متعلق مجھے کراچی سنٹرل جیل میں ناصر بلوچ کی ایک تحریر سے پتہ چلا جو جیل کا ایک ہمدرد پہرے دار اس کی جانب سے خفیہ طور پر لے کر آیا۔

"فوجی عدالت پہلے ہی ہمارے خلاف اس قدر تعصب کا اظہار کر چکی ہے کہ ہم قبر میں گڑے مردوں کی طرح ابھی سے پڑے ہیں۔" اس نے مئی ۱۹۸۳ء میں اپنے خط میں لکھا۔ "عدالت کے آٹھ گھنٹے کی کارروائی کے دوران ہمیں نہ نوٹس لکھنے کی اجازت ہے نہ پانی پینے نہ رفع حاجت کی اور نہ ہی نماز پڑھنے کی۔ ہمارے ہاتھوں اور پاؤں میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈالی ہوئی ہیں۔ جب ہمارا وکیل صفائی حاضر نہ ہوسکا تو کارروائی اس رائے زنی کے ساتھ جاری رکھی گئی "ہمیں صرف مستغیث اور ملزمان کی ضرورت ہے" فروری ۱۹۸۴ء میں اس کے مقدمہ کی سماعت ابھی بھی جاری تھی۔

مجھے ایک اور مزدور رہنما ایاز سموں کے بارے میں بھی تشویش تھی جسے دسمبر ۱۹۸۳ء میں گرفتار کیا گیا تھا اور جنرل ضیاء کے ایک حمایتی کے قتل میں بے گناہ ملوث کیا گیا تھا۔ اس کے مقدمہ کی سماعت فوجی عدالت میں جلد ہی ہونے والی تھی۔ بلوچ کی طرح سموں کو بھی ضیاء حکومت نے اس لئے گرفتار کیا تھا تاکہ کراچی جیسے صنعتی شہر میں مزدور تحریک کو پوری طرح کچل دیا جائے۔ بلوچ کے مقدمہ کی طرح سموں کے خلاف الزام بھی سزائے موت کا مستوجب تھا۔ ہمیں اس سلسلہ میں جلد از جلد کچھ کرنا تھا۔

جب میں بستر پر بیٹھنے کے قابل ہوئی تو میں نے اپنے قید خانے کے دوران رقم کردہ اشارات سے اور پاکستان میں پارٹی کے ہمدردوں کی رپورٹوں سے سیاسی اذیت ناکیوں کی ایک فہرست مرتب کرنا شروع کر دی۔ مجھے ایمنسٹی انٹرنیشنل کو باخبر رکھنے کی اہمیت کا اس وقت احساس ہوا جب میں نے دیکھا کہ انسانی حقوق کے ادارے عالمی رائے عامہ کو کس طرح بیدار رکھتے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ وکیل رضا کاظم کے

بارے میں کیا جو ماہ جنوری میں اپنے لاہور کے گھر سے گرفتار ہوا اور اس کے بعد اس کے بارے میں کچھ معلومات مہیا نہیں تھیں۔

رضا کاظم کے سلسلہ میں مغربی پریس نے ایمنسٹی کے نعرہ "عمل پر فوری توجہ" کے بارے میں بہت تشہیر کی۔

"اس ضمن میں لاہور (پاکستان) کے رضا کاظم کی گمشدگی پر توجہ کی ضرورت ہے" "دی نیشن" نے مارچ میں شائع شدہ ایک مضمون میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی حیرت کن تعداد کے بارے میں لکھا۔ "ریاستہائے متحدہ امریکہ جو پاکستان کو سالانہ ۵۲۵ ملین ڈالر کی فوجی اور اقتصادی امداد مہیا کرتا ہے، اس معاملہ میں بے حسی کا شکار ہے............ ظاہری طور پر وزیر خارجہ غیر ملکی امداد کی شرائط کے بارے میں امریکی قانون کو بھلا بیٹھے ہیں، جس کے متن کا کچھ حصہ درج ذیل ہے۔ "کوئی امداد کسی ملک کی ایسی حکومت کو مہیا نہیں کی جائے گی جو بین الاقوامی طور پر منظور شدہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں مستقلاً ملوث ہوتی ہے۔ ان خلاف ورزیوں میں اذیت رسانی، بغیر کسی الزام کے طویل نظر بندی۔ شخصی زندگی، آزادی اور سلامتی پر واضح قدغن ایسے امتناعی امور شامل ہیں"۔

اس مضمون کی اشاعت بر وقت تھی۔ مجھے مارچ میں عالمی امن پر تقریر کرنے کے لئے کارنیگی کے ادارے نے مدعو کیا تھا۔ سیاسی قیدیوں کے بارے میں معتدبہ مواد اور خطابت کی اپنی کتاب سے مسلح ہو کر یاسمین اور میں امریکہ پرواز کر گئیں۔

ایک مرتبہ پھر میں کانگرس کی طویل راہداریوں میں سے گزر رہی تھی۔ ہارورڈ میں ایک طالبہ کی حیثیت سے میں امریکہ کے جمہوری طرز حکومت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکہ کی ویت نام جنگ میں ملوث ہونے کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے واشنگٹن گئی تھی۔ اب میں اپنے ملک میں جمہوریت کو موت کی نیند سلا دینے والی حکومت کے خلاف اظہار احتجاج کے لئے یہاں آئی تھی۔ اپنی پہلی آمد پر میں نے اظہار خیال سے اجتناب کیا تھا کیونکہ مجھے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر بطور ایک غیر ملکی فرد کے امریکہ بدر کیا جا سکتا تھا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ میں بہت زیادہ گفتگو کر سکتی تھی۔ متواتر ایک ہفتے تک میں پاکستان میں انسانی

حقوق کی خلاف ورزیوں کے خاتمہ اور بحالی جمہوریت کی ضرورت پر بولتی رہی کبھی ایڈورڈ کینڈی کے ساتھ اور کبھی سنیٹر کلیبورن پیل کے ساتھ جن کی کوششوں سے مجھے رہائی مل سکی۔ اور جس کا میں نے شکریہ بھی ادا کیا اور اس طرح جس کسی سے ملاقات ہوئی میں نے اپنی آمد کے مقصد پر کھل کر اظہار خیالات کیا۔ پیٹر گلبریتھ نے کیپٹال ہل میں دیگر ملاقاتوں کے انتظام میں میری اعانت کی۔ میں کیلیفورنیا کے سنیٹر ایلن کرینسٹن سے ملی۔ نیویارک کے کانگرس کے رکن سٹیفن سولارز سے ملی، وزارت خارجہ کے اراکین اور قومی سلامتی کونسل کے معاونین سے بھی ملی۔ میں نے سابق اٹارنی جنرل ریمزے کلارک سے بھی گفتگو کی جو میرے والد کے مقدمہ کی عدالتی کارروائی دیکھنے کے لئے پاکستان بھی آئے تھے۔ اور سنیٹر میک گورن سے بھی ملاقات ہوئی جس کی ہارورڈ میں بطور ایک طالب علم کے میں نے حمایت کی تھی۔ اب مجھے امید تھی کہ وہ پاکستان میں انسانی حقوق کی بحالی کے سلسلہ میں میری حمایت کریں گا۔

واشنگٹن میں پاکستان ایک تازہ موضوع کے طور پر اراکین اسمبلی کے ذہنوں پر حاوی تھا۔ پاکستان کے غیر تصدیق شدہ نیوکلیئر پروگرام کی وجہ سے پاکستان کے لئے ۱۹۸۳ میں ۲ء۳ ملین امداد کا پاس کردہ پیکج تنسیخ کے خطرہ سے دو چار تھا۔ ماضی میں سینٹ نے اپنی توجہ اس نقطے پر مرکوز کی تھی کہ امداد کا اجراء پاکستان کے پاس "بم ہونے یا نہ ہونے پر منحصر" نہیں ہوگا بلکہ اس امر پر کہ "بم کا تجربہ" کیا گیا یا نہیں۔ ۱۹۸۴ء میں میرے دورہ کے دوران اس سقم کو سینٹر جان گلین اور سنیٹر ایلن کرینسٹن ایک ترمیم کے ذریعے دور کرنے میں کوشاں تھے جس کا مقصد پاکستان کو امداد کا تعطل تھا جب تک صدر امریکہ تحریری طور پر اس بات کی تصدیق نہ کر دیں کہ پاکستان "نیوکلیائی دھماکہ کا نہ کوئی کل پرزہ" رکھتا ہے اور نہ ہی ایسا مواد حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو ایسے "آلے کی ایجاد کا باعث ہو جس سے دھماکہ ممکن ہو۔" ۲۸ر مارچ کو تعلقات خارجہ کمیٹی نے متفقہ طور پر اس ترمیم کی منظوری دیدی۔

میں واشنگٹن میں نیوکلیائی مسئلہ پر مباحثہ کے لئے نہیں آئی تھی۔ اس لئے بے خبری میں اس سوال کا سامنا کرنا پڑا جب تعلقات خارجہ کمیٹی کے سینیٹر چارلس پرسی نے مجھے پوچھا کہ میں نیوکلیائی مسئلہ پر امداد کی تنسیخ کی حمایت کرتی ہوں یا نہیں۔ ''سینیٹر! امداد کی تنسیخ سے ہمارے دونوں ملکوں میں غلط فہمیاں پیدا ہونے کا خدشہ ہے'' میں نے ایک لمحے کے وقفہ کے بعد جواب دیا۔ ''ہمارے دونوں ملکوں کی بہتر خدمت اس طرح ہو سکتی ہے اگر امداد کو پاکستان میں انسانی حقوق اور جمہوریت کی بحالی سے منسلک کر دیا جائے'' سینیٹر پرسی جو میرے والد کو بھی جانتا تھا مسکرایا اور میرے خیالات پر شکریہ ادا کیا۔ اور میں اگلی ملاقات کے لئے روانہ ہو گئی۔

ملاقاتوں کے دوران میں طویل راہداریوں میں سے گزرتی ہوئی تعلقات خارجہ کمیٹی میں پیٹر گلبریتھ کے دفتر میں بھی گئی۔ ''تم بہت تیز بولتی ہو'' پیٹر نے مجھے سکھایا۔ اور کیپیٹال ہل میں اپنی ملاقاتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا مشورہ دیا۔ ''آہستہ بولو اور ایک وقت میں صرف ایک نکتے پر زور دو'' میں نے اس کی نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کی لیکن تنہائی کے طویل عرصہ میں خاموشی کی وجہ سے جو الفاظ تحت الشعور میں دفن ہو گئے تھے، خود بخود باہر نکلنے کی کوشش کرتے تھے۔ ''بے نظیر بھٹو ایسے بولتی ہے جیسے اپنے کھوئے گئے وقت کی کمی کو پورا کر رہی ہو'' کلیرا ہال نے اوائل اپریل میں واشنگٹن پوسٹ میں میرا خاکہ کھینچتے ہوئے لکھا۔ ''فقرے اس کے مبہم برطانوی لہجے سے تیر کی طرح باہر نکلتے ہیں مرتب ہوتے ہیں مگر زبان سے پھسلتے جاتے ہیں دریں اثناء اس کے ہاتھ بھی متحرک ہوتے ہیں۔ کبھی پیشانی کو پونچھتے ہوئے اور کبھی لٹوں کو کریدتے ہوئے۔

کلیرا ہال ٹھیک ہی کہتی تھی...... میں کھوئے ہوئے وقت کی کمی پورا کر رہی تھی اور میں بہت گھبرائی ہوئی بھی تھی۔ میری یادداشت جو نظر بندی کی مدت سے پہلے شاندار تھی اب میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اکثر میں تاریخوں اور ناموں کی تلاش میں کھو جاتی۔ کبھی وہ یاد آتے اور کبھی بھولی رہتی۔ اور لوگوں میں اپنے آپ کو پر سکون محسوس نہ کرتی۔ اگرچہ میں سرکاری اہلکاروں اور پریس کے نمائندوں کی کافی بڑی تعداد سے ملتی رہی، میں

انٹرویو سے گھبراتی تھی۔ سنیٹر کرینسٹن سے ایک روز گفتگو کے دوران مجھے محسوس ہوا میرے گال سرخ ہو گئے ہیں گرمی میرے چہرے پر پھیل گئی اور میری پیشانی پر پسینے کے قطرے جمع ہوگئے۔ "کیا تم ٹھیک ہو؟" اس نے تشویش سے مجھے پوچھا۔ "ہاں، ہاں میں ٹھیک ہوں" میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

کارنیگی وقف کے ادارے میں اپنی تقریر کی شب میں خصوصاً گھبراہٹ محسوس کر رہی تھی۔ سامعین میں وزارت خارجہ اور وزارت دفاع کے اہل کار، اراکین کانگرس، سابق سفراء، اور پریس کے نمائندے شامل تھے۔ مغربی پریس ضیاء کے تشخص کو ایک رحم دل آمر کے روپ میں اجاگر کر رہا تھا جو پاکستان میں استحکام کا سبب تھا۔ اب یہ ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی کہ میں اس کی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا پردہ چاک کروں اور پاکستانی سالمیت کو فوجی حکومت کی مرکزیت کے خطرات سے پہنچنے والے نقصان کی نشان دہی کروں۔ سامعین میں سے بااثر اراکین ہی ضیاء پر دباؤ ڈال سکتے تھے تاکہ وہ سیاسی قیدیوں کو رہا کرے اور آزادانہ انتخابات منعقد کرائے۔ اور پاکستان میں جمہوریت کو بحال کرے۔ بااثر اشخاص کی امداد کی بہت اہمیت تھی۔

"پر سکون رہو" میں نے اپنے آپ کو تنبیہ کی جب میں تقریر کرنے کے لئے اٹھی۔ "خیال کرو کہ تم اکسفورڈ یونین میں ہو" لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ یونین کے مباحث ذہنی کھیلوں کے مترادف تھے۔ اب مجھے ہزاروں سیاسی قیدیوں کی زندگی اور ملک کے سیاسی مستقبل کا مسئلہ گھمبیر معلوم ہو رہا تھا۔ "ضیاء کی غیر قانونی حکومت کو حمایت ملنے پر ہم الجھاؤ کا شکار ہیں اور مایوس ہیں" میں نے ممتاز مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں آپ کی سیاسی مصلحتوں کا بھی خیال ہے لیکن ہم آپ کو یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اپنے مفاد کے باوجود پاکستان کے عوام سے بے رخی کا مظاہرہ نہ کریں"۔

تقریر کے دوران میں نے حاضرین پر نگاہ ڈالی اور اپنے پاؤں سے اکھڑ گئی۔ ہال میں مکمل خاموشی تھی اور میں تیزی سے اپنے کاغذات اتھل پتھل کر رہی تھی۔ میں ایسا کیوں کر رہی تھی؟ کاش زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں...... میں نے اپنے آپ پر قابو

پانے کی کوشش کرتے ہوئے خود اعتمادی حاصل کی اور تقریر جاری رکھی کہ امریکی حکومت کے حاضراہل کاروں کو امریکی امداد کو انسانی حقوق سے منسلک کرنا چاہئے۔ سوال و جواب کے دورانیہ میں میری کارکردگی بہتر تھی اور اپنی تقریر کو تالیوں کی گونج میں ختم کرتے ہوئے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ اگرچہ میں اپنی پرانی شخصیت مجتمع نہ کر سکی مگر اپنے نقاط پر زور دینے میں کامیاب رہی۔

واشنگٹن سے یاسمین اور میں نیویارک پہنچیں۔ پاکستانی سفارت خانے کی سراسیمگی کے باوجود، مجھے نیویارک میں ٹائم لائف کی عمارت میں ٹائم میگزین کے اعلیٰ ترین ایڈیٹروں سے ملاقات کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ شاید یہ اعزاز پاکستان میں حزب مخالف کے رہنما کو پہلی مرتبہ ملا تھا۔ لیکن میرے لئے فائدہ کی ایک یہ صورت بھی تھی کہ میں ہارورڈ میں ٹائم کے موجودہ ایڈیٹر کی ہم جماعت رہی تھی اور میں نے واشنگٹن سے اسے اطلاع دی تھی کہ اگر ہو سکے تو ایسی ملاقات کا انتظام کرے۔ ٹائم لائف کی عمارت میں یاسمین کے ہمراہ میری آمد نے کافی ہلچل پیدا کی۔

جب ہم بذریعہ لفٹ عمارت کی ۴۷ ویں منزل میں پہنچیں اور نجی کھانے کے کمرے میں گئیں تو وہاں کرسی نشین ایڈیٹروں نے ہماری طرف حیرت سے دیکھا۔ میں بھی گھبرائی کہ شاید ہم غلط کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔

"کیا تمہیں والٹر راستے میں نہیں ملا؟ وہ سیڑھیوں سے نیچے تمہارا انتظار کر رہا ہے" خاموشی کو ایک آواز نے توڑا۔

"میں نے اسے نہیں دیکھا" میرا جواب تھا۔

"لیکن حفاظتی پہرے داروں کے درمیان سے تم یہاں کیسے پہنچ گئیں"۔

"ضیاء کے پاکستان میں پہرے داروں سے بچ نکلنا بھی ایک انسان سیکھ جاتا ہے"۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ظہرانے کے دوران ایڈیٹروں نے اتنے سوالات کی بوچھاڑ کر دی کہ لذیذ پھلوں کا سلاد اور پنیر کا لنچ پورے ذوق سے نہ کھا سکی کیونکہ ہارورڈ کے قیام کے دوران یہی میرا پسندیدہ

کھانا تھا۔ "پاکستان کے لئے امریکی امداد اکثر پاکستانیوں کی نظر میں ضیاء کے لئے امداد ہے" میں نے انہیں بتایا۔ "تم سب اس غلط فہمی کو دور کرنے میں مدد دے سکتے ہو اگر صحافتی میڈیا انسانی حقوق پر زیادہ توجہ مرکوز کرے۔ پاکستان میں سیاسی قیدیوں کے لئے ایسی تشہیر کا مطلب زندگی اور موت میں باریک سا فرق ہے"۔

مجھے اتنی شہرت ملی جس کی مجھے امید نہیں تھی جب امریکہ میں دو ہفتے کے دورے کے بعد یاسمین اور میں لندن واپسی کے لئے تیار ہوئیں۔ ۳ر اپریل کو سینٹ کی تعلقات خارجہ کمیٹی نے امریکی امداد کے لئے سخت نیوکلیائی شرائط پر اپنی متفقہ پوزیشن کو بدل دیا اور قانون میں نئی ترمیم پاس کی جس کے مطابق پاکستان کو امداد کا اجراء صدر امریکہ کے اس سرٹیفکیٹ سے منسلک کر دیا کہ "پاکستان کے پاس نیوکلیائی بم نہیں تھا۔ اور امریکی امداد کافی کم کر دی جائے گی اگر پاکستان کے قبضے میں نیوکلیائی دھماکہ کے کل پرزے موجود ہوئے" اگرچہ میرا شبہ تھا کہ پالیسی میں تبدیلی کی وجہ ریگن انتظامیہ کا شدید دباؤ ہو گا مگر سینیٹر پرسی نے اپنے ووٹ کا اس ترمیم کے حق میں جانے کا تمام اعزاز میرے دلائل کو دیا۔

جب میں لندن واپس پہنچی تو میں نے سینٹ پال کیتھڈرل کے نزدیک باربیکن میں ایک قلعہ نما عمارت کا فلیٹ کرائے پر لیا۔ میں اپنے آپ کو یہاں محفوظ سمجھتی تھی۔ اس عمارت میں تمام ملاقاتیوں کی آمد کا ڈیوڑھی ہی میں اعلان کر دیا جاتا اور میں دسویں منزل میں اپنی سلامتی کے بارے میں کافی ہوشیار رہتی جہاں کسی پاکستانی ایجنٹ کا پہنچنا بھی ناممکن تھا۔ جلاوطنی میں یہی عمارت ڈاکٹر نیازی اور یاسمین کا بھی ٹھکانہ تھی اور ہم تمام دن ایک دوسرے کے فلیٹ میں آتے جاتے رہتے۔

جلد ہی باربیکن کی عمارت پی پی پی کا انگلستان اور دیگر ملحقہ ممالک میں تمام یونٹوں کا مرکز حاکمیت بن گئی۔ فلیٹ تیزی کے ساتھ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، فرانس، کینیڈا، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، ڈنمارک، سویڈن اور آسٹریا اور اسی طرح آسٹریلیا، سعودی عرب، بحرین اور ابوظہبی میں پی پی پی کی شاخوں کی فائلوں سے بھرتا چلا گیا۔ پاکستانی رضاکاروں پر مشتمل مخلص ترین عملہ کام کرنے کے لئے آموجود ہوا۔ سمبلینہ، انگلستان کی رہائشی

ایک نوجوان لڑکی ٹائپ کا کام سنبھال لیتی، ناہید ایک جلا وطن سرگرم کارکن اور طالبہ ٹیلی فون پر جوابات دیتی اور صفدر عباسی، ایک قانون کے طالب علم کی امداد کرتی جو پی پی پی کی مرکزی ایگزیکٹو کمیٹی کی رکن ڈاکٹر اشرف عباسی کا بیٹا تھا اور پاکستان کے تمام خطوط کا جواب بھیجتا۔ بشیر ریاض ایک صحافی جس نے میرے والد کی زندگی بچانے کے لئے ایک مہم چلانے میں میرے بھائیوں سے تعاون کیا تھا ہمارا اخباری ترجمان بن گیا، اور پریس کے ساتھ انٹرویوز کا مہتمم بھی تھا۔ ڈاکٹر نیازی ایک اور جلا وطن صفدر ہمدانی اور سابق وزیر اطلاعات مسٹر نسیم احمد کے ساتھ شامل ہو گئے تاکہ ہماری خبریں برطانوی اراکین پارلیمینٹ تک پہنچاتے رہیں۔ ہمیشہ کی طرح سے اب بھی یاسمین ہر طرح سے ہماری امداد کے لئے تیار رہتی۔ ہم اکھٹے مل کر پاکستان سے موصول شدہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی تمام رپورٹیں اور خطوط ایک سونے کے کمرے میں انڈیلتی رہتیں اور وہیں اپنا دفتر جما کر تمام مواد کا معائنہ کرتیں۔

ہم سیاسی قیدیوں کی تصویریں، ان کے مقدمات کی تفاصیل اور دیگر خطوط اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل، نائب وزیر خارجہ امریکہ برائے انسانی حقوق مسٹر ایلیئٹ ابرمز. وزرائے خارجہ، وکلاء کے اداروں اور بین الاقوامی تجارتی انجمنوں کو ارسال کرتی رہتیں۔ ہم برطانوی اراکین پارلیمینٹ، ایمنسٹی انٹرنیشنل، اور عالمی رہنماؤں سے ان ممالک کے سفارت خانوں کے توسط سے ملاقاتیں کرتیں۔ ناصر بلوچ کی زندگی نازک مرحلے میں تھی اور اس طرح متعدد قیدیوں کی زندگی کا چراغ آخری دموں پر محسوس ہوتا تھا اور ہم دوڑ میں پیچھے جا رہے تھے۔

پاکستان بھر میں تمام بار ایسوسی ایشنوں کے احتجاجات کے باوجود، تین نوجوانوں کو ایک پولیس سپاہی کے قتل میں جعلی طور پر ملوث کر کے ایک خصوصی فوجی عدالت میں خفیہ سماعت مقدمہ کے بعد پھانسی چڑھا دیا گیا۔ "ان تینوں نوجوانوں کو پھانسی سے بچایا جا سکتا تھا۔ جنہیں پچھلے تین برسوں سے زنجیروں میں باندھ کر رکھا گیا تھا اگر یورپ اور شمالی امریکہ کے سیاسی حلقے اور ذرائع ابلاغ ان کی قسمت میں تھوڑی سی بھی دلچسپی کا اظہار کرتے اور اسی

طرح باقی ہزاروں قیدیوں کی زندگیاں بھی بچائی جا سکتی تھیں" میں نے اراکین حکومت اور پریس کے نمائندوں کو خطوط لکھے جن کے نام ہماری ڈاک کی بڑھتی ہوئی فہرست میں شامل تھے۔ "مغربی اقوام کو اپنے اثرورسوخ کواستعمال کرتے ہوئے سیاسی قیدیوں کی زندگیاں بچانے کے لئے آواز اٹھانی چاہئے جنہیں آمریت میں پھانسی کی سزاؤں کا سامنا ہے...... اس سنجیدہ اپیل کے جواب میں براے مہربانی موثر اور بسرعت عمل در آمد کیجئے"۔

پارلیمینٹ کے ایک لیبر پارٹی کے رکن ٹونی بین نے لندن میں پاکستانی سفارت خانہ کے نام ایک احتجاجی خط لکھا...... اس نے اپنے خط اور حکومت کے ترجمان وزیر اطلاعات قطب الدین عزیز کے جواب کی نقول مجھے بھجوائیں "مس بھٹو کا الزام کہ پاکستانی جیلوں میں ۴۰،۰۰۰ سے زیادہ قیدی موجود ہیں۔ حقائق کے خلاف ہے" قطب الدین عزیز نے لکھا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستانی جیلوں میں دیگر ممالک کی جیلوں کی طرح قیدی موجود ہیں لیکن یہ قیدی یاتو سزاء یافتہ مجرم ہیں یا مشکوک جرائم پیشہ اشخاص، ہماری جیلوں کے حالات بہت سے ترقی پذیر ممالک کی جیلوں سے بدتر نہیں ہیں...... جب کہ پاکستانی حکومت دہشت گردوں اور قاتلوں کے ساتھ سختی سے نمٹتی ہے...... وہ ہر کیس میں طے شدہ قانونی طریقہ کار پر عمل کرتی ہے" حکومت کے ترجمان نے پاکستانی بار ایسوسی ایشنوں کی طرف سے غیر قانونی طریقہ کار پر عمل در آمد کے خلاف مسلسل احتجاج کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

جب ہمیں ضیاء کی فوجی عدالتوں سے سزائے اموات کے ایک اور سلسلے کا علم ہوا تو ہم تمام طے شدہ اوقات سے زیادہ کام کرنے لگے۔ لفافے، ڈاک ٹکٹ اور خطوط کی لامحدود تعداد کی وجہ سے دفتر ہمارے رہائشی کمروں تک بھی پھیل گیا جہاں ہم دن رات لیبل لگانے، مہریں لگانے اور ڈاک میں ارسال کرنے کا کام پوری تندہی سے بجا لاتے رہے۔ باقاعدہ رضاکاروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور جلاوطنی کے دن گزارنے والے پاکستانی فوج کے ایک سابق میجر اور ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی ہمارے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ ہم کام میں مصروف رہنے کے لئے لاتعداد چائے اور کافی کے پیالے پیتے رہے۔ ضیاء اپنے مظالم کو دنیا

سے چھپانے کا پورا بندوبست کرتا تھا اور بیرون ملک سے کسی مبصر کو عدالتوں یا جیلوں میں کسی قیدی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہم نے ان مظالم کو طشت از بام کرنے اور قیدیوں کی طرف سے عالمی ضمیر کو بیدار کرنے کی پوری پوری سعی کی۔

یہ ضروری تھا کہ سیاسی قیدیوں کے بارے میں مکمل حالات جن میں قیدیوں کو رکھا جا رہا تھا اور مقدمات کی نوعیت کے متعلق پوری معلومات اور دستاویزات کا حصول ممکن ہوتا۔ پاکستان میں جہاں شرح خواندگی بہت کم اور سنسر شپ بہت سخت تھی ضروری معلومات کا حصول بہت مشکل ہو جاتا۔ اکثر وہ لوگ جنہیں درست اور مکمل کوائف کا علم ہوتا خود قیدی ہی ہو سکتے تھے۔

بڑی تگ و دو کے بعد ہم نے ایسے لوگوں کا ایک خفیہ جال پھیلا دیا جو ہمیں جیل خانوں کے اندر سے باقاعدہ رپورٹیں ارسال کرتے، خود قیدیوں کے تحریر کردہ ہمارے سوالناموں کے جوابات لندن میں ہم تک پوشیدہ ذرائع سے پہنچ جاتے۔ ہم جیل کے ہمدرد پہرہ داروں، محفوظ گھروں سے خطوط کو، جلا وطن افراد کے رشتے داروں کو جو پاکستان سے آتے جاتے رہتے تھے، ائرلائن کے ہمدرد اہل کاروں کو استعمال کرتے اور ابوظہبی اور سعودی عرب میں اپنے خطوط کو ڈاک کے حوالے کرتے جو مختلف ڈاک کے نشانات کی وجہ سے حکومت کے سنسر کنندہ حکام کی نظروں سے بچ جاتے۔ اور اس طرح ہمیں معلومات فراہم ہونے لگیں۔ لاڑکانہ سے کراچی سنٹرل جیل میں مقید ایک ۲۳ سالہ طالب علم سیف اللہ خالد جو ناصر بلوچ کا ساتھی تھا نے اپنا دستی تحریر کردہ جواب بھجوایا اور بتایا کہ اسے "سیاسی خیالات" کی وجہ سے ۱۹۸۱ء میں گرفتار کیا گیا اور وحشت ناک پوچھ گچھ میں پاکستان پیپلز پارٹی کے سربراہ کو طیارہ کے اغواء میں ملوث ہونے کی گواہی دینے پر مجبور کیا۔ اسے ایک جیل سے دوسری جیل میں منتقل کیا جاتا رہا اور مہینوں تک اس سے کسی کو بات چیت کی اجازت نہیں تھی۔ "مجھے دو روز تک عرض والی قلعہ میں رکھا گیا، ایک ہفتے تک تین نامعلوم مقامات میں، چار روز تک قلعہ بالا حصار میں، دس روز تک وارسک چھاونی میں، ایک روز پشاور کی سنٹرل جیل میں...... ایک ماہ تک کراچی سی آئی اے کے مرکز میں،

ایک ماہ تک کراچی کے بلدیہ اذیت رسانی کے مرکز میں" سیاسیات کے ایک طالب علم نے جواب میں لکھا جو اپنی گرفتاری کے تین سال بعد بھی جیل میں مقید تھا اور سزائے موت کا منتظر۔ اب کراچی سنٹرل جیل میں اسے عقوبت خانہ میں دس روز تک رکھا گیا اور ہرروز تین مرتبہ اسے پیٹا جاتا۔ "پوچھ گچھ کے دوران بلبوں کی تیز روشنی نے میری نظر کمزور کر دی تھی جس سے میں مستقل سردرد اور آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا ہو گیا۔ مجھے ٹانگوں میں لوہے کی بیڑیاں پہنا دی گئیں جن سے میرے خصیوں میں درد شروع ہو گیا۔ جیل کے ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ مجھے علاج کے لئے سول ہسپتال میں بھیج دیا جائے۔ تین ماہ کے بعد اب میں ہرنیا کے آپریشن کے لئے یہاں لایا گیا ہوں"۔ بہت سے متعدد سیاسی قیدیوں کی طرح سیف اللہ خالد حکومت کے رحم و کرم پر تھا۔ "میری زندگی اور میرے ساتھی ملزم کی زندگی خطرے میں ہے کیونکہ استغاثہ نے ہمارے لئے سزائے موت کا مطالبہ کیا ہے" طالب علم نے مزید تحریر کیا۔ "میں ایمنسٹی سے مداخلت کی اپیل کرتا ہوں تاکہ ہماری زندگیاں بچ جائیں"۔

ناٹنگھم، گلاسگو، مانچسٹر، بریڈ فورڈ، میں نے انگلستان میں پاکستانیوں سے مختلف شہروں میں خطاب کیا تاکہ ہمیں اپنی مہم میں زور پیدا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ حمایت مل جائیں۔ جرمنی، ڈنمارک اور اسی طرح سوئٹزر لینڈ میں جہاں میں اپنی والدہ کو ملنے ایک ماہ میں ایک بار جاتی، پاکستانیوں سے خطاب کیا۔ میں نے ڈنمارک میں وہاں کے سابق وزیراعظم انکر جور جنسن سے ملاقات کی جو میرے والد کو جانتے تھے۔ فرانس میں گالسٹوں کے ساتھ اور جرمنی میں گرین پارٹی کے اہل کاروں سے ملاقات کی۔ ایک غمگین دل کے ساتھ میں نے اگست میں تختہ دار پر چڑھائے گئے تین نوجوانوں کے نام کے بعد "شہید" کا لفظ لکھا۔

میں ہر مرتبہ جب واپس انگلستان کے ہوائی اڈے پر اترتی تو اس خدشے کے ساتھ کہ شائد امیگریشن حکام مجھے اپنے ملک سے نکل جانے کا نہ کہہ دیں۔ اس وقت پاکستانیوں کے لئے ائرپورٹ پر ہی برطانوی امیگریشن ویزا جاری کرتا تھا۔ اور وہ صرف ایک بار داخلے کے لئے

ہی ہوتا تھا۔ جب میں پہلی بار انگلستان پہنچی تھی تو امیگریشن اہلکاروں نے ۴۵ منٹ تک استفسار کیا تھا کہ میں کہاں ٹھہروں گی اور میں یہاں کیا کرنا چاہتی ہوں۔ ”میں ایک سیاح ہوں“ میں نے انہیں یقین دلایا تھا۔ اور ہر مرتبہ دوبارہ داخلے پر یہی کہنا پڑا۔ اس وقت بہت اطمینان ہوتا جب آخر کار وہ پاسپورٹ پر ویزا کی مہر لگا دیتے۔ لیکن جلد ہی میرے پاسپورٹ پر اتنی تعداد میں ویزا کی مہریں لگ چکی تھیں کہ پاسپورٹ کے صفحات ختم ہو رہے تھے...... مجھے معلوم تھا کہ ضیاء مجھے نیا پاسپورٹ جاری نہیں کرے گا۔ ہر مرتبہ جب امیگریشن اہل کاروں کے سوالات کا جواب دیتی اور ضخیم سیاہ کتاب میں انہیں اپنا نام تلاش کرتے دیکھتی تو اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوتی کہ وہ میرے دل کی دھک دھک کی آواز نہ سن پائیں۔ ہم سیاسی قیدیوں کی طرف سے تشہیر کی کامیاب مہم چلا رہے تھے اور اگر کہیں اس میں ناکامی ہو گی تو کہیں کے نہیں رہیں گے۔ ”میرا پختہ عزم تھا کہ ہر پارلیمانی یا دیگر مواقع حکومت برطانیہ پر زور دینے کے لئے صرف کروں تاکہ وہ حکومت پاکستان پر سیاسی مخالفوں خصوصاً پاکستان پیپلز پارٹی کے سیاسی مخالفوں کے خلاف اپنی قتل کی مہم کو ختم کرنے پر توجہ دے“ ایوان زیریں کے ایک رکن میکس میڈن نے ماہ نومبر میں مجھے خط لکھا۔ امریکہ کے نائب وزیر خارجہ برائے انسانی حقوق ایلیٹ ابرمز کا جواب بھی موصول ہوا۔ جسے میں نے ناصر بلوچ اور سیف اللہ خالد کے بارے میں لکھا۔ ”میں سویلین افراد کے خلاف خفیہ سماعت مقدمہ کے غیر منصفانہ پہلو پر تمہاری تشویش میں برابر کا شریک ہوں اور اس کیس میں پریشان کن الزام پر بھی اقبالی بیان بذریعہ اذیت حاصل کیا گیا ہے“ مسٹر ابرمز نے لکھا ”برائے مہربانی یقین رکھیں کہ پاکستان میں ہمارے سفارت کار ان مقدمات کا قریب سے جائزہ لینا جاری رکھیں گے“۔

میں باربیکن میں ہر صبح ۷ بجے اٹھ جاتی سب سے پہلے فلیٹ کی صفائی کرتی پھر نہا دھو کر دن بھر کے کھانوں کا انتظام کرتی، سادہ دالوں کی ڈشیں تیار کر کے چولہے پر پکنے کے لئے رکھ دیتی۔ بشیر ریاض لندن کے پاکستانی مضافات سے اسلامی طریقے سے ذبح کئے ہوئے مرغ اور حلال گوشت پکانے کے لئے لے آتا۔ ڈاک کا خرچ بہت زیادہ تھا۔ میں اپنے

سپیکر پنجاب اسمبلی محمد حنیف رامے وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے ہمراہ

بجٹ کو بڑی احتیاط سے خرچ کرتی۔ میری رقم کا ۲/۳ حصہ مکان کے کرائے پر اٹھ جاتا۔ باقی رقم ٹیلی فون بل، ڈاک ٹکٹ اور دیگر اشیاء پر اٹھتی۔ میری والدہ نے فلیٹ کی آرائش کے لئے کچھ رقم دی تھی۔ میں نے پرانا غالیچہ، کچھ برتن، اور بغیر شیڈ کے لیمپ خریدے، رقم کا بہتر مصرف وہ سیاسی کام تھا جو ہم دفتر میں کرتے تھے۔ ہم نے اپنے اردو کے مجلّہ "عمل" کا آغاز کیا جس میں کچھ صفحات انگریزی کے بھی ہوتے تھے۔ اسے ہم ہر مہینے بین الاقوامی انجمنوں، غیر ملکی سفارت خانوں اور جلا وطن پاکستانیوں میں تقسیم کرتے تاکہ انہیں پاکستان کے واقعات سے باخبر رکھیں۔ "عمل" مانگے تانگے کے بجٹ پر گزارہ کرتا تھا۔ بشیر ریاض اس کا ایڈیٹر بھی تھا اور اس کے لئے اشتہارات کا ذریعہ بھی...... ناہید چندے کے لئے جو قابو آجاتا اسے پکڑلیتی، ہم اس مجلّے کو پاکستان میں بھی سمگل کرتے اور پارٹی کے سرگرم کارکن اس کے اہم حصوں کی فوٹو سٹیٹ کاپیاں پارٹی کے حامیوں میں تقسیم کر دیتے۔ اس کی کاپیاں جیلوں میں سیاسی قیدیوں تک بھی پہنچائی جاتیں تاکہ انہیں علم ہو کہ انہیں بھلایا نہیں گیا۔ "عمل" حوصلہ افزائی کے لئے انمول ثابت ہؤا۔ قیدی اسے چاہت سے پڑھتے حکومت اس سے خوف کھاتی۔

"میں آج کام پر نہیں آرہا" ہمارے کاتب نے بشیر کو فون کیا۔ "کیوں" بشیر نے مایوسی میں پوچھا۔ "عمل" کاتب کی اعانت کے بغیر شائع نہیں ہو سکتا تھا۔ اردو کی طباعت پرانے طریقے ہی سے کی جاتی ہے کاتب اپنے ہاتھ سے مومی کاغذ پر متن تحریر کرتے ہیں۔ "سفارت خانہ نے مجھے آپ کے ساتھ کام نہ کرنے کے لئے زیادہ رقم ادا کر دی ہے" کاتب نے اعتراف کیا۔ جب پرنٹر نے بھی مجلّے کی طباعت پر حکومت کے دباؤ کا ذکر کیا تو ہم سمجھے "عمل" کا مستقبل ختم ہو گیا۔ مگر پرنٹر پارٹی کا ہمدرد نکلا جس نے حکومت کے دباؤ کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا بلکہ اپنی پریسوں کو رات کے وقت بھی چلانے پر اتفاق کیا۔ بشیر نے لندن میں پاکستانی اخبارات میں کام کرنے والے کاتبوں میں سے چند کو راضی کر لیا کہ وہ رات کو ہمارے لئے بھی کام کریں۔ اگر حکومت ایک کو واپس لے جاتی تو بشیر اپنی لگن سے دوسرے کو لانے میں کامیاب ہو جاتا۔

پاکستان میں ضیاء نے مارشل لاء کی قوت کا دوبارہ مظاہرہ کرنے کا آغاز کر دیا تاکہ عوام الناس کو فوجی گرفت کا احساس دلایا جا سکے۔ جب ہم "عمل" میں ناصر بلوچ سے غیر منصفانہ اور ظالمانہ سلوک پر مضامین لکھ رہے تھے، ہمیں پاکستان سے تشویش ناک خبریں موصول ہونا شروع ہوئیں کہ اسے اور اس کے قیدی ساتھیوں کو سزائے موت دی جا رہی تھی۔ ہمارے خدشات ۵ر نومبر ۱۹۸۴ء کو سرد اور طوفانی صبح کو یقین میں بدل گئے جب فوجی عدالت نے کراچی میں اپنے آخری فیصلے کا بر سرعام اعلان کیا۔ ناصر بلوچ اور دوسروں کو موت تک پھانسی کی سزاء سنا دی گئی۔

باربیکن میں ہم نے ہنگامی حالات کے تحت کام کا تہیہ کیا اور ان معتوب افراد کی زندگیوں کو بچانے کے لئے بین الاقوامی اداروں میں اپیلوں پر اپیلیں لکھ کر بھیجتے رہے۔ ہمارا غصہ اس وقت انتہا تک پہنچ گیا جب ایک پارٹی ہمدرد نے معجزانہ طور پر وہ خفیہ دستاویز ہمیں پہنچائی جس سے پتہ چلتا تھا کہ سزائے موت کے فیصلوں میں ضیاء نے براہ راست کردار ادا کیا تھا۔ دستاویز سے ثابت ہوا کہ فوجی عدالت نے دراصل صرف ناصر بلوچ کو سزائے موت سنائی تھی اور سندھ کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو مطلع کیا گیا تو اس نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ لیکن اچانک ہی اس نے اپنا ارادہ بدل لیا اور فوجی عدالت کو " دوبارہ اپنا اجلاس بلانے اور اپنے پہلے فیصلے پر دوبارہ غور کرنے کے لئے کہا" صرف ضیاء ہی جو اس کا اعلیٰ افسر تھا اسے اپنا ارادہ تبدیل کرنے کا مشورہ دے سکتا تھا۔ مزید براں ہمیں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی سٹیشنری کے ایک کاغذ پر ضیاء کے اپنے ثبت شدہ دستخط مل گئے۔ جس میں ۲۶ر اکتوبر کو چار ملزموں کی سزائے موت کی تصدیق کر دی گئی تھی حالانکہ اس کی کانگرو عدالت نے پورے دس روز بعد اپنا فیصلہ سرعام سنایا تھا۔ ان معتوب افراد کے لئے زندگی کی اپیل کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ ضیاء کو بطور صدر پاکستان رحم کی درخواست بھجوائیں۔ مگر یہ کتنا بڑا فریب تھا انہیں ایسے شخص کے پاس اپنی اپیل بھجوانا تھی جو ان کی سزائے موت کی پہلے ہی تصدیق کر چکا تھا۔

بہت سے رضاکاروں کی آنکھوں میں یہ دستاویز دیکھ کر آنسو آ گئے لیکن میں غصے سے لبریز تھی پہلی مرتبہ ہمارے پاس ان باتوں کی تصدیق کا ثبوت تھا جو ہم نے سن رکھی تھیں۔ فوجی عدالتوں میں سیاسی مقدمات کی سزائیں ضیاء خود تجویز کرتا تھا۔ ہم نے دستاویز کے کاغذات کی تصنیف و تالیف پر کام شروع کر دیا تاکہ ممکنہ وقت میں اس کی اشاعت کا بندوبست ہو سکے۔ اگر بین الاقوامی رائے عامہ پر واضح کر دیا جائے کہ ضیاء کی فوجی عدالتیں حکومت کے فیصلوں پر محض ربر کی مہروں کا کام کرتی ہیں تو لارڈ ایوبری جو میری والدہ کی رہائی کے سلسلہ میں ایک بڑا وسیلہ ثابت ہوا تھا برطانوی پارلیمینٹ میں اس دستاویز کے افشاء کے لئے ہماری طرف سے پریس کانفرنس کا اہتمام کر سکتا۔ ہماری مہم میں مزید شدت آ گئی۔

انسانی حقوق کی انجمنوں سے مزدور راہنماؤں تک باضمیر لوگوں نے اس کا جواب دیا۔ "جب کہ ہم اس ملک میں اپنے ٹریڈ یونین حقوق کے خطرات سے باخبر ہیں، ہمیں دوسرے ملکوں میں اپنے ہم پیشہ بھائیوں اور بہنوں کی جاری جدوجہد سے پوری طرح باخبر رہنا چاہئے جو وہ اپنے ملکوں میں لڑ رہی ہیں" ناٹنگھم کی ٹریڈ یونین انجمن کے مہتمم لارنس پلیٹ نے ایک بڑے ٹریڈ یونین جریدے "ٹی اینڈ جی ریکارڈ" میں لکھا۔ "شاید مزدور راہنما ناصر بلوچ اور اس کے تین ساتھیوں کی زندگیاں بچانے کے لئے وقت ہو اگر حکومت پاکستان اور اس کے سفارت خانہ تک احتجاجات پہنچا دیئے جائیں"۔

وکلاء کو اس خبر سے صدمہ پہنچا اور برطانیہ کے ممتاز وکلاء کے ایک گروہ نے بیان جاری کیا جس کا کچھ حصہ یہ تھا۔ "ان چار اشخاص پر پاکستان میں مارشل لاء قواعد کے مطابق قائم کردہ ایک خصوصی فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور سزاء سنائی گئی" ان عدالتوں کی صدارت فوجی افسران کرتے ہیں جنہیں کوئی قانونی تربیت حاصل نہیں اور مقدمات کی سماعت خفیہ ہوتی ہے۔ ثبوت کا سارا بوجھ ملزم پر ہوتا ہے کہ وہ اپنی بے گناہی ثابت کرے۔ مزید برآں انہیں اپنے مقدمات کی پیروی کے لئے کوئی وکیل مہیا نہیں کیا جاتا"۔

"ہم حکومت پاکستان سے ایسے مقدمات اور پھانسیوں کی سزاؤں کے خاتمہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم خاص طور پر جنرل ضیاء الحق سے ان چاروں افراد کی سزائے موت کی تصدیق نہ کرنے اور ان کی زندگیاں بچانے کی اپیل کرتے ہیں۔ ہم حکومت برطانیہ سے جو ضیاء حکومت کو اقتصادی اور فوجی امداد مہیا کرتی ہے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ حکومت پاکستان پر اپنا اثرورسوخ استعمال کرے تاکہ ان چاروں اشخاص کی سزائے موت اور اس قبیل کے دیگر مقدمات کی سماعت ختم کر دی جائے"۔

ہمیں سیاسی قیدیوں کی زندگیاں بچانے کا خبط تھا۔ لیکن پاکستان میں موت کے خلاف ہماری جنگ کے دوران، پی پی پی کے بعض جلا وطن راہنما اپنے مفادات اور طاقت کی بنیادوں کو مضبوط بنانے میں سرگرم عمل تھے۔ باربیکن میں ان راہنماؤں کی طرف سے ٹیلی فون متواتر بجتے رہتے جو زیادہ تر میرے والد کی حکومت کے سابق وزراء تھے اور مجھ سے ملاقاتوں کی درخواست کرتے رہتے۔ میری خوش قسمتی کہ باربیکن کے منتظمین ایک دن میں پندرہ سے زائد ملاقاتیوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے مگر میں بعض اوقات بیک وقت پانچ یا چھ افراد کے گروپوں کی شکل میں زیادہ افراد سے ملاقاتیں کرنے میں کامیاب ہو جاتی...... میں ان ملاقاتوں میں بے چین اور مضطرب رہتی کیونکہ اہم کاموں کو ختم کرنے کا سوچتی رہتی جو اس طرح ملتوی ہوتے رہتے۔

پی پی پی ہمیشہ ہی بیش طبقاتی پارٹی رہی ہے۔ بہت سے متضاد سماجی اقتصادی گروہوں کا مجموعہ، مارکسسٹ، جاگیردار، تجارت پیشہ، مذہبی اقلیتیں، خواتین، اور غرباء ...... میرے والد کے انتقال سے قبل، ان تمام مختلف گروہوں کے مفادات میں تضادات کی خلیج پاٹنے میں میرے والد کی مضبوط شخصیت اور عوامی تشخص کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ لیکن لندن میں جلاوطنی کے تناؤ اور سیاسی راہنماؤں کے وطن میں بھلا دیئے جانے کے خوف کے باعث مشترکہ مقاصد پر ذاتی مفاد نے فتح پالی تھی۔ ہر چیز سے ماسوا، پارٹی راہنمائی کے لئے ایک غیر اعلان کردہ جنگ بھی جاری تھی۔ لندن میں پرانے سکہ بند راہنماؤں کا مخمصہ یہ تھا کہ اگر وہ ایک مرتبہ میری راہنمائی قبول کر لیں گے تو ممکن تھا ہمیشہ کے لئے میری راہنمائی ہی میں کام

کرنا پڑے۔ "یہ ہماری تقدیر نہیں کہ پہلے باپ کی پیروی کی پھر ماں کی اور اب بیٹی کی پیروی کریں" ان میں سے ایک نے یہ رائے اس وقت دی جب میں پہلی دفعہ لندن پہنچی تھی۔ "تمہیں فیصلہ کرنا ہو گا کہ تم کس طرف ہو" مختلف راہنماؤں نے مجھے لیکچر دیئے ہر ٹولہ پی پی پی میں اپنی اہمیت کو جتانے کے لئے حمایت حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھا اور غالباً پارٹی کی قیادت سنبھالنے کے لئے تیار بھی۔

"میں کسی شخص کی طرف نہیں ہوں" میں بااصرار کہتی۔ "اگر پارٹی مختلف ٹولوں کی بجائے جوایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی تگ و دو میں مصروف ہیں ایک متحدہ جماعت کی شکل میں سامنے آئے تو ہمیں مزید کامیابی ہو گی" میں نے پرسکون اور معقول رویہ اپنایا تاکہ بزرگ "چچاؤں" کو بھی اجنبیت کا احساس نہ ہو اور میں بھی اپنی سیاسی پوزیشن کی کمزوری سے کماحقہٗ آگاہ رہوں۔ اگرچہ پارٹی کی مرکزی ایگزیکٹو کمیٹی نے میری پوزیشن کی قائم مقام چیئرپرسن کے طور پر تصدیق کر دی تھی جب میں نے انگلستان میں پہلے پہل قدم رکھا تھا۔ لیکن یہ تمام لوگ پرانے سیاسی گرو تھے۔ میں ایک نوجوان عورت تھی جو ان کی بیٹیوں کی ہم عمر تھی۔ ضیاء کی سازش کے دور سے اب تک پی پی پی ان ہی کی سربراہی میں رواں دواں تھی۔ میں پاکستان سے نئی نئی آئی تھی۔ انہوں نے سالہا سال سے اپنی اپنی قوت کی بنیادیں تعمیر کی تھیں۔ میں ماضی کے اختلافات کو ختم کرنے میں یقین رکھتی تھی اور پارٹی کے مفاد میں ان کے انفرادی قوت کے سرچشموں میں توازن کی متلاشی تھی۔ جب میں امریکہ کے سفر سے واپس آئی تو سب سے زیادہ توانا ٹولے، مارکسسٹوں نے اعلان جنگ کر دیا۔

"تمہیں امریکہ قطعاً نہیں جانا چاہئے تھا"۔ مارکسسٹوں کے راہنما نے مجھے تنبیہ کی، اگرچہ امریکہ جانے سے پہلے اس نے اس ضمن میں ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔ "امریکی ضیاء کے دوست ہیں ہمیں اسے ختم کرنے کے لئے روسیوں کے ساتھ شامل ہونا چاہئے"۔

"آپ کو کس بات سے پتہ چلا کہ امریکی یا روسی کسی کے دوست بھی ہو سکتے ہیں؟" میں نے جواباً کہا۔ "امریکی ضیاء کی حمایت اپنے سیاسی مفادات کی حفاظت میں کر رہے

ہیں۔ روسی ہو سکتا ہے آج ہماری حمایت کریں لیکن کل کو اگر ان کے سیاسی اور جغرافیائی مفادات کا تقاضا بدل گیا کو وہ ہمیں دغا دے جائیں گے۔ ہمیں ان سپرپاور ممالک کی رقابتوں میں ملوث نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں اپنے قومی مفادات کے لئے لڑنا چاہئے۔ ہم عالمی سیاست کی جنگ لڑنے کے قابل نہیں ہیں"۔

علاقائی سوچوں کے مالک بھی اس جھگڑے میں کود پڑے۔ "تم ایک سندھی ہو۔ تمہیں دوسرے صوبوں کے مقابلے میں سندھیوں کے حقوق کے لئے لڑنا چاہئے، ورنہ وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کریں گے" انہوں نے مجھے متنبہ کیا۔

"مارشل لاء حکومت کے ہاتھوں میں کیوں کھیلنا چاہتے ہو جو اس صوبائی اختلافات کا ہوّا کھڑا کر کے صرف فوج کو پاکستان کے اتحاد کا منبع ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہے"۔ میں نے جواب دیا یقیناً ایسے لوگ موجود ہیں جو چاروں صوبوں میں جمہوریت کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ظلم صوبائی حد بندیوں کا قائل نہیں ہوتا۔ کیا ہم اپنی توانائیاں مشترکہ دشمن کے خلاف لڑنے میں گزاریں تو ہمارے بہترین مفاد میں ہے یا ایک دوسرے کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر اپنا نقصان کرنا بہتر ہے"۔

پی پی پی کے نمائش پسند اور افسر شاہی کے گرویدہ ارکان جو اپنے مفادات کے تقاضوں کے زیر اثر ضیاء سے صلح صفائی کی کوششوں میں سرگرداں تھے ان کے اغراض کی آوازیں ان لوگوں کی آوازوں میں شامل ہو گئیں۔ میری مایوسی روز بروز بڑھتی گئی جب یہ لوگ دلائل پر دلائل جھاڑتے رہے۔ یہیں ملحقہ کمرے میں وہ رضا کار تھے جو پاکستان میں پارٹی کے حامیوں کی زندگیاں بچانے کے لئے مشکل سے مشکل کام میں اپنی بے لوثی کے ساتھ مصروف عمل تھے۔ اور ادھر پارٹی کے بزرگ سیاستدان تھے جو لوگوں کے مفادات کو پس پشت ڈال کر اپنے ذاتی مفادات پر اصرار کر رہے تھے۔

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا جب ان بزرگ چچاؤں میں سے ایک جلاوطن "چچا" باربیکن میں آیا۔ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا اور مطالبہ کیا "کہ میں اسے پنجاب پی پی پی کا صدر نامزد کر دوں اور اس کے چیدہ افراد کو مجلس عاملہ کے ارکان"۔ "تمہیں اس

طرح نامزد نہیں کر سکتی"۔ میں نے صدمہ محسوس کرتے ہوئے اس آدمی سے کہا جو وطن میں پنجابی سیاستدانوں میں کوئی ممتاز حیثیت نہیں رکھتا تھا اور جس نے سازش کے بعد اپنا کل وقت لندن میں چین سے گزارا تھا۔ "اس سے پارٹی میں ناراضگی بڑھے گی اور صلاحیت اور اتفاق کی بنیاد پر ہمارے فیصلہ کرنے کی پالیسی اثر انداز ہو گی"۔

"تمہارے پاس یقیناً انتخاب کا دائرہ وسیع نہیں ہے" اس نے سرپرستانہ انداز میں مجھے کہا۔ "مارکسسٹ تم سے ناراض ہیں علاقائی سوچ رکھنے والوں نے اپنی الگ انجمن بنالی ہے تم مجھے الگ تھلگ رکھنے کی ہمت نہیں رکھتی ہو"۔

"لیکن یہ پی پی پی کے اصولوں کے خلاف ہے" میں ہکلائی اور اس کے مطالبہ پر حیرت زدہ ہوئی۔

"اصول" اس نے تضحیک کے ساتھ کہا۔ "اصول عمدہ ہوتے ہیں لیکن لوگ سیاست میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔ اگر تم مجھے میری ٹیم سمیت صدر نامزد نہیں کرتیں تو مجھے ڈر ہے میں اپنی خواہش کے مطابق دوسرے راستے تلاش کروں گا۔ ہو سکتا ہے میں اپنی ایک الگ پارٹی کی تشکیل دے ڈالوں۔ میں تمہارا سب سے بڑا مخالف ثابت ہوں گا"۔

مجھے اپنا غصہ بڑھتا ہوا محسوس ہوا...... کیا اس خصوصی مفادات کے ٹولے کی نوک جھونک جس میں میرا سارا وقت ضائع ہوا کا لب لباب یہی تھا۔ اور اب یہ کیا قبل از مرگ واویلا شروع کر دیا گیا تھا۔ پاکستانی سیاست کا یہ نیا ڈھنگ تھا۔ اپنے لئے مچھلی پکڑے کا کانٹا لگاؤ۔ اپنے وزن کا دباؤ محسوس کراؤ۔ جو عہدہ ممکن ہو زبردستی حاصل کرو۔ بلیک میل کرو...... دھمکی دو، پرانی سیاست کاری بہت ہو چکی۔ "انکل" میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اور اپنی کرسی پر آگے کو جھکتے ہوئے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ اگر آپ پارٹی چھوڑ دیں گے تو آپ کے لئے پارلیمینٹ میں ایک سیٹ جیتنا بھی مشکل ہو جائے گا"۔

"یقیناً؟ یقیناً؟" اس نے میرے تلخ جواب پر اپنا سر حیرت سے پیچھے کو مارتے ہوئے کہا۔ اور وہ کمرے سے باہر بھاگ گیا اور آخر کار پارٹی سے بھی۔ اور زیادہ مصیبت، میں

نے غور و خوض کرتے ہوئے اس خیال کو ذہن سے باہر دھکیل دیا۔ جب کوئی پارٹی چھوڑ جاتا تو اس سے مجھے کوئی خوشی نہ ہوتی لیکن میں بالا آخر اس نتیجے پر پہنچی کہ سیاست میں کوئی چیز مستقل نہیں ہوتی۔ لوگ چھوڑ جاتے ہیں۔ لوگ شامل ہو جاتے ہیں اور لوگ دوبارہ مصالحت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جو چیز اہم ہے وہ ایک سیاسی پارٹی کا نئی نسل کے مزاج کی صحیح نمائندہ ہونا ہے۔ لندن میں ہمارے کام کی وجہ سے لوگوں کی ہمت افزائی ہو رہی تھی۔ اور پاکستان میں پارٹی کو نئی توانائی مل رہی تھی۔ اسی چیز کی ضرورت تھی۔ دسمبر ۱۹۸۴ء تک خصوصاً یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ پی پی پی کو جس قدر توانائی کی ضرورت تھی اسی قدر کوشش کر کے حاصل کی جانی چاہئے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دباؤ کے تحت ضیاء نے مارچ ۱۹۸۵ء تک انتخابات کے انعقاد کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن سب سے پہلے، اعلان کیا گیا، وہ ۲۰ر دسمبر کو قومی ریفرنڈم منعقد کرے گا۔ اسلامی ریفرنڈم کے الفاظ جو بعد میں نام پڑ گیا، کافی مضحکہ خیز ثابت ہوئے اگر اس قدر ہوشیاری سے کام نہ لیا جاتا۔ "آیا پاکستان کے عوام جنرل محمد ضیاء الحق کے اس طریقہ کار کی تصدیق کرتے ہیں جو انہوں نے پاکستان کے قوانین کو قرآن مجید اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ڈھالنے میں اختیار کیا ہے۔" یہ ریفرنڈم کے الفاظ تھے۔ ایک ملک جس کی ۹۵ فیصد آبادی مسلمان تھی اس ریفرنڈم کے خلاف کیسے ووٹ دے سکتی تھی؟۔ خلاف ووٹ دینے کا مطلب اسلام کے خلاف ووٹ دینا تھا۔ لیکن سیاسی حیثیت سے ریفرنڈم کے حق میں ووٹ دینے کا مطلب سخت بھیانک نکلتا تھا۔ "ہاں" میں ووٹ کا مطلب اگلے پانچ سال کے لئے اس کا بطور صدر "انتخاب" ہو گا۔ ضیاء نے اعلان کیا اس تمام تماشے کا انعقاد دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا تھا کہ ضیاء کو وہ عوامی مینڈیٹ مل گیا ہے جس کی اسے اشد ضرورت تھی۔ برصغیر کی تاریخ میں کسی دوسرے آمر نے بغیر ایسے مینڈیٹ کے اتنے طویل عرصہ کے لئے حکومت نہیں کی تھی۔ اور ضیاء کسی قسم کا کوئی خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ریفرنڈم میں "ناں" ووٹ کے خلاف مہم چلاتے ہوئے اس نے مزید یقین کے لئے اعلان کیا کہ ایسا ووٹ جرم قرار دیا جائے گا اور مجرم تین سال کی

قید بامشقت اور ۳۵،۰۰۰ ڈالر کی سزاء کا مستوجب ہو گا۔ مزید بر آں ووٹ کی پرچیوں کی گنتی فوج خفیہ طور پر کرے گی۔ اور نتائج کے خلاف کسی سول عدالت میں کسی کو عذر داری کا حق نہیں ہو گا۔ کیا وہ سمجھتا تھا کہ ایسے ووٹ کو منصفانہ اور غیر جانبدارانہ گردانا جائے گا؟۔

"بائیکاٹ" ہم نے "عمل" میں انٹرویوز میں، تقاریر میں اور اخباری بیانات میں اصرار کیا۔ ایم آر ڈی کے اراکین نے پاکستان میں "بائیکاٹ" کا اعلان کیا اور دو مذہبی جماعتوں نے ریفرنڈم کی مذمت کی اور اسے "اسلام کے نام پر سیاسی دھوکا دہی" سے تعبیر کیا۔ "ووٹ کے لئے تمہیں کسی شناختی کارڈ کی بھی ضرورت نہیں" کراچی میں گلیوں کی نکروں پر نصب سرکاری لاوڈ سپیکروں پر اعلان کیا گیا جب کہ حکومت کے ایجنٹ بلوچستان میں افغان مہاجرین کو بسوں میں بھر بھر کر پولنگ اسٹیشنوں پر لے جارہے تھے اور دیہاتیوں کو بسوں میں دوسرے پولنگ اسٹیشنوں پر لایا جارہا تھا۔

توقعات کے مطابق حکومت کی گماشتہ پریس نے دو کروڑ سے زائد یعنی ۶۴فیصد ووٹروں کی حاضری کا ڈھنڈورا پیٹا۔ لیکن اسلام آباد میں "گارڈین" کے رپورٹر نے اندازہ لگایا کہ ووٹر دس فیصد سے کسی صورت میں زیادہ نہیں تھے اور اس طرح رائٹرز خبر ایجنسی نے بھی یہی خبر دی۔ اس دھوکہ بازی کے بائیکاٹ کے ہمارے اعلان نے کام کر دکھایا۔ "اگر جنرل ضیاء کھلم کھلا اور جرات سے مذہبی لبادے کے بغیر اپنے آپ کو اس امتحان میں ڈالتا تو امکانات یہی تھے کہ اسے "شکست" ہو جاتی" لندن ٹائمز نے ۱۲ر دسمبر کے اداریئے میں تحریر کیا۔ "اسی وجہ سے اس نے ایسا نہیں کیا"۔

میں پی پی پی کے جلاوطن راہنماؤں کے ساتھ صحیح وقت پر واپس پاکستان لوٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔ امکانی طور پر یہی موقع تھا۔ "ضیاء الحق کے خلاف احتجاجی مہم چلانے کا یہی وقت ہے" شمالی لندن کے پی پی پی کے ایک سابق وزیر کے گھر میں منعقدہ ایک اجلاس میں پارٹی کے ممتاز رہنماؤں میں سے ایک نے رائے دی۔ "ریفرنڈم نے پوری دنیا میں ضیاء کی غیر مقبولیت کو افشا کر دیا ہے" دوسرے اس رائے کے مخالف تھے ہو سکتا ہے۔ "ملک ایسے
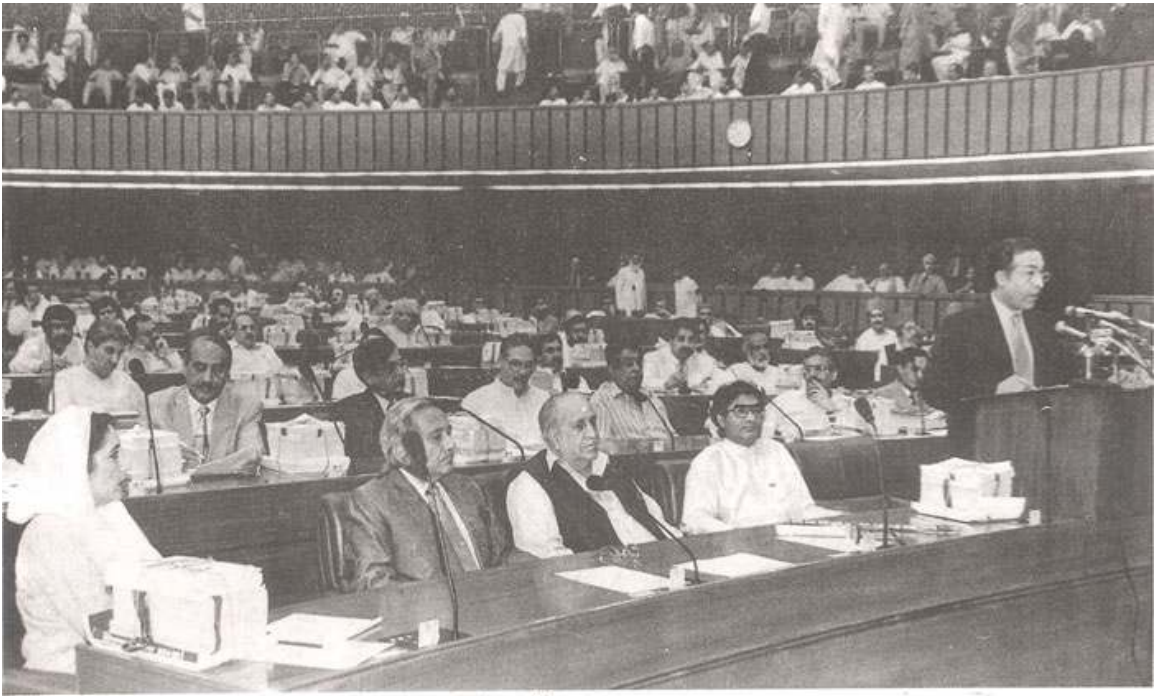
قومی اسمبلی کے بجٹ اجلاس کے دوران وزیر اعظم بے نظیر بھٹو بجٹ تقریر سن رہی ہیں

جواب کے لئے تیار نہ ہو" انہوں نے دلیل دی۔ "لوگوں کو اتنے طویل عرصہ سے بے حس و حرکت رکھا گیا ہے کہ وہ منجمد ہو گئے ہیں ہمیں سیدھے مقابلہ کے لئے تیاریاں کرنی چاہئیں"۔ بحث مباحثہ طول پکڑا گیا یہاں تک کہ ایک "انکل" نے میری طرف مڑ کر کہا۔ "میں اس کا جواب جانتا ہوں" "ہمیں مس بے نظیر بھٹو کو واپس بھیجنا چاہئے، اس سے ہر طرف ہلچل پیدا ہو گی"۔

"ٹھیک ہے" میں نے اتفاق کیا۔ "اگر سیاسی طور پر میرا جانا صحیح ہے تو ہمیں سب کے واپس جانے کے لئے ایک پروگرام وضع کرنا چاہئے۔ ہمیں وہاں اپنی آمد کو دنوں پر پھیلانا چاہئے ہر روز دس دنوں تک ایک راہنما کی آمد سے ہم لوگوں میں جوش اور ولولہ کا طوفان پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے"۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ "واپس جاؤ؟ میں واپس نہیں جا سکتا" یکے بعد دیگرے ہر راہنما نے احتجاج کیا اور پاکستان میں ان کے خلاف الزامات، سزائے قید اور سزائے موت کے مقدمات کی فہرست کی گردان شروع کر دی۔ میں ششدر رہ گئی وہ مجھے بھیجنے کے لئے متفق اور پوری طرح تیار تھے لیکن ایک متحدہ محاذ کھولنے میں مخلص نہیں تھے۔ "یا تو ہم مناسب طریقے سے اس پر عمل کرتے ہیں یا پھر بالکل ہی نہیں کرتے" میں نے کہا۔ مکمل خاموشی چھائی رہی۔

تاہم ہم سب ریفرنڈم میں ضیاء کی شکست پر مطمئن تھے۔ تمام دنیا میں میرے والد کا یوم پیدائش ۵ر جنوری کو بطور "یوم جمہوریت" فتح کی عوامی ریلیاں منعقد کر کے منایا گیا۔ سندھی، اردو اور انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے میں نے لندن میں ایک جلسے کی قیادت کی جہاں ایک سیمینار اور مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ تمام فضاء میں برقی لہر دوڑ گئی تھی۔ کرائے کا ہال لوگوں سے بھر گیا تھا۔ میں نے اپنی تقریر کا اختتام ایک انقلابی شاعر کے اشعار پر کیا۔ پی پی پی کے پرچم لہراتے ہوئے تمام سامعین گاتے ہوئے میرے ساتھ مل گئے۔ "میں باغی ہوں، میں ایک باغی ہوں! جو چاہے مجھ پر ظلم کرو۔

سیمینار کے درمیان مجھے اپنی والدہ کی ٹیلی فون کال ملی۔ صنم کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی

ہے۔ شملہ میں "یہ لڑکی ہے" لڑکی کے الفاظ برے معنوں میں استعمال کئے گئے تھے۔ مگر یہاں میں نے پی پی پی کے حامیوں کے اجلاس میں خوشی سے اعلان کیا۔ "آج ایک اچھی خبر آئی ہے کہ شہید بھٹو کے یوم پیدائش پر میری ہمشیرہ کے ہاں بچی پیدا ہوئی ہے۔ میری بھتیجی کا نام آزادی رکھا گیا ہے" میرا کہنا تھا کہ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ سیمینار کو ویڈیو ٹیپ کیا گیا اور اس کی درجنوں نقول پاکستان میں خفیہ طور پر بھجوائی گئیں۔ تین روز بعد میں اپنی والدہ اور صنم کے پاس پہنچ گئی جب ضیاء نے فروری کے آخر میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے انعقاد کا اعلان کیا۔ ان انتخابات کے بائیکاٹ کا مسئلہ ریفرنڈم کے بائیکاٹ سے زیادہ پیچیدہ تھا۔ مارشل لاء ابھی نافذ تھا۔ اور سیاسی پارٹیاں تھیں...... قومی اسمبلی کی سیٹوں کے لئے ہمارے امیدوار انفرادی حیثیت میں تو کھڑے ہو سکتے تھے مگر پارٹی کے نمائندوں کے طور پر نہیں۔ تاہم ۱۹۷۷ء کی ضیاء کی سازش کے بعد یہ پہلے قومی انتخابات تھے اور ہمیں فیصلہ کرنا تھا کہ ان میں حصہ لیں یا نہیں۔

"بائیکاٹ" لندن اور پاکستان میں پی پی پی کے اراکین نے ضیاء کے اعلان سے قبل ہی اس سلسلے میں کافی بحث مباحثہ کر لیا تھا۔ لیکن میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ میدان کو خالی مت چھوڑو، میرے والد بار بار کہا کرتے تھے۔ میں عجیب مخمصے میں گرفتار تھی کہ کیا کیا جائے اور یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ پاکستان میں ایم آر ڈی کے ارکان اس سلسلے میں کس نہج پر سوچ رہے ہیں......؟ یہ عجیب شش و پنج کا عالم تھا کہ ہم یورپ میں بیٹھے تھے جب کہ وطن میں اس قدر سرگرمی جاری تھی۔ اور ضیاء عادتاً قوانین کو تبدیل کرتا جا رہا تھا۔ ۱۲ر جنوری کو اس نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اعلان کیا کہ پی پی پی اور ایم آر ڈی کے ممتاز اراکین کو انتخابات میں حصہ لینے سے نااہل قرار دیا جائے گا۔ تین روز بعد اس نے اپنا لہجہ بدل لیا اور کہا کہ ان میں سے اکثر کو حصہ لینے کی اجازت ہوگی...... یہ سب کچھ میرے لئے ناقابل برداشت تھا۔

"میرا خیال ہے مجھے وطن واپس جانا چاہئے" میں نے اپنی والدہ کو بتایا جبکہ صنی کی بچی پس منظر میں رو رہی تھی۔ "میں مرکزی ایگزیکٹو کمیٹی سے انتخابات کے بارے میں بات کرنا

چاہوں گی۔ ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ آیا حصہ لینے سے یا بائیکاٹ کرنے سے ہمیں سیاسی جیت حاصل ہو گی"۔

مجھے توقع تھی کہ وہ واپسی کے میرے فیصلے کی مخالفت کریں گی۔ کون جانتا ہے کہ ضیاء کا میرے ساتھ اب کیسا سلوک ہو گا؟۔ لیکن انہوں نے ایک منٹ کے توقف کے بعد جانے کی اجازت دیدی۔ "تم درست کہتی ہو" انہوں نے کہا۔ "یہ وقت ہے کہ اس معاملے پر پاکستان میں پارٹی کے راہنماؤں سے مشورہ کیا جائے" ہم دونوں باری باری پاکستان کے پارٹی نائب سے فون پر بات کی کوشش کرتی رہیں۔ اور اس تمام کارروائی میں کئی گھنٹے صرف ہو گئے۔ ہماری اس سے ٹیلی فون پر ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ تاہم میں نے اپنی کزن فخری کو پکڑا۔ "گھر کے عملے کو بتا دو کہ ۷۰ کلفٹن کو کھول لیں میں نے اسے بتایا"۔ "میں تین یا چار روز میں وہاں پہنچ جاؤں گی" میں طیاروں کی پرواز کا شیڈول پتہ کر کے گھر پہنچی تو ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

"۷۰ - کلفٹن کو فوجیوں نے محصور کر رکھا ہے"۔ ڈاکٹر نیازی نے کہا۔ "مجھے کراچی سے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ تمہارے اور تمہاری والدہ کی نظر بندی کے احکام جاری ہو چکے ہیں۔ ملک کی تمام ایئرپورٹوں کو گھیرے میں لیا جا چکا ہے۔ اور کوئی خاتون جو لندن اور فرانس سے برقع میں ملبوس پہنچے، اس کی تلاشی لی جاتی ہے"۔

واپس جانے کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں اگر پہنچتے ہی فوراً گرفتار کیا جانا ہے۔ اسی طرح میں کسی سے بات چیت کرنے سے قاصر رہوں گی کہ آیا انتخابات میں کھڑے ہونا چاہئے یا نہیں۔ یورپ میں رہتے ہوئے کم از کم میں فون کا استعمال تو کر سکتی تھی۔ میں فون پر پاکستان میں اپنے نائب سے رابطہ کرنے کی مسلسل کوشش کرتی رہی۔ میرا پورا ارادہ تھا کہ انتخابات میں ضیاء کی بھرپور مخالفت کرنی چاہئے۔ اور میں ایم آر ڈی کے اجلاسوں میں اس رائے کی نمائندگی کرنا چاہتی تھی۔

"کیا مس بے نظیر بھٹو بول رہی ہیں" ایک حیران کن آواز ایبٹ آباد سے سنائی دی جب بالآخر میری ایک کال سپھل ہوئی۔

"ہاں، ہاں، ہاں" میں نے بے صبری سے کہا۔ "کیا ایم آر ڈی نے انتخابات کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا ہے"۔

"ہاں" اس نے کہا۔

"وہ کیا ہے؟" میں نے سانس روکتے ہوئے کہا۔

"بائیکاٹ کرنے کا" اس نے کہا۔

اگر پارٹی اور مشترکہ حزب مخالف کا یہی فیصلہ تھا تو چلو ایسا ہی سہی۔ میں واپس لندن آگئی اور ایک پیغام سندھی اور اردو میں ٹیپ ریکارڈ کیا۔ جس میں عوام الناس سے انتخابات کے بائیکاٹ کی اپیل کی۔ اس کو خفیہ ذریعہ سے پاکستان بھجوایا گیا اور اندرون سندھ، پنجاب، اور ملک کے دیگر علاقوں میں ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا گیا۔ ۲۵ر فروری کو میں لندن میں ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ گئی تاکہ قومی اسمبلی کی ووٹنگ کی کارروائی کا قریب سے اندازہ کر سکوں اور اسی طرح تین روز بعد صوبائی اسمبلی کی ووٹنگ کا۔ پاکستان میں انتخابات کے دھوم دھڑکے کا عمل ہے اور میلے کا سا سماں ہوتا ہے۔ گلیوں میں لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو جاتا ہے۔ کھانے والے اپنی ریڑھیوں پر خوراک بیچتے ہیں۔ شربت، آئس کریم، مٹھائی، سموسے اور پکوڑے بیچتے ہیں۔ لوگ پولنگ اسٹیشنوں کے سامنے جمع ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی ووٹ کی باری حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہیں۔ پاکستانی عام طور پر سیدھی قطاروں میں کھڑا ہونے کے عادی نہیں ہوتے۔ لیکن ووٹ ڈالنے والوں کو جس طرح میں نے ٹیلی ویژن پر دیکھا شاید ٹیلی ویژن کے سامنے سرکاری ملازمین چلتے ہوئے دکھائی دیئے وہ پتلی پتلی قطاروں میں قابل رحم حالت میں ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے نظر آرہے تھے۔ اور کھانا بیچنے والی ریڑھیاں بھی غائب تھیں۔

یہ حقیقت ضیاء جسے انتخابات کے نام سے پکارتا تھا، قابل ملامت تھی۔

"سیاسی جماعتوں کی غیر حاضری میں" ٹائم میگزین نے اپنے ایشیاء ایڈیشن میں رپورٹ کیا۔ "انتخابی مہم میں کوئی نصب العین نہیں تھا۔ کوئی پلیٹ فارم نہیں تھا اور نہ ہی قومی مسائل پر مباحثہ کی کوئی صورت۔ امیدواروں کو گھروں کے باہر اجتماعات اور جلسوں کے

انعقاد کی اجازت نہیں تھی نہ ہی وہ لاؤڈ سپیکر یا مائیکرو فون استعمال کر سکتے تھے اور نہ ہی ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر اپنا لائحہ عمل سمجھا سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ حکومت نے ایک امیدوار کو گھر گھر جاکر اپنے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کی اجازت دی تھی اور وہ صرف ان لوگوں کی تعداد کو خطاب کر سکتا تھا جو ایک کمرے میں سما سکیں۔ کچھ خوش امیدوں نے مسجدوں کے فورم کو استعمال کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں جلد ہی نااہل قرار دیدیا گیا"۔

حکومت نے ووٹروں کی حاضری ۳۵ فیصد بتائی۔ ہمارا اندازہ علاقے کی نوعیت کے مطابق ۱۰ سے ۲۴ فیصد تک تھا۔ ایم آر ڈی کے بائیکاٹ کی اپیل نے کام دکھادیا تھا۔ اگرچہ اتنی کامیابی نہیں ہوئی تھی جتنی ریفرنڈم کے موقع پر۔ اس مرتبہ کامیاب بائیکاٹ کے خلاف ضیاء نے مارشل لاء قوانین کا سہارا لیا تھا۔ اور بائیکاٹ کو قید بامشقت کی سزا کا مستوجب قرار دیا تھا۔ انجام کار وہاں ایسا کوئی سیاسی راہنما موجود نہیں تھا، جو بائیکاٹ کی اپیل کر سکے۔ "انتخاب سے قبل آخری دنوں میں" ٹائم نے رپورٹ دی۔ "حکومت نے تقریباً ۳۰۰۰، سیاسی مخالفوں کو زیر حراست کر لیا جن میں ہر بڑی سیاسی جماعت کا ہر ممتاز راہنما شامل تھا اور انہیں ووٹنگ ختم ہونے تک جیل میں یا گھر میں نظر بند رکھا گیا"۔

اس کے باوجود ووٹنگ سے مارشل لاء اور ضیاء کی نفاذ اسلام کی پالیسی کے استرداد کا واضح ثبوت مل گیا اس کی کابینہ کے نو میں سے چھ وزراء نے جنہوں نے قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا شکست کھائی اور اسی طرح متعدد ان امیدواروں نے بھی جو ضیاء کی حمایت کا دم بھرتے تھے۔ صوبائی انتخابات میں بنیاد پرست مذہبی جماعتوں کا بھی برا حشر ہوا۔ جماعت اسلامی کے ۶۱ امیدواروں میں سے صرف چھ الیکشن جیت سکے۔ مقابلتاً وہ امیدوار جنہوں نے ہمارے بائیکاٹ کے باوجود اپنا تعلق پی پی پی سے ظاہر کیا، شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ ۵۲ نشستوں میں سے پچاس پر جیت گئے۔ "پی پی پی جس کی راہنمائی لندن میں جلاوطنی کے دن گزارنے والی بھٹو کی بیٹی بے نظیر کرتی ہے تقریباً آٹھ سالہ پابندی کے باوجود ملک کی سب سے بڑی پارٹی ہے" ٹائم نے واضح طور پر لکھا...... کوئی

وفاقی کابینہ کے اجلاس کا ایک منظر، وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو صدارت کر رہی ہیں

بھی ایسی امیدیں کہ ضیاء جمہوریت کی طرف قدم بڑھا رہا ہے، انتخابات کے بعد ایک ہفتے ہی میں چکنا چور ہو گئیں۔ نئی منتخب قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس سے قبل ہی ضیاء نے آئین میں بعید از قیاس تبدیلیوں کا اعلان کر دیا۔ اس کی ترمیموں نے اس کی پانچ سالہ صدارت کی توثیق کر دی اور نہ صرف اسے اپنا وزیر اعظم، مسلح افواج کے سربراہ اور چار صوبائی گورنروں کے تقرر کا اختیار مل گیا بلکہ اپنی مرضی کے مطابق قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو برخاست کرنے کا حق بھی۔

اس کی نئی حکومت پہلی حکومت سے کس طرح مختلف تھی؟۔ کسی طرح بھی نہیں۔ اگرچہ ضیاء مغربی حکومتوں کے دباؤ کے زیر اثر ظاہراً ایک سویلین حکومت کے قیام کا بندوبست کر رہا تھا، مگر عملی طور پر مارشل لاء کا نفوذ قائم و دائم تھا۔ اگرچہ اب اس نے اپنے لئے زیادہ مقبول لقب "صدر" اختیار کر لیا تھا لیکن وہ اب بھی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور آرمی کا چیف آف سٹاف تھا۔ صدارت کے عہدہ پر متمکن ہونے کے کئی مہینوں بعد ٹائم کے ساتھ ایک انٹرویو میں ضیاء نے کہا کہ وہ مارشل لاء اٹھا لے گا اور آرمی چیف آف سٹاف کے عہدہ سے مستعفی ہو جائے گا۔ "جب ۲۳ر مارچ کو میں صدر کا حلف اٹھا لوں گا تو میرا خیال ہے مجھے اپنا ظاہری حلیہ بدل کر سول لباس زیب تن کرنا ہو گا" اس نے کہا اور وہ اس طرح تبدیلی لباس سے لوگوں کو بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ مارشل لاء مزید ایک سال تک نہیں اٹھایا جائے گا۔ ضیاء اب بھی آرمی کا چیف آف سٹاف تھا وردی کی بجائے کبھی کبھی شیروانی پہن لینے سے عہدے کی پٹیاں تو تبدیل نہیں ہوتیں۔ یکم مارچ کو انتخابات کے چار روز بعد، ایاز سموں کو سزائے موت سنا دی گئی۔ ۵ر مارچ کو ناصر بلوچ کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ ہم سب بہت زیادہ رنجیدہ ہوئے جب ہم نے ناصر بلوچ کی موت کی خبر سنی۔ ضیاء نے صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے نو منتخب ارکان کی رحم کی اپیلوں کو بھی نظر انداز کر دیا۔ کراچی سنٹرل جیل کے کئی سیاسی قیدیوں نے آخری لمحات میں ناصر بلوچ کے بارے میں اپنی رحم کی درخواستیں جیل سے باہر بھجوائیں لیکن ضیاء نے انہیں دوسری جیلوں میں منتقل کر کے ان کی درخواستوں کا جواب دیا۔ ہمارے خفیہ دستاویزات کے افشا

کے بعد بین الاقوامی دباؤ کے تحت وہ باقی تین قیدیوں کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کرنے پر مجبور ہوا۔ لیکن ناصر بلوچ کو "بلیک وارنٹ" جاری کر دیا گیا۔ مزدور رہنما کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ گارڈین کے نمائندہ نے اسلام آباد سے رپورٹ کیا۔ "وہ فوج کے خلاف نعرے لگاتا رہا اور "بھٹو زندہ باد" کے نعرے بھی"۔

ناصر بلوچ کے کیس کے سلسلہ میں خط و کتابت کی ضخیم فائل جو ہم نے تیار کی تھی، اسے شدید غم کے ساتھ میں نے بار بار پڑھا اس میں اس کا وہ تحریر کردہ خط بھی شامل تھا جو اس نے سگریٹ پیکٹ کے اندرونی کاغذ کی پشت پر تحریر کیا تھا۔ اور کراچی سنٹرل جیل کی موت کی کوٹھڑی سے خفیہ ذریعے سے بھجوایا تھا۔ "خدا آپ کو اور بیگم صاحبہ کو طویل عمر عطاء کرے تاکہ پاکستان کے غریب عوام آپ سے راہنمائی حاصل کر سکیں" اس کی تحریر کا آغاز تھا۔ "ہم چیئرمین شہید بھٹو کی طرح جنہوں نے فوجی آمریت کے سامنے اپنا سر نہیں جھکایا تھا بڑی بہادری اور حوصلے کے ساتھ اپنے دن گزار رہے ہیں۔ ہم اس فوجی حکومت سے زندگی کی بھیک نہیں مانگیں گے۔ ہم اپنی زندگیوں پر پارٹی کی عزت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم آپ کی کامیابی کے لئے دعا گو ہیں۔ خدا آپ کی مدد کرے......"۔

میں نے مہینوں ناصر بلوچ کی رہائی کے لئے دعائیں مانگی تھیں۔ اب شدید کرب میں تنہائی میں اور تعزیت کے ایک مذہبی اجلاس میں جو ہم نے ایک جلاوطن راہنما کے گھر میں منعقد کیا اس کی روح کی بخشش کے لئے دعائیں کیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرا بھائی کھو گیا ہے۔ وہ ملیر میں رہتا تھا جو کراچی کا سب سے زیادہ افلاس زدہ علاقہ ہے۔ جہاں وہ، اس کی بیوی اور بچے، اپنے والدین بھائی اور اس کے کنبے کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہائش پذیر تھے۔ ناصر بلوچ کو اپنی بیٹیوں پر فخر تھا اور وہ اکثر ان کے بارے میں باتیں کیا کرتا تھا۔ ان میں سے ایک کی شادی اس وقت ہوئی جب میں ۱۹۸۳ء میں ۷۰ کلفٹن کی سب جیل میں مقید تھی اور جس قدر مالی امداد کر سکتی تھی وہ میں نے فخری کے ذریعہ اس کے خاندان تک پہنچائی اور کچھ رقم شادی کے اخراجات کے لئے بھی بھجوائی۔ اب جب میں اس کے خاندان کے لئے ایک تعزیتی خط لکھنے لگی تو میں نے ان کے درد و غم کو اپنا درد و غم محسوس کیا۔ معلوم ہوا

کہ اور بھی بہت سے ساتھیوں نے اس کرب کو ایسے ہی محسوس کیا۔ برطانوی اخباروں کے مطالعہ کے بعد پتہ چلا کہ اس کی پھانسی کی رات کراچی سنٹرل جیل کے باہر جو ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا اسے کنٹرول کرنے کے لئے اضافی پولیس منگوانا پڑی تھی۔ جب اس کی میت دفنانے کے لئے اس کے خاندان کے حوالے کی گئی تو تعزیت کنندگان کا مجمع اتنا بڑا تھا کہ پولیس کو انہیں منتشر کرنے کے لئے اشک آور گیس کا استعمال کرنا پڑا۔ ضیاء کی نئی سویلین حکومت نے اپنے ہاتھوں کو خون سے رنگین کر کے اپنے اقتدار کا آغاز کر دیا تھا۔ کیا ایاز سموں ان کا دوسرا شکار ہو گا؟۔ "میں یہ خط لکھتے ہوئے ایاز سموں کی زندگی بچانے کے لئے آپ کی اعانت کا طالب ہوں۔" یہ ہمارے خط کا آغاز تھا جو ان کرم فرماؤں کو لکھے گئے جو ہماری ڈاک کی فہرست میں مندرج تھے۔ اور پاکستان پیپلز پارٹی کی انسانی حقوق کمیٹی کی طرف سے ڈاکٹر نیازی کے دستخطوں سے جاری کئے گئے "پیارے اراکین اور عہدیداران!" صفدر ہمدانی جو ہمارے جلاوطنوں کے رابطہ کنندہ تھے اور سمندر پار یونٹوں کے ساتھ خط و کتابت کرتے تھے اور خود مرکزی وائی ایم سی اے میں قیام پذیر تھے انہوں نے لکھا۔ "ایاز سموں کیس کے بارے میں موصول شدہ اہم تفصیلات کی روشنی میں برائے مہربانی اپنی مساعی کو دوگنا کر دیجئے اور (ا) اپنے مقامی پارلیمینٹ کے رکن سے ملاقات کریں (ب) پارلیمینٹ کے دیگر ارکان سے وفود کی شکل میں ملاقات کا بندوبست کریں۔ (ج) ایک درخواست پر دستخط حاصل کریں۔ (د) انسانی حقوق کی انجمنوں سے رابطہ کریں۔ (ڈ) پریس سے رابطہ رکھیں"۔ ایاز سموں "نیا دور موٹرز" کا مزدور رہنما تھا جسے فوجی عدالت نے یکم مارچ ۱۹۸۵ء کو سزائے موت سنائی۔

ایاز سموں کیس کے غبارے میں جو ہوا بھری گئی تھی اس کی تفصیلات اس وقت واضح ہو گئیں جب ایک ہمدرد نے پاکستان سے اس کیس پر پولیس رپورٹ کی نقل خفیہ ذریعے سے ہمیں بھجوائی۔ سموں پر ظہور الحسن بھوپالی کے قتل کا الزام لگایا گیا جب وہ ۱۹۸۲ء میں کراچی میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا۔ ایک قاتل موقع پر ہی مارا گیا تھا۔ پولیس کی رپورٹ کے مطابق گواہوں نے دوسرے قاتل کا حلیہ بیان کرتے ہوئے اسے ۲۵ اور

۳۰ سال کے درمیان عمر، طویل قامت، جسیم اور سفید رنگ کا جوان بتایا اس کے کندھے کے زخم سے بری طرح خون بہہ رہا تھا جب وہاں کار میں منظر سے غائب ہو گیا، گواہوں کی رپورٹ تھی۔

ایاز سموں کی ان تفصیلات سے کوئی مطابقت نہیں تھی۔ وہ سانولے رنگ کا، پتلا اور پانچ فٹ چار انچ قامت کا شخص تھا۔ اس کی عمر ۲۲ سال تھی اور گرفتاری کے وقت اسے کہیں زخم آیا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن حکومت کو ان تفصیلات کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ انہیں بھوپالی کے قاتل کو گردن زدنی کرنے کا اتنا شوق تھا کہ تین مختلف فوجی عدالتوں نے تین مختلف ملزموں کو پکڑ کر مقدمہ چلانا شروع کر دیا تھا اور انہیں ایک ہی جرم کے سلسلہ میں مجرم بھی گردان دیا گیا تھا۔

لیکن ہمیں تو سموں کی بے گناہی کا ثبوت چاہئے تھا۔ صحیح ثبوت وہ سموں کے وکیل نے اس کی کال کوٹھڑی سے کپڑے کے ایک ٹکڑے کو خفیہ ذریعہ سے ہمیں بھجوایا۔ پولیس نے پاکستان میں موقع واردات سے بھاگنے والی کار کی قتل کے بعد بازیافت سے ان میں خون کے نشانات کو پانے کا ایک بڑا ڈرامہ رچایا۔ کار میں پائے گئے خون کا تجزیہ ڈاکٹر شیرانی سے کرایا گیا اور اس کی رپورٹ بھی پولیس رپورٹ میں شامل تھی سموں کے خون کا کبھی معائنہ ہی نہیں کیا گیا تھا کہ آیا اس کا خون قاتل کے خون کے گروپ سے کوئی مطابقت بھی رکھتا تھا یا کہ نہیں۔ ہم نے لندن کے ایک ماہر تشخیص امراض ڈاکٹر کو سموں کے خون کا گروپ شناخت کرنے کیلئے کہا ہمیں ثبوت مل گیا جو ہم نے ڈاک کے ذریعے اپنے تمام کرم فرماؤں کو بھجوا دیا۔ سموں کے خون کا گروپ وہ نہیں تھا جو کار میں سے پائے گئے خون کا تھا۔ لیکن سزائے موت کو تبدیل نہیں کیا گیا۔

"میری پیاری بہن!" ایاز سموں نے کراچی سنٹرل جیل سے ۲۳ر مارچ کو تحریر کیا۔ "خدا کا شکر ہے مجھے آپ کو یہ خط لکھنے کا موقع ملا۔ ہمارا عزم پہاڑوں سے زیادہ مضبوط اور ہمالیہ کی چوٹیوں سے زیادہ بلند ہے۔ انقلابیوں کی سرشت میں ہی نہیں کہ آمروں کے سامنے جھک جائیں۔ زندگی خدا کی نہ کہ ضیاء کی عطاء کردہ ہے۔ میں ظالم کے ماتحت جینے سے تختہ

دار پر لٹک جانے کو ترجیح دیتا ہوں۔ شکست کھانا ہمارا اصول نہیں ہے۔ ہم مارشل لاء کے خوف سے گدھے کو گھوڑا یا سیاہ کو سفید نہیں کہہ سکتے۔ میری پیاری بہن تمہارا بھائی ایاز سموں تمہیں یقین دلاتا ہے کہ دہشت گرد ضیاء الحق میری گردن مروڑ سکتا ہے لیکن اسے جھکا نہیں سکتا...... ہم شہید اپنا خون بہاتے رہیں گے ایک دن ہمارا خون ہی لوگوں کیلئے صبح کی نوید بن کر آئے گا۔ انشاء اللہ...... ہم زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ آپ کا بھائی ایاز سموں"۔

میں ایاز سموں کیس کی تمام تفصیلات ہر جگہ اپنے ساتھ لے گئی۔ اپریل میں امریکہ میں جب مجھے ہارورڈ میں رام مہتا لیکچر میں حصہ لینا تھا پھر نیویارک میں تعلقات خارجہ کونسل سے خطاب کرنا تھا۔ پھر جون میں سٹراسبرگ میں جہاں مجھے یورپی پارلیمنٹ کے اراکین سے مخاطب ہونا تھا۔ "ایاز سموں ایک مزدور رہنما اور پارٹی کا حامی کال کوٹھڑی میں سڑ رہا ہے۔ اس جرم کے الزام میں جو اس سے سرزد ہی نہیں ہوا۔ اسے اپنی قسمت کا کچھ یقین نہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے خون کا گروپ قاتل کے خون کے گروپ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اسے ایسے جرم میں ملوث کیا گیا ہے جو اس نے کیا ہی نہیں" میں نے سٹراسبرگ میں ایک پریس کانفرنس میں کہا۔ "جب عالمی ضمیر کو نسلی منافرت اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خلاف دوسری جگہوں میں بیدار کیا جاتا ہے تو اسے ایسے ملک کی فوجی عدالتوں کے قتل سے آنکھیں بند نہیں کر لینا چاہئے جو مغرب سے ٹھوس امداد بھی حاصل کرتا ہے"۔

۱۹۸۵ء کے موسم بہار میں میرے امریکہ روانہ ہونے سے قبل، لاہور میں الذوالفقار کے ساتھ ملوث کئے گئے ۵۴ گرفتار شدگان کو سزائے قید دی گئی اور چالیس دوسرے افراد کو غیر حاضری میں بھی یہ سزا سنائی گئی...... ان میں میرے بھائیوں میر اور شاہ کو بھی شامل کیا گیا۔ ایک مرتبہ پھر حکومت دہشت گردی کی عامیانہ اصطلاح استعمال کر کے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنا چاہتی تھی۔ "ایمنسٹی انٹرنیشنل متفکر ہے کہ طویل عرصہ سے ان لوگوں کو جو اپنے سیاسی اختلاف کا اظہار عدم تشدد کے ذرائع سے کرنا چاہتے ہیں الذوالفقار

کے ساتھ ملوث ہونے کا بہانہ تراش کر قید کی سزاء دی جارہی ہے"۔ ایمنسٹی نے ۱۹۸۵ء کی رپورٹ میں الزام لگایا۔ ۷۰ سے زائد قیدیوں کو تختہ دار پر لٹکادیا گیااور ایک سو سے زائد گرفتار شدہ افراد کو سزائے موت سنائی گئی۔

پاکستان پیپلز پارٹی

۱۱۱الاڈرڈیل ٹاورز

باربیکن

لندن ای سی ۲

۱۸رجون

ایاز سموں کی زندگی بچایئے

پیارے رکن! تمہیں تیزی سے حرکت میں آنا چاہئے اور پاکستان کے ۲۲ سالہ فرزند کی زندگی بچانے کیلئے اپنی بھرپور کوشش کرنی چاہئے ...... ہر ممکنہ ممتاز شخص سے رابطہ کرو۔ ایاز سموں کی رحم کی اپیل کی درخواست آج پیش کی جارہی ہے برائے مہربانی جس قدر تیزی سے کام ہوسکے کرو۔ وقت بہت کم ہے۔

ضیاء کو خطوط بھیجے گئے تاریں، سفارت کاروں کی درخواستیں، غیر ملکی حکومتوں کا دباؤ، مگر افسوس کہ ایاز سموں کو ۲۶رجون ۱۹۸۵ء کو پھانسی دے دی گئی۔

برتن ٹوٹنے کی آواز، باورچی خانے میں کیاہورہاتھا۔ کسی نے شائد کھڑکی کھلی چھوڑ دی ہوگی میں نے باربیکن میں کچن کی طرف جاتے ہوئے خیال کیا تاکہ ہوا کے زور سے دیوار سے گری ہوئی چیزوں کو اٹھاسکوں وہاں کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

کیا وہ ایاز سموں کی روح تھی۔ میں حیران رہ گئی میں نے اس کی روح کے ثواب کیلئے دعامانگی۔

اگلی صبح میں ناہید، بشیر ریاض، صفدر، سمبلینہ، یاسمین اور مسز نیازی کے ساتھ واپس کام پر آگئی اور ہم نے ان تمام لوگوں کو خطوط لکھے جنھوں نے ایاز سموں کے معاملہ میں دلچسپی کااظہار کیا تھا۔ اسی طرح ہم نے تعزیتی خطوط کا جواب تحریر کیا۔ جو ہمیں مختلف النوع

اشخاص سے ملے مثلاً ایران بالا، انگلستان کے لارڈ ایوبری، ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ایلیٹ ابرمزاور برسلز سے کارل وان مائرٹ یورپی پارلیمنٹ کے سوشلسٹ گروپ کے ساتھ مل کر پاکستان میں اقتصادی تعاون کے متوقع معاہدہ کو منسوخ کرانے کی تحریک پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مجھے ایاز سموں کے پھانسی پانے کی خبر سن کر بہت رنج ہوا اگرچہ یہ خبر میرے لئے حیرانی کا باعث نہیں تھی۔ "لارڈ ایوبری نے لکھا۔ "اس سے صاف عیاں ہے کہ ضیاء پر انسانی ہمدردی کی اپیلوں کا مطلق اثر نہیں ہوتا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ جانتا ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرتا پھرے اس سے امریکی گراں قدر مالی امداد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی اور ریگن انتظامیہ کے عمائدین کے ارادوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی جو پاکستان کو "آزاد دنیا" کے ایک حصہ کے طور پر دیکھنے کے آرزومند ہیں"۔

ہم تمام غمزدہ حالت میں اپنے کام میں خاموشی سے جتے ہوئے تھے جب ہال میں ٹھپ سے گرنے کی مہیب آواز نے سب کو چونکا دیا۔ ہال میں کاغذات، فائلوں اور لفافوں کے گھٹے پڑے ہوئے تھے ہم سب نے چوکنا ہو کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

"کوئی فائل میز سے گر گئی ہوگی" بشیر نے ہال کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں گرا ہے" میں نے ایک رات قبل کے واقعہ کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتی تھیں؟" اس نے واپسی پر کہا۔

"کیا تمہارے خیال میں یہ ایاز سموں کی روح تھی" میں نے دوسروں سے پوچھا۔

"اوہ! خدا اس کی بخشش کرے" مسز نیازی جو بہت مذہبی ذہن رکھتی ہیں نے کہا۔ "ہمیں فلیٹ میں اس کیلئے قرآن خوانی کرنی چاہئے اس سے اس کی روح کو سکون اور استقامت ملے گی"۔

ناہید نے اسی سہ پہر پاکستانی خواتین کے ایک گروہ کا فلیٹ میں قرآن خوانی کیلئے آنے کا اہتمام کیا۔ ہم سب نے قرآن کریم کی سورتیں گھنٹوں تک بلند آواز میں تلاوت کیں۔ یہاں تک کہ مکمل قرآن کریم کی تلاوت کئی بار مکمل ہوئی۔ ایاز سموں کی روح نے پھر کبھی

بے چینی کا اظہار نہیں کیا۔

مجھے وضع کردہ پروگرام کے مطابق یکم جولائی کو جنوبی فرانس میں اپنی والدہ اور خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ تعطیل منانے کیلئے جانا تھا مگر یکے بعد دیگرے کوئی نہ کوئی اڑچن آڑے آتی رہی، سیاسی جلسے، پاکستان سے پی پی پی کے رہنماؤں کی آمد جو اپنے پروگرام تبدیل کرنے پر قادر نہیں تھے وغیرہ وغیرہ۔

میری والدہ نے ٹیلی فون پر بتایا کہ شاہ نواز کو میرے نہ آنے کا افسوس ہے کہ میں بار بیکیو میں ''بھنے ہوئے گوشت'' کی اس کی مجوزہ دعوت سے محروم ہورہی تھی اور اسی وجہ سے وہ خود بھی اس لذت سے محروم ہوگیا۔ میری رہائی کے بعد ہم صرف چند مرتبہ ہی اکٹھے ہوئے تھے۔ میں خود انہیں ملنے کیلئے بہت بیتاب تھی۔ میر، شاہ، انکی ننھی بچیاں فتحی اور سسّی ان کی افغانی بیویاں فوزیہ اور ریحانہ لیکن وہ وسط ماہ سے قبل ممکن نہیں تھا جب میں انہیں ملنے کے قابل ہوئی۔

۱۷ر جولائی کو صبح میں نے اپنے ملبوسات سوٹ کیس میں پھینکے اور ایئرپورٹ کیلئے روانہ ہوگئی۔ میرے سامنے امن و سکون کے دو ہفتے تھے جن کی مجھے پچھلے ماہ کے اندوہناک واقعات اور تناؤ کے بعد کینز میں اشد ضرورت تھی۔ میں مزید انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اموات نے مجھ پر گہرا اثر کیا تھا۔

وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو ایک ہسپتال میں زیر علاج ایک خاتون کی عیادت کر رہی ہیں

باب ۱۲

میرے بھائی کا انتقال

وہ سب کہاں چلے گئے؟ کیا وہ مجھ سے ملنا بھول گئے؟ امیگریشن اہل کاروں کے پاس سے گزرتے ہوئے مصروف نیس ائرپورٹ پر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

"کیا حیرانی ہے؟" ائرپورٹ کے ایک ستون کے پیچھے سے اچھلتے ہوئے شاہ نواز نے کہا۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

"چھپ جانے کا تصور اسی کا تھا" ممی بھی مسکراتی ہوئی آگئیں اور مجھے بوسہ دیا۔ شاہ نے میرا سوٹ کیس اٹھایا اور فوراً اس پر ایک چڑانے والی مضحکہ خیز شکل بنائی۔

اوف! تمہارے پاس کیا ہے؟ سونا؟ ہم ائرپورٹ سے باہر نکلتے ہوئے ہنسے۔ فرانسیسی ریویرا پر ایستادہ سفیدے کے درختوں کی تنی ہوئی شاخیں آہستہ چلتی ہوا میں دھیرے دھیرے لہرا رہی تھیں۔ پچھلے چند مہینوں کے تناؤ کے بعد اپنے گھر والوں سے ملنا بہت پیارا لگا اور پھر چھوٹا شریر بھائی جو ہمیشہ ہنستا رہتا اور غیر سنجیدہ سا لگتا۔

وہ تمام بچوں میں میرا سب سے زیادہ پیارا پسندیدہ بھائی تھا۔ اور ہم دونوں ایک خاص رشتہ سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ سب سے چھوٹا تھا اور میں سب سے بڑی۔ میں نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا جیسے ہی میں نے نسوانی نظریں اٹھتے ہوئے دیکھیں اور بہت سے سر شاہ کو دیکھنے کے لئے مڑے۔ اس کا بدن چھریرا اور ورزشی تھا اور میں راہ گیروں کی قابل ستائش نگاہوں کو دیکھے بغیر اس کے ساتھ کبھی بھی چل نہیں سکتی تھی۔

شاہ اور میری والدہ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور میں عقبی سیٹ پر اور کار کینز میں پوری رفتار سے چلتی گئی۔ شاہ بولتا چلا گیا اور مجھے پس منظر دکھانے والے کار کے آئینے میں اکثر جھانکتا اور کبھی سڑک پر دیکھتا۔ اس کی آنکھیں لانبی گھنی پلکوں کے نیچے سے چمکتی ہوئیں اس کے بال پانی کے جھلملاتے سنہری عکس سے دمکتے ہوئے...... وہ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ سفید بل دار قمیص اور سفید پتلون میں ملبوس وہ اتنا حسین اور چھریرا پہلے کبھی نہیں لگا تھا۔

مجھے اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت اطمینان ہوا۔ میری انگلستان کی آمد کے پچھلے ڈیڑھ سال میں چند مختصر ملاقاتوں میں شاہ مجھے نحیف سا لگا تھا۔ اب پہلی مرتبہ مجھے اس کا اور اپنا وزن بڑھتا ہوا محسوس ہوا...... اب اسے پاکستان میں میری نظر بندی کی کوئی پریشانی نہیں تھی اور نہ ہی مجھے اس کے یا میر کے بارے میں کوئی پریشانی تھی۔ طویل عرصہ سے الذوالفقار کی سرگرمیاں ماند پڑ گئی تھیں یا ایسا کوئی سرکاری دعویٰ معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔ اور گھر والوں میں کسی کو کوئی فوری خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ کینز کے آفتابی شعاعوں سے دھلے ساحلوں سے ضیاء بہت دور تھا۔ جہاں شاہ اپنی بیوی ریحانہ کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ اور کار میں ہماری گفتگو کا محور سیاست نہیں تھی بلکہ آم تھے۔

"تم کس قسم کے آم ہمارے لئے لائی ہو" شاہ نے کار کے آئینے میں سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہم دو ہفتوں سے ان کا انتظار کر رہے ہیں"۔

"سندھڑی ہیں" اگرچہ میری پسند "چونسہ" ہیں وہ زیادہ چھوٹے اور میٹھے ہوتے ہیں"۔

"ایک سندھی اور سندھڑی کو پسند نہیں کرتا؟" شاہ مضحکہ خیز ہنسی ہنسا۔ "میڈم! واقعی آپ سندھی ہیں؟ کیا ایسے باغی اعمال کا اعتراف اکثر کرتی ہو؟"۔

میں ہنسی، شاہ ہمیشہ مجھے ہنساتا رہتا تھا...... شاہ کنبے کے ہر فرد کو ہنساتا رہتا تھا۔ مجھے اپنے سفر کی تکان اور عمومی تھکان ختم ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شاہ کی زندہ دلی کا جوش اور جذبہ چھوت کی مرض کی طرح پھیلتا ہے...... وہ ایسا کرنے پر کس طرح قادر ہے؟ وہ جب ابھی

چھوٹا ہی تھا کہ سیاست کی دنیا نے ہم سب کو غرقاب کر دیا تھا۔ جب وہ پیدا ہوا تو پاپا ابھی وزیر بنے ہی تھے۔ میری والدہ سرکاری دوروں پر ان کے ہمراہ ہوتی تھیں۔ اور جدامجد فوت ہو چکے تھے۔ دادی بھی بقید حیات نہیں تھیں۔ اب اسے کوئی بھی لاڈ پیار سے بگاڑنے والا گھر پر نہیں تھا جس طرح ہم تینوں کو بگاڑا گیا تھا۔ چنانچہ شاہ کو میرے ساتھ خصوصی انس پیدا ہو گیا تھا۔ ہارورڈ میں اس کے بچپن میں شکستہ لکیروں کے کئی خطوط مجھے ملے تھے۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا، ہم دونوں گرمیوں میں سکواش کھیلا کرتے تھے۔ وہ کتابوں کی بجائے کھیلوں کا زیادہ شوقین تھا۔ وہ سکول کی باسکٹ بال ٹیم کا کلیدی کھلاڑی تھا اور گھر میں جسم بنانے کے لئے وزن اٹھاتا تھا۔ لیکن میرے والد کی نظر میں کھیلوں کی مطالعہ جیسی اہمیت نہیں تھی۔

شاہ کو زندگی میں نظم و ضبط سکھانے کے لئے حسن ابدال کیڈٹ سکول میں داخلہ دلایا گیا۔ وہاں دوسرے طلباء کی حیرانی کی حد نہ رہی جب انہوں نے وزیراعظم کے مراعات یافتہ بیٹے کو ناتواں خیال کیا مگر اس نے اپنی جسمانی قوت اور ”بقائے حیات کے کورسوں“ میں اپنی ممتاز حیثیت منوالی۔ لیکن وہ حسن ابدال میں خوش نہیں تھا اور جلد ہی ممی کی چاپلوسی کر کے ان کو پاپا سے بات کرنے کے لئے مجبور کیا کہ وہ اسے واپس وزیراعظم ہاؤس بلالیں اور اسلام آباد کے انٹرنیشنل سکول میں داخل کرا دیں۔

شاہ نواز............ اردو میں رحمدلی کا بادشاہ، شاہ مزاج میں اتنا فیاض تھا کہ کوئی نہیں جانتا تھا وہ کیا کرنے والا ہے۔ پیرس میں ایک سال قبل دو مرتبہ ایسے ہوا کہ اس نے ہیرلڈ ٹریبون خریدنے کے لئے ریزگاری حاصل کی جب کہ میں ایک کیفے میں اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ دونوں مرتبہ وہ خالی ہاتھ واپس لوٹا اور اس نے تمام رقم گلی میں ہیٹ پکڑے غریب لوگوں میں بانٹ دی۔ محاورۃً کہتے ہیں اس نے اپنی قمیص اتار دی۔ ”لے لو تم لے لو“ اگر کہیں کسی نے قمیص کی تعریف میں چند جملے کہہ دیئے اور وہ اس پر مصر بھی ہو جاتا۔ ایک دفعہ اس نے نیا بلیزر جو والدہ نے خرید کر دیا تھا اتار کر ایک غریب آدمی کو پیش کر دیا۔ وہ بچپن سے ہی غرباء کے ساتھ دلی ہمدردی رکھتا تھا۔ اس نے ۷۰ کلفٹن میں جھاڑ پھونس سے اپنے

لئے ایک جھونپڑی بنائی تھی اور ہفتوں تک وہاں سوتا رہا تاکہ اسے غریب لوگوں کی محرومیوں کا احساس رہے۔

ہم سب میں سے صرف وہی اکیلا ایسا تھا جو تعلیم کے لئے ہارورڈ نہیں گیا لیکن اس کی بجائے سوئٹزر لینڈ کے شہر لیسن کے امریکی کالج میں داخل ہوگیا۔ وہاں وہ ایک خوبصورت ترکی لڑکی پر عاشق ہو گیا اور وہاں بہت سے دوست بنائے۔ میرے والد کے اضطراب کے باوجود کلاس میں اپنے گریڈوں کو بہتر نہ کر سکا۔ اکثر وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ شام گزارنے کے لئے پیرس کی تفریح گاہ ریجنی میں پہنچ جاتا۔ ۱۹۸۴ء میں اس نے مجھے اور یاسمین کو اس مشہور شبانہ کلب میں جانے کے لئے مجبور کیا۔ شاہ کا جوش و خروش سے استقبال کیا گیا۔

تاہم مجھے ہمیشہ یہ توقع رہی کہ ہم سب میں وہ زیادہ تیز طرار ہے۔ اسے سیاست میں گھل مل جانے کے زیادہ مواقع میسر آئے میرے والد اسے اپنے انتخابی جلسوں میں اکثر ساتھ لے جاتے۔ بارہ برس کی عمر میں اس نے اپنی پہلی پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ خدا نے اسے تیز سیاسی حس ودیعت کی تھی وہ لوگوں کے رد عمل تک فوراً پہنچ جاتا وہ کیا سوچ رہے ہیں؟ کیا محسوس کر رہے ہیں؟ اور ان کا خون کن باتوں پر کھولتا ہے؟ ہر فرد خاص صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے کوئی موسیقی کے لئے کوئی رقص یا آرٹ کے لئے۔ اور وہ سیاست کے لئے تھا۔

"شاہ مجھے اپنی جوانی کی یاد دلاتا ہے" میرے والد اکثر مجھے کہا کرتے تھے۔

کینز میں ہم سب اہل خاندان اس مرتبہ دوسری دفعہ جمع ہوئے تھے۔ "تمام سال تم جو کچھ مرضی کرتے رہو لیکن ماہ جولائی میں تم سب کو میرے پاس ہونا چاہئے" ۔ میری والدہ نے ہم سب کو نصیحت کی۔ پچھلے سال کینز میں آنٹی بہجت کے گھر میں خاندان نے جو چھٹی منائی تھی وہ خاص کامیاب نہیں تھی۔ ہم سب کے پروگرام متضاد تھے اور ہم زیادہ وقت اکٹھے نہیں رہ سکے تھے۔ اور میر اور میں ضیاء کا تختہ الٹنے کے طریقہ کار کے بارے میں آپس میں مستقلاً الجھتے رہتے۔

ضیاء نے پاکستان کو ایک مسلح دہشت گردی میں تبدیل کر دیا ہے" میر اصرار کرتے ہوئے کہتا۔ "صرف تشدد ہی تشدد کا جواب دے سکتا ہے"۔

"تشدد سے تشدد پیدا ہوتا ہے" میں نے جواباً بتایا تھا۔ "ایسی جدوجہد کے کبھی پائیدار نتائج سامنے نہیں آتے۔ کوئی بھی مستقل تبدیلی پر امن سیاسی انتخابات سے عوامی مینڈیٹ کے ساتھ ہی ممکن ہو سکتی ہے"۔

"انتخابات؟ کون سے انتخابات؟ ضیاء نے اپنا تخت کبھی نہیں چھوڑنا۔ اسے مسلح جدوجہد سے ہی ہٹایا جا سکتا ہے" میر نے جواب دیا۔

"فوج کے پاس کسی گوریلا گروہ سے زیادہ اسلحہ ہوتا ہے" میں نے دلیل دی۔ "ایک ریاست میں لڑنے کی صلاحیت کسی مخالف گروہ سے بدرجہا زیادہ ہوتی ہے۔ مسلح جدوجہد غیر ممکن اور منفی نتائج پیدا کرتی ہے"۔

ہمارا بحث مباحثہ شدت اختیار کر جاتا ہماری آوازیں بلند تر ہوتی جاتیں اور شاہ آہستہ سے تالاب میں تیراکی کے لئے کھسک جاتا یا کسی کیفے کا رخ کرتا یا ایسی جگہ جہاں ہماری آوازیں نہ پہنچ سکتیں۔ "میری برداشت سے باہر ہوتا ہے جب تم لوگ اس طرح جھگڑتے ہو" اس نے مجھے بتایا۔ اس سال شاہ کی طمانیت کے لئے، میر اور میں نے اپنے اختلافات قائم رکھنے پر سمجھوتہ کر لیا تھا اور سیاست پر کوئی بحث نہ کرنے کا بھی۔

شاہ کی سیاست میں سوچ پاکستان کی حدود سے باہر نکل گئی تھی۔ پاکستان چھوڑنے کے بعد اور متعدد مشرق وسطیٰ کے ممالک میں قیام پذیر رہنے کے بعد اس کی سیاست کا محور لبنان، لیبیا اور شام کی سیاسی پیچیدگیاں بن گئی تھیں۔ "تم مسز تھیچر کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتی ہو" وہ مجھے اکثر چھیڑتا۔ "ایسا نہیں ہے شاہ، وہ دائیں بازو کی ہے اور میں نہیں" میں احتجاج کرتی اور اس ضمن میں دوسری چیزوں کے علاوہ برطانیہ میں بیروز گاری کے اعدادو شمار دیتی۔ وہ اپنا سر نفی میں ہلاتا اور اپنی انگلی مجھ پر لہراتا۔ "نہیں میں سچائی پر ہوں" وہ کہتا۔ "تمہارا دل اس کے لئے نرم ہے کیونکہ وہ ایک عورت ہے"۔

مرضی سے نہیں، حالات نے اسے الذوالفقار کی خطرناک دنیا کے اندھیروں میں دھکیل

دیا تھا۔ کابل میں الذوالفقار کے رضا کاروں کی تربیت کا فریضہ اسے سونپا گیا تھا۔ ہر چیز جو شاہ کرتا، اس نے اپنے فریضہ کو جوش اور شرارت سے مکمل کرنے کا عزم کیا ہوا تھا، ایک مرتبہ آدھی رات کے وقت کابل میں روسیوں کے نافذ کردہ کرفیو کے باوجود اپنے رضا کار دستوں کے ساتھ ناشتہ کرنے کے لئے چل پڑا۔ میر بڑا پریشان ہوا جب صبح سویرے شاہ کو اپنی جگہ سے غائب پایا۔ ''میں اور کس طرح اپنے آدمیوں کو بچنے کی چالیں سکھا سکتا ہوں'' غصے سے بھرے ہوئے میر کا سامنا کرتے ہوئے شاہ نے مسکرا کر کہا جب اسے ڈھونڈ لیا گیا۔

باقی ہم سب کی طرح ضیاء کی بغاوت اور ہمارے والد کے قتل کے نتیجہ میں شاہ کا مستقبل بھی پٹڑی سے اتر گیا۔ اس کی ترکی لڑکی سے کی گئی طویل مدت تک محیط محبت، لڑکی کے خاندان والوں نے توڑ دی تھی جب انہیں شاہ کے الذوالفقار میں ملوث ہونے کی خبر ملی۔ اسے بزنس میں اپنے جانے کا خواب بھی منتشر کرنا پڑا، اگرچہ کچھ عرصہ پیشتر وہ فرانس میں فلیٹوں کے بلاک کی تعمیر کے لئے سرمایہ جمع کرنے کے متعلق اکثر گفتگو کرتا رہا تھا۔ ''تم اور میر سیاست کرتے رہو جب کہ میں خاندان کے لئے دولت جمع کروں گا'' ہم سب کے سامنے اس نے ایک دفعہ دعویٰ کیا تھا۔

اسے جاسوسی کارروائیوں میں بھی دلچسپی تھی اور اس بارے میں وسیع مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ ''جب تم اور میر پاکستان میں سیاسیات میں مصروف ہو جاؤ تو یاد رکھنا تمہارا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے جو جاسوسی کے کاموں میں تمہاری امداد کر سکے گا۔ تم اسے جاسوسی کے محکمہ میں مناسب آسامی دے دینا'' اس نے ہمیں کہا۔ سوسائٹی کے تمام افراد کے لئے باوجود ان کی ایسا کرنے کی خواہش کے ''رہنما'' بننا بہت مشکل ہوتا ہے۔ موجودہ معاشرے وسیع اور پیچیدہ ہیں۔ تمہیں ایسے بااعتماد شخص کی ضرورت ہوگی جو تمہیں بتا سکے کہ آج کل کیا رجحانات ہیں؟ عوام کا مزاج کیا ہے، بنیادی سطح پر کیا کچھ ہو رہا ہے؟ پس وقت آئے تو مجھے یاد رکھنا۔ میں موجود ہوں گا''۔

''کینز میں کتنا عرصہ مزید رہو گی'' شاہ نے کار میں مجھے پوچھا۔

وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مزار پر دعا مانگ رہی ہیں

"۳۰ر جولائی تک" میں نے کہا۔

"نہیں، نہیں، نہیں" وہ احتجاجاً پکارا۔ "تمہیں زیادہ عرصہ رہنا ہو گا۔ میر بھی ۳۰ر تاریخ کو ہمیں چھوڑ رہا ہے۔ میں تمہیں جانے نہیں دوں گا، کم از کم ایک ہفتہ اور میرے پاس رہنا پڑے گا"۔

"مجھے آسٹریلیا روانہ ہونا ہے" میں نے اسے بتایا۔

"تمہیں کہیں نہیں جانا ہے، تم میرے پاس ٹھہرو گی"۔

ٹھیک ہے، ٹھیک ہے" میں نے سپر ڈال دی۔

مجھے علم تھا کہ میں مزید نہیں ٹھہر سکتی، لیکن میں شاہ کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتی تھی۔ تمام اہل خاندان میں سے وہی تھا جس نے مجھے ملنے کی سب سے زیادہ کوشش کی۔ وہ ۱۹۸۴ء کے موسم بہار میں پیرس بغیر اطلاع کے مجھے ملنے کے لئے آیا تھا، جب میں وہاں سیاسی کام سے گئی تھی۔ ہوٹل جہاں میں قیام پذیر تھی اس کی استقبالیہ خاتون نے یکے بعد دیگرے پیغامات دیئے کہ "ریڈ سٹار" کا ایڈیٹر آپ سے انٹرویو کرنا چاہتا ہے"۔ "ریڈ سٹار" میں نے یہ نام کبھی نہیں سنا تھا، لیکن یہ بھی تھا کہ بہت سی انجمنوں اور لوگوں سے جنہیں میں نہیں جانتی تھی، اکثر ملنے کی درخواست آیا کرتی تھی۔ تیسری مرتبہ جب ریڈ سٹار کا فون آیا تو میں نے خود کال وصول کی۔ "سربراہان مملکت سے ملنا آسان ہے مگر تم سے نہیں"۔

شاہ زور سے ہنسا۔ "مس بے نظیر کو ملنے کی نسبت بیروت میں دروز ہیڈ کوارٹرز میں ولید جمبلاط کو ملنا آسان ہے"۔

پیرس میں ہر صبح ۶ بجے شاہ کا میرے ہوٹل کے کمرے میں ٹیلی فون آتا۔ "تم ابھی تک سو رہی ہو؟" وہ مضحکہ خیز حیرت کا اظہار کرتا۔ "اٹھ جاؤ تاکہ ہم اکٹھے ناشتہ کریں"۔ سیاسی عشائیے شاہ کے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرتے تھے۔ پیرس میں پہلی شب ہی جب میں مسٹر نسیم احمد، ایک سابقہ وزیر اطلاعات سے ملاقات کرنے والی تھی، اس نے مجھے پوچھا تھا "تم کب تک اس ملاقات سے فارغ ہو جاؤ گی؟" وقت مقررہ پر کھانے کے کمرے میں

مجھے ہلچل محسوس ہوئی اور مجھے ایک خوبصورت جوان شاہانہ انداز میں ہماری طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ میرا عشائیے کا ساتھی ٹھٹھکا، شاہ صرف سابق وزیر اعظم کا بیٹا ہی نہیں ہے بلکہ ایک مشہور دہشت گرد بھی۔ ایک سگار سلگاتے ہوئے، شاہ مسٹر نسیم احمد سے جلد ہی اپنی کہانیاں سنا کر ہنسی ٹھٹھے میں مشغول ہو گیا۔ بعد میں یاسمین، شاہ اور میں بجری بچھی گلیوں میں موسم بہار کی تازہ فضاء میں چلتے رہے اور ۳ بجے صبح تک ایک کیفے میں کافی پیتے اور گپ بازی کرتے رہے۔

"میں تمہیں صبح ۷ بجے آکر لے جاؤں گا" شاہ نے میری والدہ کو اور مجھے کراؤسیٹ میں میری والدہ کے کرائے پر لئے ہوئے دو بیڈ روم کے فلیٹ پر اتارتے ہوئے کہا۔ "تم پہلے میرے نئے فلیٹ کو دیکھنے کے لئے آؤ گی پھر ہم سب ساحل سمندر پر باربیکیو کھانے کے لئے جائیں گے۔ میں نے تمام تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔ صرف تمہیں مزا لینے کے لئے آنا ہے۔

"کیا ریحانہ بھی وہاں ہو گی؟" میں نے اسے پوچھا۔

"ہاں" اس نے کہا۔ اس کی شادی کے موجودہ حالات کا کوئی اشارہ مترشح نہیں تھا۔ وہ ہماری پکنک کے لئے مزید اشیاء خریدنے کے لئے روانہ ہو گیا۔

صنم، اس کا خاوند ناصر، ان کی نئی بچی "آزادی" اور میں ہم سب میری والدہ کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ لاس اینجلس سے ہماری پندرہ سالہ کزن بھی آئی ہوئی تھی۔ مشرقی کنبے ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر گزارہ کر لیتے ہیں۔ اس لئے جگہ کی تنگی کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ میر جو اپنے کنبے کے ساتھ شاہ کے پاس قیام پذیر تھا، تھوڑی دیر کے لئے فتحی کے ہمراہ آیا۔ میں فتحی کے لئے ایک چھوٹا سا پلاسٹک کا تحفہ اور چند کتابیں لائی تھی جو میں نے اسے سہ پہر کے دوران پڑھ کر سنائیں۔ فلیٹ میں ائر کنڈیشنر نہیں تھا اور موسم خاصاً گرم ہو گیا تھا۔ تمام خاندان چھوٹی سی بالکنی میں جمع ہو گیا۔ گرمیوں کی سہ پہر سب نے وہیں گزاری اور ٹھنڈی شام کے منتظر تھے۔ میں افغانی بہنوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی جن سے چار سال قبل کابل میں میرے بھائیوں نے شادی کی تھی۔

میر فوزیہ کے ساتھ خوش و خرم نظر آرہا تھا مگر شاہ اور ریحانہ میں کچھ مغائرت تھی۔

"اگر میں تمہیں کچھ بتاؤں تو وعدہ کرو میرے ساتھ بحث نہیں چھیڑو گی؟" شاہ نے پیرس میں میری پچھلی بار آمد پر کہا تھا۔

"میں کوشش کروں گی" میں نے جواب دیا۔

"میں اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہوں" اس نے کہا۔

میرا منہ لٹک گیا۔ "پاگل مت بنو! گوگی" میں نے اسے خاندانی پیار کے لقب سے پکارا۔ "تم ایسا نہیں کرو گے ہمارے خاندان میں کبھی طلاق نہیں ہوئی۔ تمہاری شادی والدین نے نہیں کی تھی۔ تمہارے پاس یہ کہنے کا کوئی بہانہ نہیں کہ دونوں ساتھ نہیں چل سکے۔ تم نے ریحانہ کو شادی کے لئے منتخب کیا تھا۔ تمہیں ساتھ نبھانا چاہئے"۔

"تم طلاق کے نام سے پریشان ہو تمہیں میری کوئی پرواہ نہیں" اس نے سچ ہی کہا تھا۔

"کیا غلطی ہو گئی ہے" میں نے ممکنہ حل میں مدد دینے کے خیال سے پوچھا۔ لیکن جو کہانیاں اس نے اپنی شادی کی بڑھتی ہوئی مشکلات کے بارے میں سنائیں تو معلوم ہوتا تھا یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔

ریحانہ شادی کے بعد بالکل ہی بدل گئی تھی، اس نے مجھے بتایا۔ شروع میں تو وہ بہت محبت کرنے والی اور توجہ دینے والی ثابت ہوئی۔ جب وہ اپنے رضاکاروں کے ساتھ کام کرنے کے بعد تھکا ہارا گھر آتا اس کے لئے گرم کھانا اور ٹھنڈا مشروب تیار کر کے لاتی۔ مگر اس نے اچانک ہی اپنا رویہ بدل لیا اور ایک پیالہ چائے بھی اس کے لئے لانا بند کر دی۔ اکثر جب وہ گھر واپس آتا تو میک اپ کر کے تیار بیٹھی ہوتی اور اس کی آمد کے تھوڑی دیر بعد باہر نکل جاتی اور اسے اکیلا چھوڑ دیتی۔

"میں کس قدر تنہا ہوں" شاہ نے اعتراف کیا۔ "میرا کوئی گھر نہیں ہے کوئی خاندان نہیں ہے۔ میں فقط کوئی شخص چاہتا تھا باتیں کرنے کے لئے، ساتھ ٹیلی ویژن دیکھنے کے

لئے۔ لیکن وہ گھر پر ہی نہیں رہتی۔ میرا خیال تھا ہمارا بچہ ہو جائے گا تو حالات تبدیل ہو جائیں گے مگر وہ تو بد تر ہو گئے"۔

شاہ اور ریحانہ دو مرتبہ الگ ہو گئے تھے۔ دونوں مرتبہ شاہ نے ہی صلح کے لئے قدم بڑھایا۔ اپنی بیٹی سسّی کی خاطر، اور چونکہ اسے امید تھی کہ ریحانہ اپنے پہلے رویئے پر لوٹ آئے گی۔ لیکن پیرس میں اس نے بتایا کہ وہ شادی کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے پر تل گیا ہے۔ اور میں پھر بے وقوفوں کی طرح اسے منع کرتی رہی۔

"شاید وہ اکیلی ہے اور بوریت محسوس کرتی ہے، گوگی" میں نے اپنے بھائی کو سمجھایا۔

"شادی کے بعد یکے بعد دیگرے کبھی ایک عرب ملک میں رہے ہو اور کبھی دوسرے میں، وہ ایسے ملکوں میں رہی جہاں اس کا کوئی دوست یا رشتہ دار نہیں تھا، جہاں وہ ان کی زبان سے بھی نا آشنا تھی، جہاں وہ ٹیلی ویژن بھی نہیں دیکھ سکتی تھی، کوئی خریداری کے لئے جانا نہیں ہوتا تھا، کوئی فلمیں نہیں، کوئی تھیٹر نہیں، یہ کوئی زندگی نہیں ہے اور مزید بر آں وہ اس کم عمری میں ایک بچے کی نگہداشت کا بوجھ بھی سنبھالے ہوئے ہے۔"

شاہ کو ریحانہ کے مسائل کا میرا تجزیہ اچھا لگا۔ "وہ مجھے امریکہ میں بزنس کرنے کے لئے کہتی ہے اور یہ بھی کہ امریکی بلیک لسٹ میں سے میرا نام ختم کرا دے گی" شاہ نے کہا لیکن میں امریکہ میں تارک وطن بن کر زندگی نہیں گزار سکتا"۔

"یورپ میں رہنے کے متعلق کیا خیال ہے؟ جب تک پاکستان واپس نہیں جاسکتے" میں نے اصرار کیا۔ "دیکھو اگر تم دونوں یورپ میں رہو مثلاً یہاں فرانس میں، اگر تم نزدیک نہیں بھی ہو کم از کم ریحانہ سینما جاسکے گی یا دوستوں کو مل لے گی" یہ قدامت پرست ملک نہیں جہاں عورتوں کے گھر میں رہنے کی توقع کی جاتی ہے۔ اور باہر لوگ گھورتے ہیں۔ اب میر کے سوئٹزر لینڈ میں رہنے کی وجہ سے، وہ اپنی بہن کے بھی قریب ہی ہو گی۔ اگر تم ریحانہ کے حالات صحیح کر دو تو ہو سکتا ہے اسے اپنی بیزاری اور مایوسی سے چھٹکارا پانے میں مدد ملے اور وہ پہلے جیسی بیوی پھر بن جائے۔ اگر تم پسند کرو، میں اپنے دوستوں سے مل کر

تمہیں فرانس میں رہائش دلوا دوں"۔

شاہ کو یقیناً میری تجویز پسند آئی۔ "فرانس بہت خطرناک ہے" اس نے کہا اگر میں یہاں رہتا ہوں تو بندوق کا اجازت نامہ بھی لینا پڑے گا"۔

"مجھے اس بارے میں علم نہیں" میں نے اسے بتایا۔ "تاہم میں کوشش کر سکتی ہوں"۔

ہماری گفتگو کے بعد اس کا مزاج کافی بہتر ہو گیا تھا۔ لیکن میرا مزاج اس وقت سرد پڑ گیا جب وہ مجھے اپنے ساتھ ایسی جیکٹ خریدنے لے گیا جس پر گولی اثر نہیں کرتی۔ "یورپ میں مجھے اس کی ضرورت ہے" اس نے مجھے بتایا اور جہاں اپنے لئے ایک ایسی جیکٹ خریدی تو ایک ڈھیلی ڈھالی جیکٹ میرے لئے بھی خریدی۔ "تمہیں کیا علم کہ ضیاء میری کھوج میں لگا ہو"۔

میں نے اسے پرسکون کرنے کی کوشش کی کیونکہ سلامتی کے بارے میں میں خود بھی جنونی تھی۔ لیکن وہ اس بات پر مصر تھا۔ "مجھے خبر مل چکی ہے کہ وہ مجھے قتل کرانا چاہتا ہے" شاہ نے کہا۔

"لیکن، گوگی، الذوالفقار کابل سے جا چکی ہے اور برسوں سے انہوں نے کچھ بھی نہیں کیا ہے"۔ میں نے اسے بتایا وہ اس پر صرف مسکرا دیا۔ "یہ میری خبر ہے" اس نے آہستہ سے کہا۔

جب میں سکھر جیل میں تھی تو مجھے اپنے بھائیوں کی زندگی کے بارے میں خدشات تھے۔ وہ مطلوب تھے اور میں ہمیشہ اس خدشے میں رہتی تھی کہ انہیں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جس راستے پر وہ چل رہے تھے موت کی بدشگونی سے پاک نہیں تھا۔ اور یہ راستہ انہوں نے اپنی آزاد مرضی سے چنا تھا۔ لیکن کچھ بھی ہو بہن کی حیثیت سے میں بہت متفکر رہتی تھی۔ اپنے والد کو کھو دینے کے بعد میں اپنے قریبی عزیزوں کے بارے میں زیادہ متفکر ہو گئی تھی اور میرے بھائیوں کی زندگی کو حقیقی خطرہ درپیش تھا۔

میر اور شاہ کے ساتھ بعد کی ملاقات میں مجھے پتہ چلا کہ ان کی بیویوں کے خاندان کے پرانے مصاحبوں میں سے ایک نے ان دونوں کو کابل میں زہر دینے کی کوشش کی تھی۔ میرے بھائیوں کی خوش نصیبی اور ان کے کتے کی بدقسمتی تھی کہ اس نے وہ کھانا پہلے کھالیا اور مر گیا۔ نوکر نے اپنے جرم کا اقبال کیا ان کے آگے جھک گیا اور معافی مانگنے لگا۔ "مجھے مجاہدین نے رقم دی تھی" اس نے اعتراف کیا۔ "وہ ضیاء کو خوش کرنا چاہتے تھے" میرے بھائیوں نے اس کی زندگی بخش دی تھی جب میر کی بیوی فوزیہ نے نوکر کی جانب سے مداخلت کی۔

وہ ایک اور قتل کی کوشش سے بال بال بچے تھے جب وہ ایک کار کی اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہ سے کوئی چیز گر گئی تھی اور دونوں اسے اٹھانے کے لئے جھکے۔ اسی لمحے ایک گولی زن سے ان کی کار میں اسی مقام سے گزری جہاں بصورت دیگر ان کے سر موجود ہوتے۔

ان کا ہدف شاید میر نہیں، شاہ ہوتا۔ جب میرے بھائی ابھی کابل میں تھے، ایک قبائلی پٹھان پاکستان سے میر کو ملنے آیا۔ "ضیاء کو شاہ نواز کا سر پہلے درکار ہے" اس نے بتایا تھا۔ "شاہ کو پہلے قتل کرنے کا حکم ہے بعد میں مرتضیٰ کو" یہ سچ ہو سکتا ہے میر نے اس کی تشریح کی تھی۔ "میں زیادہ سیاسی آدمی ہوں جب کہ شاہ کا تمام وقت گوریلاؤں کو جسمانی تربیت دینے میں گزرتا ہے۔ شاہ جسے فوجی مہارت حاصل ہے۔ شاہ ہی اس کے لئے فوری خطرہ ہے"۔

"میں خدا سے دعا کرتی ہوں تم اور میر پاکستان کے نزدیک سے کبھی پرواز نہ کرو" میں نے شاہ کو کہا۔ "اگر طیارہ اغواء کر لیا گیا تو ضیاء تمہیں پکڑے گا" شاہ بہت ہنسا تھا۔ "موت سے کون بچ سکتا ہے۔ اگر تمہاری باری ہے تو جو کچھ مرضی کرو تم موت سے نہیں بچ سکتے۔ لیکن ضیاء ہم پر کبھی قابو نہیں پا سکتا اور نہ ہی ہم کوئی نام افشا کر سکتے ہیں وہ جتنا چاہے زور لگا لے۔ ہم جہاں بھی جاتے ہیں زہر کی شیشی ساتھ رکھتے ہیں۔ اگر ضیاء مجھے پکڑ لے تو میں اپنی شیشی پی جاؤں گا یہ سیکنڈوں میں اثر کرتی ہے۔ میں اپنی بے عزتی اور

ساتھیوں سے غداری پر موت کو ترجیح دیتا ہوں"۔

کینز میں وہ شام دل پذیر تھی جو فیشن ایبل کیلی فوی کے علاقے میں ایک طویل پہاڑی سڑک کے اوپر شاہ کے نئے فلیٹ میں ہماری آمد سے شروع ہوئی۔ یہ فلیٹ شاہ اور ریحانہ نے چھ ماہ قبل کرائے پر لیا تھا۔ اسے بہت خوشی ہوئی تھی جب میں اس کے لئے ایک رہائشی اجازت نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ ریحانہ اور اس کی صلح ہو گئی تھی پھر انہوں نے فرانس میں جگہ جگہ سفر کیا...... وہ کینز کے انتخاب سے قبل مونٹے کارلو میں قیام کا ارادہ رکھتے تھے۔ فخریہ انداز میں وہ اپنا فلیٹ دکھانے لگا۔ سسّی کے کمرے میں دیواروں پر شرارتی پتلیاں آویزاں تھیں اور کتابوں کی الماری میں بھس بھری کھالوں کے جانور اٹے ہوئے تھے۔ پھر کھانے کا کمرہ اور رہائشی کمرہ تھا وہاں سے چھت کی طرف نکل جائیں تو دور فاصلے پر بحیرہ روم کے چمکتے ہوئے پانی کی جھلک نظر آتی تھی۔ فلیٹ بہت دلا آویز تھا اور فضا کسی فلمی نظارے سے کم نہیں تھی۔

میں نے گرم جوشی سے ریحانہ کو مبارک باد دی...... میں چاہتی تھی اس مرتبہ اس کی چپ کو توڑوں اور کسی قسم کی قربت کی رشتے داری قائم کر لوں۔ معمول کے طور پر وہ جدید ترین فیشن میں ملبوس تھی اگرچہ اس کا لباس ساحل سمندر پر پکنک کی بجائے کسی ریستوراں میں ضیافت سے زیادہ مطابقت رکھتا تھا۔ لیکن ہمارے اہل خاندان ہمیشہ لباس کے سلسلہ میں بے تکلفی اور آرام کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ جب شاہ سب افراد کو ٹھنڈے مشروب سے نواز رہا تھا میں نے ریحانہ سے گفتگو کو چارونچار جاری رکھنا چاہا۔ آیا وہ شرم کی وجہ سے یا غیر دلچسپی کی بدولت کوئی خاص گفتگو نہیں کر رہی تھی، میں کچھ کہہ نہیں سکتی، لیکن وہ جلد ہی وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے کے دوسرے سرے پر بیٹھی ہوئی اپنی ہمشیرہ کے پاس چلی گئی۔ دونوں بہنیں ظاہری طور پر کافی خوبصورت تھیں مگر باطن کے اندر تو کوئی جھانک نہیں سکتا اور میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔

میں نے ننھی سسّی کو کچھ تحفے دیئے اور تھوڑی دیر اس کے ساتھ کھیلتی رہی۔ شاہ پکنک کی کھانے کی ٹوکری تیار کرنے کے لئے باورچی خانہ میں چلا گیا۔ آنٹی بہجت اور انکل کریم ہمارے

پاس آگئے۔ میں شاہ کی جگہ پر بیٹھ گئی جبکہ میرے اہل خانہ رہائشی کمرے میں گھومتے پھرے۔ میز پر خاندان کی اور ستی کی تصویریں تھیں۔ سرخ چمڑے کی ایک فائل ڈیسک پر پڑی تھی۔ تازہ پھولوں کا گلدان شیشے کی کافی کی میز پر رکھا ہوا تھا۔ میں خوش تھی کہ شاہ کی زندگی میں ایک سلیقہ آگیا ہے۔ "پہلی مرتبہ محسوس ہوتا ہے کہ میں دنیوی خوشیوں کی بلندی پر پہنچ گیا ہوں" ڈیسک کے کنارے پر تھوڑی دیر کے لئے بیٹھتے ہوئے شاہ نے مجھے کہا۔ "ہر چیز میری مرضی کے مطابق ہو رہی ہے"۔

"مجھے پکڑو، آنٹی! مجھے پکڑو" میری دونوں بھتیجیوں نے ساحل پر مجھے پکارا اور وہ سمندر کے کنارے پر اندر باہر بھاگتی رہیں میں ان کے پیچھے بھاگی یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ میں انہیں پکڑ نہیں سکتی۔ شاہ نے بالآخر کوئلے جلا دیئے اور ہم سب مرغی کی بھنائی تک بہت بھوک محسوس کرنے لگے تھے۔ "پہلا ٹکڑا تمہارے لئے ہے" تقریباً آدھی مرغی میرے حوالے کرتے ہوئے شاہ بولا۔ "اوہ، گوگی! میں اتنا نہیں کھا سکتی" میں نے احتجاج کیا۔ "نہیں، نہیں، نہیں" اس نے اصرار کیا۔ "تم سارا ٹکڑا کھاؤ گی"۔

میں نے ارد گرد دیکھا سب اہل خاندان آپس میں گپ بازی اور ہنسی ٹھٹھے میں مشغول تھے۔ کتنے برس پہلے کی بات تھی کہ ہم کراچی سے باہر ساحل سمندر پر پکنک منایا کرتے تھے۔ اور اپنا کھانا عجلت سے کھاتے تھے تاکہ شکاری جرأت مند پرندے ہم سے چھین کر نہ لے جائیں۔ کون پیش گوئی کر سکتا تھا کہ فرانسیسی ریویرا کے ساحلوں پر ہم دوبارہ پکنک کے لئے اکٹھے ہو جائیں گے۔ گھر والوں کا دوبارہ ملاپ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہم میں آپس میں اب بہت کم کشیدگی تھی جو پچھلی گرمیوں میں دیکھنے میں آئی تھی۔ میں نے اپنی دونوں بھاوجوں ریحانہ اور فوزیہ کو دیکھا وہ دونوں الگ تھلگ بیٹھی ہوئی تھیں۔ میر سوئٹزرلینڈ میں اور شاہ فرانس میں رہائش پذیر ہونے کی بنا پر وہ اکثر آپس میں مل نہیں سکتی تھیں شاید وہ دونوں بہت سی یادوں کو تازہ کر رہی ہوں گی۔

"آؤ سب کیسینو چلیں" انکل کریم نے رائے دی۔

میں تھکن محسوس کر رہی تھی مگر شاہ نے میری طرف پر امید نگاہوں سے مسکراتے

ہوئے دیکھا۔

"ہم ساری رات گپ شپ کریں گے تم ضرور آؤ، پنکی!"۔

"اچھا، میں بھی چلوں گی" میں اپنے بھائی کو انکار نہ کر سکی۔

"بہت اچھا! لیکن کل کا پروگرام نہ بھول جانا" اس نے مجھے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ جب ہم نے خریداری کے لئے جانا تھا جس میں میری والدہ کی طرف سے میری سالگرہ کا تحفہ بھی شامل تھا۔ "میں لوئی ویٹان کی مارکیٹ کا ماہر ہوں۔ کل ہم جب بھی بیدار ہوئے میں تمہیں خریداری کے لئے نیس لے جاؤں گا"۔

تجاویز، بہت سی عمدہ تجاویز۔ شاہ اور ریحانہ اپنی پکنک کی ٹوکری لئے اپنے فلیٹ کی طرف چل دیئے۔ صنم اور ناصر کو آنٹی بہجت اور انکل کریم نے اپنی گاڑی میں بٹھالیا۔ میر اور فوزیہ نے میری والدہ، میری کزن کو اور مجھے ہمارے فلیٹ میں چھوڑا اور خود فتحی کو شاہ کے فلیٹ میں سلانے کے لئے چل دیئے۔ "شاہ اور میں آدھ گھنٹے میں واپس آکر تمہیں لے چلیں گے" میر نے جاتے جاتے کہا۔

وہ واپس اکیلا ہی آیا۔

"خوش مزاج شاہ جسے ہم نے ساحل پر چھوڑا تھا، وہ شدید غصے میں تھا جب ہم ان کے فلیٹ پر پہنچے" میں نے اسے پوچھا تمہیں کیا ہو گیا ہے؟۔ میر نے کہا، لیکن شاہ کے جواب دینے سے قبل ہی ریحانہ چیخ پڑی۔ "نکل جاؤ باہر نکل جاؤ! یہ میرا فلیٹ ہے" وہ چلاتی رہی۔ وہ جنونی ہو چکی تھی۔ "مت جاؤ" گوگی نے مجھے کہا لیکن میں دونوں کے درمیان پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے وہ پر سکون ہو جائے اگر فوزیہ اور میں ان کا فلیٹ چھوڑ دیں"۔

"تو فوزیہ کہاں ہے؟" والدہ نے پوچھا۔

"وہ نیچے کار میں ہے اور بہت گھبرائی ہوئی ہے" میر نے کہا۔ "وہ سیدھا ابھی جنیوا جانا چاہتی ہے۔ اس وقت نصف شب ہے میں نے اسے بتایا اور علاوہ ازیں میری ہمشیرہ ابھی ابھی پہنچی ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ ہم کسی ہوٹل میں ٹھہریں مگر میں نے انکار کر دیا ہے۔

کیونکہ میں اپنے اہل خاندان سے کبھی کبھار ہی ملتا رہا ہوں اور میں تم سب لوگوں کے پاس ٹھہروں گا۔ لیکن ہمیں اپنی تمام شام برباد نہیں کرنا چاہئے۔ چلیں ہم اپنی تجویز کے مطابق عمل کریں"۔

"تم سب جاؤ" میں نے صنم، ناصر اور میر کو بتایا۔ "میں طویل دن کے بعد تھک چکی ہوں"

"مجھے پڑھ کر سنائیں، آنٹی! مجھے پڑھ کر سنائیں" فتحی نے اگلے روز میرا ناطقہ بند کر دیا۔ صنم، ناصر اور میر صبح چھ بجے تک واپس نہیں آئے تھے اور ہم سب دیر سے سوئے تھے۔ میں ابھی تک اپنے شب خوابی کے لباس میں گھوم رہی تھی جب ایک بجے دوپہر کے بعد دروازے کی گھنٹی بجی۔

"آنٹی کو اب تیار ہو کر بازار جانا ہے" میں نے فتحی کو کہا یہ سوچ کر کہ شاہ مجھے نیس لے جانے کے لئے آ پہنچا ہے۔

اس کی بجائے صنم بیڈ روم میں دوڑتی ہوئی آئی۔ "جلدی کرو، ہمیں بعجلت جانا ہے" اس نے اپنی بچی کو مجھے پکڑاتے ہوئے کہا جبکہ میں ابھی پوری طرح تیار بھی نہیں ہوئی تھی۔

"کیا معاملہ ہے؟" میں نے اسے پوچھا۔

"ریحانہ کہتی ہے گوگی نے کچھ کھا لیا ہے" صنم نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے جلدی میں کہا۔

میری ٹانگیں کانپنے لگیں میں نے سنبھلنے کے لئے گہرا سانس لیا۔

"کیا وہ بیمار ہے کیا یہ نازک معاملہ ہے" میں نے کہا جیسے ہی وہ ہال سے باہر نکلی۔

"ہم نہیں جانتے، یہ ہم دیکھیں گے" اس نے جواب دیا اور چلی گئی۔

میں وہاں فتحی اور ننھی بچی کے ساتھ اکیلی کھڑی تھی۔

پولیس، پولیس کو اطلاع دو۔ میں نے گود میں بے بی کو سہلاتے ہوئے فون پر ہنگامی حالت کا نمبر تلاش کرنا شروع کیا۔ پھر میں نے وہ نمبر ملایا، اور فرانسیسی زبان میں ریکارڈ کیا

ہوا پیغام موصول کیا۔ میں نے ٹیلی فون کی کتاب اٹھائی اور ہسپتالوں کے نمبر دیکھنا شروع کئے۔ اتنے میں میری والدہ اور صنم واپس بھاگتے ہوئے آئے۔ میراور ناصر پہلے ہی ریحانہ کے ساتھ شاہ کے فلیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ گلی میں ٹیکسی نہ ملنے کی وجہ سے میری والدہ اور صنم اسے حاصل کرنے کے لئے وہاں آئے تھے۔

"ممی! آپ فرانسیسی زبان مجھ سے بہتر جانتی ہیں۔ اگر پولیس نہیں مل رہی کم از کم ہسپتال تو ملا دیں" میں نے انہیں جلدی میں کہا۔

"ہم سیدھا وہاں کیوں نہ چلے جائیں ہو سکتا ہے وہ ٹھیک ہی ہو" انہوں نے کہا۔

"نہیں ممی، احتیاط بہتر ہوتی ہے ٹونی کو یاد کریں" میں نے انہیں یاد دھانی کراتے ہوئے کہا کہ اس لڑکی نے گولیوں کی زیادہ خوراک کھالی تھی اور ہسپتال جانے میں دیر ہونے کی وجہ سے بچ نہیں سکی تھی۔ مجھے اپنا تجربہ بھی یاد ہے جب ۷۰ کلفٹن کو پولیس نے محصور کیا ہوا تھا۔ وہ وقت یہ جاننے کا نہیں تھا کہ پولیس کیوں آئی تھی۔ پہلے تمام کاغذات جلا ڈالو پھر پوچھو"۔

میری والدہ نے ٹیلی فون کی کتاب اٹھائی انہوں نے ایک ہسپتال ملایا انہوں نے ایک دوسرے ہسپتال کا نمبر دیا۔ اس ہسپتال کو ملایا کسی اور کو ملو، انہوں نے جواب دیا۔ وہ تیسرے ہسپتال کو فون کر رہی تھیں کہ میر اندر آگیا۔

وہ ٹوٹا ہوا اور پٹا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ خاموشی سے اس نے کہا اور میں نے اس کے ہونٹ ہلتے دیکھے۔ "وہ مر چکا ہے"۔

"نہیں" میں چلائی "نہیں"۔

میری والدہ کے ہاتھ سے ٹیلی فون گر گیا۔

"یہ سچ ہے، ممی!" میر نے کرب کے ساتھ کہا۔ "میں نے مردہ اشخاص دیکھے ہیں، شاہ کا جسم ٹھنڈا ہے"۔

ممی نے رونا شروع کر دیا۔

"ایمبولنس بلاؤ" میں نے کہا۔ "خدا کے لئے ہسپتال ٹیلی فون کرو، ہو سکتا ہے وہ ابھی

زندہ ہوا سے دوبارہ ہوش میں لایا جا سکتا ہے" مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا میں اپنے بازوؤں میں تھامے بے بی کا کیا کروں۔ فتحی میری ٹانگوں سے لپٹی ہوئی تھی اور مجھے تک رہی تھی۔

میری والدہ نے ٹیلی فون کو فرش سے اٹھایا۔ تیسرا ہسپتال ابھی لائن پر تھا۔

"ہمیں بتائیں کہاں جانا ہے؟" آپریٹر جس نے ہماری چیخیں سن لی تھیں نے کہا۔ ہم دروازے سے باہر کو بھاگے۔

شاہ نواز رہائشی کمرے میں کافی کے میز کے ساتھ قالین پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے کل شب والی سفید پتلون ابھی تک پہنی ہوئی تھی۔ اس کا ہاتھ باہر کو پھیلا ہوا تھا۔ ایک خوبصورت بھورے رنگ کا ہاتھ۔ وہ سوئے ہوئے ایڈونس کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

"گوگی" میں چلائی اور اسے جگانے کی کوشش کی۔ لیکن پھر میں نے اس کی ناک دیکھی۔ وہ چاک کی طرح سفید تھی اور اس کی سرخ ناک سے بالکل مختلف۔

"اسے آکسیجن دو" میں ایمبولینس کے عملے پر چلائی جو اس کی نبض دیکھ رہے تھے۔

"اس کے دل کی مالش کرو"۔

"وہ مر چکا ہے" عملہ میں سے ایک نے خاموشی سے کہا۔

"پنکی! وہ بالکل ٹھنڈا ہے" میر نے کہا۔ "وہ گھٹنوں سے ٹھنڈا ہے"۔

میں نے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ کافی کی میز ٹیڑھی تھی۔ ایک بھورے رنگ کا سیال مادہ چھوٹی میز پر طشتری میں پڑا تھا۔ تکیہ کاؤچ سے آدھا اترا ہوا تھا اور پھولوں کا گلدان گرا ہوا تھا۔ میری آنکھیں اس کی ڈیسک کی طرف اٹھیں۔ چمڑے کی فائل غائب تھی۔ میں نے چبوترے کی طرف دیکھا۔ اس کے کاغذات وہاں پڑے تھے فائل کا فولڈر کھلا ہوا تھا۔

کوئی خطرناک قسم کی غلطی نظر آ رہی تھی۔ اس کا جسم ٹھنڈا تھا۔ خدا جانتا ہے کب سے؟ شاہ وہاں پڑا مر رہا تھا۔ لیکن کوئی اس پر بیدار نہیں ہوا اور کسی نے اس کے کاغذات کی تلاشی میں کافی وقت صرف کیا تھا۔

میں نے ریحانہ کو دیکھنے کے لئے نظر اٹھائی۔ وہ مطلقاً ایسی عورت نہیں لگ رہی تھی جس کا شوہر فوت ہو چکا ہو اور جس نے امداد حاصل کرنے کی تگ و دو کی ہو۔ وہ صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے تھی اس کی سفید سوتی جیکٹ پر کوئی بل نہیں تھا۔ بال بنے ہوئے تھے کوئی ایک بال بھی بکھرا نہیں تھا۔ اس نے بننے سنورنے میں کتنے گھنٹے لگائے ہوں گے جبکہ میرا بھائی فرش پر مردہ پڑا تھا؟۔ اس نے میری طرف نظر اٹھائی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔

اس کے ہونٹ ہلے۔ میں بالکل نہ سن سکی کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔

"زہر" اس کی بہن نے بتایا وہ کہہ رہی تھی۔ "اس نے زہر کھالیا تھا"۔

مجھے اس کا یقین نہیں آیا۔ ہم میں سے کسی نے بھی یقین نہ کیا۔ شاہ زہر کیوں کھائے گا؟ وہ کل رات جتنا خوش و خرم تھا پہلے کبھی نہیں تھا۔ وہ اپنے مستقبل کی تجاویز پر عمل کرنے میں پرجوش تھا۔ ماہ اگست میں افغانستان واپس جانا چاہتا تھا۔ کیا اس سب کا یہ نتیجہ تھا۔ کیا ضیاء کو شاہ کی تجاویز کا پتہ چل چکا تھا اور اس نے پہلے سے اس کا توڑ کر لیا تھا؟ یا کیا سی آئی اے نے اپنے پسندیدہ آمر کو خوش کرنے کے لئے اسے مار دیا تھا؟۔

"خدا کے لئے شاہ کے جسم کو ڈھانپ تو دو" صنم نے کہا۔ کوئی سفید پلاسٹک کا ایک ٹکڑا لے آیا۔

"آنٹی، آنٹی! کیا معاملہ ہے؟" ننھی فتحی میری قمیص کا کنارہ کھینچتے ہوئے پوچھتی رہی۔

"کچھ نہیں، پیاری بیٹی!" میں غائبانہ طور پر تین سالہ بچی کو مطمئن کرتی رہی۔ سسی بھی بہت پریشان اور مخبوط الحواس لگتی تھی۔ کمرے میں ادھر ادھر گھومتی اور اپنے باپ کے جسم کے ساتھ جاکر لگ جاتی۔ "بچوں کو کمرے سے باہر لے جاؤ" میری والدہ نے کہا۔ میں انہیں سسّی کے سونے کے کمرے میں لے گئی اور انہیں ایک کتاب دیدی۔

جب پولیس شاہ کی نعش کو لینے آئی تو میر نے مجھے باورچی خانہ میں بھیج دیا۔ "تم یہ منظر نہیں دیکھ سکو گی" اس نے کہا۔ میں نے چولھے پر فرائی پین میں ابھی تک پکے ہوئے انڈے

وزیر اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو، صدر پاکستان سردار فاروق احمد خان لغاری، بیگم نصرت بھٹو، اور گورنر پنجاب چوہدری الطاف حسین، صوبائی وزیر سردار مقصود احمد لغاری کے بیٹے کی دعوت ولیمہ میں شریک ہیں۔

اور آدھے کٹے ہوئے ٹماٹر پر نظر دوڑائی۔ یہ سب کس کے لئے؟ میز پر دودھ کی بوتل بھی پڑی تھی۔ دن بہت گرم ہونے کی وجہ سے دودھ دہی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اسے فریج سے باہر کیوں دھرا رہنے دیا گیا؟ "وہ شاہ کو لے گئے ہیں" میر نے باورچی خانے میں آکر بتایا۔ پولیس نے کہا اسے دل کا دورہ پڑا معلوم ہوتا ہے۔

وہ اپنے چہرے سے آنسو پونچھتے ہوئے پیچھے مڑا۔ جب اس نے ٹشو کا کاغذ ردی کی ٹوکری میں ڈالا تو اس کی نگاہ ایک چمکتی ہوئی چیز پر پڑی۔ یہ زہر کی خالی شیشی تھی۔

فرانسیسی حکام نے کئی ہفتوں تک شاہ کی میت ہمارے حوالے نہ کی۔ انتظار کرب انگیز تھا کیونکہ ہم سب والدہ کے فلیٹ میں جمع ہو گئے تھے۔ بطور مسلمان ہم اپنے مردوں کو ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر دفن کر دیتے ہیں مگر شاہ کی میت پر ٹسٹ کے بعد ٹسٹ ہو رہے تھے۔ ہمیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ہم کیا کریں۔ ہم رو لیتے، بیٹھے رہتے یا آسمان کی طرف گھورتے رہتے۔ کسی کو کھانے، پینے یا کچھ کرنے کی آرزو نہیں تھی۔ ہمارے پاس صنم کی بے بی، میر کی بیٹی تھی اور اکثر سسّی کو بھی فوزیہ اس وقت چھوڑ جاتی جب ریحانہ کو تفتیش کے سلسلہ میں پولیس اسٹیشن جانا پڑتا۔ ہمیں جھولوں تک لے جاؤ، ننھی بچیاں مجھ سے التجا کرتیں اور میں انہیں نزدیکی پارک میں جھولوں تک لے جاتی۔ بعض اوقات میر بھی میرے ساتھ شامل ہو جاتا جب لڑکیاں کھیل رہی ہوتیں میر اور میں ایک بینچ پر بیٹھ جاتے اور سمندر کو خاموشی سے تکتے رہتے۔

میرا دل سسّی کے لئے بہت دکھتا۔ وہ اپنے باپ کی بہت چہیتی بیٹی تھی۔ شاہ صبح سویرے اسے جگاتا، اس کا ناشتہ تیار کرتا اور رفع حاجت بھی کراتا۔ تقریباً تین سالہ سسّی جانتی تھی کہ اس کے پاپا زندہ نہیں رہے۔ جب میر فتحی کو لینے آتا تو وہ بھی پکارتی۔ "میرا پاپا، میرا پاپا؟" جب کار "لانپولے" کے ساحل سمندر کے پاس سے گزرتی جہاں ہم سب نے باربیکیو کھایا تھا تو سسّی چلاتی۔ "پاپا شاہ، پاپا شاہ" پولیس والے قالین کا وہ حصہ کاٹ کر لے گئے تھے جہاں شاہ کا جسم پایا گیا تھا۔ جب ریحانہ نے وہاں نئی قالین بچھائی تو سسّی اس جگہ کی طرف اشارہ کرتی جہاں اس نے اپنے والد کو آخری وقت دیکھا تھا۔ "پاپا شاہ، پاپا

شاہ" وہ پکارتی رہتی۔ وہ ہم سے چمٹ جاتی جب بھی ہم اسے فوزیہ کے پاس واپس چھوڑنے جاتے۔ وہ اس گھر میں جانا نہ چاہتی اور اپنے بازو مضبوطی سے ہماری گردنوں کے گرد لپیٹ لیتی۔ "جاؤ ننھی بے بی میں آہستہ سے اس کے کان میں کہتی جبکہ فوزیہ اسے اپنی طرف کھینچتی۔ لیکن سسّی اور زیادہ سختی سے چمٹ جاتی۔ ہمیں اس کی گرفت کو ڈھیلا کرنے کے لئے اس کے ہاتھوں کو کھولنا پڑتا۔

شاہ کی میت کے حصول کے لئے اس طرح بیٹھے رہنا کافی وحشت ناک تھا۔ ہر چیز مجھے اس کی یاد دلاتی تھی۔ مجھے ہر جگہ شاہ نظر آتا، کارلٹن ہوٹل میں بیٹھا ہوا، کرائے سیٹ میں چلتا ہوا۔ اس کے کھو جانے کا غم اور بھی بڑھ جاتا جب پاکستانی اخبارات میں مستقلاً اس کی ملامت اور مذمت میں خبریں چھاپی جاتیں۔ حکومت کے جی حضوری اخبارات لکھتے کہ شاہ مایوسی کا شکار تھا جوئے باز تھا اور خودکشی پر آمادہ شخص تھا۔ جس رات وہ مرا وہ شراب کے نشے میں مدہوش تھا۔ ان کا دعویٰ تھا۔ لیبارٹری کی رپورٹیں ان کے دعویٰ کی نفی کرتی تھیں لیکن ایسی رپورٹیں پاکستانی پریس میں کوئی جگہ نہ پاتیں۔ اب جبکہ شاہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اس کے دشمن بہرطور اس کے وقار اور عزت کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اور میرے بھائی کی میت کے حصول میں تاخیر ہمارے کرب کو مزید بڑھاتی جاتی۔

"میں شاہ کی میت کو دفنانے کے لئے پاکستان لے جارہی ہوں" میں نے ایک سہ پہر اہل خاندان کو بتایا۔

میری والدہ تقریباً پاگل ہوگئیں۔ "اوہ پنکی! تم واپس نہیں جاؤ گی" وہ چلائیں۔ "میں اپنے بیٹے کو گنوا بیٹھی ہوں میں اب اپنی بیٹی کو گنوانا نہیں چاہتی"۔

"شاہ نے سب کچھ میرے لئے کیا۔ مگر اپنے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے کبھی نہیں کہا تھا" ۔ "وہ لاڑ کانہ واپس جانا چاہتا تھا۔ وہ اکثر پوچھتا کہ پاپا کو کہاں دفن کیا گیا ہے تاکہ وہ اس کی تصویر اتار لے۔ میں اسے گھر لے جاؤں گی" ۔

" میر! اسے بتاؤ یہ گھر واپس نہیں جائے گی" میری والدہ میرے بھائی سے التجا کرتی ہیں۔ وہ کیا کر سکتا تھا۔

"اگر تم واپس جاتی ہو تو میں بھی جاؤں گا" اس نے مجھے کہا اور مجھے ڈرا کر نہ جانے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ ہم سب جانتے تھے کہ ضیاء یقیناً اسے قتل کر دے گا۔

"تم مت جاؤ، میں جاؤں گی" آنٹی بہجت نے کہا۔

"میں جاؤں گی" صنم نے کہا۔

"میں جاؤں گا" ناصر نے کہا۔

"ٹھیک ہے ہم سب اکٹھے جائیں گے" میں نے کہا۔ "میں نہیں چاہتی کہ شاہ کو خاموشی سے خفیہ طور پر دفنا دیا جائے۔ میں چاہتی ہوں اس کی عزت اور وقار کے شایان شان اسے دفن کیا جائے" ۔

جب کہ اس کے جسم کا تجزیہ جاری رہا۔ میں چند دنوں کے لئے لندن بذریعہ طیارہ واپس آ گئی تاکہ باربیکین میں تمام امور کی دیکھ بھال کر سکوں۔ ہزاروں لوگ پارٹی کے دفتر میں تعزیت کے لئے آئے۔ شاہ کی موت کا غم حقیقی تھا اور پاکستانی میرے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ اور سب میں یہ شک و شبہ عام تھا کہ میرے بھائی کی موت میں ضیاء کا ضرور ہاتھ ہے۔ پاکستان میں، مجھے بتایا گیا، ہر کوئی اس غم میں شریک ہے۔ شاہ کی روح کے ثواب کے لئے پورے ملک میں دعائیہ جلسے منعقد ہو رہے تھے۔ جبکہ ہزاروں لوگ ۷۰ کلفٹن میں بھی دعا میں شامل ہونے کے لئے آ رہے تھے۔ اخبارات جن میں شاہ کی موت کے بارے میں شراب اور منشیات کے استعمال کا جھوٹا پراپیگنڈہ کیا جا رہا تھا نذر آتش کئے جا رہے تھے۔ سندھ میں وفات پانے والے کے احترام میں اکثر دوکانداروں نے اپنی دوکانیں بند کر دی

تھیں۔ جولائی کی تمازت کے باوجود لوگوں کا سیلاب لاڑکانہ میں اڈا چلا آرہا تھا۔ ہر ہوٹل کے کمرے بک ہو چکے تھے اور لوگ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ڈیرے جما چکے تھے۔

جب میں کینز میں واپس آئی تو مجھے اپنی تلملاہٹ پر ضبط کرنا پڑا تاکہ میت کے طبّی جائزے کی تکمیل کے بعد اپنی روانگی کے انتظامات کے سلسلہ میں لندن اور کراچی سے رابطہ کر سکوں کیونکہ بہت سے پاکستانی شاہ کے سفر آخرت میں اہل خانہ کے ساتھ جانا چاہتے تھے۔ پاکستانی سرکاری پریس شاہ کی میت کے حصول اور ہماری واپسی کے ممکنہ اوقات کے بارے میں الجھاؤ پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور میں نے اس کی مزاحمت کے لئے اور اپنے حامیوں کی اطلاع کے لئے ہر روز باقاعدگی سے بلیٹن جاری کرنا شروع کر دیا۔

ہمارے غم کی تو کوئی انتہاء نہیں تھی۔ کسی ظاہری سبب کے بغیر، میری والدہ کی کار جو متعدد دوسری گاڑیوں کی طرح گلی میں ایستادہ رہتی تھی توڑ دی گئی۔ وہ خطوط جو میں واپس اپنے ساتھ لائی تھی اور عقبی نشست پر پڑے تھے۔ چرا لئے گئے تھے۔ ہمارے شکوک بڑھ گئے اور ہمیں اپنی سلامتی کی فکر پڑ گئی۔ اس بات کا یقیناً زبردست امکان تھا کہ شاہ کو حکومت کے گماشتوں نے قتل کیا۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہ کینز چھوڑ کر واپس جا چکے تھے۔ ہم نے اپنے خدشات اور اپنے تحفظ کے بارے میں فرانسیسی حکومت کو آگاہ کیا اور انہوں نے مناسب انتظامات کا یقین دلایا۔

جب بالآخر شاہ کی میت ہمارے حوالے کی گئی۔ ہم اس کی نماز جنازہ پڑھنے کے لئے گئے۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنے چھوٹے بھائی کو اسی پہلی حالت میں دیکھوں گی سورج کی دھوپ میں تپا ہوا چہرہ، سفید سوٹ میں ملبوس پتلا خوبصورت جسم جیسا ہم نے تابوت برداروں کے پاس چھوڑا تھا کیونکہ سفید رنگ اسے بہت پسند تھا۔ لیکن کفن میں لپٹا ہوا جسم کسی اجنبی کا دکھائی دیتا تھا۔ شاہ کے چہرے پر پوڈر کا سفید رنگ چھڑکا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ تابوت برداروں نے طبّی معائنہ کے دوران چیر پھاڑ کے بہت سے نشانات کو مٹانے کی غرض سے چہرے پر کھریا مٹی ملی ہوئی تھی۔ یہ دلدوز نظارہ تھا۔

آہ میرا بیچارہ گوگی، تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے؟ کمرے سے رونے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ لاشعوری انداز میں، میں اپنے چہرے پر دوہتڑ مارنے شروع کر دیتی۔ ہچکیاں بھرتے ہوئے اور بار بار رکتے ہوئے جب سانس کی گھٹن بڑھ جاتی۔ ہمیں کمرے سے باہر لے جایا گیا۔ ہم نے اپنے آپ پر ضبط کی کوشش کی اور کار کی طرف بڑھے جہاں پریس کے فوٹو گرافر منتظر تھے۔

شاہ کو میں ۲۱ر اگست ۱۹۸۵ء کو پاکستان لے گئی۔ حکومت نے بادل ناخواستہ لاڑکانہ میں اسے دفنانے کی اجازت دیدی تھی۔ شاید لوگوں کے غصیلے ردعمل سے بچنے کے لئے کیونکہ مسلمانوں کی روائت کے خلاف میرے والد کے دفنانے پر میری والدہ کو اور مجھے ان کی زیارت تک کرنے کی حکومت نے اجازت نہیں دی تھی۔ تاہم حکومت نے ایک اور بھٹو کے دفناتے وقت اپنی پوری کوشش کی کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔

ایک جذباتی مجمع سے ڈرتے ہوئے مارشل لاء حکام نے شاہ کی میت کے ہمراہ ہمیں سیدھا کراچی سے بذریعہ طیارہ موہنجو داڑو پہنچانے کے انتظامات کئے تاکہ وہاں سے بذریعہ ہیلی کاپٹر خاندانی قبرستان لے جایا جاسکے جہاں ایک ہیلی پیڈ تعمیر کر دیا گیا تھا۔ حکومت کی خواہش تھی کہ شاہ کے دفنانے کو لوگوں کی نظروں اور ذہنوں سے دور خاموشی سے سرانجام دیا جائے۔ میں نے انکار کر دیا۔ شاہ کی آٹھ سال سے متواتر یہ خواہش تھی کہ وہ اپنے پیدائشی گھر کو واپس جائے۔ میرا عزم تھا کہ اس کے سفر آخرت کو اس کے لئے اور اپنے لئے زیادہ سے زیادہ بامعنی بنایا جائے۔ اسے ان ہی دروازوں میں سے گزارا جائے جنہوں نے اسے پناہ اور سایہ دیا تھا یعنی کراچی کے گھر ۷۰ کلفٹن میں اور لاڑکانہ کے گھر المرتضٰی میں۔ میری خواہش تھی کہ اسے ان زمینوں میں سے لے کر جاؤں جہاں وہ پاپا اور میر کے ساتھ شکار کھیلتا رہا اور لوگوں کے پاس سے جن کی حفاظت میں وہ اپنے طور پر کوشاں رہا۔ لوگوں کا یہ حق تھا کہ وہ پاکستان کے ایک بہادر بیٹے کی عزت افزائی کریں اس سے قبل کہ اسے گڑھی خدا بخش میں اپنے والد کے پہلو میں جاودانی استراحت کے لئے لٹا دیا جائے۔

"مارشل لاء حکام کو بتادو کہ وہ جو کچھ میرے ساتھ کرنا چاہتے ہیں کریں مگر میں اس امر

کی اجازت نہیں دوں گی کہ ایک مسلمان کا حق ادا نہ کرنے دیا جائے کہ وہ اپنے آخری غسل کے لئے اہل خانہ اور خاندان والوں کے پاس اپنے گھر جائے"

میں نے ڈاکٹر اشرف عباسی کو بتایا جو لاڑکانہ میں تمام انتظامات طے کرنے کے لئے مقامی انتظامیہ سے رابطہ رکھ رہی تھیں۔ حکومت کے ساتھ ایک درمیانی راستہ اختیار کرنے پر اتفاق ہو گیا تھا۔ ہمیں شاہ کو ۰۷ کلفٹن میں لے جانے کی اجازت نہیں ہو گی مگر ہم اسے المرتضٰی میں لے جاسکیں گے۔ لاڑکانہ میں ہمارا گھر بہت دور افتادہ تھا اور پہنچنے کا راستہ بھی کٹھن کہ مقامی حکام نے اپنی رپورٹوں میں لکھا وہاں لوگوں کا زیادہ ہجوم اکٹھا نہیں ہو سکے گا خاص طور پر ماہ اگست کے جہنم کی وجہ سے۔ فوج نے عوام کو روکنے کے لئے ان تمام سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں جو صوبہ سندھ کی طرف جاتی تھیں۔ بسیں، ٹرک، ٹرینیں، اور کاریں کھڑی کی جاتیں اور ان کی تلاشی لی جاتی۔ فوج کو سندھ میں چوکنا کر دیا گیا اور پی پی پی کے راہنماؤں کو نظر بند کر دیا گیا۔ کراچی ائیرپورٹ کو گھیرے میں لیا گیا اور ٹرکوں میں خود کار اسلحہ سے مسلح سپاہیوں کو شہر کے بڑے بڑے راستوں میں پھیلا دیا گیا۔ کسی بھی ہنگامے کی پیش بندی کے لئے حکومت نے مارشل لاء اٹھا لینے کی آخری تاریخ کا اعلان کیا تاکہ لوگ تسلی سے گھروں میں بیٹھے رہیں۔ اپنے بھائی کی میت کے ہمراہ پاکستان جانے کے لئے زیورخ سے میری روانگی پر، ضیاء کے نامزد کردہ وزیراعظم محمد خان جونیجو نے دسمبر میں مارشل لاء کے اٹھانے کا حتمی اعلان کیا۔

سیاہ بازوؤں پر سیاہ پٹیاں سیاہ شلواریں قمیصیں اور دوپٹے۔ ہم کراچی میں مختصر عرصہ کے لئے ٹھہرے اور سنگاپور ائرلائنز کے طیارہ سے ہمیں موہنجو داڑو کے آخری سفر کے لئے چھوٹے چارٹرڈ طیارہ فوکر میں منتقل کر دیا گیا۔ جیسے ہی شاہ کا کفن جسے پی پی پی کے جھنڈے میں لپیٹا گیا تھا اتار کر ایک ٹرالی میں رکھا گیا۔ ۰۷ - کلفٹن سے آئے ہمارے ملازمین روتے ہوئے اس پر پل پڑے۔ روتے چلاتے ہوئے ہمارے کراچی کے بہت سے رشتہ دار بھی جمع ہو گئے اور پاری، سمیعہ، اور اس کی بہن بھی۔ اور وہاں سے ہم ایک ہنگامہ خیز طوفانی جنازہ میں گھر گئے جو پاکستان میں اس سے قبل شاید ہی دیکھا گیا ہو۔

"چلو چلیں، چلو چلیں، چلو لاڑ کانہ چلیں۔ کیا تم نہیں جانتے وہاں آج شاہ نواز کی میت آرہی ہے۔ شاہ نواز جو ذوالفقار علی بھٹو کا بیٹا ہے۔ شاہ نواز جو ایک مجاہد ہے۔ شاہ نواز جس نے اپنی زندگی تمہارے اور میرے لئے قربان کر دی۔ آؤ، آؤ، ہم سب چلیں اور اپنے ہیرو کا استقبال کریں" ایک خوبصورت گیت جو میرے بھائی کے لئے لکھا گیا پورے پاکستان میں گایا جارہا تھا۔ حکومت کی دھمکیوں کے باوجود لوگوں کا ایک سیلاب کئی ہفتوں سے لاڑ کانہ کی طرف اڈا چلا آرہا تھا کھیتوں میں لوگوں نے خیمے ڈال دیئے اور پٹڑیوں پر سونا شروع کر دیا۔

سیاہ اور زیادہ سیاہ جیسے ہی فوکر صبح ۱۰ بجے موہنجو داڑو پر اترا، ائرپورٹ پر سیاہ ملبوس لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے، جو میلوں تک سڑکوں کے کنارے پر کھڑے تھے۔ حکومت کی رکاوٹیں ان تعزیت کنندگان کے آڑے نہ آئیں جنہوں نے جھلستی ہوئی گرمی میں اظہار غم کے لئے اپنے وطن کے جاں نثار سپوت کی خاطر سفر کیا۔ مسلمانوں میں عداوتیں بھی ہوں تو موت کے سانحہ پر ختم ہو جاتی ہیں۔ اور رنج و غم کا اظہار ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن کسی کو بھی اس قدر کثیر ہجوم کی توقع نہیں تھی۔ پریس نے لوگوں کی تعداد دس لاکھ کے لگ بھگ بتائی۔

"اللہ اکبر! اللہ اکبر!" لوگوں نے بلند آواز میں پکارا جب شاہ کا تابوت ایک منتظر ایمبولینس میں رکھا گیا۔ اور ارد گرد برف کی تہیں رکھ دی گئیں۔ تمام ترپوسٹ مارٹم اور طبّی جائزوں کے بعد میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بدن خراب ہو۔ "انا اللہ و انا علیہ راجعون" "ہم سب اللہ کی طرف سے آئے ہیں اسی کی طرف واپس جانے والے ہیں" لوگوں نے ہاتھوں اور ہتھیلیوں کو اوپر کی طرف اٹھاتے ہوئے بلند آواز میں مرنے والے کے لئے دعا پڑھی جیسے ہی ایمبولینس ان کے پاس سے گزری۔

میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ جیسا شاندار اور باوقار الوداع شاہ کو ۲۸ سال کی عمر میں نصیب ہوا کبھی مملکتوں کے سربراہوں کو بھی نصیب ہوا ہو گا۔ ہر قسم کی دو ہزار گاڑیاں جن میں کاریں، موٹر سائیکلیں، ٹرک اور جانوروں سے جتے ہوئے گڈے بھی شامل تھے۔ سیاہ

کپڑوں میں ملبوس تابوت کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ گاڑیوں کی ایک لمبی قطار دس میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ لوگوں نے ایئرپورٹ سے لاڑ کانہ تک ۲۸ کلو میٹر کے فاصلے پر پھیلے ہوئے سفر میں ایمبولنس پر منوں پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں۔ جیسے ہی اس کا تابوت پاس سے گزرتا، ہجوم میں سے بہت سے لوگ فوجی طرز کا سلام کرتے ان کے سر کشیدہ کی ہوئی ٹوپیوں سے یا اپنے قبیلے کی پگڑیوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔

شاہ کی بڑی بڑی تصویریں سیاہ حاشیئے میں فریم کی ہوئی جگہ جگہ رکھی ہوئی تھیں۔ شاہ نواز شہید، شاہ نواز شہید، وہاں میری، والدہ کی تصویریں اور ایک ناقابل فراموش تصویر شاہ کی پاپا کے سائے میں رکھی ہوئی تھیں۔ شہید کا بیٹا شہید اس پر لکھا ہوا تھا۔ غم کے دبے ہوئے جذبات...... جو لوگ میرے والد کی موت پر اظہار تعزیت سے قاصر رہے تھے اب اپنی اور ہماری تکالیف کا احساس دلوں میں لئے سب مل کر باہر آرہے تھے۔ روتے ہوئے اور اپنی چھاتیوں کو پیٹتے ہوئے غم زدہ لوگ گاڑیوں کے آگے بچھے جارہے تھے۔ اپنے جنون میں کاروں کو ہلاتے اور الوداعی اشارے کے طور پر شاہ کی تابوت کی گاڑی کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ سورج آسمان کی بلندیوں پر تھا اور ابھی نماز ظہر سے قبل بہت کچھ کرنا باقی تھا۔

غسل میت، اہل خانہ کی طرف سے میت کی آخری زیارت، گھر کی خواتین کی طرف سے شہید کے لئے دعا کیونکہ وہ میت کے ساتھ قبرستان نہیں جاتیں، مردوں کے لئے نماز جنازہ کا انتظام نزدیکی فٹ بال کے میدان میں کیا گیا تھا۔ شاہ کو سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے دفنایا جانا تھا۔ اور صنم اور میں نے ابھی اس کی قبر کی نشان دہی کرنا تھی۔ ہم اپنے والد کے لئے یہ کام نہیں کر سکی تھیں۔ اس مرتبہ میری خواہش تھی کہ شاہ کی قبر اپنے والد سے کافی فاصلے پر رکھی جائے تاکہ بعد میں دونوں کے مزار تعمیر کئے جا سکیں۔ جب ہم المرتضٰی تک پہنچے تو ہجوم ایک ٹھوس دیوار بن کر آگے کھڑا تھا۔

''سیدھے گڑھی کی سمت روانہ ہو جاؤ'' میں نے اپنی کار کے ڈرائیور کو کہا۔ کسی نہ کسی طرح وہ ہمیں ہجوم سے باہر لے گیا۔ جبکہ شاہ کی میت کو اٹھائے ہوئے ایمولینس المرتضٰی کے

صحن میں پہنچ گئی۔ پندرہ میل دور ہمارے خاندانی قبرستان کے آس پاس ہجوم کم گنجان تھا۔ لیکن وہ دیواروں کے باہر کھڑے تھے۔ صنم اور میں نے قبرستان کے بائیں کونے میں جگہ چنی جو میرے والد کی قبر سے کافی فاصلے پر تھی۔ والد کی قبر ہمارے دادا کی قبر کے قریب تھی۔ اپنے والد کی قبر پر مختصر دعا پڑھنے کے بعد ہم جلدی سے المرتضٰی کی جانب روانہ ہو گئیں۔

چلاتے ہوئے، روتے ہوئے، اپنے غم کی شدت میں لوگوں نے المرتضٰی کی دیواریں توڑ دی تھیں۔ وہ نہ صرف صحن میں بلکہ گھر کے اندر بھی پھیل گئے تھے۔ گھر ان لوگوں سے بھرا ہوا تھا علاوہ ازیں ہماری رشتہ دار خواتین، خاتون پارٹی اراکین اور گھر کے ملازمین سب جمع تھے۔ شاہ کا تابوت بیٹھک میں رکھا تھا جو اس شورو غل کی وجہ سے ابھی تک کھلا پڑا تھا۔ "برائے مہربانی جانے کے لئے ہمیں جگہ دو" میں نے ہاتھ باندھ کر لوگوں سے التجا کی جو ایک دوسرے پر پلے پڑتے تھے۔ نظم و ضبط ختم ہو گیا تھا۔

میں شاہ کے چہرے کو رشتہ دار خواتین کو دکھانا چاہتی تھی لیکن جب ملازمین تابوت کو دادا کے کمرے میں غسل کے لئے لے جارہے تھے تو جذبات میں طوفان آگیا۔ خواتین اور خصوصاً گھر کے ملازمین جذبات سے اس قدر بے قابو ہوئے کہ انہوں نے اپنے سروں کو تابوت پر مارنا شروع کر دیا۔ مردوں کے سروں سے، عورتوں کے سروں سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ "خدا کے لئے ان سب کو پرے لے جاؤ مبادا وہ اپنے آپ کو زیادہ نقصان پہنچالیں" میں چلائی۔ "شاہ کو تیزی سے میرے دادا کے کمرے میں لے جاؤ"۔

آخر کار خاموشی اور ملائمت کے ساتھ شاہ کی میت کو ہمارے مولوی اور گھریلو سٹاف نے غسل دیا اور کفن میں لپیٹ دیا۔ گرمی کے درجہ حرارت ۱۱۰ ڈگری کی وجہ سے فضاء میں گھٹن تھی اور دفنانے کے متعلق میری پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔

"اوہ بابا! اس کے تمام جسم پر چیرپھاڑ کے بے شمار نشان تھے" گھریلو عملہ کے ایک ملازم نے غسل کے بعد کہا۔ "مجھے مت بتاؤ" میں نے اسے کہا۔ لیکن وہ بند نہ ہوا۔ "اس کی ناک کٹی ہوئی تھی اس کی ٹھوڑی، اس کی......" "چپ کرو" میں چلائی۔ "کافی ہو چکا وہ

فلپائن کے صدر جنرل راموس وزیر اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو کے ہمراہ

اب اپنے گھر میں ہے واپس اس جگہ جہاں کی مٹی سے پیدا ہوا" میرا بہنوئی ناصر حسین میرے پاس آیا۔ "دیر ہو رہی ہے" اس نے کہا۔ "ہمیں جلدی کرنی چاہئے" ہجوم کو دیکھتے ہوئے ہم نے فیصلہ کیا کہ بہترین طریقہ یہی ہے کہ شاہ کی میت کو کفن کی بجائے ایک مضبوط چوبی تابوت میں قبرستان تک لے جایا جائے۔

میں نے ملازمین کو شاہ کی میت کو بیٹھک میں لانے کے لئے کہا تاکہ رشتہ دار دعا مانگ لیں۔ تب اچانک شاہ کا تابوت ہجوم میں سے ایمولینس کی طرف جاتا ہوا نظر آیا۔ ناصر حسین پیچھے بھاگا۔ اس کشمکش میں میں خود پیچھے رہ گئی۔ دعاؤں کی آوازیں سن کر میں تابوت کے پیچھے دروازے تک آئی۔

الوداع شاہ نواز! الوداع...... الوداع اس قدر جلدی میں ہوا اور اتنا درد انگیز تھا کہ بیان سے باہر تھا۔ جب ایمبولنس چل پڑی، میں پیچھے بھاگنا چاہتی تھی کہ اسے بند کرواؤں اور شاہ کو واپس لے آؤں۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کو جدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اوہ، گوگی! میرے پاس ٹھہرو۔ باغ میں ٹھہری ہوئی پانچ سو عورتوں کے نوحے کی ایک ہی آواز بلند ہوئی جب ایمولینس دروازوں سے باہر نکلی اور نظروں سے غائب ہو گئی۔ میرا بھائی ہمیشہ کے لئے مجھ سے بچھڑ چکا تھا۔

شیعہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہر نسل میں ایک کربلا برپا ہوتی ہے وہی المیہ دہرایا جاتا ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خاندان پر ان کی ۶۳۲ء میں وفات کے بعد متشکل ہوا۔

پاکستان میں بہت سے لوگوں کا یقین ہے کہ بھٹو خاندان اور ہمارے حامیوں پر آمر کا ظلم عظیم ہماری نسل کی کربلا ہی تھی۔ والد کو زندہ نہیں چھوڑا گیا والدہ پر ہر قسم کا ظلم ڈھایا گیا۔ بھائیوں کو بھی بخشا نہیں گیا۔ بیٹی کو ہر طرح سے اذیت دی گئی۔ ان کے حامیوں پر ظلم ڈھایا گیا۔ رسولؐ کے نواسے کی طرح ہمارے عزم میں کوئی لغزش نہیں آئی۔

جب میں المرتضیٰ کے دروازے میں کھڑی تھی، صحن میں سسکیوں کی آوازوں میں سے ایک آواز ابھری جس نے کربلا کے المیے کی یاد تازہ کر دی۔ "بے نظیر کو دیکھو، بے نظیر کو

دیکھو" ایک عورت کی بلند آواز زیر و بم کی لہروں میں سے گزرتی پکاری۔ "وہ اپنے بھائی کی میت کے ساتھ آئی ہے کتنا جوان، کتنا خوبصورت اور کتنا معصوم تھا۔ اسے ظالم کے ہاتھ نے قتل کر دیا۔ ایک بہن کے غم کا احساس کرو۔ زینبؓ کو یاد کرو جو یزید کے دربار میں گئی۔ اس زینب کو یاد کرو جس نے یزید کو اپنے بھائی کے سر سے کھیلتے ہوئے دیکھا"

"بیگم بھٹو کے دل کو دیکھو جو پھٹا جاتا تھا جیسے ہی وہ اپنے بچے کو دیکھتی ہے جس کو اس نے جنم دیا جس بچے کو اس نے کھلایا۔ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے بڑا ہوا۔ نصرت نے اسے جلتے ہوئے دیکھا۔ ماں جس نے اپنا سارا پیار اسے دیدیا۔ اس کو دیکھو"۔

"مرتضٰی کو دیکھو، اس کا داہاں ہاتھ کٹ گیا ہے۔ اس کا آدھا دھڑ ختم ہو گیا ہے۔ وہ دوبارہ اپنے آپ میں نہیں آسکتا"۔

المرتضٰی کی دیواروں سے رونے اور چلانے کی آوازیں ابھریں عورتیں چلائیں اور اپنے سینے پیٹنے لگیں۔ ہائے، ہائے، یہ الوداع کی چیخیں تھیں۔ میں آہستہ آہستہ گھر کے اندر آگئی۔ میرے بھائی کو ہمارے اجداد کے قبرستان میں دفنایا جا رہا تھا۔ میں اب بے بس ہو گئی تھی۔

ناصر حسین، گڑھی خدا بخش

جب ہم نماز جنازہ کے بعد بھٹو خاندان کے قبرستان میں پہنچے، ہجوم میں سے گزرنا مشکل ہو گیا۔ جیسے ہی تابوت کو ایمبولنس میں سے اتارا، میں نے اگلے کونے کو کندھا دیا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں میرے پیچھے کون تھا۔ میں اپنی جگہ چپکا رہا اور ہجوم تابوت کو اٹھانے کے لئے بیتابی میں ہر ایک کو دھکا دیتا رہا تا کہ وہ ہمارے بوجھ میں حصہ دار بن سکیں۔ اور خود بھی اس اعزاز

کو حاصل کر سکیں۔

قبر کی سمت ہماری راہنمائی کے لئے کوئی نہیں تھا اور کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ کدھر جا رہے تھے۔ تابوت پہلے دگنا وزنی محسوس ہو رہا تھا کیونکہ ہم سب کی حرکات میں رابطہ نہیں تھا۔ ہمارے کندھوں پر سوار یہ بے پتوار کا بحری جہاز تھا جس کو ہجوم آگے پیچھے دھکیل رہا تھا۔ جہاں ہمارے پاؤں پڑتے کسی اور کے بھی وہاں جم جاتے۔ ایمولینس سے قبرستان کے داخلی دروازے تک دس گز کا فاصلہ ۴۵ منٹ میں طے ہوا۔

اچانک مجھے ایک ہاتھ بلند ہوتا ہوا نظر آیا...... یہ المرتضیٰ کے ایک ملازم کے بیٹے کا ہاتھ تھا۔ اور میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا جب کہ وہ جائے قبر کی طرف جا رہا تھا۔ ہجوم بھی اسی سمت چلنا شروع ہو گیا۔ میں نے اس گرمی اور جنونی حالت میں اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس ہجوم کے دھکم پیل کے باوجود معجزانہ طور پر کسی نے بھٹو خاندان کی قبروں کو اپنے پاؤں تلے نہیں روندا۔

جب ہم شاہ کی قبر تک پہنچ گئے میں تھک کر گر پڑا اور میری ٹانگیں کھدائی میں پھنس گئیں۔ ایک دیہاتی ایک زنگ آلود پیالے میں میرے لئے پانی لایا جو میں نے نگل لیا۔ شاہ کے جسم کو تابوت سے باہر نکالنے کے لئے جگہ نہیں مل رہی تھی۔ ہمیں تابوت کو ٹیڑھا کرنا پڑا تاکہ میت خود ہی قبر کے اندر کھسک کر گر جائے۔ لوگ شاہ کے چہرے کی آخری زیارت پر مصر تھے۔ مگر بے نظیر نے مجھے پہلے ہی روک دیا تھا۔ آخری دعا مانگی گئی اور تمام نوحہ خوان فاتحہ میں شامل ہو گئے۔ سب نے ہاتھ اٹھا لئے اور دعا پڑھنے لگے۔ جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو کئی بزرگ آگے بڑھے اور ۲۴ گھنٹے دعائیں پڑھنے کے لئے بیٹھ گئے۔ میرا ایک غم ناک فریضہ ختم ہوا اور ہم شاہ نواز کو اس کی ابدی آرام گاہ میں لٹا آئے تھے۔

مجھے کراچی میں پانچ روز بعد مارشل لاء حکومت نے گرفتار کر لیا۔ مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ اگرچہ ضیاء نے پریس کو یقین دلایا تھا کہ شاہ کی میت کے ساتھ واپس آنے پر مجھے گرفتار نہیں کیا جائے گا اور سندھ کے وزیر اعلیٰ نے بھی ایک بیان جاری کیا تھا کہ مجھے ہر جگہ آمدورفت کی آزادی ہوگی۔ مگر تعزیت کنندگان کے ہجوم نے لاڑکانہ میں فوجی رکاوٹوں کو ملیامیٹ کرتے ہوئے ہمارے خاندان کے ساتھ جس یکجہتی کا مظاہرہ کیا تھا اس نے حکومت کے اعتماد کو ہلا دیا تھا، جب تعزیت کنندگان المرتضٰی کے باہر کھیتوں اور گلیوں میں میت کی مذہبی رسومات منانے کے لئے اکھٹے ہوئے تو میرا یقین ہے حکومت کو بغاوت کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔

اگرچہ میرے بھائی کی موت نے انہیں مارشل لاء کے خاتمے کی تاریخ کا اعلان کرنے پر مجبور کر دیا تھا، نہ ہی اس کی موت اور نہ ہی ہزاروں کارکنوں کی تکالیف کا مداوا ہو سکا تھا۔ ''اب جب کہ ضیاء کو ہٹانے کے لئے عوامی جذبات بلند ترین سطح پر ہیں ہمیں پہل کرنی چاہئے'' متعدد پی پی پی راہنماؤں نے شاہ کے دفنانے کے بعد ایک میٹنگ میں رائے دی۔ دوسروں کی رائے تھی کہ ہمیں حکومت کو مارشل لاء نہ اٹھانے کا کوئی بہانہ نہیں دینا چاہئے۔ غم کے باوجود، معلوم ہوتا تھا کہ ہم سیاست نہیں بھولے۔ ''مارشل لاء ملک کے لئے لعنت ہے اور ہمیں یقین دلانا چاہئے کہ اسے اٹھالیا جائے گا'' میں نے ضبط قائم رکھنے پر دلیل دی۔ ''شاہ نے اس کے لئے اپنی جان کی قربانی دی۔ اگر ہم اب کسی ہلچل کا آغاز کرتے ہیں تو وہ کہیں گے کہ وہ مارشل لاء اٹھانا چاہتے تھے مگر مجبوراً اب نہیں اٹھا سکتے، ہمیں اس پہلو پر غور کرنا چاہئے''۔ تاہم میں نے حکومت کے ردعمل سے بچنے کے لئے مناسب احتیاط برتی۔ میت کا سوئم دفن کے تیسرے دن ہوتا ہے اور چہلم چالیس روز بعد۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں چالیس دن آزاد رہوں گی۔ چنانچہ علمائے دین سے مشوروں کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ شاہ کی فرانس میں ماہ جولائی موت کے بعد سے دنوں کی گنتی کی جائے نہ کہ اگست سے جب اسے دفنایا گیا۔ اس طرح سوئم اور چہلم ایک ہی دن منعقد ہو سکتے تھے۔

ایک اور بھٹو کی قبر۔ ایک اور تازہ گیلی مٹی کا ڈھیر۔ میں شاہ کی قبر پر لوگوں کے پھولوں

کے بے پناہ ڈھیر میں اپنے پھول بھی ملانے کے لئے لے گئی۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" میں نے قبرستان کی شدید گرمی میں جمع سینکڑوں لوگوں کے ہمراہ دعا مانگی۔ تازہ قبر کی مٹی کا نظارہ دلدوز تھا۔ آہ شاہ نواز!۔

سوئم کے بعد صنم کو کراچی واپس جانا تھا۔ اسی طرح فخری کو۔ میں غمگین حالت میں المرتضٰی میں اکیلی رہنا نہیں چاہتی تھی پس میں نے بھی ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ تسلی کے لئے کافی تھا کہ کم از کم صنم اور میں تو اکٹھی ہیں خاندان کا کچھ حصہ تو باقی ہے۔ لیکن پھر یہی ہوا کہ سیاست ہمارے ذاتی غم پر غالب آ گئی۔

ہزاروں لوگوں نے کراچی ائرپورٹ پر ہمارا استقبال کیا۔ ہمیں کار تک پہنچنے میں بھی دقت ہوئی۔ پارٹی کے اراکین نے ہمارے لئے راستہ بنایا ہمارے ارد گرد ہاتھوں سے ہاتھ ملا کر ہمیں جانے کا راستہ دیا گیا۔ لوگوں کے درمیان سے کار کو گزرتے ہوئے ۷۰ کلفٹن تک پہنچنے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ جیپوں اور موٹر سائیکلوں پر سوار ہمارے ہمراہ جاتے ہوئے لوگوں نے انگلیوں سے فتح کے نشان بنائے مگر کسی نے کوئی سیاسی نعرہ بازی نہیں کی۔ نعرہ بازی خوشی کے موقع پر ہوتی ہے مگر اس وقت شاہ کا غم نمایاں تھا۔ ۷۰ کلفٹن کا باغ بھی لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں لوگوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے باہر نکلی کہ کس طرح انہوں نے ہمارے غم میں شریک ہو کر ہمارے ساتھ یکجہتی کا مظاہرہ کیا۔ بہت سے مانوس چہرے نظر آئے۔ مرد اور عورتیں جو اپنے سیاسی عقیدے کی وجہ سے متعدد بار جیل میں گئے۔ "خواہ ہم سب میرے بھائی کے طریق کار سے متفق تھے یا نہیں، وہ ایسا شخص تھا جس نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی" میں نے انہیں کہا۔ "اس کا ضمیر اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا کیونکہ پاکستان میں ظلم ہو رہا تھا"۔

ناصر بلوچ، ایاز سموں، دو ایسے نوجوان جنہوں نے جمہوریت پر اپنی جانیں قربان کر دیں اور فوجی دہشت کا شکار بنے۔ وہ بھی میرے بھائی ہی تھے میرے گرد گھومتے رہتے۔ میری حفاظت کرتے اپنی بہنوں کی طرح میرا خیال رکھتے۔ اگلے روز میں نے ان کے اہالیان سے رابطہ کیا۔ جس طرح لوگ جوق در جوق ۷۰ - کلفٹن میں ہمارے گھر تعزیت کے لئے

آرہے تھے۔ میں بھی تعزیت کے لئے ان کے گھروں میں جانا چاہتی تھی تاکہ ان کی ماؤں اور بہنوں کے غم میں شریک ہو سکوں جن کے بھائی ان سے بچھڑ چکے تھے۔ میں وہاں نہ جا سکی۔

پولیس نے ۲۷ر اگست کو صبح سویرے ۷۰ کلفٹن کو محصور کر لیا۔ ایک مرتبہ پھر ۷۰ - کلفٹن کو سب جیل قرار دیا گیا۔ اور پولیس اور فوجی یونٹ اشک آور گیس سے مسلح ہو کر گھر کے گرد پہرہ دینے لگے۔ مجھے ۹۰ دن کے لئے نظر بندی کے احکام پہنچائے گئے۔ حکومت نے بعد میں دعویٰ کیا کہ مجھ پر ان کی تنبیہات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا جو انہوں نے مجھے "نازک مقامات" میں "دہشت گردوں" سے نہ ملنے کے متعلق وقتاً فوقتاً جاری کی تھیں۔ مجھے ایسی کوئی تنبیہات نہیں ملی تھیں۔ حکومت نے جن علاقوں کو "نازک" گردانا تھا وہ ملیر اور لیاری تھے۔ کراچی کے افلاس زدہ علاقے جہاں کے باسیوں نے ضیاء کی حکومت میں سب سے زیادہ تکالیف اٹھائیں۔ ناصر بلوچ اور ایاز سموں کے اہل خاندان اسی علاقہ کے رہنے والے تھے۔ اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ وہ ان علاقوں کو "نازک" سمجھتا تھا۔ اور ضیاء کون تھا جو لوگوں کو دہشت گرد قرار دیتا تھا۔ اگر دہشت گردی کی تعریف اقلیت کی طرف سے اکثریت کے خلاف قوت کے استعمال سے اپنے خیالات ٹھونسنا ہے تو ضیاء اور اس کی فوج اس زمرے میں سب سے پہلے آتے تھے۔

واشنگٹن میں ریگن انتظامیہ نے میری نظر بندی پر مایوسی کا اظہار کیا۔ "پاکستان نے آئینی حکومت کی بحالی کے لئے حوصلہ افزا اقدامات اٹھائے ہیں۔ ...... مس بھٹو کی گھر میں نظر بندی ان اقدامات سے مطابقت نہیں رکھتی" وزارت خارجہ امریکہ کے ایک ترجمان نے بیان جاری کیا۔ برطانوی پارلیمینٹ کے اراکین کا ردعمل زیادہ سخت تھا۔ خاص طور پر جب ممبران پارلیمینٹ میکس میڈن اور لارڈ ایوبری نے اس ضمن میں ضیاء سے رابطہ کیا۔ لیکن میں بدستور نظر بند رہی بغیر ٹیلی فون کے اور بیرونی دنیا سے کسی تعلق کے۔ صنم اور ناصر بھی چند دنوں کے لئے میرے ساتھ ہی نظر بند رہے اور میری کزن لیلا جو صرف ایک رات کے لئے میرے پاس آئی تھی مگر بغیر کسی ارادے کے حکومت کے جال میں پھنس کر رہ گئی۔

لیکن ۲ر ستمبر کو حکومت نے میرے اہل خاندان کو ۷۰ - کلفٹن چھوڑنے پر مجبور کیا اور میں غم برداشت کرنے کے لئے گھر میں بالکل تنہا رہ گئی۔ دن ہفتوں میں بدلتے گئے اور وقت نے شاہ کے غم پر کچھ مرہم رکھ دیا۔ میں نے ہر میگزین جو گھر میں پڑا تھا دوبارہ اور سہ بار پڑھا۔ اپنی ڈائریوں میں لکھتی رہی اور بی بی سی کے ہر خبری نشریئے کو سنا۔ بے حس و حرکت پڑے رہنا بہت ہی اداسی کی بات تھی۔ جب تک غم کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا میری خواہش تھی کہ پاکستان میں جو وقت بھی ملتا ہے اس سے فائدہ اٹھاؤں۔ تین مہینوں میں مارشل لاء اٹھنے والا تھا اور ضیاء کے سیاسی مخالفین میں نظم و ضبط اور اتحاد کی کوئی شکل پیدا کرنا ضروری تھا۔ اپنی گرفتاری سے قبل میں نے چاروں صوبوں کے پارٹی رہنماؤں سے ملاقاتوں کا پروگرام وضع کیا تھا۔ اب انہیں منسوخ کر دیا گیا تھا۔

اگرچہ سرکاری اخبارات میں مارشل لاء کے ۳۱ر دسمبر کی اعلان کردہ تاریخ کو اٹھنے کا شور و غوغا بہت بلند تھا لیکن ضیاء کے جبر و تشدد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میری رہائی کے بارے میں جو اجلاس منعقد ہونے والے تھے انہیں ممنوع کر دیا گیا۔ کراچی میں ۲۱ر اکتوبر کو منعقد ہونے والے ایم آر ڈی کے اجلاس میں پہنچنے والے راہنماوں کو شہر بدر کر دیا گیا یا روک دیا گیا۔ اجلاس کے موقع پر متعدد ایم آر ڈی راہنماؤں کو جیل میں بھی بند کر دیا گیا۔ ضیاء پاکستان کے عوام کا پھر بھی علم بردار ہونے کا دعویٰ کرتا رہا۔

سیاست، سیاست، سیاست، ۷۰ - کلفٹن میں نظر بندی کے دوران راہنمائی کا چغہ بہت وزنی محسوس ہوا۔ سیاست کی وجہ سے کتنی مرتبہ میں اپنے اہل خاندان سے کٹی رہی۔ خصوصاً شاہ نواز سے جو اب لاڑکانہ میں منوں مٹی کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ "مجھ سے ملنے کے لئے وقت نکالو، تم کیوں وقت نہیں نکال سکتی؟" اس نے مجھے لندن میں کتنی ہی مرتبہ ٹیلی فون کیا تھا اور خود ہی میرے مخصوص جواب کی نقل کر کے مجھے سنایا تھا۔ "اوہ گوگی! مجھے امریکہ جانا ہے، ڈنمارک جانا ہے، بریڈورڈ، برمنگھم اور گلاسگو میں اہم جلسوں میں شرکت کرنا ہے......" اگر میں ذرا رک جاتی، سوچتی اور اسے کچھ وقت مل جاتا۔ لیکن تقدیر کا لکھا کون بدل سکتا ہے۔ اس کی قسمت میں یہی لکھا تھا اس کے باوجود اس کے انتقال کی حقیقت کو

ماننا کتنا مشکل تھا۔

صحن کے ساتھ ملحقہ عمارت میں اس کا کمرہ آٹھ برسوں سے ویسا ہی پڑا تھا جیسا وہ چھوڑ گیا تھا۔ اسلام آباد کے ہائی سکول کی سالانہ نوٹ بک کتابوں کی الماری میں مہماتی ناولوں کے ساتھ پڑی تھی۔ اسے یہ ناولیں اور قرآن مجید کا جو نسخہ میرے والد نے دیا تھا پڑھنا بہت پسند تھا۔ پورے گھر میں بجلی کی روشنی صرف ایک کمرے میں نظر آتی تھی وہ بھی جب حکومت کا عمل دخل کم ہو جاتا اور وہ کمرہ اتنے بڑے وسیع گھر میں صرف ایک کمرہ تھا جو میرا تھا۔

سسّی سے ملاقات کے لئے میں بیتاب تھی، شاہ کی بیٹی آئے اپنے خاندانی گھر کو دیکھے اور اپنے ورثے کو جان سکے۔ اسے اپنے والد کو بھلانا نہیں چاہئے۔ لیکن اس کے والد نے وہی کچھ سکھایا جن اصولوں کے لئے وہ لڑتا رہا اور جن کی خاطر ملک پر جان نثار کر گیا۔ سسّی کا ورثہ باعث فخر تھا جس میں یہ المیہ دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔ شاید قسمت میں یہی لکھا تھا۔

"شاہ نے اسے سسّی کا نام کیوں دیا تھا؟" ڈاکٹر عباسی نے ایک روز جب ہم حیدر آباد کار میں جا رہے تھے تو مجھے پوچھا تھا۔ "یہ بہت غم انگیز نام ہے۔ سسّی کی کہانی تمہیں یاد ہے جو پنوں کے عشق میں دیوانی ہو گئی تھی لیکن انہیں الگ کر دیا گیا تھا۔ سسّی صحراؤں اور پہاڑوں میں اسے تلاش کرتی پھری۔ صحرا میں ایک جگہ سے پنوں کی آواز آئی سسّی سسّی، لیکن وہ جب وہاں پہنچی زمین دو ٹکڑوں میں بٹ گئی اور اسے نگل گئی"۔ لیکن شاہ سسّی کے نام سے بہت پیار کرتا تھا اتنا ہی جتنا اپنی بیٹی سسّی سے اور یہ نام اس سے چپک کر رہ گیا۔

کیا ہمیں کبھی علم ہو گا کہ شاہ کے قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا؟ ۷۰ کلفٹن میں مقفل میں اس کہانی کو دہراتی رہی جو سمیعہ نے شاہ کی میت کے ہمراہ موہنجو داڑو کی پرواز کے دوران مجھے سنائی۔ ایک آدمی قتل سے ایک ماہ قبل مختلف اخبارات میں شاہ کی موجودہ تصویروں کی تلاش میں جاتا رہا۔ کیا کوئی شخص شاہ کی شناخت کے لئے اس کی ۲۷ سالہ عمر کی تصویر تلاش کر رہا تھا؟۔

میں ۲۲ر اکتوبر کو بی بی سی کی صبح کی نشریات سن رہی تھی کہ میرا جسم اکڑ گیا۔ پولیس نے

کینز میں ریحانہ کو فرانسیسی قانون کے ماتحت اس الزام میں گرفتار کر لیا ہے کہ "وہ خطرے میں محصور ایک شخص کی امداد سے قاصر رہی" مزید تفصیلات کا پتہ نہیں ہے۔

بی بی سی پر ریحانہ کے بارے میں خبر سننے کے چند روز بعد میں نے مقامی اخبارات میں پڑھا کہ شاہ کی موت کے سلسلہ میں تفتیش کے لئے مجھے سمن موصول ہوئے تھے۔ اور یہ کہ میں نے جانے سے معذوری کا اظہار کر دیا تھا۔ "یہ سچ نہیں ہے کہ میں تفتیش میں شامل ہونا نہیں چاہتی تھی؟" میں نے وزارت داخلہ کو ایک خط میں لکھا۔ "میں شامل ہونا چاہتی ہوں لیکن یہ میرے ہاتھوں میں نہیں تمہارے ہاتھوں میں ہے کہ اجازت دیں" برائے مہربانی فرانسیسی عدالت کو اطلاع دے دیں کہ میں شامل ہونا چاہتی ہوں لیکن تم مجھے جانے سے روک رہے ہو"۔ ۳ر نومبر کو مجھے رہا کر دیا گیا۔

"آج میں ایک مشکل سفر پر روانہ ہو رہی ہوں ایسا افسردہ سفر جو مجھے اجنبی ملک کے عدالتی کمروں میں لے جائے گا۔ جہاں میرے پیارے بھائی شاہ نواز کی موت کی تفتیش ہو رہی ہے" میں نے اپنے حامیوں کو ایک بیان میں بتایا۔ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کیا...... اس دفعہ حکومت نے ۷۰ کلفٹن کی ہر سمت کی بجلی بند کر دی تھی یہاں تک کہ ملحقہ کمروں کے الگ برقی نظام کو بھی معطل کر دیا گیا تھا۔ "میرا پختہ ارادہ ہے کہ جلد از جلد واپس آؤں" اختتامیہ فقرہ تھا۔ "انشاء اللہ، مجھے امید ہے کہ ممکنہ نتائج کی پرواہ کئے بغیر اگلے تین مہینوں میں واپس آ جاؤں گی"۔

فرانس میں فضا ہلکی تھی جب میں اپنا بیان دینے کے لئے پہنچی مگر میرا دل بھاری تھا۔ یہ اور بھی بھاری ہو گیا جب مجھے شاہ کی موت کی تفاصیل اور ریحانہ کی گرفتاری کا علم ہوا۔

ریحانہ ۲۲ر اکتوبر کو پولیس سٹیشن اپنا پاسپورٹ واپس لینے گئی تھی جسے فرانسیسی پولیس نے شاہ کی موت کے بعد ضبط کر لیا تھا۔ مہینوں غیر مختتم استفسارات کے بعد جن کے جواب میں ریحانہ نے انٹرپول (بین الاقوامی پولیس) اور فرانسیسی پولیس کے سامنے بار بار یہی دعویٰ کیا کہ نہ ہی اس نے کچھ دیکھا اور نہ ہی سنا تھا جب میرا بھائی موت کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کے وکلاء اپنا کیس پیش کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ اس کا پاسپورٹ اسے واگذار کر

دیا جائے۔ ریحانہ جب پولیس اسٹیشن پہنچی تو فرانس چھوڑنے پر پوری طرح تیار ہو چکی تھی۔ اس کی بجائے اس نے ایک بم پھینک دیا تھا۔

اپنے پہلے دعووں سے انحراف کرتے ہوئے، ریحانہ نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی جو صرف پولیس کو ہی میت کے طبّی معائنہ کے بعد پتہ چلی تھی کہ شاہ کی موت اچانک واقع نہیں ہوئی تھی۔ پولیس نے اس سے مزید پوچھ گچھ کی اس پر الزام لگایا کہ وہ خطرے میں محصور ایک شخص کی امداد کو نہیں پہنچی اور اسے ایک مجسٹریٹ کے روبروپیش کر دیا۔ اپنا پاسپورٹ حاصل کرنے کی بجائے، ریحانہ کو گرفتاری کا وارنٹ دیا گیا اور نیسس کی مرکزی جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔

شاہ کی موت کے افشاء پر پورا خاندان تباہ ہو گیا تھا۔ وہ زہر جو میرے دونوں بھائی ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے، شاہ نے مجھے بتایا تھا، فوراً اثر کرتی تھی۔ میر کے زہر کی شیشی کا معائنہ فرانسیسی اور سوئٹزرلینڈ دونوں ممالک کی پولیس نے کیا تھا اور شاہ کے دعویٰ کی تصدیق کی تھی کہ اگر زہر کو بغیر کسی محلول میں ملانے کے براہ راست نوش کر لیا جائے تو موت فوراً واقع ہو جائے گی۔ ہمیں اطمینان تھا کہ شاہ فوراً اور کسی تکلیف کے بغیر جام مرگ نوش کر گیا تھا۔ ہمارے غم میں شدید اضافہ ہوا جب یہ انکشاف ہوا کہ وہ اس طرح موت سے ہم کنار نہیں ہوا تھا۔

ایک ہفتے تک میں خوفناک خواب دیکھتی رہی۔ "میری مدد کرو" شاہ مجھے پکارتا تھا۔ "میری مدد کرو" دیگر خوابوں میں وہ سردی سے کانپ رہا ہوتا تھا اور میں اس کے لئے کمبل لاتی تھی۔ دن کے دوران میں اکثر غسل خانے کی طرف الٹیاں کرنے کے لئے دوڑتی۔ شاہ کی خوفناک موت کو ایسے سوالات نے گھیر رکھا تھا جن کے جوابات حاصل نہ ہونے سے ہمیں پریشانی نے جکڑ رکھا تھا۔ ریحانہ اس کی امداد کے لئے کیوں نہیں گئی تھی؟ اور وہ کیوں بار بار دعویٰ کر رہی تھی کہ شاہ نے خودکشی کی تھی، مسلمانوں پر ایسا الزام جن کا عقیدہ ہے کہ زندگی اور موت فقط خدا کی طرف سے ہے۔ ہمیں پتہ تھا کہ شاہ کی باطنی قوت اور زندہ رہنے کی امنگ کتنی تھی؟۔ وہ کبھی خودکشی نہیں کر سکتا تھا۔ اور کوئی بھی اپنی مرضی

سے اتنی طویل اور دردناک موت کا انتخاب نہیں کر سکتا تھا جیسی ظاہراً اس نے چنی تھی۔
بطور ایک خاندان کے ہمیں یقین تھا کہ شاہ کو قتل کیا گیا اور ہم نے نامعلوم اشخاص کے خلاف قتل کے الزامات داخل کر دیئے تھے۔ کارلٹن میں، میں غیر سرکاری طور پر پولیس کے ایک افسر سے ملی جو اس کیس کی تفتیش کر رہا تھا۔ پولیس بھی الجھن میں پھنسی ہوئی تھی۔ ''کیا تم زہر کے بارے میں کچھ مزید معلومات دے سکتی ہو؟'' اس نے پوچھا ''جسم میں اس زہر کا اب کوئی نشان تک باقی نہیں بچا'' میں نے اس سراغ کا تعاقب کرنے کی کوشش کی اور بالآخر خفیہ خفیہ جو تفصیلات میسر آئیں رونگٹے کھڑا کرنے کے لئے کافی ہیں۔

تفصیل کا بیان اب بھی خوف زدہ کرتا ہے۔ ''زہر اگر بغیر ملاوٹ کے پی جائے تو فوراً اثر کرتی ہے'' رپورٹ میں لکھا تھا۔ ''اگر کوئی ملاوٹ کی جائے تو اس کی ماہیت مکمل طور پر بدل جاتی ہے، تین منٹوں کے بعد مصیبت زدہ فرد استقامت کھو بیٹھتا ہے۔ اور سر درد، تھکاوٹ کے احساس اور شدید پیاس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک گھنٹے میں جسم تھرتھرانا شروع ہو جاتا ہے دل اور معدے کے آس پاس ناقابل برداشت درد محسوس ہوتا ہے پھر پورے بدن میں اینٹھن اور اکڑاہٹ پیدا ہو جاتی ہے...... موت سے پہلے قوت مدافعت زائل ہو جاتی ہے۔ اور فرد کو فالج کے آغاز میں احساس باقی رہتا ہے۔ بلغم گلے میں پھنستی ہے جس سے سانس اور بولنے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ احساس ابھی باقی ہوتا ہے۔ اور مریض اب سردی محسوس کرتا ہے۔ مرنے کا دورانیہ چار سے سولہ گھنٹے تک ہو سکتا ہے''۔

شاہ کی موت کا کرب پورے خاندان میں سرائت کر گیا اور اس کا آغاز میری فوزیہ سے علیحدگی پر منتج ہوا۔ سسّی ہم سے بچھڑ چکی تھی۔ جب میں بیان دینے کے لئے نیس پہنچی تو ریحانہ جیل میں تھی اور سسّی فوزیہ کے پاس تھی۔ جسے اس نے ہمیں ملنے تک نہیں دیا۔ ہمارا درد لا انتہا تھا۔ سسّی ہمارا خون تھی ہمارا گوشت تھی۔ وہ شاہ سے بہت مماثلت رکھتی تھی خاص طور پر اس کی آنکھیں۔ سسّی ہی ایک شاہ کی نشانی باقی رہ گئی تھی اور اسے بھی ہم حاصل نہیں کر پائے تھے۔ ہم نے ریحانہ کے ساتھ ایک قانونی خاندانی تصفیے پر عمل در آمد کی کوشش کی تھی سسّی اس کے ساتھ سال کے نو مہینے اور ہمارے ساتھ تین مہینے گزارے گی جب کہ اس کی

بودوباش اور تعلیم کے تمام اخراجات ہم ادا کرنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن ریحانہ کو اس میں کچھ دلچسپی نہیں تھی۔ ہم نے ایک مرتبہ پھر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر قانونی کارروائی سے ہمارے نقصان کا مداوا نہ ہو سکا۔

فروری ۱۹۸۸ء میں عدالت نے میری والدہ کو سسّی سے ہر ہفتہ کے آخری دن میں ملاقات کی اجازت دی مگر فیصلے پر عملدر آمد ممکن نہ ہو سکا۔ ریحانہ نے سسّی کو کیلیفورنیا میں اپنے اجداد کے پاس رہائش کے لئے بھیج دیا تھا کسے پتہ ہے وہ اب کہاں ہیں اور کیسی ہیں؟ مجھے دل میں زبردست کسک اٹھتی ہے میں جب بھی اس کے بارے میں سوچتی ہوں۔ ہمیں اتنا یقین بھی ہو جائے کہ وہ ٹھیک ہے، صحت مند ہے اور خوش ہے تو ہمارے لئے کافی ہے۔ لیکن ہمیں کچھ نہیں بتایا جاتا۔ دریں اثنا اس خواب اور امید پر میں زندہ ہوں کہ سسّی کسی نہ کسی دن ہم سے آملے گی۔ اپنی ہم نام کی طرح صحراؤں اور پہاڑوں کو پھلانگتی اپنے خاندان سے آملے گی جو اس سے محبت کرتا ہے ہم ہمیشہ اس کے منتظر رہیں گے۔

جون ۱۹۸۸ء میں دو سالہ قانونی کارروائیوں کے بعد فرانسیسی عدالت نے فیصلہ دیا کہ ریحانہ کو اب اس مقدمہ کا سامنا کرنا پڑے گا کہ ایک شخص کو خطرے میں دیکھنے کے باوجود اس نے اس کی کوئی اعانت نہیں کی اور اس الزام کے ثابت ہونے پر اسے ایک سے پانچ سال تک کے درمیان قید کی سزا ہو سکتی تھی۔ ہماری ناامیدی مزید بڑھی جب عدالت نے یہ فیصلہ دیا کہ نامعلوم افراد کے خلاف قتل کے الزام میں شہادت ناکافی تھی۔ لیکن خودکشی کا داغ شاہ کے نام سے مٹ گیا۔ عدالت کے فیصلہ کے چند روز بعد بی بی سی نے ریحانہ کے قول کو نشر کیا کہ ریحانہ بھی تسلیم کرتی تھی کہ شاہ کو قتل کیا گیا تھا۔

ہم سب کی طرح سسّی کو بھی شائد کبھی اس سچائی کا علم نہ ہو سکے کہ اس کا والدہ کیسے فوت ہوا۔ جولائی ۱۹۸۸ء میں ہمیں پتہ چلا کہ ریحانہ فرانس چھوڑ کر امریکہ میں اپنے اہل خاندان اور سسّی کے پاس جا بسی تھی۔ فرانسیسی حکام نے "انسانی رحمدلی کے تقاضوں کے طور پر" ریحانہ کو اس کا پاسپورٹ واپس کر دیا تھا۔ ہمارے وکلاء نے یہ خبر بھی ہمیں دی کہ ریحانہ کو مارسیلز میں واقع امریکی قونصل خانہ سے ویزا حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں

آئی۔ اس پر کوئی مقدمہ اگر چلا بھی تو ۱۹۸۹ء سے پہلے نہیں چلے گا۔ تاہم ہمارے وکلاء کا کہنا ہے کہ ریحانہ مقدمہ کی کارروائی میں حصہ لینے کیلئے فرانس واپس نہیں لوٹے گی۔

ایک اور بھٹو اپنے سیاسی عقائد کی وجہ سے موت کو گلے لگا گیا، ایک اور سرگرم کارکن کو خاموش کر دیا گیا۔ ہم البتہ آگے چلتے رہیں گے۔ ہم کی تنہیں ہمیں سیاسی میدان سے یا جمہوریت کے حصول کی تگ و دو سے بھگا نہیں سکیں گی۔ ہمیں اپنے خدا پر یقین ہے اور ہم انصاف اسی ذات پاک پر چھوڑتے ہیں۔

باب ۱۴

لاہور کو مراجعت
اور اگست ۱۹۸۶ء کا قتل عام

۳۰ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو مارشل لاء اٹھالیا گیا۔ میں ابھی تک یورپ میں تھی اور ایک ہوٹل کی تار سروس پر یہ خبر پڑھی۔ لیکن جو وقت اب سکون کا وقت ہونا چاہئے تھا نہیں تھا۔ مارشل لاء کا خاتمہ مغربی ممالک میں ایک فریب دہی سے زیادہ کچھ اور نہیں تھا۔ یہ شہریوں کی حکومت کی جانب سچی واپسی نہیں تھی، کیونکہ ضیاء نے آرمی چیف آف سٹاف اور صدر کے دونوں عہدے اپنے پاس رکھے ہوئے تھے اور یہ کہنا ناممکن بنا دیا گیا تھا کہ فوج نے اپنے آپ کو سیاسی عمل سے غیر متعلق بنالیا ہے۔ سیاسی پارٹیاں انتخابات کے ذریعہ جو کردار ادا کر سکتی تھیں، وہ لائحل چھوڑ دیا گیا تھا اور اس طرح حکومت کے پاکستان کو سچی جمہوریت کی راہ پر چلانے کے خوف نے اہمیت اختیار کر لی تھی۔

ضیاء کی نئی شہری حکومت دراصل ایک معمہ تھی۔ مارشل لاء کے اٹھانے سے کچھ عرصہ قبل، ضیاء کی کٹھ پتلی پارلیمینٹ نے بدنام زمانہ آٹھویں ترمیم پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی جس کے مطابق مارشل لاء کے ماتحت حکومت کے تمام اہل کاروں کے گزشتہ اعمال کو مواخذہ سے بری گردانا گیا تھا۔ بلکہ مارشل لاء کے باقی تین مہینوں کے کارہائے نمایاں بھی قابل معافی قرار دیدیئے گئے تھے۔ اس طرح یہ ضمانت حاصل کر کے کہ کوئی قانونی گرفت ان کے سابقہ اعمال پر نہیں ہو سکتی، فوجی عدالتوں نے ہزاروں لوگوں کو طویل میعاد کی قید کی

سزائیں دیں تاکہ مارشل لاء کے اٹھنے کے وقت پر زیادہ سے زیادہ سیاسی مخالفوں کو حراست میں رکھا جا سکے۔ مارشل لاء کے خاتمہ سے اس کی وراثت کے نشانات ختم نہ ہو سکے۔

۱۹۷۷ء سے ضیاء نے خصوصی طریقے سے ان تمام اداروں کو آہستہ آہستہ برباد کر دیا جن کی بنیادیں میرے والد کی حکومت نے رکھی تھیں۔ آزاد عدلیہ، ایک باضابطہ اقتصادی نظام، پارلیمانی طرز حکومت، آزاد پریس، مذہبی آزادی، ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت شہری حقوق کی ضمانت، کسی قانونی نظم و ضبط کے فقدان کی وجہ سے اور ہر شے میں ناپائیداری کے احساس کی بدولت، پاکستان میں زندگی کی اقدار ختم ہو گئی تھیں۔

رشوت اور جرم قومی سطح پر صنعتیں بن گئے تھے۔ تیز طرار نوجوانوں میں کسٹمز کے محکمہ میں ملازمت بہت پر کشش تھی کیونکہ وہاں فاضل آمدنی کے مواقع بہت زیادہ تھے۔ اس طرح سرمایہ داروں کے ایک نئے طبقے نے جنم لیا جو کسٹمز کے اہل کاروں کو ادائیگی کے بعد ائیر کنڈیشنز سے وڈیو کے آلات تک ہر چیز کو غیر قانونی طور پر منگوا لیتے تھے۔ اور اس طرح در آمد شدہ اشیاء کو چور بازاری میں بھاری قیمتوں پر فروخت کرتے تھے۔ سٹیٹ بنک کی ایک حالیہ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ پاکستان کی مفروضہ اقتصادی ترقی کا انحصار زیادہ تر غیر قانونی در آمدات یعنی سمگلنگ پر تھا۔ ملک کو اس کالے دھن سے کوئی ٹیکس وصول نہیں ہوتا۔

افغانستان میں روسی مداخلت کے طویل اور شدید منحوس اثرات ظاہر ہوئے۔ امریکی اسلحہ جو مجاہدین کے لئے بھیجا جاتا تھا وہ ایک نئی اور پر رونق پاکستانی مارکیٹ میں راہ پا لیتا۔ سویت روس کی کلاشن کوف جب پاکستانی ہنر مندوں کے ہاتھ لگی تو انہوں نے سرمو اس کی نقل بنائی اور بلیک مارکیٹ میں سستے ترین ہتھیار کے طور پر بیچنا شروع کر دی۔ یہاں تک کہ یہ ۴۰ ڈالر تک بھی ملنے لگی تھی۔ بتایا گیا کہ کراچی میں فی گھنٹہ کرائے کے حساب سے بھی کلاشن کوف میسر آنے لگی تھی۔ سندھ کے اندرونی حصوں میں لوگوں نے شام کے بعد سفر کرنا ترک کر دیا تھا کیونکہ ڈاکوؤں کے گروہ خود کار اسلحہ اور راکٹ لانچروں سے مسلح ہو کر سڑکوں پر دندناتے پھرتے تھے۔ بڑے بڑے زمینداروں اور صنعت کاروں نے پاکستان بھر

میں اپنے مسلح دستے منظّم کرنا شروع کر دیئے تھے، تاکہ وہ اپنی حفاظت کر سکیں اور کبھی کبھی وہ اپنے حریفوں پر حملے بھی کروا دیتے تھے۔ بعض اوقات حکومت نے ایسے مسلح دستوں کی تیاری میں حوصلہ افزائی بھی کی اور قبائلی سرداروں کی تیار کردہ فوج کے سپاہیوں کو یونیفارم اور تنخواہیں بھی مہیا کیں۔ یہ دستے پی پی پی کے حامیوں کو دبانے کے لئے استعمال ہوتے تھے اور بعض اوقات ان کے پورے دیہاتوں کو راکھ بنا دیتے۔ ان مساجد کو بھی نہیں بخشا گیا جہاں دیہاتی پناہ لینے کے لئے داخل ہو جاتے۔

افغانستان پر حملہ کے زیر اثر منشیات بھی پروان چڑھیں۔ پاکستان میں افغانی مہاجرین سے قبل منشیات کی لعنت موجود نہیں تھی لیکن اب دس لاکھ سے زیادہ پاکستانی اس کے نشے کا شکار تھے۔ جبکہ کروڑوں ڈالروں کی ہیروئن اور افیون شمال میں مہاجرین کے کیمپوں سے سڑکوں کے راستے جنوب میں کراچی سے باہر لے جانے کے لئے جہازوں میں پہنچائی جاتی تھی۔ ۱۹۸۳ء تک پاکستان باقی دنیا کو ہیروئن مہیا کرنے والا سب سے بڑا ملک بن چکا تھا۔ ہیروئن کے پیسے سے کراچی، لاہور، اور قبائلی علاقوں میں بڑے بڑے وسیع اور شاندار محلات تعمیر کئے گئے۔ حکومت نے یا تو اس سے نظر چرائی یا اپنا حصہ وصول کیا۔ جہازوں میں لدی ہوئی بہت سی ہیروئن ان فوجی ٹرکوں میں لاد دی جاتی تھی جو درہ خیبر میں مجاہدین کے لئے اسلحہ بھر کر لے جاتے تھے اور واپسی میں کراچی آتے تھے۔ بڑے بڑے عہدہ کے فوجی افسران کے رشتے دار جن میں فوجی کابینہ کے وزیر کا ایک بیٹا بھی شامل تھا، امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں منشیات کی ترسیل کے سلسلہ میں انٹرپول نے زیر حراست لئے۔ لیکن پاکستان میں کسی سرکاری اہل کار کو حراست میں نہیں لیا گیا۔ اگرچہ وہ انکار کرتا تھا لیکن یہ افواہ عام تھی کہ منشیات کی تجارت کا بڑا سرغنہ صوبہ سرحد کا فوجی گورنر فضل الحق تھا جو اپنے عہدہ پر سات سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہا جبکہ ضیاء نے دوسرے فوجی گورنروں کو اپنی مرضی سے کئی بار تبدیل کیا۔ عبداللہ بھٹی کا معاملہ بھی اسی قدر بدنام تھا جو منشیات کے دو بڑے سرداروں میں سے ایک تھا جنہیں مارشل لاء کے آٹھ برسوں میں گرفتار کیا گیا تھا۔ فوجی عدالت سے سزا پانے کے بعد بھٹی "مفرور" ہو گیا۔ کئی سالوں بعد

جب خراب موسم کی وجہ سے اس کا طیارہ کراچی میں اتارنا پڑا تو بھٹی کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ جنرل ضیاء نے معافی کے اپنے صدارتی اختیارات استعمال کرتے ہوئے اسے رہا کر دیا۔ ایک ایسا اختیار جو اس نے کسی سیاسی قیدی کے سلسلہ میں کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔

ضیاء کی نفاذ اسلام کی پالیسیوں نے ملک کو تقسیم اور بد دل کر دیا تھا۔ جہاں میرے والد کے زمانے میں مذہبی رواداری موجود تھی، ضیاء کے نفاذ اسلام کے دوران ہماری تمام مذہبی اقلیتوں کو بے جا تنگ کیا گیا۔ پاکستانیوں کی اکثریت سنی مسلمانوں کے حنفی مکتب فکر کی پیرو کار ہے جو مذہبی عقائد کا ایک معتدل مزاج مکتب فکر ہے۔ ہمارے ملک کی بنیاد تمام مذہبی اقلیتوں، احمدیوں جن کے اپنے مذہبی علماء انگلستان میں مقیم ہیں، ہندوؤں، عیسائیوں، اور پارسیوں اور آتش پرست زر تشتیوں کی ایک مختصر مگر متحد باشندوں کی آبادیوں کے آپس میں اتحاد، حمایت اور رواداری کے اسلامی اصولوں پر رکھی گئی تھی۔ "تمہیں اپنے مندروں میں جانے کی آزادی ہے، تمہیں اپنی مسجدوں میں جانے کی آزادی ہے اور اسی طرح پاکستان کی اس ریاست میں جس پرستش کی جگہ جانا چاہو آزادی سے جا سکتے ہو۔ تمہارا کوئی بھی مذہب ہو ذات ہو یا عقیدہ ہو اس کا ریاست کے امور کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے" ہمارے ملک کے بانی محمد علی جناح نے اس دن برملا اعلان کیا جب وہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کے صدر منتخب کئے گئے۔

تاہم ضیاء وہابیوں کی حمایت کر رہا تھا ایک فرقہ جو سعودی عرب کے مصلحین کے بہت قریب ہے اور جو جماعت اسلامی جیسے دائیں بازو کے گروہوں پر مشتمل ہے اور اسلام کے متشدد اور غیر روادار پہلو کا تر جمان ہے۔ ۱۹۷۷ء کی بغاوت سے آغاز کرتے ہوئے، حکومت نے نفاذ اسلام کا پرچار کیا، جبکہ بنیاد پرستوں نے تمام ملک پر اپنے اقلیتی متعصب خیالات کے نفاذ کی کوشش شروع کر دی۔ عیسائیوں، ہندوؤں اور پارسیوں کے گھروں میں دروازوں کے نیچے سے ایسے خطوط کی نقول پھینکی گئیں جن پر تحکمانہ لہجے میں درج تھا۔ "باہر نکل جاؤ، ہمیں تمہاری یہاں ضرورت نہیں" خاموشی سے بہت سے اقلیتی فرقوں کے لوگوں نے اپنی جائیدادیں بیچ دیں اور ملک چھوڑ کر باہر چلے گئے حالانکہ نسلوں سے یہ ان کا

گھر چلا آرہا تھا۔ جو لوگ پیچھے رہ گئے، انہیں بہت دب کر رہنا پڑا...... پارسی عورتیں جو میرے والد کے زمانے میں اکثر جینز پہنا کرتی تھیں، بنیاد پرست ملاؤں کے خوف سے شلوار قمیص پہننے پر مجبور ہو گئیں۔ ضیاء کے ماتحت ملاء نفاذ اسلام کی تلوار بن گئے۔ انہوں نے اس کی ظالمانہ حکمرانی کو اسلام کی ڈھال مہیا کی، تاکہ وہ لوگوں کے لئے قابل برداشت بن سکے اور ضیاء نے اس کے بدلے میں زکوٰۃ کا اسلامی ٹیکس، تمام آمدنی کا ۲٫۵۰ فیصد نافذ کیا جسے ان کے ذریعے سے تقسیم کیا گیا۔ زیادہ تر زکوٰۃ کا پیسہ ملاؤں کی جیب میں گیا نہ کہ ناداروں اور ضرورت مندوں کے ہاتھوں میں جن کے لئے یہ ٹیکس جمع کیا جاتا تھا۔

یہ فتویٰ یا فیصلہ کہ صحیح کیا تھا یا غلط کیا ملاؤں کے نماز جمعہ کے خطبوں پر جا پڑا اور اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ ایک ایسا ہی مضحکہ خیز فتوی ۱۹۸۴ء میں جاری کیا گیا جس کا تعلق ٹیلی ویژن ڈرامے کے دو کرداروں سے تھا جو اپنی حقیقی زندگی میں شادی شدہ تھے۔ ڈرامے میں مرد ایکٹر اپنی "بیوی" کی مذمت کرتے ہوئے کہتا تھا "میں تمہیں طلاق دیتا ہوں" اور تین مرتبہ اس جملے کو دہراتا تھا۔ اس پر ملاؤں نے اپنے فتوی کا اعلان کر دیا کہ اس شادی شدہ جوڑے میں طلاق واقع ہو چکی تھی اور "بیوی" رجم کی مستحق ہے کیونکہ وہ زنا کاری کی مرتکب ہو رہی تھی اور اس کی سزا سنگ زنی یا رجم ہے۔ ایک ہجوم نے نصف شب کے قریب اس میاں بیوی کے گھر پر حقیقتاً حملہ کر دیا۔ لیکن عوام بنیاد پرستوں کے تصور اسلام سے اس قدر بے حس ہو چکے تھے کہ کسی نے اس سانحے کا نوٹس تک نہیں لیا۔

ضیاء نے اپنے ظالمانہ اقدامات کا جواز تلاش کرنے کے لئے اور معاشرے کے خصوصی طبقات کو دہشت زدہ کرنے کے لئے اسلامی پندونصائح کا انداز متواتر استعمال کیا۔ ۱۹۷۹ء میں خمینی کی ایران میں مراجعت کے دو ہفتہ بعد، ضیاء کی شریعت کورٹ نے بدنام زمانہ حدود آرڈیننس جاری کیا جس کے مطابق سنت و شریعت کی کڑی تشریح کرتے ہوئے چوری، زنا اور زنا بالجبر جیسے جرائم کی سزاؤں کا اعلان کیا۔ حدود آرڈیننس کے تحت، عورت کے زنا بالجبر کے الزام کو ثابت کرنے کے لئے چار مسلمان مردوں کی گواہی کو لازم قرار دیا گیا۔ ایسی شہادت کے بغیر جو بین طور پر ممکن نہیں، الزام لگانے والی عورت کو زنا کے جرم میں سزا دی جا سکتی

تھی۔ صفیہ بی بی جو ایک نابینا لڑکی تھی کے ہاں ایک مالک اور اس کے بیٹے سے زنا بالجبر کے نتیجہ میں ایک بچہ پیدا ہوا، جو بنیاد پرستوں کی ناانصافی کی ایک مستند مثال بن گئی۔ چونکہ کسی مرد نے اپنے جرم کا اعتراف نہیں کیا۔ اور صفیہ بی بی چار شاہدوں کو پیش نہ کر سکی جو زنا بالجبر کے عینی شاہد ہوتے، دونوں مردوں کو چھوڑ دیا گیا جبکہ نوجوان خاتون کو زنا کے جرم میں سرعام کوڑوں کی اور تین سال کی قید کی سزا سنا دی گئی۔

صفیہ بی بی کی جان بخشی مشتعل خواتین کی مہم کی وجہ سے ہوئی جنہوں نے اس سانحہ کو بین الاقوامی رنگ دیدیا۔ ہراساں ہو کر حکومت نے نوجوان خاتون کو فوراً رہا کر دیا۔ ایک ۱۳ سالہ لڑکی جو اپنے چچا کے زنا بالجبر کی وجہ سے حاملہ ہو گئی اتنی خوش قسمت نہیں تھی...... عدالت کو زنا بالجبر کا یقین دلانے میں ناکامی پر اسے دس کوڑوں اور تین سال کی قید کی سزا سنائی گئی۔ عدالت نے سزا کو اس وقت تک معطل کر دیا جب تک اس کا نوزائیدہ بچہ دو سال کا نہیں ہو جاتا۔

میرے والد کا تیار کردہ ۱۹۷۳ء کا آئین عورتوں کے خلاف کسی قسم کی تفریق کی ممانعت کرتا تھا۔ "جنس کی بنیاد پر کسی قسم کی تفریق جائز نہیں ہوگی" دفعہ ۲۵ (۲)۔ ضیاء کی نفاذ اسلام کی سیاسی پالیسیاں نہ صرف اس تفریق کو جائز بناتی تھیں بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتی تھیں۔ کراچی یونیورسٹی میں جہاں مسجد کو جماعت اسلامی کی طلباء شاخ کے لئے اسلحہ خانہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا بنیاد پرست طالب علموں نے جنس کی بنیاد پر کیمپس کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی ہنگامہ آرائی بھی شروع کر دی۔ "عورتیں مردوں کے ساتھ محفوظ نہیں ہیں" کا نعرہ مرد طلباء نے بلند کر دیا۔ اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لئے انہوں نے ان طالبات کو ہراساں کرنا شروع کر دیا جو برقعہ میں اپنے آپ کو چھپاتی نہیں تھیں بلکہ بعض پر تیزاب بھی پھینکا گیا جس سے ان کے کپڑے اور جسم جل گئے۔ تیزاب پھینکنے والے طلباء کو کوئی سزاء نہیں دی گئی۔ معاشرے کے تمام پہلوؤں میں عورتوں کو الگ رکھنے کا رجحان بڑھتا گیا۔ بعض سرکاری تقاریب میں بھی مہمانوں کو جنس کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا۔ یہاں تک کہ معزز ترین مرتبے کی خواتین کو بھی اپنے مرد رفقاء سے الگ کر دیا گیا۔ ٹیلی

ویژن پر خاتون خبر خوانندگان کو سر پر دوپٹہ پہننا لازمی قرار دیا گیا اور جنہوں نے انکار کیا، انہیں برطرف کر دیا گیا۔ خواتین کی ہاکی ٹیموں کے اراکین کو اپنی ٹانگوں کو پوری طرح کھیل کے میدان میں ڈھانپنے پر اصرار کیا گیا اور اس طرح بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ لینے سے منع کر دیا۔ حکومت کا اسلامی جوش کئی مواقع پر بے ہودگی تک بھی جا پہنچا جب حکومت کا سنسر اخبار کے ایڈیٹر کی کھنچائی کرتا کہ "اس عورت کی ننگی ٹانگوں کی تصویر کیوں دکھائی گئی ہے؟" جب کہ وہ تصویر ورلڈ کپ ٹینس ٹورنامنٹ کے آخری میچ کی تھی۔ "وہ عورت کی تصویر نہیں وہ بجارن بورگ کی ہے جو مرد ہے" ایڈیٹر سنسر کو بتاتا۔

خواتین نے بھی اپنی جنگ جاری رکھی جبکہ حکومت کے دیگر آرڈیننس آہستہ آہستہ ان کے اثرورسوخ کو ختم کرنے کے در پے تھے۔ جب حکومت کی شرعی عدالتوں نے فروری ۱۹۸۳ء میں اعلان کیا کہ عورت کی گواہی ایک مرد کی گواہی سے نصف ہے تو عورتوں نے لاہور میں ایک زبردست مظاہرہ کیا...... پولیس نے یونیورسٹی پروفیسروں، تجارت پیشہ عورتوں اور خاتون وکلاء کے اجتماع پر لاٹھی چارج کیا اور اشک آور گیس پھینکی اور ان میں ۷۰ سے ۸۰ تک خواتین کو چوٹی سے گھسیٹ کر جیل میں بند کر دیا۔ شاید یہ کافی نہیں تھا۔ بنیاد پرست ملاؤں نے فتویٰ دیا کہ "یہ باغی عورتیں دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور ان کی شادیاں اپنے خاوندوں سے فسخ قرار دی جاتی ہیں" عورتیں ملاؤں کو نظرانداز کر سکتی تھیں مگر حکومت کو نہیں۔ احتجاجات کے باوجود، ضیاء کی پارلیمینٹ نے ۱۹۸۴ء میں قانون شہادت پاس کر دیا۔

قتل کے مقدمات میں عورتوں کو بطور گواہ نااہل قرار دینے کا قانون ابھی زیر غور تھا اور اسی طرح قصاص اور دیت کا قانون جس کے تحت مقتولہ خاتون کے رشتہ داروں کو معاوضہ کم دیا جانا تھا۔ اس مفروضے پر عمل کرتے ہوئے کہ ایک عورت کی قیمت مرد کی قیمت سے آدھی ہے، مقتولہ عورت کے خاندان کو مقتول مرد کے خاندان سے آدھا معاوضہ ملے گا۔

مارشل لاء کے اٹھائے جانے کے پراپیگنڈہ کے باوجود، ضیاء کے پاکستان میں جبروظلم اور

تقسیم کی کیفیات جاری رہیں۔ غربا اور مساکین بہت بد دل ہوئے۔ عورتیں بھی بہت شکستہ دل ہوئیں۔ ان کے اختلافات کو پر امن طریقے سے حل کرنے یا ان اختلافات کو برداشت کرنے کی بجائے، حریف گروہوں نے تمام پاکستان میں اغواء کی واردات اور بندوق کی لڑائی شروع کر دی۔ تشدد کی لہر خاص طور پر اقلیتی صوبوں میں یعنی سندھ، بلوچستان اور سرحد میں زیادہ ابھری جہاں ضیاء کی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی نے نسلی تفاوت پیدا کیا اور مرکز گریز رجحانات کو بڑھایا۔ آغاز ہی سے ضیاء کی سیاسی پارٹیوں پر قدغن اور مرکز گریز راہنماوں کی سرپرستی ساتھ ساتھ چلے۔ مرکز گریز راہنماؤں کے بیانات کو پریس میں اجاگر کر کے، ضیاء نے پنجاب اور اقلیتی صوبوں کے درمیان بے اعتمادی کا بیج بویا اور اس شاخسانے کو ہوا دی کہ فوجی حکومت ہی ملک کو یکجا رکھنے کا فریضہ ادا کر سکتی تھی۔ غیر جماعتی انتخابات نے جو حکومت نے منعقد کرائے، ملک کی یکجہتی کو نقصان پہنچانے میں گراں قدر کردار ادا کیا۔ سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا کر، حکومت نے امیدواروں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی انتخابی مہم سیاسی تصورات کے پلیٹ فارم پر نہیں جو نسلی اور علاقائی حدود سے ماورا ہیں بلکہ انفرادی شناخت کی بنیاد پر لڑیں۔ "مجھے ووٹ دو، میں تمہاری طرح شیعہ ہوں" امیدوار اپنے اہل حلقہ کو انتخابات کے دوران کہتے۔ "مجھے ووٹ دو میں پنجابی ہوں"۔

ملک قیمت ادا کر رہا تھا۔ پٹھانوں اور مہاجروں کے درمیان کراچی میں ۱۹۸۵ء میں لسانی بنیادوں پر فسادات پہلی مرتبہ بھڑکے تھے۔ پچاس سے زیادہ لوگ مارے گئے اور ایک سو سے زیادہ اس لڑائی میں زخمی ہوئے۔ جب ایک پٹھان ڈرائیور کی بس غیر ارادی طور پر ایک مہاجر لڑکی کو کچلنے کا باعث بنی۔ مشتعل ہجوم نے فوراً ہی سینکڑوں کاروں، سکوٹروں اور بسوں کو نذر آتش کر دیا۔ لڑائی اتنی عجلت سے پھیلی کہ گردونواح میں حکومت کو طویل عرصہ کے لئے کرفیو نافذ کرنا پڑا جس سے مسئلہ کے ظاہری نشانات تو محو ہو گئے مگر اصل اسباب کا تدارک کرنے کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا گیا...... اگلے تین سالوں میں زخم کھانے والوں، مرنے والوں اور لسانی فسادات میں جائیداد کی تباہی میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ نئی سیاسی جماعتیں جن کی بنیاد خصوصاً نسلی معاونت پر رکھی گئی، شہرت پکڑتی گئیں اور فرقہ واریت کے

تناؤ کا باعث بنیں۔ پاکستان کے اتحاد کو کاری ضرب لگی۔

"میں گھر واپس جانے کا سوچ رہی ہوں" میں نے جنوری ۱۹۸۶ء میں بار بیکن میں پی پی پی کے سرگرم کارکنوں کے اجتماع میں اظہار خیال کیا جب میں فرانس سے واپس لندن پہنچی، انہوں نے مجھے پر امید نگاہوں سے دیکھا نہ جانتے ہوئے کہ میرے دل میں کیا تھا۔ "میں شاید لاہور یا پشاور میں پہنچوں گی" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ان کے چہرے روشن ہو گئے۔ "گھر" کا مطلب ۷۰ - کلفٹن نہیں تھا "گھر" کا مطلب پاکستان کا طول وعرض تھا۔ ضیاء کو پی پی پی کا چیلنج شروع ہونے والا تھا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی" ناہید نے کہا اور پھر صفدر عباسی بھی یہی کہنے لگا۔ "میں بھی واپس جاؤں گا" بشیر ریاض بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ "جلدی میں کوئی فیصلہ مت کرو" میں نے انہیں متنبہ کیا یہ جانتے ہوئے کہ ناہید اور بشیر دونوں کے خلاف پاکستان میں مقدمات بنے ہوئے تھے۔ لیکن ہمارے رضا کاروں کا مختصر سا ٹولہ پر عزم تھا۔ ہم سب اکٹھے واپس جائیں گے۔ ہم نے صحیح وقت کا انتخاب کیا تھا۔ ضیاء کی مارشل لاء کے اٹھا لئے جانے کی لاف زنی کو دیکھتے ہوئے ہم حکومت کو مجبور کر سکتے تھے اور نئی نئی آزادی کے دعوؤں کی آزمائش بھی ہو سکتی تھی۔ اگر ضیاء نے واپسی پر مجھے گرفتار کر لیا تو اس کی جمہوریت کا بھانڈا بیچ چوراہے کے پھوٹ جائے گا۔ اگر اس نے گرفتار نہ کیا تو پچھلے نو سالوں میں پہلی مرتبہ مجھے پی پی پی کا پیغام لوگوں تک پہنچانے میں کامیابی ہو گی۔ نفسیاتی طور پر بھی وقت مبارک محسوس ہوتا تھا۔ دو آمروں کو تازہ تازہ شکست کا سامنا تھا ایک فلپائن کا فرڈی ننڈ مارکوس اور دوسرا ہیٹی کا پاپا ڈوک ڈووالئیر، تیسرے آمر کا وقت آ پہنچا تھا۔

یہ بہت بڑا فیصلہ تھا۔ لیکن کیا یہ صحیح تھا؟ اپنی نظر بندی اور جلاوطنی کے سالوں کے بعد، میں پاکستان میں سیاسی ٹمپریچر کو ٹھیک طور پر جانچنے کے قابل نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے پی پی پی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس لندن میں طلب کر لیا۔ "میرا خیال ہے کہ یہی وقت واپس جانے کا ہے" لیکن یہ آپ سب کی رائے پر منحصر ہے۔ یہ اچھا موقع ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا یا مجھے گرفتار کر لیا جائے گا۔ ایسی حالت میں پی پی پی کا کردار کیا ہو گا؟ کیا یہ

مناسب وقت ہے کہ مکمل جمہوریت کے لئے ضیاء پر احتجاجات کا دباؤ ڈالا جائے یا مجھے اپنی واپسی موخر کر دینی چاہئے؟ آپ سب فیصلہ کریں"۔ "آپ کو اس وقت ضرور واپس جانا چاہئے، ہم ہر طرح آپ کے ساتھ ہیں" تمام راہنماؤں نے متفقہ اعلان کیا۔ "اگر ضیاء آپ کے خلاف کوئی کارروائی کرتا ہے، وہ ہم سب کے خلاف متصور ہوگی" میں بہت خوش تھی جب ہم سے کچھ رفقاء باربیکن کے چھوٹے سے کھانے کے کمرہ میں میز پر بیٹھے رہے اور پنجاب، فرنٹیئر اور سندھ میں میرے دورے کے مجوزہ راستوں پر سوچ بچار کرتے رہے۔ ہمیشہ کی طرح ہماری سوچ سیاسی تھی اور متشدد نہیں تھی، ہم موجودہ نظام کے اندر رہ کر اسے ختم کرنے کے لئے کام کرنا چاہتے تھے اور حکومت کو ہمیں گرفتار کرنے کا کوئی بہانہ نہیں دینا چاہتے تھے۔ وسیع پیمانے پر پاکستان بھر میں سیاسی مظاہرے منظّم کر کے ہم حکومت کو مجبور کرنا چاہتے تھے کہ وہ انتخابات کی جلد از جلد تاریخ کا اعلان کرے غالباً ۱۹۸۶ء کے موسم خزاں میں۔

میں اپنے دورے میں شہروں کا اضافہ کرتی رہی۔ بڑے شہروں میں بیک وقت مظاہروں کی بجائے میری تجویز تھی کہ بہت سے مختلف شہروں میں ایک خاص مدت تک باری باری مظاہرے جاری رہنے چاہیں۔ اس طریقے سے لوگوں کا اعتماد بڑھتا چلا جائے گا اور ضیاء نے پھانسیوں اور کوڑوں کی سزاؤں کی پالیسی سے پورے ملک میں جو دہشت پیدا کی تھی وہ ختم ہو جائے گی۔ "کیا آپ اس قدر بوجھ برداشت کر سکیں گی؟" راہنماؤں نے پوچھا۔ "میں برداشت کر سکتی ہوں" میں نے رات کے کھانے پر جو چکن اور دال پر مشتمل میں نے تیار کروایا تھا، جواب دیا۔ ہم متفق تھے کہ پاکستان میں داخلہ کے لئے ہمارا نقطہ آغاز لاہور ہونا چاہئے۔ لاہور پنجاب کا دارالحکومت تھا جہاں سے فوج میں زیادہ تر لوگ ملازمت کے لئے جاتے تھے۔ پھر پی پی پی کی حمایت کا بہت بڑا گڑھ تھا۔

وزیر اعظم بے نظیر بھٹو سیالکوٹ میں ڈیجیٹل ٹیلی فون ایکسچینج کے افتتاح کے موقع پر

جب ہم نے اپنے پروگرام کی تفاصیل طے کر لیں، تو دوسرے پی پی پی کے رہنماؤں نے ہر چیز منظم کرنے کے لئے پاکستان واپس جانا شروع کر دیا، اگرچہ میری اپنی واپسی کی متعینہ تاریخ کو خفیہ رکھا گیا۔ اس وقت تک ہم سیکھ گئے تھے کہ ضیاء کو پیشگی تیاریوں کے لئے کوئی موقع نہیں دینا چاہئے۔ ہمیں غیر متوقع طور پر اس راز داری سے اپنی تشہیر میں خصوصی فائدہ پہنچا۔ تمام پاکستان میں لوگوں نے اندازے لگانے شروع کر دیئے۔ "وہ یوم پاکستان ۲۳ر مارچ کے دن آرہی ہے" ایک افواہ اڑی۔ "نہیں وہ ۴ر اپریل کو اپنے والد کی برسی کے دن آرہی ہے" دوسروں نے اصرار کیا۔ اخبارات میں بھی قیاس آرائیاں چھپنا شروع ہو گئیں۔

مجھے دھمکیاں ملنا بھی شروع ہو گئیں۔ ایک پی پی پی کے حامی نے پاکستان سے سندھ میں متعین ایک فوجی افسر کا پیغام بھجوایا۔ "اسے بتا دو کہ وہ پاکستان نہ آئے" پیغام کا متن تھا۔ "وہ اسے قتل کروا دیں گے" میری زندگی پر فوری خطرے کی دھمکیاں پنجاب سے، سرحد سے اور پورے ملک سے آنا شروع ہو گئیں۔ "جیسا آپ خود بھی جانتی ہیں، سیاست میں ایک عورت زیادہ غیر محفوظ ہے۔ مت واپس آؤ" میرا گھر کا ٹیلی فون وقت بے وقت بجنے لگا کبھی صبح سویرے کبھی بہت رات گئے۔ جب میں ریسیور اٹھاتی تو کوئی آواز نہ ہوتی۔ ایک دوست نے ٹیلی فون پر بتایا کہ ایک پاکستانی میجر کو ہیتھرو ائرپورٹ پر تمہاری تصویر لیتے ہوئے روکا گیا اور واپس پاکستان بھیج دیا گیا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ یہ دھمکیاں حقیقی تھیں یا حکومت مجھے واپس نہ آنے پر مجبور کرنے کے لئے خوف زدہ کر رہی تھی۔ لیکن میرے لئے ایک بدشگونی اور نحوست کا یہ واقعہ تھا کہ میرے والد کے پرانے اور بہت ہی قابل اعتماد ملازم نور محمد کو ماہ جنوری میں کراچی میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی موت سے قبل میں نے اس کی نوجوان بھتیجی اور متبنّٰی بیٹی شہناز سے ایک خط موصول کیا تھا جس میں لکھا گیا تھا کہ نور محمد مجھ سے بات کرنے کے لئے مضطرب تھا اور میں اسے ضرور ٹیلی فون کر لوں۔ حکومت اس کی جان کے در پے ہے اس نے بتایا تھا کیونکہ اسے "کچھ رازوں کا علم" تھا۔ میں نے لندن سے اسے فوراً ٹیلی فون کیا تھا مگر تاخیر ہو چکی تھی۔ نہ صرف نور محمد بلکہ ۱۱ سالہ

شہناز کو بھی بے رحمی سے خنجر مار کر ذبح کر دیا گیا تھا۔ چند دن بعد مجھے نور محمد کا تحریر کردہ خط بھی ملا جو اس نے اپنی موت سے قبل ڈاک کے سپرد کر دیا تھا۔ اس میں بھی مجھے فوراً ٹیلی فون کرنے کے لئے لکھا گیا تھا۔ وہ کیا بات تھی جو نور محمد کو مجھے بتانے کا موقع نہ ملا؟۔

میں واشنگٹن پرواز کر گئی تاکہ حکومت کے جمہوریت بحال کرنے کے عزم کو آنے والے دنوں میں آزمایا جا سکے۔ پاکستان کے عوام نو سالوں سے انتخابات اور ایک جمہوری حکومت کی بحالی کا انتظار کر رہے تھے۔ کسے علم تھا کہ میری واپسی پر ان کا کیا ردعمل ہو گا اور حکومت کا کیا جواب ہو گا؟ ضیاء کے وزیراعظم محمد خان جونیجو نے مجھے یقین دلایا تھا کہ میری آمد پر مجھے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ لیکن کسے علم تھا کہ ضیاء کی کیا مرضی ہے؟۔ واشنگٹن میں میں نے سینیٹر پیل، سینیٹر کینڈی اور کانگرس کے رکن سٹیفن سولارز سے ملاقاتیں کیں۔ سولارز چاق و چوبند اور ذہین پارلیمانی نمائندہ تھا جو فلپائن میں انتخابات کا مبصر بھی تھا جن کی وجہ سے کورازون اکینو جمہوری طریقے سے منتخب ہو کر برسراقتدار آئی اور میرا ایک ذاتی حمایتی بھی بن گیا تھا۔ وہ میرے پاکستان واپس جانے کے بہت حامی تھے۔ وہ پاکستان میں انسانی حقوق کی بحالی اور آزادانہ انتخابات کے انعقاد کے لئے زبردست دباؤ ڈال رہے تھے اور میری واپسی کے بعد حالات کی مکمل نگہداشت کا وعدہ بھی کیا۔ مارک سیگل ایک سیاسی مشیر جسے میں ۱۹۸۴ء میں اپنے واشنگٹن کے دورے کے دوران ملی تھی بہت مدد گار ثابت ہوا۔ اس نے منتخب سرکاری اہلکاروں اور بااثر لوگوں سے پاکستانی اہل کاروں کو خطوط لکھوائے اور انہیں میرے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا۔ مزید احتیاط کے لئے مارک نے ایک بنیان بھی دی جس پر بندوق کی گولی اثر نہیں کرتی تھی۔

امریکی پریس کے صحافی ضیاء سے میری لڑائی اور فلپائن میں فرڈیننڈ مارکوس کو کورازن اکینو کے چیلنج میں مماثلت محسوس کرتے تھے۔ مسز اکینو اور مجھ میں مماثلت کے متعلق ان کے خیالات میں تاہم رومانیت زیادہ تھی۔ ٹھیک ہے ہم دونوں مشہور زمینداروں کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والی خواتین تھیں جنہوں نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ دونوں کے خاندانوں کے اہم ترین افراد آمروں کی نذر ہو چکے تھے۔ مسز اکینو کے شوہر اور

میرے والد اور بھائی۔ مسز اکینو نے عوامی طاقت کے بل بوتے پر ایک پرامن انقلاب برپا کیا تھا اور میں بھی پاکستان میں ایسا ہی کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ لیکن دونوں کی مماثلتیں یہیں ختم ہو جاتی تھیں۔ فلپائن میں کورازون اکینو کو مارکوس حکومت کے خاتمہ کے لئے اپنی جدوجہد میں فوج اور پادریوں دونوں کی تائید حاصل تھی۔ پاکستان میں میں دونوں سے محروم تھی۔ جرنیل میری مخالفت کرتے تھے کیونکہ میں اس بدعنوان طریقہ کار کے خلاف تھی جس کے ذریعے انہیں زرعی زمینوں کی الاٹمنٹ تھوڑی سی قیمت پر کر دی جاتی تھی۔ اسی طرح کسٹم ڈیوٹی ادا کئے بغیر کاریں بھی کم قیمت پر حاصل کر لیتے تھے اور میرے ساتھ معدودے چند علماء تھے مگر بنیاد پرست ملاء ضیاء کی آمریت کے حامی تھے۔

سب سے زیادہ اہم بات یہ بھی تھی کہ امریکیوں نے مارکوس کے خلاف نوٹس بھی دیدیا تھا اور اسے فلپائن سے اپنے خاندان اور متوکلین سمیت ملک سے باہر جانے کے لئے ٹرانسپورٹ بھی مہیا کر دی تھی۔ برعکس اس کے، ریگن انتظامیہ ضیاء کی مکمل پشت پناہی کر رہی تھی۔ مزید بر آں، ریگن کے عملہ کے توسط سے پاکستان کے لئے ۴ء۲ ارب ڈالر کا چھ سالہ فوجی اور اقتصادی پیکج بھی کانگرس کے زیر غور تھا۔ مجھے امریکی حکومت کے کچھ ارکان اور پریس کے چند صحافیوں کی نیک خواہشات اور اخلاقی امداد کے علاوہ امریکہ سے کسی قسم کی حقیقی اعانت کی توقع نہیں تھی۔ "ہم تمہارے ساتھ جائیں گے" بہت سے نامہ نگاروں نے مجھے یقین دلایا۔ "غیر ملکی پریس بہترین ضمانت ہے" میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں اس بات کی یاد دہانی نہ کرائی کہ فلپائن کے حزب مخالف کے رہنما بینگنو اکینو اخباری نمائندوں کے ہمراہ اپنے ملک واپس گئے تھے اور ابھی سرزمین پر قدم بھی رکھنے نہ پائے تھے کہ ائرپورٹ پر انہیں گولی مار دی گئی۔ کسی نے باربیکن میں میرے دروازے کے نیچے سے ایک پرچی پھینک دی جس پر تحریر تھا "اکینو کو یاد رکھو"۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ جب میں پاکستان واپس پہنچی، تو زندہ رہوں گی یا ماری جاؤں گی۔ نہ ہی میں اس نہج پر کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ جو کچھ خدا نے قسمت میں لکھا تھا وہ ہو کر رہے گا خواہ میں کچھ بھی کروں یا کہیں بھی چلی جاؤں۔ تاہم میں اپنی ذمہ داری کو نبھانا چاہتی تھی جو میں نے اپنے والد

سے ان کے نام پر عمرہ ادا کرنے کے وقت سنبھالی تھی۔ واشنگٹن سے واپسی کے چند روز بعد میں اپنے چند دوستوں کی معیت میں مکہ چلی گئی۔ ہر مسلمان پر جس میں مکہ تک سفر کرنے کی استطاعت ہو ذوالحج کے مہینے میں زندگی میں ایک حج ادا کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ عمرہ جس کے لئے چار روزہ قیام کی بجائے صرف چند گھنٹے چاہئیں، سال بھر کے دوران کسی وقت بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔

میں اپنے والد کی طرف سے ۱۹۷۸ء سے عمرہ ادا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ضیاء کی مفروضہ اسلامی حکومت نے مجھے مکہ تک سفر کرنے کی اجازت سے دو مرتبہ انکار کیا تھا۔ نہ جانتے ہوئے کہ میرے لئے مستقبل میں کیا پوشیدہ ہے میں نے اس آخری موقع کو غنیمت جانا۔

مکہ میں میرے دوستوں اور میں نے حاجیوں کے لئے مجوزہ ان سلا سفید لباس زیب تن کیا اور مناسک کی ادائیگی شروع کر دی "اللھم انت السلام و منک السلام حینا ربنا بالسلام" ہم نے مسجد الحرام میں داخلہ سے قبل باب السلام پر عربی میں دعا مانگی۔ جس کا وسیع صحن سفید سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا تھا۔ ہم نے سات مرتبہ کعبے کا طواف کیا، کعبہ جو ۵۰ فٹ بلند اور ۳۵ فٹ طویل عمارت ہے جو مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سطح زمین پر خدا کا پہلا گھر بنایا تھا۔ اللہ اکبر، خدا سب سے بڑا ہے کا ورد کرتے ہوئے ہم حجراسود کے پاس سے گزرتے جسے ہمارے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے بوسہ دیا تھا جب ساتویں صدی میں انہوں نے کعبے کی دیوار میں اسے چنا۔

مناسک عمرہ ادا کرتے ہوئے مجھے اپنی ذمہ داریاں ہلکی محسوس ہوئیں۔ ہر مرتبہ رکنے پر، میں اپنے والد، حکومت کے ظلم سے ہونے والے شہداء، اپنے بھائی شاہ نواز اور ان مردوں اور عورتوں کے لئے جو ابھی تک جیل کی سلاخوں میں بند تھے دعائیں مانگتی۔ اس مذہبی تجربے نے مجھے بہت روحانی رفعت عطا کی اور میں نے دوبارہ عمرہ ادا کرنے کے لئے مزید ایک روزہ قیام کا ارادہ کر لیا۔ روحانی طور پر مصفا ہونے کے بعد میں سیاسی دنیا میں واپس آ گئی اور سوویت یونین کو پرواز کر گئی جہاں مجھے خواتین کی ایک انجمن نے مدعو کیا تھا۔

روس جانے سے مجھے امید تھی کہ پی پی پی کے ان نکتہ چینوں کی کچھ تسلی ہو جائے گی جو مجھے امریکی حمایت کا طعنہ دیتے رہتے تھے۔ میں پاکستان کو واپسی سے قبل ایک ٹھوس حمایت کا بندوبست کر رہی تھی۔

۲۵ر مارچ کو میں نے پیغام بھیج دیا۔ "میں ۱۰ر اپریل کو پاکستان واپس پہنچوں گی" بین الاقوامی پریس کے نمائندے پیشگی ہی لندن پہنچنا شروع ہو گئے۔ اگرچہ ہماری سوچ کے مطابق ہمارا نکتہ نظر صحیح اور منصفانہ تھا، اخبارات نے اسے ایک نوجوان خاتون اور ایک فوجی آمر، ڈیوڈ اور گولیئتھ کے ایک جدید اور نسوانی کرداروں میں ایک ڈرامائی اور تیز و تند مقابلہ کی شکل میں پیش کر دیا۔ امریکہ میں سی بی ایس نے اپنے پروگرام "۶۰ منٹ" میں مجھے فلمایا۔ جریدہ وینٹی فیئر نے اپنے سرورق کی تصویر کے لئے لارڈ سنوڈن کو خصوصی طور پر میری پورٹریٹ بنانے کے لئے متعین کیا۔ لندن میں ٹیلی ویژن کی صبح کی نشریات میں مجھے دکھایا گیا اور اسی طرح نیویارک میں بذریعہ سیٹلائٹ ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا۔ بی بی سی نے اپنی عالمی سروس کی نشریات کے لئے میرا انٹرویو انگریزی میں ریکارڈ کیا اور اردو سروس میں خبروں میں نشر کرنے کے لئے اردو میں ریکارڈ کیا۔ اسی طرح آنٹی بہجت کے فلیٹ میں ایسوشی ایٹڈ پریس، یو پی آئی، چینل فور، اور برطانوی پریس نے میرے انٹرویو ریکارڈ کئے۔ پیٹولا کلارک بھی اسی عمارت میں رہتی تھی اور پہلی مرتبہ آنٹی بہجت نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ پیٹولا کے فلیٹ کی بجائے ایک دوسرا فلیٹ بھی توجہ کا زیادہ بڑا مرکز بن گیا۔

ضیاء کو پی پی پی کے کامیاب چیلنج کی بین الاقوامی پریس میں بہت دھوم مچ گئی۔ لیکن پاکستان میں کیا ہونے والا تھا اس کی مجھے کچھ توقع نہیں تھی۔ برسوں کے جبر و ظلم نے لوگوں کی مزاحمت کی قوت کو نچوڑ لیا ہو گا۔ جیکوبو ٹمرمین نے اپنی انگریزی تصنیفات "بغیر نام قیدی" اور "بغیر نمبر کی جیل کوٹھڑی" میں مظلوم لوگوں کے رد عمل کو مختلف مرحلوں میں تقسیم کیا تھا۔ غصہ، خوف اور بے نیازی کیا عوام پی پی پی کی للکار پر اٹھیں گے یا انہیں ڈنڈے مار مار کر اتنا ادھ موا کر دیا گیا ہے کہ اپنی بقا کے لئے صرف خاموش رہنا پسند کریں گے؟ پاکستانیوں کی ایک پوری نسل مارشل لاء کے منحوس سائے تلے پروان چڑھی تھی۔ جولائی

۱۹۷۷ء میں ایک دس سالہ بچہ ۱۹ سالہ نوجوان میں ڈھل چکا تھا مگر اسے اپنے ابتدائی حقوق کی کیا خبر ہو گی۔ کیا وہ اس چیز کے حصول کی خواہش کر سکیں گے جسے انہوں نے پہلے آزمایا ہی نہیں؟۔

ہم نے اپنی واپسی کا اعلان کر کے اپنے لئے ایک راہ متعین کر لی تھی۔ پوری دنیا دیکھ رہی تھی "کتنے لوگ لاہور میں ہمارے استقبال کے لئے آئیں گے" میں نے پنجاب پی پی پی کے صدر جہانگیر بدر سے پوچھا جو ہم سے پہلے لاہور پہنچنے والا تھا۔

"پانچ لاکھ" اس نے جواب دیا۔

"یہ تو بہت بڑی تعداد ہے" میں نے جہانگیر کو محتاط کیا۔

"لیکن کم از کم پانچ لاکھ ضرور ہوں گے" اس نے احتجاجاً کہا۔ "آپ ابھی لندن سے روانہ بھی نہیں ہوئیں اور ہمیں رپورٹ پہنچی ہے کہ لوگ پہلے سے لاہور پہنچنا شروع ہو گئے ہیں"۔

"لیکن ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے" میں نے اسے بتایا۔ "اگر پریس کے نمائندے تمہیں پوچھیں تو کہہ دو ایک لاکھ کے لگ بھگ نہ کہ پانچ لاکھ" اس طرح اگر ہجوم کا اندازہ ۴ لاکھ ۷۰ ہزار بھی ہو تو کوئی اسے ہماری توقع سے کم نہیں گردان سکے گا"۔

۹ر اپریل کو یورپ سے لاہور کے لئے کوئی پرواز نہیں تھی۔ اس لئے میں بشیر ریاض، ناہید، صفدر، اپنی سکول کی دوست حمیرا اور متعدد دیگر افراد کے ہمراہ لندن سے ظہران (سعودی عرب) پرواز کر گئی تاکہ وہاں سے پی آئی اے کی لاہور کے لئے پرواز میں بندوبست ہو سکے۔ پی آئی اے کے عملہ نے بہت تعاون کیا اور طیارے کو پی پی پی کے پرچموں، جھنڈیوں اور نشانوں سے سجانے کی اجازت بھی دیدی جن پر نو سالوں سے قدغن لگی ہوئی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ دوسرے مسافر کیا سوچ رہے تھے۔ طیارے پر ۳۰ پی پی پی کے اراکین کے علاوہ پریس کے نمائندے بھی موجود تھے اور پرواز خصوصی چارٹر کی ہوئی نظر آتی تھی۔

جشن منانے کا جذبہ ہم سب میں پھیل گیا تھا اگرچہ خطرے کا بھوت بھی ساتھ ساتھ

لہراتا دکھائی دیتا تھا۔ ظہران میں عارضی توقف کے دوران، سعودی حکام مجھے ایک مخصوص آرام گاہ میں لے گئے اور دوسرے ساتھیوں کو ایک کمرے میں محدود کر دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہماری آمد کے وقت پاکستانی سفیر بھی وہاں پہنچ چکا تھا اور سعودیوں کو ہماری حفاظت کی فکر بھی تھی۔ پاکستان سے دھمکیاں بھی موصول ہو چکی تھیں۔ ناہید، بشیراور ہماری پارٹی کے ایک اور رکن تک پیغام پہنچا تھا کہ ان کے نام حکومت کی فوری گرفتاری کی فہرست میں شامل تھے۔ میرے لئے بھی گزارشات موصول ہوئی تھیں کہ میں واپس نہ پہنچوں۔ میں نے ایسے خطرے کو ذہن سے جھٹک دیا اور اپنی تقریر کی تیاری میں مشغول ہو گئی جب ہماری پرواز جانب لاہور شروع ہو گئی۔ حکومت رپورٹوں کے مطابق پی پی پی کے حامیوں سے بھری ہوئی بسوں کو بلوچستان، سندھ اور سرحد کی سرحدوں پر روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ لاہور پہنچنے پر ہمارا کیسا استقبال ہو گا۔

لاہور ــــــ ۹؍اپریل ــــ آمنہ پراچہ

بے نظیر کی آمد سے ایک شب قبل لاہور کا نظارہ کسی تہوار یا میلے کا تھا۔ مسز نیازی، میرے شوہر سلیم اور میں ان کے استقبال کے لئے اسلام آباد سے لاہور پہنچے اور ہم میں سے کسی نے بھی پہلے اس قسم کا منظر نہیں دیکھا تھا۔ شہر بھر میں جگہ جگہ کھانے پینے کے کیمپ لگے ہوئے تھے۔ کھانے کے سٹال ائرپورٹ کی سمت جانے والی سڑک پر بھی لگائے گئے تھے۔ سارا شہر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ طلباء سوزوکی گاڑیوں میں بھٹو خاندان کے بارے میں اونچی اونچی آوازوں میں گاتے ہوئے سڑکوں پر گھوم پھر رہے تھے۔ سب سے پیارا گیت پنجابی میں گایا جارہا تھا۔ "اج تے ہو گئی بھٹو بھٹو" یعنی آج تو بھٹو بھٹو کا ہی دور دورہ ہے۔ لوگ اپنی کاروں، بسوں، بیل گاڑیوں، ٹرکوں میں اور پیدل چل کر پہنچ رہے تھے۔ میں نے لوگوں سے بھری ہوئی بسوں کا ایک طویل قافلہ بھی دیکھا جس کی وجہ سے ٹریفک رک گئی تھی۔ لوگ پی پی پی کے پرچم لہرا رہے تھے۔ "یہ بس بدین سے آئی ہے، یہ سانگڑھ سے آئی ہے" طویل عرصے کے ظلم، بدصورتی اور مایوسی کے بعد پہلی مرتبہ جوش اور ولولے نے

بلوچستان کے ممتاز سیاسی راہنما نواب محمد اکبر بگٹی' محترمہ بے نظیر بھٹو کا استقبال کر رہے ہیں

جگہ حاصل کر لی تھی۔

ساری رات کوئی نہیں سو سکا۔ ہم شہر سے ائرپورٹ تک پیدل چلنے والوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ایک بوڑھا آدمی اشک آلود آنکھوں کے ساتھ ہمارے ساتھ چلتا رہا۔ ایک ضعیف عورت ہم میں شامل ہو گئی کبھی چلاتی اور کبھی مسکراتی۔ مسٹر بھٹو کے انتقال پر کسی کو رونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کوئی باقاعدہ تعزیتی اجتماع نہیں ہو سکا تھا۔ اب آخر کار لوگوں کو اپنے غم کے اظہار کا موقع ملا تھا اور ساتھ ہی بے نظیر بھٹو کی واپسی پر خوشی کے اظہار کا موقع بھی۔ لاہور اس شب میری زندگی کے خوبصورت ترین تجربات میں سے ایک تھا۔

ڈاکٹر اشرف عباسی

یہ عید کی طرح کا دن تھا۔ گوشت، چاول اور پھل لوگوں میں مفت تقسیم کئے جا رہے تھے۔ لوگ ہر جگہ گا رہے تھے ناچ رہے تھے اور فضاء ڈھولوں اور تالیوں کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ کیسٹ مسٹر بھٹو، پی پی پی اور بے نظیر کے گیتوں کو الاپ رہے تھے۔ الفاظ دل کو پکڑنے والے اور مشہور فلمی گانوں کی طرز پر منتخب کئے گئے تھے اور فوراً ذہن نشین ہو جاتے تھے۔ پی پی پی کے پرچم اچانک ہی گھروں کی بالکونی میں اور ہر کھمبے پر آویزاں نظر آ رہے تھے۔ لوگ سبز، سرخ اور سیاہ کپڑوں سے اپنے ملبوسات تیار کر رہے تھے تاکہ بے نظیر کی آمد پر پہن سکیں۔ ہمارے بنیاد پرست مخالفین بھی پیسہ کمانے کے لئے بے نظیر کی تصویریں اور پی پی پی کے پرچم گلیوں میں فروخت کر رہے تھے۔

مسز نیازی

میری کتنی خواہش تھی کہ میرے شوہر اور میری لڑکی یاسمین آج لاہور میں ہوتے لیکن حکومت نے اسلام آباد میں ان کے خلاف سنگین الزامات لگا رکھے تھے۔ چنانچہ وہ لندن سے واپس نہیں آسکتے تھے۔ حقیقتاً یہ جشن لوگوں نے اپنی مصیبت کے ازالے کے لئے منانا

شروع کیا تھا۔ مجھے وہ خاتون یاد آتی رہی جس نے جبر و ظلم کے ہولناک دور میں مجھے بتایا تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی ختم ہو گئی ہے اور مسٹر بھٹو کا نام لوگوں کی زبان پر کبھی نہ آئے گا۔ ''نہیں ایسا نہیں ہو گا'' میں نے جواب دیا تھا۔ پی پی پی کبھی ختم نہیں ہو سکتی کیونکہ لوگ ہی پارٹی ہیں۔ وہ دن آئے گا جب تم مسٹر بھٹو کا نام ہر جگہ چھپا ہوا پاؤ گے۔ آج وہ دن آ گیا ہے اور ہر شخص کے جذبات دیدنی ہیں۔

سمیعہ

حکومت ابھی تک بڑی بڑی لوہے کی سلاخیں اور کانٹے دار تاروں سے ایئرپورٹ پر رکاوٹیں کھڑی کر رہی تھی تاکہ لوگوں کے ہجوم بے نظیر کی آمد پر ایئرپورٹ سے باہر ہی روکے جا سکیں۔ ائرپورٹ کی آمد اور روانگی کے راستوں کو دوبارہ تعمیر کیا گیا تھا۔ ۰۰ - ۴ بجے صبح ہم ایک متفقہ جگہ پر ملاقات کے لئے اکٹھے ہوئے۔ انتظامیہ صرف ۲۰۰ افراد کو ائرپورٹ کے اندر جانے کی اجازت دے رہی تھی اور اس کے لئے ہمیں پاس دیئے گئے۔ وہ عقبی راستے سے ہمیں ائرپورٹ کے اندر لے گئے۔ میرے گلے میں سوجن تھی۔ ہم اتنے خوش تھے کہ ہمیں علم نہیں تھا کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر عباسی

لیکن ہماری خوشی کے ساتھ ساتھ خوف کا عنصر جڑا ہوا تھا۔ ہم بے نظیر کی حفاظت کے لئے اس قدر خوف زدہ تھے کہ ہم سب نے مجتمع ہو کر اس کے گرد دائرے کی شکل اختیار کر لی اور ایک انسانی ڈھال بنا لی۔ لاہور میں اتنی تعداد میں لوگ جمع ہو رہے تھے کہ کوئی نہیں جانتا تھا دوسرا کون ہے؟

صبح ۰۰ - ۷ بجے طیارے میں پائلٹ کی آواز مائیکروفون پر گونجی ''ہماری لاہور میں اترائی شروع ہو گئی ہے'' پائلٹ نے کہا۔ ''ہم مس بے نظیر بھٹو کو پاکستان میں آمد پر خوش آمدید کہتے ہیں'' ایک ایئرہوسٹس میری سیٹ تک آئی۔ ''پائلٹ کو زمین سے پیغام پہنچا ہے کہ ائرپورٹ پر دس لاکھ لوگ آپ کے انتظار میں کھڑے ہیں'' اس نے بتایا۔

دس لاکھ لوگ۔ میں نے کھڑکی میں سے نیچے جھانکا لیکن سوائے لہلاتے ہوئے پنجاب

کے سبز کھیتوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ "آپ پائلٹ کے کاک پٹ (پائلٹ کا خانہ) میں آجائیں اور خود دیکھ لیں" ایئرہوسٹس نے کہا۔ میں نے طیارے کے سامنے کے شیشے میں سے نظر دوڑائی لیکن دور فاصلے پر سوائے رن وے کے کچھ نظر نہ پڑا۔ چھوٹی سی چھڑی جتنی قد کی شکلیں تمام رن وے کے گرد اور ایئرپورٹ کی عمارت کے اوپر نظر آئیں۔ جیسے ہی ہم زمین پر اترے، میں نے دیکھا وہ حفاظتی دستے تھے۔ اس قدر سخت احتیاط برتی گئی تھی کہ دیگر پروازوں کو اترنے سے منع کر دیا گیا تھا۔

"ناہید، بشیر، دارا، میرے قریب کھڑے رہو" میں نے ان ہم سفروں کو کہا جن کے بارے میں ہمیں تنبیہ کی گئی تھی کہ انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ یہ بھی ایک مضحکہ خیز بات تھی کہ میرے حامیوں نے میرے گرد میری حفاظت کے لئے گھیرا ڈال لیا اور میں نے ان کی حفاظت کے لئے انہیں اپنے نزدیک رکھا۔ "ہم تمہاری حفاظت کی ضمانت ہیں" پریس کے نمائندوں نے کہا۔ لیکن دراصل لوگوں کا بےپناہ ہجوم ہی ہماری حفاظت کا ضامن ثابت ہوا۔ امیگریشن حکام ایئرپورٹ سے ہمیں جلدی چھٹکارا دلانے کے لئے پریشان تھے اور انہوں نے طیارے ہی میں آکر ہمارے تمام پاسپورٹوں پر جلدی جلدی مہریں ثبت کر کے اپنی کارروائی سرانجام دی۔

گھر۔ میں گھر میں آ گئی تھی۔ جب میں نے پاکستانی سرزمین پر قدم رکھا میں اپنے قدموں کے نیچے اپنی زمین کا احساس کرنے کے لئے رکی اور ہوا میں گہرا سانس لیا جس کا میں خود ایک حصہ تھی۔ میں لاہور بذریعہ طیارہ کئی مرتبہ آچکی تھی میں نے بہت اچھا وقت یہاں گزارا تھا لیکن یہ وہ شہر بھی تھا جہاں میرے والد کو موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ اب میں والد کے قاتل جرنیل کو چیلنج کرنے کے لئے واپس آئی تھی جس نے آئین کی خلاف ورزی کر کے شدید بغاوت کا جرم سرزد کیا تھا۔ سمیعہ، امینہ، ڈاکٹر عباسی! "میں نہیں جانتی یہاں سے باہر کیسے نکلیں گے۔ یہاں اتنے لوگ جمع ہو گئے ہیں" سمیعہ نے ائرپورٹ پر ہی کہا اور میرے گلے کے ہاروں میں اپنے ہار کا اضافہ کیا۔ "ہم ٹرک میں جا رہے ہیں" جہانگیر بدر نے کہا اور ایک چمکتے ہوئے روغن کئے ہوئے ٹرک کی طرف میری راہنمائی کی۔ اس کے ٹین پر بنے ہوئے ڈیزائن چمک رہے تھے۔

میں نے اپنی تقریر کے چیدہ چیدہ عنوانوں کو مضبوطی سے ذہن نشین رکھا اور ٹرک پر بلندی پر تعمیر کئے گئے پلیٹ فارم پر سوار ہونے کے لئے ایستادہ سیڑھی پر نظر دوڑائی۔ مجھے سیڑھیوں پر چڑھنے سے خوف آتا رہتا تھا مگر یہاں اس سیڑھی پر چڑھنا پڑا۔ اچانک وہی سیڑھی میرے سامنے تھی اور ہزاروں پر امید آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں اور سیڑھی پر چڑھتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں کیا کر سکتی تھی؟ لندن میں ہم اسی ذریعہ مواصلت پر ائرپورٹ سے مینار پاکستان تک پہنچنے کے لئے متفق ہوئے تھے۔ یہ وہ یادگار تھی جو میرے والد نے قرار داد لاہور کی یاد میں بنوائی تھی جس نے ہمیں پاکستان کی تعمیر کی راہ سجھائی تھی۔ اب تو ٹرک پر بیٹھنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ دروازوں کے باہر دس لاکھ انسانوں کا جم غفیر میرا منتظر تھا۔ میں نے اپنا پہلا قدم سیڑھی پر رکھا اور گہرا سانس لیا۔ "بسم اللہ" میں نے اپنے آپ کو مخاطب کیا۔ "میں باسمہ اللہ تعالیٰ شروع کرتی ہوں"

زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جنہیں لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ لاہور کو میری واپسی ان میں سے ایک ہے۔ انسانوں کا سمندر جو سڑکوں کے ساتھ ساتھ ایستادہ تھا، گھروں کی بالکنیوں اور چھتوں پر موجود تھا، درختوں میں اور بجلی کے کھمبوں پر پھنسا ہوا تھا، ٹرک کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اور دور تک کھیتوں میں پھیلا ہوا ایک چھوٹا ہی نہیں، انسانوں کا وسیع و بے کراں سمندر تھا۔ ائرپورٹ سے اقبال پارک میں مینار پاکستان تک کا ۸ میل کا فاصلہ عموماً پندرہ منٹ میں طے ہو جاتا ہے۔ ۱۰ر اپریل ۱۹۸۶ء کے ناقابل یقین دن میں ہمیں وہاں پہنچنے تک ۱۰ گھنٹے لگے۔ ائرپورٹ پر دس لاکھ انسانوں کی تعداد مینار پاکستان تک پہنچتے پہنچتے بیس لاکھ تھی پھر تیس لاکھ کا جم غفیر و بے کنار تھا۔

ایئرپورٹ کے دروازے کھلتے ہی ہزاروں رنگین غبارے فضا میں تیرتے ہوئے دیکھے گئے۔ گلاب کے پھولوں کی پتیاں، اشک آور گیس کی بجائے، ٹرک پر نچھاور کی گئیں یہاں تک کہ وہ ٹخنوں تک ٹرک میں بھر گئیں۔ ہوا میں سے پھولوں کے ہار مجھ پر پھینکے گئے۔ میں نے ایک ہار اس لڑکی کی طرف پھینکا جس کے بھائی کو پھانسی دی گئی تھی اور وہ میری طرف تک رہی تھی۔ مزید ہار ٹرک پر پھینکے گئے...... اسی طرح دستی تیار کردہ دوپٹے اور شالیں

بھی۔ میں نے کتنے ہی دوپٹے اپنے سر پر اوڑھ لئے اور کتنے ہی اپنے شانوں پر لٹکا لئے۔ جب ہم سابق سیاسی قیدیوں کے پاس سے گزرے تو میں نے ان کی طرف پھولوں کی پتیاں اور کشیدہ کئے ہوئے کپڑے پھینکے اور اسی طرح ان خاندانوں کے اراکین کی طرف جن کے پیاروں کو پھانسیاں دی گئیں یا اذیتیں دی گئیں اور اسی طرح ان نوجوان اور بوڑھی خواتین کی طرف جو سڑک کے کناروں پر کھڑی تھیں۔ پی پی پی کے سیاہ، سبز اور سرخ رنگوں کے سوا لاہور میں اس دن اور کوئی رنگ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پی پی پی کے پرچم اور جھنڈیاں خشک گرم ہوا میں لہراتے ہوئے ایک مستقل اور متواتر سائبان کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ لوگوں نے سرخ، سبز اور سیاہ جیکٹیں، دوپٹے، شلواریں اور قمیضیں پہن رکھی تھیں۔ گدھوں اور بھینسوں کی ایالوں اور دموں میں پی پی پی کے رنگوں کے ربن گندھے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے اشتہاروں پر میرے والد، میری والدہ، میرے بھائیوں کی اور میری تصاویر انہی رنگوں کے فریموں میں سجائی گئی تھیں۔

"جیوے، جیوے، بھٹو جیوے" ہجوم پنجابی میں زور دار نعرے بلند کر رہا تھا۔ ایک جذبے کا اظہار جس کے لئے تین ماہ قبل قید بامشقت اور کوڑوں کی سزائیں سنا دی جاتی تھیں۔ "منجھے بہن! منجھے بہن، بے نظیر" میری بہن، میری بہن بے نظیر، دوسرے سندھی میں الاپ رہے تھے۔ اردو میں، پشتو میں، پاکستان کی ہر علاقائی زبان میں نعرے لگ رہے تھے۔ "بے نظیر آئے گی، انقلاب لائے گی" میری آمد سے قبل ہمارے حامی نعرے لگا رہے تھے اب ان کے نعروں میں یہ تبدیلی تھی۔ "بے نظیر آئی ہے انقلاب لائی ہے" جب میں ہاتھ لہراتی۔ "ہجوم اپنے ہاتھ لہراتا" جب میں اپنے سر پر ہاتھ اٹھا کر تالی بجاتی، جیسے میرے والد کیا کرتے تھے، ہجوم بھی تالیاں بجاتا، ان کے اٹھے ہوئے ہاتھ اور بازو فضا میں گندم کے ایک وسیع و عریض کھیت کی شاخوں کی طرح لہراتے۔

ایسے بھی واقعات تھے جب میں اسلام آباد کے ایک خالی گھر میں نظر بند تھی اور صبح سویرے جاگتی تو لوگوں کے ہجوم کے شور کی آوازیں سنائی دیتیں۔ میں اپنے ذہن کی کہر کو دور کرتی اور اس ہجوم کو پہچاننے کی کوشش کرتی۔ وہ کس چیز کے لئے چلا رہے تھے؟ کیا وہ

غصے میں ضیاء کے خلاف نعرہ زن تھے؟۔ اور ان کے نعروں کا یہ کیا انداز تھا؟ یا کیا وہ راولپنڈی جیل کے دروازے کھلنے پر اور میرے والد کو باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر خوشی سے نعرہ زن تھے؟ لیکن ایسا کہاں ہوتا تھا۔ میں سکھر جیل، کراچی سنٹرل جیل، المرتضٰی اور ۷۰ کلفٹن میں نظر بندی کے دوران یہی شور اور نعرے سنتی رہی۔ میں ان آوازوں کو پہچاننے کی کوشش کرتی مگر ہمیشہ دھوکا کھاتی۔ "اب جیسے ہی میں لاہور کی گلیوں میں آوازوں کے ایک بے اتھاہ سمندر کو سن رہی ہوں تو مجھے یقین ہوا ہے کہ یہی آوازیں ہمیشہ سنتی رہی تھی"۔

میں دس گھنٹوں تک ٹرک کے اوپر کھڑی رہی جیسے ہی ہم انچ بہ انچ مینار پاکستان کی طرف بڑھتے رہے گورنر ہاؤس کے پاس سے گزرتے ہوئے جہاں ہمارے اہل خاندان کبھی کبھی آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ اور جہاں میرے والد کے قتل کے بعد جنرل ضیاء راہداریوں میں نیند سے اچاٹ راتوں میں لیڈی میکبتھ کی طرح ہاتھ میں لیمپ اٹھائے سرگرداں نظر آتا۔ ہم اس سائبان کے پاس سے گزرے جہاں ملکہ وکٹوریہ کا مجسمہ ایستادہ ہوا کرتا تھا پاکستان میں اس کی یہی شبیہ باقی رہ گئی تھی کیونکہ بنیاد پرستوں کے اعتراضات آرٹ میں کسی جاندار مخلوق کی تشکیل کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ پھر زمزمہ جو کم کی توپ تھی اور جسے رڈیارڈ کپلنگ نے اپنے کلام میں جاودانیت عطا کر دی تھی کے پاس سے گزرے۔ میں اپنے آپ کو ہلکا اور بہت ہی ہلکا محسوس کر رہی تھی اس یقین کے ساتھ کہ جن شہیدوں نے جمہوریت کی خاطر اپنی جانیں قربان کی تھیں ہجوم میں خوشی سے میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ فتح، جرات مندی اور ہماری حق پسندی کا ثبوت جو فضا میں ہر طرف پھیلا ہوا تھا پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ "ضیاء الحق! تم ہمیں قبول نہیں ہو" ہجوم کی آوازیں لہرا رہی تھیں۔ "ہم تمہاری چنی ہوئی اسمبلیاں نہیں چاہتے، ہم تمہارا جعلی آئین نہیں چاہتے، ہم تمہاری آمریت نہیں چاہتے۔ ہمارا جذبہ تمہاری آنسو گیس، تمہارے کوڑوں اور گولیوں سے زیادہ عظیم ہے، ہم انتخابات چاہتے ہیں"۔

اگرچہ میں ایک کھلے ٹرک پر بیٹھی ہوئی تھی مگر میں خطرے سے بے نیاز تھی۔ مجھے نقصان

پہنچانے کی کوئی کوشش کرنے والا ہجوم سے اپنا تکا بوٹی ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ پولیس سے یا فوج سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لوگوں کے ہجوم سے مرعوب ہو کر ہمارے سابقہ دشمنوں میں سے کچھ تو اپنے مقفل دروازوں کے پیچھے چھپے رہے اور بہت سے باہر نکل کر جشن منانے والوں میں شامل ہوگئے۔ زیادہ تشویش مجھے اپنی آواز سے تھی جو فلو اور نزلہ کی وجہ سے بیٹھی ہوئی تھی۔ راستہ بھر میں گلے کو ڈسپرین اور گرم پانی سے ٹکور کرتی رہی اور گلوکوز کا ایک محلول پیتی رہی جو میرے والد کا ذاتی خدمت گار عرس کراچی سے میرے لئے لایا تھا۔

سورج مینار پاکستان پر غروب ہونا شروع ہو گیا تھا جب ہم مینار پاکستان کی پارک میں پہنچے۔ میدان لاکھوں لوگوں سے اٹا پڑا تھا اور کہیں کوئی خالی جگہ نظر نہیں پڑتی تھی۔ ہم سٹیج تک بڑی ہی مشکل سے پہنچ پائے۔ میرے پاس کوئی حفاظتی گارڈ نہیں تھے جیسے بعد میں منظم ہوتے رہے اور میں ان کے بغیر ہی ہجوم میں سے ہوتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ ابھی تک ہم یہ چال نہیں سیکھے تھے کہ ٹرک کو سیدھا پلیٹ فارم تک لے جائیں تاکہ صرف ایک قدم پر پلیٹ فارم پر کھڑے ہو جائیں۔ مینار پاکستان پر ٹرک سے اتری تو صرف چار پانچ ساتھی تھے جو ہجوم میں سے مجھے لے کر آگے بڑھتے گئے۔ ہجوم سے مجھے کسی نقصان کی توقع نہیں تھی لیکن جوش اور ولولے نے ان میں جنونی کیفیت بھر دی تھی۔ لوگ دھکم پیل سے میری طرف بڑھنے کی کوشش کرتے رہے اور اس دائرے کو جو دوستوں نے میرے گرد بنا رکھا تھا توڑنے کی سعی کی۔ میں نے سوچا کہ شاید ہماری موت یہیں واقع ہو جائے گی یا دم گھٹ کر یا کچلے جانے سے۔ بہت سوں کے ہوش جواب دے گئے تھے خصوصاً پارٹی کے ایک راہنما کے جو میرے گرد دائرے پر بار بار یلغار کر رہا تھا۔ مجھے اسے علیحدہ کرنے کے لئے زور سے دھکا دینا پڑا۔ کسی نہ کسی طرح ہم سٹیج تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جہاں پنجاب پی پی پی کا صدر شدید تھکاوٹ سے مغلوب ہو کر گر گیا تھا۔ "شاید ہمیں حفاظت کے بارے میں غور و فکر کرنا چاہئے" میں نے اس سے ایک طرف ہو کر کہا۔ کیا روح پرور منظر تھا جب میں نے اقبال پارک کو سر اٹھا کر دیکھا۔ راستے سے پرے، بادشاہی مسجد کا سرخ پتھر غروب ہوتے

سورج کی آخری کرنوں میں آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ بادشاہی مسجد دنیا کی عظیم ترین مسجدوں میں سے ایک ہے۔ سامنے دائیں جانب درختوں کے سایوں میں سے جھلکتا ہوا لاہور کا شاہی قلعہ تھا مغلوں کا قلعہ جس کے تہ خانوں میں ہمارے بہت سے حامیوں کو اذیتیں دی گئیں اور ان میں سے کچھ نے موت کو گلے لگالیا۔ اور تمام اطراف میں ہر جگہ لوگ مجھے گھر آنے پر خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ "مجھے کچھ لوگوں نے سیاست چھوڑ دینے کی نصیحت کی ہے" میں نے اردو میں بلند آواز میں کہا۔ "انہوں نے متنبہ کیا ہے کہ میری قسمت بھی میرے والد اور بھائی جیسی ہو سکتی ہے۔ بعض نے کہا کہ پاکستان میں سیاست کا میدان عورتوں کے لئے نہیں۔ میرا ایسے تمام لوگوں کو جواب ہے کہ میری پارٹی کے کارکن ہر خطرے سے میری حفاظت کریں گے۔ میں نے اپنی مرضی سے کانٹوں کا راستہ چنا ہے اور موت کی وادی میں قدم رکھا ہے"۔

لاوڈ سپیکروں کا نظام پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا اور کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ ہمارے اندازے سے دس گنا زیادہ لوگ اکٹھے ہوگئے تھے۔ لیکن شاید مسمریزم کے زیر اثر لوگ میرے ہاتھ کی ایک جنبش سے خاموش ہو جاتے تھے۔ "یہاں اور ابھی میں قسم کھاتی ہوں کہ لوگوں کے حقوق حاصل کرنے کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کروں گی" میں نے اونچی آواز میں پکارا۔ "کیا تم آزادی چاہتے ہو؟ کیا تم جمہوریت چاہتے ہو؟ کیا تم انقلاب چاہتے ہو؟" "ہاں" لوگوں کا ہر مرتبہ آوازہ اٹھتا۔ ۳۰ لاکھ لوگوں کی بیک وقت آوازوں کی ایک آواز۔ "میں واپس آئی ہوں تاکہ لوگوں کی خدمت کروں، نہ کہ انتقام کی آگ بجھاؤں"۔ میں نے انہیں بتایا۔ "میں انتقام کو ختم کرتی ہوں۔ میرے دل میں ایسا کوئی احساس موجود نہیں۔ میں پاکستان کی تعمیر چاہتی ہوں لیکن میں تم سب سے استصواب رائے یعنی ریفرنڈم لینا چاہتی ہوں۔ کیا تم ضیاء کو برسراقتدار دیکھنا چاہتے ہو؟"۔ "نہیں" لوگوں نے بیک وقت پکارا۔ "کیا تم چاہتے ہو ضیاء جائے"۔ "ہاں" ایک مرتبہ پھر آوازہ بلند ہوا۔ "تب فیصلہ ہے کہ ضیاء جاوے" میں نے کہا۔ "ضیاء جاوے، جاوے، جاوے" لاکھوں لوگوں نے رات کی تاریکی میں بلند آہنگ آواز میں پکارا۔

پورے دن میں تشدد کا کوئی ایک سانحہ بھی پیش نہیں آیا۔ سوائے حکومت کو پر امن چیلنج کے اور کچھ بھی ارادہ نہیں تھا۔ ہجوم اتنا تیار اور تابع تھا کہ بہت سے لوگوں کے خیال میں حکومت کا تختہ الٹا جا سکتا تھا۔ صرف ایک لفظ کہنے پر، ہجوم پنجاب اسمبلی، وزراء کے گھر اور لاہور ہائی کورٹ جہاں ضیاء کی نامزد کردہ عدالت نے میرے والد کو سزائے موت سنائی تھی سب کو تباہ و برباد کر سکتا تھا۔ لیکن ہم قتل و غارت گری کے ذریعے بر سراقتدار نہیں آنا چاہتے تھے۔ ہم جمہوریت پر امن اور قانونی انتخابات کے ذریعہ سے معرض وجود میں لانا چاہتے تھے۔ یہ حکومت تھی جس نے تشدد کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ اور اسی شب انہوں نے اپنا وطیرہ پھر آزمایا۔

میں پچھلے ۴۸ گھنٹوں میں پہلی بار اپنی نیند سونے لگی تھی کہ کسی نے سونے کے کمرے کے دروازے کو تیزی سے کھٹکھٹایا۔ میری حفاظت کے خیال سے مقامی پارٹی کے اہلکاروں نے میری متعلق تین مختلف رہائش گاہوں میں قیام کا چرچا کیا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک گھر خالد احمد کے اہل خاندان کا تھا جہاں مینار پاکستان سے واپسی پر میں نے غیر ملکی پریس کے نمائندوں سے بات چیت کی تھی...... اسے فوج کے ایک میجر نے تہ و بالا کر دیا تھا۔ کیا منحوس یاد دہانی تھی کہ میں ضیاء کے پاکستان میں واپس آگئی تھی۔ میجر میری تلاش میں وہاں آیا تھا۔

عذرا خالد

میں سو رہی تھی کہ ایک ملازم نے مجھے جگایا۔ فوجی جوانوں کے ملازمین کے کوارٹروں میں حملہ کے بعد اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ پندرہ یا سولہ فوجی جوانوں نے صحن کی دیوار پھاندی، ملازموں کو بری طرح پیٹا اور گھر کے اندر بے نظیر بھٹو کے متعلق پوچھتے ہوئے آرہے تھے۔ اس نے مجھے بتایا۔ ہمارا سامنے کا دروازہ مقفل تھا لیکن فوجیوں نے دروازہ توڑ ڈالا اور سامنے کی کھڑکیوں میں پڑے پھولوں کے گملے گرا دیئے۔ "بے نظیر کہاں ہے؟" ان کے راہنما ایک میجر قیوم نے پستول لہراتے ہوئے پوچھا۔ ہمارا ایک ملازم جو باہر سو رہا تھا نے اپنے بیٹے کا کرکٹ کا بلا اٹھا کر میجر قیوم کے سر پر دے مارا تو وہ فوراً چیخ اٹھا

"میں ایک خفیہ محکمے کا افسر ہوں، ایک کمانڈو ہوں" ۔ میں نے پولیس کو اطلاع دی اگرچہ ضیاء کے زمانے میں کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ ہمارے دوست ہیں یا دشمن، جیسے ہی پولیس کی کار آئی تو دیگر فوجی جوان بھاگ کھڑے ہوئے۔ پولیس نے میجر قیوم کو گرفتار کر لیا۔ اس کی کار میں بیئر اور وسکی شراب کا ایک کریٹ تھا جو وہ ہمارے گھر میں رکھ کر بر آمد کرانا چاہتا تھا۔ اور اس کی ڈائری میں حکومت کے بلند رتبہ کے جرنیلوں اور وزیروں کے ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے تھے۔

میجر قیوم پاگل بن گیا۔ حکومت نے بھی یہی اعلان کیا کہ وہ پاگل تھا اور اپنے آپ ہی یہ کام کر رہا تھا۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ میجر قیوم جنونی نہیں تھا۔ بے نظیر کا استقبال اس روز لاہور میں اتنا شاندار اور ناقابل یقین تھا کہ حکومت اسے چھونے کی کوشش نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے بے نظیر کو قتل کروانے کے لئے یا اپنے دورے کو جاری رکھنے سے ڈرانے کے لئے یہ حکمت عملی اپنائی تھی۔ اسے جیل میں تھوڑے سے وقفہ کے لئے رکھا گیا۔ جب وہ اپنے گاؤں واپس پہنچا تو بغیر کسی سبب کے اسے قتل کروا دیا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حکومت نے اپنے خلاف ایک ثبوت کا قلع قمع کر دیا تھا۔

گوجرانوالہ ـــ فیصل آباد ـــ سرگودھا ـــ جہلم ـــ راولپنڈی ـــ "لاہور میں استقبال بے مثال تھا" ہمارے نقادوں نے اور بعض اخبارات نے اعلان کیا۔ "بے نظیر کو ایسے استقبال دوسرے شہروں میں نہیں ملیں گے" وہ غلطی پر تھے۔ ہم لاہور سے دن کے بارہ بجے ۱۲/اپریل کو پنجاب کے دورے پر گوجرانوالہ ۰۰ - ۵ بجے کی ریلی میں شامل ہونے کے لئے روانہ ہوئے لیکن سڑکوں پر لوگوں کا ٹرک کے ارد گرد اس قدر ہجوم تھا کہ میلوں تک پھیلا ہوا تھا اور ہم اگلے دن ۰۰ - ۵ بجے صبح جلسہ گاہ میں پہنچے۔ "اب تو جلسے میں کوئی عوام نہیں ہونگے" میں نے کہا۔ "وہ سب لوگ اپنے بستروں میں سو گئے ہوں گے" اس کی بجائے جلسہ بھرا ہوا تھا۔ لوگوں نے ساری رات ہمارا انتظار کیا تھا۔

"ہمیں تیز تر حرکت کرنی چاہئے" میں نے اپنے رضا کار حفاظتی عملے کو کہا۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ گوجرانوالہ سے فیصل آباد تک سڑکوں پر لوگ ہی لوگ تھے اور ۸۰ کلو میٹر کا

فاصلہ ۱۶ گھنٹوں میں طے ہوا۔ ٹرکوں، بسوں، رکشاؤں اور موٹر سائیکلوں کا جلوس ہمیں گھیرے ہوئے تھا حتیٰ کہ آنے والی ٹریفک کو سڑک سے نیچے اترنا پڑتا تھا۔ ہزاروں لوگ ٹرک کے ساتھ ساتھ ساری رات چلتے رہے ایک عظیم گارڈ آف آنر کی طرح۔ میں ٹرک کے اوپر عوام کو خوش باشی کے انداز میں ہاتھ لہراتی رہی۔ "سب طرف پھول بکھیرو اور راستے میں موتی انڈیلو کیونکہ بے نظیر آئی ہے" لوگ گاتے رہے۔ "اے خدا! وہ دن واپس لا جب غریبوں کی تکلیف کے دن خوشی میں بدل جائیں گے" یہ تجربہ میرے لئے اور پی پی پی کے کارکنوں کے لئے انکساری اور عاجزی کا تجربہ تھا۔ "خدایا! ہمیں حوصلہ اور دانائی دے کہ ہم لوگوں کی توقعات پر پورا اتریں" ہم نے انچ انچ سرکتے ہوئے ٹرک پر اجتماعی دعا مانگی۔ جب ہم بالآخر صنعتی شہر کے نواح میں پہنچے تو فیصل آباد پر سورج طلوع ہو رہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر ہم کھیلوں کے میدان میں منعقدہ جلسے میں نصف دن کی تاخیر سے پہنچے جہاں نو سال قبل میں نے گھبرائے ہوئے اپنی پہلی تقریر کی تھی۔ ایک بار پھر مجھے یقین تھا کہ جلسہ گاہ خالی ہو چکی ہو گی۔ لیکن جیسے ہی ٹرک دروازوں میں سے گزرا، ایک بے محابا شور لاکھوں لوگوں سے اٹھا۔ "قوم کی تقدیر، بے نظیر، بے نظیر" جوش اور ولولہ اس وقت تک قائم رہا جب ہم جلسہ گاہ سے واپس گئے تھے۔ کارخانوں کے مزدور اس پارٹی کو نہیں بھولے تھے جس نے ان کو وقار اور ملازمت کا تحفظ دلایا تھا۔ اگرچہ بہت سے مل مالکان نے اپنے کارخانوں کے دروازے مقفل کر دیئے تھے تاکہ مزدور پی پی پی کی حمایت کا اظہار نہ کر سکیں۔ تاہم مزدور دیواریں پھاند کر ہم میں شامل ہونے کے لئے آن پہنچے۔

جہلم، جہاں سے فوج کے جوانوں کی اکثریت بھرتی کی جاتی ہے۔ راولپنڈی، جو سرکاری ملازمین کا شہر ہے۔ ان دونوں شہروں میں بھی جہاں عوام فطرتاً ضیاء کو پی پی پی کے چیلنج کی کھل کر حمایت نہیں کر سکتے تھے یا نظرانداز کرنے پر مجبور تھے۔ جلسوں میں لوگوں کی تعداد طوفان خیز تھی۔ غیر ملکی صحافی اور ٹیلی ویژن کا عملہ اتنے بڑے بڑے اجتماعات کو ناقابل یقین گردانتا تھا لیکن وہ اپنے عوام الناس کو ایسی خبریں دینے پر مجبور تھے۔ لیکن میرے ہم وطن ایسا کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اگرچہ کہنے کو مارشل لاء اٹھالیا گیا تھا، لیکن حکومت نے ٹیلی

وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو ۱۹۹۷ء میں قیام پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر اسلام آباد میں تعمیر ہونے والے ایک عظیم کمپلیکس کا ماڈل دیکھ رہی ہیں۔

ویژن پر میری خبروں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ نہ ہی میرا یہ دورہ اور نہ ہی پاکستان واپسی کے بعد میری کوئی سیاسی خبر ٹیلی ویژن پر کبھی بھی دکھائی گئی تھی۔

پریس کانفرنسیں، تعزیتی ملاقاتیں، پارٹی کے اجلاس، خدا ہی جانے مجھ میں سب کچھ کرنے کے لئے طاقت کہاں سے عود کر آئی تھی۔ میری واپسی پر لوگوں کے رد عمل نے میرے لئے قوت کی دوا کا اثر کیا تھا۔ لیکن ایسے لمحات پھر بھی آتے تھے جب میں غم میں محصور ہو جاتی تھی۔ میں اپنے دماغ میں کینز میں قالین پر شاہ کے جسم کو پڑے ہوئے سین کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتی رہتی اور کبھی کبھی اپنے والد کو موت کی کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے دیکھتی۔ میں کتنی ہی خواہش کرتی کہ وہ ایک لمحے کے لئے ہی آجاتے اور اپنی تمام تکالیف کا مداوا دیکھ پاتے۔ ہمیں بچپن ہی سے یہ سبق سکھایا گیا کہ اپنے وطن کی خاطر کوئی قیمت بھی بڑی قیمت نہیں ہے۔ لیکن ہمارے سلسلہ میں ذاتی نقصان کی قیمت بے پناہ تھی۔

اپنے غم کو ہلکا کرنے کے لئے میں نے راولپنڈی جانے کے پروگرام میں ردوبدل کر دیا تاکہ میں راولپنڈی سنٹرل جیل کے پاس سے نہ گزروں جہاں میرے والد کا انتقال ہوا تھا۔ لیکن میں دوسرے لوگوں کے المیے اور قربانیاں کیسے بھول سکتی تھی۔ گوجرانوالہ میں میں پرویز یعقوب کی قبر پر گئی جس نے میرے والد کی سزائے موت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے سب سے پہلے خود سوزی کی۔ راولپنڈی میں ان تین نوجوانوں میں سے ایک کے گھر پر تعزیت کے لئے گئی جن کو اگست ۱۹۸۴ء میں پھانسی دی گئی تھی۔ کتنی ہی زندگیوں کے چراغ گل کئے گئے...... کتنے ہی المیے برپا ہوئے۔ یہ لڑکا دوسروں کی طرح صرف ۱۶ برس کا تھا جب اسے گرفتار کیا گیا اور ۱۹ برس کا جب اسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ "اب ان تمام ہجوموں کو دیکھو" اس کی والدہ نے مجھے کہا "وہ وقت بھی تھا جب لوگ ہم سے بات کرنے پر بھی خوف زدہ تھے"۔

ہم وہاں سے صوبہ سرحد میں پشاور کی طرف روانہ ہو گئے۔ پنجاب پی پی پی کے صدر نے صوبائی حدود پر مجھے سرحد پی پی پی کے صدر کے حوالے کر دیا۔ یہاں بھی سڑکیں لوگوں

سے اٹی پڑی تھیں اور ہم رات کے وقت وہاں پہنچے۔ حکومت نے گلیوں کی روشنیاں بجھا دی تھیں تاکہ میری آمد کو کوئی نہ دیکھ سکے مگر لوگوں نے ٹارچیں اور گھروں کی ویڈیو روشنیاں ٹرک پر ڈالنا شروع کر دیں تاکہ لوگ مجھے دیکھ سکیں۔ میری حفاظت کے عملہ کا سربراہ کافی خوف و تشویش کا اظہار کر رہا تھا جب ہم اس قدیم تجارتی شہر کی تنگ گلیوں میں سے گزر رہے تھے جو درہ خیبر اور افغانستان سے صرف ایک گھنٹے کے سفر کے فاصلے پر تھا۔ پاکستان میں اس وقت ۳۰ لاکھ افغان مہاجرین تھے جن کی ضیاء دیکھ بھال کر رہا تھا اور ان کی اکثریت پشاور کے گردونواح میں آباد تھی۔ ہمیں افواہیں ملیں کہ حکومت افغان مجاہدین کے ذریعے مجھے قتل کروا دے گی۔ اگرچہ مجھے خبر نہیں دی گئی حفاظتی عملہ کے سربراہ نے ٹرک پر بیٹھی عورتوں جن میں اس کی اپنی بیوی بھی شامل تھی سے کہا کہ وہ میرے ارد گرد مضبوطی سے بیٹھی رہیں تاکہ کوئی مجھے نشانہ نہ بنا سکے۔ تاریک گلیوں میں مجھ پر پڑتی ہوئی روشنی میں میں آسان نشانہ بن سکتی تھی مگر خدا کا فضل تھا کہ مجھ پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔

"میں بہادر پختونوں کو سلام کرتی ہوں جیسے میرے والد نے کیا تھا" میں نے سٹیڈیم میں جمع مسلسل تالیاں بجاتے ہوئے لوگوں کے ہجوم کو کہا جن پر ہمارے اپنے جنریٹروں سے روشنی پھینکنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ پشاور میں مجھے کچھ دقت ہوئی جب میرے ایک معاون نے میری تقریر کے مختصر نوٹس گم کر دیئے۔ لیکن یہ بہت اہم تھا کہ میں اس قدامت پسند معاشرہ کو اپنا دوبارہ تعارف کراؤں جن کی پاکستان سے علیحدگی کی دھمکی اور اپنی آزاد ریاست بنانے کا چیلنج بہت حقیقی تھا۔ اس پدر سری پٹھان معاشرے کو یہ یقین دلانا بھی ضروری تھا کہ ایک عورت بھی ان کی راہنمائی کر سکتی تھی۔

"لوگ کہتے ہیں میں کمزور ہوں کیونکہ میں ایک عورت ہوں" میں نے ہجوم کو مخاطب کیا جس میں ۹۹ فیصد مرد تھے۔ "کیا انہیں خبر نہیں میں ایک مسلمان عورت ہوں اور مسلمان عورتوں کو اپنی میراث پر فخر ہے۔ مجھ میں بی بی خدیجہؓ کا صبر ہے، جو رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی بیوی تھیں۔ مجھ میں بی بی زینبؓ کا استقلال ہے جو امام حسینؓ کی بہن تھیں۔ اور مجھ میں حضرت عائشہؓ کا حوصلہ ہے جو ہمارے رسولؐ کی چہیتی بیگم تھیں جنہوں نے اپنے اونٹ پر خود سوار ہو کر جنگ میں مسلمانوں کی سربراہی کی۔ میں شہید ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی ہوں اور شہید شاہ نواز بھٹو کی بہن ہوں اور میں آپ سب کی بہن ہوں۔ میں اپنے مخالفوں کو چیلنج کرتی ہوں کہ ان میں دم خم ہے تو آئیں اور جمہوری انتخابات کے میدان میں میرا مقابلہ کریں" تالیاں خوشگوار نعروں میں بدل گئیں جب میں نے کہا "ضیاء زا" یعنی ضیاء جاؤ تو مجمع بھی پکار اٹھا۔ "زا زا" جاؤ، جاؤ۔

پشاور بار ایسوسی ایشن کو اگلے دن خطاب کرنے کے بعد میں واپس پنجاب آ گئی تاکہ لاہور، اوکاڑہ، پاک پتن، وہاڑی اور ملتان میں جلسوں کو خطاب کروں۔ ملتان میں میں نے آٹھ سال قبل ایک کپڑے کی مل میں ہزاروں شہید ہونے والے مزدوروں کو خراج تحسین پیش کیا۔ پھر میں سندھ میں گھر واپس آ گئی اور کراچی میں جلسے سے خطاب کیا جہاں لوگوں کے ہجوم نے لاہور کے جلسے کو مات دینے کی کوشش کی۔ پھر بلوچستان میں کوئٹہ گئی اور واپس سندھ میں آ کر ٹھٹھہ، بدین، حیدر آباد اور آخر میں ماہ رمضان میں لاڑکانہ میں جلسوں سے خطاب کیا۔ "ماروی مالیرجی، بے نظیر، بے نظیر" لوگوں نے نعرے لگائے مجھے سندھ کی لوک داستان کی ہیروئن ماروی سے مماثل کرتے ہوئے جس نے ایک مقامی ظالم کی خواہشات کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اگرچہ اس نے اسے ایک قلعہ میں نظر بند کر دیا تھا مگر وہ داستان کے مطابق اس کی روح اور اس کے جذبے کو کچل نہ سکا جو اسے عام لوگوں سے پیار نے ودیعت کیا تھا۔

لاڑکانہ میں اس شدت کی گرمی تھی کہ ائرپورٹ سے کھیلوں کے سٹیڈیم تک جاتے ہوئے میں نے دوپٹے کے نیچے برف کی قاشیں رکھ لی تھیں۔ آج سے دس ماہ قبل اسی میدان میں میرے بھائی شاہ کے جنازے میں شریک ہونے کے لئے لوگوں کا اجتماع ہوا تھا۔ ہجوم اتنا بڑا تھا کہ غروب آفتاب سے پہلے سٹیڈیم میں پہنچنے کے لئے ہمیں راستہ تبدیل

کرنا پڑا۔ میں تمام وقت چلچلاتی دھوپ میں کھڑی رہی، پہلے اپنی پجیرو کی چھت پر اور بعد میں ایک ٹرک پر اور وقفے وقفے سے لیموں اور نمک بھی چوستی رہی۔ لاڑکانہ کا پی پی پی کا صدر گرمی کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوگیا۔ "خدایا مجھے بے ہوش نہ ہونے دینا" میں دعا کرتی رہی کیونکہ ہمارے حریفوں کی تو یہی خواہش تھی کہ میں گر جاؤں۔ مگر میں جلسے سے خطاب میں کامیاب رہی۔

موت کی دھمکیاں اور جلسوں کو تتربتر کرنے کی خبریں میرے ۱۹ شہروں کے دورے میں میری آمد سے پہلے پھیلا دی جاتیں...... خاص طور پر بلوچستان کے دورے میں اور زور پکڑ گئیں جہاں میرے حفاظتی گارڈوں نے جلسے کی اگلی صفوں میں تین افغان مجاہدین کو خود کار ہتھیار چھپائے بیٹھے ہوئے دیکھ لیا۔ یہ ہتھیار نہیں تھے جن کی وجہ سے خطرہ تھا۔ بلوچستان میں زیادہ تر لوگوں کے پاس کھلے ہاتھوں بندوقیں تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے ہتھیار چھپا کر رکھے ہوئے تھے۔ گارڈوں نے مشکوک افغانیوں کے بارے میں مجھے مطلقاً خبر نہیں دی بلکہ میرے سامنے ایسی جگہوں پر کھڑے ہوگئے کہ تقریر کے دوران میری بجائے وہ خود گولی کا نشانہ بنتے۔

گھومتی ہوئی سٹیج پر جو اس موقع کے لئے تیار کی گئی تاکہ اتنے بڑے ہجوم میں ہر ایک کی نگاہ مجھ پر پڑ سکے مجھے سر چکرانے کے متعلق تشویش ہو رہی تھی۔ لیکن جب میری نظر لوگوں کے بے پناہ ہجوم پر پڑی جن میں زیادہ تر غریب اور نحیف تھے مجھے اپنی تشویش بھول گئی۔ بلوچستان ایک غربت زدہ اور بہت ہی پسماندہ صوبہ تھا اور ہے۔ قبائلی سردار کسی بھی ایسے ترقی یافتہ اقدام کی مخالفت کرتے ہیں جن سے لوگوں پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے۔ میرے والد کے دور تک، وہاں گندے راستے تھے اور بلوچستان میں سڑکیں ناپید تھیں۔ بجلی نہیں تھی تازہ پینے کا پانی دستیاب نہیں تھا۔ محدود تعداد میں غیر کاشت شدہ صحرائی سرزمین میں فصلیں اگتی تھیں...... کئی نسلوں سے لوگ مشکلات کا شکار تھے۔ میں پہلی مرتبہ بلوچستان میں اپنی والدہ کے ساتھ آئی تھی جب انہیں عورتوں اور بچوں نے محصور کر لیا تھا اور وہ کسی درخت کے سائے کی تلاش میں تھیں۔ ان کے حفاظتی گارڈوں نے اس ہجوم کو پرے

ہٹانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے گارڈوں کو منع کر دیا اور عورتوں کو اپنے قریب آنے دیا۔ حیرت میں وہ میری والدہ کے بالوں کو چھوتیں جو ہموار اور صاف ستھرے تھے۔ جب کہ ان کے اپنے سروں کے بال الجھے ہوئے اور گندے تھے۔ انہیں بالکل معلوم نہیں تھا کہ کنگھی کیا ہوتی ہے۔ میرے والد کی حکومت نے بلوچستان کے لوگوں کی حالت ٹھیک کرنے میں زبردست کردار ادا کیا تھا باوجود اس کے کہ قبائلی سرداروں نے پی پی پی کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔

"پاکستان پیپلز پارٹی کو یقین ہے کہ لوگوں کی خوشحالی میں ملک کی خوشحالی ہے" میں نے آہستہ آہستہ گھومتے ہوئے سٹیج سے تقریر شروع کی۔ "اگر عام آدمی کو کام کی ضمانت ہو اگر اس کی صحت کے عوامل اسے دستیاب ہوں اگر اس کے بچوں کو مناسب تعلیم مل سکے اور وہ خوشحال ہوں تو ملک بھی خوش حال ہو گا۔ یہ خدائی قانون نہیں کہ ہمارے لوگ غربت کی زندگی گزاریں۔ ہماری قوم کا وقار گندے محلوں کی وجہ سے نہیں اگر ہم اپنے ملک کے وسائل کے صحیح استعمال سے لوگوں کی حالت بدل سکتے ہیں تو ہم ایسا ضرور کریں گے"۔ سامعین میں سے کچھ لوگ اٹھے اور انہوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں اور ان میں اگلی صف میں بیٹھے ہوئے تین افغانی بھی شامل تھے۔ میرے حفاظتی گارڈوں نے چین کا سانس لیا۔

خطرہ ٹل گیا تھا ۔

خطرہ ٹلا نہیں تھا۔ باقی ملک میں ابھی شروع ہوا تھا۔ ۳۰ر مئی کو یعنی دو ہفتوں سے کم عرصے میں جب میں واپس کراچی پہنچی، پولیس حیدر آباد میں نوجوانوں کے ایک ہوسٹل میں داخل ہوئی اور فقیر اقبال حسبانی کو قتل کر دیا وہ سندھ سٹوڈنٹ پیپلز فیڈریشن کا صدر اور تمام صوبے کے حفاظتی گارڈوں کا سالار تھا۔ اس کا ساتھی اور پی پی پی کارکن جہانگیر پٹھان

اس حملہ میں مستقل طور پر مفلوج ہو گیا۔ پولیس کے سپاہیوں کی گولیوں نے اس کی ریڑھ کی ہڈی کے ٹکڑے کر دیئے۔

جب صبح سویرے دوست محمد نے مجھے جگا کر اقبال حسبانی کے قتل کی خبر سنائی تو مجھے ایسے لگا کہ جیسے میرا اپنا خون بہہ رہا تھا۔ بازوؤں پر مزید سیاہ پٹیاں، مزید سیاہ سر کی پٹیاں، سیاہ دوپٹے اور سیاہ جھنڈے، ایک نوجوان کا جنازہ جسے میں نے اپنی زندگی کی حفاظت کا فریضہ پورے اعتماد سے سونپا ہوا تھا۔ ایک والدہ سے تعزیتی ملاقات جس کا اکیلا بیٹا اس سے بچھڑ گیا تھا۔ اس نے وہ دعا جو اپنے بیٹے کے لئے لکھی تھی میرے حوالے کر دی تاکہ خدا اس کے اس بیٹے کا نعم البدل عطا کر دے جو حیدر آباد میں میرے جلوس کے ہنگامے میں گم ہو گیا تھا۔ تم رکھ لو، اس کی ماں نے مجھے کہا "یہ تمہیں اقبال کی طرف سے تحفہ ہے" میں اپنے دستی بیگ میں اب بھی یہ دعا اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔ اور کتنے نیک لوگ حکومت کے ہاتھوں سے مارے جائیں گے۔

اقبال حسبانی کے قتل پر پورے پاکستان میں پر امن احتجاجی مظاہرے ہوئے، لیکن حکومت کے تشدد کے عزم میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ کاشمور میں ایک احتجاجی جلسے میں ضیاء کی صوبائی اسمبلی کے ایک رکن نے مجمع کو منتشر کرنے کے لئے ہجوم پر کلاشن کوف سے گولی چلا دی۔ خوش قسمتی سے کوئی شخص بھی نہ مارا گیا، لیکن اس سے حکومت کی نئی اور خطرناک ہدایات کا اشارہ ملا۔ اپنے علاقے کو گولیوں سے قابو کرو۔ زخموں اور موت سے قابو کرو، ہر قیمت پر قابو کرو۔ چند ہفتوں میں پی پی پی کے دو مزید ارکان مارے گئے۔ ٹنڈو آدم کے ایک پارٹی رکن اور ڈوکری پی پی پی کے صدر کو گولی مار دی گئی۔ پہلے قتل کی ذمہ داری ضیاء کی صوبائی اسمبلی کے ایک رکن پر تھی جب کہ دوسرے قتل کا ذمہ دار ایک پولیس انسپکٹر تھا جس نے غیر لائسنس یافتہ خود کار ہتھیار استعمال کیا۔ "سندھ کابینہ کے ایک وزیر نے پی پی پی کے کتوں کو مارنے کی کھلی چھٹی دی ہے" انسپکٹر ایک چائے کی دکان پر مقامی باشندوں سے کہتا ہوا سنا گیا۔ حکومت اب چھوٹے سیاستدانوں اور ماتحتوں کو یہی گندا کام کرنے کے لئے اکسا رہی تھی۔

ہم حکومت سے تصادم کے راستے پر رواں تھے۔ ہم جانتے تھے۔ اور وہ بھی جانتے تھے۔ کوئی پالیسی ساز فیصلے نہیں ہو رہے تھے حکومت کی تمام قوتیں پی پی پی کی کارکردگی پر مرکوز تھیں۔ جب حکومت نے جون میں اپنا بجٹ پیش کیا تو ہم نے مقابلے میں پیپلز بجٹ پیش کیا۔ جب انہوں نے خیال کیا کہ ماہ رمضان کے اختتام پر ہم سندھ میں ایک تحریک کا آغاز کرنے والے ہیں تو انہوں نے صوبے میں ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا۔ جب درحقیقت ہم نے ایسا کچھ نہ کیا تو انہوں نے ہنگامی حالت کو ملتوی کر دیا۔ چونکہ حکومت پٹڑی سے اتر چکی تھی تو مناسب وقت تھا کہ موسم خزاں میں ضیاء کو انتخابات منعقد کرنے پر مجبور کرنے کے لئے ہم اپنی مہم کا دوسرا مرحلہ شروع کریں۔

۵ر جولائی ۱۹۸۶:۔

تختہ الٹنے کی سازش کی نویں برسی، ہم اسے سیاہ دن کہتے ہیں اس روز ہم نے چین کے درہ خنجراب سے بحیرہ عرب تک پاکستان کے تمام ضلعی صدر مقاموں میں عوامی جلسوں کے انعقاد کی سکیم تیار کی۔ ابھی کسی کو یہ تجربہ نہیں تھا کہ پی پی پی کی سیاسی تنظیم اتنی مضبوط تھی کہ بیک وقت سیاسی مظاہروں میں رابطہ قائم رکھ سکے گی۔ ”سیاہ دن“ کے مظاہرے ایک قسم کی ریہرسل تھی یہ دیکھنے کے لئے کہ مقامی اور علاقائی پارٹی کے عہدہ دار کس قدر وسیع پیمانے پر شہری احتجاجات منظم کرنے کے قابل تھے تاکہ ہم حکومت کو جلد انتخابات پر مجبور کرنے کے لئے موسم خزاں میں مظاہروں کا آغاز کر سکیں۔ موسم خزاں کے مظاہروں کو موثر بنانے کے لئے، ہمیں ایک لاکھ ”جمہوریت کی فاختائیں“ بھرتی کرنے کی ضرورت تھی یعنی پی پی پی کے وہ ہمدرد اور جیالے جو بھوک ہڑتالوں اور دھرنا مار کر بیٹھنے کے ذریعے گرفتاریاں دینے پر رضامند ہوں۔ قبل ازیں اس سلسلہ میں ہر تفصیل کو جانچ لینا ضروری تھا...... جیسے ہی ۵ر جولائی قریب آتی گئی میں نے انتظامی تفصیلات طے کرنے کے لئے تمام ملک کا وسیع دورہ کیا اور ”سیاہ دن“ انتہائی موثر طریقے سے منایا گیا۔ پی پی پی کے ایک لاکھ پچاس ہزار حامی کراچی میں باہر نکلے جب کہ لاہور میں دو لاکھ سے زیادہ تھے۔

۱۴ر اگست پاکستان کے یوم آزادی کی سالگرہ، کیلنڈر پر اگلی اہم تاریخ تھی۔ میرے دورہ پاکستان کے دوران پی پی پی کی وسیع پیمانے پر عوامی حمایت سے مجروح ہو کر ضیاء کے مرغ دست آموز وزیراعظم محمد خان جونیجو نے اعلان کیا کہ حکومت کی سرکاری مسلم لیگ ۱۴ر اگست کو لاہور میں مینار پاکستان پر ایک جلسہ منعقد کرے گی۔ جیسے ہی جونیجو نے اپنے عزائم کا اظہار کیا، ہم نے اعلان کر دیا کہ پی پی پی بھی یوم آزادی پر لاہور میں ایک جلسہ منعقد کرے گی یہ جانتے ہوئے کہ عوام الناس کا ہجوم ہمارے جلسے میں زیادہ بڑا ہو گا۔ حکومت نے ہمارے لوگوں کو لاہور آنے سے روکنے کے لئے اور اپنے حمایتیوں کو لانے کی خاطر پنجاب میں تمام بسوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ "حکومت کی بسوں میں جاؤ" ہم نے پی پی پی کے اراکین کو ہدایت کی۔ "جب لاہور پہنچ جاو تو ہمارے جلسے میں آ جاؤ" ایم آر ڈی بھی اس مخاصمت میں شامل ہو گئی۔ پاکستان میں میری واپسی کے بعد پی پی پی کے رہنماؤں اور میں نے تحریک بحالی جمہوریت کے اراکین سے ملاقاتیں کی تھیں اور ۱۹۸۱ء میں طیارے کے اغواء کے بعد سیاسی پارٹیوں کا ایک اتحاد تشکیل دیا تھا اور ہم اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ حکومت پر دوبارہ دباؤ ڈالنے کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ ۱۰ر اگست کو ایم آر ڈی کے ۹ رہنما ۷۰ کلفٹن میں پچھلے تین سال کے عرصہ میں پہلی مرتبہ اپنے معاہدہ کو پکا کرنے کے لئے جمع ہوئے۔ ان میں سے ایک رہنما احرام باندھے ہوئے تشریف لائے کیونکہ حکومت نے انہیں حج پر جاتے ہوئے ایئرپورٹ پر ہی روک لیا تھا۔

دوسری طرف ضیاء ملک سے باہر فرار ہو گیا تھا۔ یوم آزادی کے جلسوں میں اپنی بے عزتی اور مذمت کے خوف سے وہ اپنے کنبے سمیت ۷ر اگست کو سعودی عرب روانہ ہو گیا۔ ایک پی پی پی کے ہمدرد نے ایئرپورٹ پر خاموشی سے بتایا کہ ضیاء نے کارگو جہاز کے ذریعے فرنیچر کے تین بڑے بڑے صندوق اور سونے کی ملمع کی ہوئی رولز رائس کار جو اسے ایک عرب ریاست کے سربراہ نے بطور صدر پاکستان عطا کی تھی ملک سے باہر بھجوا دی تھی۔

ایک بار پھر وقت بہت نازک تھا۔ ہمارے مشترکہ اجلاس کے بعد، ایم آر ڈی کے راہنماؤں اور میں نے قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے انتخابات کے انعقاد کے لئے

مشترکہ احتجاجی جلسے منظم کرنے کے لائحہ عمل پر اتفاق کر لیا۔ اگلے روز ایم آر ڈی نے اعلان کیا کہ پی پی پی اور دوسرے مخالف گروہ کراچی اور لاہور میں یوم آزادی کے موقع پر مشترکہ ریلیاں منعقد کریں گے اور ضیاء پر زور دیا کہ ۲۰ر ستمبر تک انتخابات کی تاریخ کا اعلان کرے۔ اس مرتبہ یہ جونیجو تھا جس کے اوسان خطا ہو گئے۔

میں ۱۲ر اگست کو متعدد صحافیوں اور پارٹی کارکنوں کے ساتھ ملاقات میں مصروف تھی جب مجھے بتایا گیا کہ جونیجو ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ایک غیر متوقع اعلان کرنے والا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ جونیجو نے مسلم لیگ اور حزب مخالف کے حمایتیوں میں ممکنہ تصادم کے پیش نظر اعلان کیا کہ وہ مسلم لیگ کے یوم آزادی پر منعقد ہونے والے جلسے کو منسوخ کرتا ہے۔ اس نے مخالف پارٹیوں سے اپنے جلسے منسوخ کرنے کی اپیل کی۔ عوامی جلسوں کے انعقاد کو ممنوعہ قرار دینے کے لئے کوئی انتظامی حکم جاری نہ کیا گیا۔

جونیجو کی اپنے آپ کو شرمندگی سے بچانے کی کوشش پر مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ مگر ہمیں تشدد پر ابھارنے کی اس کی کوشش پر غصہ ضرور آیا۔ حکومت ہمارے عوامی جلسوں اور جلوسوں میں مستقلاً تشدد پر اکسانے کی کوشش کرتی رہی حالانکہ ہم سیاسی ذرائع سے پر امن تبدیلی لانے کے اپنے عزم پر بدستور قائم رہے۔ میرے رضا کار حفاظتی گارڈ اپنے اسلحہ کے بغیر اپنا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ لیکن ضیاء کے کٹھ پتلی وزیر نے سیاسی اظہار خیالات کو ممنوعہ قرار دینے کے لئے کوئی بہانہ تراشنا تھا جب کہ مارشل لاء کو اٹھائے ہوئے پورے آٹھ ماہ ہو گئے تھے۔ وہ حکومت کے گھناؤنے چہرے سے پردہ اٹھانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ جونیجو کچھ عرصہ قبل ہی ریاستہائے امریکہ کے دورے سے واپس آیا تھا جہاں صدر ریگن نے "جمہوریت کی سمت اہم اقدام اٹھانے کی کوشش پر" پاکستان کی بہت تعریف کی تھی۔ جونیجو نے ٹائم میگزین سے انٹرویو میں لاف زنی کی تھی کہ اس نے پاکستان میں مارشل لاء اٹھائے جانے اور جمہوریت کے قیام ایسے مسائل کو حل کر دیا ہے۔

"اب انتخابات کی کیا ضرورت باقی رہ گئی ہے؟" ہم نے یہ کام کر لیا ہے اس نے یہ دعویٰ کیا جب ہم نے جونیجو کو اپنے جلسہ عام کو منسوخ کرنے کا اعلان کرتے ہوئے سنا تو میں

نے اپنے دفتر میں جمع پارٹی کارکنوں سے کہا "یہ ہماری بہت بڑی فتح ہے۔" "جونیجو جمہوری وزیراعظم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اسے کہاں عوامی تائید حاصل ہے؟ اس نے اپنا جلسہ یہ جانتے ہوئے منسوخ کیا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ پی پی پی کے سامنے اس کا چراغ نہیں جل سکتا۔ حکومت میدان سے بھاگ گئی ہے"۔

"اب ہمیں ۱۴ر اگست کے مظاہروں کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں رہی" ایک شخص نے کہا۔ "ہم پہلے ہی جیت چکے ہیں"۔

"نہیں ہمیں آگے بڑھنا چاہئے" ایک اور شخص نے کہا "ہم کیوں نہ ۱۵ر کو جلسہ عام کریں"۔

"۱۵ر کو ہندوستان کا یوم آزادی ہے"۔

"پھر ۱۶ر تاریخ ٹھیک رہے گی"۔

"میں کل پی پی پی کے جلسہ عام کے لئے فیصل آباد جارہی ہوں" میں نے انہیں بتایا "ہم وہیں فیصلہ کریں گے"۔

میں ۷۰ - کلفٹن کے اس معمول کے اجلاس سے سیدھی ایم آر ڈی کے طلب کردہ ہنگامی اجلاس میں شرکت کے لئے چلی گئی۔ وہاں کی فضا بالکل مختلف تھی۔ ایم آر ڈی کے رہنما میری اس رائے پر بہت ناراض تھے کہ میں مظاہروں کے پروگرام کو دوبارہ طے کرنے کے لئے پی پی پی کے دوسرے راہنماؤں سے مشورہ کروں گی۔ "آپ سیاست کے متعلق کچھ نہیں جانتی ہیں"۔ انہوں نے کہا "ہمیں یوم آزادی پر مظاہروں کے پروگرام پر عمل کرنا چاہئے یہی وقت ہے، ہم اب پیچھے نہیں ہٹ سکتے"۔ میں نے احتجاج کیا۔ مجھے علم تھا کہ پی پی پی ابھی کھل کر مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے "یوم سیاہ" پر بھاری جلسوں کا اہتمام کیا تھا اور اتنی جلدی میدان میں آنے کے لئے مناسب تنظیم اور وقت درکار تھا۔ زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ہماری چال حکومت سے کسی سیدھے تصادم کی نہیں تھی بلکہ ہم سیاسی مظاہروں کی رفتار کو آہستہ آہستہ تیز کر کے حکومت کا دبدبہ کمزور کرنا چاہتے تھے۔ ہڑتالوں اور دھرنا مار کر بیٹھنے سے حکومت کے مفلوج ہونے کے مواقع

زیادہ تھے کیونکہ اس طرح کاروبار متاثر ہوتا تھا، اقتصادیات پر اثر پڑتا تھا پورے ملک کی زندگی میں ہلچل پیدا کر کے حکومت کے خلاف بے اطمینانی کی لہر موجزن ہو جاتی۔ اس مرحلے پر حکومت سے تصادم کا الٹا اثر پیدا ہوتا۔ پارٹی رہنما غالباً گرفتار کر لئے جائیں گے۔ بہت سے پارٹی کے ہمدرد بھی گرفتار ہو جائیں گے اور ہماری تحریک کا زور ٹوٹ جائے گا۔

"ہمیں آگے بڑھنا چاہئے" ایم آر ڈی کے راہنماؤں نے کہا۔

میں مخمصے میں پڑ گئی۔ یا تو ایم آر ڈی اور پی پی پی کا اشتراک ختم ہو جائے گا اور یا مجھے ان کی بات ماننا پڑے گی۔ متفقہ فیصلہ یہی تھا کہ ہمیں مظاہروں میں حصہ لینا چاہئے۔ ۹ میں سے صرف میں اکیلی متفق نہیں تھی۔ "ٹھیک ہے ہم آگے بڑھیں گے" میں نے چارو ناچار کہا۔ "لیکن خدا کے لئے آج شب اپنے منصوبے کا اعلان نہ کریں۔ کم از کم کل تک انتظار کر لیں" مجھے اپنے پارٹی راہنماؤں کو زیر زمین چلے جانے کا مشورہ دینے کے لئے چند گھنٹوں کے وقفے کی ضرورت تھی۔ اگر ہم سب گرفتار کر لئے گئے تو موسم خزاں کے ہمارے منصوبے ملیامیٹ ہو جائیں گے۔ تاہم ایم آر ڈی نے اعلان جاری کر دیا۔

۱۳، اگست ۱۹۸۶ء

میں اپنے پروگرام کے مطابق فیصل آباد پی پی پی کے ایک جلسہ میں شرکت کے لئے ائرپورٹ جاتی ہوں۔ پولیس کے سپاہی مجھے گیٹ پر ملتے ہیں۔ "ہمیں تمہارے پنجاب بدری کے احکام موصول ہو چکے ہیں اگر پھر بھی جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ" وہ مجھے بتاتے ہیں۔ وہ نئی چال چل رہے ہیں، میں نے خیال کیا تاکہ اس طرح وہ مجھے جانے پر اشتعال دلائیں اور وہ دعویٰ کر سکیں کہ احکامات کے باوجود میں نے خلاف ورزی کی اور مصیبت کھڑی کر دی۔ میں جلدی سے پی پی پی کے ائرپورٹ پر موجود کارکنوں سے مشورہ کرتی ہوں۔ چونکہ ۷۰ کلفٹن کو واپسی کی صورت میں مجھے اپنی گرفتاری کی توقع تھی تو میں اپنے ساتھیوں کو آخری ہدایات دیتی ہوں کہ میری گرفتاری کی صورت میں وہ ملک بھر میں پارٹی کے سرگرم کارکنوں سے رابطہ قائم کریں۔
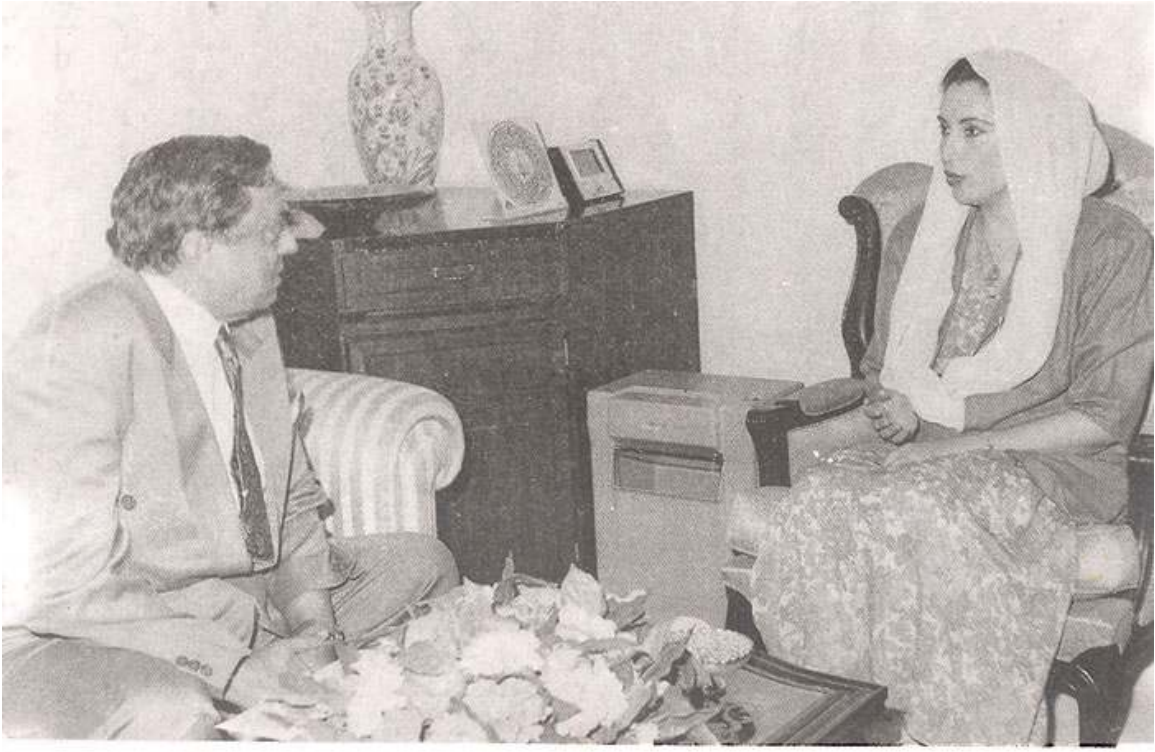
سابق گورنر پنجاب چوہدری الطاف حسین مرحوم کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے ہمراہ ایک یادگار تصویر

جب میں ۷۰ – کلفٹن واپس پہنچتی ہوں تو وہاں کوئی پولیس نہیں ہے۔ ایک اور طرفہ تماشا، لیکن ریڈیو انڈیا غلطی سے میری گرفتاری کی خبر نشر کر دیتا ہے۔ اور ٹیلی فون آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ میری حراست کے خلاف لیاری میں فسادات بھڑک اٹھتے ہیں۔ فیصل آباد میں ائرپورٹ پر میرے استقبال کے لئے آئے ہوئے لوگوں پر لاٹھی چارج کیا جاتا ہے اور اشک آور گیس پھینکی جاتی ہے۔ یہ تھے "جمہوریت کے لئے حکومت کے بڑے بڑے اقدامات" میں پولیس کا انتظار کرتی ہوں مگر کوئی نہیں آتا۔ دریں اثنا پی پی پی اور ایم آر ڈی کا ہر دوسرا رہنما زیر حراست لے لیا جاتا ہے۔ پہلی مرتبہ وہ تمام اندر ہیں اور میں باہر ہوں۔ حکومت مجھے چھوئے بغیر پارٹی کو مفلوج کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ میں فیصلہ کرتی ہوں اور عالمی رسوائی سے بچتی ہوں خصوصاً ریاستہائے متحدہ امریکہ سے جہاں نئے پیکج (امدادی معاہدہ) پر موسم خزاں میں ووٹ ڈالے جائیں گے۔ میرے لئے یہی بہتر تھا کیونکہ میری صوبہ بدری کی وجہ سے حکومت سے براہ راست تصادم کا موقع ٹل جائے گا اور ہم مناسب وقت پر یہ تصادم اختیار کریں گے۔

۷۰ – کلفٹن پر اخباری نمائندے ہلہ بول دیتے ہیں۔ ٹائم میگزین کا راس منرو، بی بی سی ٹیلی ویژن کا کیمرہ مین، اسی طرح لائف میگزین کی این فیڈی مین جو ریڈ کلف میں میری دوست تھی اور اپنی فوٹو گرافر میری ایلین مارک کے ساتھ کراچی آئی ہوئی تھی تاکہ پاکستان میری واپسی پر ایک رپورٹ ارسال کر سکے۔ جنگ اور ڈان کے پرانے مشہور صحافی محمود شام اور حضور شاہ، سہ پہر تک تقریباً ایک ہزار پی پی پی اور ایم آر ڈی کے رہنما اور کارکن زیر حراست لئے جا چکے تھے لیکن مجھے چھوڑ دیا گیا تھا۔

کراچی پریس کلب سے ایک رپورٹر آکر بتاتا ہے۔ "اس نے ابھی ابھی ایک مخالف حکومت رہنما سے سنا ہے کہ کل کو کراچی میں ایم آر ڈی کا جلسہ پروگرام کے مطابق منعقد ہو گا اور یہ کہ میں اس میں شامل ہوں گی۔ میں متحیر ہو جاتی ہوں۔ کسی نے منصوبے میں تبدیلی کے بارے میں مجھ سے مشورہ نہیں کیا ہے۔ لیکن خبر پھیل جاتی ہے اس شب بی بی سی اپنے ایک نشریئے میں تین بار اعلان کرتی ہے کہ میں ۱۴ر اگست کو کراچی میں ایم آر ڈی کے

جلسہ میں جارہی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ حکومت کی طرف سے یا ایم آر ڈی کی وجہ سے کسی اشتعال زدہ صورت حالات میں پھنس جاؤں۔ لیکن اب میں کیا کر سکتی ہوں؟ اگر میں اب جلسے میں شمولیت اختیار نہیں کرتی تو ہمارے مخالف دعوی کر سکیں گے کہ میں حوصلہ ہار گئی ہوں۔ میں پارٹی کے ایک دو چھوٹے عہدہ داروں کے ذریعے پیغام پہنچاتی ہوں کہ ہر اس کارکن کو جو پولیس کی گرفتاری سے بچ نکلا ہو کہہ دیں کہ صبح سویرے ۷۰ - کلفٹن میں آجائے تاکہ ہم سب ایک جلوس کی شکل میں جلسہ گاہ تک جائیں۔

۱۴ر اگست ۱۹۸۶ء پاکستان کا یوم آزادی

"جیئے بھٹو! میری بہن، تیری بہن، بے نظیر!" صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں ۷۰ - کلفٹن کی دیواروں کے باہر سیاسی نعروں کی آوازیں سن رہی ہوں۔ ہزاروں پی پی پی کے حامی گھر کے سامنے جمع ہوگئے جن کو پارٹی ارکان اور بی بی سی کے نشریوں نے ایم آر ڈی کی ریلی میں میری حاضری کی خبر دیدی تھی۔ ایک پیغام ملتا ہے جس میں میری گرفتاری ابھی تک نہ کرنے کی وجوہات درج ہیں۔ خود کسی فیصلے پر نہ پہنچ پانے کی بنا پر، ایک رات قبل ایم آر ڈی کے اعلان کے بعد، حکومت نے ضیاء کو سعودی عرب میں میرے متعلق حتمی فیصلے کے بارے میں پوچھنے کے لئے ٹیلیکس سے پیغام دیا۔ اس کا جواب صبح ۹ بجے تک نہیں پہنچا تھا۔ آخر ضیاء نے بذریعہ ٹیلیکس جواب بھیجا "اسے گرفتار کر لو" لیکن اب پولیس گرفتاری کی جرات نہیں کرتی۔ "پی پی پی کے وہ تمام حمایتی جو ۷۰ کلفٹن کے باہر کھڑے تھے، میرا بھرکس نکال دیتے" ایک پولیس کے سپاہی نے مجھے بعد میں بتایا۔ پولیس ہجوم پر گولی چلانے سے ہچکچاہٹ کا اظہار کرتی ہے اور ۷۰ کلفٹن کے نواح میں فساد پھیلانا نہیں چاہتی۔ کلفٹن کے رقبے میں بہت سے سفارت کاروں کی رہائش گاہیں بھی ہیں اور پولیس نہیں چاہتی کہ بپھرے ہوئے ہجوم سفارت خانوں کو جلا کر اپنی آتش انتقام بجھائیں۔

پولیس کو میری موجودگی کا اتا پتہ بھی نہیں ہے۔ میری دوست پوتشی نے رات ۷۰ - کلفٹن میں گزاری تھی۔ وہ صبح سویرے کار میں روانہ ہو گئی تھی اور پولیس والوں کے خفیہ

ایجنٹ سمجھتے رہے کہ وہ شاید میں ہی تھی۔ افواہ پھیل گئی کہ میں چکمہ دے کر فیصل آباد پرواز کر گئی ہوں اگرچہ میرے سفر پر پابندی عائد تھی۔ انہیں کوئی خبر نہیں کہ میں گھر پر ہی ہوں۔ تاہم کچھ دیر بعد وہ پتہ چلا لیتے ہیں۔

"آپ کس وقت روانہ ہو رہی ہیں؟" ایم آر ڈی کا ایک نمائندہ مجھے پوچھتا ہے۔

"ہم ۲ بجے یہاں سے روانہ ہوں گے" میں اسے بتاتی ہوں۔ کچھ دیر ہی بعد مجھے خبر ملتی ہے کہ پولیس مجھے ۲ بجے گرفتار کرنے کے لئے آ رہی ہے۔ اگرچہ اس کا کوئی سبب نہیں۔ سیکرٹری داخلہ نے ریلی پر کسی پابندی کا اعلان نہیں کیا تھا۔

ہم ایک بجے روانہ ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں اور صحافی حضرات اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ہارورڈ میں، مجھے تاسف سے وہ دن یاد آتے ہیں میں کبھی کبھی لائف میگزین میں ایک کالم پڑھا کرتی تھی۔ "لائف فلموں کی طرف جاتا ہے" اب لائف میرے پاکستانی پولیس سے تصادم اور میری گرفتاری کی طرف جا رہا ہے۔ مجھے این فیڈی مین اور راس منرو، نئی دہلی میں ٹائم میگزین کے بیورو چیف کے بارے میں تشویش ہے جو برصغیر کی سیاسیات کا علم رکھتا ہے۔ کسی کو خبر نہیں کہ کیا ہونے والا ہے جب ہم ۷۰ - کلفٹن سے روانہ ہوتے ہیں۔

گھر کے دروازے پر تلاوت کرتی ہوں "قل ھو اللہ احد" این فیڈی مین، راس منرو، بی بی سی کا کیمرہ مین، پی پی پی کے چند اراکین اور میری دوست پوتشی ایک پجیرو جیپ میں سوار ہو جاتے ہیں۔ میں اپنی گاڑی میں سوار ہو جاتی ہوں جسے سیاسی پرچیوں سے سجایا گیا ہے۔ اس میں عوام کو خطاب کرنے کے لئے مائیکروفون اور لاوڈ سپیکر ہے، پی پی پی کے گیتوں کے کیسٹ ہیں اور بونٹ پر پی پی پی کے پرچم لہرا رہے ہیں۔ سمیعہ، کچھ سیاسی کارکن اور فوٹو گرافر میری ایلین مارک میرے ساتھ سفر پر گامزن ہیں۔ جیسے ہی گھر کے دروازے کھلتے ہیں میں عقبی نشست پر کھلی جیپ میں کھڑی ہو جاتی ہوں۔ "ماریں گے، مر جائیں گے، بے نظیر کو لائیں گے" ہجوم بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔ اور پجیرو کے گرد جمع ہو جاتا ہے۔ میرا گارڈ آف آنر پانچ ہزار افراد کا پجیرو کے گرد اجتماع ہے۔

دھوش ـــــ پولیس اشک آور گیس کا پہلا حملہ ہم پر مڈ ایسٹ ہسپتال کے نزدیک کرتی

ہے یہ ۳۰۰۰ اشک آور گیس کے گولوں میں سے پہلا گولا تھا جو اس روز کراچی میں عوام الناس پر پھینکے گئے۔ ۳۰۰ گولے تو صرف اس سڑک پر پھینکے گئے جو کلفٹن کی طرف جاتی ہے۔ دوسرا سلسلہ اس گول چکر کے قریب شروع ہوتا ہے جہاں پولیس مجھے گھر پر گرفتاری کے لئے جاتے ہوئے ہجوم میں پھنس کر رہ گئی۔ پولیس پجیرو تک پہنچنے کے لئے ہجوم پر اشک آور گیس کے گولے برسا کر راستہ بنانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ پجیرو میں بیٹھے ہوئے کسی ساتھی نے مجھے نیچے کھینچ کر اوپر کی چھت بند کر دی کیونکہ ہم لوگ بری طرح کھانستے ہیں اور گھٹن محسوس کرتے ہیں۔ ہم نمک اور لیموں اپنی زبانوں پر رکھتے ہیں اور اپنے چہرے گیلے تولیوں سے ڈھانپ لیتے ہیں جو ہم اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ میں دوسری گاڑی میں بیٹھے ہوئے پی پی پی کے کارکنوں اور صحافیوں کے لئے متفکر ہوں۔

این فیڈی مین

ہم کھڑکیوں میں سے بمشکل باہر دیکھ سکتے تھے، اشک آور گیس کے بادل اس قدر دبیز تھے۔ کہ ہم نے پجیرو کی چھت کو بند کرنے کی کوشش کی جیسے ہی ہماری گاڑی گیس کے دھوئیں سے بھر گئی مگر چھت آدھی لٹکتی رہ گئی۔ جب بالآخر ہم چھت کو بند کرنے میں کامیاب ہوئے تو ہجوم کے پجیرو پر ہلہ بولنے کی وجہ سے حالت اور بھی گھمبیر ہو گئی کیونکہ ہر شخص چھت کے کناروں میں سے اپنے ہاتھ سے بے نظیر کے قریب بیٹھے لوگوں کو چھونے کی کوشش کرتا تھا۔ ہم اس اشک آور گیس میں گاڑی میں مقفل ہو گئے تھے جو امریکی کمپنی سمتھ اینڈ ولسن کی بنائی ہوئی تھی۔

راس اشک آور گیس کا مزا پہلے بھی چکھ چکا تھا اور اس کا علاج بھی جانتا تھا۔ ہم نے ہتھیلیوں پر پانی رکھ کر اپنی آنکھوں کو گیلا کیا اور گیلے رومال سے ایک دوسرے کے چہرے کو ڈھانپا۔ لیکن طبیعت پھر بھی منغض ہوئی۔ پوتشی جو دمہ کا شکار تھی خوش قسمت تھی کہ اشک آور گیس کے حملے سے قبل ہی پجیرو سے اتر گئی تھی اور اپنے گھر چلی گئی تھی۔ لیکن باقی سب کو ہفتوں تک اشک آور گیس کے مضر اثرات سے پالا پڑا رہا۔ جب میں آرام کے

لئے گھر پہنچی تو مجھے انجکشن لگوانے پڑے جو ڈاکٹر کے خیال میں سانس بحال کرنے کے لئے ضروری تھے۔ میں خوش قسمت تھی۔ بشیر ریاض...... مجھے بعد میں بتایا گیا طویل عرصے تک بیماری میں مبتلا رہا۔

عوام، پولیس اور آنسو گیس کے بحران میں پجیرو کے ڈرائیور پولیس کو الجھانے کے لئے گول چکر سے دو مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔ ہم سب ہی عقبی سڑکوں کا رخ کرنے کے بعد لیاری میں (جہاں کراچی کا غریب ترین طبقہ رہائش پذیر ہے اور جو پی پی پی کا مضبوط قلعہ ہے) ایم آر ڈی کے جلسہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ہر مرتبہ جب پولیس والے بسوں، ٹرکوں اور کاروں کے ہمارے طویل جلوس کی نشان دہی کر لیتے ہیں تو وہ ریڈیو پر آگے اطلاع کر دیتے ہیں۔ اور ہمارے سامنے سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ ہم دوسری پجیرو کو ساتھ لے کر محمد علی جناح کے مزار پر جانے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ہم پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کے خطرناک کھیل میں مصروف ہیں۔ ہم پھر لیاری کا رخ کرتے ہیں۔ اچانک ایک پہیئے کے ٹائر میں سے ہوا نکل جاتی ہے۔ جیک نکال کر لگانے کا وقت نہیں ہے۔ لوگ خود ہی پجیرو کو اس طرف سے اونچا اٹھا لیتے ہیں اور دوسرا ٹائر لگا دیا جاتا ہے۔ پولیس ہم تک پہنچنے والی ہوتی ہے کہ ہم پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔

باب ۱۴

راس منرو

ہمارے موٹروں کے جلوس کے گرد دس ہزار لوگوں کا بپھرا ہوا ہجوم چل رہا تھا جب ہم لیاری کے وسیع عوامی میدان چاکیواڑہ چوک میں پہنچے تھے۔ بے نظیر نے کم از کم اپنی منزل تک پہنچ کر اور چند منٹ تقریر کر کے علامتی فتح حاصل کر لی تھی۔ "تم سب میرے بھائی اور بہنیں ہو" اس نے اپنے مائیکرو فون اور لاؤڈ سپیکر سے بلند چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ "ضیاء کو جانا ہو گا" یہ یوم آزادی ایک مذاق بن کر رہ گیا ہے، اس نے کہا. کیونکہ پاکستانیوں کو اپنی مرضی کے اظہار کیلئے کوئی سیاسی آزادی نہیں ہے۔ دو سو گز پرے جب وہ تقریر کر رہی تھی ایک جلتی ہوئی بس میں دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔

این فیڈی مین

میں نے پی پی پی کے کسی رکن کو تشدد اختیار کرتے نہیں دیکھا۔ تمام تشدد پولیس والے ہی کر رہے تھے جو ہجوم کو منتشر کرنے کیلئے ان پر لاٹھیاں برسا رہے تھے۔ نوجوان لاٹھیوں کے وار سے بچنے کیلئے اپنے بازو اوپر کو اٹھائے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے بے نظیر کی پجیرو کو دیکھا تو وہ گاڑی کی کھڑکیوں تک بمشکل پہنچ کر اپنے خونیں بازوؤں کو لہراتے کہ بے نظیر کو پتہ چلے وہ اس کیلئے ہر قربانی دینے کو تیار ہیں۔ میں نے اچانک بی بی سی کے کراچی نامہ نگار

اقبال جعفری کو ہجوم کے ایک سرے پر دوڑتے ہوئے دیکھا۔ "یہاں اس قدر تشدد کیا جارہا ہے" وہ پکارا۔ "میں نے ابھی ابھی دس سالہ بچے کو دیکھا جسے پولیس کے سپاہی زمین پر لٹاکر لاٹھیاں برسا رہے تھے کیونکہ اس نے پی پی پی کی ایک پرچی قمیض پر لٹکا رکھی تھی" پولیس مزید اشک آور گیس لیاری میں لے آئی جب انہوں نے بے نظیر کو دیکھ لیا۔

"نیچے جھک جاؤ، نیچے جھک جاؤ" مجھے کسی کی آواز سنائی دیتی ہے اور کوئی مجھے پجیرو کے اندر نیچے کو کھینچتا ہے جب کہ اشک آور گیس کا گولہ قریب ہی پھٹتا ہے۔ یہ تو ایسے ہی تھا جیسے قذافی سٹیڈیم میں میری والدہ اور مجھ پر حملہ کیا گیا تھا۔ پولیس اشک آور گیس کے گولوں کو ہجوم منتشر کرنے کیلئے نہیں بلکہ قاتل ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ پولیس کی گاڑیاں جمع ہو رہی ہیں۔ "ہم اپنی پارٹی رہنما کو یہاں گرفتار ہونے نہیں دیں گے" پی پی پی کا ایک سرگرم رکن چلاتا ہے۔ ہر جگہ سے پکار اٹھتی ہے "پولیس کو روکو، پولیس کو روکو"۔

رکاوٹیں توڑ دی جاتی ہیں۔ ٹائروں کو اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں کو آگ لگادی جاتی ہے۔ جب لیاری کی تنگ گلیوں میں سے ہوتے ہوئے واپسی کا رخ کرتے ہیں جب کہ ہماری آنکھیں اور گلے اشک آور گیس سے زخم خوردہ ہیں۔ ہمارا تعاقب کرتی ہوئی پولیس کی کاروں پر لوگ پتھر پھینکتے ہیں۔ "اس طرف سے، اس طرف سے" لوگ ہمیں بندگلیوں سے بچاکر سیدھے راستے پر ڈالتے ہیں۔ جب ہم تھوڑی دیر کیلئے پولیس کی نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں تو ایک ٹیکسی کو روکتے ہیں۔ میں اس میں سوار ہوجاتی ہوں۔ اشک آور گیس اور آتش زنی سے دھوئیں کے بادل ہرطرف اٹھ رہے ہیں۔ لوگوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ پولیس کے سائرن بج رہے ہیں میری پجیرو دوبارہ روانہ ہوجاتی ہے۔ سمیعہ میرا دوپٹہ اوڑھے پولیس کو دھوکا دینے کیلئے اگلی نشست پر بیٹھی ہے۔ ہمارا ٹیکسی ڈرائیور اس قدر خوفزدہ ہے کہ کھلے دروازے کے ساتھ ہی چل پڑتا ہے۔ "کیا جلدی ہے" میں اسے پوچھتی ہوں۔ وہ تنگ گلیوں میں سے تیزی سے گزرتا ہے لیکن ایک پولیس والا اپنی موٹر سائیکل پر ہمارا تعاقب کررہا ہے۔ میں کار میں بیٹھے پی پی پی راہنماؤں سے مشورہ کرتی

ہوں۔ ہمیں پریس کانفرنس کرنی چاہئے لیکن کہاں؟ کئی مختلف جگہوں کی بات ہوتی ہے مگر آخر کار ۷۰ - کلفٹن جانے پر ہی مصر ہوں۔ اگرچہ وہاں پولیس کے ہاتھوں میں خود کو دھکیلنے والی بات ہوگی، میں اپنے گھر میں ہی صحافیوں سے مخاطب ہونا چاہتی ہوں اور اگر گرفتار ہونا ہی ہے تو وہیں سے گرفتار ہونا بہتر ہے۔ لیکن موٹر سائیکل ہمارے تعاقب میں ہے۔ ہمیں اسے دھوکا دینا چاہئے۔ "دائیں مڑ جاؤ" میں اچانک موٹر ڈرائیور کو کہتی ہوں جب ہم میٹروپول ہوٹل کی گلی کے پاس سے گزرتے ہیں۔ وہ گاڑی کو بریک لگاتا ہے اور ہوٹل کے گرد دوسری جانب کو مڑ جاتا ہے۔ موٹر سائیکل والا نظر نہیں آتا۔ جب ہم کلفٹن کے قریب پہنچتے ہیں، وہاں پولیس نے رکاوٹیں کھڑی کی ہوئی ہیں اور ہر طرف پولیس ہی پولیس ہے۔ ڈرائیور گھبرا جاتا ہے اور کار کو پیچھے لے جانے کیلئے گیئر بدلتا ہے۔ "معمول کے مطابق گاڑی چلاتے جاؤ اور اپنی ایک ہی رفتار رکھو" میں اسے کہتی ہوں۔ "پولیس کو پیلی گاڑی کی تلاش نہیں" بے چارہ ڈرائیور کانپ رہا ہوتا ہے جب وہ پولیس والوں میں سے گزرتا ہے۔ میں نے سمیعہ کا دوپٹہ پہنا ہوا ہے اور پولیس والے مجھے نہیں پہچانتے۔ ہم مختصر عرصہ کیلئے ایک پارٹی عہدہ دار کے گھر میں ٹھہرتے ہیں اور اشک آور گیس کے اثرات کو دھوتے ہیں۔

"کیا کرایہ لو گے؟" میں اپنا بٹوہ نکال کر ڈرائیور سے پوچھتی ہوں۔ "میں ٹیکسی ڈرائیور نہیں ہوں یہ میری اپنی کار ہے" وہ کانپتے کانپتے کہتا ہے۔ "تم ٹیکسی ڈرائیور نہیں ہو؟" میں بے یقینی اور حیرت سے پوچھتی ہوں کیونکہ میں اسے بری طرح حکم دیتی رہی۔ "نہیں، میں تو صرف پی پی پی کا ایک حامی ہوں" وہ کہتا ہے۔ وہ کوئی پیسہ لینے سے انکار کر دیتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

صحافی پہلے ہی ۷۰ - کلفٹن پر موجود ہیں جب ہم وہاں پہنچتے ہیں۔ پریس کانفرنس کے دوران پیغام ملتا ہے کہ پولیس آ گئی ہے۔ "ان کو اندر آنے دو" میں کہتی ہوں۔ تین پولیس خواتین سپاہی غیر ملکی پریس کے سامنے ڈرتے ڈرتے کمرے کے اندر داخل ہوتی ہیں اور مجھے ۳۰ روزہ نظر بندی کے احکام پکڑاتی ہیں جن میں مجھ پر غیر قانونی اجتماع کا الزام لگایا

گیا ہے۔

جب میں اپنے کپڑے اور ٹوتھ برش سمیٹ لیتی ہوں تو پولیس کی گاڑیوں کے ایک بڑے قافلے کی نگرانی میں مجھے پولیس سٹیشن لے جایا جاتا ہے اور پیچھے پیچھے پی پی پی کی گاڑیوں کا بھی ایک قافلہ رواں دواں ہوتا ہے۔

پولیس اسٹیشن پر مجھے پتہ چلتا ہے کہ لاہور میں یوم آزادی کی ریلی میں چھ اشخاص مار دیئے گئے اور بیسیوں زخمی ہوگئے۔ ایک مرتبہ پھر حکومت نے اپنے گماشتوں کے ذریعے یہ خوفناک کام انجام دیا تھا۔ ان مردہ اور زخمی لوگوں پر گولی چلانے والے پارلیمینٹ کے حاضر ارکان تھے جنھوں نے کلاشن کوف سے ہجوم پر فائر کر دیا تھا۔ کسی پارلیمانی رکن کو پکڑا گیا اور نہ ہی اسے ملزم ٹھہرایا گیا۔ اور نہ ہی پولیس کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی جس نے ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ پر دھاوا بول دیا اور زخمیوں پر جب وہ ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے اپنی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں۔ ایک مولوی کو بھی نہ بخشا گیا جو مسجد میں ہمارے حمایتیوں کی آنکھوں سے اشک آور گیس کے اثرات دور کر رہا تھا۔ پولیس نے مسجد پر بھی دھاوا بول دیا اور اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ سندھ میں نقصان اور بھی زیادہ ہوا۔ سولہ مارے گئے اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ نہ صرف لیاری میں بلکہ صوبے کے دیہی علاقوں میں بھی پرامن مظاہرین پر پولیس حملہ آور ہوئی۔ صوبہ سرحد میں ضیاء کی افواج نے مظاہرین پر حملہ کر دیا۔ اور صرف اس بات پر کہ انہوں نے یوم آزادی کی سالگرہ پر پرامن ریلیوں میں حصہ لیا تھا۔

مجھے قید تنہائی میں لانڈھی بورسٹل جیل میں رکھا گیا جو دراصل کراچی کے مضافات میں نابالغ بچوں کا قید خانہ ہے۔ پولیس نے اتنی تعداد میں سیاسی قیدیوں کو گرفتار کر لیا تھا کہ میرے لئے کراچی سنٹرل جیل میں کوئی جگہ باقی نہیں بچی تھی۔ میری نظر بندی پر ملک بھر میں شدید احتجاجات ہوئے اور اس قدر بدامنی پھیلی جو ۱۹۸۳ء کی ایم آر ڈی تحریک کے وقت بھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ سندھ میں نہ صرف پولیس تھانوں کو آگ لگادی بلکہ سرکاری دفاتر اور ریلوے اسٹیشن بھی نذر آتش کئے گئے۔ لیاری میں ایک ہفتے تک پی پی پی کے

حامیوں اور پولیس میں بندوقوں اور اشک آور گیس کی جنگ جاری رہی۔ احتجاج کنند گان کو زبردستی دبانے کیلئے فوجی جوان بھی پولیس کی امداد کیلئے بلالئے گئے جن کا خونی شکار ۳۰ سے زائد اشخاص ہوئے۔ فسادات پر میری ایلن مارک کی فلموں کو ضبط کرلیا گیا۔

سیاسی اظہار رائے کو ظالمانہ طریقے سے دبانے پر حکومت کے خلاف انگلستان اور جرمنی سے بین الاقوامی ناراضگی کا غلغلہ فوراً بلند ہوا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ سے سینیٹر کینیڈی اور سینیٹر پیل نے اپنی تشویش کا اظہار کیا اور اسی طرح کانگرس کے رکن سولارز نے بھی جو میرے لئے خصوصاً رائے عامہ ہموار کرنے میں مصروف تھا۔ ''اگر حکومت اپنے مخالف راہنماؤں کو نظربند کرتی رہی اور پرامن سیاسی جلسوں کی اجازت دینے سے انکار کرتی رہی تو پاکستان کے دوستوں کو آئندہ مستقبل میں کانگرس سے مزید امریکی امداد کی منظوری کا حصول مشکل ہو جائے گا'' سولارز نے جو کانگرس کی ایشیا بحرالکاہل کے امور کی سب کمیٹی کا سربراہ تھا متنبہ کیا۔ لیکن ریگن انتظامیہ بدستور ضیاء اور اس کے وزیراعظم جونیجو کی حمایت کرتی رہی۔ ''اس (جونیجو) میں حزب مخالف کا سامنا کرنے اور غیر ملکی تنقید کو نظرانداز کرنے کا حوصلہ ہے'' وزارت خارجہ کے ایک رکن نے بتایا۔ ضیاء نے مکہ سے اگست کے اواخر میں اپنی واپسی پر امریکی کانگرس ایسے اہم ادارے کے اعتراضات کا جواب دینے میں جلد ہی اپنی آواز اٹھائی ''مس بھٹو کوئی مسئلہ نہیں ہے'' نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار سٹیون وائزمین کو ۲۶ راگست کو بتایا۔ ''یہ مس بھٹو کی اقتدار کے حصول کیلئے غیر ضروری اور ناقابل عمل خواہشات ہیں جو قابل اعتراض ہیں''۔

میرے مقدمہ کی سماعت سندھ ہائی کورٹ میں ۱۰ ر ستمبر کو رکھی گئی مجھے کسی الزام کے بغیر زیر حراست رکھا گیا تھا۔ یوم آزادی کی ریلی قانون کے اندر تھی۔ جب ہزاروں لوگ اگلے دن میری متعینہ پیشی کے دن عدالت کے باہر اندرون سندھ سے پیدل سفر کر کے آن پہنچے تو حکومت جھک گئی۔ ''میرے پاس آپ کیلئے حیرت انگیز خوش خبری ہے'' آپ کو رہا کیا جاتا ہے'' جیل سپرنٹنڈنٹ نے رات کو ۳۰ -- ۹ بجے میری کوٹھڑی پر آکر مجھے اطلاع دی۔ لیکن مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی میں نے اپنا سامان باندھ رکھا تھا اور میں جانے کیلئے تیار

تھی۔ میری رہائی کے بعد مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرنے کیلئے پی پی پی کے اجلاس میں جذبات بہت برانگیختہ تھے۔ بعض ارکان حکومت سے خون کا انتقام لینے کیلئے تحریک کو آگے بڑھانے کے حق میں تھے۔ پہلی مرتبہ انہوں نے اس کا اشارہ دیا تھا۔ حکومت نے پنجاب میں مظاہرین پر گولی چلائی ہے۔ ضیاء کا تختہ الٹنے کیلئے اس سے بہتر سازگار ماحول دوبارہ نہیں ملے گا جذبات اس وقت بلند ترین مقام پر ہیں۔ ان میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

''ہم نے سیاسی ذرائع سے پرامن تبدیلی لانے کا وعدہ کیا ہے'' میری دلیل تھی۔ میں نے کامیابی سے ضبط پر زور دیا ہے۔ ''لیکن حکومت نے جبر اور طاقت سے کام لیا ہے احتجاجات کا سلسلہ جاری رکھنے کا مطلب زیادہ خون بہنا، بحران یا شائد بھاگ دوڑ انتہا پسندوں کے حوالے کرنا ہے۔ آیئے ہم اگست میں شہادت کو اپنی اخلاقی فتح کے طور پر منائیں اور ہم اپنی امن کی پالیسی جاری رکھیں'' اجلاس کے فوری بعد میں نے ملک کا ایک اور دورہ شروع کر دیا تاکہ لوگوں تک اپنی ضبط اور احتیاط کی پالیسی کا پیغام پہنچایا جاسکے۔

میں زیادہ پراعتماد تھی جب ۱۹۸۷ء کا سورج طلوع ہوا۔ میرا ہمیشہ سے یقین ہے کہ آنے والا سال جانے والے سال سے بہتر ہوگا اور میرے سامنے بہت سے خوش امید نشانات تھے۔ چھ برسوں میں پہلی مرتبہ مجھے پاکستان میں آزادی نصیب ہوئی تھی۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے خاتمہ کے بعد ہم پی پی پی کی قوت کو ایک ادارے کے طور پر آہستہ آہستہ بڑھا رہے تھے۔ پارٹی کی رکنیت کی مہم چلا کر ہم نے چار ماہ کے قلیل عرصہ میں ۱۰ لاکھ افراد کو جماعت کا رکن بنالیا تھا۔ اور پاکستان میں یہ بہت بڑی کامیابی تھی جہاں خواندگی کی شرح بہت ہی کم ہے۔ ہم نے پنجاب میں پارٹی کے انتخابات منعقد کرائے، برصغیر میں یہ بھی عجوبہ ہی تھا، جن میں چار لاکھ ارکان نے ووٹ دیئے۔ ہم نے پارلیمینٹ میں مسلم لیگ کے مخالفوں کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کیا اور حکومت کی حقوق انسانی کی خلاف ورزیوں کی نشاندہی کی۔

ضیاء نے مستقلاً دعویٰ کیا کہ ہم انتقام پر اتر آئے ہیں، خصوصاً فوجیوں کے ساتھ اپنی گفتگو میں اسی عنوان پر زور دیتا تاکہ ان میں پی پی پی کی واپسی کے خوف کو اجاگر کیا جاسکے۔ لیکن

ہماری پارٹی کی سرگرمیاں انتقام کیلئے نہیں بلکہ قومی تعمیر کیلئے جاری تھیں، اور ہر شخص کو اس بات کا احساس تھا۔

میں نے پاکستان کیلئے ایک پیشہ ور فوج کی ضرورت کا نعرہ بلند کیا جو سیاست سے بالکل پاک ہو ...... میں نے سیاچین گلیشیر کے سانحہ پر ہندوستان سے نقصان اٹھانے پر ضیاء کی بدانتظامی پر تنقید شروع کر دی جہاں اس نے پچھلے تین سالوں میں پاکستان کا ۱۴۰۰ مربع میل علاقہ ہندوستان کے حوالے کر دیا تھا۔ ہجوم ہماری باتوں پر زیادہ سے زیادہ توجہ دے رہے تھے۔ ماہ دسمبر میں پی پی پی کے ایک سرگرم کارکن کی شہادت پر میں نے لالہ موسیٰ میں اس کے گھر پر حاضری دی تو فوجی بھرتی کے اس گڑھ میں بھی لوگوں نے فتح کے نشان بنا بنا کر ہماری حوصلہ افزائی کی۔ ایک مرتبہ پھر میں ضیاء کی پگڑی پر ہاتھ ڈالنے والی تھی۔

"ہمیں خبر ملی ہے کہ حکومت آپ کے خلاف ایک منصوبہ بنا رہی ہے" پی پی پی کے ایک حامی اور فوج کے سابق بریگیڈیئر نے مجھے بتایا جب میں اپنے والد کی سالگرہ کے سلسلہ میں لاڑکانہ گئی۔ "ہم المرتضٰی میں آپ کی حفاظت کے ایک منصوبے پر عمل کرنے کی مشق کریں گے" لاکھوں لوگ میرے والد کے یوم پیدائش ۵ر جنوری کو سالگرہ میں حصہ لینے کیلئے لاڑکانہ آئے تھے اور خیروخوبی سے یہ دن گزار کر چلے گئے اور مجھے کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں ہوا۔

"المرتضٰی میں حفاظتی اقدامات عمدہ ہیں" میں نے بریگیڈیئر کو یقین دلایا۔ "ان کو آزمانا چاہئے" اس نے کہا۔ میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ "بریگیڈیئر، اس کی کوئی ضرورت نہیں" میں نے اسے بتایا۔

راولپنڈی سے بھی ایسا ہی تنبیہ کا ایک اشارہ ملا۔ لاہور سے بھی مجھے متنبہ کیا گیا۔ "حکومت نے ایک مصنوعی قتل کی مشق کی تھی" انتظامیہ میں سے ہمارے ایک ہمدرد نے بتایا۔ "قاتل" آپ تک بلا روک ٹوک پہنچ گیا تھا اور واپس آکر بتایا کہ یہ کام آسان تھا کیونکہ آپ تک کوئی بھی پہنچ سکتا ہے۔ میں تاہم خوفزدہ نہیں ہوئی۔ اگرچہ موت کا کسی وقت بھی امکان ہو سکتا تھا مگر میں سیاسی مسائل میں جتی رہی۔

میری سلامتی کو خطرات بڑھتے رہے اور میرے پارٹی کے ہمدردوں نے مجھے اپنی حفاظت کیلئے مزید اقدامات کیلئے گزارشات کیں۔ صوبہ سرحد کے ایک شخص نے مجھے کلاشن کوفوں سے مسلح چھ جوانوں کی پیشکش کی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ مجھے بندوقوں کی نمائش اور تصور ہی سے نفرت تھی اور میں نے اپنے رضاکار گارڈوں کو بھی ہتھیار بند ہونے سے منع کر دیا تھا۔ کچھ عرصے بعد مجھے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا پڑی۔

جنوری ۱۹۸۷ء کے ایک ہفتے کے دوران، میرے قریبی اشخاص پر دو حملے ہوئے۔ پہلے حملہ میں، میرے حفاظتی گارڈوں میں سے ایک کو کراچی کی ایک بند گلی میں اپنی گاڑی کو لے جانے پر مجبور کر دیا جب اس پر گولی چلائی گئی۔ چونکہ وہ گاڑی میں دوسرے مسلح افراد کے ساتھ سوار تھا جنہوں نے منور سہروردی پر حملہ کیا تھا اور وہ ان کو بھگانے میں کامیاب ہوگئے تو یوں اس کی جان بچ گئی۔ ایم آر ڈی کا راہنما فاضل راہو اس قدر خوش قسمت نہیں تھا۔ ۱۱ر جنوری کو اس کے اپنے گاؤں میں کلہاڑی مار مار کر اس کو قتل کر دیا گیا۔ اسی دوران بشیر ریاض کو جو میرا پریس آفسر تھا اور لندن میں ہمارے اخبار "عمل" کا ایڈیٹر، آدھی رات کو دھمکی آمیز فون کالیں آنا شروع ہوگئیں۔ کیا حکومت کی طرف سے یہ سب تنبیہات میرے لئے تھیں؟ "حکام سے رابطہ کرو" میں نے اپنے وکیل سے کہا۔ "انہیں بتادو کہ مجھے کچھ ہوا تو اس کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر ہوگی، ہم انہیں پیشگی اطلاع دے رہے ہیں"۔

۳۰ر جنوری کو حملہ ہوگیا۔ میں لاڑکانہ واپس آنے کا منصوبہ بنارہی تھی لیکن عین آخری وقت ایک ملاقاتی کی آمد کی وجہ سے میری روانگی میں تاخیر ہوگئی۔ میں عموماً لاڑکانہ اپنی پجیرو میں جاتی تھی لیکن میں کسی بھی متوقع ہنگامی حالت کی بنا پر طیارے میں اپنی نشست ریزرو کرالیتی تھی۔ سلامتی کے لحاظ سے مختلف سفری تجاویز مناسب خیال کی جاتی تھیں۔ میں اکثر طیارے میں نشست ریزور کرالیتی تھی مگر جاتی نہیں تھی اسی طرح بعض اوقات مختلف شہروں کیلئے نشستیں ریزرو کرالیتی تھی تاکہ ضیاء کے خفیہ محکمہ کے ایجنٹوں کو تاریکی میں رکھا جاسکے میں اپنے عملے کو بھی اپنے سفری منصوبوں کا نہیں بتاتی تھی تاکہ غلطی کا احتمال نہ

رہے۔

"بی بی صاحبہ! دیر ہورہی ہے" میرے عملہ میں سے ایک ملازم نے دوپہر کے قریب کہا "اگر آپ لاڑکانہ شام کے اندھیرے سے پہلے پہلے پہنچنا چاہتی ہیں تو کاروں کو روانہ ہوجانا چاہئے"۔

"تم آگے جاؤ" میں نے عرس سے کہا۔ "میری ایک ملاقات ہے میں بعد میں آؤں گی" کاریں لاڑکانہ تک نہ پہنچ سکیں۔

میں ملاقات کے نصف میں تھی جب ایک ملازم ضروری چٹ لے کر آیا۔ اس پر صرف دو الفاظ لکھے تھے "گولیوں سے حملہ اور پجیرو" عجیب بات تھی کہ میں ابھی بھی اپنے حفاظتی گارڈ پر حملے اور ایم آر ڈی راہنما کے قتل کے متعلق ہی باتیں کررہی تھی...... سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کیا گیا تھا "ایک لمحے کیلئے معاف کریں" میں نے اپنے مہمانوں کو کہا۔ "میری کار پر حملہ کیا گیا ہے" جلدی میں, مَیں نے ملازموں کو پولیس اور اپنے وکلاء کو بلانے کیلئے کہا اور اپنے حواس بجالاتے ہوئے ملاقات کیلئے دوبارہ چلی گئی۔

چند دنوں تک واقعات کھل کر سامنے آئے تو حقائق اور بھی بھیانک تھے۔ دونوں گاڑیاں دن کی روشنی میں منجھنڈ کے قریب سڑک پر جارہی تھیں کہ سڑک کے کنارے کھڑے آدمی نے اچانک اشارہ کیا تو چار دیگر آدمی فوراً باہر نکل آئے اور میری پجیرو کے اندر سوار آدمیوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کردی۔ عرس نے رفتار تیز کردی اور پجیرو جو پہلے ہی ۷۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رواں تھی گولیوں کی بوچھاڑ میں سے گزر گئی۔ جب عملے نے پیچھے مڑکر دیکھا تو پجیرو پر ابھی بھی گولی چلائی جارہی تھی مگر دوسری کار کو انہوں نے روک لیا تھا۔ دوسری کار کے حفاظتی گارڈوں اور عملے کو بندوق کی نوک پر یرغمال بنالیا گیا تھا۔

بے حس قاتلانہ حملہ

اگرچہ حکومت کا دعویٰ تھا کہ یہ معمول کی شاہراہوں پر راہزنی تھی مگر ایسا نہیں تھا۔ اس سے بہتر طریق کار ممکن نہیں تھا۔ یہ حملہ اس رقبے سے پورے چالیس میل کی دوری پر ہوا تھا جہاں عمومی طور پر ڈاکے پڑتے ہیں یا شاہراہوں کے راہزن لوٹ مار کرتے ہیں۔ ڈاکو عموماً رات کو حملہ کرتے ہیں، سہ پہر دن دہاڑے ۳۰ - ۳ بجے نہیں۔ اور ان کا مقصد تو کار ٹھہرا کر سواریوں سے لوٹ مار ہوتا ہے نہ کہ کار کو گولیوں سے چھلنی کرنا۔

جیسے ہی قاتلانہ حملے کی خبر پھیلی، ملک بھر میں دوبارہ فسادات برپا ہوگئے۔ عوامی اشتعال اس قدر شدید تھا کہ حکومت کو میرے عملہ کے اغواء شدہ ملازمین کی بازیابی کیلئے اپنے انسپکٹر جنرل پولیس کو بھیجنے کا پراپیگنڈہ بھی کرنا پڑا۔ دریں اثناء زیادہ سے زیادہ خبریں پہنچنا شروع ہوگئیں۔ قتل کی کوشش جگہ پر ایک آدمی کو وائرلیس سیٹ کے ساتھ اس وقت دیکھا گیا جب ۷۰ - کلفٹن سے میری پجارو روانہ ہوئی تھی۔ کسی نے پہلے سے بذریعہ وائرلیس سیٹ ان لوگوں کو مطلع کر دیا تھا کہ پجارو اس راستے پر روانہ ہوگئی تھی اور یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ میں اس جیپ میں سوار ہوں جس کی کھڑکیوں کے شیشے تاریک ہیں۔

میں نے حکومت کے اس دعویٰ کو مکمل طور پر مسترد کر دیا کہ یہ حملہ ڈاکوؤں کی کارروائی تھی ان کی سرگرمیوں کا طریق کار ایک کار کو نہیں بلکہ بہت سی کاروں کو روکنا ہوتا ہے۔ اور پجارو سے قبل نکل جانے والی کار کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ ڈاکو کسی خاتون پر حملہ کرنے کو مقام بے عزتی خیال کرتے ہیں .... نہیں یہ راہزنی کی کوشش ہرگز نہیں تھی۔

مزید خبریں بھی موصول ہوئیں۔ ایک شب قبل، ایک کار ڈاکوؤں کے خفیہ صدر مقام تک پہنچی تھی اور ان کے سردار سے بات کی تھی۔ "کل کو ہمیں ایک عظیم کارنامہ

سرانجام دینا ہے " سردار نے اس کار کے جانے کے بعد اپنے ساتھیوں کو بتایا تھا دوسری خبروں کے مطابق ڈاکوؤں کا مکمل صفایا کرنے کی دھمکی دے کر یہ ذلیل کام کرنے پر مجبور کیا تھا مزید بر آں جس کسی کے پاس پی پی پی کے اراکین یرغمال تھے وہ کسی تاوان کا مطالبہ بھی نہیں کر رہا تھا یہ عمومی اغواء کا کیس نہیں تھا۔

چند روز بعد ہمارے آدمیوں کو اچانک ہی رہا کر دیا گیا انہیں کوئی گزند نہیں پہنچی تھی لیکن جو کچھ انہوں نے بتایا اس نے ہمارے شکوک کو حقیقت میں بدل دیا کہ حکومت خود اس سانحے میں ملوث تھی "ہم بے نظیر کے عملے کے ارکان ہیں " ان افراد نے اغوا کنند گان کو بتایا جو میری خصوصی جیپ سے بھی مترشح تھا جس پر پی پی پی کے پرچم اور جھنڈیاں چپکی ہوئی تھیں اور چھت پر لاؤڈ سپیکر بھی آویزاں تھے "ہم جنرل ضیاء کے آدمی ہیں " اغوا کنند گان نے جواب دیا۔ اس جرم کے مرتکب ڈاکوؤں کو کبھی گرفتار نہیں کیا گیا۔

ہمارے بڑھتے ہوئے تشدد پسند معاشرے میں حکومت نے تشدد کو بھڑکانے کا مزید سامان پیدا کر دیا تھا حکومت نے اپنے مجاہدین یعنی بنیاد پرست طلباء، علیحدگی پسند افراد اور مسلم لیگ کے رضاکاروں کو مسلح کر دیا تھا ایک سویلین حکومت کے سربراہ ہونے کا یقین دلانے کے لئے، ضیاء نے اپنے سیاسی حریفوں کو ختم کرنے کے لئے پرائیویٹ فوج تیار کر لی تھی ۱۹۸۷ء کا پہلا مہینہ ختم ہونے سے پہلے پی پی پی کے ایک سرگرم کارکن کو جیل میں کوڑے مارے گئے اور مزید سیاسی مخالفوں کو قتل کرایا گیا حالانکہ مارشل لاء اٹھا لیا گیا تھا۔ میرے لئے یہ بہت مشکل تھا کہ پی پی پی کے نوجوان ارکان کو ایسی حالت میں تشدد کرنے سے باز رکھ سکوں۔

پاکستان میں حالات تیزی سے بحرانی کیفیت کی طرف بڑھ رہے تھے لندن میں قائم کردہ "ساؤتھ " نامی جریدہ نے ماہ فروری میں اپنے اداریئے میں رقم کیا "فوج اپنے اعتماد کو ٹھیس پہنچا چکی ہے اب حکومت اپنی ظاہری انتظامی ہیئت کو بھی کھو رہی ہے۔ حکومت کا ادارہ، فوج، پولیس، عدلیہ اور انتظامیہ سب لٹو کی طرح اپنے اپنے دائروں میں گھوم رہے ہیں ملک فرقہ واریت، قبائلی اور نسل تضاد، تناؤ اور جھگڑے کی کیفیات میں معلق ہے۔ قانون اور نظم وضبط

حتمی طور پر ختم ہو چکے ہیں اور لوگوں کی زندگیوں پر منشیات فروشوں اور مسلح گروہوں کے مافیا کا تسلط قائم ہو چکا ہے"

پاکستان انتشار کے کنارے پر کھڑا تھا۔ کسی باہر کے دشمن کی کیا ضرورت تھی؟ ضیاء ملک کے اندر یہی کام بڑھ چڑھ کر کر رہا تھا۔ وقت تیزی سے ۱۹۹۰ء کے متوقع قومی انتخابات کی طرف رواں دواں تھا۔ لیکن ان لوگوں کی تعداد میں روزبروز کمی آرہی تھی جنہیں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے انعقاد کا یقین تھا۔

۱۹۸۷ء کے موسم خزاں میں مقامی بلدیاتی انتخابات سے انصاف اور غیر جانبداری کا بھرم کھل گیا تھا۔ حکومت کی حمایت یافتہ مسلم لیگ کے امیدواروں کے مخالف امیدواروں کے تقریباً ۴۰ فیصد حصے کے کاغذات نامزدگی کو حکومت کے اہلکاروں نے مسترد کر دیا کیونکہ وہ اپنی جبری ریٹائرمنٹ سے خوف زدہ تھے۔ انتخابات کے اعلان سے کچھ عرصے پہلے ضیاء نے ایک قانون پاس کیا تھا جس کی رو سے صوبائی حکومتوں کو دس سال کی ملازمت کے بعد کسی بھی سرکاری ملازم کو ریٹائر کرنے کا اختیار مل گیا تھا۔ سازش کو بھی دس سال ہو چکے تھے۔

باقی ۶۰ فیصد نشستوں کیلئے مقابلہ حکومت نے اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے کیلئے مناسب طور طریقے سے جاری رکھا۔ ووٹروں کی فہرستیں جو خود ساختہ تھیں ان کی کوئی تصحیح نہیں کی گئی بلکہ انتخابات کے دن تک تبدیل ہوتی رہیں۔ انتخابات جیتنے کیلئے ناجائز طور پر ضلعی حد بندیوں کو مسخ کیا گیا اور حکومت کی حامی مسلم لیگ کو جتانے کیلئے ۶۰۰ سے لے کر ۲۶۰۰ لوگوں کی حلقہ بندیاں مرضی کے مطابق وضع کی گئیں۔ قوانین مستقل طور پر بدلتے رہے۔ انتخابات سے دست برداری کی آخری تاریخ ۱۹ر نومبر رکھی گئی تھی۔ لیکن ۱۹ر نومبر کی شب آخری تاریخ بڑھا کر ۲۵ر نومبر کر دی گئی۔ اس طرح انتظامیہ کو مخالف امیدواروں کو اپنے نام واپس لینے پر مجبور کرنے کیلئے مزید چھ دن مل گئے تاکہ مسلم لیگ کے امیدواروں کے "بلامقابلہ" جیتنے کا اعلان کیا جاسکے۔

ووٹنگ کو اپنے حق میں ڈلوانے کیلئے سازباز سے کام لیا گیا۔ پولنگ اسٹیشن ہمیشہ ہی
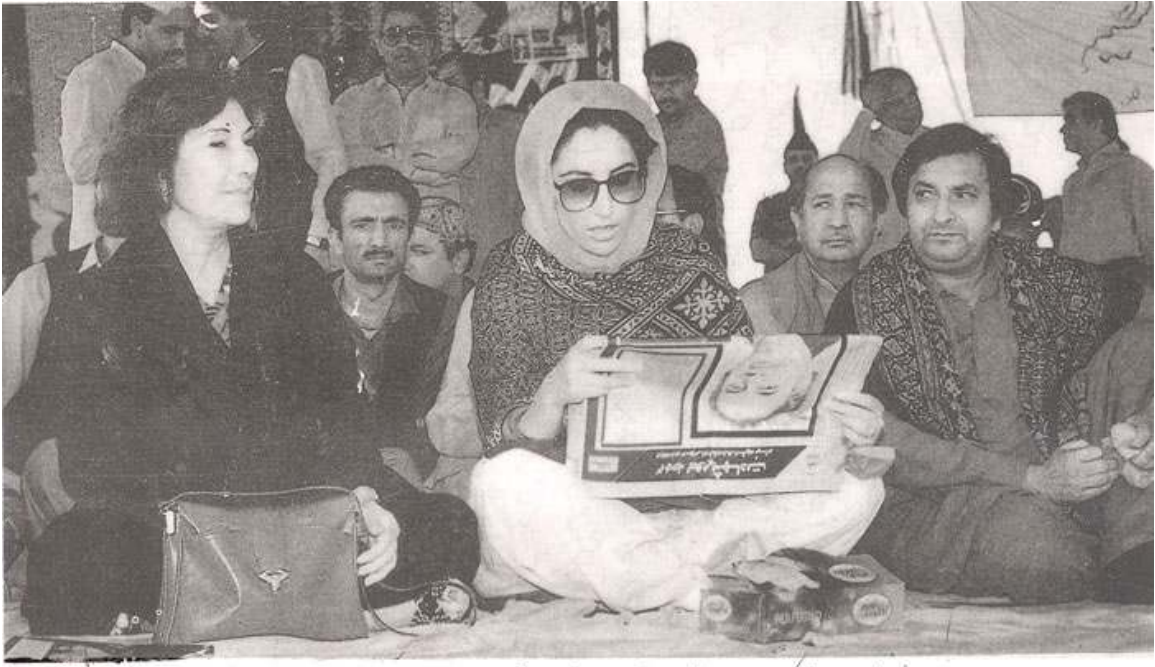
لاڑکانہ میں شہید ذوالفقار علی بھٹو کی برسی کے موقع پر منعقدہ ایک تقریب کے دوران' محترمہ بے نظیر بھٹو' بیگم نصرت بھٹو اور اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین جناب فخر زمان

کثیر آبادی کے دیہاتیوں اور شہروں میں عام جگہوں پر بنائے جاتے تھے لیکن ان انتخابات میں حکومت نے عین آخری وقت اعلان کیا کہ انتخابات کی جگہوں کو کم آبادی والے علاقوں میں بھی مقرر کیا جاسکتا تھا اور بعض جگہوں پر مسلم لیگیوں کے گھروں کو بھی انتخابی جگہ مقرر کیا گیا جہاں ووٹر خوف کے مارے جانے سے احتراز کررہے تھے۔ انتخاب کے دن بھی حکومت نے بعض پولنگ اسٹیشنوں کے مقررہ مقامات کو مخالف امیدواروں کی اطلاع کے بغیر کسی دوسری جگہ تبدیل کر دیا اور نتیجتاً ہمارے حامی وہاں ووٹ ڈالنے سے قاصر رہے۔ کثیر تعداد تو ایسے اسٹیشنوں تک پہنچ بھی نہ سکی۔ پولنگ سے دو روز قبل، الیکشن کمیشن نے پی پی پی کے حامیوں کی کاروں اور جیپوں اور دیگر ذرائع حمل پر انتخابی عملے کی ترسیل کے بہانے قبضہ کرلیا۔ مسلم لیگی امیدواروں کی گاڑیوں کو ہاتھ تک بھی نہیں لگایا گیا۔ حکومت کے کھلم کھلا دھاندلی کے طریقوں سے اپنے حق میں ووٹوں کے انبار لگانے کے باوجود، مسلم لیگ کو متوقع نتائج سے ہاتھ دھونا پڑا۔ لاڑکانہ میں ہمارے حلقے میں جہاں جونیجو کے رشتہ دار بھی رہائش پذیر تھے، مسلم لیگ بے چین تھی کہ نتائج کو اس طرح اپنے حق میں دکھایا جائے کہ علی الاعلان دعویٰ کیا جاسکے کہ بھٹو خاندان اپنے حلقہ انتخاب میں بھی جیت نہیں سکا۔ جب ہمارے امیدواروں کو ڈرا دھمکا کر اور رشوت دے کر نام واپس لینے کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں، تو انہوں نے پی پی پی کے ۶۰۰ ووٹوں پر مشتمل ایک محلے کو فہرستوں میں سے خارج کروادیا جہاں میرے والد نے ان کیلئے رہائشی گھروں کا ایک منصوبہ بنایا تھا۔ تاہم ہم پھر بھی جیت گئے۔

انتخابات کا **پہلا** مرحلہ وہ تھا جس میں کونسلروں کا انتخاب عمل میں آیا اور بعدازاں انہی کونسلروں نے ضلعی اور میونسپل کمیٹیوں کے چیئرمینوں کا انتخاب کیا۔ دوسرے مرحلے کے انتخابات میں بھی دھاندلی روا رکھی گئی۔ جب ہم کثرت میں ہوتے تو مسلم لیگ کو جتانے کیلئے ہمارے کونسلروں کو اپنی مقرر کردہ انتخابی مشینری کے ذریعہ نااہل قرار دیدیا جاتا۔ جب اعداد و شمار کے ہیر پھیر سے بھی ان کا بس نہ چلتا تو وہ نتیجے کو کسی نہ کسی طرح بدل دیتے۔ لاڑکانہ کے ضلعی انتخاب میں یہی کچھ ہوا جہاں پی پی پی کا حمایت یافتہ امیدوار چیئرمین منتخب

ہو گیا تھا۔ گنتی کے بعد، ڈسٹرکٹ کمشنر جو الیکشن افسر بھی تھا کمرے سے باہر نکل گیا اور جب دوبارہ اندر آیا تو دوبارہ گنتی کا مطالبہ کیا۔ متعدد ووٹوں کو مسترد کر دیا گیا اور مسلم لیگ کے امیدوار کی جیت کا اعلان کر دیا۔ پی پی پی کے کونسلروں نے ڈسٹرکٹ کمشنر کی مذمت کی تو اس نے معافی مانگ لی اور کہا کہ وہ مجبور تھا۔ شہداد میونسپل کمیٹی میں حکومت نے مختلف چال چلی۔ میونسپل کمیٹی کی چیئرمینی کے انتخاب کے موقع پر، پی پی پی کے دو کونسلروں کو اغوا کر لیا گیا۔ مکسی فورس جو فوجی ذیلی ادارہ ہے کے سپاہیوں نے دیگر کونسلروں کے گھروں میں گھس کر دھمکیاں دیں۔ "اگر تم میں سے کسی نے کل کو مسلم لیگ کے امیدوار کے خلاف نامزدگیاں داخل کیں تو تمہیں بھی اغواء کر لیا جائے گا اور تمہیں بے نظیر بھی چھڑا نہیں سکتی،" انہیں بتایا گیا۔ خوف زدہ کونسلروں نے اپنی نامزدگیاں داخل نہیں کیں اور مسلم لیگ کا امیدوار جیت گیا۔

حکومت نے ۱۹۸۷ء کے بلدیاتی انتخابات کو اپنی عظیم کامیابی قرار دیا۔ جب ہم نے ان پر دھاندلی کا الزام لگایا تو ان کا جواب تھا "انگور کھٹے ہیں"۔

حقائق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ میرے والد نے مشرقی پاکستان میں ہندوستانی افواج کی ڈھاکہ میں فتح کے موقع پر اقوام متحدہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔ نازی افواج بھی کبھی ماسکو کی دہلیز تک پہنچ گئی تھیں۔ انہوں ے بتایا۔ فرانس جرمنی کے زیر تسلط رہا۔ چین پر جاپان قابض ہو گیا تھا۔ حبشہ پر فسطائیوں کی حکمرانی تھی۔ لیکن ان حقائق کو تسلیم کرنے کی بجائے، ان ممالک کے لوگوں نے قابض حکمرانوں کے خلاف جدوجہد کی اور تاریخ کا رخ بدل دیا۔ سلامتی کونسل میں ان کی تقریر کا مجھ پر گہرا اثر ہوا جب میں ابھی یونیورسٹی کی ۱۸ سالہ طالبہ تھی یہ تقریر میرے لئے جنرل ضیاء کے ظلم و جبر کے آنے والے سالوں میں بھی مشعل راہ رہی۔ "حقائق تبدیل ہوتے رہتے ہیں" اپنے والد کی آواز مجھے ہمیشہ سنائی دیتی رہی۔

تصورات خواب بھی ہو سکتے ہیں اور پیش گوئیاں بھی ہو سکتے ہیں۔ جس کسی کو پاکستان سے محبت ہے وہ اپنے ملک اور اپنے لوگوں کیلئے ایک عظیم اور خوشحال مستقبل کا خواب دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن ایسے تصورات کو عملی جامہ پہنانے کیلئے شدید اور سخت اقدامات

کی ضرورت ہوتی ہے۔ ۲۰۰۰ء تک پاکستان کی موجودہ دس کروڑ کی آبادی ۱۵ کروڑ ۵۰ لاکھ ہوجائے گی۔ قابل منصوبہ بندی آبادی کا ۴۴ فیصد حصہ ۱۵ سال کے کم عمر بچے ہوں گے۔ کم از کم اندازوں کے مطابق بھی پاکستان کی شہری آبادی آج سے تین گنا زیادہ ہوگی۔ آج بھی ۸۵ سے ۹۰ فیصد پاکستانیوں کی صاف اور صحت مند پانی تک رسائی نہیں ہے۔ اتنے ہی فیصد لوگ مناسب حفظان صحت اور نکاسی آب کی سہولتوں کے بغیر گندے محلوں کی گنجان آباد جھونپڑیوں میں رہائش پذیر ہیں۔ بلوچستان اور صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں لوگ ابھی تک غاروں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود حکومت رہائشی سکیموں پر سالانہ بجٹ کا صرف ۰۵ء خرچ کرتی ہے۔

حکومت لوگوں کو تعلیم دلانے کے منصوبے کو نظرانداز کررہی تھی۔ خواندگی کے بین الاقوامی معیار کے مطابق ۹۰ فیصد پاکستانی ناخواندہ تھے۔ ایک دوسرے معیار خواندگی کے مطابق جس میں ہروہ شخص جو اپنا نام لکھ سکتا ہے خواندہ ہے۔ ۷۳ء فیصد پھر بھی ناخواندہ کی فہرست میں شمار کئے جاتے ہیں۔ تاہم ۵ اور ۱۰ برس کی عمر کے درمیان بچوں کا صرف ۵۴ فیصد حصہ سکولوں میں داخلہ حاصل کرپاتا ہے۔ اور ان میں بھی اپنی اقتصادی مجبوریوں کی وجہ سے پانچ میں سے چار بچے دس برس کی عمر سے پہلے ہی پڑھائی چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ اعدادوشمار صدمہ خیز ہی نہیں بلکہ لرزہ خیز ہیں۔ پاکستان کی موجودہ آبادی میں ہرسال ۱۵ لاکھ ناخواندہ افراد کا اضافہ ہورہا تھا۔ جنرل ضیاء کی حکومت کے ماتحت، خواندگی کی شرح بڑھ نہیں رہی بلکہ کم ہورہی تھی۔ ہماری قومی ترجیحات کو بری طرح گڈمڈ کردیا گیا تھا۔ ضیاء کی حکومت نے دفاعی اخراجات کو دگنے سے بھی زیادہ بڑھادیا تھا۔ نتیجتاً پاکستان میں فی کس فوجی اخراجات جنوبی ایشیاء کے دوسرے ممالک کے مقابلہ میں بہت بڑھ گئے تھے .... تعلیم، رہائش اور صحت پر ہمارے فی کس اخراجات سب سے کم تھے۔ اقوام متحدہ کے اطفالی فنڈ کے مطابق پاکستان میں ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ہرسال ۴۰ لاکھ نوزائیدہ بچوں میں سے چھ لاکھ بچے ایک برس کی عمر سے پہلے موت کا شکار ہوجاتے تھے۔ اور اس طرح پانچ برس کی عمر تک پہنچنے سے قبل ہی ساٹھ لاکھ پچاس ہزار بچے لقمہ اجل بن جاتے تھے۔ مغرب میں

مساوی تعداد میں پیدائش کے بالمقابل پاکستان میں سات لاکھ بچے سالانہ موت کے منہ میں چلے جاتے تھے۔ ان حقائق کے باوجود لوگوں کو اپنے مستقبل پر کوئی اختیار نہیں تھا۔

آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات

ہم ابھی اس دن کی تیاری میں مصروف تھے جب پاکستان میں جمہوریت کا دور دورہ ہو گا۔ میرے والد نے غریب اور امیر، مرد اور عورت اور تمام نسلی گروہوں اور مذہبی اقلیتوں کو آئینی مساوات دینے میں اپنی زندگی کو تج دیا تھا۔ تعلیمی اور اقتصادی ترقی کے ذریعے انہوں نے پورے ملک کو فائدہ پہنچایا تھا۔ اور جمہوریت کی آواز آبادی کے اس طبقے تک پہنچادی تھی جو اس کیلئے تڑپ رہا تھا۔ انہوں نے بالآخر اپنی مثالیت پسندی کی قیمت جان کا نذرانہ پیش کر کے ادا کر دی تھی۔

ظلم و استبداد پر، جہنم کی طرح، آسانی سے قابو نہیں پایا جاسکتا۔ تاہم ہمیں اتنا اطمینان تو نصیب ہے کہ "تصادم جس قدر گھمبیر ہو گا، فتح اسی قدر شاندار ہو گی" ٹامس پن نے ۱۹۷۶ء میں اپنی تصنیف "امریکی بحران" میں لکھا تھا۔ ہم پاکستان میں مارشل لاء کے جہنم میں سے گزر کر آئے تھے اور کسی بھی مستقبل کے ظلم کا سامنا کرنے کیلئے تیار تھے۔ ہم نے تکالیف اٹھائی تھیں، قربانیاں دی تھیں، اپنے اہل خاندان کو مرتے دیکھا تھا اور دوسرے خاندانوں کے بچوں اور والدین سے تعزیت بھی کی تھی۔ آئندہ بھی ہمیں سانحے پیش آسکتے تھے۔ لیکن ان آزمائشوں سے گزرتے ہوئے ہم نے جمہوریت کے چراغ کو روشن رکھا۔ کوئی فتح اس دن سے عظیم تر اور حسین تر نہیں جس نے آمریت کو ہمیشہ کیلئے نیست و نابود کر دیا اور جمہوریت کا خواب ایک مرتبہ پھر پاکستان میں حقیقت بن کر جلوہ گر ہو گیا۔

اپنے والد کے گھر سے بیاہی گئی

میری ذاتی زندگی میں ۲۹ ر جولائی کو ایک ڈرامائی موڑ آیا جب میں اپنے اہل خاندان کے کہنے پر ان کی پسند کردہ شادی پر رضامند ہو گئی۔ اہل خاندان کی پسند کی شادی ہی وہ قیمت تھی جو مجھے اپنی سیاسی زندگی کے لئے ذاتی پسند پر ادا کرنی پڑی۔ پاکستان میں میرے بلند تشخص نے عام حالات میں کسی نوجوان سے ملنے کے تمام امکانات ختم کر دیئے تھے جسے میں اچھی طرح جان سکتی اور پھر اس سے شادی بھی کر لیتی۔ بہت زیادہ باشعور تعلقات بھی افواہ اور بے پر کے شعلوں کو ہوا دیتے جو میری ہر حرکت کے گرد پہلے ہی سرگرداں تھے۔

اہل مشرق کی اکثریت والدین کی پسند کی شادیوں کو منفرد نہیں بلکہ عام معیار کے مطابق گردانتی ہے۔ لیکن میرے والدین کی شادی محبت کی شادی تھی اور میں اسی عقیدے کے ساتھ جوان ہوئی تھی کہ میں بھی کسی سے محبت کروں گی اور اپنے دل پسند نوجوان سے شادی کروں گی۔ تاہم میری شادی کے منصوبے کے متعلق استفسارات اسی وقت شروع ہو گئے تھے جب میں ابھی ریڈکلف میں زیر تعلیم تھی۔ میں پاکستان کے قدیم اور معروف ترین خاندانوں میں سے ایک کی رکن ہونے کا اعزاز رکھتی تھی اور پھر اس وقت ایک وزیر اعظم کی بیٹی بھی تھی۔

تحریک نسواں کے پھیلتے پھولتے زمانے میں امریکہ میں زیر تعلیم طالبہ کی حیثیت سے مجھے یقین تھا کہ شادی اور کسی معاشی پیشہ کے حصول میں کوئی ناموافقت نہیں ہے اس سے ایک دوسرے کی نفی نہیں ہوتی۔ میرا تب بھی اور اب بھی یہی نظریہ ہے کہ ایک عورت کو اپنے عزائم کی تکمیل اور حصول کا پورا پورا حق ہے۔ ایک قابل اطمینان ہنر مند زندگی اور ایک قابل اطمینان شادی اور اپنی اولاد کا اطمینان۔ میں ایک ایسے مرد سے شادی کی منتظر تھی جو زندگی میں اپنے عزائم اور مقاصد کے حصول کی جدوجہد جاری رکھے اور میں اپنے عزائم کی تکمیل میں مصروف رہوں۔

فوجی بغاوت نے یہ سب کچھ تلپٹ کر دیا۔ اگرچہ مارشل لاء کے ابتدائی سالوں میں

میرے بارے میں استفسار جاری رہا مگر میں نے شادی کی کسی تجویز کو اسی لمحے مسترد کر دیا۔ میں شادی کی پر مسرت زندگی کا کیسے سوچ سکتی تھی جب میرے والد قید خانے کی سلاخوں میں بند تھے اور ان کی زندگی خطرے میں تھی۔ ان کے قتل کے بعد شادی کا بندھن اور بھی بعید ہو گیا۔ روایتی طور پر جب بھٹو خاندان کی کسی بزرگ یا اعلیٰ مرتبہ کی شخصیت کا انتقال ہو جاتا تو ایک برس تک خاندان کا کوئی فرد شادی نہیں کرتا تھا۔ لیکن میں اپنے والد کے انتقال کے صدمہ سے اس قدر نڈھال تھی اور انہیں ایسا ہی عظیم شخص سمجھتی تھی کہ ۱۹۸۰ء میں جب میری والدہ نے میری شادی کی تجویز چھیڑی تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ میں دو سال تک مزید انتظار کرنا چاہتی تھی۔ نہ صرف میں اپنے والد کو خراج عقیدت ادا کرنا چاہتی تھی بلکہ میں کسی خوشی اور مسرت کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی جب میں اس قدر شدید درد اور کرب میں مبتلا تھی۔

مجھے اپنے بچپن میں والد کی سنائی ہوئی کئی کہانیاں اپنے مستقبل کی شادی کے ارد گرد گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم شادی کرو لیکن تم کرو گی ضرور" میرے والد صنم کو اور مجھے تفریحاً چھیڑا کرتے تھے۔ "میں اس دن کا منتظر رہوں گا جب تم واپس آؤ گی اور اگر تمہاری آنکھ میں ایک بھی آنسو ہوا یا آواز ذرا بھی بھرائی، تو میں تمہارے شوہر کو پکڑ لوں گا اور خوب پیٹوں گا اور تمہیں اپنے گھر واپس لے آؤں گا۔" وہ تو مذاق میں ایسا کہتے تھے لیکن شادی کا تذکرہ مجھے اپنے بچپن کی یاد دلا دیتا اور پہروں غم سے نڈھال رکھتا۔ ابھی میں اپنے غم پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ جب اس سانحے کو دو سال گزر چکے تو میں قید خانے میں بند تھی۔ شادی کا نتیجتاً سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب تین سال بعد ۱۹۸۴ء میں مجھے رہا کیا گیا، اور میں انگلستان میں جلاوطن ہو گئی، شادی کے استفسارات شروع ہو گئے۔ لیکن والدہ کو میرا جواب ابھی بھی نفی میں تھا۔ کئی سالوں کی قید تنہائی کے بعد میں لوگوں کی قربت سے خوفزدہ تھی اور کافی دباؤ کا شکار تھی تو وہاں شوہر کی موجودگی بھی کیسے قابل قبول ہوتی۔ ایسی گفتگو اہل خاندان کے ساتھ بھی میرے دل کی دھڑکن کو تیز کر دیتی اور مجھے سانس چڑھ جاتا۔ خفیف سا شور بھی کپکپی طاری کر دیتا۔ "مجھے ابھی اپنے آپ کو

تلاش کرنا ہے پھر کہیں شادی کی بات ہو سکے گی" میں نے اپنی والدہ کو بتایا۔ "مجھے ابھی سکون کی ضرورت ہے، مجھے اپنے اوسان بحال ہونے کے لئے کچھ وقت در کار ہے۔"

ہولے ہولے اور ثابت قدمی سے انگلستان میں رہائش کے اگلے سال میں کچھ بحال ہوئی۔ دریں اثناء شادی کی بات چیت بھی جاری رہی۔ خاندان کے مختلف افراد اپنے اپنے امیدوار پر زور دیتے اور میری سہیلیاں بھی مجھے اپنی رائے سے نوازتی رہتیں۔ جولائی ۱۹۸۵ء میں خاندان کے افراد کے کینیسز میں اکٹھے ہونے سے کچھ عرصہ پہلے، میری والدہ اور آنٹی منا زمیندار زرداری خاندان کے بیٹے آصف کی طرف سے شادی کی تجویز لے کر مجھ تک پہنچیں۔ آنٹی منا سے مجھے بعد میں پتہ چلا کہ می تک یہ پیغام پہنچانے سے پہلے آصف کے بارے میں بہت سی معلومات اکٹھی کر لی گئی تھیں۔ "پٹارو کیڈٹ کالج، پھر لندن سنٹر میں اقتصادیات اور سیاست کا مطالعہ" اس کا پیشہ (اصلی جاگیر، زراعت اور تعمیراتی بزنس) اس کے تفریحی مشاغل (تیراکی، سکوائش اور اس کی اپنی پولوٹیم) اور یہاں تک بھی کہ آیا اسے کتابوں کے مطالعہ کا شوق ہے یا نہیں۔

"ٹھیک ہے وہ مطالعہ میں بے نظیر کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا لیکن اسے مطالعہ کا شوق ضرور ہے" اس کے والد حاکم علی نے کہا جو سابق رکن قومی اسمبلی اور اب عوامی نیشنل پارٹی کے وائس پریذیڈنٹ تھے اور یہ پارٹی ایم آر ڈی میں شامل تھی آنٹی منّا جو آصف کے خاندان کی پرانی دوست تھیں۔ میرے ہونے والے بر کو خود بھی دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس کو ان کے گھر لے جایا گیا جہاں وہ معائنہ میں پاس ہو گیا وہ اپنے پولو کے لباس میں چاق و چوبند اور بہت سمارٹ نظر آ رہا تھا۔ جب ہر طرح سے تسلی کر چکیں تو پھر آنٹی منّا نے انگلستان میں میری والدہ سے رابطہ کیا۔ لیکن ایک المیہ پھر درمیان میں آ پڑا۔

ایک ماہ کے دوران، میرے بھائی شاہ نواز کو قتل کر دیا گیا۔ میں باقی سب کی طرح ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے اپنی والدہ اور اپنی آنٹی کو صاف صاف بتا دیا کہ اگر دو برس نہیں تو کم از کم ایک برس تک میں شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں نے زرداری قبیلے کے متوقع بر کا نام تک بھی نہیں پوچھا۔

تاہم آنٹی منا اپنے امیدوار کے حق میں عزم صمیم کے ساتھ لیس ہوچکی تھیں۔ جب میں اپریل ۱۹۸۶ء میں پاکستان واپس آئی تو وہ زرداری کے بیٹے کے بارے میں مجھے دق کرتی رہیں، ایسا بیٹا جو ایک لاکھ زرداری افراد کے قبیلے کے سردار کا وارث تھا۔ زرداری قبیلہ کئی صدیاں قبل ایرانی بلوچستان سے سندھ کے ضلع نواب شاہ میں آکر آباد ہوگیا تھا۔ ہاں آصف اپنے خاندان کی زمینوں کی نگرانی کرتا تھا۔ "وہ بہت نفیس ہے، وہ تمہاری ہی عمر کا ہے اور ایک زمیندار خاندان کا فرد ہے۔ اس کا خاندان سیاسی خاندان ہے۔ لاہور اور پشاور کے تجارت پیشہ افراد نے بھی اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے لیکن وہ تمہارے مزاج کے مطابق نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ایسے شخص سے شادی کرو جو سندھ میں رہتا ہو اور مقامی رسم و رواج اور روائت سے پوری واقفیت رکھتا ہو....." وہ بہت کچھ کہتی رہیں لیکن مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پچھلے سات برسوں میں پہلی مرتبہ میں اپنے ملک کی فضا میں ہنسی خوشی سانس لے رہی تھی، کام کر سکتی تھی۔ "مجھے اپنی آزادی میں کچھ دیر تو خوش ہولینے دو" میں انہیں کہتی۔

لیکن آنٹی منا نے ہمت نہیں ہاری۔ مجھے بتائے بغیر، پاکستان میں میری واپسی کے سات ماہ بعد انہوں نے میری کزن فخری کے ذریعہ آصف کو ماہ نومبر میں ایک ڈنر پارٹی پر مدعو کر لیا۔ انہوں نے اسے اس موقع کے لئے سوٹ پہن کر آنے پر مجبور کیا تاکہ اس کی شخصیت کا تاثر اچھا ہو ورنہ وہ بلوچی جنگلی لباس کو ترجیح دیتا ہے اور لندن کی گلیوں میں بھی اسی لباس میں چلتا پھرتا تھا۔ آنٹی منا نے ڈنر پر کچھ لوگوں کے جمع ہونے کا انتظار کیا تاکہ آصف کا تعارف کرایا جاسکے۔ جب میں نے "آصف" کے الفاظ سنے تو دل کی دھڑکن تیز نہیں ہوئی۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کون تھا اور صرف اتنا یاد ہے کہ ہم دونوں بحث مباحثہ میں الجھ گئے۔ آنٹی منا فکرمند ہوگئیں جبکہ وہ زیادہ تر تک میرے پاس بیٹھا رہا کیونکہ ایسی صورت میں قیاس آرائیوں کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ انہوں نے کسی کو اسے ایک طرف لے جانے کے لئے بھیجا جو میرے لئے باعث راحت تھا۔ سارا دن پارٹی میں بحث و تمحیص کے متعلق گفتگو سن کر میں اس بارے میں کچھ کہنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

اسی دوران میں یہ سوچ کر بھی حیران تھی کہ میرا متوقع شوہر میری زندگی کو برداشت بھی کر سکے گا جیسی مصروف زندگی میں گزار رہی تھی۔ جب میں گھر پر ہوتی تھی تو میری سیاسی ملاقاتیں آدھی آدھی رات تک بھی چلتی تھیں اور زیادہ عرصہ مجھے گھر سے باہر بھی پاکستان کے طول و عرض میں سفر کرتے ہوئے گزارنا پڑتا تھا۔ کونسا شوہر پسند کرے گا کہ میرا وقت میرا نہیں ہے اور اس کا وقت بھی اس کا نہیں ہو گا۔ کیا ایسے کسی مرد کا وجود تھا جو روائت کو توڑ کر اس حقیقت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو گا۔ کہ میری پہلی وفاداری اس سے نہیں بلکہ ہمیشہ پاکستان کے عوام سے رہے گی۔

میں شادی کے سلسلہ میں لوگوں کے احساسات پر بھی متفکر تھی۔ چونکہ میں جوان تھی، میں نے قید میں کتنے ہی برس گزارے تھے اور میری زندگی میں المیہ پر المیہ چھایا رہا۔ میرے دوستوں کی رائے تھی کہ میں لوگوں کی نظروں میں "ولی اللہ" بن گئی ہوں وہ قربانیاں جو میرے خاندان نے ایک جمہوری پاکستان کے لئے پیش کیں اور جن کی بنا پر مجھے اپنے والد، والدہ اور بھائیوں کی سرپرستی اور چاہت سے محروم ہونا پڑا، انہوں نے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال جاگزیں کر دیا تھا کہ وہ سب میرا خاندان ہی تھے۔ پی پی پی کی بنیادی طاقت کا سرچشمہ یہی سرپرستی کا احساس تھا جو لوگوں کو میرے متعلق تھا۔ اگر میں شادی کر لیتی ہوں تو کیا ان کے احساس کو زک نہ پہنچے گی؟۔

دوسری طرف میں نے اپنے آپ سے حجت کی کہ مجرد زندگی سیاسی طور پر پاکستان کے اندر اور باہر میرے لئے اذیت رساں بھی ہو سکتی تھی۔ ہمارے پدر سری معاشرہ میں، مرد مجرد بھی رہے تو بال بیکا نہیں ہوتا، مگر اکیلی عورت پر الزام تراشی معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔ "تم نے شادی کیوں نہیں کی؟" صحافی مجھے عموماً پوچھتے۔ چڑ کر کئی دفعہ میں ان سے پوچھنے کی خواہش رکھتی تھی کہ وہ یہی سوال کسی مجرد مرد سے پوچھنا پسند کیوں نہیں کرتے مگر میں نے ہمیشہ ضبط کیا۔ روائتی مسلمان معاشرہ میں بن بیاہی یا اکیلی خواتین سے صحافیوں کو کبھی واسطہ نہیں پڑا اور غیر معمولی سوالات جنم لیتے ہیں۔

ایسے سوال میں پوشیدہ اور مردوں کے مکمل مکتب خیال کا نمائندہ وہ تعصب تھا جس کے

مطابق بن بیاہی خاتون میں کردار کی خرابی لازمی گردانی جاتی ہے۔ کون جانے ایسی خاتون قابل اعتماد راہنما بھی بن سکے گی؟ دباؤ کی حالت میں وہ کیا کر سکے گی؟ میری صلاحیتوں اور پارٹی پلیٹ فارم پر نگاہ رکھنے کی بجائے، ان کے شکوک تھے کہ ایک مجرد عورت ملک کی راہنمائی کرنے میں بہت زیادہ جنونی بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ یا پھر بہت زیادہ جارح ہوگی یا بہت زیادہ بزدل۔ ایک مسلمان معاشرے میں یہ حقیقت سچ بھی تھی کہ جہاں شادی کو ہی ایک مرد اور عورت کی زندگی کا معراج تصور کیا جاتا ہے اور اولاد اس کا فطری نتیجہ۔

آصف زرداری، آصف زرداری، آصف زرداری، اس کے خاندان کی دو سالہ جستجو اور تحقیق کے بعد بھی نہ ہی اس نے اور نہ ہی اس کے خاندان نے اپنی کوشش کو ترک کیا تھا۔ ماضی میں میرا طریق کار یہ تھا کہ ایسی تجاویز پر کارروائی کو اتنا طول دیدیا جاتا کہ دوسری پارٹی یا تو تھک ہار کر بیٹھ جاتی یا خیال کرتی کہ ہمیں ان میں دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن زرداری ایسے نہیں تھے۔ فروری ۱۹۸۷ء میں میں افغانستان پر ایک ٹیلی ویژن کے مباحثہ میں شرکت کے لئے لندن گئی۔ آصف کی سوتیلی والدہ انہی دنوں غیر متوقع طور پر اپنی پرانی سکول کی دوست آنٹی بہجت سے ملنے کے لئے لندن آئیں۔ "آصف اتنا رحمدل ہے، اتنا شائستہ ہے، اور اتنا فیاض ہے" آنٹی بہجت نے آصف کے بارے میں گفتگو شروع کروں۔ "بینظیر کو اسے ملنے کی ترغیب دو" آنٹی منا بھی اس خاندانی ترغیب میں شامل ہو گئیں۔ "وہ تمہیں مل چکا ہے۔ تم ہی اس کی امنگوں پر پورا اترتی ہو۔ وہ دل سے چاہتا ہے کہ تم سے شادی کرے"۔

میری والدہ نے بھی دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ "ہم اس خاندان کو جانتے ہیں" انہوں نے مجھے بتایا۔ "وہ ۳۴ سال کا جوان ہے بالکل تمہاری عمر کا۔ وہ سندھی ہے اور ہمارے رسوم ورواج سے پوری واقفیت رکھتا ہے۔ وہ شہری پیشہ ور لوگوں کی طرح بے اصل یا بے خاندان نہیں ہے جو جہاں سینگ سمائیں اپنا بستر بور یا سمیٹ کر چلے جاتے ہیں۔ وہ دیہاتی ہے اور اپنے خاندان اور قبیلے سے وفادار ہے وہ تمہاری وفاداریوں کی بھی قدر کرے گا"۔

ان کی ترغیبات نے مجھے مزید مشکوک بنا دیا۔ وہ بے روح کرداروں کی عموماً تعریف شروع کر دیتی تھیں اور اس دعویٰ کے ساتھ کہ وہ بہت چاہنے والے اور ہر طرح خیال رکھنے والے شوہر ثابت ہوتے ہیں جبکہ دوسری عورتیں ہر وقت تیز طرار اور خوش خلق مردوں کے تعاقب میں رہتی ہیں۔ میری شادی کبھی پر سکون نہیں رہے گی میں جانتی تھی کہ بے روح شخص کے ساتھ میرا گزارہ مشکل سے ہو گا۔ آنٹی بہجت نے مجھے اور آصف کی سوتیلی والدہ کو چائے پر بلایا۔ میں نے انکار کر دیا۔ ایسی کوئی ملاقات میری رضا مندی کے طور پر دیکھی جائے گی اور اگرچہ میں اپنے آپ کو شادی کے لئے ذہنی طور پر تیار کر رہی ہوں اس کا حقیقت اختیار کر لینا مجھے وحشت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ "مجھے جون تک کا وقت دیں" میں نے اپنے رشتہ داروں سے التجا کی۔ "میں ابھی تیار نہیں ہوں۔"

"تم ایک مکمل اجنبی شخص سے کیسے شادی کر لیتی ہو میں نے پاکستان واپسی پر لاہور میں اپنی ایک دوست سے پوچھا۔" "ایک دفعہ شادی ہو جائے تو تم اس شخص کو مختلف نظروں سے دیکھتی ہو" اس نے کہا۔ میں نے ایک دوسری دوست سے یہی سوال کیا۔ "بیشک تم اسے پہلے کبھی نہیں ملی ہو لیکن تم اس سے محبت کرنا شروع کر دیتی ہو کیونکہ وہ تمہارا شوہر ہے" اس نے جواب دیا۔ "تمہیں اس محاورہ کا علم ہے کہ شادی پہلے ہوتی ہے اور محبت بعد میں خود بخود ہو جاتی ہے۔"

میں نے اپنے طور پر خود بھی تحقیق کی۔ کسی نے مجھے بتایا کہ پولو کھیلتے ہوئے آصف گھوڑے سے گر پڑا تھا اور اپنی بقایا زندگی لنگڑا کر چلتا رہے گا۔ مگر یہ سچ نہیں تھا لیکن اگر ایسا بھی ہو تو میں اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتی۔ لنگڑانا کردار کی کوئی کمزوری نہیں ہے۔ میں نے ایسے شخص سے بات کی جو آصف کے بہت قریب تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی کمزوری اس کی فیاضی ہے ہمیشہ اپنے دوستوں کی مالی مشکلات میں بے دریغ امداد کر دیتا ہے۔ مجھے فیاضی پسند آئی۔ ایک مشترکہ دوست نے آصف کے پختہ ارادہ اور وفاشعاری کو بیان کرتے ہوئے اردو ضرب المثل کا سہارا لیا۔ "وہ دوست، کا دوست اور دشمن کا دشمن ہے" اس تعریف نے مجھے اپنے بھائیوں کی یاد دلادی اور یہ صفت قابل ستائش تھی ان تمام چیزوں کے

باوجود میں حد سے زیادہ مصروف تھی اور بعض اوقات اپنے آپ کو بالکل اکیلا محسوس کرتی تھی۔ ۷۰ کلفٹن ایک وسیع گھر ہے جس میں بھٹو خاندان کی کئی نسلیں بیک وقت سما سکتی ہیں۔ المرتضیٰ بھی بڑی جگہ ہے۔ تاہم اکثر رات کو پورے گھر میں صرف ایک کمرہ روشن ہوتا تھا اور وہ میرا تھا۔ ان دونوں گھروں میں حفاظت کے خاطر خواہ انتظامات نہیں تھے۔ ان دونوں میں کوئی جائیداد نہیں تھی۔ میر یقیناً دوبارہ شادی کرے گا اور جس قدر جلدی ممکن ہو واپس پاکستان آئے گا۔ اپنے بھائی اور اس کی نئی بیوی کے گھر میں میری حیثیت کیا ہوگی؟ مجھے اپنے گھر کی ضرورت تھی، میں نے فیصلہ کر لیا۔

مجھے اپنے اہل و عیال کی بھی ضرورت تھی۔ میری ہمشیرہ کی شادی ہو چکی تھی اور اس کی ایک بچی بھی تھی۔ میرے بھائیوں کے ہاں بھی اولاد تھی۔ ہم نے جن کے خاندان کی مرکزی حیثیت تھی، دوسرے مرکزی حیثیت کے خاندانوں کے لئے جگہ مہیا کر دی تھی۔ ان تمام خاندانوں کے گرداب میں میری کیا حیثیت بنتی تھی؟ موت کا خطرہ بھی میرے دماغ پر سوار رہتا تھا۔ شاہ کے قتل سے پہلے میں نے محسوس کیا تھا کہ ہم ایک بہت بڑا خاندان ہیں، مگر جب ہم صرف تین بہن بھائی رہ گئے تو خاندان بھی چھوٹا لگنے لگا۔ اب صرف ایک بھائی ہونے سے، توازن بگڑ گیا تھا۔ مجھے اپنے بچوں کے ہونے کا خیال زیادہ ستانے لگا تھا۔

میں نے اپنی رشتہ داروں کو آصف سے انگلستان میں ماہ جون میں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اسلام آباد میں انہی دنوں حزب مخالف کی پارلیمانی گروپ کے اجلاس کی وجہ سے میرا سفر موخر ہو گیا۔ جب میں اسلام آباد سے کراچی واپس آئی تو آصف کی سوتیلی والدہ کی طرف سے مجھے ملنے کی خواہش کا ایک رقعہ گھر میں ملا۔ "فخری، فخری! میں اب کیا کروں" میں نے اپنی کزن کو فون کیا۔ "انہیں مل لو اس نے اصرار کیا۔ "اگر تم چاہو تو میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گی" علاوہ ازیں جن شکوک کا تم ہم سے تذکرہ کرتی رہتی ہو وہ بھی ان سے پوچھ لینا۔

"یہ امر باعث شرف و عزت ہو گا اگر آپ آصف کے بارے میں غور فرمائیں" ۷۰ کلفٹن کے رہائشی کمرے میں ایک بے داغ لباس میں ملبوس کیمبرج کے گریجوایٹ نے مجھ سے کہا۔ "شادی سے زندگی میں ایک نیا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔" میں نے یہ کہنے میں ضبط سے

کام لیا کہ ایک عورت کو زندگی کے نئے پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے شادی کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ اس کی بجائے میں آصف کی سوتیلی والدہ کو یہ بتانے پر زور دیتی رہی کہ شادی میرے لئے باعث شرف نہیں بلکہ ایک بھیانک خواب معلوم ہوتی تھی۔ ''سیاست میں میری زندگی عام سی نہیں ہے'' میں نے انہیں بتایا۔ ''میں ہر پانچ سال بعد انتخابات کے انعقاد کا خاموشی سے انتظار نہیں کر سکتی۔ میری سیاست آزادی کے لئے مستقل جدوجہد ہے اور یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ وہ مرد کیا محسوس کرے گا جسے علم ہو کہ اس کی بیوی کی زندگی اس کے گرد نہیں گھومتی؟''۔

''پیاری! آصف بہت خود اعتماد نوجوان ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے سامنے کتنا مہیب سمندر ہے وہ اسکے لئے تیار ہے'' آصف کی والدہ نے مجھے یقین دلایا۔ میں نے مزید کہا۔

''میں تو زیادہ تر سفر میں رہتی ہوں۔ میں اپنے خاوند کو ساتھ ساتھ کہاں لئے پھروں گی۔''

''آصف کی اپنی مصروفیات ہیں اور وہ تمہارے ساتھ ہر جگہ جانے کے تیار نہیں ہو گا'' انہوں نے جواب دیا۔

''میں نے سنا ہے اسے پارٹیوں میں جانے اور لوگوں سے ملنے جلنے کا بہت شوق ہے'' میں نے کہا۔ ''مجھے جو تھوڑا بہت وقت اپنی ذات کے لئے ملتا ہے وہ گھر پر اور اپنی مخصوص دوستوں کے ساتھ گزارنا پسند کرتی ہوں۔''

''یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے'' انہوں نے سادگی سے کہا۔ ''جب مرد گھر بسالیتا ہے تو وہ اپنی بیوی بچوں کے پاس گھر پر رہنا پسند کرتا ہے''۔

حوصلہ افزائی پاکر، میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور سب سے مشکل مسئلہ چھیڑا۔ ''باوجود رواج کے، میں اپنے سسرال والوں کے پاس نہیں رہ سکتی'' میں نے کہا۔ ''گھر میں دن رات سیاسی کارکنوں سے ملاقاتیں اور اجلاسوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے رہائشی کمرے اور کھانے کے کمرے میں بھی ہلچل رہتی ہے۔ مجھے علیحدہ اپنے گھر کی ضرورت ہوگی۔''

"میں اتفاق کرتی ہوں اور آصف بھی اس بات سے اتفاق کرتا ہے" انہوں نے ناقابل یقین سی بات کہہ دی۔ "آصف کی والدہ اور بہنوں کو بھی خلوت کی ضرورت ہوگی۔" یہ کون غیر معمولی مرد ہے میں نے سوچا، اور میں نے اسے لندن میں ملنے کے لئے اپنے پروگرام کو دوبارہ وضع کیا تاکہ خفیہ ایجنسیوں کی گاڑیوں اور ضیاء حکومت کی نگران آنکھوں سے دور بات چیت ہو سکے۔

میں ان سیاسی تقریبوں کی شکر گزار ہوں جن میں ۲۲ر جولائی ۱۹۸۷ء کا سارا دن ذہنی مصروفیت میں گزرا۔ شام ہونے کے ساتھ ساتھ میرا معدہ پریشانی سے کلبلانے لگا اور مجھے اندازہ ہوا کہ آصف سے ملے بغیر چارہ نہیں۔ آنٹی منّا اپنی پریشانی میں کافی کی چسکیاں لے رہی تھیں۔ جب آصف اور اس کی سوتیلی والدہ نے میرے کزن طارق کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی، ڈرائنگ روم کی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے میں نے بے پرواہ نظر آنے کی کوشش کی، لیکن میرا دل آصف کے نزدیک آتے ہوئے قدموں کے ساتھ دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کے لئے بھی وہ قدم کرب انگیز ہوں گے اگرچہ وہ میری نگاہ میں پر اعتماد دکھائی دیتا تھا حاضرین میں سے ہر کوئی غیر ذاتی معاملات پر گفتگو کرتا رہا اور کسی نے بھی شادی کا ذکر نہیں چھیڑا۔

تمام شام آصف اور میں نے آپس میں کوئی گفتگو نہیں کی۔ اس نے عینکیں پہن رکھی تھیں۔ اور میں اس کی آنکھوں کے تاثرات نہ جان سکی۔ جب ملاقات ختم ہوچکی تو مجھے اس کے بارے میں کوئی دلی احساس پیدا نہیں ہوا اور نہ ہی اس وقت جب اگلے روز اس نے ایک درجن گلاب میرے لئے بھیجے۔ تاہم فورٹریم اینڈ میسن کے ہاں سے آموں کا کریٹ جو میری دل پسند مٹھائی کے ایک ڈبے کے ساتھ مجھے بھجوایا گیا وہ بہت لذیذ تھا۔ اسی طرح چیری کا وہ کریٹ بھی جو اس نے سنی کے لے بھجوایا۔

"جواب کیا دیں، پنکی!" میری والدہ نے پوچھا۔ آنٹی بہجت اور آنٹی منانے بھی اس صبح، پھر اگلی صبح پوچھا۔ "مجھے علم نہیں" میں نے کہا۔ میں ٹوٹ کا شکار ہوگئی۔ مجھے پتہ تھا کہ مغرب میں میرے دوست ہمارے عجیب ثقافتی اور سیاسی حالات کو سمجھ پائیں گے جن کے نتیجہ میں ایک ترتیب دی گئی شادی پر رضامند ہو رہی تھی۔ مغرب میں تحریک نسواں مشرق

کی نسبت بالکل مختلف تھی جہاں مذہبی اور خاندانی فرائض مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس مسئلے کا ایک ذاتی پہلو بھی تھا۔ پاکستان کی سب سے بڑی مخالف پارٹی کی رہنما کے طور پر سوائے شدید غیر معمولی حالات میں اپنی منگنی توڑنے یا شادی کے بعد طلاق حاصل کرنے کی بدنامی کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ مجھے ایک ایسے آدمی کے ساتھ بقیہ زندگی گزارنے پر ذہنی تیاری کے لئے آمادہ کیا جارہا تھا جس سے میں صرف تین دن قبل ملی تھی اور وہ بھی دونوں متعلقہ خاندانوں کے معزز افراد کے ہمراہ۔

میں نے آکسفورڈ کے اپنے چند دوستوں سے اس کا تعارف کرایا۔ انہوں نے اسے پسند کیا۔ میں نے ایک اپنی پاکستانی سکول کی سہیلی سے ملایا۔ اس نے اسے بہت دلکش شخصیت کا مالک بتایا اور مجھے شادی کا مشورہ دیا۔ آصف میرے اہل خاندان کو کھانے کے لئے باہر لے گیا مجھے اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھنا پڑا۔ میں نے اپنی بھتیجی فتحی کو اپنے دوسری طرف بٹھالیا جو لگاتار باتیں کرتی رہتی ہے۔

اگلے روز میرے کزن طارق اور آصف کے درمیان روبرو باتیں ہوئی۔ "اگر تم بے نظیر سے شادی کرتے ہو تو تم بھی لوگوں کی نظروں میں آجاؤ گے" طارق نے اسے بتایا۔ "معمولی سے معمولی کام بھی جو تم کرو گے خواہ وہ دوستوں سے رات کو دیر تک ملنا ہی کیوں نہ ہو بے نظیر پر اثرانداز ہوگا" آصف نے بھی طارق کا دل جیت لیا تھا۔ "وہ حالات کو سمجھتا ہے" میرے کزن نے بعد میں مجھے یقین دلایا۔ "وہ مدت سے تمہارے ساتھ شادی کا متمنی رہا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس شادی کی کیا قیمت چکانا پڑے گی۔"

"تمہارا کیا جواب ہے، پنکی!" یاسمین نے زور دیا۔ سنی اور ممی ہر صبح دوڑ کر میرے بستر کے قریب آتیں اور معنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھتیں۔ "اب مسئلہ کیا ہے تم فیصلہ کرنے میں اتنی دیر کیوں لگا رہی ہو؟"۔

"میں ابھی بھی نہیں جانتی۔"

قسمت نے ایک شہد کی مکھی کی شکل میں یاوری کی۔ زرداری سے ملاقات کے چوتھے روز میں فتحی کو ونڈسر پارک میں لے گئی جبکہ زرداری پولو میچ دیکھنے چلا گیا۔ ایک شہد کی

وزیر اعظم بے نظیر بھٹو پرائم منسٹر ہاؤس اسلام آباد میں ۹ زیادہ آبادی والے ممالک کے لیڈروں کی دستاویز پر دستخط کرتے ہوئے۔

مکھی نے میرے ہاتھ پر ڈنک مار دیا۔ رات کے کھانے تک میرا ہاتھ سوج چکا تھا۔ اگلی صبح سوجن مزید بڑھ گئی۔ "میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جارہا ہوں" آصف نے فلیٹ میں آتے ہی مجھے کہا۔ اس نے میرے احتجاجات کو نظر انداز کر دیا۔ فوراً کار منگوالی، ڈاکٹر کا انتظام کیا، نسخہ پر لکھی ہوئی ادویات خرید لیں۔ "پہلی مرتبہ میں اپنی مالک نہیں ہوں" میں نے خیال کیا "میں کسی اور کی تحویل میں ہوں" یہ بھی ایک نفیس اور غیر رسمی احساس تھا۔ قسمت نے ایک مرتبہ پھر ایک دور افتادہ پاکستان ریستوران کی تلاش کے دوران مداخلت کی۔ میری والدہ، صنم، آصف اور میں اپنے کچھ پاکستانی دوستوں کے ہمراہ ڈنر کو جانے کے لئے ایک کار میں گھس بیٹھے۔ ہم راستہ بھول گئے۔ لیکن آصف بے صبر اور چڑ چڑا ہونے کی بجائے کار میں سب کو ہنساتا رہا۔ وہ لچک دار تھا اور حس مزاح بھی رکھتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دوسروں کا لحاظ بھی رکھتا تھا۔

"کیا جواب ہے، پنکی!" اگلی صبح میری والدہ نے پوچھا۔

میں نے گہرا سانس لیا "ٹھیک ہے ممی!" میں نے کہا۔ سات روز بعد میں آصف سے ملی۔ ہماری منگنی ہوگئی۔

"اپنے دینی فرائض کا شعور رکھتے ہوئے اور اپنے خاندانی فرائض سے آگاہ ہوتے ہوئے، اپنی والدہ بیگم نصرت بھٹو کی ہدایت کے مطابق شادی کی تجویز کو خوشی سے قبول کرتی ہوں" اخبارات کو یہ بیان جاری کیا گیا۔ "شادی کسی طور بھی میری سیاسی وفاداری میں مزاحم نہیں ہوگی............ پاکستانی عوام ایک بہتر اور پرامن مستقبل کا حق رکھتے ہیں اور میں یہ حق دلانے کے لئے ہمیشہ ان کے ہمراہ چلوں گی۔"

پاکستان میں اس خبر پر ملا جلا ردعمل تھا۔ میرے بیان کے باوجود حکومت کے گماشتوں نے کوئی وقت ضائع کئے بغیر افواہیں پھیلانا شروع کر دیں کہ میں سیاست کو تیاگ رہی ہوں۔ منظم گروہوں نے شاہراہوں پر چلنے والی بسوں کو روک کر میرے اشتہارات کو اتارنا شروع کر دیا یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اب ان کا کوئی فائدہ نہیں جب کہ میں شادی کر رہی ہوں۔ "پی پی پی کے پرچم کو ابھی تک کیوں لہراتے پھر رہے ہو" پارٹی کے کارکنوں کو طنزاً کہا گیا۔ "بے نظیر نے تم کو چھوڑ دیا ہے اور الگ ہوگئی ہے۔" پی پی پی کے حامیوں کے خوف کو

مزید ممیز ملی جب آصف کی والدہ کا ایک جعلی انٹرویو حکومت کے سرکاری اخباروں کی زینت بنا۔ "میں جنرل ضیاء کو شادی پر مدعو کر رہی ہوں" ان کی رائے مبینہ طور پر شائع کی گئی لیکن ملک کے لوگوں کی اکثریت خوش تھی کہ میں معمول کی زندگی گزارنا چاہ رہی ہوں۔ تین روز تک شہروں میں مٹھائی کی دوکانوں پر خرید و تقسیم کی بھرمار رہی کیونکہ لوگ اس واقعہ کا جشن منا رہے تھے۔ "دس برس تک رونا دھونا ہی رہا ہے، بالا آخر خوشی منانے کا وقت آ گیا ہے" سب جگہ یہی رائے تھی۔ زرداری قبیلہ بہت خوش تھا۔ پندرہ ہزار زرداری نواب شاہ میں آصف کی زمینوں پر گاتے، رقص کرتے اور پی پی پی کے پرچم لہراتے آصف کے استقبال کے لئے اکٹھے ہو گئے۔

جب میں پاکستان واپس لوٹی، میں نے پورے ملک کا دورہ کیا اور لوگوں کو یقین دلایا کہ میں ان کی بہن ہوں اور ہمیشہ ان کی بہن رہوں گی اور یہ کہ میری شادی کا میری سیاسی زندگی پر کوئی سایہ نہیں پڑے گا۔ آصف ہر رات مجھے فون کرتا جہاں کہیں بھی میں ہوتی اور اس طرح آہستہ آہستہ میں اس کی طبیعت کی شناسا ہو گئی۔ میرے خیال کے برعکس ہم میں بہت سی عام باتیں مشترک تھیں۔ اس کے خاندان نے بھی مارشل لاء کے ہاتھوں زک اٹھائی تھی۔ اس کے والد حاکم علی کو فوجی عدالت نے سات سال کے لئے سیاست سے خارج کر دیا تھا اور حکومت نے اس کی حیدر آباد میں ۱۸۰۰ ایکڑ اراضی کی فصلوں کو پانی کاٹ کر تباہ کر دیا تھا۔ زیادہ تکلیف کا سامنا اس منگنی کے بعد پڑا جب قومیائے گئے بینکوں نے حاکم علی کے تعمیری منصوبوں کے لئے قرضہ جات یکایک بند کر دیئے۔ "تم غلطی کر رہے ہو" لوگوں نے ہماری منگنی کے اعلان پر حاکم علی کو کہا۔ "تمہارا اکلوتا بیٹا بے نظیر سے شادی کر رہا ہے اب پوری فوج اور افسر شاہی تمہاری دشمن ہو جائے گی" "مجھے اس کی پرواہ نہیں" حاکم علی نے جواب دیا۔ "میرے بیٹے کی خوشی ہی میرے لئے سب کچھ ہے"۔

مجھے علم تھا کہ آصف کو، پارٹی کی سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ "ایک خاندان میں ایک سیاستدان ہی کافی ہوتا ہے" لندن میں پریس کے استفسار پر اس کا جواب تھا۔ لیکن بہت سے جاگیردار خاندانوں کی طرح، وہ مقامی سیاست میں دلچسپی لیتا تھا اور ۱۹۸۵ء کے انتخابات میں نامزدگی کے کاغذات داخل کئے تھے۔ بعد میں ایم آر ڈی کے فیصلہ کے مطابق

اس نے ان کا بائیکاٹ کر دیا تھا، اور اسے بھی مارشل لاء سے زک اٹھانا پڑی تھی۔

نصف شب کے قریب اسے اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ فوج نے اس پر الزام لگایا کہ وہ سڑکوں پر بے لائسنس ہتھیار لہراتا پھر رہا تھا۔ آصف کی خوش قسمتی کہ فوجی عدالت میں یہ جھوٹی کہانی سچی ثابت نہ ہو سکی۔ ''میں نے صرف دو راتیں جیل میں گزاریں۔ یہی کافی تھا'' آصف نے میری ایک دوست کو بتایا ''میں صرف تصور ہی کر سکتا ہوں کہ بے نظیر پر کیا بیتی ہوگی۔ ''

اس نے مجھے ہیرے اور نیلم کی دل کی شکل کی انگوٹھی دی۔ وہ ہر روز مجھے گلاب کے پھول بھیجتا۔ ہم باتیں کرتے رہتے اور باتیں کرتے رہتے۔ ''ہماری شادی اب دو اجنبیوں کی شادی نہیں'' اس نے مجھے بتایا۔ جب ہم لڑکپن میں تھے وہ مجھے اس سینما میں آتے اور جاتے دیکھتا تھا جس کے مالک اس کے والد تھے۔ دو دہائیوں بعد اس کا خیال مجھ سے شادی کرنے کا تھا، اس کے والدین کا نہیں۔ ''اگر آپ میری شادی کرنا چاہتے ہیں تو بے نظیر کے لئے کوشش کریں۔ '' اس نے اپنے والد کو پانچ سال قبل بتایا تھا۔ اس نے تب سے صبر کے ساتھ انتظار کیا تھا۔ ''کیا تمہیں اس سے محبت ہے؟'' ایک صحافی نے اسے پوچھا۔ ''کیا ہر ایک کو نہیں؟'' اس کا جواب تھا۔ ہمیں ابھی آپس میں محبت نہیں ہوئی تھی، مگر میری والدہ مجھے یقین دلاتی تھیں کہ بعد میں محبت ہو جائے گی۔ اس کی بجائے ہماری ذہنی عقیدت تھی کہ ہم بطور میاں بیوی مثالی جوڑا ثابت ہوں گے اور ہمیشہ کے لئے ایسا ہو گا۔ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ یہ بندھن محبت سے زیادہ پائیدار ہو گا۔ اگرچہ میں مرتب شادیوں کی ترجمانی یقیناً نہیں کرتی اور نہ ہی کروں گی مگر مقبولیت میں کچھ نہ کچھ احساس بنیاد بنتا ہے، جو اسے پائیداری بخشتا ہے۔ ہمیں اس شادی میں پہلے سے کوئی تصورات یا توقعات نہیں تھیں سوائے باہمی عزت اور ہمدردی سگالی کے۔ میں سمجھتی تھی کہ توقعات اس قدر بلند و بالا ہوتی ہیں کہ وہ آخر میں زمین بوس ہو جاتی ہیں۔ ایک قسم کا خوف بھی لاحق رہتا ہے کہ محبت ختم ہو گئی تو شادی بھی دگرگوں ہو جائے گی۔ ہماری محبت نے تو ابھی بڑھنا تھا۔

دسمبر ۱۹۸۷ء میں شادی سے ایک ہفتہ قبل ہی ۷۰ کلفٹن کے باہر ہجوموں نے ڈیرہ ڈالنا

شروع کر دیا۔ تحائف دروازے پر ہی آنے شروع ہوگئے۔ سندھ سے ہاتھوں سے بنی ہوئی سادہ شلوار قمیصیں، پنجاب سے کشیدہ کاری کے دوپٹے، مٹھائی، پھل، گڑیائیں اور گڈے جو آصف اور مجھ سے مماثلت رکھتے تھے۔ کئی مرتبہ میرے رشتے دار بھی ہجوم میں شامل ہو جاتے اور خوشی میں ان کے ساتھ رقص کرتے۔ عورتیں اور بچے آتے اور باغ میں بیٹھ جاتے۔

یہ بھی رواج ہے کہ شادی سے ایک دو ہفتے قبل دلہن الگ رہتی ہے نظر بد سے بچنے کے لئے زرد لباس پہنتی ہے۔ اور کوئی میک اپ نہیں کرتی۔ لیکن میرے پاس اس قدیم روائت کا پاس کرنے کے لئے وقت نہیں تھا۔ جسے عرف عام میں مایوں بیٹھنا کہا جاتا ہے۔ میرے پاس کام کی وجہ سے شادی سے پہلے دو ہفتے تک بیکار بیٹھے رہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ہم تو ہنی مون کے لئے بھی کہیں جانا نہیں چاہتے تھے۔

ہم نے باقی ملک کے لئے مثال قائم کرنے کے لئے مزید روائتوں سے بھی بغاوت کی۔ شادی باوقار اور سادہ طریقہ سے ہونا تھی۔ پاکستان کے متعدد خاندانوں کی طرح نہیں جو ہفتہ بھر فضول رسومات میں اپنی عمر بھر کی کمائی کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ اور پھر قرض کی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ۲۱ سے لے کر ۵۱ ملبوسات کے جوڑے جو دولہا کا خاندان رواجاً دلہن کے خاندان کو پیش کرتا ہے اس کی بجائے میں نے صرف دو جوڑوں پر اکتفا کیا...... ایک جوڑا شادی کے دن کے لئے دوسرا شادی کے دو دن بعد زرداریوں کی طرف سے ولیمہ کی دعوت کے لئے۔ دلہن کے شادی کے لباس پر عموماً گوٹے سے کشیدہ کاری کی جاتی ہے، لیکن میں نے درخواست کی کہ میرے لباس پر اوپر یا نیچے گوٹے کی جھالر استعمال کی جائے، لیکن دونوں کناروں پر نہیں۔

زیورات کے تحائف بھی روائت کا حصہ ہیں۔ دلہن اکثر گلوبند سے لے کر کمر تک لٹکتے ہاروں کے زیورات کے سات سیٹ پہنتی ہے۔ میں نے آصف سے صرف دو سادہ سیٹوں کا مطالبہ کیا...... ایک شادی کے دن کے لئے اور دوسرا ولیمہ کے لئے۔ میں ایسی زندگی نہیں گزارتی جہاں زیورات کا تحفہ دینے کیلئے تمہاری ساری عمر پڑی ہے۔" میں نے آصف کو

تسلی دی جو مجھے بہترین سیٹ دینا چاہتا تھا۔ میں نے روائتی سونے کی چوڑیاں پہننے سے بھی احتراز کیا جو دلہنیں عموماً دونوں بازوؤں پر کہنی تک پہنچتی ہیں اور صرف چند سونے کی باقی کانچ کی چوڑیاں پہننے کو ترجیح دی۔ میں چاہتی تھی۔ کہ لوگ کہہ سکیں کہ اگر بے نظیر شادی کے روز کانچ کی چوڑیاں پہن سکتی ہے تو میری بیٹی کیوں نہیں۔ میں نے اپنا نام قائم رکھنے پر بھی زور دیا۔ اگر ۳۴ سال تک میں بے نظیر بھٹو تھی تو میں اپنی شناخت کو بدلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی ہوں۔

میرے محبوب کے ماتھے پر بال چمک رہے ہیں، اس کے بال چمک رہے ہیں۔ میرے محبوب کے ماتھے پر بال چمک رہے ہیں لاؤ، مہندی لاؤ، میرے محبوب کے ہاتھوں پر لگاؤ۔ ۱۷ر دسمبر کو رسم حنا سے پہلے تین دنوں تک میری ہمشیرہ میری کزن بہنیں اور میری سہیلیاں ۱۷ کلفٹن میں جو ہمارے گھر ملحقہ عمارت تھی اور جہاں ہمارا استقبالیہ اور دفاتر تھے گیتوں اور رقص کی مشق کرتی رہیں تاکہ دولہا کے خاندان والوں سے مہندی پر مقابلہ کیا جاسکے۔ سمیعہ، سلمیٰ، پوتنی اور امینہ وہاں تھیں اور یاسمین بھی جو سیدھی لندن سے پرواز کر کے یہاں آئی تھی۔ ہر روز انگلستان سے دوست آتے رہے۔ کونی سائیفرٹ جس نے میری والدہ کو طبی وجوہات کی بنا پر بیرون ملک علاج کے لئے ضیاء کو اجازت دینے پر مجبور کیا۔ آکسفورڈ کے دنوں کے دوست ڈیوڈ ساسکنڈ، کائتھ گریگوری اور دوسرے۔ وکٹوریا شیفیلڈ جس کے ویزا کو حکومت نے آخری لمحات میں روک لیا تھا۔ این فیڈی مین اور میری سابقہ ہم جماعت یولندا کو ڈرز کی دور افتادہ امریکہ سے آئے۔ این لائف میگزین کے لئے میری شادی کی تفصیلات پر مضمون لکھنے کے لئے آئی۔ ''۱۹۸٦ء میں تم اشک آور گیس کے بھبھو کے سونگھنے کے لئے یہاں آئی تھیں۔ میں نے این سے ہنستے ہوئے کہا ''اچھا ہے اب ہنسنے اور رقص کرنے کے لئے آئی ہو'' یہ ایک معجزانہ ملاپ تھا، تعلقات جو نہ صرف قائم رہے بلکہ مارشل لاء کے مظالم نے انہیں مضبوط بنا دیا تھا۔ میرے والد کے وکلا آئے اور اسی طرح بہت سے سابق سیاسی قیدی، ڈاکٹر نیازی کے ۷۰ کلفٹن میں آنے پر ہلچل مچی۔ اگرچہ میرے والد کے دانتوں کے ڈاکٹر کو اسلام آباد میں کئی شدید الزامات کا سامنا تھا

دنیا کے عظیم باکسر محمد علی' وزیر اعظم بے نظیر بھٹو سے ملاقات کر رہے ہیں

وہ میری شادی پر چھ سالہ جلاوطنی کے بعد آئے تھے۔ کراچی میں وہ محفوظ تھے۔ لیکن کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ شادی کے بعد اسلام آباد اپنی طبّی پریکٹس دوبارہ شروع کرنے کے لئے جائیں گے تو کیا حشر ہو گا۔ میری والدہ فکر مندی سے ہر جگہ گھومتی پھر رہی تھیں تاکہ تمام تفصیلات سے آگاہی رہے۔ ۱۹۸۲ء سے وہ پاکستان میں نہیں رہی تھیں اور حیرانی کی بات نہیں کہ وہ آرام کی نیند سونے میں مشکل محسوس کر رہی تھیں۔ "

جب ہمارے دوست اور رشتہ دار ۷۰ کلفٹن میں جمع ہو رہے تھے، تو ہزاروں لوگ کراچی میں مرکز لیاری میں بھی اکٹھے ہو رہے تھے۔ ہم دو شادیوں کا انتظام کر رہے تھے ایک گھر پر اہل خاندان اور دوستوں کی موجودگی میں اور دوسری کراچی کے غریب ترین علاقے میں لوگوں کے درمیان جہاں پی پی پی کا مضبوط قلعہ تھا۔ ہم نے پارٹی کے حامیوں کو جو مارشل لاء کے دوران گرفتار کئے گئے تھے اور شہیدوں کے خاندانوں کو عوامی استقبال میں شامل ہونے کے لے ۱۵۰۰۰ (پندرہ ہزار) دعوت نامے بھجوائے تھے۔ استقبال کا انتظام ککری گراؤنڈ میں کیا گیا تھا۔ جو لیاری میں ایک وسیع کھیل کا میدان ہے جہاں میرے والد پہلے سیاستدان تھے جنہوں نے غیر مراعات یافتہ طبقے سے خطاب کیا تھا اور جہاں ۱۴ر اگست ۱۹۸۶ء کے مظاہرے میں پولیس کے ذریعہ چھ اشخاص کو قتل کیا گیا، سینکڑوں کو پیٹا گیا اور اشک آور گیس کا نشانہ بنایا گیا۔ ککری گراؤنڈ کے کچھ حصے عام لوگوں کے لئے الگ کر دیئے گئے تھے۔

رسم حنا سے ایک شب قبل میں برقعہ پہن کر لیاری چلی گئی تاکہ تیاریوں کا معائنہ کر سکوں۔ بحری مزدور یونین اور دوسری یونینوں کے اراکین ککری گراؤنڈ میں ۴۰ × ۵۰ فٹ کے ٹھوس چوبی اور ۸۰ ٹن فولادی تعمیر شدہ بڑے سٹیج کے آخری مراحل میں ٹیپ ٹاپ کرنے میں مصروف تھے۔ وسیع میدان کو روشن رکھنے کے لئے ہنگامی جنریٹرز بھی نصف کئے گئے تاکہ اگر حکومت کے ایماء پر بجلی منقطع کر دی جائے تو کام چلایا جاسکے۔ تمام کارروائی کو دکھانے کے لئے گراؤنڈ کے چاروں طرف بڑے سکرین کے ۲۰ ٹیلی ویژن سیٹ بھی لگا دیئے گئے۔ یاسمین صدبرگ اور گلاب کے پھولوں کے گچھے، قالین سے مرصّع سٹیج پر

نشستی حصہ کے دونوں جانب لٹکا دیئے گئے اور خصوصاً ان کرسیوں کے گرد جن پر آصف اور میں نے بیٹھنا تھا۔

پی پی پی کے سرخ، سبز اور سفید رنگوں کے برقی قمقمے میدان کے ارد گرد پانچ منزلہ عمارتوں پر روشنیوں کے ہاروں کی شکل میں آویزاں کئے گئے تھے۔ میرے والد کی دعاؤں کے ساتھ میرے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے ایک بڑی تصویر ایستادہ کی گئی تھی جس پر روشنی پڑنے کا خصوصی اہتمام تھا۔ ہمیں ککری گراؤنڈ میں ایک لاکھ افراد کی آمد کی توقع تھی۔ کم از کم دس ہزار تو ڈیرا ڈال چکے تھے بعض اندرون سندھ سے پیدل چل کر اور بعض اپنے بائیسکلوں پر آئے تھے۔ وہ میرے بھائی بہنوں کی طرح تھے وہ سمجھتے تھے کہ انہیں کسی دعوت نامے کے تکلف کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنے ہی گھر کی ایک شادی میں شامل ہو رہے تھے۔

ڈھولکیوں کے بجنے کی آواز۔ خواتین گیت گاتی ہوئیں۔ میرے رشتہ داروں کی طرف سے استقبالیہ پٹاخے، دولہا کی برات ۱۷ر دسمبر کو مہندی کے لئے ۷۰ کلفٹن پہنچی۔ آصف کے عزیزوں نے ایک بڑی پلیٹ میں حناء کو ایک مور کی شکل میں سجایا ہوا تھا جس کے دم کے پر اصلی تھے۔ میری خواتین رشتہ داروں نے زرداری کی برات کے افراد کو پھولوں کے ہار پہنائے جب وہ باغ میں تشریف لا چکے۔ آصف برات کے درمیان میں تھا اس کے سر پر اس کی بہنوں نے ایک شال تان رکھی تھی۔ مجھے اطمینان ہوا جب میں نے اسے پیدل آتے دیکھا کیونکہ اس نے مجھے پولو کے ایک گھوڑے پر سوار ہو کر آنے کی دھمکی دی تھی۔

ہم دونوں آر سی مصحف کی رسم کے لئے ایک بنچ پر بیٹھ گئے جسے ۷۱ - کلفٹن کی سیڑھیوں کے اوپر رکھا گیا تھا...... دونوں گھروں کی خواتین اور سہیلیاں بنچ کے دونوں اطراف بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے گیت میرے عزیزوں نے گائے وہ شائد کسی نے سنے بھی یا نہیں، کیونکہ ان میں آصف کو نصیحت کی گئی تھی کہ وہ بچوں کا خیال رکھے گا۔ جب بے نظیر سیاسی مہم پر گئی ہوئی ہو اور نہ ہی اسے جیل جانے سے روکے گا۔ یاسمین، صنم، لیلا اور دوسری سہیلیوں نے گایا۔ "آصف! تمہیں تائید کرنا ہوگی کہ بے نظیر قوم کی خدمت

کرے گی" اور پھر آصف کی طرف سے خود ہی جواب بھی دیتیں۔ "یہ میری طرف سے ٹھیک ہی ہے کیونکہ میں اپنی بیوی کی خدمت کر کے قوم کی خدمت کر رہا ہوں گا"۔

کھانے کی میزوں کی طرف بڑھنے سے پہلے دو سو کے قریب ہمارے قریبی دوستوں نے باغ میں رنگین شامیانوں کے سائے میں تالیاں بجائیں اور خوب باتیں کیں۔ میں نے ممی کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔ خبر نہیں وہ خوشی کے آنسو تھے یا اس خوف کے کہ غیر ملکی فوٹو گرافروں کی ایک بڑی تعداد ہمارے حفاظتی انتظامات کو تلپٹ کر کے اندر گھس آئی تھی اور آصف اور مجھے اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھی مہندی کلیتاً ہمارا خاندانی معاملہ تھا لیکن پریس میں برصغیر میں صدی کی سب سے عظیم شادی کی تشہیر نے صحافیوں کو دور دراز کے ملکوں سے بھی آنے پر اکسایا تھا۔ عرب ممالک کے صحافی، جرمنی، فرانس، ہندوستان، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور انگلستان کے علاوہ مقامی صحافیوں کی بہت بڑی تعداد شادی کے جشن کی رپورٹنگ کے لئے آئی تھی۔

میری بڑی خواہش تھی کہ میرا بھائی میر بھی ہمارے ساتھ ہوتا جب اگلی شب ہم سب باغ میں نکاح کے لئے جمع ہوئے۔ وہ تو صنم کی شادی پر بھی نہیں آسکا تھا اور نہ ہی خاندان کا کوئی فرد افغانستان میں اس کی شادی میں شامل ہوسکا تھا۔ میر نے حکومت کو میری شادی پر پاکستان آنے کی دھمکی دی تھی، مگر ایسی صورت میں اس کے پکڑے جانے اور گرفتار ہونے کا خطرہ تھا۔ لیکن میری والدہ نے اسے ایسا خطرہ مول لینے سے منع کر دیا تھا۔

"اتنا تیز نہ چلو، تم عوامی جلسے میں نہیں جارہی ہو" سنی نے گلابی رنگ کے میرے چہرے پر پڑے گھونگھٹ میں سے جھانکتے ہوئے مجھے کہا جب وہ اور ممی مجھے باغ میں شادی کے لئے بنائے گئے سٹیج پر لے جارہی تھیں۔

"دلہنیں متانت سے چلتی ہیں" آنٹی بہجت نے قرآن مجید کا میرے سر پر سایہ کرتے ہوئے پکارا میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

شادی کی سٹیج پر بیٹھتے ہوئے میں نے آنکھیں شرم سے جھکائے رکھیں۔ میرا کزن شاد مسکراتے ہوئے میرے پاس آیا۔

"مردوں کے آنے میں اتنی دیر کیوں ہوگئی ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا کہ آصف کی جانب کیا ہو رہا ہے جہاں ہماری خاندانی مسجد کا مولوی شادی کے کلمات پڑھ رہا تھا۔

"منظور آہے؟" شاد نے مجھے سندھی میں پوچھا۔ میں سمجھی وہ مجھ سے مذاق کر رہا تھا کہ آیا میں تیار ہوں۔ آہے میں نے جواب دیا۔ "لیکن وہ ہیں کہاں؟"۔

وہ صرف مسکرایا اور مزید دو مرتبہ یہی سوال دہرایا۔ "آہے، آہے" میں نے جواب دہرا دیا۔

میں نے جب غور کیا تو اب سمجھ آئی کہ تین مرتبہ "ہاں" ایک مرد گواہ کے سامنے کہنے کا مطلب تھا کہ میں شادی شدہ خاتون بن گئی ہوں۔

حرف "س" سے شروع ہونے والی سات اشیاء میرے ارد گرد رکھ دی گئیں اور اسی طرح مٹھائی کی پلیٹیں، چاندی اور سونے کے اوراق میں لپٹے ہوئے خشک پھلوں کے مغز، چاندی کی طشتری میں چاندی میں لپٹی موم بتیاں بھی میرے پاس رکھ دی گئیں۔ ہزاروں روشنی کے سفید قمقمے باغ کو منور کر رہے تھے۔ سٹیج کے گرد جلتی بجھتی روشنی کے بلبوں کا ہار سجاوٹ میں اضافہ کر رہا تھا۔ میری رشتے دار خواتین نے سبز اور سنہری کشیدہ کئے شال کو میرے سر کے اوپر آویزاں کیا جب آصف بھی میرے ساتھ شامل ہوگیا۔ ہم دونوں نے سامنے رکھے آئینے میں دیکھا اور ایک دوسرے کو اپنے ساتھی کے طور پر پہچانا۔ ہوا میں پٹاخے گونج اٹھے جب میری والدہ اور میری خالاؤں نے ہم دونوں کے سروں پر پسی ہوئی چینی کا چھڑکاؤ کیا تاکہ ہماری پوری زندگی شیریں رہے۔ پھر ہمارے دونوں کے سروں کو ٹکرایا جو ہمارے ملاپ کی نشانی تھی۔

کراچی شہر اس شب جشن کی خوشیوں سے پاگل ہوگیا۔ ہزاروں لوگ ۷۰ کلفٹن کے باہر آصف کی اور میری ایک جھلک دیکھنے کے لئے جمع ہوگئے تھے جب ہم ایک بلاک کے فاصلے پر کلفٹن کے باغات میں ایک استقبالیہ میں شامل ہونے کے لئے باہر آئے۔ پی پی پی کے رضا کاروں نے ہجوم میں سے مہمانوں کے لئے راستہ بنایا تاکہ وہ ۷۰ کلفٹن سے چند سو گز کے

فاصلے تک پیدل جاسکیں۔ جب ہم ایک گھنٹہ بعد لیاری میں عوامی استقبالیہ میں شامل ہونے کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ بھر سڑکوں اور گلیوں میں ہمارے خیر خواہوں کے ہجوم ایستادہ تھے، جیپوں پر لاؤڈ سپیکروں سے بلند آواز میں شادی کے گیت گائے جارہے تھے اور شادی کے یہی گیت پورے پاکستان میں ہماری شادی کے اعزاز میں گائے گئے۔ پی پی پی کے رنگوں کی روشنیاں ہر جگہ آویزاں تھیں خاص طور پر اس چوک کے مرکز میں جہاں ایک سال قبل متعدد لوگ اشک آور گیس کا شکار ہوئے تھے۔ راستہ بھر بہت سی عمارتیں روشنیوں سے سجائی گئی تھیں۔

ککری گراؤنڈ میں لوگوں کا ہجوم دولاکھ سے تجاوز کر گیا اور گلیوں میں پھیل گیا۔ آصف نے پہلی دفعہ پی پی پی کے لئے عوام کی محبت اور حمایت کا نظارہ دیکھا اور وہ پریشان تھا جب حفاظتی گارڈوں نے ہجوم میں سے پجیرو کے لئے راستہ بنایا۔ کھیل کے میدان میں ایک انچ زمین خالی نہیں بچی تھی۔ گراؤنڈ کے ارد گرد عمارتوں کی بالکنیوں میں کسی اور شخص کے کھڑا ہونے کی گنجائش نہیں تھی۔ کئی دنوں سے پی پی پی کی خاتون اراکین پی پی پی کے رنگوں کے ڈبوں میں شادی کی مٹھائی باندھ کر رکھ رہی تھیں تاکہ لیاری میں لوگوں کو تقسیم کر دی جائے۔ چالیس ہزار ڈبے ایک گھنٹے میں ختم ہو چکے تھے۔

" جئے بھٹو، جئے بھٹو " کی لوک موسیقی پورے ہجوم کو مست کر رہی تھی۔ لوگ تالیاں بجارہے تھے اور رقص کر رہے تھے۔ گرم ہوا کے غبارے فضا میں اڑائے گئے جس کے ساتھ ساتھ آگ کی امواج لہرارہی تھیں۔ آتش بازی کے مظاہرے میں اندھیری فضا میں سینکڑوں راکٹ چھوڑے گئے اور زمین پر سونے چاندی کے فوارے ابل پڑے۔ میں نے ہجوم کو ہاتھ ہلا کر خوش آمدید کہا۔ انہوں نے جواب میں اپنے ہاتھ لہرائے۔ ان کی امیدوں اور خوابوں پر میرے شادی شدہ ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

ضیاء کے خفیہ محکمہ کے گماشتے، مجھے یقین ہے، لیاری میں لوگوں میں گھسے ہوئے تھے تاکہ اسے بتا سکیں کہ میری شادی کی وجہ سے میری عوامی حمایت میں کمی آگئی ہے۔ لیکن

محترمہ بے نظیر بھٹو، صوبہ سرحد کے ممتاز سیاسی راہنماؤں، خان عبدالولی خان، آفتاب احمد خان شیرپاؤ اور بیگم نسیم ولی خان کے ہمراہ

حکومت کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ "اب ضیاء اس وقت تک انتخابات نہیں کرائے گا جب تک بے نظیر کے ہاں اولاد نہ ہو جائے،" سمیعہ نے ۷۰ کلفٹن واپسی پر عشائیہ سے لطف اندوز ہونے سے پہلے مذاقاً کہا۔ ہر ایک قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اگرچہ آصف بڑے خاندان میں یقین رکھتا تھا مگر ہم نے انتظار کا فیصلہ کیا۔ ہمیں شادی شدہ زندگی میں ہم آہنگی کی ضرورت تھی اور آپس میں بھی ذہنی موافقت کی۔ اور میری سیاسی ترجیحات جوں کی توں تھیں۔

"آج، اس موقع پر جو میرے لئے ذاتی اور اہم ہے، میں پاکستان کے عوام سے اپنے عہد کی تصدیق کرتی ہوں اور آمریت سے اس عظیم قوم کی آزادی اور ہر شہری کی فلاح و بہبود کے لئے اپنی زندگی قربان کرنے کی دوبارہ قسم اٹھاتی ہوں،" میں نے شادی کی صبح پریس کے لئے بیان تحریر کیا تھا۔ "میں ماضی کی طرح آئندہ بھی کسی قربانی سے دریغ نہیں کروں گی خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ میں اپنے بھائیوں اور بہنوں کے شانہ بشانہ یعنی پاکستان کے عام لوگوں کے ہمراہ ایک مساویانہ معاشرہ کی تشکیل کے لئے کوشاں رہوں گی جو ظلم و تشدد، رشوت ستانی اور ہر قسم کے تناؤ سے پاک ہو۔ یہ کل بھی میرا مطمح نظر تھا۔ یہی میرا اور تمہارا مشترکہ خواب ہے اور یہی لائحہ عمل ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہے گا۔"

باب ۱۵

جمہوریت کی نئی امید

۲۹ر مئی ۱۹۸۸ء کو جنرل ضیاء نے اچانک پارلیمینٹ تحلیل کر دی، اپنے نامزد کردہ وزیراعظم کو برطرف کر دیا اور انتخابات کا اعلان کر دیا۔ میں ۷۰ - کلفٹن میں لاڑکانہ سے آئے ہوئے پارٹی اراکین کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھی جب یہ چونکا دینے والا پیغام مجھے پہنچا۔ "تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے" میں نے کہا "جنرل ضیاء انتخابات سے پیچھا چھڑاتا ہے وہ ان کا انعقاد نہیں کرا سکتا۔" باوجود میرے پارٹی اہل کاروں کی یقین دہانی کے کہ ضیاء نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر سات بجکر پندرہ منٹ پر شام اعلان کیا ہے، مجھے اس کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ "کسی دوسرے ملک کی خبر سے تم نے اس خبر کو الجھا دیا ہے" میں نے کہا۔

مبارک باد کے فون ۷۰ - کلفٹن میں آنے شروع ہو گئے اور دروازے کے باہر اخباری ہاکروں کے شور نے ضیاء کی اس ناگہانی چال کی تصدیق کر دی۔ بعض کے نزدیک وقت مشکوک تھا۔ چار روز قبل کراچی کے ایک اخبار نے اعلان کر دیا تھا میں امید سے ہوں۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ جب تمہارے ہاں اولاد ہونے والی ہوگی تو ضیاء انتخابات کرائے گا" سمیعہ نے فاتحانہ انداز میں مجھے پریس کانفرنس کے بعد کہا۔ آیا ضیاء کا اعلان میری

حالت کے ردعمل میں وقوع پذیر ہوا یا نہیں، لیکن میرے امید میں ہونے کی خبر کے بعد ہی اعلان ہوا تھا۔ اس میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اگرچہ آصف کا اور میرا فیصلہ تھا کہ بچوں کی پیدائش میں کچھ انتظار بہتر رہے گا مگر اس غیر متوقع خبر پر ہم بہت محظوظ ہوئے۔ ضیاء کے اس ڈرامائی اعلان کے ساتھ، ۱۹۸۸ء کا سال بہت سے غیر متوقع واقعات کے انعقاد کا شاخسانہ معلوم ہوتا تھا۔

ضیاء کی نیت اور ارادے کا کسی کو کچھ علم نہیں تھا، یہاں تک کہ وزیراعظم جونیجو کو بھی نہیں جو ابھی ابھی مشرق بعید کے دورے سے واپس آیا تھا اور ٦ بجے شام ایک پریس کانفرنس کر رہا تھا۔ ایک گھنٹے سے بھی کم عرصے میں، جونیجو کے ایک معاون نے جو ضیاء کے نشریئے کو سن چکا تھا، ضیاء کے وزیراعظم کو خبردار کیا کہ اسے برطرف کر دیا گیا ہے۔ حکومت کی تحلیل کے چار اسباب بتائے گئے، نفاذ اسلام میں وزیراعظم کی حکومت کی تاخیر اور ناکامی، ماہ اپریل میں اوجڑی کے اسلحہ کے ڈپو میں تباہ کن دھماکوں (جن کی وجہ سے شہری آبادی سینکڑوں میزائلوں اور بموں کا نشانہ بنی) کی تحقیقات میں بدانتظامی، انتظامیہ میں بدعنوانی اور تمام ملک میں امن و امان کی معطلی۔

اگرچہ ضیاء کے نامزد وزیراعظم سے میرا کبھی واسطہ نہیں رہا تھا تاہم مجھے جونیجو کی برطرفی کے اس کم ظرف طریق کار پر افسوس ہوا۔ جونیجو نے ضیاء کے مقاصد کی خوبی کے ساتھ خدمت کی تھی۔ ضیاء کے آئین پر مہر تصدیق ثبت کرنا، مارشل لاء کے دور میں جاری احکامات اور اعمال پر عام معافی نامہ، ضیاء کی بطور صدر اور چیف آف آرمی سٹاف ۱۹۹۰ء تک توثیق...... لیکن میں نے جلد ہی بھانپ لیا کہ اس کے لئے کہیں سے کسی نے بھی ہمدردی کے دو حرف تک نہیں کہے۔ "جب تم کتوں میں بیٹھو گے تو کاٹے بھی جاؤ گے۔" ردعمل میں لوگوں نے ایسے ہی سخت سست جملے کہے۔ جونیجو کے کتبہ کے طور پر متعدد اشخاص نے پڑھا "وہ آدمی جو تاریخ کے اندر لڑھک گیا پھر تاریخ سے باہر لڑھک گیا" اس کے باوجود ضیاء کے اعلان پر ملک بھر کا ردعمل پرجوش تھا۔ ضیاء کے اپنے آئین کے مطابق حکومت کی برطرفی کے بعد ۹۰ دنوں کے اندر اندر انتخابات کا انعقاد لازمی تھا اور اکثریت کا جائزہ تھا کہ

فتح پی پی پی کی ہوگی۔ ''کوئی مائی کا لال اب پی پی پی کی فتح نہیں روک سکتا'' ایک کے بعد دوسرے حامی کا یہی ردعمل تھا، مگر میں نے محتاط رہنے کی تلقین کی۔ اگرچہ میں نے بین طور پر انتخابات کے وعدے کا مشروط مثبت جواب دیا۔ ''اگر ۹۰ دنوں کے اندر اندر جماعتی بنیادوں پر آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات منعقد ہوجائیں، تو ہم انہیں خوش آمدید کہیں گے'' لیکن پوشیدہ طور پر مجھے ان کے انعقاد میں شک و شبہ تھا۔

آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کا مطلب پی پی پی اور بھٹو خاندان کی واپسی تھی۔ ضیاء کے اقوال ریکارڈ پر تھے کہ وہ ''اقتدار کبھی ان لوگوں کے حوالے نہیں کرے گا جن سے اس نے چھینا تھا۔'' اگر وہ مسٹر جونیجو جو اس کی اپنی تخلیق تھا، کے ساتھ چلنے میں دقت محسوس کرتا رہا تو وہ اس شخص کی بیٹی کو بطور وزیراعظم کیسے قبول کرے گا جسے اس نے خود موت کے گھاٹ اتار دیا تھا؟ ضیاء جونیجو کو برطرف کرکے پارلیمینٹ کو پی پی پی کے ہاتھوں میں جانے نہیں دے گا'' میں نے بغلیں بجانے والے حامیوں کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا۔ بدقسمتی سے لیکن لازمی طور پر، ضیاء کے اگلے اقدامات نے میرے بدترین خدشات کی تصدیق کردی۔

۱۵ر جون کو ضیاء نے نفاذ شریعت یعنی اسلامی قانون کو ملک کے اعلیٰ ترین قانون کا درجہ دینے کا اعلان کردیا۔ ضیاء نے ٹیلی ویژن کے خطاب میں اس کی مطلقاً کوئی تعریف نہ کی کہ یہ کیا تھا یا کیا نہیں تھا؟؟ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ اس کا مطلب کیا تھا؟ کیا اس کا مطلب ایسے کرنسی نوٹوں کا خاتمہ تھا؟ جن پر بانی پاکستان محمد علی جناح ؒ کی تصویر ثبت تھی کیونکہ بعض مکاتب اسلام کے مطابق انسانی چہرے کی تصویر کشی غیر اسلامی تھی۔ کیا اس کا مطلب حکومت کے تمسکات جن میں سود کی شرح مقرر کی گئی تھی؟ تمام غیر قانونی اور بے سود قرار پائیں گے؟ کوئی ہدایت نامہ جاری نہیں کیا گیا تھا۔ مختصراً یہی سمجھا گیا کہ کوئی بھی شہری موجودہ قوانین کو ہائی کورٹوں میں ''غیر اسلامی'' قرار دے کر چیلنج کرسکتا تھا۔ اگر عدالت نے قانون کو خلاف اسلام پایا، تو جج اسے منسوخ کرسکتے تھے۔ لیکن ضیاء نے نفاذ شریعت کے لئے ۱۹۸۸ء تک انتظار کیوں کیا؟

اکثریت کا خیال تھا کہ ضیاء کی طرف سے اسلام کا تازہ استحصال مجھے نقصان پہنچانے کے لئے تھا۔ اردو پریس کا اندازہ تھا کہ ضیاء متعصب مسلمان علماء کی اسلام کی تاویلات کو مجھے بطور عورت انتخابات میں کھڑا ہونے سے روکنے کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ یا بعد میں قومی اسمبلی میں فاتح جماعت کی رہنما کی حیثیت سے مجھے نااہل قرار دلا سکتا تھا۔ لیکن مجھے اس کی کامیابی میں شکوک تھے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق جسے ملک کی مذہبی جماعتوں نے منظور کر لیا تھا، عورتیں سربراہ حکومت بننے کی مجاز تھیں...... اسی طرح ضیاء کا ۱۹۸۵ء کا آئین بھی عورتوں کے سربراہ حکومت بننے کو جائز قرار دیتا تھا۔ ضیاء کی خواہشات کا دائرہ اس ضمن میں تنگ ہو رہا تھا۔

ہمیں پہلے سے زیادہ شک ہو گیا تھا کہ انتخابات منصفانہ اور غیر جانبدارانہ نہیں ہوں گے۔ تاہم پی پی پی نے اپنا دباؤ جاری رکھا اگرچہ ہمیں کچھ خبر نہیں تھی کہ آیا سیاسی جماعتوں کو امیدوار کھڑا کرنے کی اجازت بھی دی جائے گی یا نہیں اور یہ کہ انتخابات کا انعقاد کس تاریخ کو ہو گا؟ باوجود ضیاء کے اعلان کے کہ انتخابات کی تاریخ کا اعلان اسلامی قوانین کے نفاذ کے بعد کیا جائے گا، کسی تاریخ کا حتمی اعلان ابھی تک نہیں کیا گیا تھا۔ فروری میں ہم نے ضیاء کے ۱۹۸۵ء کے ووٹروں کی رجسٹریشن کی شق کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا تھا جس کے مطابق تمام سیاسی پارٹیوں کا حکومت کے پاس رجسٹرڈ ہونا لازمی تھا۔ ضیاء کے قوانین کے تحت، تمام سیاسی پارٹیوں کو جو انتخابات میں حصہ لینے کی خواہش مند تھیں، ضروری تھا کہ وہ اپنے حسابات اور عہدیداروں کی فہرستیں اس کے نامزد کردہ الیکشن کمیشن کے پاس جمع کرائیں۔ ان اطلاعات کی روشنی میں الیکشن کمیشن کسی سیاسی پارٹی کو انتخابات میں حصہ لینے سے روک سکتا تھا، جو اس کے خیال میں اسلامی نظریات کے خلاف ہو، حالانکہ نظریہ کی اب تک کوئی حتمی تعریف نہیں کی گئی تھی۔ اس طرح کمشنر پارٹی کے عہدہ داروں کے الیکشن میں کھڑا ہونے پر ۱۴ سال کے لئے پابندی لگا سکتا تھا یہاں تک کہ سات سال تک سزائے قید بھی دینے کا مجاز تھا۔

یہ ایک ایسا قانون تھا جو پی پی کو مبینہ طور پر انتخابی میدان سے باہر نکالنے اور شہریوں کے

انجمن بنانے کے بنیادی حق آزادی کو نہ صرف معطل کرتا تھا بلکہ ضیاء کے نامزد کردہ حاکم کو یہ کہنے کا حق عطا کرتا تھا کہ کونسی پارٹی حصہ لے سکتی تھی اور کون سی نہیں؟ ہماری خوش قسمتی تھی کہ مسٹر یحییٰ بختیار پاکستان کا سابق اٹارنی جنرل جس نے میرے والد کی اپیل داخل کی تھی۔ سپریم کورٹ میں اس کیس کو پیش کرنے کے لئے راضی ہو گیا...... گیارہ ججوں کے بینچ نے کیس کی سماعت کی...... عدالت کی تاریخ میں اتنا بڑا بینچ پہلے تشکیل نہیں کیا گیا تھا۔ ان کا متفقہ فیصلہ جس کا اعلان ۲۰ر جون ۱۹۸۸ء کو کیا گیا، پاکستان کے عوام کی اخلاقی اور قانونی فتح پر منتج ہوا۔ ضیاء کی رجسٹریشن کی شق کو مکمل طور پر کالعدم قرار دیا گیا۔

"پارلیمانی حکومت پارٹی کی حکومت ہوتی ہے اور پارٹی کی حکومت ہی ایک نمائندہ حکومت کا لازمی اصول ہے" چیف جسٹس نے اپنے بیان میں لکھا۔ "انتخاب کم از کم حکومت کرنے کے دعویٰ کی تصدیق کا قانونی ذریعہ مہیا کرتا ہے۔" چیف جسٹس سے اتفاق کرتے ہوئے، سپریم کورٹ کے ایک دوسرے جج نے تحریر کیا "قانون ساز اسمبلی کے لئے ذاتی حیثیت میں منتخب ہونے والے افراد کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی...... وہ سیاسی منظر پر بے بادبان کشتی کی طرح بے مقصد لڑھکتے رہتے ہیں۔ مگر جب وہ بطور ایک جماعت اپنے آپ کو ایک گروہ میں منسلک کر لیتے ہیں تو وہ ایک قوت بن کر فیصلوں پر اثرانداز ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک سیاسی پارٹی کے رکن بن کر ہی نہ کہ اپنی انفرادی حیثیت میں قانون ساز اسمبلی کے ارکان اپنے مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ضیاء کی "رجسٹریشن کی شق" کو کالعدم قرار دینے میں سپریم کورٹ کی نیت واضح تھی۔ کسی پارٹی کو خواہ وہ رجسٹرڈ ہو یا غیر رجسٹرڈ ہو۔ انتخابات میں حصہ لینے سے روکا نہیں جاسکتا۔ عدالت کا فیصلہ واضح تھا...... ہر شہری کا بنیادی حق ہے کہ وہ اپنی پسند کی سیاسی جماعت کے ذریعہ انتخابات میں حصے لے۔ انتخابات سیاسی جماعتوں کی بنیاد پر ہی منعقد ہونا تھے۔ ضیاء کے آئین کے تحت بھی دوسرا کوئی آئینی راستہ نہیں تھا۔ لیکن ضیاء جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں۔ اپنے آپ کو پاکستان کے قوانین کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے ملک کا دورہ جاری رکھا...... لاڑکانہ سے جیکب آباد گئی جہاں لوگوں کے جوشیلے ہجوم نے استقبال کیا۔ پھر نواب شاہ گئی

جہاں مسلم لیگ کے سابق اراکین نے پی پی پی میں شمولیت کا اعلان کیا۔ جب میں کراچی واپس لوٹی تو مسلم لیگ کے پارلیمانی ممبران نے ہماری پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ لوگوں کا جوش اور ولولہ پی پی پی کے حق میں بلند ہو رہا تھا اور سب چلتی گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ تمام متوقع امیدوار پارٹی کی حمایت حاصل کرنے میں کوشاں تھے تاکہ ووٹوں کے لئے پی پی پی کا نشان مل سکے۔

اس بات کا قدم قدم پر ثبوت مل رہا تھا کہ ضیاء کی بے تکی چالیں الٹی پڑ رہی تھیں۔ ہمیں رپورٹیں مل رہی تھیں کہ ضیاء جو عمومی طور پر خاموش اور سرد مزاج مشہور تھا...... کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا اور وہ اپنا سکون کھو بیٹھا تھا۔ ''جنرل ضیاء کا وطیرہ پر اغلاط اور غیر مستحکم ہو چکا ہے'' ایک سیاسی تجزیہ نگار نے مجھے بتایا ایک ریٹائرڈ فوجی افسر نے کہا۔ ''ضیاء نے ہمیشہ سوچ سمجھ کر خطرات مول لئے ہیں، لیکن اب وہ جوئے بازوؤں کی طرح عمل کر رہا ہے...... اس کی باتوں اور عمل میں منطق باقی نہیں رہی۔'' ضیاء کے ہوش ضرور اڑے ہوں گے جب باوجود موسم گرما کی بارشوں اور جھلستی گرمی کے، ملک کے طول و عرض میں پی پی پی کے عوامی جلسوں میں لوگوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچنے لگی تھی۔ لاہور میں جولائی کے مہینے میں اخباری رپورٹوں کے مطابق میرے جلسے میں لوگوں کی تعداد اتنی ہی تھی جتنی ۱۹۸۶ء میں جلاوطنی سے واپسی پر میرے استقبال کے لئے جمع ہو گئی تھی۔ ضیاء کا دماغ چیخ گیا۔ ایک استقبالیہ میں، پی پی پی کے ایک وفادار کارکن نے ضیاء سے بہت قریب رہنے والے شخص کے تاثرات کھینچے ''جنرل ضیاء بہت مایوس، پریشان اور بے حوصلہ رہنے لگا ہے'' اس نے کہا ''وہ تنکوں کو پکڑ کر مروڑتا ہے اور بے سمت ہو گیا ہے......'' میرے تعلق والے شخص نے بتایا کہ اس نے ضیاء کو مشورہ دیا ہے کہ انتخابات منعقد کرا دے، عوامی نتائج کو قبول کر لے اور خود ملک چھوڑ جائے...... وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس پر آپ کا رد عمل کیا ہو گا۔'' ضیاء کی طرف سے ایسے اقدام جن کی بعد میں دوسروں نے تصدیق بھی کی، پی پی پی سے سودا کرنے کی کوشش تھی۔ ''ضیاء اور اس کے خاندان کے خلاف کسی قانونی کارروائی سے احتراز کرنے کے بدلے میں وہ انتخابات کرا دے گا۔ چند دوسرے

ممالک اس کے ضامن ہوں گے " میں نے انکار کر دیا۔ نہ صرف مجھے ایسی پیشکش کی دیانت پر شبہ تھا بلکہ مجھے اس میں کوئی معقولیت بھی نظر نہیں آئی۔ "ضیاء ایسی سودا بازی کرکے میرے تشخص کو داغ دار کرنا چاہتا ہے" میں نے پیغام بر کو جواب دیا۔ "علاوہ ازیں میں نہیں جانتی کہ وہ خوفزدہ کیوں ہے؟ اگر وہ انتخابات منعقد کراتا ہے تو اس میں غصے اور رنجش کی کونسی بات ہے اور اسے اپنی حفاظت کے لئے ضامنوں کی کیا ضرورت ہے؟ لوگوں کا غصہ تو اس بات پر بڑھے گا اگر وہ انتخابات کے انعقاد سے انکار کردے۔" تمام مباحثہ اس پر ختم ہو گیا اور مزید کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ میں نے ملک کا دورہ جاری رکھا۔

بفضل خدا میں چاق وچوبند تھی اور طاقت سے بھرپور۔ "مجھے تو پتہ نہیں چلتا کہ آپ بچے کی ماں بننے والی ہیں" ایک خاتون ڈاکٹر نے سفر کے دوران پوچھا۔ "ہمارا خیال تھا کہ ضیاء کی انتخابات کرانے کی یہ بھی ایک سیاسی چال تھی۔" مجھے حیرانی ہوئی کہ پورے ملک میں ہر جگہ اس شبہ کا اظہار کیا گیا۔ "لوگ مجھے پوچھتے رہتے کہ اگر میں واقعی بچے کی ماں بننے والی ہوں تو اس قدر ہیجان خیز سفری پروگرام پر عمل کیسے کر سکتی ہوں" فخری نے بھی تھک ہار کر مجھے یہی سوال کیا۔ لیکن اتنا کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا کہ آرام سے بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ اگر ضیاء نے اپنے آئین کی پاسداری کرتے ہوئے انتخابات کرا دیئے تو وہ اگست میں لازماً ہوجائیں گے۔

میں ۷۰ - کلفٹن میں ۲۰ر جولائی کی صبح آسٹریلوی سفیر کے ساتھ ناشتے کی میز پر تھی جب ایک چٹ مجھے پہنچائی گئی۔ انتخابات، ضیاء نے ابھی ابھی اعلان کیا ہے ۱۶ر نومبر کو منعقد کئے جائیں گے۔ یہ مانتے ہوئے کہ انتخابات آئین کی رو سے قومی اسمبلی کی تحلیل کے بعد ۹۰ دنوں کے اندر اندر ہونے چاہئیں، ضیاء نے ان کو موسم برسات، ماہ محرم اور پھر حج کے مہینہ کے پیش نظر موخر کر دیا ہے۔ تنازع جو محرم میں وقوع پذیر ہوتا ہے، ضیاء نے استدلال دیا وہ انتخابات کو ناممکن بنا دے گا۔ اسی طرح اگر انتخابات آئینی مدت کے دوران کرا دیئے جائیں تو ۹۰ ہزار حاجی حج کی وجہ سے اپنے حق رائے دہی سے محروم ہوجائیں گے۔ اور برسات پہلے ہی ملک کے متعدد حصوں میں سیلاب کا سبب بن چکی ہے۔ مجھے اس کے یہ بہانے نگلنے میں

بہت دقت محسوس ہوئی۔ التواء کا اصلی سبب میری جسمانی حالت تھی۔ ضیاء نہیں چاہتا کہ میں انتخابی مہم کو جاری رکھنے کے قابل رہوں۔ چلئے آخر کار ایک تاریخ تو طے ہو گئی اور ہمیں تھوڑا سا اطمینان نصیب ہوا۔ ضیاء آئین سے انحراف کر چکا تھا اور ہمیں کماحقہ، یقین نہیں تھا کہ وہ نومبر میں دوبارہ انحراف نہیں کرے گا اور انتخابات کو منسوخ نہیں کر دے گا۔ ہمیں ابھی تک یہ بھی خبر نہیں تھی کہ ضیاء کا منصوبہ جماعتی بنیادوں پر انتخابات منعقد کرانے کا تھا یا غیر جماعتی بنیادوں پر۔ تاہم تمام علامتوں سے ضیاء کے کیمپ میں پریشانی کی تصویر دکھائی دیتی تھی۔ وزیراعظم جونیجو اور قومی اسمبلی کی مئی میں برطرفی کے بعد مسلم لیگ کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ ضیاء کو پی پی پی کے چیلنج کا سامنا کرنے کے لئے انہی وزراء اور وزیراعظم کی چاپلوسی کرنا پڑی جن کو وہ بدعنوان اور نااہل قرار دے چکا تھا۔

اپنے حفاظتی باڑے کی مرمت کرنے کے لئے ضیاء اپنی عبوری نگران حکومت کے لئے جونیجو کابینہ کے نو وزراء کو دوبارہ متعین کر چکا تھا۔ دراصل نئے ۱۷ وزراء اور ایک وزیر مملکت میں سے برطرف شدہ سینٹ کے سات ارکان تھےاور قومی اسمبلی کے دس۔ ضیاء نے بے قاعدگیوں اور بدعنوانی کے الزامات لگا کر سابق ممبران اسمبلی سے ان کے جذبات اور احساسات کو مجروح کرنے پر بر سرعام معافی بھی مانگ لی تھی۔ بر سرعام اس معافی نامے کا مطلب وزیراعظم جونیجو کی عارضی تسلی بھی تھا۔ ستم ظریفی یہ بھی تھی کہ صرف دو ماہ کی برطرفی کے بعد ضیاء نے محسوس کیا کہ اسے جونیجو کی دوبارہ ضرورت ہے پی پی پی کی قوت میں کسی کمی کے آثار نہ دیکھ کر ضیاء کا انتخابی سٹاف بھی خوفزدہ ہو چکا تھا۔ جب میں نے لاڑکانہ میں الیکشن کمیشن کے پاس ووٹروں کی فہرست حاصل کرنے کے لئے ایک نمائندہ بھیجا تو اسے اگلے دن آنے کے لئے کہا گیا۔ اگلے دن پھر اگلے دن آنے کے لئے کہا گیا پھر اس سے اگلے دن اور پھر اس سے اگلے دن۔ "تم معاملہ کو ہر روز موخر کیوں کر رہے ہو؟" میرے نمائندے نے پوچھا۔ خوفزدہ اہل کار نے جواب دیا۔ "ہم نے اسلام آباد اجازت حاصل کرنے کے لئے تار بھیجا ہے۔ ابھی تک اس کا جواب موصول نہیں ہوا۔"

پی پی پی سے ضیاء کا خوف ۲۱ر جولائی کو مکمل طور پر عیاں ہو گیا۔ یہ دعویٰ کرتے ہوئے

وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو قومی اسمبلی کے ایک اجلاس سے خطاب کر رہی ہیں

کہ جماعتی بنیاد پر انتخابات اسلام کی روح کے خلاف ہیں کیونکہ جماعتی فیصلے انفرادی ضمیر پر اثرانداز ہوسکتے ہیں۔ اور یہ کہ لوگوں کی اکثریت اس کے خیال سے متفق ہے۔ ضیاء نے اعلان کیا کہ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر منعقد ہوں گے اور امیدواروں کو ووٹ کی پرچی پر کسی سیاسی جماعت کے نشان لگانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ایک مرتبہ پھر، آبادی کی وسیع اکثریت کو اس شناخت سے محروم کر دیا گیا کہ وہ کس کو ووٹ دینا چاہتے ہیں۔ مزید براں ضیاء کے طریق کار کی بدولت صرف بااثر افراد ہی اوپر آسکیں گے اور یہ ان مخلص سیاسی کارکنوں کی قیمت پر ہوگا جو پارٹی کی حمایت کے بغیر انتخاب نہیں جیت سکتے۔

ایک مرتبہ پھر ضیاء نے آئین کی اور ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے جذبات کی خلاف ورزی کی تھی۔ ۳۱ر جولائی کے اخبارات کی رپورٹ نے اس کا سبب بھی واضح کر دیا۔ اپنے تازہ خلاف جمہوریت اعلان سے قبل ضیاء نے چاروں صوبوں کے سیکرٹریوں اور دیگر اعلیٰ افسروں کو اس بات پر مذاکرات کے لئے اسلام آباد طلب کیا تھا کہ آیا انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہونا چاہئیں یا غیر جماعتی بنیادوں پر۔ مسلم لیگ میں اندورنی خلفشار کی وجہ سے، اخبار نے رپورٹ دی، بلوچستان، سندھ، پنجاب اور سرحد کے تمام رہنماؤں نے محسوس کیا کہ پی پی پی کو انتخابات جیتنے کے لئے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ منقسم مخالفین، صوبہ سرحد کے رہنما نے بیان کیا، "بے نظیر بھٹو کے لئے واحد اکثریتی گروپ کے طور پر ابھرنے کے لئے آسانی مہیا کریں گے۔" تین دن بعد، ضیاء نے غیر جماعتی بنیاد پر انتخابات کا اعلان کر دیا۔

ایک مرتبہ اور، ہم نے عدالتوں کا رخ کیا اور اوائل اگست میں سپریم کورٹ میں ایک درخواست پیش کر دی جس میں ضیاء کے غیر جماعتی انتخابات کو آئینی بنیادوں پر چیلنج کر دیا گیا۔ لیکن کیا سپریم کورٹ میں فتح کا کوئی حقیقی فائدہ ہوگا کیونکہ ضیاء نے عدالت کے پہلے فیصلے کی خلاف ورزی کر کے توہین عدالت کا ارتکاب کیا تھا۔ اگر سپریم کورٹ جماعت بنانے کے بنیادی حق کی بنا پر ہمارے حق میں فیصلہ دے بھی دے تو ضیاء ہنگامی حالات کے نفاذ کا اعلان کر کے ایسے فیصلے سے جان چھڑا لے گا۔ وہ ایسے کسی مرحلے کی پہلے سے ہی

تیاری کر رہا تھا۔ ۴ر اگست کو ماہ محرم کے آغاز پر، ایک شیعہ رہنما کو پشاور میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ مخالف ہونے کی بنا پر ہم نے اندازہ لگایا کہ قتل کے پیچھے حکومت کا یہ عندیہ تو کار فرما نہیں کہ باہمی مناقشات کو ہوا دے کر ہنگامی حالت کے اعلان کے لئے جواز پیدا کیا جائے۔ ضیاء کی جیت کو ہر طرح ممکن بنانے کے لئے، افواہوں نے مزید زور پکڑا نئے انتخابی قوانین زیر تشکیل ہیں تاکہ کامیاب امیدواروں کو بھی اس بہانے نااہل قرار دیا جاسکے کہ وہ سیاسی جماعتوں کی حمایت سے جیتے تھے۔ ہمارے زرائع نے ہمیں بتایا کہ ایسی قانون سازی اکتوبر کے پہلے ہفتہ کے دوران کی جائے گی تاکہ ضیاء کے مخالفین کو انتخابات سے قبل ایسے قانون کو عدالت میں چیلنج کرنے کے لئے بہت کم وقت ملے۔ صاف ظاہر تھا کہ آمر غیر جماعتی انتخابات، دہشت اور مخصوص انتخابی قوانین کے ذریعے اپنی پسند کے انتخابی نتائج حاصل کرنے کا پختہ ارادہ رکھتا تھا۔

جب نومبر کے انتخابات قریب آگئے تو پاکستان کا مستقبل جمہوریت اور جاری آمریت کے دوارہے پر معلق نظر آتا تھا۔ پاکستان کے عوام حق خودارادیت کے لئے واویلا مچا رہے تھے۔ ان کی نمائندہ آواز صرف پاکستان پیپلز پارٹی تھی، اور ضیاء بھی اس بات کو جانتا تھا۔ ساڑھے گیارہ سال کے عرصہ کے بعد بھی وہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے انعقاد میں پس و پیش کر رہا تھا مبادا پی پی پی جیت جائے۔

غیر جماعتی انتخابات کے امکان کا سامنا کرتے ہوئے ہمیں ہر ٹھوس اور معروف امیدوار کی ممکنہ ضرورت تھی۔ مجھے امید تھی کہ میری والدہ الیکشن میں حصہ لینے کے لئے بروقت پاکستان پہنچ جائیں گی اور کہ میں اپنی ہمشیرہ صنم کو بھی انتخاب لڑنے کی ترغیب دے سکوں گی۔ ان رکاوٹوں کے باوصف، پی پی پی کا پختہ عزم تھا کہ وہ ضیاء کو قانونی دائرے کے اندر رہتے ہوئے پرامن جمہوری زرائع سے چیلنج کرے کیونکہ کسی مہذب ملک کی ریڑھ کی ہڈی یہی قوانین ہوتے ہیں۔ بندوقوں اور اشک آور گیس کے گولوں کے ذریعے لوگوں کی آبادی کو اطاعت اور فرماں برادری پر مجبور تو کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی روح پر تسلط حاصل نہیں جاسکتا۔ ضیاء جانتا تھا کہ وہ لوگوں کے دلوں کو کبھی بھی جیت نہیں سکا اور نہ ہی ان کی

حمایت حاصل کر سکا ہے۔ اس کی بجائے اس نے دھمکی اور دہشت سے حکومت کی تھی۔

جس طرح صحرا میں پھول نہیں کھل سکتے۔ اسی طرح سیاسی جماعتیں آمریت میں پھل پھول نہیں سکتیں...... اپنے خلاف خونخوار اقدامات کے باوجود سیاسی جماعتیں اگر آمریت کے گیارہ سالوں میں زندہ رہ سکیں اور پنپ سکیں تو یہ ان لوگوں کے لئے خراج عقیدت ہے جنہوں نے جمہوریت کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ دیا اور پاکستان کے عوام کے لئے بھی جو سمجھتے تھے کہ ان کے حقوق کی بحالی اور حفاظت تبھی ممکن ہے اگر وہ ایک قومی جماعت میں مدغم ہو جائیں۔ ہم ملک کا ضمیر، مستقبل اور امید تھے اور ہیں۔

باب ۱۶

اختتامیہ

زندگی میں بعض لمحات اس قدر بھونچکا کرنے والے، اس قدر غیر متوقع ہوتے ہیں کہ انہیں بھلایا نہیں جاسکتا۔ میں یہ کتاب مکمل کر چکی تھی جس میں میں ضیاء الحق کے ظالمانہ مارشل لاء کی حکومت کا کچا چٹھا بیان کرنا چاہتی تھی کہ ایک ایسا ہی لمحہ در آیا۔

پاکستان کے مشرقی حصہ میں بہاولپور کے فوجی ہوائی اڈے سے واپسی پر ۱۷/اگست ۱۹۸۸ء کو جنرل ضیاء ایک ہوائی حادثے میں مارا گیا۔ تیس دیگر افراد بھی اس کے ساتھ ہی مارے گئے جن میں جائنٹ چیف آف سٹاف کا چیئرمین، وائس چیف آف آرمی سٹاف، پاکستان مسلح افواج کے ۸ اعلیٰ افسر، پاکستان میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کا سفیر آرنلڈ رافیل اور ایک امریکی بریگیڈیئر جنرل شامل تھے۔

خبر آہستہ آہستہ پھیلی "ایک صحافی نے ابھی ابھی اطلاع دی ہے کہ طیارہ غائب ہو گیا ہے جس میں ایک اعلیٰ ترین شخصیت بھی سوار تھی" ایک سہ پہر کو پارٹی کارکنوں سے ملاقات کے دوران میری سیکرٹری فریدہ نے ایک چٹ بھجوائی۔

"اس کا کیا مطلب ہے" میں نے اسے پوچھا۔

"یہ جنرل ضیاء کا جہاز تھا" فریدہ نے آہستہ سے کہا جیسے وہ صدمہ کی وجہ سے اونچی

آواز میں کچھ کہنے سے قاصر تھی۔

ضیاء درحقیقت مرچکا ہے میرے ذہن میں بھی یہ خیال نہیں ابھرا۔ میں سمجھی وہ مفرور ہو گیا ہے کیونکہ مجھے ایک ماہ قبل کی اس کی پیشکش یاد آ گئی جس میں اس نے اپنی اور اپنے خاندان کی جان بخشی کے عوض انتخابات کے انعقاد کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا ضیاء کا عہد بالآخر ختم ہو گیا تھا۔

"اس صحافی کو فون پر ملاؤ" میں نے اپنی سیکرٹری سے کہا۔

صحافی نے ڈرتے ڈرتے پیغام کو دہرایا۔ "ضیاء کا طیارہ غائب ہو گیا ہے" اس نے کہا۔

"ریڈیو کا تعلق بھی منقطع ہو چکا ہے"۔

تمہارا "غائب ہونے" سے کیا مطلب ہے؟ میں نے ذرا زور دے کر کہا۔

"کیا طیارہ ایران، انڈیا افغانستان چلا گیا ہے؟ کیا ضیاء اپنی مرضی سے گیا ہے یا اس کے طیارے کو اغواء کیا گیا ہے؟ تفصیلات بتاؤ"۔

بے چارہ آدمی صاف بات کرنے میں اس قدر خوفزدہ تھا کہ معموں میں باتیں کرنے لگا۔

"طیارہ اس سہ پہر اسلام آباد واپس نہیں پہنچا۔ تین گھنٹوں سے ریڈیو تعلق بھی منقطع ہے"۔

ایک اور فون فوراً ہی موصول ہوا۔ یہ سابق جنرل اور سرحد کے پی پی پی کے رہنما کا تھا۔

"کچھ نہ کچھ ہو گیا ہے۔ فوج حرکت میں آ گئی ہے" اس نے کہا۔

"کیا دوستی کی حرکت ہے یا دشمنی کی؟" میں نے اس امکان کو سوچتے ہوئے اسے کہا کہ ضیاء نے فرار ہونے سے پہلے اقتدار فوج کے حوالے کر دیا تھا یا فوج کو پورے ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کیلئے حکم دیا تھا جب کہ وہ ابھی یہیں مقیم تھا۔

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا" پارٹی کے رہنما نے کہا۔

ایک اور فون پارٹی کے ایک رکن سے موصول ہوا "طیارے کا ایک حادثہ ہو گیا ہے"

اس نے کہا "ضیاء مرگیا ہے اور تمام جرنیل جو طیارے میں سوار تھے، مارے گئے ہیں"۔

لیکن میں ابھی تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر سکتی تھی۔ دہشت اور کرب کے ان تمام سالوں کے بعد یہ سمجھنا اچنبھا سا محسوس ہوتا تھا کہ ضیاء اس دنیا کو چھوڑ گیا ہے۔ میں نے اس کے اس طرح خاتمے کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا، اگرچہ امکان تو ہمیشہ ہی موجود تھا۔ یہ تمام علاقہ تشدد سے بھرا ہوا ہے۔ اس کا عہد بھی تشدد سے شروع ہوا تھا اور کیوں نہ وہ تشدد پر ہی ختم ہو؟۔

پھر بھی اس بات کو ہضم کرنا آسان نہیں تھا۔ میں ضیاء کو طیارے میں فرار ہوتے تو تصور کر سکتی تھی اور میرے خیال میں آمریت کا خاتمہ ایسے ہی ممکن تھا۔ مارکوس فلپائن سے بھاگ گیا تھا شاہ ایران سے باہر پرواز کر گیا تھا۔ دووالئیر ہیٹی سے طیارے میں بھاگ گیا تھا۔ میرا ہمیشہ یہ تصور رہا کہ جب ضیاء کا خاتمہ قریب ہو گا وہ ایک طیارہ میں بیٹھ کر باہر پرواز کر جائے گا۔

"میں نے ابھی ابھی فوجی کور کمانڈر سے بات کی ہے" ایک اور فون کال آئی "طیارہ بہاولپور سے اپنی اڑان کے تھوڑی دیر بعد تباہ ہو گیا اور کوئی سوار زندہ نہیں بچا"۔

مجھے بالآخر یقین آ گیا۔ اسی طرح ان تمام حامیوں کو بھی یقین آ گیا جو ۷۰ - کلفٹن کے ڈرائنگ روم میں جمع ہو رہے تھے، وہ حامی جو قید خانے میں رہے تھے اور جنہوں نے کوڑوں کی سزائیں برداشت کی تھیں، جن کے خاندان بے روزگار ہو گئے تھے جنہوں نے اپنے مردوں کو بغیر دیکھے دفن کر دیا تھا۔ اپنی سیکرٹری کو ہدایت دے کر کہ وہ پارٹی کے ارکان سے رابطہ کرے جو عدالت میں انتخابی لائحہ عمل جاننے کیلئے گئے ہوئے تھے اور ایم آر ڈی کے حلیفوں سے بھی ملے، میں اوپر کی منزل میں اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی تاکہ لندن اپنی ہمشیرہ کو فون کر سکوں۔ صنم گھر پر نہیں تھی۔ میں نے پیغام دیدیا مگر الفاظ میرے گلے میں اٹک رہے تھے۔ "اسے بتا دو" میں نے کہا "جنرل ضیاء مرگیا ہے"۔

جونہی میں نے یہ الفاظ ادا کئے، مجھے اپنے کندھوں سے بے بہا بوجھ اترتا ہوا محسوس

ہوا۔ گیارہ برسوں کی دہشت اور اذیت کے بعد ہم آزاد ہوگئے تھے اور وہ جاچکا تھا۔ ضیاء ہمیں دوبارہ تکلیف نہیں پہنچا سکے گا۔

ایک ایسے ملک میں جہاں خبر سیلاب کے پانی کی طرح تنگ گلیوں اور بازاروں میں تیزرفتاری سے پھیلتی ہے لوگ جشن منارہے تھے۔ لاہور میں مٹھائی کی دکانیں خالی ہوگئیں۔ کراچی میں پان مفت تقسیم کیاگیا۔ خبر ملنے کے آدھ گھنٹے کے اندر اندر ۷۰ - کلفٹن کے باہر ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ وہ بلند آواز سے گارہے تھے اور سیاسی نعرے لگارہے تھے۔ "طیارے کے حادثہ کا تمہیں کیسے پتہ چلا" میں نے انہیں پوچھا۔ اخبارات کے ہاکر آوازیں دے رہے تھے کہ "ضیاء مرگیاہے ضیاء مرگیاہے" ایک نے مجھے بتایا۔ "موٹر کاریں اپنے ہارن بجابجا کر اپنی کھڑکیوں کے شیشے نیچے کرکے اعلان کررہی تھیں کہ ضیاء مرگیاہے"۔ ایک دوسرے نے بتایا۔

مجھے فکر تھی کہ قومی سطح پر ایسا کوئی جشن نامناسب ہے۔ نہ صرف ہم اپنا طرز عمل ضیاء سے مختلف رکھنا چاہتے تھے بلکہ مسلمان کی حیثیت سے بھی ہمیں کسی کی موت پر خوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ طیارے کے حادثے میں اور بھی بہت سے افراد مارے گئے تھے۔ اور ان کے خاندانوں کیلیئے خوشی کا کوئی احساس قابل ستائش نہیں ہوسکتا تھا۔ میرا دل سفیر رافیل کی بیوی نینسی کیلیئے ڈوب رہا تھا جس کی شادی میری طرح تھوڑا عرصہ قبل ہی ہوئی تھی۔ اب اس کا شوہر جسے میں مل چکی تھی اور جو بہت خوش مزاج تھا اور پاکستان میں بحالی جمہوریت کا علمبردار بھی، دنیا سے رخصت ہوچکا تھا۔ ملک بھر کے پی پی پی کے تمام راہنماؤں کو ضبط میں رہنے کا پیغام بھیج دیا گیا تھا۔ کسی حالت میں بھی ہم فوج کو کوئی ایسا بہانہ مہیا نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ حکومت کی باگ ڈور سنبھال کر مارشل لاء کے نفاذ کا اعلان کردیں۔

ہمیں سب سے پہلے شام ۶ بجے کے قریب خبر ملی تھی لیکن ابھی تک ریڈیو یا ٹیلی ویژن سے اس کی تصدیق نشر نہیں ہوئی تھی۔ ایک گھنٹہ گزرا پھر دوسرا، مجھے مارشل لاء کا ڈر پیدا ہوگیا۔ وزرائے اعلیٰ جو تمام ضیاء کے آدمی تھی، ۱۶ر نومبر کے انتخابات کی تنسیخ چاہتے تھے یا کم از کم ان کا التوا۔ ضیاء کی موت کے باعث اور قومی غیریقینی کی وجہ سے، وہ فوج کو آسانی

سے حکومت سنبھالنے کی ترغیب دے سکتے تھے۔

۷۰ - کلفٹن میں تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ افواہیں گردش میں تھیں کہ مخالف راہنماؤں کو اس رات حراست میں لے لیا گیا تھا۔ میرے شوہر نے اپنے آپ کو "محافظت کا سربراہ" قرار دے کر مجھے اگلے چند روز گھر میں ہی رہنے کے احکام سنادیئے۔ جب میں نے باہر جانے پر اصرار کیا تو کافی تو تکار کے بعد اس نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دیدیا۔ شام ۸ بجے ہمیں بہت اطمینان ہوا جب پتہ چلا کہ سول حکومت کا طریق کار اختیار کیا جارہا ہے۔ سینٹ کے سابق چیئرمین غلام اسحاق خان نے ریڈیو پاکستان پر اعلان کیا کہ وہ آئین کے مطابق پاکستان کی صدارت سنبھال رہے ہیں۔ جب غلام اسحاق خان بذات خود ٹیلی ویژن پر نمودار ہوئے اور انتخابات کا پروگرام کے مطابق انعقاد کا اعلان کیا تو ہمیں مزید اطمینان حاصل ہوا۔ یہی اس بات کی سب سے پہلی نشانی تھی کہ فوج ملک میں جمہوریت کی بحالی کا تہیہ کئے ہوئے تھی۔ اسحاق جو ایک سابق سرکاری افسر تھا اور ضیاء کا معاون خاص، فوجی فیصلہ کے بغیر انتخابات پر رضامند نہیں ہو سکتا تھا۔

تاہم فوج کے حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کا میرا خوف بے بنیاد نہیں تھا۔ ضیاء کی موت کے فوراً بعد، ضیاء کے وزرائے اعلیٰ اور تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کے درمیان ایک ہنگامی اجلاس میں فوج پر کافی دباؤ ڈالا گیا کہ وہ مارشل لاء کے نفاذ کا اعلان کر دے۔ یہ بات ان کے ابدی حق میں شمار کی جائے گی کہ ملٹری افسران نے وزرائے اعلیٰ کو فوجی کندھوں پر رکھ کر سیاسی بندوق چلانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ "اگر انتخابات منعقد ہوئے اور بے نظیر جیت گئی، تو وہ تمام افسروں کو تختہ دار پر لٹکادے گی" وزرائے اعلیٰ نے فوجی افسروں کو انتباہ کیا۔ "اس کے والد نے فوج کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تو وہ کیوں کرے گی" افسروں نے بین طور پر جواب دیا۔

ضیاء کی موت سے ایسے حلقوں نے بھی اطمینان محسوس کیا جن کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کھاریاں اور وزیر آباد ایسے فوجی علاقوں سے بھی فون پر رپورٹیں مل رہی تھیں کہ لوگ پی پی پی کے عہدیداروں کے گھروں پر طویل فاصلے طے کر کے مبارک باد دینے جارہے تھے

کہ وہ ضیاء کے عہد کے خاتمہ پر بے انتہاء خوش تھے۔ مجھے اب اس امر کا انکشاف ہوا کہ اگرچہ ضیاء فوج کا چیف آف سٹاف تھا اور مسلح افواج کو ہمیشہ اپنا "حلقہ نیابت" قرار دیتا تھا، مگر فوج صرف اس کے عہدہ کی بنا پر ہی اس کا حلقہ تھی۔ اگرچہ ضیاء نے پی پی پی کے خلاف مستقل پراپیگنڈہ جاری رکھا تھا تاکہ فوج کی اطاعت گزاری کو اپنے تک محدود رکھا جاسکے، ہمارا امن و آشتی کا پیغام بھی انہیں ضرور ملا ہو گا۔ فوج "دائیں اور بائیں" بازوؤں میں منقسم نہیں تھی۔ وہ جنرل ضیاء کی ملکیت ہے اور نہ ہی بے نظیر بھٹو کی۔ فوج پاکستانی عوام کی ملکیت ہے۔

لیکن ضیاء سمجھتا تھا کہ فوج اس کی ملکیت تھی اور بنیادی طور پر اس کی مقید تھی۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیساکہ اس نے مسلح افواج میں ریفرنڈم کرایا ہو اور انہیں پوچھا ہو "کیا تم میری کارروائیوں کی حمایت کرتے ہو؟ کیا تم سیاست میں ملوث ہونا چاہتے ہو اور لوگوں سے محاذ آرائی چاہتے ہو؟" مجھے ابھی تک اس تناؤ کی گہرائی کا علم نہیں تھا جس کے تحت فوجی افسروں اور جوانوں کو ضیاء کے آخری لمحات تک رہنا پڑا۔ مسلح افواج کو حکومت کے سیاسی حربے کے طور پر استعمال کرکے ضیاء نے ان کی پیشہ وارانہ مہارت اور فخر پر ضرب لگائی تھی۔ کراچی میں فوج کے میسوں میں اس رات کسی رنج و افسوس کا شائبہ تک نہیں تھا، ایم آر ڈی کے ایک رکن نے مجھے بتایا رپورٹوں کے مطابق میرے والد کے قتل کے بعد کھاریاں، کوئٹہ اور دوسری چھاؤنیوں میں جوانوں نے اس قدر شدید صدمہ محسوس کیا تھا کہ بعض تین دن تک بھوکا رہے۔

۱۷ر اگست کی شام گزرنے کے ساتھ ساتھ ضیاء کے ہوائی حادثے کے ممکنہ اسباب کے متعلق افواہیں زوروں پر تھیں۔ ابتداء میں زیادہ زور اس افواہ پر رہا کہ طیارے پر ہندوستانی سرحد سے ایک میزائل پھینکا گیا۔ بہاولپور کا فوجی اڈہ ہندوستانی سرحد سے صرف ۸۰ میل کے فاصلے پر تھا اور پچھلے چند ماہ میں ہندوستان سے تناؤ میں اضافہ ہوا تھا۔ اور باتوں کے علاوہ پاکستان پر پنجاب میں سکھ انقلابیوں کی تربیت، سرحد پار سے انہیں بھیجنے کا الزام لگاکر، ہندوستان کے وزیراعظم راجیو گاندھی نے اپنی ۱۵ر اگست کی تقریر میں اعلان کیا کہ اگر

پاکستان اپنی کرتوت سے باز نہ آیا، تو وہ اسے سبق سکھادے گا۔

یہ جانتے ہوئے کہ ہمارے سرحدی دفاع اور فوجی نگرانی کے طریقے کافی متحکم تھے میں میزائل تھیوری کو شعوری طور پر ماننے کو تیار نہیں تھی لیکن "غیر ملکی ہاتھ کی کارفرمائی" کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سویت یونین بھی ضیاء سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا تھا۔ اور انتباہ کر چکا تھا کہ افغانی مزاحمت کی حمایت جاری رکھ کر پاکستان کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنے کیلئے تیار رہنا چاہئے۔ سفارتی حلقے اور غیر ملکی پریس اندازہ لگارہی تھی کہ ضیاء کے طیارے کو گرانے میں کابل کی سویت حمایت سے چلنے والی حکومت کے خفیہ محکمہ کے کارندوں کا ہاتھ تھا۔ ضیاء کو راستہ سے ہٹانے کے بعد، پاکستانی امریکی مشترکہ منصوبہ خاک میں مل جانے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ ضیاء کو راستہ سے ہٹانے کے بعد، اب کیا ارادے تھے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ اگر غیر ملکی ہاتھ کی تھیوری پر صاد کیا جائے تو میزائل حملے کے بعد مزید کارروائی کی پیش گوئی مشکل نہیں تھی۔ ملک اس وقت شدید غیر محفوظ حالت میں تھا۔ کسی پارلیمینٹ کا وجود نہیں تھا۔ کوئی وزیراعظم نہیں تھا۔ صدر مملکت مرچکا تھا۔ فوج کی اعلیٰ قیادت مرچکی تھی۔ ملک ایک خلاء میں لٹکا ہوا تھا اور اندرونی یا بیرونی ہرطرح کی تخریب کاری کے لئے موزوں وقت تھا۔ درحقیت ایم آر ڈی کے کچھ رفقاء نے اس شب یہ مشورہ بھی دیا کہ ہماری طرف سے حملہ کرنے کا یہی وقت تھا کہ ضیاء کی افواج کے دوبارہ مجتمع ہونے سے پہلے پہلے کارروائی کی جاسکے۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اب سوال صرف جمہوریت ہی کا نہیں تھا بلکہ ملک کی سلامتی کا بھی تھا۔ اس کے بجائے میں نے پارٹی کے سیکرٹری جنرل، جنرل ٹکاخان کے ذریعہ حکام کو ایک خفیہ پیغام پہنچایا کہ پی پی پی ایک محبّ الوطن جماعت ہے۔ اور ملک کے خلاف کسی سازش کے موقع پر ملک میں ایسے حالات پیدا نہیں ہونے دے گی جن سے غیر یقینی میں مزید اضافہ ہو۔

میزائل تھیوری کی جگہ تخریب کاری کی تھیوری نے لے لی۔ تمام ملک کی نگاہیں فوج پر مرتکز تھیں۔ اگر ہوائی حادثہ کا سبب تخریب کاری تھا تو فوج کے علاوہ اور کوئی یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ حادثہ فوجی جہاز میں فوجی ہوائی اڈے پر فوجی حفاظت میں وقوع پذیر ہوا تھا۔

سوائے فوجی افسران کے کسی شخص کو ضیاء کے بہاولپور جانے کی خبر نہیں تھی۔ اگلے روز تک ملک کے کونے کونے میں یہی تھیوری بر سرعام تھی۔ ان علاقوں میں بھی جو روایتی طور پر فوجی کہلاتے تھے ایک ہی لفظ بر زبان تھا "اندرونی کام تھا" مجھے یہ افواہیں بہت خطرناک محسوس ہوئیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ فوج ایسے وقت کسی مباحثے کا عنوان بنے جب کہ وہ سیاست سے کلی طور پر الگ ہو رہی تھی۔ ایسے لمحے میں پریس سے خطاب کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے کہلوانا چاہتے تھے کہ میں اپنے دشمن کو مردہ دیکھ کر خوش ہوں اور یہ کہ فوج ہی اس کی ذمہ دار ہے۔ جب تک ایسی کوئی تصدیق نہ ہو جاتی میں کیسے کہہ سکتی تھی؟

ضیاء کی موت کے بارے میں مفروضوں پر مفروضے گھڑے جانے لگے۔ پائلٹ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی زندگی کو قربان کر دینے سے لے کر بہاولپور میں ضیاء کو تحفہ میں دیئے گئے آموں کے کریٹوں میں چھپائے گئے دھماکہ خیز مادے تک، لیکن آموں کے کریٹ حفاظتی عملے کی نگرانی کے بعد طیارے میں پہنچے تھے۔ اور پائلٹ کو جو ضیاء کو بہاولپور لے کر گیا تھا کوئی پختہ یقین نہیں تھا کہ وہ اسی طیارے سے واپس پرواز کرے گا۔ ضیاء کے استعمال کیلئے بیک وقت دو طیارے موجود رہتے تھے۔

طیارے کے انجن میں تکنیکی خرابی خارج از مکان نہیں تھی۔ کیونکہ سی - ۱۳۰ جہاز بہت زیادہ مستحکم اور قابل اعتماد گردانا جاتا ہے، مبصرین کی رپورٹوں کے مطابق طیارہ زمین میں دھنسنے سے قبل صرف مشکل سے دو منٹ ہی مائل پرواز رہ سکا اور یہ امر فنی خرابی کی نشاندہی کرتا تھا۔ "۱۰ لاکھ میں یہ موقع ایک مرتبہ ہو سکتا ہے اور معلوم ہوتا ہے یہی کچھ ہو گیا ہے" پاک فضائیہ کے آصف کے ایک دوست نے حادثہ کے بعد فون پر بتایا۔ لیکن یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بالاخر امریکی اور پاکستانی تحقیقاتی ٹیموں نے حادثے کا کوئی یقینی سبب بتانے سے معذوری کا اظہار کیا۔ بہت سے پاکستانیوں کی طرح، میرا بھی یہی فیصلہ تھا کہ ضیاء کی موت کا وقت خدا کی طرف سے متعین تھا۔

مسلمان بچوں کو خدا کے قہر سے بچنے کی تعلیم دی جاتی ہے .... یہ قہر کسی پر بھی اچانک اور بغیر تنبیہ کے نازل ہو سکتا ہے۔ پاکستان کے متعدد لوگوں نے ضیاء کی موت کو خدا کا قہر

وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو پی ڈی ایف سے تعلق رکھنے والے ممبران قومی اسمبلی سے خطاب کر رہی ہیں

ہی قرار دیا۔ تاہم خدا کے قہر کی ایسی مثال رونگٹے کھڑے کرنے والی تھی۔

طیارہ پانچ گھنٹے تک بری طرح جلتا رہا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ضیاء نے اسلام کے نام کا اس قدر استحصال کیا تھا کہ جب وہ مرا، خدا نے اس کا کوئی نشان تک نہیں رہنے دیا۔ میت کو غسل دینا اور جنازہ پڑھتے وقت اس کے منہ کو مکہ کی جانب رکھنا، تجہیز و تکفین کی ایسی رسومات پر عمل ممکن نہ ہوسکا۔ شاہ فیصل مسجد کے احاطہ میں جس تابوت کو دفنایا گیا اس میں ضیاء کے جسم کا بچا کھچا کوئی بھی حصہ بند نہیں تھا۔

ضیاء کی موت کے دوسرے دن، پی پی پی کی سنٹرل ایگزیکٹو کے اجلاس میں، پارٹی ہائی کمان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ صدر اسحاق خان کے الفاظ پر یقین کرنا چاہئے اور امید کرنی چاہئے کہ ان کے مطابق ہی عمل در آمد ہو گا۔ اگر قائمقام صدر آئینی راستہ اختیار کرے تو ہم اس سے پورا پورا تعاون کریں گے تاکہ پاکستان میں پچھلے گیارہ برسوں میں پہلے، جمہوری انتخابات کا انعقاد ممکن ہوسکے۔

ہمیں بہت صدمہ ہوا جب ہم نے دیکھا کہ اسحاق خان کی نگران حکومت ضیاء کے حاشیہ برداروں اور گماشتوں پر مشتمل تھی۔ غیر جانبدار اور بے سروکار کابینہ کی بجائے یہ تو ضیاء کے بدعنوان نظام کے وہی نمائندے تھے جو منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کو اپنے اقتدار اور سرپرستی کیلئے نقصان دہ خیال کریں گے۔ ہم نے دوسری سیاسی پارٹیوں کی طرح، ان کی برطرفی کا مطالبہ کیا مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔

نگران حکومت کا پہلا عمل ملک بھر میں لوگوں سے رابطہ کر کے انہیں ضیاء کے جنازے میں شامل کرنے کیلئے مفت ٹکٹ اور مفت جگہ مہیا کرنا تھا۔ حیران کن بات یہ تھی کہ بہت کم سربراہان مملکت آئے اور نہ ہی زیادہ پاکستانی شامل ہوئے۔ انجام یہی تھا کہ ضیاء کی تعزیت میں لوگ برائے نام ہی شریک تھے۔ ضیاء کی مرگ کے چالیس دن بعد چہلم کے موقع پر ۳۰۰۰ سے زیادہ لوگ شریک نہیں ہوئے۔

کچھ لوگوں کی قیاس آرائی تھی خصوصاً غیر ملکی پریس کی، کہ ضیاء کی موت کے بعد میرے عزم اور پی پی پی کی حمایت میں کمی واقع ہوجائے گی۔ سالہاسال عامتہ الناس ضیاء کے ساتھ

میری سیاسی مخالفت کو اپنے والد کے قتل کے انتقام سے موسوم کرتے رہے تھے۔ لیکن یہ اصلی حقیقت نہیں تھی۔ تلخی کسی کو مطلوبہ توانائی مہیا نہیں کر سکتی۔ یہ کسی کو نگل سکتی ہے مگر متحرک نہیں کر سکتی۔ میری منزل اور میری نیت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ پہلے کی طرح اب بھی وہی تھی یعنی منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخاب کے ذریعے پاکستان کی جمہوریت کو واپسی۔

ضیاء کی موت کے بعد آنے والے ہفتوں میں، انتخابات کے تحرک میں اضافہ ہو گیا۔ میں روزانہ دس اجلاسوں میں شرکت کرتی تھی۔ پریس سے ملاقات، پارٹی اہلکاروں سے ملاقات اور ایم آر ڈی کے فریقین سے ملاقاتیں تاکہ ۱۶ر نومبر کے انتخابات میں قومی اسمبلی کی ۲۰۷ نشستوں کیلئے اور ۱۹ر نومبر کو صوبائی انتخابات میں ۴۸۳ نشستوں کیلئے متفقہ فیصلہ کیا جاسکے۔ دراصل ہمیں چار متبادل راستے تلاش کرنے پڑے۔ اگر سپریم کورٹ کے فیصلہ کے مطابق انتخابات جماعتی بنیاد پر منعقد ہوئے تو ہم غیر معروف امیدواروں کو نامزد کر سکتے ہیں جنہیں پارٹی نشان سے تقویت حاصل ہوگی اور اگر انتخابات غیر جماعتی بنیاد پر منعقد ہوئے تو ہمیں بلند شہرت یافتہ امیدواروں کی ضرورت پڑے گی۔

پی پی پی کے ٹکٹ پر انتخابی امیدوار بننے کیلئے، متوقع عہدیداروں کا کراچی میں سیلاب آگیا۔ شہر کے کسی ہوٹل میں کوئی کمرہ خالی نہیں رہ گیا تھا۔ ۱۸،۰۰۰ افراد نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ۷۰۰ ٹکٹوں کیلئے درخواستیں دیں۔ ضیاء کی سیاسی مشینری کو ادھیڑنے کیلئے پی پی پی نے مسلم لیگ کے سابق ممبران کے لئے اپنے دروازے کھول دیئے۔ ہمارے اپنے بہت سے سابق ممبران جو ۱۹۸۵ء کے انتخابات کے موقع پر پارٹی چھوڑ گئے تھے، واپس ہمارے حلقہ میں آگئے۔ پارٹی نے مجھے تین نشستوں پر لاڑکانہ، لاہور اور کراچی سے کھڑا ہونے کیلئے کہا۔ میری والدہ میرے بچے کی پیدائش کی وجہ سے میری انتخابی مہم چلانے کیلئے پاکستان واپس آرہی تھیں۔ دو نشستوں پر لاڑکانہ اور صوبہ سرحد میں چترال سے کھڑی ہوئیں۔ اگست کے اواخر میں ایم آر ڈی کے ایک خصوصی طویل اجلاس کے بعد میں بیمار پڑ گئی اور میرے ڈاکٹر نے میرے ہونے والے بچے کی حالت کا بذریعہ الٹراساؤنڈ معائنہ کیا۔

یہ عجیب بات تھی کہ پورے حمل کے دوران میں نے بچے کی حرکت کو پیٹ میں محسوس نہیں کیا تھا۔ جب میں نے اپنی ایک دوست سے اس کا ذکر کیا تو اس نے کہا "اس کا مطلب ہے یہ لڑکا ہے کیونکہ لڑکے عموماً حرکت نہیں کرتے" میں نے اس معمہ کا اپنے ڈاکٹر سے استفسار کیا کہ میری دوستوں کی رائے میں بچے پیٹ میں حرکت کرتے رہتے ہیں مگر میں نے ایسا محسوس نہیں کیا تو اس نے بتایا "تم اپنے کام میں اس قدر مصروف رہتی ہو کہ تمہیں بچے کی حرکت کا احساس نہیں ہوتا"۔

معائنہ سے نتیجہ الٹ ثابت ہوا.......... پتہ چلا کہ میرے پیٹ میں سیال مادے کی کمی کی وجہ سے بچہ حرکت کرنے کے قابل ہی نہیں۔ چونکہ میں نے اجلاسوں میں بیٹھے رہنے میں طویل عرصہ گزارا تھا چنانچہ خون مناسب طور پر گردش نہیں کرتا رہا۔ اور بچے کو بھی اس طرح پوری خوراک نہیں ملتی رہی۔ ڈاکٹر کے حکام کے مطابق اگلے چار روز بستر پر لیٹی رہی اور آصف سے بچے کے نام پر اردو حروف تہجی کے مطابق استفسار کر کے وقت گزارتی رہی۔ اس دن کے بعد سے ڈاکٹر نے مشورہ دیا، مجھے ہر صبح اور ہر رات ایک گھنٹے تک آرام سے لیٹنا ہو گا اور اپنی توجہ بچے کے حرکت کرنے پر مرتکز رکھنا ہوگی۔ اگر میں ایسا نہ کر سکی تو مجھے فوراً ہسپتال میں منتقل ہو جانا ہو گا۔ ہر چوتھے دن بچے کی حالت کے سلسلہ میں معائنہ کیلئے کلینک جانا ہوتا تھا۔ اپنے کپڑے تیار رکھو، ڈاکٹروں نے مجھے انتباہ کیا کیونکہ کسی وقت بھی بڑے آپریشن کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میں اس لئے پریشان ہو گئی کیونکہ وہ پریشانی کا اظہار کر رہے تھے چنانچہ صنم کے ذریعہ اپنی والدہ کو فوراً آنے کا پیغام بھجوایا۔ ممی بھی بہت متفکر تھیں اور دو ہفتے بعد پہنچ گئیں۔

بچے کی حالت نے پہلے سے موجودہ تناؤ میں مزید اضافہ کر دیا۔ ہر چوتھے روز میں آصف کے ہمراہ کلینک جاتی خاص طور پر رات کے وقت تاخیر سے کیونکہ اس وقت نسبتاً زیادہ خاموشی ہوتی۔ یہ آنے جانے کا وبال میرے معمول کا حصہ بن گیا۔ لیکن ماہرین کو ایسی کوئی خطرناک علامت محسوس نہ ہوتی اور میں واپس گھر آجاتی۔ تین ہفتے تک میں نے اپنا روزانہ کا معمول جاری رکھا اور اس دوران پارلیمانی امیدواروں کی فہرست تیار کی اور پھر ہم

اپنے نئے گھر میں منتقل ہو گئے۔

۱۹ر ستمبر کو، ڈاکٹر نے اپنے معمول کے معائنہ کے دوران بتایا کہ ابھی تین یا چار ہفتوں تک انتظار کرنا ہو گا۔ پھر جب بھی دوبارہ معائنہ کیلئے گئی تو ڈاکٹر سیٹنا نے بچے کے دل کی دھڑکن سننے کے بعد مشورہ دیا "آج رات تمہیں یہیں ٹھہرنا ہو گا ہم صبح سویرے آپریشن کریں گے"۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے پر مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ لیکن ڈاکٹر کے اچانک فیصلہ نے تلملا دیا اور وہ بھی کافی رات گئے، اپنے رشتہ داروں کو مطلع کرنا مشکل ہو گیا۔ میری دوست پوتشی جو کلینک تک میری ہمراہ ہی آئی تھی کراچی کی ویران گلیوں میں سے گھومتی ہوئی سیدھی میری والدہ کو اطلاع دینے پہنچ گئی۔ بچے کے سامان کا بیگ اٹھالائی اور ساتھ ہی وہ دعا بھی جو یاسمین نے مجھے پیدائش میں آسانی کیلئے بتائی تھی۔ پوتشی "مریم پنجہ" بھی لے آئی جو آصف کے ایک دوست نے مجھے دیا تھا اور خشک پھول جو ایک برتن میں پانی میں بھگو کر رکھ دیئے گئے اور میں آپریشن کے کمرے میں چلی گئی۔ جب پھول پانی میں پوری طرح کھل جاتے ہیں تو بعض مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ زچہ کی تکلیف دور ہو جاتی ہے۔ آصف رات بھر ہسپتال میں رہا اور راہداری میں میری سلامتی سے متفکر آگے پیچھے چلتا رہا۔

ڈاکٹر سیٹنا صبح سویرے مجھے لینے آگیا۔ "ہمیں جلدی کرنا ہو گا" اس نے کہا "لوگ ہسپتال کے باہر جمع ہو رہے ہیں" انہیں کیسے پتہ چلا؟ میں نے کراچی کے دیدہ زیب اور مہنگے ہسپتال کی بجائے لیاری کے لیڈی ڈفرن ہسپتال کو زچگی کے لئے منتخب کیا تھا۔ میرا پسندیدہ ڈاکٹر بھی وہیں پریکٹس کرتا تھا اور لیاری کی میرے لئے ایک ذاتی اہمیت بھی تھی۔ یہ علاقہ ہماری خوشیوں اور غموں میں برابر کا شریک رہا تھا۔ میرے والد نے اپنی سیاسی جنگوں میں آخری تقریر وہیں کی تھی۔ میں اشک آور گیس کا نشانہ وہیں بنی تھی اور آصف اور میری شادی کا عوامی استقبال بھی وہیں ہوا تھا۔ لیاری کے غریب لوگوں نے ضیاء کے دور میں بہت تکلیف اٹھائی تھی۔ ہم میں بہت کچھ مشترک تھا۔ میرا یہ بھی خیال تھا کہ میرے بچے کی پیدائش سے لیاری کے لوگوں کا ان ڈاکٹروں اور عملے پر اعتماد بڑھے گا اور وہ اپنے طبی علاج

کے لئے اس ہسپتال میں آیا کریں گے۔ لیکن انہیں میرے ہسپتال میں آنے کا کیسے پتہ چلا؟ کیا خفیہ محکمہ کی گاڑیاں جواب بھی میرا تعاقب کرتی تھیں حکومت کی مختلف ایجنسیوں کو خبریں پہنچا رہی تھیں؟ نرسنگ سٹاف نے میرے منہ پر چادر ڈال دی تھی تاکہ آپریشن تھیٹر میں مجھے لے جاتے ہوئے کوئی پہچان نہ سکے۔ دوسرے کمرے میں آصف کی والدہ اور کچھ رشتہ دار مجھے درد سے نجات دلانے کیلئے سورہ مریم کی تلاوت کر رہے تھے۔ آصف کی خواہش تھی کہ بیٹا ہو۔ تقریباً جس کسی سے پچھلے آٹھ ماہ ملاقات ہوئی اس نے لڑکے کی ہی خوش خبری سنائی۔ شاید یہ اس لئے تھا کہ پاکستان میں لڑکے کی پیدائش کو خوش بختی سمجھا جاتا ہے۔ میرے والد کی تین نواسیاں تھیں لیکن ابھی نواسہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ میرا بچہ بھٹو خاندان میں ہماری شاخ کا پہلا نواسہ ہو گا جو پاکستان میں پیدا ہوا...... میں لڑکوں کے بارے میں گفتگو کی ہمیشہ مزاحمت کرتی رہی۔ "لڑکیاں ہوں تو پھر کیا ہے؟" میں نے ہمیشہ اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ لیکن لوگ باتیں کرتے رہے۔

کئی سال قبل اپنی کزن فخری کے گھر پر قرآن خوانی کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے سر پر کچھ چھڑکا گیا تھا۔ "یہ کیا ہے" میں نے اپنا چہرہ پونچھتے ہورئے پوچھا۔

"مبارک ہو" عورتیں چلائیں "تم بیٹے کی ماں بنو گی"۔

"تمہیں کیسے خبر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم نے پیچھے سے تمہارے سر پر نمک چھڑکا تھا" انہوں نے مجھے بتایا۔ "تم نے اپنا ہاتھ ہونٹوں پر رکھا جس کا مطلب مونچھیں اور لڑکا ہے۔ اگر تم نے اپنی آنکھوں یا پیشانی کو چھوا ہوتا تو اس کا مطلب لڑکی ہوتا۔"

تمام قیاس آرائیاں ۲۱ر ستمبر کی صبح ختم ہو گئیں۔ "بیٹا ہوا ہے،" میرے شوہر کی فخریہ اور مطمئن آواز میرے کانوں میں سنائی دی جب میں بے ہوشی سے ہوش میں آئی۔ "وہ مجھ پر گیا ہے" میں پھر سو گئی اور بندوق چلنے کی آواز پر جاگی جو خوشی میں ہسپتال کے باہر چلائی گئی تھی۔ پھر ڈھولک کی تھاپ اور "جئے بھٹو" کے نعروں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ پاکستان کی تاریخ میں ایک بہت ہی متنازعہ اور عظیم ترین جشن منایا جانے والا بچہ پیدا ہو گیا

تھا۔ ہم نے بچے کی پیدائش کی متوقع خبر کو خفیہ رکھا تھا تاکہ ضیاء اپنے انتخابی پروگرام کو میری زچگی کے عرصہ سے منسلک نہ کرسکے۔ تاریخ پیدائش کا پتہ چلانے کے لئے حکومت کے خفیہ ایجنٹوں نے میرے طبی ریکارڈ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے وہ ریکارڈ اپنے پاس رکھے۔ حکومت کے ایجنٹوں نے ۱۷ر نومبر کا اندازہ لگایا تو ضیاء نے انتخابات کی تاریخ کے لئے ۱۶ر نومبر کا اعلان کر دیا

لیکن بچہ ہم سب کے اندازوں کو دھوکا دے گیا صرف ضیاء ہی ایک ماہ کا غلط اندازہ نہیں لگا سکا ہمارا بلکہ تخمینہ بھی وسط اکتوبر کا تھا لیکن خدا نے ہم پر مزید فضل کیا اور ہمارے اندازے سے بھی پانچ ہفتے قبل ہی پیدا ہو گیا اس سے مجھے انتخابی مہم وسط اکتوبر سے چلانے کے لئے اپنی توانائی بحال کرنے کو ایک مہینہ مل گیا۔

اگرچہ بچہ میرے بھائیوں اور میری پیدائش کے وقت وزن میں نسبتاً کم تھا مگر خدا کا شکر ہے ظاہری طور پر مضبوط اور صحت مند تھا اس کی پیدائش پر، آصف نے اس کے کانوں میں اذان دی۔ آصف اپنے بیٹے سے مسحور تھا اور کمرے سے باہر جانے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ بچہ اپنے باپ کی محبت کے سائے میں جوان ہو گا۔ ۷۰ کلفٹن پر مبارک باد کے تاروں، خطوط اور کارڈوں کا سیلاب آگیا۔ پھولوں اور مٹھائی کی دکانیں خالی ہو گئیں۔ سینکڑوں کیکوں پر پی پی پی کے سرخ سبز اور سیاہ رنگوں کی کریم سے نقش و نگار بنائے گئے تھے میں نے بہت سے کیک اور پھول کراچی جیل کے سیاسی قیدیوں ہسپتال کے عملے اور مریضوں اور شہیدوں کے گھروں میں بجھوا دیئے۔ آصف نے بھی متعدد کیک اور پھول ریس کورس جہاں وہ پولو کھیلتا تھا کے نزدیک یتیم خانے میں بھجوائے۔ اخبارات میں بچے کے متعلق بہت سے کارٹون اور کہانیاں طبع کی گئیں "بچہ جس نے صدر کو بیوقوف بنا دیا" میں نے بچوں کی کاپی میں مجتمع کر کے رکھ لئے۔

ہر کوئی بچے کی تصویر کا طالب تھا یہاں تک کہ غیر ملکی اخبارات بھی لیکن آصف راضی نہیں تھا اور احتجاج کر رہا تھا کہ ہماری زندگی میں کوئی راز داری نہیں۔ جب تمام دنیا سے درخواستیں آنا شروع ہو گئیں تو وہ بھی ڈھیلا پڑ گیا اور ہم نے ایک خصوصی فوٹو بنوائی تاکہ

تقسیم کی جاسکے جب میں نے پہلی مرتبہ لاڑکانہ کی طرف پرواز کی تو ایک مسافر نے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے بٹوے سے ایک تصویر نکالی وہ ہمارے بچے کی تصویر تھی۔

بچے کی پیدائش توقع سے پہلے ہوگئی، اور ہم نے ابھی اس کے نام کا فیصلہ نہیں کیا تھا بہت سے موصولہ خطوط میں بچے کا نام میرے والد پر رکھنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ لیکن پاکستان میں باپ کے نام پر بچے کا نام رکھنے کا رواج ہے۔ اور میں پاکستان کی روایات کا احترام کرنا چاہتی تھی۔ میری خواہش تھی کہ بیٹا پیدا ہونے کی صورت میں اس کا نام شاہ نواز رکھوں گی۔ لیکن جب کسی نے مجھے کہا۔ اگلی مرتبہ تمہیں ملنے آؤں تو شاہ نواز پیدا ہوگا یہ سنتے ہی میرا دل بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے مردہ بھائی کے فرش پر پڑے ہوئے جسم کا منظر گھوم گیا اور میں نے جان لیا کہ اپنے بیٹے کا نام شاہ نواز رکھ کر میں ہر وقت اس منظر کو یاد کر کے زندگی بتا نہیں سکتی۔ آصف نے ایک نام بتایا اسی طرح اس کی والدہ اور میری والدہ نے بھی۔ مجھے کسی پر بھی اعتراض نہیں تھا۔ "ہم کسی مذہبی عالم سے پوچھیں گے" میں نے کہا "جو بھی زیادہ مبارک نام ہو گا اسی سے ہم پکاریں گے "لیکن مذہبی عالم نے کہا کہ تینوں ہی مبارک نام ہیں اور ایک دوسرے کے برابر۔

تب اچانک ذہن میں بلاول نام آیا جو بل آول سے ماخوذ ہے اور اس کا مطلب "بے مثال" ہے۔ سندھ میں ایک بزرگ بلاول بھی گزرے ہیں جنہوں نے اپنے زمانے میں ظلم وجبر کے خلاف جنگ لڑی۔ آصف کے اجداد میں بھی ایک کا نام بلاول تھا اس نام میں میرے اپنے نام کی گونج بھی پوشیدہ تھی جس کا مطلب بے نظیر یا بے مثال ہی ہے۔ پس ہمیں ایک ایسا نام مل گیا جو ماں، باپ اور ملکی ثقافت وتہذیب کا مظہر بھی تھا۔ ہر شخص نے اتفاق کیا اور ہم نے بچے کا نام بلاول رکھ لیا۔ پانچ دن ستانے کے بعد میں دوبارہ اپنے کام میں جت گئی۔ مجھے کرسی میں ہی اوپر نیچے لے جایا جاتا۔ ہمیں ابھی بھی شک تھا کہ انتخابات پروگرام کے مطابق منعقد ہوں گے یا بالکل ہی نہیں۔

۲۷ر ستمبر کو لاہور کے نواح میں تباہ کن سیلاب آگیا اور اچانک بہت سے لوگوں مویشیوں اور گھروں کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ لوگ غصے میں بھر گئے جب ان پر یہ

انکشاف ہوا کہ ضیاء کی نگران صوبائی انتظامیہ کے حکام نے لاہور کے کم آباد مگر امیر علاقے کو سیلاب سے بچانے کے لئے ایک غریب مگر کثیر آبادی کے علاقے کی حفاظت کے لئے تعمیر کئے گئے بند کو ارادۃً ڈینامیٹ سے اڑا دیا تھا۔

پانی بڑھتا گیا اور دو ہفتوں تک لاہور، پنجاب کے دوسرے شہروں اور دیہاتوں میں تباہی مچاتا رہا۔ چودہ اضلاع کے تقریباً دو لاکھ مویشی اور پانچ لاکھ ایکڑ اراضی پر پھیلی ہوئی فصلیں بالکل تباہ ہو گئیں۔ پنجاب پی پی پی نے ہنگامی پناہ گاہیں تیار کیں اور ہزاروں لوگوں کو جن کے گھر بار اجڑ گئے تھے، خوراک اور پانی مہیا کیا۔ اس ناگہانی آفت اور حکام کی اپنی غفلت کی وجہ سے، عام خیال تھا کہ انتخابات یا تو ملتوی کر دیئے جائیں گے۔ اور یا مارشل لاء نافذ ہو جائے گا۔ لیکن فوج کی طرف سے انتخابات کے پروگرام کے مطابق انعقاد کے اصرار نے ضیاء کے حامیوں کی سیاسی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

۲۹ ستمبر کو انتخابات کے انعقاد کی توقعات پھر ڈانواڈول ہو گئیں جب حیدر آباد اور کراچی میں دہشت گردوں نے جمہوری عمل کو تباہ کرنے کے لئے بغیر کسی اشتعال کے اودھم مچا دیا۔ تیس نقاب پوش بندوقچیوں نے جو سب مشین گنوں اور اے کے ۴۷ رائفلوں سے مسلح تھے، شہر کے مہاجر آباد کے علاقے میں بے گناہ شہریوں پر بیک وقت فائر کھول دیا۔ مہاجر، سندھی، پٹھان اور پنجابی بھی مارے گئے بندوقچیوں نے کسی تفاوت کے بغیر سب کو گولی کا نشانہ بنایا۔ ۹ گھنٹوں کے بعد، دہشت گردی کی منظم مہم نے کراچی میں نسلی تناؤ کو ہوا دی جہاں قاتلوں نے سندھی علاقے میں رہائشی لوگوں کو بندوقوں کا نشانہ بنایا۔ ایک مقام پر وہ ایک بس میں داخل ہو گئے اور سیٹوں پر بیٹھے ہوئے مسافروں پر گولی چلا دی۔ اس خونریزی کے نتیجہ میں ۲۴۰ افراد مارے گئے اور ۳۰۰ زخمی ہوئے۔ حیدر آباد، اور کراچی میں کرفیو کا نفاذ ہو گیا اور سکول، منڈیاں اور دکانیں بند ہو گئیں۔

میرا جی متلانا شروع ہو گیا جب میں نے یہ خبر سنی۔ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟ چونکہ پاکستان بہت سی غیر ملکی سازشوں کی آماجگاہ رہا تھا، ملک کو قتال و جدال کے ذریعے غیر مستحکم کرنے میں غیر ملکی اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اندرونی سازشوں سے بھی

صرف نظر نہیں ہو سکتی تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ یہ امکان خاصا صحیح معلوم دیتا ہے کہ نگران انتظامیہ نے انتخابات میں شکست کو سامنے دیکھتے ہوئے امن و امان کو تباہ کرنے کیلئے ڈاکوؤں کو کرائے پر خریدا ہے۔ تاکہ فوج کو مارشل لاء کے نفاذ پر مجبور کیا جائے۔ لیکن فوج نے شاندار ضبط کا مظاہرہ کیا اور دونوں شہروں میں مزید قتل روکنے کے لئے اور بحران پر قابو پانے کے لئے فوج کی گشت بڑھادی۔

۵ر اکتوبر کو، سپریم کورٹ نے میری آئینی درخواست کو منظور کر لیا جس میں ضیاء کی غیر جماعتی انتخابات کے انعقاد کی ہدایات کو چیلنج کیا گیا تھا۔ راولپنڈی میں عدالت کا کمرہ بھرا ہوا تھا۔ جب ۱۲ ججوں کے مکمل بنچ نے فیصلہ دیا کہ تمام سیاسی جماعتیں انتخابات میں حصہ لینے کا حق رکھتی تھیں اور یہ کہ سیاسی نشانات انفرادی امیدواروں کی بجائے جماعتوں کو تقسیم کئے جائیں گے۔ نگران انتظامیہ نے عدالتی فیصلے کو منظور کر لیا۔ ضیاء کے آدمی دنیا کی نظروں میں اور کر بھی کیا سکتے تھے؟ تمام ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ضیاء کی موت کے بعد مجھے اپنی سلامتی سے بے فکری کے ابتدائی احساسات کو اس وقت ختم کرنا پڑا جب سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کے نتیجہ میں مجھے موت کی دھمکیاں ملنا شروع ہو گئیں۔ افغانی مجاہد راہنما گلبدین حکمت یار کا مبینہ طور پر تحریر کردہ ایک خط پکڑا گیا جس میں اپنے پیرو کاروں کو بے نظیر بھٹو کو راستے سے ہٹانے کی ہدایات درج تھیں۔ حکمت یار کے پاکستانی خفیہ ایجنٹوں سے گہرے مراسم تھے ار اس کے اصرار پر وہ قتل کا حکم جاری کر سکتا تھا۔ دوسری طرف یہ ممکن تھا کہ خط باغیوں کے مخالف گروہ کا تحریر کردہ ہو جو مجاہدین کی جدوجہد کو میرے قتل کے ذریعے نقصان پہنچانا چاہتے تھے تاکہ ساری ذمہ داری حکمت یار پر ڈال دی جائے۔

نئی دھمکیاں اندرون پاکستان سے بھی موصول ہونا شروع ہو گئیں۔ ہمیں رپورٹیں ملیں کہ پنجاب کی نگران انتظامیہ اپنے بعض سندھی اتحادیوں کے ساتھ مل کر میرے قتل کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ ضیاء کے انتقال کا مطلب یہ نہیں تھا کہ دھمکیوں کا دور ختم ہو گیا تھا۔ اب کہ پی پی پی کی جیت یقینی تھی، ضیاء کے وزراء پی پی پی کو اور مجھے راستہ سے ہٹانا چاہتے تھے۔

جیسے جیسے نامزدگیاں داخل کرنے کا وقت قریب آ گیا، نئے سیاسی اتحاد ہر گھنٹے کے بعد معرض وجود میں آنے لگے۔ پارٹی کے اندورنی مناقشات اور جھگڑے جو پاکستانی سیاست کا طرۂ امتیاز ہیں ہماری سب سے بڑی مخالف ضیاء کی مسلم لیگ کو مزید منقسم کرنے کا سبب بن گئے۔ ۱۳ر اگست کو ضیاء کے ہوائی حادثہ سے چار روز قبل، مسلم لیگ کی مرکزی ایگزیکٹو کونسل کا اعلیٰ عہدیداروں کو منتخب کرنے کے لئے اسلام آباد میں ایک اجلاس ہوا۔ لیکن ووٹ ڈالنے کی بجائے انہوں نے ایک دوسرے کو گالیاں دیں اور نئے نئے القاب سے یاد کیا اور یہ اقتدار کی جنگ بالآخر کرسیوں اور کراکری کے ایک دوسرے پر پھینکنے میں ختم ہوئی۔

دو ہفتے بعد مسلم لیگ دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ ایک شاخ کی سربراہی ضیاء کے دو خوشہ چینوں نے سنبھال لی ان میں سے ایک صوبہ سرحد کا سابق گورنر تھا اور دوسرا پنجاب کا قائم مقام وزیراعلیٰ نواز شریف، دونوں ضیاء کے زبردست حامی تھے۔ دوسری شاخ کی سربراہی ضیاء کے سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو کے حصہ میں آئی جو ضیاء کا مخالف تھا۔ ہماری شدید ترین مخالف جماعت کی تقسیم کے بعد ہماری انتخابات میں جیت یقینی ہوگئی۔

بدقسمتی سے ایم آر ڈی اور پی پی پی کا اتحاد بھی تحلیل ہوگیا۔ جب ہم نے اپنے امیدواروں کی نامزدگی کا فیصلہ کیا، تو پتہ چلا کہ ایم آر ڈی کے متعدد امیدوار اپنے مخالف مسلم لیگی امیدواروں کو شکست دینے میں کافی کمزور ثابت ہوں گے۔ مزید بر آں ایم آر ڈی نے انتخابات کے بعد اپنے متبادل راستے کھلے رکھنے کے لئے ہمارے ساتھ مشترکہ حکومت کی تشکیل سے انکار کر دیا۔ ہمیں بصد افسوس ایم آر ڈی سے اپنا راستہ الگ بنانا پڑا۔ تاہم ہم نے ایم آر ڈی کو یقین دلایا کہ ہم ان کے حلقوں میں اصولاً ان کے خلاف پی پی پی کے امیدوار نامزد نہیں کریں گے۔

ایک متحدہ اور مضبوط پی پی پی کی وجہ سے، سیاسی تگ ودو میں تیزی آ گئی...... مسلم لیگ کی ضیاء حامی شاخ نے سات دوسری مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے ساتھ اسلامی جمہوری اتحاد کی داغ بیل ڈال لی تاکہ ایک پرچم اور ایک انتخابی سیاسی نشان تلے انتخابات میں حصہ

لے سکیں۔ آخری وقت میں ۱۵ر اکتوبر سے قبل جب نامزدگیاں داخل کرنے کی آخری تاریخ تھی، جونیجو اور اس کی مسلم لیگی شاخ نے بھی اس اتحاد میں شمولیت اختیار کرلی، اب ہمارا مقابلہ ۹ سیاسی پارٹیوں کے اتحاد سے تھا۔

یہ ایک طرفہ تماشا تھا کہ ان پارٹیوں نے پی پی پی کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنا گٹھ جوڑ تشکیل دیا تھا۔ روایتی طور پر ایسے اتحاد برسراقتدار پارٹی کے خلاف تشکیل دیئے جاتے ہیں۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ برسراقتدار پارٹی نے ہمارے خلاف یعنی حزب مخالف کے مقابلہ میں ہر ممکنہ ووٹ حاصل کرنے کے لئے اتحاد بنایا۔ لیکن وہ بھی ان کے لئے کافی نہیں تھا۔ تمام بےجوڑ عوامل کو ہمارے خلاف اکٹھا کرنے کے لئے صدر نے خود ہی اور غیر آئینی طور پر انتخابی قوانین کو تبدیل کرنے کا حکم جاری کر دیا تاکہ ہمارے حامیوں کو انتخاب میں حصہ لینے سے نااہل قرار دیا جاسکے اور ان کے ووٹ کا حق بھی سلب ہو جائے۔

حکم نامہ میں اعلان کیا گیا کہ تمام ووٹروں کو ووٹ دیتے وقت شناختی کارڈ دکھانا ہوں گے۔ جب ہم نے احتجاج کیا تو کہا گیا کہ "۱۰۳ فیصد" ووٹروں کے پاس شناختی کارڈ موجود ہیں۔

اعداد و شمار کی گتھیوں کے برعکس ہمیں صحیح حالت کا اندازہ تھا۔ دیہاتی ووٹروں میں جو پی پی پی کا اصل سرمایہ تھے صرف ۵ فیصد عورتوں اور ۳۰ فیصد مردوں کے پاس شناختی کارڈ تھے۔ نہ صرف نئے کارڈوں کے حصول کے لئے درخواست فارموں کی کمی تھی بلکہ ایک رجسٹریشن افسر کے کہنے کے مطابق وہ ایک دن میں صرف ۳۰۰ کارڈ جاری کر سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ انتخابات سے قبل کے دو ہفتوں میں صرف ۴۰۰۰ شناختی کارڈ جاری ہو سکتے تھے۔ بہت سے انتخابی اہل کار انتخابات کے بعد پی پی پی کے کارڈوں کی تصدیق جاری کر رہے تھے۔

نگران انتظامیہ کے شناختی کارڈوں کے اصرار نے ہماری منصفانہ انتخابات کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ووٹ ڈالنے کے لئے ۱۹۸۴ء کے ریفرنڈم، ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات اور ۱۹۸۷ء کے بلدیاتی انتخابات میں شناختی کارڈوں کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس وقت

ہر صوبے میں ووٹروں کی فہرستوں میں رجسٹرڈ کیئے گئے ناموں کا اندراج ہی کافی خیال کیا گیا۔ اب شناختی کارڈوں کا مطالبہ پی پی پی کے ووٹروں کی تعداد کو کسی طرح کم کرنے کا حکومتی حربہ معلوم ہوتا تھا۔ قبل ازیں ضیاء نے لوگوں کے فیصلے کو محدود کرنے کے لئے سیاسی جماعتوں کو خلاف قانون قرار دیا تھا...... اب اس کے گماشتے ووٹروں پر اس طرح قدغن لگا کر قوم سے فریب دہی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ جب ضیاء زندہ تھا تو سیاسی امیدواروں کو نااہل قرار دیا گیا اب اس کے پٹھو ووٹروں کو نااہل قرار دے رہے تھے۔

ایک مرتبہ پھر ہم نے عدالتوں کا رخ کیا اور شناختی کارڈ کی ضرورت کی آئینی حیثیت کو چیلنج کیا اور اس دوران میں نے اپنی توجہ انتخابی مہم پر مرکوز رکھی۔ میرے والد نے اپنی مہم کا آغاز ٹرین کے ذریعہ کیا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی کراچی سے لاہور ٹرین کے ذریعہ سفر کر کے ایسا ہی کیا۔ چونکہ الیکشن کمیشن نے ہمیں اپنے پرانے اور معروف نشان "تلوار" کی اجازت نہیں دی تھی لہٰذا ہم نے انتخابی جنگ کے لئے ایک نئے نشان "تیر" کا انتخاب کیا۔

نگران حکومت نے انتخابات سے قبل تمام امیدواروں کو ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر پبلسٹی سے منع کر دیا تھا۔ چنانچہ میں نے ٹرین کے متعینہ سٹاپ کے وقفہ میں پی پی پی کے حامیوں کو انتخابات میں بھرپور حصہ لینے کی تلقین کی۔ ٹرین کے سٹاپوں کے وقفے کے دوران میں نے مقامی پی پی پی کے رہنماؤں سے رابطہ بھی جاری رکھا جو ایک سٹیشن پر گاڑی میں سوار ہو کر دوسرے سٹیشن پر اتر جاتے۔ "ظالموں کے دل میں تیر، بے نظیر" لوگوں کے ہجوم خوشی سے نعرہ زن ہوتے، ٹرین پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کرتے اور پارٹی کے کارکنوں کو کھانا اور پانی مہیا کرتے۔ میں ہر سٹاپ پر ادویات کھاتی اور گرم گرم چائے کا پیالہ انڈیلتی تاکہ گردے کی تکلیف پر قابو پائے رکھوں جس نے مہم کے ابتدائی دنوں میں مجھے زک پہنچائی تھی۔ آصف جس نے پہلے کبھی میرے ساتھ سفر نہیں کیا تھا اس مہم کے ابتدائی دنوں میں میرے ساتھ شرکت کی اور اسی طرح متعدد پی پی پی کے پرجوش کارکن بھی جو ٹرین کی چھت پر چڑھ جاتے اور ہمارے ساتھ ساتھ دور تک سفر کرتے۔ ہمیں ان کے سائے پنجاب کے سرسبز کھیتوں میں پڑتے نظر آتے جب وہ رقص کرتے اور گیت گاتے۔ میاں چنوں کے

زرعی علاقہ میں رات کے وقت سٹاپ کے فوری بعد انجن چل پڑا اور میں پلیٹ فارم پر کھڑی رہ گئی۔ لوگ ریلوے کی پٹڑی پر لیٹ گئے اور میں گاڑی میں سوار ہو گئی۔

ایک ہفتے بعد سندھ میں ٹرین سفر کے دوران ایک بہترین خبر نے میرا استقبال کیا۔ یہ اس واقعہ کے دوسرے دن کی بات ہے جب پی پی پی کے کارواں کے ۴۰ مسافر نواب شاہ میں آصف کے خاندانی گھر میں رات گزارنے کے لئے قیام پذیر ہوئے۔ ۸ر نومبر کو لاہور ہائی کورٹ نے شناختی کارڈ کی ضرورت کو کالعدم قرار دے دیا اور ۲۱ سالہ عمر کے تمام پاکستانی رجسٹرڈ ووٹروں کا آئینی حق رائے وہی مناسب شناخت کے ساتھ برقرار رکھا۔ لاہور کے ایک انتخابی حلقہ میں سرکاری طور پر جاری کردہ شناختی کارڈوں کی تعداد رجسٹرڈ ووٹروں کی تعداد کا تقریباً دگنا ہے۔ عدالت نے تحریر کیا مزید بر آں عورتوں کو جاری کردہ شناختی کارڈوں پر ان کی تصویریں یا دستخط نہیں ہیں اور اس طرح فریب وہی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ ان حقائق اور بے قاعدگیوں کے پیش نظر، عدالت نے فیصلہ دیا کہ شناختی کارڈ منصفانہ انتخابات کو یقینی بنانے کی بجائے ان میں مزاحم ہوں گے۔ فوری ردعمل کے طور پر ضیاء کے حامیوں نے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔

لاہور ہائی کورٹ میں منصفانہ انتخابات کے سلسلہ میں ہماری فتح نے لوگوں کی توقعات کو ایک نئی جہت بخش دی۔ میری والدہ نے لاڑکانہ کے ایک عوامی جلسے میں ۱۰ر نومبر کو تالیاں بجاتے ہوئے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا "علی بابا چلا گیا مگر ۴۰ چور ابھی باقی ہیں۔ آپ لوگ جانتے ہیں وہ کون ہیں؟ ۱۶ر نومبر کو تیر کے نشان کو ووٹ دو۔" اسی روز راولپنڈی میں میرے استقبال میں آئے لوگوں کے ہجوم نے ۱۹۸۶ء میں میرے جلسے کا ریکارڈ توڑ دیا۔ پی پی پی کے جلوس میں لاکھوں حامیوں نے شہر، گلیوں اور بازاروں میں ٹریفک کے نظام کو بھی اپنی تعداد سے درہم برہم کر دیا۔ ہمیں ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے میں پورے تین گھنٹے لگے۔ "آپ لوگوں کو آمریت کے حامیوں اور جمہوریت کے حامیوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے" میں نے لاکھوں کے مجمع کے عوامی جلسہ گاہ میں پہنچ کر خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو رجعت پسندوں اور پی پی پی کے جمہوریت

پسندوں میں سے ایک کو چننا ہے، رجعت پسند عوام کو دبانا چاہتے ہیں جب کہ جمہوریت پسند جبر اور دباؤ کی زنجیروں کو توڑنا چاہتے ہیں۔ "

ہماری مہم کے آخری چند دنوں میں پنجاب کے عوام کا جوش و خروش قابل دید تھا۔ پاکستان میں پچھلے ۴۱ سالوں میں صرف دو عام انتخابات ہی منعقد ہوئے تھے۔ پہلے انتخابات نے مغربی پاکستان کی رہنمائی کا ہار میرے والد اور پی پی پی کے گلے میں ڈالا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں پی پی پی کی حکومت دوبارہ منتخب ہو گئی تھی۔ یہ انتخابات تیسرے تھے اور مقابلہ بھی سخت ترین تھا۔ ضیاء کی مسلم لیگ کے رہنماؤں نے برملا اعلان کیا کہ ۱۶ر نومبر کے انتخابات کے نتیجہ میں کسی بھٹو کو حکومت کے سربراہ کے طور پر قبول نہیں کریں گے۔ بنیاد پرست جماعت اسلامی نے شور و غوغا مچا رکھا تھا کہ عورت کی سربراہی غیر اسلامی ہے اگرچہ ضیاء کے ۱۹۸۵ء کے آئین میں انہوں نے اسے اسلامی گردانا تھا۔ احمد رضا قصوری بھی جو ایک چھوٹا سیاستدان تھا اور جس نے ۹ سال قبل میرے والد کے عدالتی قتل میں ضیاء کے ساتھ مل کر سازش کی تھی اب ضیاء کے بیٹے اعجاز الحق سے ہاتھ ملا کر ہمارے خلاف نکل آیا تھا۔ اعجاز الحق نے پریس میں ناقابل یقین طور پر اعلان کیا کہ پی پی پی کی مہم "لندن میں ایک یہودی کمپنی" کے زیر نگہداشت چلائی جا رہی ہے دریں اثنا سپریم کورٹ شناختی کارڈ کی ضرورت کی آئینی حقیقت پر غور و پرداخت کرنے والی تھی جو اگر نافذ کر دی گئی تو رجسٹرڈ ووٹروں کا ۵۵ فیصد ووٹ دینے کے اہل نہیں رہے گا۔ نتیجتاً مبارک نظر آتا تھا۔ "ہم نے راولپنڈی میں تمہارے جلسوں کا ہجوم دیکھا ہے" سپریم کورٹ کے ایک جج نے ہمارے ایک وکیل کو راز داری میں سماعت کے موقع پر کہا "ہم پی پی پی کو پلیٹ میں رکھ کر فتح نہیں دے سکتے۔ "

ایسی غیر یقینی حالت اور مخالفت کے باوجود پی پی پی کے حامیوں کی وفاداری قابل رشک تھی۔ فیصل حیات جسے ضیاء کے مارشل لاء کے دور میں لاہور قلعہ میں اذیت دی گئی، قومی اسمبلی کی سیٹ کے لئے انتخاب لڑ رہا ہے۔ اسی طرح خالد احمد بھی جو اس کا چچا ہے اور پہلا سرکاری ملازم جسے ضیاء نے گرفتار کیا اور اب جلاوطنی سے واپس آیا ہے، جہانگیر بدر، پرویز

علی شاہ، قومی اسمبلی کے سابق ڈپٹی سپیکر ڈاکٹر اشرف عباسی اور میرے والد کے وکیل سابق اٹارنی جنرل یحیٰی بختیار انتخاب لڑ رہے ہیں اور اسی طرح سینکڑوں پی پی پی کے اراکین جنھوں نے جمہوریت کی خاطر جیلیں کاٹیں اور کوڑے کھائے انتخاب میں حصہ لے رہے ہیں ان کے ہمراہ وہ شہید بھی کھڑے ہوں گے جنھوں نے آزادی کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

خواہ پی پی پی جیتے یا ہارے، ہم نے پاکستان میں جمہوریت کے احیاء کو کم از کم ممکن بنا دیا ہے ہماری جدوجہد رائیگاں نہیں گئی اور نہ ہی ہم نے اپنے اصولوں کے راستے سے انحراف کیا ہے۔ جب ہم اپنی انتخابی مہم کا اختتام کرتے ہیں "وزیر اعظم بے نظیر" کا نعرہ تمام چاروں صوبوں میں گونج رہا ہے۔ جب میری والدہ ہیٹ سٹروک اور بخار میں مبتلا رہنے کے باوجود اپنے انتخابی پروگرام کو بخیر و خوبی سرانجام دیتی ہیں تو لوگوں کے نعرے گونجتے ہیں۔ "بھٹو خاندان، ہیرو، ہیرو، باقی سب زیرو، زیرو۔"

ہم لاڑکانہ کے اپنے حلقے میں المرتضیٰ اکٹھے ہی جائیں گی تاکہ ۱۶ر نومبر کو اپنے ووٹ ڈال سکیں۔ ووٹ ڈالنے کے بعد میرا ارادہ سپاس عزت کے لئے اپنے والد کی قبر پر جانے کا ہے جو پاکستانی تاریخ میں عوامی انتخابات کے ذریعے بننے والے ملک کے پہلے وزیر اعظم تھے۔ ہم سیاستدانوں کی وہ نسل ہیں جنھوں نے ایک مساویانہ اور ترقی یافتہ پاکستان کے حصول کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

پبلشر کی تشریح

زیر نظر کتاب "مشرق کی بیٹی" میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے ۱۶ نومبر ۱۹۸۸ء کو پاکستان میں قومی اسمبلی کے انتخابات کے انعقاد سے چند روز قبل تک کے حالات و واقعات قلمبند کئے ہیں۔ مگر اس کتاب کی تکمیل کے بعد جو واقعات پاکستان کی تاریخ کا حصہ بنے وہ بھی سیاسیات اور تاریخ کے طالب علموں کے لئے بے حد اہم، سبق آموز اور فکر انگیز ہیں--- جنرل ضیاء کی ہلاکت کے بعد اگرچہ بظاہر آمریت ختم ہو گئی مگر عام انتخابات کے انعقاد اور انتقال اقتدار تک تمام حکومتی مشینری ہو بہو وہی رہی جو جنرل ضیاء نے قائم کی تھی.... فرق صرف یہ پڑا کہ صدر جنرل ضیا کی جگہ قائم مقام صدر غلام اسحاق خان اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء کی جگہ جنرل اسلم بیگ نے لے لی۔ تاہم یہ دونوں اصحاب بھی جنرل ضیا کے ہی منظور نظر اور مقرر کردہ تھے جنوں نے بعد ازاں جنرل ضیا کی تمام باقیات کو قائم و دائم رکھنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ پاکستان کی وفاقی حکومت میں تمام نگران وزرا اور چاروں صوبائی حکومتوں میں گورنر، وزیر اعلیٰ اور کابینہ کے تمام ممبران بھی جنرل ضیا ہی کے مقرر کردہ تھے جنہیں قائم مقام صدر غلام اسحاق خان نے جوں کا توں برقرار رکھا گویا نومبر ۱۹۸۸ء کے انتخابات سے قبل وفاقی اور صوبائی سطح پر موجود تمام حکمران ٹولہ محترمہ بے نظیر بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کا بد ترین مخالف تھا اور اسے پاکستان پیپلز پارٹی کو عام انتخابات کے ذریعے اقتدار میں آنے سے روکنے کے لئے تمام حکومتی وسائل بھرپور طریقے سے استعمال کرنے کی مکمل اجازت اور آزادی حاصل تھی۔ ادھر ۱۲ نومبر ۱۹۸۸ء کو سپریم کورٹ نے لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے انتخابات میں تمام ووٹروں کے لئے قومی شناختی کارڈ رکھنا لازمی قرار دے دیا۔ جس سے ووٹروں کی تقریباً آدھی آبادی ووٹ کا حق استعمال کرنے سے محروم ہو گئی۔ ان تمام مخالف حالات کے باوجود محترمہ بے نظیر بھٹو کی قیادت میں پاکستان پیپلز پارٹی نے ۱۶ نومبر ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور ان کی والدہ بیگم نصرت بھٹو نے سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد میں قومی اسمبلی کے پانچ حلقوں سے انتخاب لڑا اور انہیں پانچوں نشستوں پر ہی فتح حاصل ہو گئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے صوبہ سندھ میں تمام سیٹیں جیت کر اسلامی جمہوری اتحاد میں اپنے مخالفوں کو بری طرح چت کر دیا۔ اسی طرح پنجاب میں بھی اسے اپنے مخالفین پر واضح برتری حاصل رہی--- پی پی پی واحد پارٹی تھی جس نے پاکستان کے چاروں صوبوں میں

انتخابی دنگل میں فتح حاصل کی اور اس طرح قومی اسمبلی میں اسلامی جمہوری اتحاد کی ۵۴ سیٹوں کے مقابلے میں ۹۲ سیٹیں حاصل کیں۔ آئی جے آئی کے اہم لیڈر اور وزارت عظمیٰ کے امیدوار محمد خان جونیجو اور غلام مصطفیٰ جتوئی بھی عبرت ناک شکست سے دوچار ہوئے جب کہ وزیر اعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف قومی اسمبلی کی چار میں دو سیٹوں پر شکست کھا گئے۔ جنرل ضیاء کی کابینہ کے وزرا اور قریبی ساتھیوں کو بھی عوام نے مسترد کر دیا۔

۱۹ نومبر ۱۹۸۸ء کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں بھی پاکستان پیپلز پارٹی نے چاروں صوبوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

پاکستان میں جمہوریت کی بحالی یکم دسمبر ۱۹۸۸ء کو ہوئی جب قائم مقام صدر غلام اسحاق خان نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو وزیر اعظم نامزد کیا اور حکومت کی تشکیل کی دعوت دی۔ اس طرح ۳۵ برس کی عمر میں محترمہ بے نظیر بھٹو عالمی سطح پر سب سے کم عمر سربراہ حکومت اور جدید دور میں ایک مسلمان قوم کی پہلی سربراہ کا اعزاز حاصل کرنے والی شخصیت بن گئیں .....

پاکستان کے عوام نے آئین کے مطابق محترمہ بے نظیر بھٹو اور ان کی پارٹی کو پانچ برس کے لئے حکومت کرنے کا مینڈیٹ دیا تھا مگر عوام مخالف اور آمریت نواز قوتوں کو یہ گوارا نہ تھا کہ پاکستان کے عوام کو پاکستان پیپلز پارٹی کے پرچم تلے امور مملکت میں حصہ دار رہنے دیا جائے چنانچہ انہوں نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی قیادت میں پی پی پی کے اقتدار سنبھالنے کے ساتھ ہی اس کے خلاف سازشیں کرنا شروع کر دیں اور عوامی حکومت کے خاتمے کے لئے منصوبہ بندی میں لگ گئے۔ اس منصوبہ بندی میں صدر مملکت غلام اسحاق خان برابر کے شریک تھے۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء میں جب محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کو ابھی ایک سال کا عرصہ بھی نہیں ہوا تھا ان کے خلاف اپوزیشن کی طرف سے قومی اسمبلی میں تحریک عدم اعتماد پیش کر دی گئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے ارکان سمیت محترمہ بے نظیر بھٹو کے حامی تمام ممبران قومی اسمبلی محترمہ بے نظیر بھٹو کی قیادت میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوئے اور جب ۲ نومبر ۱۹۸۹ء کو تحریک عدم اعتماد رائے شماری کے لئے قومی اسمبلی میں پیش ہوئی تو اسے عبرت ناک شکست سے دوچار ہونا پڑا ... محترمہ بے نظیر بھٹو کو جمہوری عمل کے ذریعے اقتدار سے الگ کرنے کی تمام امیدیں جب خاک میں مل گئیں تو ان کے مخالفین نے آمرانہ انداز میں ان سے مسند اقتدار چھین لینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ صدر غلام اسحاق نے چھ اگست ۱۹۹۰ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کو غیر آئینی، غیر قانونی اور غیر اخلاقی طور پر برطرف کرنے کا اعلان کر دیا--- حکومت کی برطرفی کے ساتھ ہی قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیاں بھی توڑ دی گئیں اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۰ کو نئے

انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا گیا..... انتخابات کے انعقاد تک مرکزی سطح پر اور تمام صوبوں میں ایسے افراد کو وزارتیں دے دی گئیں جن کا شمار بھٹو خاندان اور پاکستان پیپلز پارٹی کے بد ترین مخالفین میں ہوتا تھا- ادھر صدر غلام اسحاق نے محترمہ بے نظیر بھٹو پر مختلف نوعیت کے لا تعداد مقدمات کر دیئے اور ان کے خاوند آصف علی زرداری کو گرفتار کر کے جیل بند کر دیا--- تمام سرکاری ذرائع ابلاغ کو محترمہ بے نظیر بھٹو اور ان کے ساتھیوں کے خلاف زہریلے پراپیگنڈے پر لگا دیا گیا جب کہ ملکی اخبارات و جرائد کو پاکستان پیپلز پارٹی کے اہم رہنماؤں کی کردار کشی کرنے کے لئے بھاری رقوم ادا کی گئیں--- ان تمام تر نا مساعد حالات کے باوجود محترمہ بے نظیر بھٹو نے پاکستان بھر میں زبردست انتخابی مہم چلائی اور ملک کے کونے کونے میں پہنچ کر عوام کو اپنے مخالفین کے مذموم عزائم سے آگاہ کیا--- محترمہ بے نظیر بھٹو اگرچہ نگران حکمرانوں کی نیت اور انتخابی نتائج سے بخوبی آگاہ تھیں اس کے باوجود انہوں نے اپنی جمہوری سوچ کے باعث انتخابی عمل میں بھرپور حصہ لیا--- اکتوبر ۱۹۹۰ کے انتخابات میں پہلے سے طے شدہ منصوبہ کے تحت آئی جے آئی کو قومی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت اور چاروں صوبائی اسمبلیوں میں واضح اکثریت دلا کر حکمران بنا دیا گیا-

پاکستان پیپلز پارٹی کو قومی اسمبلی میں محض ۴۵ سیٹوں پر منتخب قرار دیا گیا--- الیکشن ۱۹۹۰ میں اس کھلی دھاندلی اور فراڈ کے باوجود محترمہ بے نظیر بھٹو نے ایسا کوئی قدم اٹھانے سے گریز کیا جس سے پاکستان میں جمہوریت کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال ہو کیوں کہ بقول بے نظیر بھٹو "بدترین جمہوریت بھی بہترین آمریت سے بہتر ہوتی ہے" --- چنانچہ ۳ نومبر ۱۹۹۰ء کو انہوں نے قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف کی کرسی سنبھال لی اور ملک میں ایک بار پھر حقیقی جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد شروع کر دی- ۳ ماہ سے زائد تک انہوں نے بقول قائد حزب اختلاف اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور ہر اہم معاملہ پر قوم کی مکمل رہنمائی کی--- قومی اسمبلی میں بحیثیت قائد حزب اختلاف ان کی تقاریر تاریخی اہمیت کی حامل ہیں- قومی اسمبلی سے باہر میدان سیاست میں بھی محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی بھرپور رابطہ عوام مہم کے ذریعے زبردست ہلچل پیدا کر دی اور عوام کو انتخابات میں دھاندلی کے ذریعے برسراقتدار آنے والے ٹولہ کے خلاف منظم اور متحرک کیا--- ۱۸ نومبر ۱۹۹۲ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو نے اقتدار پر قابض گروپ کے خلاف عوام کو اسلام آباد کی طرف لانگ مارچ کرنے کی کال دی.... پاکستان کے چاروں صوبوں سے عوام کی بھاری اکثریت نے اس کال پر لانگ مارچ کی تیاریاں مکمل کر لیں--- حکمران ٹولہ لانگ مارچ سے اس قدر خوف زدہ ہوا کہ اس نے ۱۸ نومبر ۱۹۹۲ء کو اس مارچ کو روکنے کے لئے وحشت و بربریت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے--- ۱۸ نومبر کو لانگ مارچ سے اگرچہ حکومت تو ختم نہ ہوئی تاہم اس نے

حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں- دوسری جانب محترمہ بے نظیر بھٹو کی سیاسی حکمت عملی سے صدر غلام اسحاق اور نواز شریف ایک دوسرے کو ایوان اقتدار سے باہر پھینکنے کے لئے باہم دست و گریباں ہو گئے--- نیجتاً ۱۸ اپریل ۱۹۹۳ء کو صدر غلام اسحاق نے نواز شریف حکومت کو برطرف کردیا قومی اسمبلی توڑ دی اور بزرگ سیاسی رہنما میر بلخ شیر مزاری کو نگران وزیر اعظم نامزد کر دیا--- نواز شریف نے عدالتی جدوجہد کے ذریعے ۳۷ روز بعد سپریم کورٹ سے اگرچہ اپنی حکومت بحال کروانے میں کامیابی حاصل کر لی لیکن سیاسی طور پر وہ اس قدر کمزور ہو چکے تھے اور صدر کے ساتھ ان کے اختلافات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ مزید عرصہ اقتدار میں رہنا ان کے بس کی بات نہ رہی ادھر محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھی نواز شریف حکومت کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور ۱۶ جولائی ۱۹۹۳ء کو حکومت کے خلاف ایک اور لانگ مارچ کی کال دے دی--- تاہم اس لانگ مارچ کی نوبت ہی نہ آئی کہ نواز شریف نے حالات سے مجبور ہو کر خود ہی مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا اور قومی اسمبلی توڑ دی- دوسری جانب صدر غلام اسحاق کو بھی اپنی کرسی چھوڑنا پڑی--- سینٹ کے چیئرمین وسیم سجاد نے قائم مقام صدر مملکت کا عہدہ سنبھال کر چھ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو قومی اسمبلی کے انتخابات کروانے کے اعلان کر دیا مسٹر معین قریشی کو نئے انتخابات کے انعقاد تک نگران وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا-

۶ اکتوبر کے انتخابات کے میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی جماعت نے ایک بار پھر قومی اسمبلی نے واضح اکثریت حاصل کر لی- ۹ اکتوبر کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں بھی پاکستان پیپلز پارٹی نے چاروں صوبوں نے واضح کامیابی حاصل کی--- قائم مقام صدر وسیم سجاد نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو قومی اسمبلی میں اکثریتی جماعت کا قائد ہونے کے باعث حکومت بنانے کی دعوت دے دی--- ۱۹ اکتوبر کو قومی اسمبلی کے اجلاس میں ۷۲ کے مقابلے میں ۱۲۱ ارکان نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو قائد ایوان منتخب کر لیا--- اسی شام انہوں نے ایک بار پھر وزیر اعظم پاکستان کی حیثیت سے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا--- پاکستان کی تاریخ میں عوام کے ووٹو سے منتخب ہوکر دوبارہ وزیر اعظم بننے کا تاریخی اعزاز محترمہ بے نظیر بھٹو کو حاصل ہو گیا- اس سے قبل یہ اعزاز صرف ان کے عظیم والد جناب ذوالفقار علی بھٹو شہید کو حاصل ہوا تھا- محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت اس وقت ہر لحاظ سے مستحکم، مضبوط اور فعال ہے اور وطن عزیز کے استحکام، تعمیر و ترقی اور عوام کی خوشحالی کے ہمہ وقت سرگرم عمل ہے-

محترمہ بے نظیر بھٹو اور جناب آصف علی زرداری اپنی شادی کے موقع پر

محنت کش پیپلزپارٹی کا عظیم سرمایہ ہیں۔ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو ایک محنت کش کے ہمراہ

۱۹۸۶ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی پاکستان واپسی کے بعد لاہور میں انہیں پارٹی کارکنوں کی جانب سے تلوار پیش کی گئی

دورۂ لاہور کے موقع پر وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو سینئر وزیر پنجاب مخدوم الطاف مرحوم، سپیکر پنجاب اسمبلی محمد حنیف

ایکسپورٹ پروموشن بیورو پاکستان کی جانب سے منعقدہ ایک نمائش کے موقع پر

وزیراعظم بے نظیر بھٹو ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے

وزیراعظم بے نظیر بھٹو فلپائن کی سابق صدر مسز کوریزن اکینو کے ہمراہ

محترمہ بے نظیر بھٹو تحریک استقلال کے سربراہ ایئرمارشل اصغر خان اور خورشید محمود قصوری کے ہمراہ

وزیراعظم لاہور پریس کلب کے منتخب عہدیداران کے ہمراہ

سیاچن کے دورہ موقع پر وزیراعظم ارض وطن کے محافظوں کے ہمراہ

پاکستان کے بزرگ سیاسی راہنما نوابزادہ نصراللہ اور محترمہ بے نظیر بھٹو

وزیراعظم بے نظیر بھٹو انتخابی مہم کے دوران ایک جلسہ عام سے خطاب کر رہی ہیں

دورۂ سنگاپور کے دوران وزیراعظم بے نظیر بھٹو سیکورٹی افسران کے ساتھ

دورۂ جرمنی کے موقع پر وزیراعظم بے نظیر بھٹو ایئرپورٹ پر استقبال کے لئے آنے والے بچوں سے پھول وصول کر رہی ہیں

قطر کے دارالحکومت دوحہ میں پیپلزپارٹی کے مقامی راہنما عزیز قریشی، محترمہ بے نظیر بھٹو پر لکھی گئی کتاب "لیڈر آف ٹوڈے" پر ان سے آٹوگراف لے رہے ہیں

سپین کے دورے کے دوران وزیراعظم بے نظیر بھٹو اپنے تاثرات قلم بند کر رہی ہیں۔

مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم وزیراعظم پاکستان کے ہمراہ

ہمارا پیغام امید کا پیغام ہے، ہمارا پیغام اتحاد کا پیغام ہے۔ امن، آزادی اور ترقی کا پیغام ہے۔

پیپلزپارٹی ڈرائنگ روم کی سیاست پر یقین نہیں رکھتی۔ہماری سیاست عوام سے ہے۔

جن کارکنوں اور لیڈروں کو پاکستان کے استحکام، ترقی اور خوشحالی سے دلچسپی ہے وہ یقیناً میرا ساتھ دیں گے۔

اقتدار کوئی چیز نہیں ہوتی، سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ عوام کی نظروں میں آپ کی عزت ہو۔

ہم سیاست میں اپنے ذاتی مفاد کے لئے نہیں ہیں بلکہ ہم نے جو قربانیاں دی ہیں وہ غریب عوام کے لئے ہیں۔
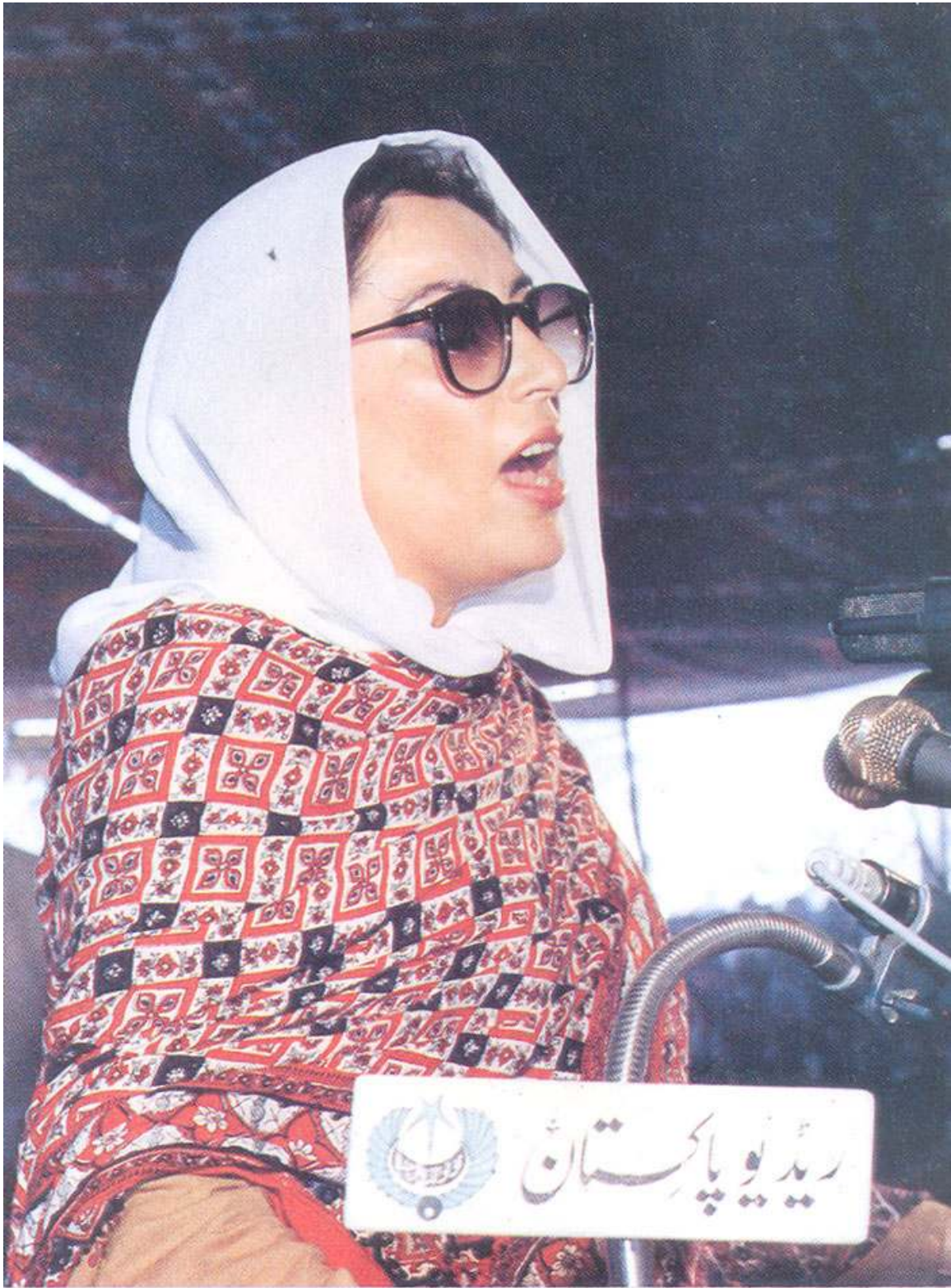
ایک طرف دولت کی ریل پیل ہو اور دوسری طرف غربت، ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے۔

مقبوضہ کشمیر کے انقلابی لیڈر اور آل پارٹیز حریت کانفرنس کے سربراہ میرواعظ عمر فاروق اور وزیراعظم پاکستان کے درمیان ملاقات

(i) امریکہ کے سابق صدر رچرڈ نکسن اور وزیراعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو

جنوبی افریقہ کے انقلابی لیڈر، صدر نیلسن منڈیلا اور وزیراعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو کے درمیان ملاقات کا ایک منظر

اردون کے شاہ حسین وزیراعظم پاکستان بے نظیر بھٹو سے ملاقات کر رہے ہیں

دورۂ ترکی کے موقع پر وزیراعظم بے نظیر بھٹو ترک وزیراعظم تانسو چیلر کے ہمراہ

دورۂ ایران کے موقع پر وزیراعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو اور صدر اسلامی جمہوریہ ایران ہاشمی رفسنجانی گارڈ آف آنر کا معائنہ کر رہے ہیں۔

سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فہد بن عبدالعزیز اور وزیراعظم پاکستان بے نظیر بھٹو کے درمیان ملاقات

وزیراعظم بے نظیر بھٹو برطانیہ کی سابق وزیراعظم مارگریٹ تھیچر کے ہمراہ
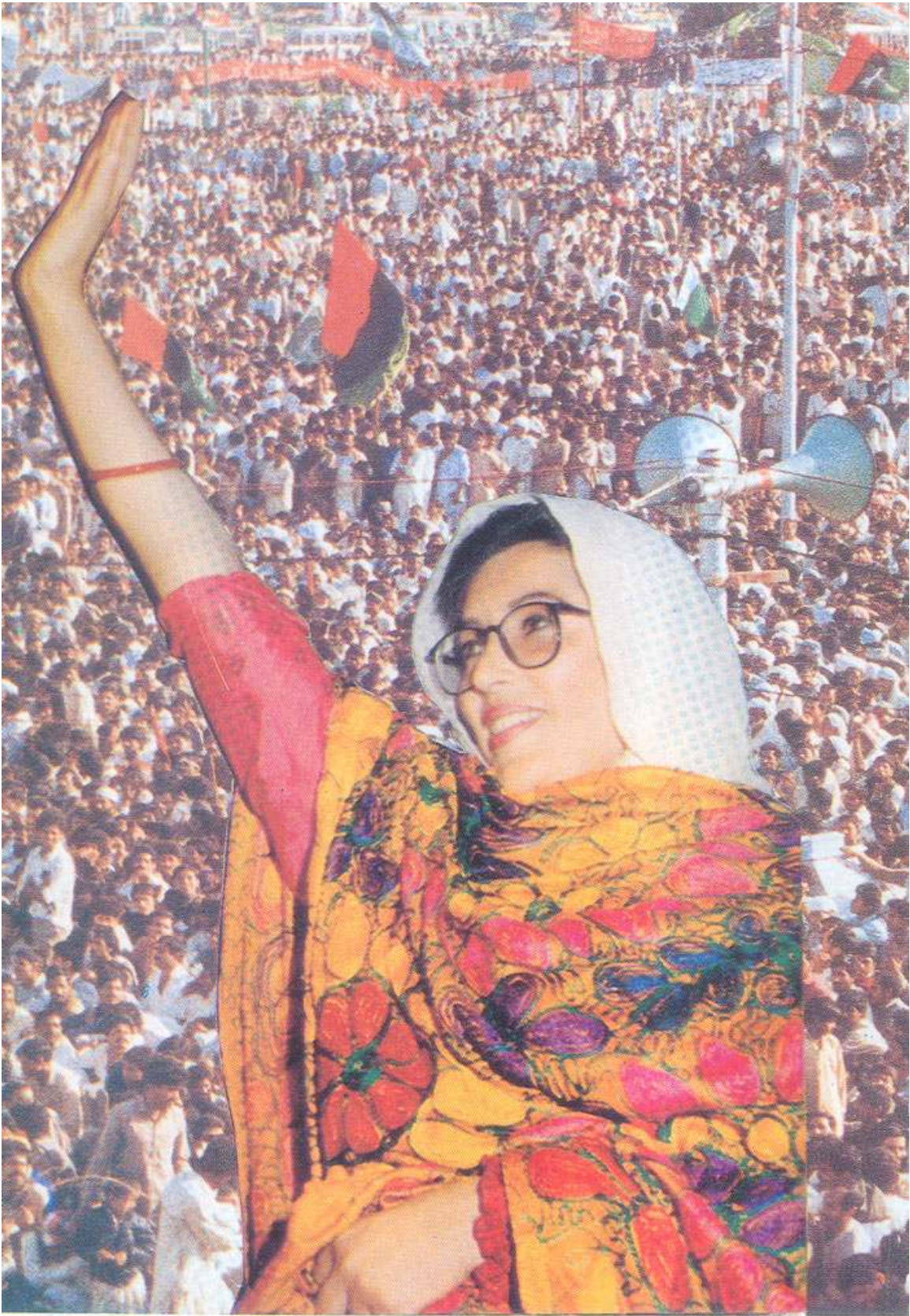
ہم نے عوام کی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے ہر مشکل کا مقابلہ کیا۔

بھٹو صاحب نے کہا "یہ بات اچھی نہیں کہ لوگوں کے بچے قربانیاں دیں اور میرے بچے نہ دیں"